یا حی یا رحیم

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کردوں — کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن — کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

حیاتِ دبیرؒ

اسم تاریخی سوانح عمری دبیر انور اللہ مرقدہ

یعنی

خلاق معانی فرزدق ثانی ہمہ دان ہمہ صفت قاآنی ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ جامع کمالات حضرت میرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم مغفور مرثیہ گو کی مفصل سوانح عمری اور ان کے زمانے میں گلزار لکھنؤ کا علم و فضل کی آبیاری سے سرسبز ہونا ان کا فطری شاعر اور جمیع اصناف سخن پر قادر ہونے کی ... ان کی خوش تقریری قیاسی و حافظہ و اخلاقی فضائل کے حالات اور ہندوستان کے مستند علما و شعرا و اہل کمال کی محققانہ رایوں کا اقتباس اور عرب و فارس و ہند کے بعض مستند و مشہور شعرا کے کلام سے ان کے کلام کا مقابلہ اور ایک محققانہ علمی مضمون عالیجناب مسٹر حامد علی خان صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ کا جس میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کے مختلف کلام سے مرزا صاحب کے رنگ کلام کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام سے مختلف اقسام کے نمونے اور انہی قلمی تحریر کا عکس اور ان کے صاحب تلامذہ کے مختصر حالات و مختصر نمونہ کلام اور بعض اہل کمال کے ذکر کتاب پر ریویوز (تقریظیں) اور تاریخیں

مؤلفہ

جناب سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اہل کار دربار کوٹہ (راجپوتانہ)

جس کو

مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب لاہور نو ہاری منڈی نے فاضل مؤلف کی اجازت سے پہلی مرتبہ
مطبع سیوک سٹیم پریس لاہور میں باہتمام ماسٹر تمارام مالک چھپوا کر شائع کیا

تعداد جلد ۱۰۰۰ — ۱۳۳۱ھ — قیمت فی جلد ... کاغذ ... [illegible]

فہرست مضامین دیباچہ حیات دبیرؒ موسوم باسم

۱۳ ۳۰

سوانح عمری دبیر نوراللہ مرقدہ

فہرست مضامین کتاب حیات دبیر رح

فہرست مضامین حیات دبیر

نمبر باب	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۸	۳	۲۴۸ تا ۲۵۷	نمبر ۴۶ تا ۵۰ - تنہائی میں امام حسینؑ کا بیٹے اور بھائی کو یاد فرمانا گرمی۔ دھوپ۔ سایہ۔ مضامین عالی و نازک خیالی۔ گھوڑے سے باتیں۔ دربار یزید میں علیؑ اصغر کا بیان۔ عشق خدا کا بار۔ نئے غیر نقیسی مرثیے کے بند۔ شہادت کا مآل۔ مصائب کی فہرست بالاجمال۔ امام حسینؑ کی کارگذاری۔
۹	۱	۲۵۸ تا ۲۶۲	ایجادات دبیرؔ۔ زمانہ شہرت کے اساتذہ۔ نمبر ۱ تا ۴۔ مرثیہ میں حمد و نعت۔ ۱۴ معصومینؑ کے حال میں مرثیے۔ مرثیے میں حمل و ولادت و شادی
〃	۲	۲۶۲ تا ۲۶۴	مناظرہ۔ واقعہ قتل علم کربلا میں۔ مرثیہ بطور حالات تاریخی۔ حضرت زینبؑ کی زبانی امام حسینؑ کی کہانی۔ روایات کثیرہ
〃	۳	۲۶۶	مناظرہ پانی کا ماتم۔ حال مختار منتقم خون امام حسینؑ۔ سراپائے حضرت حرؑ۔ حال حبیب ابن مظاہر۔
۹	۴	۲۶۸ تا ۲۷۰	چار بحور مرثیہ۔ مختلف بحور مرثیہ۔ مسدس اور مسکند و سعدا مربع مرثیہ اصطبیر۔ احکام ذبیحہ۔
۱۰	۱	۲۷۱ تا ۲۷۳	تعداد کلام۔ ہزار دس مرثیے مشہور ہونے کی وجوہ۔ ۶۲ برس مدت تصنیف۔ رات بھر میں ایک مرثیہ کہنا
〃	۲	۲۷۳ تا ۲۷۶	مرثیہ کہہ کر دوسرے کا تخلص ڈال دیا۔ دفتر پریشان۔ ایک مرثیے میں پانچ چھ مطلع۔
〃	۳	۲۷۷ تا ۲۸۰	تعداد مراثی دفتر ماتم۔ رباعیاں نوحے۔ قطعات وغیرہ۔ مرثیے جو زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کہے ہیں۔
〃	۴	۲۸۱ تا ۲۸۶	مرثیے جو ابتک نہیں چھپے۔ مرزا صاحب کے مرثیے میر صاحب سے بہت زیادہ ہیں۔ انتخاب کلام جناب لبؔ و تتمہ نقل پیرگوئی جناب مصحفی۔
۱۱	۱	۲۸۷	دبیر کے قدرشناس اہل کمال۔
〃	۲	۲۸۹ تا ۲۹۷	جناب مفتی میر عباس صاحب شوستری لکھنوی۔ اور اُن کا فیصلہ بحث افضلیت دبیرؔ و انیسؔ میں۔

خلاصۂ مضمون	نمبر صفحہ	نمبر باب	نمبر شمار	خلاصۂ مضمون	نمبر صفحہ	نمبر باب	نمبر شمار
جوابات اعتراضات مولوی شبلی صاحب مندرجہ موازنہ آفتاب میں داغ - نافہمی یا ناواقفی کا داغ - اعتراض میر انیس و البطاشہ مرجان کا مقدم - مطبعوں کی غلطیاں - مراثی دبیر مطبوعہ مطبع اودھ اخبار دفتر ماتم - المامون عالم امام رضا - امام ہشتم کو امام ہفتم کہنا لا تعد و لا کا قابلیہ صحیح ہے - سند میں آیہ قرآن دبیر اور برابر کا جواب - تقدم شہرت دبیر - حضرات امانت - عشق - اختر - اسیر - شہرت مرحومین - خود جناب انیس کا قول تقدم شہرت دبیر میں - سراپا سخن و شاگرد شاگرد دبیر - اوّل مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی - مرزا صاحب کا دعوے ایجاد و تعریض سرقہ وغیرہ -	۴۹۰ تا ۵۱۰	۱	۱۴	ملٹن و دبیر کی مشترکہ خصوصیتیں - مضامین عالی - علم -	۴۵۸	۴	۱۵
				مرثیہ کا چہرہ - دبدبہ آمد - نعت - منقبت دلگداز - پر دقیس آزاد مقبولیت مرثیت دبیر - الفاظ مستعمل دبیر - ایک واقعہ کربلا ہزار ہا طرح سے با ندھا - معرکہ کربلا - خواہ حالی معرکہ بجو - مرثیہ دبیر بلحاظ اکثریت اشعار شہادت -	۴۶۳ تا ۴۸۰	۵	۶
				وہ کلام فوق طاقت بشری تھے - کلام دقیق - مناقب میں جوش طبیعت - ظرافت - مرثیہ و تسلسل - حاشیہ پریشان مرثیہ عربی (دعبل) و فارسی (محتشم) و اُردو (میر و سودا) - مرثیہ میں مثنوی اور قصہ کا سا تسلسل لازمی نہیں ہے - سلاست و عام فہم الفاظ - فسانہ عجائب - مرزا صاحب نے خاص جگہ پیدا کر لی -	۴۸۱ تا ۴۸۹	۶	۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للہ رب العلمین ۔ والصلوٰۃ والسلام علی محمد خاتم النبیین و تمام عدۃ المرسلین وعلی آلہ الطیبین الطاہرین ۔ واصحابہ المنتجبین[1] +

ناظرین حیاتِ دبیر!! (۱) دبیر کون بزرگوار تھے؟ (۲) اور کتاب حیاتِ دبیر کیا چیز ہے؟

یہ کتاب کیوں لکھی

ان دونوں سوالوں کا جواب شافی تو یہ کتاب (خود زبان حال سے) دیگی ۔ میں آپ سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ کتاب کیوں اور کیونکر لکھی ۔ اسی کے ضمن میں شاید سوالات نمبر ۱ و ۲ کا بھی کچھ جواب مل جائے +

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا ۔ کہ شعر و سخن سے میری طبیعت کو ابتدا ہی سے لگاؤ تھا[2] ۔ اور اس کے ساتھ ہی بچپن ہی سے مرثیہ پڑھنے کا شوق ہوا ۔ اکثر حکیم کا بیٹا حکیم اور عالم کا لخت جگر عالم اور کاریگر کا فرزند کاریگر ہوتا ہے ۔ میں نے آنکھ کھول کر اپنے نانا میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی مرحوم کو مرثیہ پڑھتے ہوئے دیکھا ۔ میں ادھر مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں مولوی میر صفدر شاہ صاحب مرحوم سے اردو و فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا ۔ ادھر فرصت کے وقت نانا مرحوم مجھ کو مرثیہ پڑھنا سکھاتے تھے ۔ میں جب عروض تو خاک نہیں جانتا تھا ۔ مگر جو مصرع ناموزوں ہوتا تھا ۔ وہ خود بخود دل پر کھٹک جاتا تھا ۔ البتہ عین یا ہ ایسے حروف گرنے کی مجھے خبر نہ ہوتی تھی +

مؤلف

نانا مرحوم مرزا دبیر مغفور کے شاگرد رشید تھے ۔ بارہ تیرہ برس کی عمر سے ان کے شاگرد ہوئے ۔

---

[1] یہ کلمات نیز گاد عائے صحیفہ کاملہ (یوم الثلثاء) سے اخذ کئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] ۱۵ رجب ۱۲۸۹ ہجری روز جمعہ کی میری پیدائش ہے ۔ نظیر حسن تاریخی نام ہے ۔ عروض و قافیہ سے بھی میرا سال ولادت نکلتا ہے ۔ یہ قدرتی شعر و سخن کے توام ہونے کا شاعرانہ لال ثبوت ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور ہمیشہ ہر بڑی مجلس اور ہر معرکے میں اُن کے ساتھ رہتے۔ وہ گویا مرزا صاحب کی زندہ تاریخ تھے۔ اور مرزا صاحب کے گویا مددگار تھے۔ اسی مناسبت سے مرزا صاحب نے اُن کا تخلص ظہیر (مددگار) رکھا تھا +

اگرچہ اُن کے والد ماجد میر فتح علی مرحوم زمانہ شاہی (لکھنؤ) میں رسالدار اور وہ خود نائب رسالدار تھے۔ مگر مرثیہ پڑھنے کا اُن کو ایسا شوق تھا۔ کہ عمر بھر گویا یہی کام کیا کئے +

مجھے اُنہوں نے دس برس کی عمر میں ہی جب میں غلط سلط اردو لکھ اور پڑھ لیتا تھا۔ مرثیہ پڑھنا سکھایا اُنہوں نے میر ضمیر مرحوم (جو مرثیہ میں اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کے بھی موجد تھے اور جن کو اُنہوں نے برسوں خوب سُنا تھا) کے طرز مرثیہ خوانی میں کچھ تبدیلی کر کے ایک طرز خاص بنانے کا بیڑا لیا تھا۔ اگرچہ وہ سلام اکثر اور مرثیہ کمتر کہتے بھی تھے۔ مگر خاص کر مرثیہ پڑھنے پر اُنہوں نے سخت محنت کی تھی۔ اکثر خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے ساتھ کے پڑھنے والوں میں فقط ایک میر شرف الدین مرحوم تھے۔ جو محض بین ۱۵ سے ۲۵ بند مجلس میں پڑھتے تھے۔ اور بین لاجواب پڑھتے تھے۔ سراپا۔ لڑائی وغیرہ وہ نہیں پڑھتے تھے۔ اور میں اُن سب مقامات (مرثیہ) کو پڑھتا تھا۔ میرے بعد کے (مرزا صاحب کے) شاگردوں میں میر افضل مرحوم اچھے پڑھنے والے تھے۔ اُنہوں نے میرے طرز کی پیروی کی۔ اور خوب خوب پڑھتے۔ خود مرزا صاحب شاگردوں کو مرثیہ خوانی کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ اس لئے اس خاندان میں جو کوئی شاگرد ہوتا تھا۔ وہ انہیں کے پاس مرثیہ پڑھنے کو آتا تھا۔ اور وہ سکھاتے تھے۔ خود ہر روز تنہائی میں ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ بعض مصرع کو بیس بیس مرتبہ مختلف طرز۔ اُتار۔ چڑھاؤ سے پڑھتے تھے۔ جب جا کر اُن کو اطمینان ہوتا تھا۔ اور شاگردوں کو سامنے بٹھلا کر سکھاتے تھے +

المختصر چند روز مشق کے بعد اُن کی پیش خوانی میں (مجالس عزا میں) میں نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر کسی مجلس میں جاتا تھا۔ جو میرے مدرسہ کے وقت نہ ہوتی تھی۔ نانا مرحوم کے ہمرکاب اُن مجلسوں میں بھی اکثر جاتا تھا۔ جن میں جناب مرزا صاحب یا جناب میر صاحب یا میر مونس مرحوم یا میر انیس مغفور یا آغا عشق مرحوم یا اور کوئی اعلیٰ درجہ کا ذاکر پڑھتا تھا۔ کہ نانا مرحوم اور ان سب صاحب کمالوں سے بھی راہ و رسم و نسبت تھی۔ اثنائے مرثیہ خوانی میں یہ سب صاحب اُن کی طرف (خاص طور پر) متوجہ اور اُن سے

طالب داد ہوتے تھے - اس سبب سے ہر کامل کو سننے کا مجھے اچھا موقع ملتا تھا [میں نے علاوہ مدرسہ ایمانیہ کے (بعد کو) بعض علمائے فرنگی محل (مولوی امان علی صاحب و مولوی لمعان الحق صاحب) اور مولوی آقا محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد و محدث لکھنؤ اور مولوی سید علی نقی صاحب داعی پوری مرحوم مدرس کیننگ کالج سے بھی کچھ پڑھا] یہاں تک کہ ۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ میں میر و مرزا نے (تین چار مہینے کے اندر اندر) انتقال فرمایا - میری عمر اس وقت ۱۴ چودہ برس کی تھی - اب اُدھر میر نفیس مرحوم اِدھر جناب مرزا اوج مدظلہ کے پڑھنے کی دھوم دھام کی مجلسیں شروع ہوئیں کبھی کبھی جناب میر انس و میر مونس و میر عشق مرحومین بھی پڑھتے تھے - کربلائے معلّٰے سے جناب تعشق مغفور نے بھی آکر پڑھنا شروع کیا - اُن کو بھی سُنا - جناب میر وحید (مرحوم) نے بھی خوب خوب مرثیے کہے اور پڑھے +

اِدھر ٹکسال (لکھنؤ) میں میر محمد صاحب سلیس مرحوم نے کچھ مجلسوں میں میر انیس صاحب کے لوح محفوظ والے غیر تقسیمی مرثیے پڑھنا شروع کئے - ان کے پڑھنے میں صورت میں - آواز میں میر صاحب کی مشابہت تھی - اور خوب پڑھتے تھے +

بہر حال ان تمام اہل کمال کو میں سُنتا تھا - اور ان رنگا رنگ خوشبودار پھولوں کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوا جاتا تھا - اور موت گویا زبان حال سے کہہ رہی تھی - (مؤلف)

بہت رنگ و بو پہ نہ اتراؤ پھولو نہیں دیر لگتی خزاں آتے آتے

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سر سبز گلزار لکھنؤ میں یکا یک پت جھڑ شروع ہوئی - اور بجز حضرت اوج سلمہ کے سب کے سب بزرگوار باغ جنت میں چل بسے - خدا جناب ممدوح کو سلامت رکھے کہ اب ان کا دم بہت غنیمت ہے +

میں ۱۸۹۲ء میں لکھنؤ سے بھرت پور میں پہنچا - یہاں سے محسن اہل علم عالم علوم مشرقی و مغربی جناب ڈپٹی سید جعفر حسین صاحب جعفری بیرسٹری (لندنی) دام مجدہ و اقبالہ کے ہمرکاب کوٹہ آیا - اور جناب ممدوح کی وجہ سے ریاست میں نوکر ہوا - جس سلسلہ کا اب تک پابند ہوں + ۱۸۹۰ء سے میں نے مستقل طور پر غزل کہنا بھی شروع کر دیا تھا - اور جب پیام یار وغیرہ کسی گلدستہ میں غزل بھیجتا تھا تو

جناب منشی امیر مینائی

جناب منشی امیر مینائی کی خدمت عالی میں بھیجوا دیتا تھا۔ بعض ابتدائی غزلیں اُن کی نظر سے گذریں اور اصلاح کے بعد چھپیں۔ ادھر جو سلام وغیرہ کہے۔ وہ جناب مرزا اوج مدظلہ کو دکھائے۔ عروض میں اپنے طور پر کتابیں دیکھ دیکھ کر کچھ مہارت پیدا کرلی۔ اور پھر جب (۱۹۰۳ء میں) عتبات عالیات (کربلا و نجف وغیرہ) کی زیارت سے مشرف ہُوا۔ تو اُن پاک زمینوں کے اثر سے مسلسل مرثیے کہنا شروع کئے۔ الحمدللہ کہ اب ایک معقول ذخیرہ مرثیوں کا ہوگیا ہے۔ جس کی ایک جلد چھپ سکتی ہے۔ اسی کو میں توشۂ آخرت سمجھتا ہُوں۔ ابتدا میں جب مَیں غزل و سلام کہتا تھا اور مرثیہ پڑھتا تھا۔ اور غور کرتا تھا۔ تو غزل سے مرثیہ گوئی کو بہت زیادہ مشکل پاتا تھا۔ دل میں سوچتا تھا۔ کہ یااللہ یہ مرثیہ گویوں نے کیا قصور کیا ہے۔ جو تذکرہ لکھنے والے ان کے حالات و کلام یا تو لکھتے ہی نہیں۔ یا لکھتے ہیں تو برائے نام۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا ہے۔ جو کوئی کہہ سکے۔ کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے"۔ آخر پیرؤ نمیہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات دیکھا۔ سبحان اللہ۔ آزاد کی نثر۔ اور اُس کا حُسن بیان۔ اور پھر دہلی کی ٹکسالی زبان۔ دل نے مزے اُٹھائے۔ (المؤلف) ؎

آب حیات و جناب آزاد مرحوم

حق یہ ہے نثر لکھنے میں آزاد فرد تھا
حق خدمت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت آزاد نے خیر اور مرثیہ گویوں ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر وغیرہم کا ذکر خیر تو بالاجمال کیا تھا۔ لیکن دبیرؔ و انیسؔ کے حالات ذرا شرح و بسط سے لکھے تھے۔ مگر آب حیات میں حالات میرزا صاحب کو جو دیکھا۔ تو اکثر خلاف واقع پایا۔ گو بعض اہل دہلی مقیم کوٹہ (میر محبوب علی مرحوم سابق سررشتہ دار مجسٹریٹی آبو وغیرہ) کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء اپنے لڑکپن میں مجلسوں میں جناب آزاد مرحوم جناب میر صاحب ہی کے مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ مگر آزاد ایسے آزاد خیال بزرگ سے ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی تھی۔ کہ وہ جان بوجھ کر میر صاحب کے طرفدار ہونے کے سبب مرزا صاحب کے حالات بھی غلط لکھیں تا اہل علم ہیں۔ دل میں سوچا۔ کہ اس میں کوئی راز ہے۔ حضرت آزاد (مرحوم) کو میں نے کوٹہ سے خط لکھ کر آگاہ کیا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے جو حالات میں نے بزرگوں (اہل لکھنؤ) سے سُنے ہیں (کہ جن میں سے بعض حضرات ابتک زندہ ہیں) اکثر یہ حالات منہ آب حیات آپ کے بالکل برخلاف [illegible]

غلط ہیں۔ اُن مرحوم نے مجھے جواب دیا* کہ جن صاحب سے حالات دبیرؔ کو خط لکھ کر میں نے پوچھا۔ اُنہوں نے (اہل لکھنؤ وغیرہ میں سے) کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ خیر غزل گو شعرا کے تو کچھ حالات ملک سے ملے بھی مگر مرثیہ گویوں کا تو کوئی حال ہی نہیں بتاتا۔ میں نے جو کچھ سُنا۔ لکھ دیا۔ مگر مجھے اس کی صحت پر نہ بھروسہ ہے نہ اصرار۔ تم صحیح حالات لکھ بھیجو۔ میں شکریہ کے ساتھ آئندہ (ایڈیشن میں) چھپنے پر وہ حالات لکھ دونگا۔ اب میں اس فکر میں تھا۔ کہ رخصت لیکر لکھنؤ جاؤں۔ تو معمر آدمیوں سے مزید صحت کر کے صحیح حالات جناب آزاد کو لکھ بھیجوں۔ اُس زمانے میں کوئٹہ سے ریل سو میل سے زیادہ دور تھی۔ برسوں کے بعد جانا ہوتا تھا۔ کئی برس کے بعد جو میں لکھنؤ گیا۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت آزاد اب آزاد نہیں رہے۔ پابند جنون ہو گئے۔ ادھر خود جناب نانا صاحب (مرحوم) نے ایک مختصر رسالہ (تنقید آب حیات) چھپوا کر ملک میں مشتہر کر دیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ کہ یہ کام تو خیر ہو گیا۔ مگر آزاد مرحوم نے آب حیات میں تمام مرثیہ گویوں کے حالات نہیں لکھے۔ اور میر و مرزا کے معاصرین اور بعد کے شعرا، اہل بیت کا تو گویا نام ہی نہیں ہے۔ لاؤ تم ایک تذکرہ مرثیہ گویوں کا لکھ ڈالو۔ لکھنؤ میں کچھ لوگوں کے حالات بزرگوں سے دریافت کر کے لکھ بھی لئے۔ اور جو مرثیہ گو زندہ تھے۔ اُن سے حالات ملنے کی کوشش کی۔ بعض اخباروں میں خطوط لکھی بھیجے۔ اکثر نے تو اس کو صدائے بے ہنگام سمجھ کر جواب ہی نہ دیا (چھاپنا تو در کنار)۔ بعض نے اُس کو اشتہارات کے ذیل میں قرار دیکر دام مانگے۔ بعض نے چھپوا بھی دیا۔ مگر پھر کبھی کسی نے حالات یا منتخب کلام کسی کا (بجز دو تین صاحبوں کے) نہیں بھیجا۔ میں بھی "عرفت ربّی بفسخ العزائم" پڑھ کر چپ ہو گیا۔ جو مصالح اُس وقت فراہم کیا تھا۔ وہ یونہی پڑا رہا۔ مگر جب کبھی کوئی ایسی کتاب (جس میں مرثیہ گویوں کا کچھ تذکرہ ہوتا تھا) یا کسی شاعر کی لائف دیکھتا تھا۔ دل میں جوش پیدا ہوتا تھا۔ کہ مرثیہ گو شاعروں کے کمال سے ملک کو آگاہ کیا جائے۔ پھر سوڈا واٹر کی طرح وہ جوش فرو ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شمس العلما جناب مولوی شبلی صاحب کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" کا میں نے نام سُنا۔ دل میں کہا۔ نام تو بہت موزون ہے۔ غالباً کتاب بھی ایسی ہی ہوگی۔ کچھ دن کے

---

* میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ یہ ارشاد جناب امیر کا ہے۔ پورا جملہ نہج البلاغہ میں یوں ہے عرفت ربّی بفسخ العزائم وحل العقود۔ میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے اور عقدوں کے کھلنے سے پہچان لیا ۱۲ مؤلف حقیر

بعد کتاب جو دیکھی۔ تو حیران رہ گیا۔ بہت افسوس ہُوا کہ ایسے مشہور بزرگ اور ایسی ایسی غلط سلط باتیں لکھیں۔ اب دل نے کہا کہ تھوڑا تھوڑا اس کتاب کا جواب بطور ریویو (تقریظ) لکھو۔ دو کچھ لکھا بھی۔ مگر پھر لکھنؤ کے بعض خطوط سے معلوم ہُوا کہ لکھنؤ میں بھی دو بعض شعرا موازنہ کی رد لکھ رہے ہیں۔ میں یہ شعر پڑھ کر چپ ہو گیا۔

چو کارے بے فضول من برآید   مرا در وے سخن گفتن نشاید

اُسی دوران میں بعض احباب نے اصرار فرمایا کہ جناب مرزا صاحب مرحوم کی سوانح عمری (الگ) لکھو۔ میر صاحب کے حالات میں تو خیر حیات انیس و واقعات انیس لکھی گئی ہیں۔ لیکن ادھر بالکل صفر ہے۔ میں نے حامی بھر لی۔ کہ دل چاہ رہا تھا۔ شمس الضحیٰ (فارسی) مرزا صاحب کے حالات میں ایک پرانی کتاب شاہی زمانے کی مولوی میر صفدر حسین صاحب مرحوم کی لکھی ہُوئی مطبوعہ میرے پاس تھی۔ مگر وہ کوئی دوست نما رہزن ایسے لے گئے تھے۔ کہ پھر کبھی نہ دی تھی۔ پھر شمس الضحیٰ دوبارہ لکھنؤ سے منگوائی۔ اور جو حالات تذکرہ مرثیہ گویاں کی شروع ترتیب کے وقت لکھ رہے تھے۔ اُن کو نکالا۔ ادھر جو جو کتابیں ردّ الموازنہ میر افضل علی صاحب ضو سلمہ اللہ و تردید موازنہ مؤلفہ جناب شیخ محمد جان صاحب عروج فیض آبادی و حیات انیس و واقعات انیس و ردّ واقعات انیس اور بعض اخبار و پرچے نکلنے گئے۔ وہ سب منگائے۔ بہت سی کتابیں منگائیں (کہ یہاں کوٹہ میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں) تین مرتبہ ... لکھنؤ گیا۔ وہاں لوگوں سے حالات پُوچھے۔ سیکڑوں اصحاب و احباب کو خطوط لکھے۔ اخباروں کو چندہ دیئے۔ اور ... اِس سے کیا۔ کہ مرزا صاحب کی عکسی یا قلمی تصویر اور زیادہ حال اور اُن کے شاگردوں کے کچھ حالات و کلام ملے۔ مگر اکثر اخباروں کے اڈیٹروں نے تو جواب ہی نہ دیا۔ بعض نے اس کو تجارتی اشتہار قرار دے کر اُجرت مانگی۔ ہاں ڈبیر صاحب ... اثنا عشری نے اس کو پبلک (خلائق) کا کام سمجھ کر چھپوا دیا جن کا بہت شکر گذار ہُوں۔ پھر میں اس فکر میں ہُوا۔ کہ کوئی صاحب وجاہت (بزرگ قوم) اخباروں میں خطوط چھپوائیں مجھے معلوم ہُوا۔ کہ اہل علم و کمال کے دلی خیرخواہ بلکہ ہمدرد مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ نے ایک مجلس لکھنؤ میں یہ کلمہ فرمایا۔ کہ میری سب تمنائیں پُوری ہو گئیں۔ مگر ایک حسرت رہی جاتی ہے۔ کہ جناب مرزا صاحب کی لائف میری زندگی میں نہیں

شمس الضحیٰ

لکھی گئی۔ میں نے کوٹہ سے اُن کی خدمت عالی میں عریضہ بھیجا کہ میں آپ سے فقط اتنی مدد چاہتا ہوں کہ آپ مرزا صاحب کی تصویر لکھنؤ اور پٹنہ عظیم آباد و کلکتہ وغیرہ میں تلاش فرمائیں۔ قیمت میں دُونگا۔ اور اس کی کوشش فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم کے کچھ اور حالات اور اُن کے شاگردوں کا کچھ کلام وحال مل جائے۔ جناب ممدوح نے اس مقصد کے واسطے کوشش بلیغ فرمائی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مشہور اردو اخباروں کو خطوط چھپنے کے واسطے بھیجے۔ اور اپنے پاس سے اُن صاحب کو پچاس روپے دینے کا اشتہار دیا۔ جو مرزا صاحب کی تصویر لائیں۔ یہ خط ہندوستان کے قریبًا تمام مشہور اردو اخباروں نے چھاپا۔ مگر اثر بہت تھوڑا ہوا۔ تصویر کو میں نے خطوط لکھ کر بھی جابجا تلاش کیا۔ مگر نہ ملی۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر تصویر نہیں ملتی۔ تو خیر۔ اُن کے خط کا فوٹو ہی پیش کر دُوں۔ چنانچہ اُن کا ایک قلمی ورق جناب مرزا اوج مدظلہ سے منگوایا (جو بہت تلاش سے جناب مرحوم کی تصنیفات میں ملا)۔ اور اُس کا عکس (فوٹو) اس کتاب میں ملاحظہ ناظرین کے واسطے پیش کر دیا ہے۔

بعض حضرات نے مرزا صاحب کے حالات اخلاق حسنہ وغیرہ اور بعض بزرگواروں نے اُن کے شاگردوں کے حالات لکھ لکھ کر مع مختصر کلام کے خود بھیجے یا دُوسروں سے تاکید فرما کر بھجوائے۔ جن کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہُوں + سب سے زیادہ جن صاحبوں نے یہ کرم فرمایا۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) میر الطاف حسین صاحب عرف نواب مُنّے صاحب رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد۔

(۲) مولوی سید محمد عسکری صاحب مینیجر رسالہ شیعہ بازار بندی ضلع سارن۔

(۳) مولوی فاضل سید علی حیدر صاحب اڈیٹر اصلاح۔

(۴) مولوی سید احمد رضا صاحب جائسی (ضلع رائے بریلی) جنہوں نے قبلہ وکعبہ مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی سے سُن سُن کر حالات صحیح لکھ کر بھیجے۔

(۵) میر کرار حسین صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جنرل سپرنٹنڈنٹ صاحب گورکھپور و رئیس میرٹھ خلف الصدق حضرت فرقانی طاب ثراہ۔

جب محرم ۱۳۳۳ھ میں یہ کتاب ایک مرتبہ لکھ گئی۔ تو میں اس کو لیکر ڈھائی مہینے کے واسطے لکھنؤ گیا۔

وہاں بعض اہلِ علم اور راوی آدمیوں اور شاعروں کو اس کے اکثر مقامات سُنائے۔ اور بعض حالات کی تصحیح کی۔ بعض اور حالات بہم پہنچائے۔ اور جناب اُستاذی حضرت اوج مدظلہ سے بعض ایسے بند اور اشعار جناب مرحوم کے ملے جو اب تک محفوظ ہیں۔ اور جناب ممدوح نے کرم فرما کر وہ لعل بے بہا عنایت فرمائے۔ جس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قلم تو کیا میری زبان بھی قاصر ہے۔ اس جانفشانی سے یہ کتاب اور بعض تلامذہ دبیر مرحوم کا تذکرہ مرتب ہوگیا۔ اور جو خیال مدت سے دل کو بار بار بے چین کرتا تھا (کہ مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ لکھا جائے)۔ وہ جزوی طور پر معرض ظہور میں آیا۔ جلد اوّل میں مرزا صاحب کے ہر قسم کے کلام کے نمونے ہیں۔ اور جلد ثانی میں علاوہ رباعیوں، سلاموں، تضمینوں وغیرہ کے مسلسل حالات کے مرثیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جناب امام حسینؑ کا مدینہ منوّرہ سے سفر۔ پھر مکہ معظمہ میں چند روزہ قیام۔ پھر ورود کربلا، شعلے۔ پھر اُن کے اُن رفیقوں اور عزیزوں کے حالات و شہادت (جن کے حال میں مرزا مرحوم کے مرثئے ملے)۔ پھر خود امام حسینؑ کے حالات و شہادت۔ پھر اہلبیت اطہار کا کوفہ پھر شام تشریف لے جانا۔ اور وہاں کے حالات۔ پھر واپس کربلا ہوتے ہوئے مدینہ منوّرہ میں آنا۔ اگر اس کو آپ ایک پوئم نظم (مسلسل واقعات منظومہ) کہ سکتے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ اردو کی شاعری پر جو اعتراض چلا آتا تھا۔ کہ ایک پوئم سے خالی ہے۔ وہ اُٹھ گیا یا ہلکا ہوگیا۔ یہ مرثئے مجالس عزا میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی دیکھ کر ناظرین حظ و لطف سخن اُٹھا سکتے ہیں۔ ہم خرما ہم ثواب +

تلامذہ حضرت دبیرؒ

ناظرین! آپ کہتے ہونگے۔ حضرت دبیر کی لائف میں شاگردوں کے حالات و کلام کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں اس کی وجہ عرض کردوں۔ اوّل تو اس گروہ (شعرائے اہلبیت) کی حق تلفی (گویا) ہو رہی ہے[×]۔ کہ عام تذکرہ نویس

[×] ایک اور حق تلفی بھی ہو رہی ہے۔ جس کا حال چند آدمیوں کے سوا شاید تمام اہل لکھنؤ کو بھی معلوم نہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ان شاگردوں کے بعض مرثئے یا سلام یا بند اس زمانے کے بعض مرثیہ گو شعرا اپنے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ پھر اُس پر سر منبر فخر فرماتے ہیں کہ دیکھئے یہ مضمون آج تک کسی نے نہیں باندھا تھا۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کہ کسی پر چند منظور نہیں ہے بقول شاعر سہ حسینوں میں ابھی چوری گیا دل۔ مَیں کس کا نام لوں اپنی زباں سے۔ اس واسطے مؤلف حقیر کا یہ بھی ارادہ ہے کہ تلامذہ حضرت دبیر کے مرثیوں کی جلدیں بھی امرحیات دبیر طبع ہونے کے بعد چھپوا دے۔ اور خود مرزا مرحوم کے صحیح و منتخب کلام کی بھی ایک یا دو جلدیں چھپواؤں۔ یہ کام ذرا مشکل ہے مگر خدا مددگار ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ان کا تذکرہ نہیں کرتے۔ میری کتاب میں درج ہو جانے کے بعد ممکن ہے۔ کہ کوئی تذکرہ نویس ان کے ذکر خیر سے بھی اپنی کتاب کو رونق بخشے۔ اور میرے بعد جو صاحب اور کسی مرثیہ گو شاعر کی لائف لکھیں۔ وہ اُس خاندان کے شاگردوں کو لکھدیں[1]۔ اس طرح ممکن ہے۔ کہ شعرائے اہلبیت کے حالات ملک میں شائع ہوں۔ اور یہ کمی جو عام تذکروں میں ہے یوں پوری ہو جائے۔ دوسرے ہر اُستاد (شاعر) کی نسبت یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ ملک کو اُس سے کتنا فیض پہنچا۔ اُس کے شاگرد کیسے کیسے ہوئے۔ مثلاً جب آپ شیخ مصحفی اور میر انشا کا کلام و بیان (تذکروں میں) دیکھتے ہونگے۔ تو آپکو ضرور یہ خیال ہوتا ہوگا۔ کہ گو میر انشا کی سی روانی اور شوخی بدرجہا مصحفی کے عام کلام میں نہیں ہے۔ مگر مصحفی سے ملک کو فیض زیادہ پہنچا۔ جس شاخ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اِس چمن کے باغبان جناب مصحفی ہی تو ہیں۔ دیکھئے اُن کے شاگردوں میں ضمیر۔ خلیق۔ آتش۔ اسیر۔ شہیدی کیسے کیسے کامل ہوئے۔ ضمیر و خلیق کے یادگار شاگرد (روشن ضمیر و خلیق) مرزا دبیر و میر انیس ہیں۔ جو ایک ایک شاعر ہزاروں کے برابر ہے۔ اور اسیر مرحوم کے فیض یافتہ بھی بڑے بڑے کامل شاعر ہوئے۔ جن میں سے جناب منشی امیر مینائی مشہور عالم ہیں۔ کیا دبیرؒ کا یہ فیض قابل یاد و تعریف نہیں ہے۔ کہ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم سے اکمل شعرا دبیر مرحوم کے خوشہ چیں ہیں۔ یعنی مرثیہ میں شاگرد ہونے کا فخر بار بار اپنے دیوان اور لاجواب مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں۔ اسی طرح حکیم[1] قدیر الدولہ قدیر۔ مشیر[2] مرحوم۔ حاجی[3] حکیم عظیم مغفور۔ مولوی[4] ظفر مہدی صاحب مہدی۔ منشی[5] فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی خان بہادر۔ میر[6] علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی دام ظلہ و جانشین[7] حضرت دبیر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ العالی بلا واسطہ شاگردوں[2] میں اور جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے مرزا تخلص۔ اور جناب نواب بنے صاحب مشتاق مرحوم اور نواب مظفر علی خاں صاحب کوثر [illegible]

[2] تاج العلما سید علی محمد صاحب مجتہد طاب ثراہ و مولوی میر سید علی صاحب محدث مقبول تھا صاحب مجالس علویہ بھی مرزا مرحوم کے [illegible] میں قابل ذکر و فخر ہیں۔ انکی نظمیں بہت کم ہیں مگر نثر میں ان جناب نے دریا بہائے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے تاج العلما [illegible] نے عموماً اردو میں لاجواب کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان کی لاجواب کتاب چودھویں رات کا چاند۔ ورنعرۂ داؤدی ان کے کمال پر شاہد عادل ہیں ان کو زبان اردو کا سرپرست و مربی کہنا بالکل درست ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[1] مثلاً مداح آل محمد مرزا کاظم حسین صاحب محشر جناب نفیس مرحوم کی لائف لکھ رہے ہیں۔ پس وہ خاندان جناب میر صاحب کے تمام شعرائے اہل بیت کا ذکر خیر فرمائیں + ۱۲ مؤلف۔

میر امیر حسین صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن و میر فراست حسین صاحب فراست و میر یونس حسین صاحب یونس زید پوری و میر طالب حسین صاحب طالب بالواسطہ شاگردوں میں کیسے کیسے کامل ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ دبیر مرحوم سے اور کچھ فیض و فائدہ ملک کو نہیں پہنچا (حالانکہ ایسا مان فرض محال ہے)۔ تو ایک یہی فیض تلمذ کیا کم ہے۔ اگرچہ اعتراض ہے کہ کسی لائف لکھنے والے نے ایسے شاگردوں کے حالات نہیں لکھے تھے۔ تو سمجھئے آپ اس کا موجد مان لیں +

المختصر یہ مطول کتاب پانچ برس کی ایسی محنت کے بعد خدا کی مدد سے طیار ہوئی۔ کہ میں اکثر دن میں تو سات آٹھ گھنٹے تک کچہری کا کام کرتا تھا۔ پھر گھر پر آکر اکثر ضروری و غیر ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس کتاب کی ترتیب و تحریر میں مشغول رہتا تھا۔ اس درمیان میں بعض راتیں مجھ پر ایسی گذریں۔ کہ گویا پلک سے پلک [illegible] میں تھا اور حیاتِ دبیرؔ چنانچہ یہ میرے دو شعر گویا میری اسی حالت کی تصویر ہیں۔ ؎

دلسوزی [illegible] سے اور اک خدا کی ذات | خلوت میں دیکھتا ہوں تجلی کائنات
[illegible] ہوں [illegible] کا دھیان بھی | ستائے میں زمیں کبھی ہے آسمان کبھی

اس کی ترتیب و تالیف سے پہلے ہر سال ایک مرثیہ دو ڈھائی سو بند کا میں کر لیتا تھا۔ اس پانچ برس کے پانچ مرثیے بھی چمن پاک کے مقبول مداح (حضرت دبیرؔ) کی لائف کے نذر کئے +

یہ سب محنت میں نے اس واسطے کی۔ کہ میں اس کام کو ایک فرض انسانی سمجھتا تھا۔ ملک یا قوم یا کسی فرقے پر میں نے احسان نہیں کیا۔ اس لئے صاف صاف عرض کرتا ہوں۔ کہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ؎

مجھ کو شکریہ کی خواہش نہ جزا کی خواہش | شکر صد شکر نہیں دل میں عطا کی خواہش

جلد اول بہت طولانی ہو گئی تھی۔ اس لئے شاگردوں کے حالات اور نمونہ کلام کو جلد ثانی میں شامل کر دیا ہے +

یہ کتاب عالی جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کی مدد سے مرتب ہوئی ہے۔ اور جناب ممدوح نے مہینوں اپنا قیمتی وقت اس کے فراہمی مضامین اور سننے اور خط و مضمون لکھنے میں صرف فرمایا ہے جس کے شکریہ سے میں قاصر ہوں۔ میرے آقا جناب

امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اَلثَّنَاءُ بِاَکْثَرَ مِنَ الْاِسْتِحْقَاقِ مَلَقٌ وَالتَّقْصِیْرُ عَنِ الْاِسْتِحْقَاقِ عِیٌّ اَوْ حَسَدٌ۔ (یعنی) کسی کی مدح و ثنا اس کے حق سے زیادہ کرنا چاپلوسی ہے اور کمی کرنا عجز و حسد ہے۔ پس میں جناب موصوف کی مدح میں تقصیر کا معترف ہوں۔ مگر یہ کمی محض میری عاجزی کی وجہ سے ہے۔ حسد سے نہیں ہے۔ میں نے اس ادائے شکریہ میں اس کتاب کو جناب ممدوح کے نام نامی پر معنون کیا۔

طبع کتاب۔ اب چھپوانیکی فکر ہوئی۔ اس زمانے میں جس طرح مفلس آدمی علم نہیں پڑھ سکتا (کہ اسکول کالج کے مصارف بہت ہیں)۔ اسی طرح کتاب بھی شائع نہیں کرسکتا۔ انہیں (علم دوست) جناب ممدوح نے بسخاوت و تحریک فرمائی۔ کہ چند رئیس مل کر اس کتاب کو چھپوا دیں۔ اور خود وہ چھ سو روپیہ اپنے پاس سے لگانے پر بھی آمادہ ہوئے۔ اور جناب نواب مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالندھر نے اپنی دریادلی سے دو سو روپیہ اور جناب سید امیر حسن صاحب فروغ وکیل ہائیکورٹ ریاست حیدرآباد دکن نے سو روپیہ سے کم رقم شریک کرنا چاہی۔ مگر میں نے سوچا۔ کہ کتاب بڑی ہے۔ اس طرح تین چار سو جلدیں چھپ کر نذر احباب ہو جائینگی۔ ملک میں کمالات دبیرؔ سے عام و خاص کو آگاہ کرنے کی جو ضرورت ہے۔ وہ پوری نہ ہوگی۔ کسی تاجر کے ذریعہ سے چھپوا دُوں۔ اُدھر لاہور میں جناب مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب نے مجھے خط لکھکر خواہش ظاہر کی۔ اور اس کے عمدہ و صحیح چھپوانے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ارزاں (کہیں ارزاں بعلت نہ سمجھئیگا) بیچنے کا وعدہ فرمایا۔ اس لئے یہ کتاب ایک مرتبہ چھپوانے کے لئے چند شرائط پر اُن کو دی گئی +

زمانے کی رفتار

یہ بات بھی کہنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ جناب مرزا دبیر مرحوم اپنے زمانے میں یکتا اور تمام شعراء معاصرین سے افضل (شاعر و مرثیہ گو) ملک میں مانے جاتے تھے۔ اور اس کے ماننے والے عوام الناس ہی نہ تھے۔ بلکہ اکثر اہل کمال کا اس پر اتفاق تھا۔ غالب دہلوی جیسے کامل کا قول تذکرہ جلوہ خضر و سرور دیباچہ سے میں اسی کتاب میں نقل کرچکا ہوں۔ کہ مرثیہ کہنا دبیر کا حق ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔ واقعات انیس عرصے سے بھی ایسا ہی خیال

اُس زمانے کے اہل علم کا پایا جاتا ہے۔ اور جو تقریظ دکن ریویو کے پرچہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں ایک صاحب نے مرزا مرحوم کے ایک مرثیے پر چھپوائی ہے۔ اُس میں بھی وہ صاف لکھتے ہیں۔ کہ "اپنے زمانے میں جناب مرزا صاحب سب سے بہترین شاعر تصوّر کئے گئے۔ اور بڑے بڑوں نے اُس وقت اُن کے کلام کے آگے سر ڈال دیا" بایں ہمہ اب زمانے کی رفتار کو دیکھئے۔ کہ یہی مقرّظ صاحب خیال فرماتے ہیں۔ کہ گویا مرزا صاحب مرحوم مرثیہ کہنا ہی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اسی ریویو (تقریظ) میں کچھ جا بجا اظہار نقائص (جو اکثر غلطی کتابت طبع کے ہیں) فرمانے کے بعد کہ یہ مصرع اُن مرحوم کا ع "تائید غیب کے ہیں نمونے یہ مرثیے" لکھکر لکھتے ہیں۔ کہ "مرثیہ کی جگہ مسدس فرماتے۔ تو کسی کو (کلام در) عذر نہ ہوتا" اور پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ "یہ اُسی فیّاض گھر (اہل بیت پیغمبر خدا صلعم) کا صدقہ[ف] ہے۔ کہ اِس وقت بھی اُنکی نظم کے متعلق ایک طرف تو یہ فرمایا جاتا ہے۔ کہ "میر (انیس) صاحب کو سب سے بڑا شاعر مان لینے پر کبھی اگر کوئی مرثیہ گو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ تو وہ مرزا دبیر ہی ہو سکتے ہیں" اور دوسری طرف باوجود اس کے کہ ہم نہ اُن کی شاعری کو تسلیم کرتے (ہیں) نہ اُن کے مسدسوں کو مرثیہ کا اعلیٰ خطاب دے سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا بہت کچھ ادب و لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے (ہیں) اور ایک نیک دل شریف النفس

[ف] میں کہتا ہوں کہ بیشک یہ صدقہ تو اُسی فیاض گھر کا ہے کہ اہل بیت اطہار جس طرح فیاض ہوئے اُس طرح عادل بھی ہیں مرزا مرحوم نے جس طرح یہ کی [illegible] بھی ویسا ہی اُن حضرات کے صدقہ عطا فرمایا کہ بڑے بڑے کاملوں نے اُن کی تیغ زبان کا لوہا مانا اور بقول مقرظ صاحب "سر ڈال دیا" باقی رہ [illegible] مدّاحوں کو اتنا صلہ ملا جتنی اُن کی محنت تھی۔ کہ یہی عادل کے در سے کوئی محروم نہیں جاتا + ۱۲ مؤلف حقیر

[ف] اس موقع پر مخدومی خان بہادر سید علی محمد صاحب قبلہ شاد عظیم آبادی کے خط مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کے چند فقرے لکھنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) "بلا شبہ یہ کہا آپ نے بہت اچھا کیا۔ کہ جتنے نکتہ دان جناب مرزا دبیر مغفور کی سوانح عمری لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا مجھکو یقین ہے کہ آپ خوب لکھینگے اور تعصب سے بچینگے" (۲) "میں جناب مرزا دبیر مغفور کی خدمت میں حاضر رہا ہوں۔ لکھنؤ میں جناب مرحوم کا مہمان رہا ہوں [illegible] جناب مرزا صاحب سے ایک مرثیہ اور ایک فارسی مثنوی [illegible] میں اُن کو اپنا اور مرثیہ گوئی میں استاد جانتا ہوں" (۳) "خود جناب مرزا صاحب دبیر کہتے تھے کہ میر انیس کا [illegible] لیکن ساتھ ہی [illegible] استادی کے مرزا صاحب میر [illegible] اعتبار کرکے میرے بزرگ اور کامل الفن [illegible] مومن کامل

الشان ماننے کے ساتھ اُن کی پُرگوئی کے معترف بھی ہیں۔ والسلام"۔ اب مَیں کہتا ہوں۔ اور بقول منشیہ مرحوم ع "ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کچھ مجھکو ڈر نہیں" کہ اگر مرزا دبیر ہی مرثیہ گو نہ تھے۔ تو پھر ہندوستان بھر میں اُن کے زمانے میں کوئی صاحب مرثیہ گو نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اصل مرثیت (بزم) میں اور بزرگوار مرزا مرحوم کو نہیں پہنچتے۔ اور جناب معترض اسی (مرثیت) میں اُن کو ناقص خیال فرماتے ہیں۔ اس موقع پر ایک لطیفہ و واقعہ شیخ الرئیس بوعلی سینا (حکیم کامل) کا یاد آگیا۔ شیخ کو کسی شخص نے کہ دیا تھا۔ کہ وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔ اُس کے جواب میں شیخ نے یہ رباعی کہی۔ ؎ لطیفہ

کفر چو منی گزاف آساں نبود — محکم تر از ایمان من ایماں نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر — پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

مرزا صاحب کی قبولیت کے باب میں دہلوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا یہ قول لکھ دینا چاہتا ہوں (کہ جو اُنہوں نے اپنے مقدمہ دیوان کے صفحہ ۵ پر زیب قلم فرمایا ہے) "(لارڈ بائرن کی طرح) لکھنؤ میں میرانیس اور مرزا دبیر نے بھی تقریبًا ایسی ہی قبولیت حاصل کی تھی۔ جو لوگ میرانیس کو پسند کرتے تھے۔ وہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جہاں تک ہو سکتا تھا میرانیس کی تقلید کرتے تھے۔ اور جو فریق مرزا دبیر کا طرفدار تھا۔ وہ ہر ایک بات میں اُن کی پیروی کرتا تھا۔ مگر لارڈ بائرن اور اُن دونوں صاحبوں کی قبولیت میں اتنا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸) تھے میں نے کی مخالفت کیونکر کرتا اور کس منہ سے کرسکتا ہوں۔ ہاں ۳۵ برس ہوئے کہ جناب مرزا صاحب کے بعض ناواں دوستوں نے کچھ ایسا پریشان کر دیا کہ جوش جوانی میں مَیں از خود رفتہ ہوگیا۔ تو وطن میں بعض بیکار کی میرے قلم سے ایسے نکلے کہ میں شرمندہ ہوں اور اُنکی روح پر فتوح سے معافی کا خواستگار۔ اُس کے بعد آج تک جانتا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایۃً خواہ صراحتاً نکلا ہو۔ خدا جانے مرزا اوج صاحب کو کس نے کہدیا کہ دکن ریویو میں میرا ایسا تحریر نکلی ہے۔ چنانچہ مَیں نے خود آن سے پوچھا اور اُنکی تسکین کر دی۔ اور حق یوں ہے۔ کہ مجھے کچھ بھی واقف نہیں کہ یہ تحریر کس نے اور کب چھپیں"۔ (۴) "مولوی شبلی (صاحب) کے موازنہ میں بھی علمی غلطیاں اور مرزا صاحب کی شان میں سخت زبانیاں بے انتہا ہیں۔ میں نے خود مولوی شبلی (صاحب) کے روبرو اُنکو متنبہ کیا لیکن میرا گمان چشمہ ہے۔ یہ ہے حقیقت حال جسکو مَیں نے بلا کم و کاست آپکی خدمت میں عرض کر دیا"۔ یہ چند فقرے اس غرض سے ہیں نے لکھ دئیے ہیں۔ کہ بعض مرزا صاحب مرحوم کے متعلق جناب شاد مد ظلہ کے اشارے سے ایسی تقریظیں نکلی سمجھی جاتی ہیں۔ عالم کہ اُن کا دامن کمال ایسے عیبوں سے پاک ہے ۱۲ مؤلف حقیر

فرق ہے۔ کہ لارڈ بائرن کی عظمت اہل انگلستان کے دل میں صرف اس وجہ سے تھی۔ کہ وہ اُس کو اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے اُس کو یکساں عزیز رکھتے تھے۔ بخلاف اس کے دبیر کے کہ اُن کی عظمت محض ایک مذہبی شاعر ہونیکی وجہ سے تھی۔ اور یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری ... گی جس کی ایک فرقے کے دل میں تھی۔ ویسی عام طور پر دوسرے فرقے کے دل میں نہ تھی۔ یہ امتیاز یعنی قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے" یہ ارشاد جناب حالی کا ایک حد تک درست ہے۔ مگر میں اس میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ابتدا میں حضرت مرزا دبیر کی اور بعد جب جناب میر انیس کی شہرت ہوئی۔ تو اُن کی بھی عظمت تمام اہل علم کے دل میں تھی (خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں)۔ لکھنؤ میں اُن کی عظمت سنی۔ اور ہندو اہل علم بھی اسی طرح کرتے تھے جیسے شیعہ۔ اور محض مذہبی شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اخلاق حسنہ کا نمونہ بھی اُن کو جانتے تھے۔ میرے علم و خیال میں پہلے تعصب کا اتنا زور بھی نہ تھا (جتنا اب ہے)۔ چنانچہ مرزا صاحب کے شاگردوں میں بھی بعض روشن خیال سنت و جماعت و صوفی حضرات اور بعض ذی علم کائستھ کشمیری پنڈت۔ کھتری وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ارشاد جناب ممدوح کا کہ "یہ امتیاز قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے" صحیح ہے۔ اور میں کہتا ہوں۔ کہ جوں جوں روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کے آپس کے میل جول میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ تعصب بڑھتا جاتا ہے۔ تجربہ اس کا شاہد ہے۔ مگر علوم جدیدہ کا اس میں قصور نہیں ہے۔ ہمارا ہی قصور ہے۔ علم کا قصور ہوتا۔ تو یورپ میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ ہمارا مٹانے والا ایک مذہبی تعصب ہی نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی اُس کے کئی سگے سوتیلے (زبردست) بھائی ہیں۔ جن کے نام قومی تعصب۔ مقامی تعصب۔ خیالی تعصب وغیرہ وغیرہ ہیں +

قومی۔ مقامی خیالی تعصب

ایک صاحب علم مسلمان جن کو سخن فہمی کا دعویٰ ہے۔ گلزار نسیم ایسی شاداب و مرصع مثنوی کی اس لئے تعریف نہیں فرماتے۔ کہ وہ ایک ہندو کی تصنیف ہے۔ یا ایک دہلی کا باشندہ یا مقلد ہی

٭ اس باب میں جو رائے عالی جناب مسٹر ہیرالال صاحب شید اکبرآبادی دام اقبالہ کی اُن کا شکریہ میں ہے ... عنایت فرمائی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

میں اس لئے عیب نکالتا ہے۔ کہ وہ ایک لکھنؤ والے کی مثنوی ہے۔ یا ایک دہلی کے طرز تغزل کا دلدادہ عالم و شاعر جہاں عاشقانہ رنگ غزل کی پسندیدگی بیان کرتا ہے۔ وہاں شعرائے دہلی کے ساتھ ایک بھی لکھنوی شاعر کا۔ یہاں تک کہ حضرت آتش مرحوم کا (جن کے کلام میں بقول حضرت غالب مرحوم بیشتر نیز نشتر ہیں) جناب مومن دہلوی و جناب غالب کے ساتھ نام نہیں لیتا۔ اسی طرح ایک عالم شاعر اشعار کی خوبیاں بیان فرماتے چھانٹ چھانٹ کر دہلی والوں کے اشعار نظیر میں تحریر فرماتے ہیں۔ اور اگر دو ایک کوئی شعر کسی لکھنؤ کے شاعر کا بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب شعر کی برائیاں نمایاں کرکے (برے اشعار) نظیر میں پیش کرتے ہیں تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اکثر اشعار شعرائے لکھنؤ کے زیب قلم فرماتے ہیں۔ اور ایک دو شعر کسی دہلوی شاعر کے بھی مصلحتاً ملا دیتے ہیں جس شخص کو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ یا اس کے بزرگ دہلی کے تھے۔ اسکو اپنا باعث فخر سمجھ کر طرح طرح سے بڑھاتے ہیں۔ اور جسکو غیر سمجھتے ہیں اسکو گھٹانے کی کوشش فرماتے ہیں +

اسی طرح ایک لکھنؤ والا دہلی والوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ ایک شیعہ سخن سنج ایک سُنّی شاعر کی (کمال کی) اس لئے تردید کرتا ہے۔ اور اُس کے کمال کو مٹانا چاہتا ہے کہ وہ سُنّی ہے۔ اسی طرح ایک سُنّی سخن فہم شیعہ شاعر کی تنقیص (شیعہ ہونے کی وجہ سے) کرتا ہے +

ایک شخص نے جو ایک شاعر کو اکمل سمجھ لیا ہے۔ تو اب وہ اُس کے مدمقابل و معاصر شاعر کے کلام کو دیکھتا ہی نہیں۔ حالانکہ جس رنگ خاص کی وجہ سے شاعر اول الذکر کو اُس نے پسند کیا ہے۔ اُس رنگ کے اشعار بھی اُس کے مدمقابل کے یہاں موجود ہیں[1] +

---

[1] اس زمانے کے بعض اہل علم ایک کم علم شاعر کو ذی علم شاعر پر کھلم کھلا ترجیح دیتے ہیں۔ اُنکی دلیل یہ ہے کہ بڑے بڑے شاعر اکثر کم علم ہوئے ہیں شاعری فطری شے ہے علم کی محتاج نہیں ثبوت میں شکسپیر کو پیش کرتے ہیں۔ مگر اُنکو شاید علم نہیں کہ جو ڈرامہ اور ناول شکسپیر سے منسوب ہیں اُنکی نسبت خود اعلیٰ طبقہ اہل یورپ کی یہ رائے ہے کہ وہ شکسپیر کے نہیں ہیں۔ بلکہ لارڈ بیکن کے ہیں جو اُنھوں نے شکسپیر کے نام سے شائع کئے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ لارڈ بیکن کو جن کے علم و فضل کی ایک عالم میں دھوم تھی۔ اطمینان کُلّی نہ تھا۔ کہ پبلک اُن ڈراموں کے انداز کو پسند کریگی اور اُس اعلےٰ نظر سے دیکھیگی۔ کہ جو ایک عالم جیّد کی تصنیف کیلئے

مختصر یہ کہ آج کل اردو شاعری کے سمندر میں عجب طوفان برپا ہے۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے کلام کی بھی بعض بعض بزرگ اب ایسے ایسے خیالات و وجوہ سے قدر نہیں کرتے[۲] اور اُن کے حالات و کلام سے بھی اکثر ناواقف ہیں۔ تماشا یہ ہے۔ کہ ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں۔ کہ جن کے بزرگ مرزا صاحب کے فدائی یا شاگرد تھے۔ اب یہ مرزا کے مٹانے یا گھٹاتے یا کم سے کم منبر کمال پر ایک زینہ نیچے بٹھانے کی کوشش میں ہیں +

اگر بلا تعصب کسی شخص کی یہ رائے ہے۔ کہ وہ اس اس بات میں اپنے کسی معاصر سے کم تھے۔ تو مضائقہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اصناف سخن میں ایک شاعر کا کمزور ہونا اور بعض میں دوسرے کا ممکن ہے۔ جناب امیرؑ سے کسی نے سوال کیا۔ کہ سب سے بڑھا ہوا شاعر کون ہے۔ فرمایا[۳] چوگان بازی کے گھوڑوں کی ایک ہی دستہ کی طرح جماعت شعرا نہیں چلتی ہے۔ تاکہ چوگان لے جانے کے وقت ان کا اعلےٰ درجہ پہچان لیا جائے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵ نمبر ۱) ضروری ہے۔ لارڈ بیکن نے اپنے ایک خط میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام اصناف سخن میں میرا کلام ہے۔ وہ اصحاب جن کو علمی تحقیقات کا شوق ہے۔ اس مناظرے کے متعلق لٹریچر کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایسے اہل علم خیال نہیں فرماتے۔ کہ جب شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ اور قدرت جب ایک ایسے شخص کو یہ نعمت بخشے۔ جو پڑھا ہو کر عالم بھی ہو۔ تو کیا قدرت و نعمت اُس شخص سے اس جرم میں چھین لیگی کہ تو عالم ہے۔ جو لوگ فطرتی شاعر ہیں اور فاضل جید بھی۔ تو اُن کی شاعری پر علم سے صیقل ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ جن کو قدرت شاعر پیدا کرتی ہے۔ وہ بے علمی کی وجہ سے دُنیا کو اپنے خداداد فیض سے بہرہ مند نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ کے مشہور شاعر گرے نے ایک دیہاتی قبرستان کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے۔ کہ اس میں بہت ایسے کامل گڑے ہوئے ہیں۔ جن کو موقع ملتا۔ تو ملٹن اور کرامل کی طرح مشہور ہوتے۔ ایسے اصحاب ملک الشعرا انگلینڈ لارڈ ٹینیسن اور ملٹن اور کالی داس (شاعر حکیم ہند) کو کیوں بھول جاتے ہیں جو فطری شاعر اور عالم متبحر تھے۔ یہی حال مرزا دبیر مرحوم کا بھی ہے۔ کہ وہ فطری شاعر اور عالم علوم معقول و منقول تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ع۲ علم و فضل جو آدمی کیواسطے باعث فخر ہے وہ دبیر کیلئے ایسے جہالت پرستوں نے عیب قرار دیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ع۳ اصل عبارت نہج البلاغہ صفحہ ۵۲ مطبوعہ مصر۔ سُئِلَ عَنْ اَشْعَرِ الشُّعَرَاءِ فَقَالَ ؑ۔ اِنَّ الْقَوْمَ لَمْ یَجْرُوْا فِیْ حَلْبَۃٍ تُعْرَفُ الْغَایَۃُ عِنْدَ قَصَبَتِہَا۔ فَاِنْ کَانَ وَلَا بُدَّ فَالْمَلِکُ الضِّلِّیْلُ۔ یُرِیْدُ اِمْرَءَ الْقَیْسِ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(مطلب یہ ہے۔ کہ ہر ایک کا رنگ جُدا روش جُدا ہے۔ پھر کیونکر کسی ایک ہی کو ہمہ وجوہ کامل کہا جا سکے) ہاں اگر ترجیح دینا ہی ضرور ہے۔ تو بادشاہ گمراہ (امراء القیس) کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ وہ اکثر رنگوں میں اچھا کہتا ہے +

بعض بزرگوار جہاں اُن کے اور معاصرین اہلِ کمال کا ذکرِ خیر فرماتے ہیں۔ وہاں مرزا مرحوم کا نام بھی نہیں لیتے۔ واقعی مرزا نے ایسا ہی قصور بلکہ جُرم کیا ہے شیخ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

کس نیاموخت علم تیر از من : کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

مَیں کسی کا نام نہ لونگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کا مَیں نے بیان کیا ہے۔ وہ اکثر ملک کے فیض رساں اہلِ قلم سمجھے جاتے ہیں۔ اور اُن سے خلائق کو فیض پہنچا ہے۔ اور انشاء اللہ اور بھی فائدہ پہنچیگا۔ اِن میں بعض میرے بزرگوں کے ملنے والے اور اُن کے کمال کے معترف و مدّاح بھی بدرجہ کمال ہیں۔ اور مَیں نے باوصف اختلاف رائے کے ایسے کاملوں کو بہت ادب سے یاد کیا ہے۔ اور اُنکی سخن فہمی و کمال کی مدح کی ہے۔ اور یہی میرا شیوہ ہے۔ اور میرے نزدیک اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کامل کی تنقیص کرنا اچھا نہیں ہے۔ بایں ہمہ (۲) جہاں ایسے ایسے بزرگوار ہیں۔ وہیں ملک میں ایسے عالی دماغ اہلِ علم بھی ہیں۔ جن کے واسطے کوئی تعصب (مذہبی۔ قومی۔ خیالی۔ مقامی) سنگ راہ نہیں ہے۔ وہ یہ کہکر کہ ع "متاعِ نیک ہر دکّان کہ باشد" دل سے اچھے مال کے گاہک اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ* کے عامل ہیں۔ اور اس ارشادِ فیض بنیاد جناب امیرؑ پر (فَانْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَ لَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ۔ یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے) پورا پورا عمل کرتے ہیں۔ ایسے ہی سخن فہموں سے قدر و انصاف کی زیادہ امید ہے۔ (۳) تیسرا وہ گروہ سخن سنجوں کا ہے۔ جو آج بھی مرزا صاحب کو تمام ملک یا اُن کے تمام معاصرین سے بہتر سمجھتا ہے۔ اور اپنے دعوے کی تائید میں مرزا مرحوم کا ہر رنگ میں کلام پیش کرتا ہے۔ جس کو دیکھ کر سامعِ منصف کو کمالاتِ دبیر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر ایک نقل یاد آگئی۔ مرزا احمد صاحب طالب مغفور مجھ سے ناقل تھے۔ کہ ایک روز بہر رئیس لکھنؤ جناب نواب آغا علی خاں عرف آغائی صاحب مرحوم کی صحبت میں حاضر تھا۔ کہ ایک رئیس لکھنؤ جناب میر انیس صاحب کے فدائی تشریف لائے۔ جو مرزا مرحوم کا کلام سُننا گویا گناہ اخلاقی سمجھتے

حکایت

* جو صاف ہو وہ لے لے - جو خراب ہو - اسے چھوڑ دے + ۱۲ مؤلف حقیر

سنتے تھے۔ آغائی صاحب مرزا مرحوم کے فدائی اور اُن کے کلام کے دل سے شیدا تھے۔ اُن رئیس نے باتوں باتوں میں جہاں میر صاحب مرحوم کے کلام کی اور تعریف کی۔ وہیں یہ بھی فرمایا۔ کہ میر صاحب کا ہر شعر دُوسروں سے ممتاز ہے۔ ویسا فصیح و سلیس کلام دُوسرا کوئی شاعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ ایسے بیش بہا جواہر ہیں۔ جو تمام دُنیا کے جواہرات سے اعلیٰ و ارفع نظر آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آغائی صاحب کسی ضرورت سے اندر کے درجہ میں اُٹھ کر گئے۔ مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ مَیں بھی وہیں پہنچا۔ تنہائی میں فرمایا۔ کہ یہ بزرگوار بڑی شیخی بگھارتے ہیں۔ کہ مَیں میر صاحب کے کلام کو پرکھتا ہُوں۔ مَیں ابھی تم سے فرمائش کرونگا۔ کہ میر صاحب کا کچھ کلام پڑھو۔ تم کسی مرزا صاحب کے مرثیہ کے سلیس و فصیح و عام فہم چند بند پڑھ دینا۔ دیکھوں ان کا دعوےٰ کہاں تک قابلِ قبول ہے۔ مَیں نے کہا بہت بہتر۔ پھر وہ بھی آکر مجمع مذکورہ میں بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ کے بعد مَیں بھی آبیٹھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ناظم صاحب بولے جناب نواب صاحب! اِمروز کچھ دعوت کرنا چاہتا ہُوں۔ فرمایا۔ کیا؟ میری طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ صاحب جناب میر صاحب کا کلام پڑھتے ہیں۔ اُن کے اکثر چوٹی کے بند انکو زبانی یاد ہیں۔ کہئے تو کچھ اُن کا کلام فصیح و لطیف سنواؤں۔ فرمایا۔ بسم اللہ ضرور پڑھوائیے نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ مَیں نے چند سلیس و فصیح بند پڑھے۔ وہ وجد کرنے لگے۔ بار بار فرماتے تھے۔ دیکھئے جناب ناظم صاحب! مَیں نہ کہتا تھا۔ یہ فصاحت یہ شیرینی کسی دُوسرے شاعر کے کلام میں کب ہے۔ اور خطا معاف۔ جناب مرزا صاحب گو مضمون آفرین ہیں۔ مگر یہ بات اُن میں کہاں۔ یہ بندش کی صفائی۔ یہ زبان کی لطافت۔ یہ حسن بیان انیس کا حصّہ ہے۔ ناظم صاحب بڑی دیر تک اُنکی لن ترانیاں چُپ چاپ سُنا کئے۔ آخر الامر جب وہ بہت تعریف فرما چکے۔ تو (آغائی صاحب) بولے۔ جناب نواب صاحب۔ دبیر جامع اصنافِ سخن ہے۔ اُس کے یہاں جہاں بلاغت و مضمون آفرینی کے ڈھیر لگے ہُوئے ہیں۔ وہیں ان باتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ ہر رنگ میں کہتا ہے۔ فرمایا۔ اچھا اب اُن کے بھی چند بند ایسے فصیح و سلیس سنوا دیجئے۔ تو مَیں مان لُونگا۔ آغائی صاحب ہنسے۔ اور فرمایا۔ کہ جناب یہ دبیر ہی کا فصیح و سلیس کلام تھا۔ آپ تو اُنکا کلام نہ دیکھتے ہیں نہ سُننا چاہتے ہیں۔ وہ بزرگوار جھینپ ہو گئے۔ پھر اور کچھ باتیں شروع ہو گئیں۔ خود مجھ کو بھی بعض ایسے سخن سنجوں سے کام پڑا ہے۔ مَیں نے دبیرؔ و انیسؔ کے مرثیوں سے بند چھانٹ چھانٹ کے ایک مرثیہ مرتّب کر لیا ہے۔ جس میں دو چار بند میر صاحب کے پھر دو ایک بند مرزا صاحب کے

لکھے ہیں۔ کہیں چار مصرع میر صاحب کے اور ٹیپ مرزا صاحب کی ہے۔ جب ایسے کوئی صاحب مل جاتے ہیں۔ اور ایک کے کلام سے رغبت اور دُوسرے سے نفرت ظاہر فرماتے ہیں۔ اور یہ دعوٰے کرتے ہیں۔ کہ ہم کسی ایک کے کلام کو خوب پرکھتا ہُوں۔ تو مَیں وہ مرثیہ پیش کر کے عرض کرتا ہُوں۔ بتائیے۔ یہ کس کا کلام ہے۔ اوّل تو اِسی میں اُن سے غلطی ہو جاتی ہے۔ کہ کسی ایک کا کلام (تمام مرثئے کو) بتا دیتے ہیں۔ پھر جب مَیں صاف کہہ دیتا ہُوں۔ کہ اس میں دونوں بزرگوں کے بند مخلوط ہیں۔ اب بتائیے۔ کونسا بند میر صاحب کا اور کونسا مرزا صاحب کا ہے۔ تو ایک کے بند کو دُوسرے کا بتا دیتے ہیں۔ بڑے بڑے مدّعیان سخن شناسی کی قلعی ایسے موقع پر کھل جاتی ہے +

اِس لکھنے سے میری یہ غرض نہیں ہے۔ کہ میر و مرزا کے کلام میں ما بہ الامتیاز الفاظ اور بندشیں نہیں ہیں۔ ہیں مگر خاص خاص۔ ایک مرثیہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ کر سخن شناس ضرور غور و فکر کے بعد پہچان لیگا۔ کہ یہ مرزا کا مرثیہ ہے یا میر کا۔ یا اور کسی کا۔ مگر نہ ہر ایک کا یہ کام ہے۔ نہ ہر بند و ہر بیت کی پہچان آسان ہے +

بعض دبیر و انیس کے ایسے فدائی بھی دیکھے گئے۔ کہ جبتک وہ مرثیہ سُنکر یہ سمجھتے رہے۔ کہ یہ ہمارے ممدوح (دبیر یا انیس) یا اُن کے خاندان کی تصنیف ہے مجلس میں تعریف کرتے رہے۔ اور جب کسی کے کہنے یا کسی قرینے سے یہ ثابت ہُوا۔ کہ دُوسرے خاندان کا یا دُوسرے بزرگوار کا کلام ہے۔ ایسے چُپ ہو گئے۔ کہ گویا تعصّب نے گلا گھونٹ دیا۔ ہر شخص کو خدا ایسے تعصّب سے بچائے۔ عجب رنگ چھایا ہُوا ہے۔ (المؤلفہ) ؎

ہر ایک رنگ کو ہم بار بار دیکھتے ہیں ۔۔۔ خزاں میں بھی تری شیدا بہار دیکھتے ہیں

اِس موقع پر یہ لکھنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ بعض انگریزی خوانوں کے خیالات ملک میں پھیلنے کی وجہ سے قلزم شاعری اردو میں اور بھی کئی طوفان آج کل اُٹھ رہے ہیں۔ جو غالباً موسم کی طرح شاعری کے رنگ کو کچھ نہ کچھ ضرور بدل دینگے۔ بعض حضرات تشبیہات و استعارات کو ہی معرّب شاعری فرماتے ہیں۔ بعض (مبالغہ کے ساتھ) مبالغہ مقبول کی بھی مذمّت کرتے ہیں۔ کچھ اہل علم ایسے بھی ہیں۔ جو تمام صنائع و بدائع کو (چاہے وہ کتنی ہی بیساختہ نظم ہوں) شاعری کے چہرے پر بدنما داغ دھبّے سمجھتے ہیں۔ بعض اس کو بدعت شاعری قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی شکایت ہے۔ کہ اردو کی شاعری جو ڈرامہ سے آج خالی نظر آتی ہے۔ اُس کے اسباب یہی

تشبیہات و صنائع و بدائع وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ حضرات یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں۔ کہ بھاشا میں ڈراما اعلیٰ درجہ کا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ کہ اگر ڈرامہ نویسی کو ان چیزوں نے (اردو میں) روکا۔ تو بھاشا میں کیوں نہیں یہ سنگ راہ ہوئیں۔ کیونکہ جس طرح اردو نے فارسی و عربی کا دودھ پی کر ہوش سنبھالا ہے۔ بھاشا سنسکرت کی گود میں پلی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ سنسکرت میں جس کثرت سے تشبیہات و استعارات و صنائع و بدائع و مبالغے ہیں۔ شاید کسی دوسری زبان میں ہوں۔ میں نے اس کتاب میں جابجا یہی ثابت کیا ہے کہ ان صنائع و بدائع و مبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جنکو کروڑوں آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں مثلاً بائبل شریف اور قرآن مجید اور وید۔ اور صنائع و بدائع کے باب میں جو جو آیت جس جس صنعت میں تھی۔ وہ بھی (اُس صنعت کی تعریف کے ساتھ) مختصر المعانی وغیرہ کتب معانی و بیان سے لکھتا چلا گیا ہوں۔ اگر بالفرض آج یہ چیزیں یورپ میں بُری سمجھی جاتی ہیں۔ تو کچھ پروا نہیں۔ ذرا صبر کیجئے۔ سنسکرت۔ عربی۔ فارسی وغیرہ کی کتابیں وہاں جب زیادہ ترجمہ ہو جائینگی۔ تو ممکن نہیں۔ کہ یورپ کو اپنے رنگ پر کچھ نہ کچھ نہ لے آئیں۔ پھر آئندہ وہاں بھی صنائع و بدائع وغیرہ کے مینہ برسینگے۔ یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ شاعر کا کام محض ڈرامہ لکھنا ہی نہیں ہے۔ اقسام سخن میں سے (ڈرامہ) بھی ایک قسم لطیف ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ اردو کی شاعری (ڈرامہ نویسی سے) زیادہ تر قافیہ و ردیف و دیگر قیود نظم کے سبب سے محروم ہے۔ تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔ بیشک بڑی بڑی ردیفیں اور مشکل قافئے کبھی کبھی بڑے بڑے شاعروں کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ اردو کے شاعروں نے قافیہ کو وہ وسعت بھی نہ دی، جو ایرانیوں تک نے بخشی تھی۔ مثلاً قریب المخرج حروف کا قافیہ یا ایسا قافیہ جیسا کہ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ ؎

کہ اے شاہ آفاق گستر بعدل — اگر من نماندم تو باقی بفضل

عدل فضل کا قافیہ اگر کوئی اردو کا شاعر باندھے (حالانکہ حرف روی لام ہے)۔ تو ہر شخص گردن دبانے کو موجود ہے۔ اگر ردیف نہ لائیں۔ تو سامعین اس شعر کو لنڈورا کہتے ہیں۔ حالانکہ ردیف جب تک بے تکلف نہ آ جائے۔ شاعر کو میری رائے میں ہرگز نہ لانا چاہئے۔ اس باب میں براہ راست عرب کی تقلید کرنا چاہئے۔ جہاں ردیف شعر میں نہیں ہوتی۔ اُونٹ پر دو برابر برابر بیٹھنے والوں کو (عرب) ردیف کہتے ہیں۔ مولوی خواجہ حالی مدظلہ العالی کے دیوان میں مجاز۔ نماز کے قافیوں میں شاذ کا قافیہ دیکھ کر میں اس قدر خوش ہوا۔ کہ

بیان نہیں کر سکتا۔ اسی ڈرامہ و ایپک پوئیم کی خاطر سے یورپین شعرا نے قافیہ کی قید سے بعض اقسام نظم کو آزاد کر دیا جس نظم کو بلینک ورس کہتے ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ اردو کا مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز نہیں ہے۔ جو ہم مرثیہ گو شاعر کو ڈرامہ کی قیود سے باہر ہوتا ہُوا دیکھکر یہ الزام دیں۔ کہ وہ ملک کی بد مذاقی یا اور کسی سبب سے بہک گیا۔ مرثیہ اردو تمام اصناف سخن کا جامع ہے۔ ایک ایسا خوشنما باغ ہے۔ جس میں گلاب بیوتی۔ کیوڑہ۔ جوہی چنبیلی۔ بیلہ۔ چاندنی۔ نیلوفر۔ لالہ وغیرہ وغیرہ کے بیشمار خوشبودار خوش رنگ پھول نظر آتے ہیں۔ اور خوش ذائقہ و خوشبودار پھل بھی موجود ہیں۔ مرثیہ میں کہیں غزل کی شان ہے کہیں قصیدے کی آن بان ہے۔ کہیں مثنوی کا تسلسل۔ کہیں ترکیب بند و ترجیع بند کی ایسی ترکیب ہے۔ کہیں کہیں ڈرامہ کا بھی لطف کسی واقعہ کے بیان میں آ جاتا ہے۔ یعنی ردیف۔ قافیہ وغیرہ وغیرہ کی قیدوں پر یہ شعرا اہلبیت کمال کرتے ہیں۔ کہ بعض جگہ ایسا سماں دکھا دیتے ہیں۔ کہ آنکھوں کو نہیں دل کو حیرت ہو جاتی ہے (جیسا کہ میں اوپر مفصل عرض کر چکا ہوں) + مرزا مرحوم کا کلام ہر رنگ میں ہے۔ اس لئے ایسے دلکش پھولوں کی بھی (اُن کے باغ نظم میں) کمی نہیں ہے۔ اُن کا کلام ڈرامٹک خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ آپ کو اس کے کچھ نمونے تو جلد اول حیات دبیر میں ملینگے۔ باقی اکثر جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیگا۔ جو لکھی ہُوئی رکھی ہے۔ فقط چھپنے کی دیر ہے۔ میں نے مرزا صاحب کا دقیق سے دقیق اور سلیس سے سلیس کلام اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ بعض صاحب جو یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا تمام کلام دقیق ہوتا ہے۔ یہ خیال اُنہیں لوگوں کا ہے۔ جنھوں نے سب کلام اُن کا نہیں دیکھا۔ بلاغت۔ فصاحت۔ سلاست۔ متانت سب مرزا مرحوم کے کلام میں اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔ جب وہ سلیس نظم کہنے پر آتے ہیں۔ تو پھر ایسا بے تکلف اور بیساختہ کلام موزوں فرماتے ہیں۔ کہ جس کو دیکھکر دُوسرے شاعر تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔ یہ تو اُس مرثئے کی شان تھی۔ جس کے موجد جناب میر ضمیر مرحوم اور مقلد اور اُس کو معراج کمال پر پہنچانے والے دبیرؔ و انیسؔ تھے۔ مگر فی زمانہ جہاں اور چیزوں میں تغیر ہُوا۔ مرثیہ گوئی نے بھی کچھ پلٹا کھایا ہے۔ کچھ تو علمائے اعلام کی ہدایتوں کا اثر ہُوا۔ کہ جنھوں نے زیادہ مضامین خیالی اور بے اصل روایتوں کے بیان کرنے کی سخت ممانعت فرمائی۔ کچھ علوم جدیدہ نے خلاف عقل و عادت مبالغوں کو روکا۔ اور اب بجائے اُس رعایت لفظی کے جو بھری ہوئی ہو مضامین عالی کی طرف

مرثیہ طراز جدید

زیادہ توجہ ہوئی۔ صنائع و بدائع بھی اب وہی زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ جو بے تکلف ہوں۔ اور بے تکلف صنائع و بدائع نظم کرنا ہر شاعر کا کام بھی نہیں ہے۔ اس لئے اب یہ چیزیں مرثیہ طرزِ جدید میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ حقیر بھی اپنی تصنیف (مرثئے) میں ان اکثر باتوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ گو میں کیا اور میرا کلام کیا+

اِس موقع پر یہ بھی عرض کردوں۔ کہ حضرت دبیر کا ایک فیضِ تلمذ یہ بھی ہے۔ کہ فی زمانا جن شعرائے اہلبیت نے مرثیہ کو خلعتِ تجدید بخشا۔ وہ بھی میرے علم میں مرزا صاحب کے شاگرد ہی ہیں۔ اور وہ بزرگوار حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے مرثیوں میں اصل روایات و واقعات نظم فرمائے۔ اور بجائے رعایتِ لفظی کے شوق میں الفاظ لانے کو مقدم نہیں سمجھا۔ جناب موصوف کے اشعار میں فلسفیانہ مضامین کے ساتھ عرب کی شاعری کی وہ شان نظر آتی ہے۔ جس کے خوشہ چین آج اہلِ یورپ بھی ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کی نئی شان سے (مرثیوں میں) مدح و ثنا اور بد اخلاقیوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ اہلبیت علیہم السلام کے درجاتِ عالیہ کا بھی قادر اپنے والد ماجد مرحوم کی طرح لحاظ رکھا ہے۔ بیجا مبالغوں سے کلام کو بہت بچایا ہے۔ اس طرف کے اکثر مرثیوں میں [illegible] ہیں۔ یہ زبان اردو میں انتہائی تمدن کا ثبوت ہے۔ ایک مرثیہ میں جہاں حضرت مسلم بن عقیل کے سفر کی تصویر کھینچی ہے۔ وہاں بالکل عرب کا وہ جنگل دکھا دیا ہے۔ جس میں کھجور کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو یہ بے مثل نظم ہے (یہ نہیں کہ باغ تو عرب کا دکھانا مقصود ہے۔ مگر کیتھول اس میں جوہی اور بیلے کے دکھائے ہیں۔ جس کا اس سرزمین پر نام بھی نہیں ہے)۔ اسی طرح سیکڑوں جدتیں فرمائی ہیں۔ جو اُن کے مرثیوں کے سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کمال یہ ہے۔ کہ ایسی ہی پابندیوں کے ساتھ دُنیا بھر کی اعلےٰ درجہ کی شاعری موجود ہے + (۲) جناب حکیم مولوی فقیر حسین صاحب عظیم مرحوم کے مرثیوں میں پابندیِ روایت کی اعلےٰ شان نظر آتی ہے + (۳) خان بہادر جناب مولوی سیّد علی محمد صاحب شاد (عظیم آبادی) مدظلہ نے (جن کو جناب مرزا صاحب مرحوم کی شاگردی پر فخر ہے۔ اور جنہوں نے باوصف کئی انقلابوں اور کئی دوستوں کی تحریک و ترغیب کے کسی دوسرے صاحبِ کمال کی شاگردی نہیں قبول کی۔ اور جو اِس حقیر کو ایک سرفرازنامہ حال میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مجھ کو میر کا انشس بالکل اصلاح نہیں دیتا۔ کہ میں فرماتا تھا [illegible] (مرزا صاحب مرحوم کی) شاگردی کی [illegible]

انہیں کا فیض ہے۔" ایک دوسرے سرفراز نامہ میں زیب قلم فرماتے ہیں۔ کہ "میں اب واقعی یہ چاہتا ہوں۔ کہ جناب مرزا صاحب مغفور کا خاک پا ہو کر کتاب میں جگہ پاؤں" (اپنے مرثیوں میں امور مذکورہ وغیرہ کی رعایت فرمائی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اس موقع پر کچھ اُن کی نظم و نثر لکھ دوں۔ جو حقیر کے اصرار بلیغ پر اُنہوں نے عنایت فرمائی ہے (مفصل حال اور مفصل کلام جناب ممدوح کا آپ دوسری جلد حیات دبیر میں ملاحظہ فرمائینگے۔ انشاءاللہ)

ماخوذ سرفراز نامہ جناب شاد مدظلہ مورخہ ۱۲۔ جنوری ۱۹۱۳ء سے

"میں ہرگز اس کا مدعی نہیں ہوں۔ کہ میرے مقابلہ میں کوئی نہیں ہے۔ لاحول ولا قوۃ الخ۔ بات یہ ہے کہ جو طرز مرثیہ گوئی کی میر ضمیر مغفور نے نکالی تھی۔ اُس کو مرزا دبیرؒ اور میر انیسؒ اوج کمال پر پہنچا گئے۔ غیر ممکن ہے۔ کہ کوئی اُس حد تک پہنچ سکے۔ سوا اس کے کہ وہی باتیں اندک تغیر کے ساتھ پھر نظم کی جائیں جن کو سنتے سنتے پرانے لوگ تو اُکتا گئے۔ اور نئے لوگ اصلیت کے جویا اور یورپ کا انداز شاعری پسند کرنیوالے کثرت سے پیدا ہونے لگے۔ اب وہ چبائے ہوئے اور اُگلے ہوئے نوالے کب پسند ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے اب نکتہ چین اور ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ صحیح روایتوں سے تجاوز نہ ہو۔ اور کربلا کے واقعہ کی اخلاقی حالت میں ذرا بھی فرق نہ آئے"

(۲) یہ جدت نہایت ہی مشکل ہے۔ برسوں چاہئیے۔ کہ فلسفہ کی مختلف کتابوں اور یورپ والوں کے انداز بیان پر غور کرے۔ مختلف مذاہب کی کتابوں پر نظر ہو۔ اور کیا کیا عرض کروں۔ کہ کتنی معلومات اور کتنے درائج ہیں۔ ان پر عبور پیدا کر لینا آسان تھوڑا ہی ہے۔ باوجود ان سب کے یہ دیکھنا۔ کہ یہ فلسفیانہ و اخلاقی مضامین اس طریقے سے ادا ہوں۔ کہ اردو زبان کی شاعری کا مذاق قائم رہے۔

(۳) غالباً شروع شروع لوگ نئے طریقے کو دیکھ کر سخت بھیانک ہونگے۔ مگر پٹنہ کے سمجھدار تو شاید ہی پُرانے انداز کو پسند کریں۔

(۴) بہر حال میرا تو اب زمانہ آخر ہو چکا۔ اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ کوتاہی نہیں کی۔ اب قوم جانے اور قوم کے با فہم جانیں۔ ع یاد آئیگی تمہیں میری وفا میرے بعد

(۵) مَیں نے ایک مرثیے میں حدود مرثیہ کو تمہید میں نظم کر کے پڑھا۔ جس کے بعض بند آپ کے سُننے اور کتاب میں داخل کرنے کے قابل ہیں۔ دُوسرے کاغذ پر لکھ کر حاضر کرتا ہُوں +

(۶) حسب عادت تین بجے شب کو اٹھا جلد جلد سب کاموں سے فارغ ہو کر صرف نماز صبح پر کفایت کی اور یہ سب بند اور یہ خط آپکو لکھا غنیمت ہے کہ مزاج درست ہے +

(۷) شائقین دُور و نزدیک سے خدا جانے کس قدر اصرار کرتے ہیں مگر بخدا میں ایک مصرع بھی کسی کو نہیں لکھتا۔ خدا جانے آپ نے کیا اعجاز کیا۔ کہ میں اس محنت پر قادر ہو رہا ہُوں* +

(۸) جلد اوّل حیات دبیرؔ میں جہاں آپ نئے طریقے کی مرثیہ گوئی کو تحریر فرمائیں ان کو ضرور داخل کریں ممکن ہے۔ کہ مرثیہ گویوں کو فائدہ پہنچے +

نظم جناب شاد مدظلہ

اے خضر شوق راہ حقیقت بتا مجھے ۔۔۔ منزل پہ جو پہنچ گئے اُن سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بُو سے وہ ساغر پلا مجھے ۔۔۔ جویا ہے جس کی رُوح وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقع صدق و صفا کہیں ۔۔۔ وہ مرثیہ سُنا۔ جسے سب مرحبا کہیں

باتیں ہوں اِس طرح کی جنھیں لے زباں پسند ۔۔۔ سُن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سُنا کئے ہیں جسے وہ کہاں۔ پسند ۔۔۔ اب اہل بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوق سخن میں ذائقہ طبع کھو نہ جائے ۔۔۔ اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے

یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام ۔۔۔ جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیت کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معانی کا انتظام ۔۔۔ نظروں میں ہوں تُلے ہُوئے سب موقع و مقام
تصنیف شعر کے لئے لازم شعور ہے ۔۔۔ تقلید بے محل سے کنارا ضرور ہے

بلاغت
روایت

* یہ سب جناب شاد مدظلہ کی محبت و عنایت ہے۔ ورنہ مَیں کیا میرا عرض کرنا کیا۔ اِس پیرانہ سالی میں یہ تکلیف شاقہ گوارا فرما کر کلام و حالات دیکر کتاب کی عزت بڑھائی ہے۔ جلد ثانی میں جناب ممدوح کے حالات و کلام پڑھ کر ناظرین بہت شاد ہونگے جناب شاد عجب باکمال شخص ہیں۔ خدا عمر میں برکت مع صحت عنایت فرمائے + مؤلف حقیر۔

شاعرانہ مبالغہ

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر
اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی ہنر
آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

مرثیت

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام
آسان سمجھ لیا ہے زمانے نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنعت میں داخل ہے لاکلام
لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مدِ نگاہ درد و غم جاں گزا رہے
گلدستۂ سخن نہ بنے ۔ مرثیہ ۔ رہے

مضامین والفاظ

مضموں نہ ہوں رکیک نہ الفاظ ہوں دقیق
تا ہو نہ جائے سنتے ہی سنتے ۔ دلوں کو ضیق
اعلیٰ ہو فکر شعر ۔ خیالات ہوں عمیق
لفظیں ہوں پُر اثر کہ دلوں کو کریں رقیق
مضموں وہ چُست ہو کہ مزہ صبح و شام دے
خلوت میں اک لئیق مصاحب کا کام دے

بہار

جب دشت ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار
مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار
بے آب خشک ہو گیا زہرا کا لالہ زار
بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار
باقی نہ جان تھی نہ لہو جسم زار میں
کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں*

ساقی نامہ

ہے یہ بیان واقعہ شاہ خاص و عام
جانے نہ پائے ہاتھ سے سر رشتۂ کلام
اِس ضمن میں شراب و لا کا گر آئے نام
بے جا کبھی نہ جام کے اوپر لنڈھائے جام
قطرے سے جو اس شراب کے ہوں خوں ناب ہوں
ساغر تو آنکھ میں ہو پہ آنکھیں پُرآب ہوں

اخلاقی مضامین و عامیانہ مضامین

ہے جن امور کا فن اخلاق میں جواز
ہے مرثیوں میں اُن مضمونوں کا فقط جواز
لازم ہے عامیانہ مضامیں سے احتراز
لفظوں کے ساتھ تا کہ ہوں سامع کے دل گداز
افسانہ مصائب شاہ زماں ہے یہ
اتنا رہے لحاظ کہ کس کا بیان ہے یہ

* حقیر کے خیال میں اگر خالی بہاریہ مرثیہ میں نظم ہو تو بیشک محل اعتراض ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ ساتھ مرثیت کے گوشے اور غم والم کے کنائے اشارے بھی ہوں تو پھر وہ بہار بہار مرثیت ہے۔ چنانچہ جو اہل سخن کی رائے ہو (حقیر نے جس مرثیہ میں بہار کہی ہے مرثیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا)۔ اور خود دیکھئے۔ تو خود اس بند حضرت شادؔ ۔ بلا میں مرثیت کی بہار ہے۔ عجب مؤثر بند ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس طرح سے ہو حال شہ کربلا رقم ۔ ماخوذ ہو صحیح روایت سے یک قلم
رکھے بہت سنبھال کے اس راہ میں قدم ۔ عاقل ذرا صراط سے سمجھے اسے نہ کم
تابع رہے خیال عقیدت نیوشش کے ۔ آئے فریب میں نہ طبیعت کے جوش کے

ظاہر ہر ایک شے کا ہے ایک ۔ ایک ہی بطون ۔ حاوی رہیں ہر اک پہ خیالات ذو فنون
سمجھے کہ ہم ہیں کوئی صداقت ہیں رہنموں ۔ لفاظیوں سے باطن شے کا کرے نہ خوں
جان آتی ہے کلام میں معنی نغز سے ۔ کس کام کا وہ پوست جو خالی ہو مغز سے

مضموں نہ آئیں وہ جو ہیں اخلاق سے بعید ۔ ہر طرح جن کی منع میں تاکید ہے شدید
یہ شاعری خزینۂ باطن کی ہے کلید ۔ لازم ہیں اس کی حفظ میں بھی کوششیں مزید
حقّا یہ کام اہل ریاضت کا کام ہے ۔ نا اہل کو تو ہاتھ لگانا حرام ہے

عشق حقیقی

شاعر کے دل میں عشق کا جب تک نہ ہو گذر ۔ ہے مثل سرو نخل ریاض اُس کا بے ثمر
اے عشق جلوہ گاہ ہے تیری بتا کدھر ۔ آنکھیں کہاں سے لاؤں جو آجائے تو نظر
حاصل جو سر میں کیف تو دل کو سرور ہو ۔ تو روشنی دکھا ۔ تو اندھیرا یہ دور ہو

یہ تو مرزا صاحب کی مقبولیت اور مرثیہ سابق وحال کی بحث تھی۔ اب اس لائف (سوانح عمری) کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بعض بزرگوار ایسے بھی ملے۔ جو سوانح عمری لکھنا ہی سو فرماتے ہیں۔ لکھنؤ میں مجھ سے ایک میرے دوست (شیعہ اور دبیریئے) نے فرمایا کہ تم نے پانچ برس تک ناحق حیات دبیر لکھنے میں اپنا وقت ضائع کیا۔ کیا مرزا صاحب کے کمالات کوئی انکار کر سکتا ہے۔ خود اُن کا کلام اُن کی لائف اور اُن کے کمالات کا مظہر و کاشف ہے۔ مَیں نے بجا و درست کہکر ٹال دیا۔ اسی طرح اور بھی چند شیعوں اور دبیریوں کو مَیں نے اپنی رائے کا مخالف پایا۔ مگر کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کی۔ اور یہی سمجھ لیا۔ کہ یہ بزرگ ابھی تک لائف کی ضرورت و نتائج سے بیخبر ہیں۔ اور اسی سبب سے اس کتاب میں مجھے ایسے روشن خیالوں سے بہت کم مدد ملی۔ مگر جہاں لکھنؤ میں ایسے ایسے حضرات (ضرورت زمانہ سے بیخبر) تھے۔ وہاں بعض ایسے علم دوست

بھی ہے جنہوں نے میری محنت کی قدر کی۔ حالات بتانے میں مدد دی۔ کلماتِ تحسین و آفرین سے میرا دل بڑھایا۔ اور علاوہ شیعوں کے بھی اکثر اہلِ سنت و جماعت و اہلِ ہنود (حامیانِ علم و کمال) نے بھی مدد دی جن میں سے مسٹر ہیرالال صاحب سب جج کوٹہ و منشی ہیرالال صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی جوڈیشل سکرٹری محکمۂ عالیہ خاص ریاست کوٹہ خاص طور پر قابلِ بیان ہیں۔ واقعی شکریہ ہیں۔ بعض میرے احباب نے میرے واسطے ایسی کتابیں مہیا فرمائیں جن کی اس کتاب کی تالیف میں بہت ضرورت تھی۔ ایسے قدردانوں میں جناب میر محمود حسن صاحب ثاقبؔ دہلوی مقیم و وکیل درجۂ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ خاص طور پر قابلِ مدح ہیں جن کے کتب خانہ سے بھی مجھے مدد ملی۔ اور جنہوں نے محض حیاتِ دبیر کی تالیف کے واسطے بہت سی کتابیں خود خرید فرما کے مجھے دیں۔ اُن کے بعد قابلِ ذکر جناب حکیم سید احمد حسن صاحب مقیم کوٹہ منیجر مطابق الشفا و طبیب ریاست سرموناہن و حکیم مولوی مظہر الہادی صاحب سہیلؔ امروہوی مقیم ملازم ریاست کوٹہ اور مولوی سید منظیر حسن صاحب نجاؔ دہلوی مشنری اسلام و فوٹوگرافر مقیم ریاست جے پور ہیں۔ میں ان تمام صاحبوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں +

یہ بات بھی افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں۔ کہ جہاں ایسے ایسے صاحبوں نے مدد دی۔ وہیں بعض اہلِ علم نے میرے متواتر خطوں کا جواب ہی نہیں دیا۔ اور بعض اظہارِ رائے سے بھی دریغ فرمایا۔ بعض صاحبوں نے جو حالات انکو زمانہ شاہی اودھ کے (مرزا صاحب کے متعلق) معلوم تھے۔ باوجود پوچھنے اور معروضہ کے نہ بتائے۔ بعض صاحبوں نے شاگردِ حضرت دبیر کے اپنے حالات دینے سے بھی بخل فرمایا۔ اور جو نظرِ عنایت پہلے سے فرماتے تھے۔ اُس میں بھی کمی کی +

بعض ہمارے ہم مشرب جو اِس تالیف کو بے ضرورت سمجھتے ہیں اُس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ اُنکو نعمت (کلامِ دبیر) مجالس میں اکثر حاصل ہوتی رہتی ہے۔ غالباً اس بنا پر وہ ایسی کتاب کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے بعض اہلِ علم سُنی اور ہندو اس کے مشتاق و قدر شناس زیادہ ہیں۔ اُسکی وجہ شاید یہ صحیح ہو کہ معروضات زمانہ سے واقف ہیں۔ اور اہلِ علم ہیں علم و کمال کی قدر کرتے ہیں۔ اور ایسے کلام سننے کا کم اتفاق ہوتا ہے + یہ بھی عرض کر دوں کہ شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے بیجا اعتراضوں اور الزاموں کے جواب بھی میں نے مہذب و مؤدب الفاظ میں دئے۔ اور انکی سخت کلامی کا جواب بھی سخت الفاظ میں حتی الامکان میں نے نہیں دیا۔ میں مولوی صاحب کی کتاب کی اور بعض مقامات کی بھی تردید کرتا مگر مجھے معلوم ہو گیا کہ دو مستقل کتابیں اور بھی اُنکی تردید میں اسی زمانے میں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک تو میرے استاد بھائی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوقؔ شہسوار جہاں پوری کی (المیزان) ہے۔ جو علی گڈھ میں چھپ رہی ہے۔ دوسری جناب سید

مولانا مولوی شبلی صاحب

ذوالفقار حسین خاں صاحب جو چودھری کی کتاب ہے۔ کہ وہ بھی شاید عنقریب چھپے[1]۔ پس میں نے سوچا۔ کہ ضروری ضروری جوابات مولوی صاحب کو میں نے دے دئے ہیں۔ جو صاحب اس سے زیادہ مشرح اور سب الزامات کے جوابات دیکھنا چاہینگے۔ وہ اُن کتابوں میں ملاحظہ فرمالینگے۔ اور ان دونوں صاحبوں کو مجھ سے زیادہ فرصت بھی ہے۔ اور لیاقت بھی ہے[52]۔

یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب کو میں نے اُن بیجا اعتراضوں کے بھی جواب دئے ہیں۔ جو انہوں نے میر صاحب پر۔ فرد کر اُن کے کمالات کو (جس کے وہ زبان سے معترف ہیں) مٹانا چاہا ہے۔ کیونکہ میں کمالات میر صاحب مرحوم کا بھی دل سے معترف ہوں۔ اور ہرگز اُن کی تنقیص بیجا کا روادار نہیں۔ البتہ عبد الغفور صاحب نسّاخ بنگالی کی کتاب انتخاب نقص کے اعتراضوں کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اور اس وجہ سے بے ضرورت سمجھا۔ کہ اس کا جواب شافی تطہیر الاوساخ جناب مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم لکھنوی نے وقت پر لکھ کر سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں مطبع شعلہ طور کانپور میں چھپوا دیا ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اب میں اُس سے بہتر جواب نہیں لکھ سکتا۔

اور جن غلط مرثیوں مصنفہ مرزا صاحب (مطبوعہ مطبع منشی نولکشور صاحب) کی بنا پر وہ اعتراضات تھے۔ وہ مرثیے بھی اب دفتر ماتم میں کچھ صحیح چھپ چکے ہیں۔ لہٰذا اب اُن کی تردید بیجا اصل اور طول اللاطائل سمجھی گئی۔

یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ میں ایک انسان ہوں (جس کا لازمہ سہو و نسیان مشہور ہے)۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ بہت ہی کم استعداد ہوں۔ اور جو حالات میں نے سُنے یا شمس الضحٰی وغیرہ میں دیکھے۔ وہی لکھ دئے۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ مجھ سے غلطی نہ ہو۔ جو صاحب میری کتاب کی کسی غلطی پر مطلع ہوں۔ براہ کرم مجھے آگاہ فرمائیں۔ اگر اعتراض صحیح ہوگا تو شکریہ کے ساتھ صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کرونگا۔ اور ان شاء اللہ زندہ رہا۔ تو دوسری مرتبہ کتاب چھپنے پر درستی کر دونگا۔ اور (ایراد) بے بیجا و محض غلط ہوگا۔ تو جواب دونگا۔

[1] علاوہ ان کے میری کتاب ملاحظہ کرنے کے بعد جناب حکیم امجد حسن صاحب سابق اڈیٹر الشفا مقیم کوٹہ نے بھی ایک مبسوط و بکار آمد مضمون اگست سنہ ۱۹۱۲ء کے روزانہ پیسہ اخبار کے دو پرچوں میں (موازنہ مولوی شبلی صاحب کے خلاف) چھپوا دیا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[52] سُنا ہے کہ جناب صدر الافاضل (امیر الافاضل) مولوی سید سبط حسن صاحب قبلہ ادیب و محدث مقبول نے بھی موازنہ کا لاجواب جواب تحریر فرمایا ہے۔ مگر میں اب تک اُس کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا۔ ۱۲ مؤلف حقیر

اور ناقابل ہوگا۔ تو پھر سکوت اختیار کرونگا۔ اور اِس آیہ کریمہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا* پڑھکر معترض کو دُور سے ہی سلام کرلونگا۔ اِس موقع پر جناب سید انشا مرحوم کا شعر یاد آگیا ؎

جو پُوچھے تو بڑا آج کام میں نے کیا ۔ جب اُن نے گالی دی جُھک کر سلام میں نے کیا

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ اِس کتاب میں بعض بعض واقعے کئی مقامات پر لکھ دئے ہیں ممکن تھا کہ دُوسری جگہ صرف حوالہ سے دیا جاتا۔ مگر میں نے اِس خیال سے کہ بڑی کتاب ہے (اور زمانے کی رفتار یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ کتاب کو اخباروں کی طرح ایسی سرسری نگاہ سے لوگ دیکھتے ہیں۔ کہ واقعات مابعد دیکھتے دیکھتے اکثر واقعہ اوّل الذکر خیال سے اُتر جاتا ہے) دوبارہ یا سہ بارہ ایک واقعہ کو لکھکر ناظرین کو ورق لوٹنے اور ڈھونڈنے کی تکلیف سے بچایا ہے +

یہ بات بھی عام انشا پردازی زمانہ حال کے خلاف ہے۔ کہ اکثر اہل کمال کے نام یا تخلّص کے ساتھ مَیں نے جابجا الفاظ جناب۔ صاحب۔ مرحوم۔ مغفور۔ قبلہ۔ بارک اللہ۔ رحمہ۔ طاب ثراہ وغیرہ وغیرہ لکھے ہیں۔ مگر یہ میری طرزِ تحریر ہے (میں نے اہل کمال کا نام اپنی عادت کے موافق ادب سے لیا ہے) ناظرین کی نگاہ کو جو ایسے الفاظ کے پڑھنے میں کچھ تکلیف ہو۔ تو معاف فرمائیں +

اِس کتاب کے بعض مقامات پر یہ اعتراض بھی شاید بعض ناظرین فرمائیں۔ کہ بہت سی باتیں ایسی لکھدی ہیں۔ جن کا براہِ راست حیات دبیر سے تعلق نہیں ہے۔ مگر میں نے اسکی ضرورت سمجھی۔ کہ جو بعض شعرا اِس زمانے میں بغیر اصلاح اُستاد بھیڑ یا نوحی نظمیں کہتے ہیں۔ اُن کو وہ رموز و نکات شاعری بتاؤں۔ جو مجھے معلوم ہیں۔ اور حیات دبیر کی بدولت یہ فائدہ و فیض اُن لوگوں کو پہنچے۔ جو اِس سے پہلے اُن باتوں سے واقف نہ ہوں +

اچھا اب ایک اور بات بھی سُن لیجئے۔ ؎

مجھے ڈر ہے خود بیں نہ ہو جائے ثابت ۔ بہت اپنے عیب و ہنر دیکھتا ہے

(یہ بھی کہدوں۔ کہ) جس شان سے میں نے صاف صاف کمالات دبیر مرحوم کا اس کتاب میں اظہار کیا ہے۔ اُسی طرح اُن کے نقصوں اور کمزوریوں کا بیان نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں کسی کمزوری کو باریک پیرایہ میں قبول کیا

---

* جب اُن سے جاہلوں نے خطاب کیا۔ تو اُنہوں نے کہدیا۔ سلام + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ ایک آزاد طبیعت کتاب دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ ایک رُخ تصویر کا اچھا ہے دُوسرا ایسا نہیں ہے مگر اس کی وجہ بھی عرض کر دوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب میں مرزا مرحوم کی کمزوریاں صاف صاف لکھتا۔ تو زمانے کی رفتار کے موافق اُن کے تمام معاصرین شعرا کی کمزوریاں بھی دکھاتا۔ تاکہ معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا مرحوم کی کمزوریاں دُوسروں سے کم ہیں یا زیادہ۔ اِس صورت میں اُن تمام شعرا کی جو اُن اُستادوں کے شاگرد یا مقلد یا فدائی ہیں دلشکنی ہوتی۔ اور ملک بھر میں شعر و سخن کی ایک جنگ چھڑ جاتی[1]۔ میرے نزدیک ابھی ہمارا ملک اِس قسم کے نقائص اہل کمال سُننے کے لئے طیار نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں پس یہ کام آئندہ نسلوں کے واسطے چھوڑ دیا ہے۔ اب رہی حسن اخلاق کی کمزوری۔ اِس باب میں میں نے سخت کوشش کی۔ اور اکثر جناب میر انیس مرحوم کے فدائیوں سے بھی حالات پوچھے۔ مگر کسی نے بجز اوصاف حمیدہ کے مرزا صاحب کی بُرائی نہیں بیان کی[2]۔

اِس کتاب کا نام **حیات دبیر** اور تاریخی نام **سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ** ہے۔ جس سے عدد سال تالیف کتاب ۱۳۳۲ھ (پُورے پُورے) نکلتے ہیں۔

اچھا ناظرین! خدا حافظ۔ اب کتاب کی سیر اور نام سیاہ ثابت کو دعائے خیر سے یاد فرمائیے۔

۲۹ ذیحجہ ۱۳۳۲ھ کو یہ دیباچہ لکھا تھا۔ مگر پھر اس میں کچھ کمی بیشی کی گئی۔ اور آج ۱۷ صفر ۱۳۳۳ھ کو اِس کام سے حقیر فارغ ہُوا۔ اللہ بس باقی ہوس۔ خاکسار بے بضاعت افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی سررشتہ دار عدالت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

[1] مرزا مرحوم کے متعدد قلمی مرثیوں میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔ پہلے ایک قلمی مرثیہ کو دیکھ کر کسی مصرع یا لفظ پر کوئی اعتراض ہو جاتا ہے۔ مگر جب دوسرے شخص کا لکھا ہُوا وہی مرثیہ دیکھا جاتا ہے۔ تو وہ مصرع یا لفظ ہی نہیں نظر آتا ہے۔ جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ کاتبوں نے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔ مثل مشکوٰۃ کام لیا ہے۔ پس بسبب مرثیوں کے ہو جانے کی گمراہی جیسی منتخب و صحیح کلام مرزا مرحوم کا چھپ جائیگا جس کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ ثابت ہو جائیگی۔ اور مجھ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ کاتب کا کرشمہ کہاں تک ہے۔

[2] ایسی صورت میں میں مجبور تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ بد اخلاقی کے قصے اپنے دل سے گڑھ کر مرزا کی طرف منسوب کر دیتا۔ مگر میں بلحاظ ایمان داری کے ایسا نہیں کر سکتا۔ اب چاہئے کوئی صاحب فرمائیں کہ مرزا صاحب کو فرشتہ بنا دیا ہے۔ خیال ہے کہ کہیں گے ایک رُخ خراب سمجھیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ایک مختصر سی فہرست اسما بھی اِس موقع پر لکھنا چاہتا ہوں جس سے اُن صاحبوں کو اِس کتاب کی نظم (مرثیہ وغیرہ) پڑھنے میں مدد ملے جو اِن حالات سے ناواقف ہوں۔ کہ مرثیوں میں بار بار یہ نام آتے ہیں +

نمبر	نام	کیفیت
۱	اصغرؑ یا علی اصغرؑ	امام حسینؑ کے اُس دودھ پیتے چھوٹے بیٹے کا نام ہے جسکو ایک لشکری فوج یزید حرملہ نام کاہل نے امام حسینؑ کی گود میں تیر مار کر قتل کیا +
۲	اکبرؑ یا علی اکبرؑ	اُن شاہزادہ کا اسم قدسی ہے جو امام حسینؑ کے سب سے بڑے یا مجھلے فرزند اور سر سے پاؤں تک جناب محمد مصطفیٰ صلعم سے صورت اور عادات و اخلاق و گفتگو میں مشابہ تھے۔ انکی عمر کم سے کم اٹھارہ برس زیادہ سے زیادہ پچیس سال راویوں نے لکھی ہے +
۳	بانوؑ یا شہربانوؑ	جہاں کہیں مرثیہ میں شہربانو یا بانو آتا ہے زوجہ جناب امام حسینؑ سے مراد ہوتی ہے۔ یہ شاہزادی نوشیروان عادل کی نسل سے تھیں اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معرکہ کربلا سنہ ۶۱ھ میں موجود بھی تھیں یا اس سے پہلے انتقال فرما گئی تھیں مگر مرثیہ گویوں نے ورود [illegible] امام حسینؑ کی بیبیوں [illegible] لفظ بانو سے تعبیر کیا ہے۔ گویا بانو کے اصلی معنی بیبی کے ہیں [illegible] +
۴	باقرؑ	امام حسینؑ کے پوتے جو معرکہ کربلا میں پانچ برس کے تھے +
۵	حرؑ	حر کے لغوی معنی آزاد کے ہیں۔ یہ آزاد جوانمرد (کوفی) لشکر یزید میں تھا اور ایک ہزار یا پانچ ہزار آدمیوں کا افسر تھا۔ مگر اُس سب جاہ و حشمت کو چھوڑ کر اکیلا (یا اپنے بیٹے اور بھائی اور غلام سمیت) امام حسینؑ کے پاس چلا آیا پھر حضرتؑ کی طرف سے لشکر یزید سے داد جوانمردی دیکر اور بہت سے دشمن قتل کرکے شہید ہوگیا حر ابن یزید ریاحی ان بزرگوار کا نام نامی ہے +
۶	حبیبؓ یا حبیب ابن مظاہر	یہ ایک ضعیف اصحاب جناب رسالتمآب صلعم سے (۷۰ سال عمر کے) معرکہ کربلا میں تھے امام حسینؑ کی مدد کی۔ اور بہتیوں کو قتل کرکے شہید ہوگئے +
۷	جناب زینبؑ	امام حسینؑ کی حقیقی بہن ہیں جو معرکہ کربلا میں موجود تھیں انکے شوہر عبداللہ ابن جعفر طیارؓ تھے +
۸	حضرت عباسؑ	یہ امیرالمومنینؑ کے فرزند اور حضرت امام حسینؑ کے بھائی تھے امام حسینؑ سے ایسی محبت کا برتاؤ کیا جس کا نظیر تاریخ عالم میں نظر نہیں آتا۔ یہ لشکر امام حسینؑ کے علمدار تھے اور شجاعت میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے +
۹	عونؑ و محمدؑ	جناب عبداللہ ابن جعفر طیار کے دو فرزند جناب زینبؑ کے بطن سے مشہور ہیں۔ اکثر مرثیہ گویوں نے پسران زینبؑ انکو نظم کیا ہے +

نمبر	نام	کیفیت
۱۰	عونؑ و جعفر	جناب امیرؑ کے فرزند حضرت عباسؑ کے ماں جائے بھائی ہیں +
۱۱	عثمانؓ	یہ بھی جناب امیرؑ کے فرزند ہیں۔ معرکہ کربلا میں شہید ہوگئے ہیں +
۱۲	عبد اللہؓ	" " " " +
۱۳	حضرت سکینہؑ	صحیح لفظ سُکَینہ بضم اول و فتح ثانی ہے۔ مگر تمام شعرا اردو نے بفتح اول و کسر ثانی سَکِینہ ہی قافیہ میں استعمال فرمایا ہے۔ یہ جناب امام حسینؑ کی ایک صاحبزادی تھیں اور جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال فرمایا اُنکا نام بقابل اطمینان تحقیق نہ ہوسکا۔ بعض علما کے نزدیک ان کا نام زینب ہے اور شام میں جو روضہ جناب زینب مشہور ہے وہ یہی زینبؑ بنت الحسینؑ ہیں۔ بہر حال شعراء اہلبیت (اردو) نے ان صاحبزادی کا بھی جہاں کہیں ذکر فرمایا ہے اُنکا نام بھی سکینہ لکھا ہے
۱۴	شیریںؓ	گو روایت بہت ضعیف ہے مگر مشہور ہے (اور اسی کو تمام مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہے) کہ یہ جناب شہربانو مادر امام زین العابدینؑ کی کنیز تھیں۔ اور انکو جناب شہربانوؑ نے امام حسینؑ کے اشارے سے آزاد فرمادیا تھا۔ انہوں نے راہ شام میں ایک مقام پر سکونت اختیار کر لی تھی جب اہل بیت اطہار شام کو مع سرہائے شہدا و امام زین العابدینؑ جارہے تھے۔ تو انہوں نے اپنی شاہزادی کی خدمت میں آکر زیارت و خدمت کی تھی۔ اور ان کے گھر میں سر امام حسینؑ رہا تھا +
۱۵	جناب سید سجادؑ یا حضرت عابدؑ	امام زین العابدینؑ جو چوتھے امام ہیں۔ جو بروایت مشہور امام حسینؑ کے فرزند اکبر تھے۔ معرکہ کربلا میں بیمار تھے۔ یہ اسیر ہو کر شام کو تشریف لے گئے تھے +
۱۶	صغراؑ یا فاطمہ صغریٰ	یہ بھی امام حسینؑ کی صاحبزادی مشہور ہیں۔ اور گو یہ روایت ضعیف و غریب ہے۔ مگر مشہور ہے۔ کہ ان کو علالت کی وجہ سے امام حسینؑ نے مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا۔ تمام مرثیہ گویوں نے اس روایت کو خوب ہی نظم کیا ہے +
۱۷	جناب کلثومؑ	یہ بھی جناب امام حسینؑ کی حقیقی (جناب زینبؑ سے چھوٹی) بہن تھیں۔ یہ عبد اللہ ابن جعفر طیارؓ کی زوجہ اور معرکہ کربلا میں اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھیں +

باسمہٖ سُبحانہٗ
ولہُ الحمدُ والرّجوعُ الیہ
والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ محمدؐ وآلہ الطّاہرین ع

باب اوّل شجرۂ خاندان و حالاتِ بزرگانِ حضرت دبیر

شجرۂ خاندان

ملا ہاشم شیرازی نثار برادر عینی ملا اہلی شیرازی صاحبِ مثنوی سحرِ حلال

مرزا محمد رفیع متخلص بہ رفیع

مرزا غلام محمد

مرزا غلام حسین المتولد سنہ ۱۱۹۰ھ گیارہ سو نوّے ہجری بمقام شہر دہلی

۱ دختر جو میر بہ علی بہجنوری کو منسوب ہوئیں متولدہ دہلی

۲ دختر جنکی ولادت بھی شہر دہلی کی ہے حکیم میر محمد حسین تحریر تخلص کو منسوب ہوئیں لاولد رہیں

۱ دختر زوجہ مجر حسن دہلی مرحوم — ۲ دختر زوجہ مرزا علی حسن مرحوم متخلص — ۳ میر بسم اللہ — ۴ میر فضل حسین

میر محمد صولت — دختر زوجہ حکیم آغا حسین سلمہ اللہ

۳ مرزا غلام محمد نظیر ولادت دہلی۔ وفات سنہ ۱۲۹ھ

۱ مرزا محمد عباس سفیر مرحوم ۔ ۲ محمد تقی ۳ و محمد کاظم ۴ و یک دختر

میر حیدر حسین

۴ **مرزا سلامت علی دبیر مرحوم**

المتولد ۱۱ رجمادی الاوّل سنہ ۱۲۱۸ھ بارہ سو اٹھارہ ہجری

بمقام دہلی ۔ محلہ بلی ماراں

المتوفی ۔ ۳۰ رمحرم سنہ ۱۲۹۲ھ بارہ سو بانوے ہجری

مدفن شہر لکھنؤ ۔ محلہ نخاس جدید اپنے مکان میں دفن

ہیں ۔ اب یہ گلی کوچۂ دبیر کہلاتی ہے ٭

از ہرا

مرزا سلامت علی دبیر رحمہ اللہ

۱
دختر
جو میر بادشاہ علی مرحوم بقا پسر میر وزیر علی صبا مغفور کو منسوب ہوئیں

۲
مرزا محمد جعفر صاحب اوج مدظلہ
المتولد ۸ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ

۳
مرزا محمد ہادی حسین عطارد مرحوم
المتولد ۵ شعبان ۱۲۶۲ھ
المتوفی ۲۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ

اولاد مرزا محمد جعفر صاحب اوج:

۱
مرزا محمد طاہر رفیع سلمہ
ملازم دربار رامپور

مرزا محمد ذاکر عرف اغن صاحب
متخلص ذاکر۔ جن کی والدہ
دختر عطارد مرحوم ہیں

۲
دختر جو نواب حسن علی خاں عرف
اچھے صاحب سلمہ کو منسوب ہیں
یہ نسل بالکل اشتر اور خاندان
بہو بیگم صاحبہ و نواب
حیدر بیگ خاں مرحوم سے
ہیں۔ سوزخوانی میں میر بندہ حسین
صاحب مرحوم کے شاگرد اور
کامل ہیں

نواب مرزا محمد مہدی علی خاں عرف
کجن صاحب المتولد شب نیمہ شعبان

اولاد مرزا محمد ہادی حسین عطارد:

۱
مرزا عبد الحسین شفیع
عرف ابو صاحب
ملازم
دربار رامپور

۲
دختر
جو مرزا محمد طاہر کو
منسوب ہیں
(والدہ اغن صاحب
سلمہ)

حالاتِ بزرگانِ مرزا صاحب

شجرۂ خاندان میں اُوپر لکھ چکا ہوں۔ اُس کے ملاحظہ سے واضح ہوگا۔ کہ مرزا صاحب کے جدِ اعلےٰ مُلا ہاشم شیرازی ہیں۔ جو مُلا اہلی کے حقیقی بھائی تھے۔ جس طرح مُلا اہلی نظم میں یکتائے زماں تھے۔ مُلا ہاشم نثر میں وحیدِ دوراں تھے۔ مُلا اہلی کے حالات کتاب مستطاب مجالس المومنین مصنفۂ قاضی سید نوراللہ شوستری شہید ثالث علیہ الرحمہ سے (جن کا مزار مقدس اکبرآباد آگرہ میں زیارت گاہ مومنین ہے) معلوم ہو سکتے ہیں شہید ثالث ؒ نے مُلا اہلی کا ذکر اُن شعرائے کاملین میں کیا ہے۔ جو ائمہ اطہار ؑ کے مشہور مداح ہیں۔ مَیں بہت مختصر اُن کے حالات لکھتا ہوں۔ کہ میری کتاب طولانی نہ ہو جائے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مُلا اہلی شعرا و فضلا میں مشہور اور فقر و مسکنت اور بے التفاتی اہل دنیا میں معروف ہیں۔ اکثر شاعروں سے مہارت فنِ شعر کے سبب سے امتیاز رکھتے تھے۔ ہر وقت شعر کہتے تھے۔ ایسی مثنوی سحرِ حلال کہی ہے۔ کہ ہر شعر میں دو قافیہ ہیں۔ اور ہر شعر دو بحروں میں پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کی عقل حیران ہے۔ سلمان ساوجی کے مشہور قصیدۂ صنعتی کے جواب میں ایک قصیدہ میر علی شیر کے نام پر کہا۔ اُس میں چند صنعتیں قصیدۂ سلمان سے بھی زیادہ ہیں۔ خود میر علی شیر نے دادِ انصاف دے کر کہا۔ کہ سلمان سے بہتر کہا ہے۔ اہلی کا دیوان غزل مسلّم اربابِ نظر ہے۔ شعر سعدی کی چاشنی اُن کے کلام میں ہے۔ اس کے بعد چند مشہور قصائد اہلی کے مطلع لکھ کر تحریر فرمایا ہے۔ کہ ان سے ولا بت شاہِ ولایت اور خلوصِ نیّت مُلا اہلی علیہ الرحمہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک انکی رباعی بھی ان کے حسنِ عقیدت پر دلیل ہے۔

(رباعی اہلی)

یارب سگِ کوئے مقبلی سازمرا + آئینہ زعشق منجلی سازمرا

فصل اول ملا اہلی رحمہ حال

اقبال جہاں مرا بجوئے نیست قبول + مقبول محمدؐ و علیؑ ساز مرا

تیسرے مصرع سے یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ طبیعت میں مل دنیا سے کس قدر تنفر تھا۔ ملا اہلی نے بڑھاپے میں بمقام شیراز سنہ نوسو بیالیس (۹۴۲) ہجری میں وفات پائی۔ ملا میک نے جو اُن کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ وہ یہ ہے:-

قطعۂ تاریخ وفات اہلی رحمۃ اللہ علیہ

درمیان شعرا و فضلا + پیر با صدق و صفا بود اہلی

رفت با مہر علیؑ از عالم + پیرو آل عبا بود اہلی

سال فوتش ز خرد جستم و گفت + بادشاہ شعرا بود اہلی

اور تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی مدح لکھ کر اتنا زیادہ لکھا ہے۔ کہ اُن کا مرقد شیراز میں خواجہ شمس الدین حافظ شیراز کے پہلو میں ہے۔ حقیر (ثابت) نے اس موقع پر عرض کیا ہے ؎

طبع حافظ سے نہ کم تھی طبع اہلی شعر میں + مر کے بھی پہلو نشیں ہیں حافظ شیراز کے

اور مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔ کہ وہ خواجہ حافظ و مرزا نظام دست غیب کے پاس ایک ہی مقبرہ میں دفن ہیں۔ اور سنگ مزار پر یہ غزل کندہ ہے ؎

جانم بروز واقعہ پہلوے او کنید + او قبلۂ من ست رخم سوے او کنید

مؤلف حقیر کہتا ہے۔ کہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے۔ کہ جس طرح ملا اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال ایرانیوں میں لاجواب مانی جاتی ہے۔ اور صنائع و بدائع و بلاغت کی جان ہے۔ اُسی طرح صفائی بندش و حسن بیان و لطف زبان میں میر حسن مرحوم کی مثنوی ہندوستانیوں میں بے مثل مانی جاتی ہے۔ یہ اور عجیب و غریب حسن اتفاق ہے۔ کہ اس

سوا اس تذکرہ میں بھی اہلی کی بہت کچھ مدح و ثنا لکھی ہے۔ مگر میں نے طول کے خوف سے زیادہ لکھنا غیر ضروری سمجھا ۱۲ ثابت

مثنوی اردو کا نام بھی اُس سے ملتا جلتا ہوا سحر البیان ہے۔ ان دو سحر بیان (اہلی و حسن) کی اولاد میں دو ایسے بزرگوار پیدا ہوئے جن کو ملک نے اعجاز بیان مانا ہے۔ ایک مرزا دبیر ہیں جن کے یہاں تمام صنائع و بدائع اور بلاغت کے نکات موجود ہیں۔ دوسرے میر انیس ہیں جن کا کلام فصاحت و سلاست میں آپ اپنی مثال ہے +

فصل سوم / اسناد و خطوط

اسناد و خطوط

کتاب شمس الضحیٰ[1] میں اور اُس کے بعد تنقید آب حیات[2] میں چند فرمان شاہان دہلی کے اور چند خطوط امرائے دہلی کے درج ہیں۔ اور ایک استشہاد بھی چھپا ہے جن سے مرزا صاحب کے بزرگوں کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے میں انہی فرمانوں اور خطوط وغیرہ سے حالات لکھتا ہوں +

یہ استشہاد اُس زمانہ میں مرتب ہوا تھا کہ جب مرزا غلام حسین (پدر مرزا صاحب) دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اور لکھنؤ میں شادی کرنا چاہا۔ بزرگوں کی پوچھ پاچھ ہوئی۔ اور مرزا غلام حسین دہلی و آگرہ گئے۔ اور وہاں سے شہادت نامہ لکھوا کر لکھنؤ میں لائے۔ یہاں بھی جو لوگ اُن کے خاندان سے واقف تھے انہوں نے شہادت ثبت کی۔ یہ تیرھویں صدی کے شروع کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ اس شہادت نامہ سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) مرزا صاحب کے آبا و اجداد شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر سرفراز رہتا رہے۔ پھر زمانہ کی ناموافقت کے سبب سے دہلی و اکبر آباد (آگرہ) میں وارد ہوئے +

(۲) مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں حقیقی نانا مرزا غلام حسین کے ناظم صوبہ کشمیر

---

[1] شمس الضحیٰ مرزا دبیر صاحب کے حالات میں مولوی میر صفدر حسین صاحب کی تصنیف عمدہ شاہی کی مطبع حسینی میر عابد علی صاحب میں اب سے عرصہ پہلے چھپ چکی ہے +

[2] تنقید آب حیات مؤلف کے نانا میر محمد رضا طبیر مرحوم کی ایک مختصر کتاب ہے۔ عرصہ ہوا کہ چھپ چکی ہے۔ آب حیات میں جو مرزا صاحب کے حالات غلط درج تھے۔ اُن کی تصحیح فرمائی ہے +

کے تھے۔ اور مرزا غلام حسین کے ماموں مرزا شہامت علی خاں شہزادگان دہلی کے اُستاد اور خط نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے +

(۳) جد امجد مرزا محمد رفیع عہدہ منشی (میر منشی شہنشاہ دہلی) پر سرافراز تھے۔ اور والد ماجد (مرزا غلام محمد مرحوم) بھی صاحب اقتدار تھے +

(۴) جب شہر دہلی متواتر تاراج و غارت ہونے کے سبب سے قابل قیام نہ رہا۔ تو مرزا غلام حسین مرزا افضل علی خاں ابن مرزا فتح علی خاں کے ہمراہ [جنھوں نے مرزا غلام محمد (پدر مرزا غلام حسین) کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھا تھا] لکھنؤ تشریف لائے +

اس شہادت نامہ کی پیشانی پر شاہ عالم بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت ہے مُہر سے اُوپر جو عبارت شہادت مرقوم ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے "درحقیقت ان کے بزرگ شرفائے شیراز سے تھے۔ اور ما بدولت کی سرکار میں عہدہ ہائے جلیلہ پر سرافراز و ممتاز[1] تھے" اس کے بعد حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار[3] علی صاحب مجتہد اول لکھنؤ اور مرزا کاظم[2] علی صاحب محدث اور حسن[4] رضا خاں صاحب نائب صوبہ اودھ اور نواب ضیاء[5] الدولہ آفتاب جنگ محمد نور اللہ خاں کی شہادت اور مہریں ہیں ان سب بزرگوں نے مرزا غلام حسین کو خلف مرزا غلام محمد ابن مرزا محمد رفیع ابن ملا ہاشم شیرازی لکھ کر صاحبان عزت و شرافت سے لکھا ہے۔ نواب آفتاب جنگ نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا غلام حسین کی والدہ کی نانی اور میری نانی حقیقی بہنیں تھیں۔ اس کے بعد سید فرزند[6] علی اور مرزا رحمت[7] علی خاں اور امجد[8] علی خاں اور نواب مسیح[9] اللہ خاں

سـ۱ـہ مخدومی مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنوی اور محسنی حاجی ڈپٹی سید جعفر حسین صاحب جعفری بیرسٹری سابق ممبر کونسل کوٹہ و جے پور کے ارشاد کے موافق اصل شہادت نامہ و فرمان شاہی کی نقلیں بھی اس کتاب میں چھپوا دیتا ہوں جو اس سے پہلے شمس الضحیٰ و تنقید آب حیات میں بھی چھپ چکی ہیں۔ کہ یہ چیزیں بطور یادگار زمانہ سابق ہیں + مؤلف حقیر۔

سـ۲ـہ مرزا کاظم علی بیگ مشہور عالم اخباری نویس تھے۔ مرزا دبیر نے ان سے بھی پڑھا ہے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق صاحب شاہ اودھ انہیں کے فرزند ارجمند تھے۔ جو ناسخ مرحوم کے ارشد تلامذہ سے تھے + ۱۲ ثابت

شارع اعجاز خسروی اور نواب[1] مختار[10] خاں (برادر زادۂ نعمت خاں عالی) کی گواہیاں اور مہریں ہیں
بعد ازاں فضل[11] علی خاں[2] عرف آغا خاں ابن فتح علی خاں کی مہر ہے جس میں یہ مصرع سجع ہے ع
امید شفاعت ز فضل علیؑ ست ۔ اور علی مراد[12] خاں داروغہ دیوان خانہ شاہ عالم اور ابن الدین[13] علی
اور مرزا محمد[3] باقر[14] اور سید احسن اللہ[15] خاں کی شہادت اور مہریں ہیں ۔ یہ تو استشہاد کی کیفیت تھی
اب میں جو مضامین فرمانوں سے مستنبط ہوتے ہیں اُنکا خلاصہ (ذیل میں) اُردو میں لکھتا ہوں :۔

ا ۔ پہلا فرمان شاہ دہلی (شاہ عالم) کا مورخہ سوم رجب ۱۱۷۵ھ مطابق سنہ ۳ جلوس سے
حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں :۔

(۱) مرزا غلام محمد (مرزا دبیر مرحوم کے دادا) کو بادشاہ نے "فضیلت و شریعت مآب تقوے و صلاح دستگاہ" تحریر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ بادشاہ کے دل میں اُن کی کس قدر عظمت تھی ۔ اور اُن کے والد ماجد کا نام مُلا محمد رفیع اور دادا کا نام مُلا محمد ہاشم شیرازی درج فرمان شاہی ہے +

(۲) تعریف دیانت میں لکھا ہے ۔ کہ خود را بانتہاے تدیّن رسانیدہ[4] +

(۳) یہ لکھا ہے کہ خدا کی عبادت کے شوق میں مناصب جلیلہ کو ترک کر دیا +

(۴) یہ کہ ان کے نانا عنایت اللہ خاں ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر کے اور ان کے

---

[1] نواب مختار خاں نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ میں نے ولد مرزا غلام حسین کے ساتھ صیغۂ اخوت پڑھا ہے +

[2] انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا غلام حسین نے میرے والد ماجد کی مہمانداری چند روز کے عوض مجھ پر بہت احسان کئے ہیں ۔ ایک اُن میں سے یہ ہے کہ آج کل میں انہیں کے مکان میں رہتا ہوں دیکھئے اُس زمانے کے لوگ احسان کا بدلہ کس خوبی سے ادا کرتے تھے اور اُسکا اقرار کس صفائی سے فرماتے تھے ہمارے زمانہ میں احسان کا شکریہ ادا کرنا گویا بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے ۔ افسوس کیا انقلاب زمانہ ہوا +

[3] معلوم نہیں یہ مرزا محمد باقر مولوی محمد حسین آزاد صاحب آب حیات کے والد ماجد ہیں یا دوسرے بزرگوار ہیں +

[4] اس سے بڑھکر ایک دیانت دار میر منشی کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُنکی دیانت معراج کمال کو بادشاہ کی نظر میں پہنچی ہوئی تھی جس سے بڑھ کر دیانت نہیں ہو سکتی + ۱۲ آثابت

ماموں شہامت علی خاں شاہزادوں کے اُستاد۔ اور جد امجد مُلّا محمد ہاشم منشی سلطنت ہندوستان کے تھے +

(۵) اسی سند میں لکھا ہے کہ چار لاکھ اٹھاسی ہزار ایک سو بیس دام جو چار ہزار سات سو اکتیس روپیہ کے برابر ہوتے ہیں ان کو (بطور پنشن) ملتا ہے۔ ہر سال نئی سند نہ طلب کی جائے[۱] +

۲۔ دوسرا فرمان بھی شاہ عالم بادشاہ دہلی کا ہشتم ماہ رمضان سنہ ۱۱۹ھ (گیارہ سو انیس) کا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مُلّا غلام محمد (نواده ملا ہاشم شیرازی) کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ غلام حسین (پدر مرزا دبیر مرحوم) نام رکھا گیا مصارف دایہ کے واسطے سو روپیہ ماہوار (پُرانے سکّہ کے) مقرر فرمائے گئے[۲] +

مرزا غلام حسین کی لکھنؤ میں حالت عسرت یا ثروت

اس موقع پر شاید ناظرین کتاب کو یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب پریشانی کے عالم میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے ضرور مبتلائے عسرت ہونگے۔ ہرچند عسرت اور افلاس شرفا اور اہل کمال کی بے عزتی کا سبب نہیں ہوسکتے۔ مگر از بسکہ میرا فرض واقعات کا لکھنا ہے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ کہ مرزا غلام حسین باوصف عسرت کے صاحب ثروت تھے۔ ناظرین آپ تعجب کرینگے۔ کہ یہ تو اجتماع نقیضین معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور و تامل سے سُنئے۔ عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے۔ کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں مرزا غلام حسین

مرزا غلام حسین کی لکھنؤ میں حالت

---

[۱] ان ملا محمد المتخلص رفیع کا ایک قصیدہ نعت و منقبت میں کتاب روضۂ رضوان مطبوعہ بستان مرتضوی میں چھپا ہے۔ جو کتاب سنہ ۱۳۰۰ ہجری کی مطبوعہ ہے۔ سید محمد جعفر صاحب رئیس اناؤ نے یہ ملک پر احسان کیا ہے۔ کہ تمام شعرائے ایران و ہندوستان کے قصاید نعت و منقبت میں سے اکثر اعلےٰ درجہ کے قصیدے ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ رفیع مرحوم کا قصیدہ صفحہ ۸ پر ہے اُس کا مطلع یہ ہے۔ اے شہنشاہ دنے ملک وتد تے کشور + والضحےٰ روے و قمر طلعت و والنجم افسر +

[۲] اس فرمان سے ولادت مرزا غلام حسین کی سنہ ۱۱۹ ہجری کی پائی جاتی ہے +

مسافر گویا مفلس تھے کہ کوئی آمدنی نہ تھی پُرانی کھرچن (بزرگوں کی بچی ہوئی پونجی) اور اپنا اسباب خانہ داری بیچ بیچ کر کھاتے تھے مگر اس زمانے کے مالدار معز ز اہلکاروں پر خیال کیا جائے تو بہت مرفہ الحال تھے۔ دولت تلف ہونے کے بعد بھی اس قدر تھی کہ سیکڑوں روپیہ خیرات (خمس و زکوٰۃ) میں دیتے تھے۔ اس کی تصدیق آپکو دو خطوں سے ہوگی جو شمس الضحےٰ میں چھپے ہیں۔ اور جن کا خلاصہ مَیں ذیل میں نمبر بہ نمبر لکھتا ہوں:۔

۱۔ پہلا خط غفراں مآب حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب قبلہ (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) کا مورخہ ۱۲۱۶ھ ہے۔ جس کو مَیں لفظ بلفظ مع ترجمہ تبرکاً لکھتا ہوں۔ کہ ہندوستانیوں میں سب سے پہلے مجتہد ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کے تمام شیعوں میں بیداری پھیلی ہے۔ اکثر اہل علم شیعوں کے خاندان انہیں کے خانوادہ کے تعلیم یافتہ اور شاگرد ہیں۔ انکی تحریر کو شیعہ آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

اصل عبارت خط	خلاصہ اردو میں
جناب مرزا صاحب کرم فرمائے دوستان مستجمع الطاف واحسان عالی مراتب والامناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہ۔ بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائے شریف باد۔ کہ مبلغ پانصد روپیہ منجملہ زکوٰۃ وخمس کہ بدست مسمی غلام حیدر فرستادند۔ رسید انشاءاللہ تعالےٰ المستحقین مومنین تقسیم کردہ خواہد شد۔ زیادہ والسّلام۔ مرقومہ چہارم شہر رمضان ۱۲۱۶ھ ہجری نبوی	آپکا بھیجا ہوا پانچ سو روپیہ خمس و زکوٰۃ کا غلام حیدر کے ہاتھ پہنچا۔ حقدار مومنوں کو انشاءاللہ تقسیم کر دیا جائیگا۔ ۴ ماہ رمضان ۱۲۱۶ھ

سید دلدار علی
۱۲۱۰

۲۔ دُوسرا خط نواب مختار خاں رئیس دہلی برادر زادۂ نعمت خاں عالیؔ کا ہے اس میں تاریخ درج نہیں ہے۔ مگر مہر میں ۱۲۱۲ھ کندہ ہے۔ اس لئے (سنہ بارہ سو بارہ)

سنہ ۱۲۱۲ھ کے قریب قریب زمانہ کا یہ خط سمجھنا چاہیئے۔ اس خط فارسی کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ تین سو پچھتر (۳۷۵) روپیہ زکواۃ کا جو نامدار خاں کے ہاتھ آپ نے بھیجا تھا (تقسیم مومنین کو) میرے پاس امانت رکھا ہؤا ہے۔ اب چند صاحبوں کی زبانی سنا گیا ہے۔ کہ آقا شاہ حسین اصفہانی حج اور زیارات عتبات عالیات سے فائض ہو کر چند روز سے اس شہر میں وارد اور عسرت شدید میں مبتلا ہیں اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ لہذا جناب کی خدمت میں تکلیف دیتا ہوں۔ کہ اگر آپ کو دل سے منظور ہو۔ تو بعوض حصہ چند مومنین کے آقا صاحب موصوف کی خدمت میں منت وسماجت سے وہ رقم پیش کر کے اُن کو اُن کے وطن اصفہان کو بھجوادوں ۔

مرزا صاحب کے نسب پر بعض لوگوں کے حملے

فصل ۵ نسب بعض حریف حملے

اب میں یہ بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ایسے عالی نسب کے نسب پر ناواقفی یا اورکسی (کدورت باطنی وغیرہ کے) سبب سے بعض لوگوں نے کیا کیا حملے کئے ہیں۔ اُن حملہ آوروں میں سے :-

(۱) پہلے بزرگ صاحب تذکرہ سراپا سخن میر محسن علی صاحب اپنے تذکرہ کے صفحہ ۱۰۸ پر تحریر فرماتے ہیں "مرثیہ گوئی میں طاق صف آرائی اور مضمون خیزی میں شہرۂ آفاق مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے باشندۂ لکھنؤ ارشد تلامذہ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو" پھر صفحہ ۲۱۵ پر یہی بزرگ لکھتے ہیں "مرزا سلامت علی دبیر

مؤ اُس زمانے کے مصنفوں اور مؤلفوں کا یہ عمل عام طور پر نظر آتا ہے۔ کہ جس سے کچھ رنجش ہوتی تھی اُس کی تعریف کے الفاظ لکھ کر ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے تھے۔ کہ منقصت ثابت ہو۔ مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں یہ عادت عام مصنفوں و مؤلفوں کی لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی اختلاف مذہب شیعہ و سنی اس امر کا باعث ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو منشی صاحب موصوف کی تاریخ میں اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر ۱۲ آمابت

ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش باشندۂ لکھنؤ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر"۔

صفحہ ۱۰۸ پر تو متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ مرزا غلام حسین کے عزیزوں میں کوئی صاحب کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔ جن کا نام آغا جان تھا۔ جس کی تاویل یہ ہو سکتی تھی۔ کہ آغا جان تاجر کاغذ کوئی مشہور شخص تھے۔ مرزا غلام حسین کو اُن کے ذریعہ سے ناظرین تذکرہ سے واقف کرایا۔ مگر آگے بڑھ کر جب کہ صفحوں کی گنتی بجائے ایک سو کئی کے دو سو کئی ہو گئی۔ تو خود مرزا غلام حسین ہی کو کاغذ فروش لکھ دیا۔ غالباً مصنف موصوف اگر کہیں تیسری جگہ سو دو سو صفحہ کے بعد پھر مرزا دبیر مرحوم کا ذکر فرماتے۔ تو خود مرزا صاحب ہی کو کاغذ فروش بلکہ کاغذ ساز لکھ دیتے۔ مگر ہم اس کا جواب باصواب اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔

ناظرین کتاب! آپ کو یاد ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب کے استشہاد پر مہر کرنیوالوں میں سے ایک صاحب فضل علی خاں عرف آغا جان بھی ہیں۔ جن کے نام پر میں نمبر ۱۱ لکھ چکا ہوں۔ اور جنہوں نے مرزا صاحب کے مکان میں اپنا رہنا لکھا ہے۔ میں نے لکھنؤ کے بعض معمر آدمیوں سے سنا ہے۔ کہ وہ آغا جان اور مرزا غلام حسین۔ یہ دونوں صاحب بزرگوں کے وقت کا اسباب خانہ داری۔ دوشالہ۔ ہتیار۔ ظروف نقرہ وطلا وغیرہ وغیرہ جو بہت کچھ تھا۔ بیچ بیچ کر کھایا کئے۔ اُس زمانہ میں کاغذ بھی بہت قیمتی ہوتا تھا۔ خصوصاً ایرانی و کشمیری کاغذ بہت ہی قیمت پاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان صاحبوں کے ساتھ کچھ کاغذ بھی ہو۔ اور وہ بیکار سمجھ کر بیچ دیا ہو۔ ع یاروں کو شگوفہ ہات آیا اور کاغذ فروش لکھ دیا۔ حالانکہ کاغذ فروشوں کا (مثل کاغذ سازوں کے) کوئی فرقہ یا قوم نہ شاہی زمانہ میں تھا نہ آج ہندوستان بھر میں کہیں ہے۔ بلکہ پہلے بھی مختلف قوموں کے شریف آدمی کاغذ بیچتے تھے اور آج بھی۔ میں اس پر اتنا اور لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر واقعی بھی یہ بزرگوار کاغذ فروش ہوتے جب بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ فخر

اسلام کو حاصل ہے۔ کہ پیشۂ تجارت سے کوئی شخص ذلیل نہیں ہوجاتا۔ بلکہ بفحوائے الکاسب حبیب اللہ[1] شرافت بڑھ جاتی ہے۔ اور زمانہ موجودہ نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ تجارت و حرفت و صنعت ہی ترقی اقوام کا باعث ہے۔ اور اسی پر عمل نہ کرنے سے مسلمان مفلس اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لکھنا بھی غالبًا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین مرحوم نے لکھنؤ میں بزرگوں کے اسباب کو بیچ بیچ کر بسر کی۔ اور شادی کی۔ اور مکانات خریدے۔ جو آج تک لکھنؤ نخاس میں موجود ہیں[2]۔ اور نواب اودھ یا کسی اور رئیس کی نوکری نہیں کی۔ اور پھر لکھنؤ سے دہلی (شاید اپنی جائداد غیر منقولہ دہلی کی حفاظت یا فروخت کے لئے) چلے گئے۔ مرزا صاحب سے بڑی دو بہنیں اور مرزا صاحب کے بڑے بھائی (نظیر مرحوم) اور خود مرزا دبیر مرحوم یہ سب دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور پھر دوبارہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ واقعات بتلا رہے ہیں۔ کہ مرزا غلام حسین کے پاس کافی سرمایہ تھا۔ ورنہ اُن کو نواب اودھ کی نوکری مل جانا خصوصًا اُس زمانہ میں کہ جو آصف الدولہ کا زمانہ معلوم ہوتا ہے شاید بہت آسان ہوگا۔ اس لئے کہ دہلی میں میر منشی اور اُستاد بادشاہ دہلی یہ خاندان رہ چکا تھا۔ نواب اودھ کو ان سے سیکڑوں مرتبہ کام پڑا ہوگا۔ اس میرے خیال کی تائید نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نور اللہ خاں آفتاب جنگ کے ایک خط سے ہوتی ہے جس کی نقل شمس الضحیٰ میں چھپی ہے[3] جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آپ (مرزا غلام حسین صاحب) صوبہ اودھ کے

[1] الکاسب حبیب اللہ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ محنت کر کے روٹی (اکل حلال) پیدا کرنیوالا خدا کا دوست ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث ہے۔ مگر حقیر کی نظر سے ابھی تک یہ حدیث نہیں گذری۔ ورنہ ماخذ لکھ دیتا۔

[2] یہ گلی آج کل کوچہ دبیر کہلاتی ہے۔

[3] اس خط میں یا تاریخ تحریر درج نہیں یا ناقل نے چھوڑ دی۔ کہ جس نے شمس الضحیٰ میں نقل کیا۔ مگر مُہر میں سنہ ۱۱۹۰ھ کندہ ہے جس سے سنہ ۱۱۹۰ھ کے بعد کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ جو آصف الدولہ ایک سخی نواب اودھ کا عہد ہے۔ کہ جس زمانہ میں دہلی کے ایک رئیس زادہ کو لکھنؤ میں معزز نوکری مل جانا بہت آسان تھا۔ ۱۲ ثابت

پاس جاتیے۔ کہ آپکے دادا ملا محمد رفیع کے ساتھ برہان الملک (محمد امین سعادت خاں بزرگ خاندان نوابان شاہان اودھ) نے صیغہ اخوت پڑھا تھا۔ بلکہ صوبۂ اودھ کے بزرگ آپکے بزرگوں کے زیر بار احسان ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ صفدر جنگ صوبہ دار اودھ زمانہ وزارت ابوالنصر مجاہد الدین احمد شاہ میں محسود عالم ہو گئے تھے (یعنی سب لوگ اُن سے جلتے تھے) بلکہ جن خاندانوں میں پہلے وزارت رہ چکی تھی۔ وہ اُس بیچارہ (صفدر جنگ) کے در پے آبروریزی تھے۔ مگر آپ کے آباؤ اجداد عنایت اللہ خاں صوبہ دار کشمیر اور ملا غلام محمد صاحب شیرازی اُن کے مددگار تھے جس سے کسی کی دشمنی نہ چل سکی۔ انہیں دونوں صاحبوں کی بدولت ذلت۔ رسوائی و قید سے وہ محفوظ رہے۔ اور صوبہ دار کشمیر نے صفدر جنگ کو لکھنؤ کی طرف روانہ کرا دیا۔ مگر مرزا غلام حسین عجب مستغنی المزاج اور دولتمند شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کہ جنہوں نے ایسے نواب اودھ سے مطلق رجوع نہ کی جن پر اُن کے بزرگوں کا احسان تھا۔ اور صیغہ اخوت کے مقدس رشتہ سے گویا نواب اودھ کے واجب الاحترام ایمانی بھائی ہوتے تھے[✻]۔

مصنف آبحیات کی تحریر نسبت نمبر ۲

۲۔ دوسرے تذکرہ نویس مرزا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم ہیں جنہوں نے آب حیات میں یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:۔

"تذکرہ سراپا سخن میں لکھا ہے۔ کہ ان کے (مرزا دبیر کے) والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔ پھر ایک جگہ اُسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے ہیں۔ مصنف موصوف کو شوق ہے۔ کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں۔ اس لئے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک"۔

✻ اُس زمانہ کے اُمراء و شرفاء اپنے محسنوں کی اولاد سے حسن سلوک کرنا لازم و واجب جانتے تھے خصوصاً آصف الدولہ مرحوم بڑے بامروت و سخی تھے۔ جو لکھنؤ کے حاتم سمجھے جاتے ہیں۔ اور اکثر سودا بیچنے والے آج بھی یا آصف الدولہ کہکر صبح کو سودا بیچنا شروع کرتے ہیں۔ سچ کہا ہے۔ کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے۔ کچھ اسے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے۔ ۱۲ ثابت

اس عبارت میں مولانا آزاد مرحوم نے صاحب سراپا سخن کی تردید و تکذیب فرمائی ہے۔ البتہ اتنا سہو اُن سے بھی ہُوا۔ کہ اس عبارت میں سراپا سخن کے حوالہ سے مرزا دبیر مرحوم کے والد ماجد کا نام آغا جان لکھ گئے ہیں۔ مگر خدا مغفرت کرے آزاد مرحوم بہت نیک نیت۔ پاک طینت تھے۔ جب اوّل اوّل مَیں نے اُن کی کتاب آب حیات دیکھی۔ اور اس میں مرزا صاحب کے حالات میں کئی واقعہ غلط اور کئی حکائتیں ناسخ و آتش وضمیر کی خلاف واقع نظر آئیں۔ تو مَیں نے اُن کی خدمت میں ایک کارڈ بھیجا۔ کہ آپ نے ناسخ و آتش وضمیر کی حکائتیں اور کئی واقعات دبیر مرحوم کے باب میں غلط درج فرمائے ہیں۔ آب حیات میں اور ایسا شور پانی ملا ہے۔ افسوس ہے۔ اُس کے جواب میں اُن مرحوم نے صاف لفظوں میں اس غلطی کا اعتراف فرمایا تھا۔ اور لکھا تھا۔ کہ مجھ سے جس طرح لوگوں نے کہا۔ مَیں نے لکھ دیا۔ اب تم صحیح صحیح حالات لکھو۔ مَیں آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی کر دونگا۔ مگر افسوس قضاو قدر میں کیا چارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت آزاد آزاد نہ رہے۔ اُن کی حیات آب جنون کے شور چھینٹوں سے تلخ ہو گئی[۱] ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند +

۳-۴۔ تیسرا اور چوتھا نمبر مجموعہ سخن اور سخن شعرا کا ہے۔ یہ دونوں تذکرہ سراپا سخن کے بعد لکھے گئے۔ ایک نے ایک مقام کی عبارت اور دُوسرے نے دُوسرے مقام سراپا سخن کی گویا نقل کر دی۔ تحقیق کون کرے۔ اور شمس الضحٰے کون دیکھے[۲]۔ ہائے غفلت نیر امنہ کالا۔ آفتاب نکلا ہُوا ہے۔ پھر بھی لوگ رات رات پکارے جاتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر جو اس نئی روشنی میں اندھیر ہُوا ہے اُس کو نمبر ۵ میں بچشم غور دیکھئے +

---

[۱] اُس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مغل ہیں۔ میں نے میر محمد حسین صاحب لکھ دیا تھا جس پر مجھے تحریر فرمایا تھا۔ کہ بندہ آزاد سید نہیں ہے۔ بلکہ سیدوں کا غلام یعنی مغل ہے۔ اللہ اللہ کیسے خلیق و منکسر شخص تھے۔ خدا مغفرت کرے برسوں مجنوں رہنے کے بعد ابھی دو سال ہوئے کہ انتقال فرمایا ہے۔ ثابت (۵ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ) +

[۲] حالانکہ شمس الضحٰے ۱۳۰۹ھ میں مطبع اثناعشری کا لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے مگر افسوس ہندوستانیوں میں تحقیق و تنقید کا مادہ ہی بہت کم ہے + ثابت

فصل ۴ شیخ ناسخ و مرزا دبیر کے مختصر حالات

۵۔ پانچواں نمبر امراؤ مرزا صاحب حیرت (مالک کرزن گزٹ دہلی) کا ہے جنکو بعض لوگ چودھویں صدی کا مجدد (محقق) سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مرزا صاحب کو کالیستھ تو مسلم ہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو ارمغان یا چراغ دہلی مصنفہ مرزا حیرت صاحب[۱])۔ مگر اس کا جواب باصواب نواب سید مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالنسٹھ (میرے معزز کرم فرما اور استاد بھائی) کی طرف سے وقت پر پیسہ اخبار میں چھپ گیا۔ اور مرزا حیرت صاحب کی تردید ہو گئی جس کو سُن کر یا دیکھ کر مرزا حیرت پی گئے[۲]۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس لئے اور نیز اس خیال سے کہ مرزا حیرت صاحب خود شہادت جناب امام حسین ؑ کے منکر ہیں۔ مرزا دبیر تو اُن جناب کے ادنےٰ مداح ہیں[۳]۔ مَیں مرزا حیرت کی اس تحریر پر ایک نہ حیرت کرتا ہوں نہ اس سے زیادہ تردید ضروری سمجھتا ہوں + خیر مَیں اب ذات کی بحث کو زیادہ طول دینا فضول سمجھ کر اس شعر مولانا عرفی پر ختم کرنا چاہتا ہوں ؎

المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست + اینک بشہادت طلبم لوح و قلم را

مگر قبل اس کے کہ اور کچھ حالات لکھوں۔ اتنا اور لکھنا ضروری و مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ سید انشا جن کی شرافت نسب و نجابت و سیادت پر تمام تذکرے متفق ہیں۔ (اور باوصفیکہ مصحفی سے اور اُن سے کیا کیا چوٹیں چلیں۔ اور کیسی کیسی ہجو کی نوبت آئی بلکہ نوبت بجی۔ اور مصحفی کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا ہُوا پڑا تھا۔ پھر بھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ کہ آفتاب

[۱] مدت ہوئی جب میری نظر سے یہ کتاب گذری تھی اب نام بھی یاد نہیں رہا۔ مگر چراغ دہلی نام ہے تو یہ مثل اس موقع پر صادق آتی ہے کہ چراغ کے تلے اندھیرا کیونکہ مرزا صاحب معلوم ہوئی لہذا ایک خاندانی رئیس ہیں انکی نسبت حیرت دہلوی ہو کر ایسی ہو کر کھائیں مقام حیرت ہے ع حیرتی ہو تو کل العجاب مؤلف عفی عنہ +

[۲] پی گئے خاص روزمرہ ہے جس کا لطف اہل زبان یا زباندان اصحاب کو حاصل ہو سکتا ہے چنانچہ میرے استاد مکرم جناب منشی امیر مینائی مرحوم نے ایک مصرعہ مناسب بر اس روزمرہ کو نظم فرمایا ہے وہ یہ ہے ؎ ہجو مے کر رہا تھا منبر پہ۔ ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ +

[۳] مرزا دبیر کو جناب امام حسین علیہ السلام کا ادنےٰ مداح میں اس لیے کہتا ہوں کہ اُن جناب کے اعلےٰ مداح خود پروردگار عالم اور رسول مختار صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ اطہار علیہم السلام ہیں + ۱۲ ثابت

پر خاک ڈالے۔ اور سید انشا کے نسب و سیادت میں کلام کرے (یہ ایسے عالی نسب سید ہیں) انکی حقیقی نواسی سید معصوم علی مرحوم کی بیٹی مرزا دبیر مرحوم کی زوجہ تھیں۔ جن کے لختِ جگر میرے اُستاذ مکرم جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج مدظلہ (بقول مصنف خم خانہ جاوید شارح مرثیہ گویان حال) ہیں۔ جو فخریہ ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں سے نانا ہیں مرے سید عالی نسب انشا ٭ عاجز ہے خرد اُن کے فضائل ہوں کب انشا ٭ یہ رشتہ بھی مرزا صاحب مرحوم کی عالی نسبی پر ایک برہان قاطع ہے ٭

مختصر حالات سید انشا

از بسکہ سید انشاء اللہ خاں مرحوم کا نام آگیا ہے۔ میں اس مقام پر ناظرین کی اطلاع کیواسطے دو باتیں لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے انکا حال آب حیات میں لکھکر ان کے کمالات کی خوب داد دی ہے۔ اور پروفیسر آزاد مرحوم کے الفاظ سے ٹپکتا ہے۔ کہ سید انشا کے کمالات کی وجہ سے ان کو بدرجہ کمال محبت تھی۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر کوئی بات سید انشا کے حال میں غلط نہ لکھتے۔ مگر دو باتیں مندرجہ آب حیات خلاف واقع ہیں (جو قابل تنقید و تصحیح ہیں) جو غالباً پروفیسر آزاد مرحوم تک نہیں پہنچیں ٭

۱۔ آب حیات دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سعادت علی خاں نواب اودھ نے ان کی آخر عمر میں تنخواہ بند کر دی تھی۔ اور یہ محتاج و مجنون ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے بڈھے بڈھے آدمی عموماً اور ان کے نواسے جناب مرزا اوج مدظلہ خصوصاً مجھ سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ بس بات اسی قدر تھی۔ کہ نواب اودھ (سعادت علی خاں) نے یہ حکم دیدیا تھا۔ کہ سید انشا اپنے مکان پر ہر وقت رہا کریں۔ جب ہمارا چوبدار بلائے وہ آجائیں۔ اسی (حبس بیجا) کی طرف وہ اپنے اُن اشعار میں اشارہ فرماتے ہیں۔ جو صاحب علی شیرازی کو لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر یہ ہے سے

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا ٭ چساں کنم حرکت نوکریست یا بازی

اس حکم کا اُن کے دل پر ایک صدمہ ضرور تھا۔ مرزا دبیر مرحوم نے ایک رباعی میں ایسا مضمون بیان فرمایا ہے۔ جو گویا سید انشا کے حسب حال بلکہ اُن کی زبان سے (گویا) ہے سے

تصحیح حالات سید انشا

اس ہند میں طوطئ قفس کی مانند + خوبی سے زباں کو بندہ در گور ہوں میں

مدنبوہ محتاج یا مجنون مرتے مرتے نہیں ہوئے تھے +

۲۔ دُوسری بات قابلِ اظہار یہ ہے۔ کہ آبِ حیات کے دیکھنے سے لکھنؤ میں میرانشا کا آنا اور دربارِ نواب اودھ میں باریاب ہونا فقط ایک بار پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی سعادت علی خاں کے عہد میں۔ حالانکہ یہ اُن کا دوسری مرتبہ ادھیڑ عمر میں آنا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں آئے۔ جیسا کہ مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنی کتاب مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔ اور مولوی احمد علی صاحب کا لکھنا یوں قابلِ قبول ہے۔ کہ وہ سید انشا کے زمانہ کے آدمی ہیں[1] +

مولوی احمد علی صاحب نے جو لکھا ہے۔ اُس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔ سید انشا نے صغرسن میں تمام کتب صرف و نحو و منطق و حکمت صدرا تک پڑھیں۔ سولہ برس کی عمر میں نواب شجاع الدولہ (صوبہ دار اودھ) کے دربار میں حاضر ہو کر جلیسوں میں شامل ہوئے۔ اُس وقت تمام دیوان ہندی (اردو) نئے طرز پر بغیر کسی اُستاد کی صلاح کے تصنیف کر چکے تھے۔ اور کچھ فارسی و عربی اشعار بھی کہہ چکے تھے۔ مَیں (حقیر ثابت) جب کبھی میر انشا کا دیوان دیکھتا تھا۔ دل میں خیال کرتا تھا۔ دیوان کیا ہے۔ جوانوں کی اُمنگوں کا فوٹو۔ جوانی کے ارمانوں کا مرقع۔ ولولوں کا خاکہ ہے۔ کیا میر انشا ہمیشہ جوان ہی رہے۔ بڈھے کبھی نہیں ہوئے[2]۔ یہ

مولوی احمد علی صاحب کی زبانی حال سید انشا کا

---

[1] مخزن الغرائب فارسی میں ہے۔ اس موقع کی عبارت کی نقل شمس الضحیٰ میں چھپی ہے جس سے مؤلف تذکرہ ایک ذی علم باخبر شخص معلوم ہوتے ہیں۔ مَیں نے یہ خلاصہ شمس الضحیٰ سے لکھا ہے۔ مخزن الغرائب باوصف تجسّس کے مجھے اب تک نہیں ملی۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کے یہاں اس کی ایک نقل تھی۔ مگر پھر کوئی صاحب لے گئے واپس نہ دی۔ ۱۲ مؤلف حقیر +

[2] بجز ایک مشہور غزل کے جس کا مطلع یہ ہے "کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں + بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں" یا اور کوئی ایک آدھ غزل ایسی ہو۔ ورنہ تمام دیوان تغزل کے عاشقانہ رنگ سے رنگین ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

معما اس تذکرہ مخزن الغرائب سے حل ہؤا۔ کہ درحقیقت وہ دیوان عنفوان شباب کی تصنیف ہے +

پھر صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں نہایت حسین و وجیہ اور ایسے خوش تقریر تھے۔ کہ تمام دربار میں کوئی ایسا مقرب نہ تھا۔ آخر کو اکثر اہل دربار اُن سے حسد کرنے لگے۔ اور شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد عہد آصف الدولہ میں میر انشا لکھنؤ سے چلے گئے۔ کچھ روز نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے لشکر میں اور کچھ عرصہ تک بُندیل کھنڈ میں رہ۔ مگر پھر اپنے والد مرحوم حکیم میر ماشاء اللہ کی طرح دہلی محمد بیگ خاں ہمدانی کے پاس معزز رہے۔ (اس سے پہلے مولوی احمد علی صاحب اپنی کتاب میں میر ماشاء اللہ کے اعزاز کا یہ حال درج کر آئے ہیں۔ کہ جب وہ اپنے بگڑے ہوئے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس آئے ہیں۔ جب بھی اُنیس ۱۹ ہاتھی اُن کے ہمراہ تھے)۔ پھر دوبارہ (میر انشا) عالم پیری میں دہلی سے لکھنؤ آکر اوّل سلیمان شکوہ اور پھر الماس علی خاں (خواجہ سرائے شاہی) کے اور سب سے آخر میں نواب سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کے مصاحب خاص ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اردو چاروں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور بہادر اور خوش مزاج ہیں۔ مجھے بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی صحبت میں عجیب و غریب باتیں اور نقلیں سُن کر روتا ہؤا آدمی ہنس دیتا ہے۔ کبھی کبھی رستہ چلتے ہوئے آدمی سے دل لگی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ چپ ہو گیا تو خیر۔ ورنہ وہ گالیاں دے رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوئے ہنس رہے ہیں۔ یہ تو مزاج کی کیفیت ہے۔ اور یوں ہفت ہزاری کی مجال نہیں۔ کہ کوئی لفظ اُن کی شان کے خلاف کہدے۔ جے نگر میں باتوں باتوں میں مرزا اسمٰعیل بیگ خاں برادر زادہ محمد بیگ خاں ہمدانی سے لڑائی ہو پڑی۔ کٹار کھینچ کر (سید انشا) اُس کی طرف دوڑے۔ اور جو کچھ زبان پر آیا۔

مؤ شجاع الدولہ کا سال وفات پروفیسر آزاد مرحوم نے سہو سے صفحہ ۱۵۴ آب حیات میں ۱۱۸۸ھ لکھا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ آئندہ ایک دلچسپ بحث تقابل و تتبع انشاؤ نظیر کی میں لکھنا چاہتا ہوں + ۱۲ مولف حقیر۔

جاؤ بے جا کہا۔ یہی معاملہ مرزا قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ کے ساتھ لکھنؤ میں سعادت علی خاں کے روبرو پیش آیا تھا۔ کہ ایک شعر کی بحث میں سید انشا نے اُن کو ذلیل کیا۔ خیر اب میں سید انشا کو دربار اودھ میں چھوڑتا ہوں مگر قبل اس کے کہ مرزا صاحب کے حالات لکھوں۔ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے معزز معاصر۔ پروفیسر عبدالغفور صاحب شہباز مؤلف زندگانی بے نظیر نے (جنہوں نے واقعی نظیر اکبرآبادی کی بے نظیر سوانح عمری لکھی ہے) جو انشاء و نظیر کا بعض مقامات پر طرز کلام ملتا جلتا دیکھ کر یہ خیال و فیصلہ فرمایا ہے۔ کہ انشا نظیر کا متبع ہے۔ یہ میرے نزدیک بالکل معکوس ہے۔ کیونکہ خود پروفیسر شہباز صاحب کی تحقیق سے نظیر مرحوم کی موجودگی سنہ ۱۲۲۱ ہجری میں پائی جاتی ہے۔ کہ اُس سنہ کے ایک تذکرہ نویس دہلوی نے نظیر کا ذکر خیر لکھا ہے۔ اور سید انشا سنہ ۱۱۸۵ ہجری (سال وفات شجاع الدولہ) سے پہلے پہلے دیوان طیار کر چکے ہیں۔ کہ جب نظیر یا پیدا نہ ہوئے ہونگے یا پیدا ہو چکے ہونگے تو بچہ ہونگے +

پس حق یہ ہے۔ کہ نظیر مرحوم انشا کے مقلد و متبع ہیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ ذی علم و انصاف پسند پروفیسر شہباز صاحب اس پر نظر غور فرمائینگے۔ اور اگر میری تحقیق و رائے اُن کے نزدیک صحیح و قابل قبول ہوگی۔ تو زندگانی بے نظیر کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی فرما دینگے۔ کہ آئندہ نسلیں غلطی سے بچیں +

باب دوم۔ مرزا صاحب کے حالات ابتدائی

شجرۂ خاندان اور بزرگوں کے حالات دیکھنے سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ علم و تہذیب اس خاندان عالی شان میں گویا ہمیشہ سے ہے۔ اور شاعری و مدّاحی اہلبیتؑ بھی تھی۔ ہر چند یہ سلسلہ مدّاحی مسلسل قائم نہ رہا ہو۔ کیونکہ مرزا غلام حسین کی نسبت کسی تحریر سے مدّاح یا شاعر ہونا ابتک ثابت نہیں ہوا۔ مگر یہ بات بھی مرزا دبیر صاحب کے واسطے باعث فخر ہے۔ کہ آباؤ اجداد مسلسل شاعر یا مرثیہ گو نہ تھے۔ اس پر بھی اس صفت کو اُس معراج کمال پر پہنچایا۔

جس سے بڑھکر خدا کا نام[۵۱] ہے۔ چنانچہ خود وہ جناب فرماتے ہیں ؎

ہم فن مرے شاکی جو رہ ہوں رُوئے زمیں پر ✦ پہنچا دوں سخن کو میں ابھی عرش بریں پر

تاریخ ولادت

فصل ۲ تاریخ ولادت

گیارھویں جمادی اول ۱۲۱۸ھ (بارہ سو اٹھارہ ہجری) کو مرزا صاحب پیدا ہوئے[۵۲]۔

مقام ولادت

مقام ولادت

شہر دارالسلطنت دہلی۔ محلہ بلی ماراں متصل لال ڈگی مقام ولادت ہے۔ میرے خیال میں دہلی کی پیدائش صرف دو شاعر ایسے ہیں۔ جن کے حالات و خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اور جو اپنے اپنے فن میں بلکہ شاعری و مرثیہ گوئی کے فن میں یکتا مانے جاتے ہیں۔ اور دونوں اتفاق سے مغل ہیں۔ ایک تو مرزا رفیع سودا مرحوم دُوسرے مرزا سلامت علی دبیر مغفور ہیں[۵۳]۔ یہ دونوں شاعر دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ ان دونوں صاحبوں کی

---

[۵۱] پروفیسر آزاد مرحوم بھی آب حیات کے صفحہ ۵۵۰ و ۵۵۳ میں فرماتے ہیں۔ کہ مرثیہ گوئی کو مرزا دبیر نے اس مرتبہ تک پہنچا دیا۔ جس سے آگے ترقی کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئیگا نہ ویسے صاحب کمال پیدا ہونگے۔ یہ تو مرثیہ گوئی کی نسبت رائے تھی۔ شاعری کی نسبت پروفیسر آزاد کی یہ رائے ملاحظہ ہے۔ کہ میر انیس و مرزا دبیر خاتم شعرائے اردو ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۳ آب حیات ✦ ۱۲ ثابت۔

[۵۲] یہ تاریخ ولادت مجھے میر سید حسین عرف سید حسین جان صاحب شاگرد مرزا دبیر صاحب سے معلوم ہوئی کہ جو کہ والد ماجد سید حسن عرف حسن جان صاحب مرزا صاحب کے ابتدائی شاگردوں میں اور ہم عمر تھے۔ یہ تاریخ اُن کے پاس ایک کتاب میں لکھی ہوئی مل گئی جس کتاب میں اُن کے اور بزرگوں کی بھی تاریخ ولادت و وفات درج ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتائی میں اُنکی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں ✦ ۱۲ مؤلف

[۵۳] میر تقی میر مرحوم جنکے باب میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ متفق ہیں کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ معاصر مرزا سودا کو پورا شاعر اور درد کو آدھا اور سوز کو پون (شاعر) مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو آب حیات اور میر و سودا کے حالات۔ اور مرزا دبیر کو اُن کے تمام معاصرین تمام زمانہ پورا شاعر مانتا ہے۔ اور اُن کا کلام منوا کر چھوڑتا ہے۔ بشرطیکہ منصف مزاج سامع و ناظر ہو ✦ ۱۲ مؤلف

وجہ سے خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کو فخر ہے۔ ایسی مناسبت کسی تیسرے مشہور شاعر کو دہلی و لکھنؤ سے نہیں ہے۔ مثلاً میر تقی میر مرحوم اور مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور آگرہ کی پیدائش ہیں۔ درد۔ ذوق و مومن دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر لکھنؤ نہیں گئے۔ ناسخ و آتش و انیس مرحومین کی فیض آباد کی پیدائش ہے۔ میر انشا مرحوم کی مرشد آباد کی۔ مصحفی مغفور کی امروہہ کی ولادت ہے۔ شاہ نصیر دہلی کے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہے۔ وہاں دفن نہیں ہوئے۔ میر سوز اور جرأت اور میر حسن ضرور ایسے شاعر ہیں۔ جو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں پیوند زمیں ہو گئے۔ مگر یہ بزرگوار مثل سودا مرحوم کے ہر فنی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ صرف شاعر ہیں۔ مرثیہ گو نہیں ہیں۔ اور ناظرین کی یہی مرضی ہے۔ تو خیر میں ان کو بھی اس زمرہ میں لیکر پانچ کا مبارک عدد (بلحاظ پنجتن پاک) پورا کرنے کو طیار ہوں۔ یہ سب کامل ہیں۔ خصوصاً میر حسن کی میں بڑی وقعت کرتا ہوں۔ کہ جن کے پوتے جناب میر انیس مرحوم ہیں[1] باقی اپنے اپنے مقام پر سوز و جرأت بھی قابل تعریف ہیں۔ الحاصل مرزا دبیر کی وجہ سے اہل دہلی و لکھنؤ جتنا فخر کریں۔ تھوڑا ہے[2]۔

نام و تخلص

نام تو ناظرین کو اوپر (سلامت علی) معلوم ہو چکا۔ جو مرزا صاحب کی سلامت روی کی گویا خبر دے رہا ہے۔ تخلص دبیر نام سے زیادہ مشہور ہے۔ مگر میں تخلص کی تاریخ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ کس بزرگ کا عطیہ ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب اپنے

[1] اور میر حسن مرحوم کی مثنوی سحر البیان اردو کی جان فصاحت کی کان ہے جس کا جواب آج تک کسی سے نہ ہو سکا ۱۲ مولف

[2] بلکہ دہلی کے احاطہ پنجاب میں ہونیکی وجہ سے اہل پنجاب کو بھی فخر و مباہات کا موقع حاصل ہے۔ اہل پنجاب جلدی چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دہلی پنجاب سے تخت گاہ ہونیکے سبب سے نکل جائے۔ اور تم یہ موقع فخر ہاتھ سے کھو دو ۱۲ ثابت۔

والد ماجد (اور تمام کنبہ) کے ساتھ پانچ سات برس کی عمر میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ میں ان کے والد ماجد نے پڑھوانا شروع کیا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فراغ پا چکے تھے۔ کہ رجحان طبعی دیکھ کر ان کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے (یہ سنہ ۱۲۲۹ یا سنہ ۱۲۳۰ ہجری کا ذکر ہے) اور میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے کہا۔ کہ یہ بندہ زادہ ہے۔ اس کو مداحی اہلبیت کا شوق ہے۔ میر ضمیر صاحب نے (صاحبزادہ سے) مخاطب ہو کر پوچھا صاحبزادے۔ نام آپ کا۔ عرض کی۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ پوچھا۔ کیا پڑھتے ہو۔ جو کچھ پڑھتے تھے بتلایا۔ جب میر ضمیر صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہوگیا۔ کہ ذی استعداد و ذہین لڑکا ہے۔ دل میں بہت خوش ہوئے۔ فرمایا جو کچھ کہا ہو مجھے سناؤ۔ مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے + کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر + کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے[1]

مرزا دبیر کی پہلی تصنیف

یہ سن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین پھڑک گئے۔ کوئی صاحب بول اٹھے۔ صاحبزادے ماشاء اللہ چشم بد دور۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ مؤلف ع یہ بچپنے کی ہیں باتیں شباب کیا ہوگا۔ میر ضمیر صاحب نے پھر پوچھا تخلص کیا کرتے ہو۔ عرض کیا تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرما دیں۔ فرمایا دبیر[2]۔ اور پھر کہا۔ "بر دبیراں روشن ضمیر مخفی و محجب نماند" اور مسکرا کر بولے۔ صاحبزادے۔ میں نے اپنے نفس و نام پر تمکو مقدم کر دیا۔ کہ اس

---

[1] بعض حضرات اس کو رباعی سمجھتے ہیں مگر یہ اُن کی عروض سے ناواقفی ہے۔ رباعی کے لئے بحر ہزج خاص ہے۔ اور یہ نظم اُس بحر میں نہیں ہے۔ اس لئے قطعہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ یہاں پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ شاید سنہ ۱۸۸۲ء میں مجھ سے بمقام آگرہ شاہ گنج وزیر صاحب مرحوم شہزادہ خلف الصدق جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسمہ فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب کے روبرو ایک انیسیے اور ایک دبیرئے جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے ممدوح کے کلام کو پڑھ کر اُس کی خوبیاں بیان کر کے دوسرے پر ترجیح دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ دبیرئے بولے۔ اور باتیں تو درکنار ایک تخلص ہی کو دیکھئے کس قدر عظمت اور برکت نمایاں ہے۔ اُس کے وزن پر کس کثرت

لطیفہ

مشہور جملہ ہیں دبیر اوّل ضمیر بعد کو ہے۔ مَیں تمکو بتاؤنگا ضرور لکھا کرو۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کی زبان فال ہُوا کرتی ہے۔ جو کچھ میر ضمیر (روشن ضمیر) نے فرمایا تھا وہی ہُوا۔ کہ آج مرزا دبیر میر ضمیر پر تمام ملک کے نزدیک گویا مقدم ہیں۔ اپنے اُستاد سے بڑھکر شہرت اور عزّت پائی۔ زیادہ شاگرد پائے۔ اور اس فن مرثیہ گوئی (رزم و بزم) کو جس کے موجد میر ضمیر ہیں ترقّی دی۔ اس موقع پر دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ اِس لئے مَیں ایک عجیب وغریب بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ مَیں نے بہت سے تذکرے دیکھے۔ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر نظر آئے۔ مگر دبیر تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا مجھے نظر نہیں آیا۔[۱]

منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم گویا اسی موقع کے لئے فرما گئے ہیں ؎

شاعراں حال کیا مضمون تو باندھیں اسیر + ڈھونڈھتے ہیں یہ تخلص بھی نیا ملتا نہیں

مرزا صاحب مرحوم نے جا بجا اپنے مرثیوں میں شاعرانہ دعوے فرمایا ہے ؎

کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے + مضمون بھی ہمارا نہیں لڑتا ہے کسی سے

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ؎

وہ تازہ مضامین کا رن آج پڑیگا + مصرع تو کہاں ذہن کسی کا نہ لڑیگا

تیسرے مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

ماتم کی انجمن ہے یہاں رن نہ پڑنے پائے + صابر کا مرثیہ ہے نہ مضمون بھی لڑنے پائے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) سے تخلص ہیں اور کثرت سے مرزا صاحب کے شاگرد ہیں مشیر۔ منیر۔ مطیر۔ نظیر۔ تدبیر۔ ظہیر۔ فقیر۔ امیر۔ وزیر۔ خبیر۔ نصیر۔ صفیر۔ سفیر۔ حقیر۔ صغیر۔ کبیر وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کیا ہے ڈھاک کے تین پات انیس۔ نفیس۔ سلیس آگے بڑھتے آ جلیس۔ منشی صاحب نے فرمایا تخلص تو اُدھر بھی بہت ہو سکتے ہیں۔ پوچھا کیا۔ فرمایا۔ اُنیس۔ بیس۔ اکیس۔ بائیس۔ تیئیس۔ اڑتالیس تک۔ حاضرین یہ لطیفہ سُن کر بے اختیار ہنسے۔ اور فضول جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا + ۱۲ مؤلف۔

[۱] ناظرین کتاب میں سے اگر کوئی صاحب یہ تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا دیکھ چکے ہوں۔ تو کرم فرما کر مجھے آگاہ فرمائیں کہ انشاء اللہ دوسری مرتبہ چھپنے پر اپنے خیال کی تردید اور اُن کا شکریہ درج کتاب کرونگا + ۱۲ اثابت بے بضاعت

مرزا صاحب زندہ ہوتے۔ تو مَیں اُن سے عرض کرتا۔ اب اُن کی رُوح سے گزارش کرتا ہوں کہ مضمون اور مصرع لڑانا تو درکنار حضور کا تخلص بھی کسی سے نہیں لڑا۔ درحقیقت آپ امام صابرؑ کے دل سے مداح تھے ممکن ہے کہ یہ بھی اُسی کا اثر ہو +

مرزا صاحب کا حلیہ — حلیہ لکھنے سے پہلے اتنا عرض کرتا ہوں۔ کہ مَیں نے کوشش بلیغ کی۔ کہ لکھنؤ میں یا اور کہیں مرزا صاحب مرحوم کی قلمی یا عکسی تصویر مل جائے۔ مگر ناکام رہا[1]۔ دریافت پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور بعض معمر اصحاب کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ فوٹو کا مسئلہ علمائے اسلام میں مختلف ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب نے اپنی تصویر نہیں کھچوائی۔ حالانکہ شاہی فوٹوگرافر مشکور اللہ مرحوم مرزا صاحب مرحوم کے فدائی شاگرد نے بہت چاہا۔ مگر مرزا صاحب تصویر کھچوانے پر راضی نہ ہوئے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی نے کلکتہ۔ پٹنہ۔ بنارس۔ آرہ۔ کھجوہ وغیرہ میں اُنکی بغیر اجازت فوٹو لے لیا ہو۔ کہ ان مقامات پر مرزا صاحب بعد غدر ۱۸۵۷ء گئے ہیں۔ خیر اب حلیہ ملاحظہ فرمایئے

حلیہ — پکا سانولا رنگ۔ کسی قدر کشیدہ قامت۔ ماتھا بڑا۔ کثرت سجود سے ماتھے پر سجدہ کا نشان جو نہایت خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی جو ایرانی الاصل ہونیکا پتہ دیتی تھیں۔ گول دُہرا ڈیل[2]۔ دو انگشتی ڈاڑھی۔ بڑی اور پاٹ دار دلگداز آواز۔ واعظ و ذاکر کے واسطے بڑی اور دلگداز آواز ہونا بھی ایک خداداد نعمت ہے۔ مگر حسد بُری بلا ہے

---

[1] قدردان علم و ہنر مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے قریباً تمام ہندوستان کے سربرآوردہ اردو اخباروں میں بطور اشتہار خطوط شائع فرمائے۔ اور اپنی جیب خاص سے ۵۰ تصویر لانیوالے صاحب کو دینا چاہے مگر تصویر دستیاب نہ ہوئی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ اب سے تیس سال پہلے ایک یورپ کا علم دوست سیاح مرزا صاحب کے حالات و کلام لیگیا۔ مگر تصویر اُس کو بھی نہ ملی۔ حالانکہ اُس نے لکھنؤ میں بہت تلاش کی تھی۔ اور اُس زمانہ میں مرزا صاحب کے انتقال کو بھی تھوڑا عرصہ گذرا تھا + ۱۲ مولف۔

[2] جس سے خیال ہوتا تھا۔ کہ ضرور ورزش جوانی میں کی ہوگی بلکہ ہر روز تخلیہ میں کثرت کرتے ہوں۔ تو کیا عجب ہے + ۱۲ مؤلف بے بضاعت

معلوم ہوتا ہے۔ کہ کچھ لوگ اس بڑی آواز کو بھی نام رکھتے تھے۔ چنانچہ خود ایک رباعی میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں۔ رباعی سلہ

جب شاہ نجف معین و ناصر ہوئے + کیوں سب میں نہ ممتاز یہ ذاکر ہوئے
آواز ہے بھاری تو ہو۔ پر بات یہ ہے + مجلس میں سخن نہ بار خاطر ہوئے

لباس۔ سر پہ گول تیج گوشیہ ٹوپی۔ جسم میں اندر شلوکہ۔ اُوپر ڈھیلا کُرتہ جو گھٹنوں سے نیچا ہوتا تھا۔ اُس کے نیچے ڈھیلا پائجامہ۔ اور پائجامے کے نیچے ایک جانگیہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے۔ پاؤں میں گھیتلا جوتہ +

غذا۔ صرف ایک وقت دن میں نو دس بجے غذا نوش فرماتے تھے۔ رات میں صرف چائے پیتے تھے۔ اور جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے تھے۔ اُن کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے۔ اور تپ محرقہ میں سات روز تک بیہوش رہے۔ تو اچھے ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت غذا کر دی گئی تھی۔ مگر چند روز کے بعد جو دیکھا۔ تو پھر رات کی غذا نادر دتھی۔ جناب استاذی اوج مدظلہ نے پوچھا۔ تو فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے رات کی غذا ترک کر دی +

استعداد علمی۔ یہ بات لکھنؤ میں خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً مشہور ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھیں۔ جملہ علوم معقول و منقول میں تبحّر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ صرف و نحو و منطق و ادب و حکمت وغیرہ مولوی غلام ضامن سلہ صاحب (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) سے اور کتب فقہیہ حدیثیہ

سلہ ان اکثر حالات کو مصنف اصلی نے بیان فرمایا ہے۔ اور بعض امور کی صحت خود حضرت اوج مدظلہ سے حقیر نے کر لی ہے۔ حقیر نے خود بھی جناب مرزا صاحب علیہ الرحمہ کی زیارت کی ہے اور اُنکو پڑھتے بھی سُنا ہے۔ دردولت پر بھی باریاب ہوا ہے جناب مرحوم کا انتقال ہوا میری عمر آٹھ سال کی تھی بعض حالات مرحوم (اپنے نانا) میر محمد حافظ سے سُنے۔ کچھ شمس الضحیٰ سے لئے۔ اس طرح یہ مجموعہ مرکب طیار ہوئی + ۱۲ مؤلف حقیر

سلہ مولوی غلام ضامن مرحوم اُس زمانہ کے ایک فاضل متبحر تھے۔ بیر ونیہ آزاد مرحوم نے بھی حرزانا (؟) کے حالات میں

تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی صاحب (طاب ثراہ) سے پڑھی تھیں۔ علاوہ ان کے ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی اور مولوی فدا علی صاحب اخباری (رحمہما اللہ) سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا تھا۔ مولوی فدا علی صاحب اخباری کے ایک شاگرد رشید مولوی گلشن علی صاحب اخباری جون پوری نے ایک مجلس میں مرزا صاحب سے فخریہ کہا تھا۔ کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک اُستاد کے شاگرد ہیں اس لئے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ بیشک آپکا اور میرا فخر ہے۔ کہ آپنے اور مَیں نے ایسے محدث کامل سے پڑھا ہے۔ اور آپ میرے اُستاد بھائی ہیں +

مذہب۔ ازبسکہ مرزا صاحب مرحوم کے کئی اُستاد اخباری تھے۔ بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے۔ مگر تحقیق یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب ایک محتاط اصولی شیعہ تھے +

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) آبحیات کے صفحہ ۲۷ کو ان کے ذکر خیر سے بڑے تازہ بخشی ہے اور یہ نقل لکھی ہے۔ کہ "مولوی غلام ضامن صاحب منتہی کے فاضل تھے۔ ایک دن غزل لیکر (مرزا فاخر مکیں کشمیری کے پاس) گئے۔ کہ مجھے شاگرد کیجئے۔ اور اسے اصلاح فرمائیے مرزا فاخر نے ٹال دیا۔ مولوی صاحب نے پھر کہا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ اور کچھ خلقی کرنے لگے۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے سب مولوی صاحب نے ادا کئے۔ ایک نہ قبول ہوا۔ ناچار یہ شعر پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ع "مرزا مکیں ما نشود چہل بکیں ما + لیکن بست جز و عظم مرزا مکیں ما" اس سے مولوی غلام ضامن صاحب کی طبیعت حاضر کی روانی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ کیسا فی البدیہ برجستہ لاجواب شعر فرمایا ہے + ۱۲ مؤلف۔

سلہ مرزا کاظم علی صاحب کا ذکر خیر کچھ اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علم و فضل کی تمام لکھنؤ میں دھاک تھی۔ اور زہد و ورع کا شہرہ تھا۔ انہیں کے اخلاق حمیدہ کی نسبت مرزا جعفر علی صاحب فصیح مرحوم مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں ؎ عام عامل نقیبہ لوذعی　ہادی کامل امام یلمعی + ابر رحمت آفتاب مکرمت + کوکب دُرّی سحاب مکرمت + مالک اقلیم زہد و اتقا + حکمران کشور حلم و حیا + حامی دین ماحی کفر و ضلال + سرگروہ عالمان باکمال + گلبن شاداب گلزار علی + طالب حق میرزا کاظم علی + جناب شیخ ناسخ نے بھی ان کی تاریخ وفات بہت عمدہ کہی ہے۔ اور بہت مدح اخلاق حمیدہ فرمائی ہے + ۱۲ مؤلف۔

استاد فن شعر

فن شعر میں وہ میر مظفر حسین صاحب ضمیر مغفور کے شاگرد تھے۔ مگر تمام اساتذہ کو نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید حسن صاحب لطافت مرحوم (خلف الصدق امانت مغفور) نے مرزا صاحب سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ کیا آپ کو دلگیر مرحوم سے بھی تلمذ تھا۔ فرمایا اگر تلمذ ہوتا۔ تو میرا فخر تھا۔ لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا +

حقیر عرض کرتا ہے۔ کہ درحقیقت فن شعر میں تو اُن کے اُستاد صرف ایک میر ضمیر مغفور ہی تھے۔ مگر ان اساتذہ اربعہ میں بھی سب کے سب ادیب یا شاعر بلکہ شاعر گر تھے۔ اس لئے بہت سے رموز شاعری ان کو علماء ممدوحین سے حاصل ہوئے تھے۔ یہ حضرت ملا مہدی مازندرانی طاب ثراہ کا فیض تلمذ و صحبت خدمت ہے۔ کہ مرزا صاحب کی فارسی کی نظم بھی اعلےٰ درجہ کی ہے۔ خصوصاً ہفت بند ملا کاشی رح کا مخمس قابل دید ہے۔ کہ ہر بند کے پانچوں مصرع ایک ہی شخص کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک زباندان کے لئے کمال کی بات یہ ہے۔ کہ وہ اپنا کلام اہل زبان کے کلام سے ملا دے +

باب سوم۔ مرزا صاحب کی شہرت اور ترقی

باب شہرت شاعر فصل ا

مرزا صاحب کی شاعری۔ مرثیہ گوئی۔ تحصیل علم۔ عمر عناصر اربع کی طرح ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں۔ ذہین و ذکی حد درجہ کے تھے۔ اٹھارہ اُنیس سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اسی درمیان میں مرثیہ گوئی کو بھی خوب شہرت ہو گئی۔ اب تک لکھنؤ میں چار مرثیہ گو مستند مانے جاتے تھے۔ ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ اب مع دبیر پانچ مانے جانے لگے۔ گویا مرثیہ گوئی کی ٹوپی اب تک چوگوشیہ تھی۔ اب پنج گوشیہ ہو گئی۔ مرزا صاحب کی شاعری کو خداداد طبیعت و ذہن نے (کہ وہ قدرتی شاعر تھے) اور ذہن کو علم نے اور علم کو حلم نے اور حلم کو تقوے و پرہیزگاری نے چمکا یا۔ ان تمام اوصاف حمیدہ کی سرتاج

سخاوت و مہمان نوازی تھی جو خدا نے مرزا صاحب کی سرشت و خمیر میں رکھی تھی۔ ابھی تک بزرگوں کے وقت کا اسباب بیچ بیچ کر مرزا صاحب کے والد ماجد کھاتے تھے۔ مرزا صاحب کا دل جس مہمان نوازی اور سخاوت کو چاہتا تھا۔ اُس کے وہ جوہر نہیں دکھلا سکتے تھے۔ مگر سے بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد۔ اگر خارے بود گلدستہ گردد۔ اب اُس کا عجیب و غریب موقع آیا +

اسباب ترقی قدرتی پیدا ہو گئے۔ جہاں جہاں بڑی بڑی مجلسوں میں میر ضمیر صاحب سے مجلس میں پڑھنے کا وعدہ لیا جاتا تھا۔ وہاں وہاں مرزا صاحب سے بھی لوگ وعدہ لینے لگے۔ اور اُن مجلسوں کے علاوہ بھی مرزا صاحب کو لوگ پڑھوانے لگے۔ لکھنؤ کی ریاست ایسی جلدی جلدی ترقی کر رہی تھی۔ کہ گویا عنقریب یہ سلطنت بن جائیگی۔ دہلی۔ آگرہ کے خصوصاً اور ہندوستان کے اور شہروں اور قصبوں اور دیہات کے عموماً اہل کمال سمٹ کر لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ بادشاہ سے لیکر امراء بلکہ غربا فقرا تک سب کے سب بھی یا شیعہ تھا یا صوفی یا ایسے سُنّی کہ جو عزائے شہدائے کربلا کو اپنا فرض اعتقادی سمجھتے تھے۔ مرثیہ گویوں اور ذاکروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ نہایت عزت و احترام اور ادب و عاجزی کے ساتھ ذاکر کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں اہل ہنود بھی مجلسیں کرتے تھے۔ اور اکثر لوگ مرزا صاحب کو بلواتے تھے۔ اور ان کے کلام کے مشتاق رہتے تھے۔ شاعروں کا فروغ بادشاہوں یا امیروں کی دست گیری سے ہوا کرتا ہے۔ مگر دبیر کا فروغ ائمۂ اطہار و شہدائے کربلا کی بدولت

حاشیہ (بیرونی حاشیہ میں): اسباب ترقی فصل ۵

ہوا اپنے نفس کے واسطے تو شاید ہی مرزا صاحب دولت و ثروت کے طالب ہوں۔ اس لئے کہ جہاں تک میں نے سُنا۔ اور اُن کے کلام میں غور و تامل کیا۔ وہ مفلسی اور بے زری کو مالداری پر ترجیح دینے والے آدمی تھے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں سے سر کو سر گشتہ بہر ساماں نہ کیا + دل کو بے جمع زر پریشاں نہ کیا۔ ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں + احساں کیا جو ہم پہ احساں نہ کیا + ۱۲ مؤلف حقیر

ہُوا۔ اس مضمون کو وہ خود ایک مرثیہ میں یُوں فرماتے ہیں:۔

خاقانی و فردوسی و سعدی و نظامی + شاہوں کی مدد سے ہُوئے آفاق میں نامی
عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی + دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے حقِ غلامی
ہیں دو ہی دبیر اس میں نہیں ایک کو شک ہے
منبر مری جاگیر مقام اُس کا فلک ہے

فصل ۳ شاہِ اودھ نے مرزا صاحب کو بُلا کر سُنا

جہاں تک میرا حافظہ اور یادداشت تحریری[1] مدد دیتی ہے۔ اور مَیں نے سُنا ہے۔ پہلے پہل مرزا صاحب کو پہلے بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر مرحوم نے شہرۂ کلامِ کمال سُن کر اپنے عزاخانہ خاص میں پڑھنے کو چوبدار بھیج کر بُلوایا۔ مرزا صاحب پینس میں سوار ہو کر اپنے معمولی لباس میں (جو مَیں اُوپر لکھ آیا ہُوں) پہنچے۔ راہ میں ایک بند کہ لیا تھا۔ عزاخانہ میں بادشاہ سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعد سلام لینے کے مرثیہ پڑھنے کا اشارہ فرمایا۔ تو مرزا صاحب نے منبر پر جا کر حمد و نعت و منقبت میں ایک ایک رباعی پڑھ کر وہی بند پڑھا۔ وہ بند یہ ہے:۔

واجب ہے حمد و شکر جناب الٰہ میں + فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں + چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرّے پہ چشمِ مہر ہے مہرِ منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو[2]

[1] یہ واقعہ اور یہ بند میں نے اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کی زبانی غالباً اب سے ۳۰ سال پہلے سنا تھا۔ ازبسکہ اب سے ۳۰ سال پہلے میں نے ایک مفصل تذکرہ آبحیات کے رنگ میں محض مرثیہ گویوں کا لکھنا چاہا تھا۔ اُس زمانے کے بعض اخباروں میں اشتہار بھی دئیے تھے اور لکھنؤ میں جو حالات معمر آدمیوں سے سنے تھے وہ بعض لکھ لئے تھے بعض اب تک یاد ہیں۔ مگر پورے پورے حالات نہ ملنے پر وہ عزم تو فسخ کر دیا۔ وہ یادداشتیں اور حالات اس کتاب کی ترتیب کے وقت بہت کام آئے۔ سچ ہے خدا کسی کی محنت برباد نہیں کرتا + ۱۲ مولف حقیر

[2] اس بند کے مضمون پر ذرا خیال کیجئے۔ بادشاہ کی مدح بھی کی۔ تو کس نئے انداز سے کہ اس میں بھی خدا کی تعریف ہے۔

پھر یہ مرثیہ جو اُسی زمانے میں کہا تھا۔ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔ [۱]

داغ غم حسینؑ میں کیا آب و تاب ہے

جب مرثیہ پڑھتے پڑھتے اُس موقع پر پہنچے۔ کہ جناب سکینہ (دختر چار سالہ امام حسینؑ) نے یزید کو بادشاہ سمجھ کر اُس کے رُوبرو فریاد کی ہے۔ اور اُس کے لشکریوں کے ظلم کی داد چاہی ہے۔ تو بادشاہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بند یہ ہے (جناب سکینہ یزید سے کہہ رہی ہیں)

جب روز کبریا کی عدالت کا آئیگا + جبّار بادشاہوں کو بھی بلائیگا
انصاف عدل اُن سے بہت پوچھا جائیگا + تو آج داد دینے کی کل داد پائیگا
گُل کر دیا ہے دونوں جہاں کے چراغ کو
لُوٹا ہے تیرے عہد میں زہراؑ کے باغ کو

بادشاہ نے خواجہ سرا کو اشارہ کیا۔ کہ پھر پڑھواؤ۔ خواجہ سرا نے مرزا صاحب سے کہکر یہ بند دوبارہ پڑھوایا۔ بادشاہ کو اپنا خیال آگیا۔ یہ بند گویا تازیانہ عبرت ہوگیا۔ مرزا صاحب تو مرثیہ پڑھ کر چلے آئے۔ بادشاہ کو رات بھر خوف خدا سے نیند نہ آئی۔ بار بار کہتے تھے۔ کہ خدا نے مجھے بھی بادشاہ کیا ہے۔ مجھ سے بھی سخت بازپرس ہوگی۔ دیکھئے میری غفلت مجھے کیا دکھاتی ہے۔ سویرے معتمد الدولہ آغا میر وزیر کو انصاف و عدالت کے باب میں بہت تاکید فرمائی + [۲]

یہ بات بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ کہ فسانۂ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور نے عہد غازی الدین حیدر میں لکھنا شروع کیا۔ اور زمانہ نصیر الدین حیدر میں تمام کیا۔ اسی

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اور یہ بھی شکر کے قابل جگہ ہے۔ اور شکر خدا عقلاً و نقلاً واجب ہے۔ کتنی سچی بات کہی ہے۔ واقعی رستہ میں جب لوگوں نے یہ سُنا ہوگا۔ کہ آج جہاں پناہ نے مرزا دبیر کو مرثیہ پڑھنے کو بلوایا ہے۔ تو ضرور چرچا کیا ہوگا۔ فوراً لکھنؤ بھر میں شور مچ گیا ہوگا + ۱۲ مؤلف

[۱] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے + ۱۲ ثابت۔

[۲] یہ کچھ میں نے نہیں سُنا کہ بادشاہ ممدوح نے مرزا صاحب کو نذرانہ کیا دیا۔ مگر عقل چاہتی ہے کہ ہزار دو ہزار روپیہ ملا ہوگا۔ ۱۲ مؤلف

فصل ۲ — بزمانہ غازی الدین عہد میں مرزا رجب علی بیگ سرور صاحب کی شہرت تھی یا نہیں فسانۂ عجائب سے ثابت

وجہ سے وہ کہتے ہیں سے یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ۔ پس عہد غازی الدین حیدر میں جن مرثیہ گویوں کی شہرت تھی۔ اور جو موجود تھے یا گذر چکے تھے۔ اُن کے نام سرور اس تلمیح سے لیتے ہیں۔ اصل مدح تو دلگیر مرحوم کی کرتے ہیں جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ دلگیر سے سرور کو زیادہ محبت و عقیدت تھی[۱]۔

"مرثیہ گوبے نظیر۔ میاں دلگیر۔ صاف باطن۔ نیک ضمیر۔ خلیق فصیح۔ مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔" تلک عشرۃ کاملۃ۔ اس دو تین سطر کی عبارت میں سرور نے کمال کیا ہے۔ کہ دلگیر۔ ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مسکین۔ افسردہ۔ دبیر۔ سکندر۔ گدا۔ احسان۔ دس مرثیہ گویوں کے جو اس زمانہ تک گذر چکے تھے یا موجود تھے تخلص لکھ دئے ہیں۔ المختصر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہوں کے زمانہ میں مرزا صاحب کو بہت شہرت ہوگئی۔ اور یہ اُستاد مان لئے گئے۔ اور غربا و امرا سے لیکر شاہزادیاں اور بیگمیں تک ان کی شاگرد ہوگئیں۔ جن میں سے حسب ذیل نام آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (۱) ملکہ زمانی مرحومہ محل نصیر الدین حیدر بادشاہ۔ (۲) سلطان عالیہ دختر ملکہ زمانی۔ (۳) حاجی بیگم صاحبہ دختر نصیر الدولہ۔ جو بادشاہ ہوکر محمد علی شاہ کہلائے۔ (۴) نواب ممتاز الدولہ شوہر و داماد شاہ اودھ۔ ان سرکاروں سے مرزا صاحب کے سفارشی رقعوں پر اہل حاجت کو سالانہ لاکھوں روپیہ[۲] ملا کرتا تھا۔ اور یہ

سلہ سُنا ہے کہ دلگیر مرحوم سے اُس زمانہ کے تمام اہل کمال محبت رکھتے تھے۔ وہ ایسے ہی وسیع الاخلاق نیک نہاد بزرگ تھے۔ شیخ ناسخ سے کمال اُستاد لکھنؤ سے جب الہ آباد گئے ہیں۔ تو دلگیر کو اس شعر میں یاد فرماتے ہیں سے مصرعہ ایسے زمانے میں یکساں ہوتے ہیں + آپ دلگیر ناسخ جو ہے دلگیر ہوا۔ واقعی نیکی طبیعت عجب جوہر ہے۔ جو کمال پر صیقل کرتا رہتا ہے + ۱۲ مولف حقیر۔

سلہ۲ اس موقع پر لاکھوں روپیہ کے لفظ میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ واقعی یہی حال تھا + ۱۲ مولف حقیر۔

شاہزادیاں [ع۲ و ۳] مرزا صاحب کی شاگرد بھی تھیں۔ مرزا صاحب کو آبا جان کہتی تھیں۔ حالانکہ مرزا صاحب نوجوان تھے۔ مگر ان کی عفت اور نیک چلنی بھی ضرب المثل تھی۔ بڑے بڑے شاہزادے اور حکام در دولت [ع۱] پر حاضر ہوتے تھے۔ جس قدر مرزا صاحب کی شہرت و نیکنامی بڑھتی جاتی تھی۔ حاسدوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔ اور یہاں بمصداق المرء یقیس علی نفسہ [ع۲] مرزا صاحب کسی کو اپنا دشمن ہی نہ سمجھتے تھے۔ اُن کے صاف دل کی تصویر اس انہیں کے آئینہ شعر میں نظر آ رہی ہے [ع۵]

حاسد کو ہے پیچ و تاب کیوں موج کی شکل + یاں مثل حباب کچھ نہیں ہے دل میں

لوگ گھات میں لگے ہوئے تھے۔ خصوصاً وہ بعض شاگردان میر ضمیر صاحب جو مرزا صاحب سے پہلے کے شاگرد تھے۔ اور اب پیچھے رہ گئے تھے۔ حسد کا تازیانہ لگا کر اپنے فرس فراست و شہرت کو آگے نکالنا چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں نے سوچا۔ کہ شاگرد اور اُستاد میں بگڑوا دو۔ تاکہ مرزا صاحب بے اصلاحی کلام پڑھیں۔ قلعی کھلے۔ ہم کو اعتراض کا موقع ہاتھ آئے۔ کیونکہ یہ لوگ مرزا صاحب کے کلام کی تمام خوبیاں میر ضمیر صاحب کی اصلاح کی بدولت سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک دریا دل۔ امیر کبیر افتخار الدولہ مرحوم نے (جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ آخر الامر کربلائے معلےٰ میں جا کر روضۂ اقدس کے کلید بردار ہو کر وہیں سے سیدھے راہی جنت ہوئے) جن کے یہاں شبوں کی مجلسوں میں (جو ۱۹-۲۰-۲۱ ماہ رمضان کو ہوتی تھیں) اول مرزا دبیر بعد میر ضمیر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صاحبوں سے انیسویں کو اصرار بلیغ کیا کہ الکیسویں [ع۲۱]

ع۱ اس فقرہ کی تائید میں تاریخ بہارستان اودھ دیکھئے + ۱۲ ثابت۔

ع۲ یعنی ہر شخص اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے۔ ایک سلام میں حقیر نے اس مضمون کو عرض کیا ہے [ع۵] جو نیک ہیں وہ سمجھتے ہیں نیک اوروں کو + خیال جیسا ہے ویسا ہی خواب دیکھتے ہیں۔ یہی تو وجہ تھی۔ کہ حضرت آدم ایسے کامل العقل ہو کر اپنی زوجہ کے کہنے میں آ گئے۔ گیہوں کھا گئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کو آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہکر پڑھیں۔ دونوں صاحبوں نے جواب میں "انشاء اللہ"
اور "بشرطِ فرصت" کے معمولی الفاظ کہکر وعدہ کر لیا۔ مرزا صاحب کی مشقِ سخن اُن کے شباب کی
طرح زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور ہے۔
ع ذرّہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا۔ صبح کو حسبِ معمول علی الصباح میر ضمیر صاحب کی
خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا۔ حضور نے کچھ فکر فرمائی۔ فرمایا۔ مجھ کو اتنی فرصت کہاں۔ ایک مرثیہ
پہلے کا کہا ہوا ہے۔ اُسی میں مطلع اور چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں۔ وہی پڑھ دونگا۔ مرزا
صاحب نے اپنا نیا مرثیہ پیش کیا۔ اس کی زبان سلیس۔ بندش چست۔ بیان دلکش۔ شوکت
الفاظ مؤثر وغیرہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور تعریف کی۔ مرزا صاحب نے عرض کی۔
یہ سب حضور ہی کا فیض اور تصدق ہے۔ ارشاد ہو تو آپ پڑھیں۔ میں کچھ عذر کر دونگا۔ میر ضمیر
صاحب نے انکار کیا۔ میر مظفر علی صاحب اسیر (شاگرد میر ضمیر صاحب یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کے
ہمدرد تھے) بولے۔ میں مرزا صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے شک
یہ بات نامناسب ہے۔ کہ شاگرد نیا مرثیہ پڑھے اور استاد پرانا۔ میر ضمیر صاحب بولے
او میر صاحب[1] ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ خیر تم کہتے ہو تو یونہی سہی۔
پھر اپنے مرثیہ وہ مرثیہ دیکھ کر کہا۔ کہ اچھا اُدھر کا ٹکڑا جس میں فضائل ہیں تم پڑھو۔ اور
وہاں پر نشان بھی کر دیا۔ اخیر کا حصہ جس میں مصائب ہیں میں پڑھونگا۔ مرزا صاحب بولے
بہت خوب۔ جہاں تک استاد نے حکم دیا تھا۔ وہ ورق پھاڑ لئے۔ باقی مرثیہ وہیں
چھوڑ آئے۔ [illegible] کو دونوں صاحب مجلس موعودہ میں شریک ہوئے۔ افتخار الدولہ
نے اوّل مرزا صاحب سے کہا۔ آپ حسبِ وعدہ نیا مرثیہ پڑھئے۔ اُنہوں نے کہا۔

---

[1] او میر صاحب [illegible] صاحب کا [illegible] میر [illegible] کی زبانی لکھتا ہوں جو ان تمام معرکوں میں شریک
تھے [illegible] لکھنؤ [illegible] ہے۔ مؤلف

[2] [illegible]

جناب اُستاد قبلہ مدظلہ کا نو تصنیف مرثیہ ہے۔ نصف میں پڑھونگا نصف جناب اُستاد پڑھیں گے۔ یہ کہکر منبر پر گئے حسب معمول دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے۔ ادھر میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر صاحب سے سرگوشی کی۔ اور کہا اول کا ٹکڑہ بہت چُست اخیر کا سُست ہے۔ مَیں مرزا صاحب کو منع کئے دیتا ہوں کہ یہ مرثیہ نہ پڑھیں اور کوئی مرثیہ پڑھ دیں میر صاحب نے فرمایا اب یہ مناسب نہیں۔ مگر یہ کب مانتے تھے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی آنکھ سے اشارہ کر چکے تھے کہ ذرا ٹھیرئیے۔ وہ منبر پر چُپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجلس تصویر حیرت بنی ہوئی ہے۔ سناٹے کا عالم ہے۔ کہ میر بشیر نے قریب منبر پہنچ کر مرزا صاحب کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر آہستہ آہستہ کہا کہ اُستاد فرماتے ہیں۔ تم کوئی اور مرثیہ پڑھ دو۔ مرزا صاحب نے کہا۔ مَیں اور کوئی مرثیہ نہیں لایا۔ بایں ہمہ اگر اُستاد کی یہی مرضی ہے۔ تو وہ خود مجھے آنکھ سے اشارہ فرمادیں۔ مَیں رباعیاں پڑھ کر منبر سے اُتر آؤنگا۔ تمہارے کہنے کا مجھے اعتبار نہیں۔ اُنھوں نے میر ضمیر صاحب کے کان میں آکر کہا۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ آج ہی تو مجھ کو اُستاد کا امتحان منظور ہے۔ دیکھوں میرے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب یہ سُن کر آگ بگولا ہو گئے۔ ادھر مرزا دبیر ناکردہ گناہ بار بار اُستاد کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ وہاں اشارہ کیسا۔ برافروختگی کے سبب سے سر زانو پر ہے۔ ناچار مرزا صاحب نے کچھ دیر کے بعد چند رباعیاں پڑھ کر وہی نیا مرثیہ شروع کیا۔ سامعین نے تعریفوں کے پھول نثار کئے۔ سبحان اللہ۔ واہ وا۔ صلِّ علیٰ۔ ماشاء اللہ کے نعروں سے تمام مجلس گونج اُٹھی۔ جہاں تک اُستاد کا حکم تھا پڑھے۔ آگے نہ بڑھے۔ منبر سے اُترے۔ میر ضمیر صاحب تشریف لے گئے۔ فاتحہ پڑھ کر یہ فرما کر کہ یہ مرثیہ انہیں کا ہے۔ کسی پُرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اُتر آئے+

مجلس کے بعد دو خلعت آئے۔ میر ضمیر صاحب کا غصّہ اُس وقت تک نہ اُترا تھا۔ اُنہوں نے خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا۔ اُٹھا لے جاؤ۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب نے

+دیکھئے اہلِ کمال کے کیسے کیسے ناز اُس زمانہ کے اُمرا اُٹھاتے تھے۔ کہ میر صاحب نے خلعت ٹھوکر مار دی اور اقبال الدولہ ایسے امیر کبیر نے اُف نہ کی ۱۲۔ مؤلف

یہ کہکر کہ جو اُستاد کے قافیے پر اپنے قافیے کو مُقدّم رکھے وہ ملعون ہے۔ اپنا خلعت بھی پھیر دیا۔ دُوسرے دن صبح کو حسب معمول اُستاد کی خدمت میں پہنچے۔ کہ حقیقت حال معلوم ہو۔ اُنھوں نے کم التفاتی فرمائی۔ پھر شب کو میر ضمیر صاحب کے یہاں شریک ہوئے۔ تو وہاں میر عابد علی بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے آوازے پھینکنا شروع کئے۔ مگر مرزا صاحب نے صبر و تحمّل کو کام فرمایا۔ بعد ختم مجلس مع اپنے شاگرد میر ظہیر کے (جو اس کے راوی ہیں) اپنے گھر چلے۔ راستہ میں میر ظہیر سے کہا بھئی تم نے ان کی باتیں سنیں۔ ظہیر بولے۔ جناب اگر آپ تھوڑی دیر اور بیٹھے رہتے۔ تو مجھ سے کسی نہ کسی سے تلوار چل جاتی۔ دانتوں کے تلے اُنگلی دبا کر فرمایا۔ ہا۔ توبہ کرو۔ اُستاد کے گھر میں ایسی جسارت تمکو اتنی سی بات پر غُصّہ آگیا +

مرزا صاحب کا عروج کمال

فصل ۶ زمانہ کا پلٹا کھانا اور مرزا دبیر کا عروج کمال ہے

اب زمانے نے دُوسرا پلٹا کھایا۔ مرزا صاحب نے بمصداق اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ[1]) خدا کا نام لیکر بے اصلاح مرثئے پڑھنا شروع کرتے ہر مہینہ میں اپنے گھر کی گیارھویں کی مجلس[2] میں ضرور نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ اُسی زمانے کے ایک سلام کا مقطع ہے۔ جس میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں ؎

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر ماہ + دبیر اس کو سمجھو مہینہ ہمارا

اُدھر اکثر لوگوں کی صلاح سے ہر مہینہ کی تیرھویں کو ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں

---

[1] ظاہر الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کو میں نے اپنا کام سونپ دیا۔ وہ بندوں کے حال کو خوب دیکھتا ہے +

[2] دیکھئے مرزا صاحب کیا خوش نصیب خوش عقیدت تھے۔ زندگی میں اُن کی ملاقات کے دن مجلس ہوتی تھی مرنے کے بعد روز وفات قبر پر مجلس ہوتی ہے۔ مگر از بسکہ روز وفات تیسویں ہے۔ اور چاند کبھی اُنتیس کا بھی ہو جاتا ہے۔ تو یا تیسویں یا پہلی کو مجلس ہوتی ہے یعنی چاند اگر ۳۰ کا ہے تو تیسویں کو ورنہ پہلی کو مجلس ہوتی ہے + ۱۲ مولف جعفر

میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد شہرت تخلص نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں میر ضمیر صاحب خود لکھکر شہرت کو مرثیہ دیتے تھے۔ مگر (ع قبول خاطر و لطف سخن خداداد است شہرت ہونا بخت و اتفاق سے متعلق ہے) میاں شہرت کو شہرت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد مرزا صاحب کے یہاں مجلس میں جانے سے لوگوں کو منع کرتے تھے۔ مگر مثل مشہور ہے۔ الانسان حریص علی ما منع۔ لوگ زیادہ سُننے کو آتے تھے۔ مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار اُن کے مخالفوں سے کہتے تھے۔ کہ شیخ صاحب اب تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُستاد نے اصلاح دے کر سُست کلام کو چست کر دیا۔ اس درمیان میں اور بھی کئی شاہزادے اور شاہزادیاں اور نواب زادے اور امیر و غریب ہر طبقہ کے اہل علم و اہل کمال میں سے اکثر مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار ہو گئے۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نثر و نظم میں حملے کرتے تھے۔ کوئی صاحب مرثیہ میں فرماتے تھے ع ہمنام دبیر فلک پیر مٹا دوں۔ کوئی صاحب نثر میں دل کے بخارات نکالتے تھے۔ مرزا صاحب کے طرفدار شاگرد اُن کو جواب دیتے تھے۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے معتقدوں کو سمجھاتے رہتے تھے۔ کہ دیکھو۔ اُستاد کا مرتبہ باپ سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ کیسا ہی کوئی سخت کلمہ کہہ بیٹھے۔ تم کوئی بات خلاف تہذیب نہ کہنا۔ واقعہ واقعی بیان کر کے بس اتنا کہہ دینا۔ کہ دبیر کا قصور نہیں ہے۔ اگر حیات مستعار باقی ہے۔ تو یہ سب شورشیں اور سوزشیں آپ سے آپ مٹ جائینگی۔ بقول مصحفی

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائینگے دن + فصل گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے

آدمی شدائد و مصائب میں مستقل رہے زمانہ خود پلٹا کھائیگا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائیگا۔ مرزا صاحب کی عادت تھی۔ کہ جب زمانہ مخالفت کرتا تھا۔ وہ سکوت اختیار فرماتے تھے۔ گویا ان اشعار جناب امیر علیہ السلام پر اُن کا عمل تھا

جو جس چیز سے روکا جاتا ہے۔ اُس کے کرنے کو آدمی کا دل زیادہ چاہتا ہے +

اَلدَّھْرُ یَخْنِقُ اَحْیَانًا قِلَادَتَہٗ + عَلَیْکَ لَا تَضْطَرِبْ فِیْہِ وَلَا تَثِبْ
حَتّٰی یُفَرِّجَھَا فِیْ حَالِ مُدَّتِھَا + فَقَدْ یَزِیْدُ اِخْتِنَاقًا کُلُّ مُضْطَرِبٖ

ماحصل اس کا یہ ہے۔ کہ زمانہ کبھی کبھی اپنا گلوبند تیری گردن میں جست جکڑ دیتا ہے۔ پس تو نہ گود نہ تڑپ۔ یہاں تک کہ خود بخود زمانہ ہی اُس کو پُرانا کرکے ڈھیلا کردے۔ کیونکہ تیرے تڑپنے سے وہ گلوبند اور زیادہ تنگ ہوکر تجھ کو زیادہ تکلیف دیگا۔ اور پُرانا پڑتا جائیگا۔ ڈھیلا ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک دن تیری گلوخلاصی ہوجائیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چند سال کے بعد مرزا صاحب کی شہرت کمال کا آفتاب اطراف عالم میں چمک گیا۔ ایک دن وزیراودھ نواب علی نقی خاں مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نیا مرثیہ پڑھنے کے لئے منبر پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک تو وزیراودھ کی مجلس (جو مثل شاہ اودھ مرزا صاحب کے قدر شناس و فدائی تھے)۔ دُوسرے مرزا صاحب کا پڑھنا۔ گویا تمام شہر کے شہزادے۔ نواب زادے عمائد اہل کمال۔ سخنور سخن شناس۔ سخن سنج لوگوں کا مجمع تھا۔ جناب میرضمیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جو غالبًا بانی مجلس کی طلب پر تشریف لائے ہونگے۔ اس مجلس میں تمام شاہزادے اور جلیل القدر حکام مع حضور عالم (وزیراودھ) شہ نشین پر تھے۔ اوّل مرزا صاحب نے ایک نظر سے تمام حاضرین کو دیکھا۔ پھر باواز بلند فرمایا کہ حضرات یہ مجلس عزا کسی بادشاہ دُنیا کا دربار نہیں۔ بلکہ شاہنشاہ دین و دُنیا کا دربار دُربار ہے۔ آپ حضرات جو شاہ نشین پر ہیں۔ بے تکلف ہوکر زیر منبر تشریف لائیں۔ اب کس میں طاقت تھی۔ جو تعمیل حکم نہ کرتا۔ حضور عالم نے سبقت فرمائی۔ اُن کے پیچھے پیچھے تمام شہزادے اور عمائد زیر منبر آ بیٹھے۔ مرزا صاحب نے چند رباعیاں اور چند شعر سلام کے پڑھ کر یہ مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے ؎

فصل ۱۱
اُستاد سے صفائی کی نوبت آئی

اے عرشِ بریں تیرے ستاروں کے تصدق[1]

حاضرین نے تعریفوں کے پھول نچھاور کئے۔ حضور عالم نے جب ایک موقع پر باآواز بلند بہت تعریفیں کی۔ تو مرزا صاحب نے میر ضمیر صاحب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے فرمایا۔ کہ یہ سب تصدق اور فیض جناب اُستاد کا ہے۔ مرثیہ ختم ہونے پر مرزا صاحب منبر سے اُترے۔ تو میر ضمیر صاحب نے اُٹھ کر گلے سے لگایا۔ وہیں سے مرزا صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ سب اگلی پچھلی باتیں دُہرائی گئیں۔ میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب بولے۔ اب یہ شخص اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے۔ مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کی۔ کہ ان کی خطا بھی میری خطا کے ساتھ ہی معاف فرمائیے۔ میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا۔ اور کچھ نادم ہوئے۔ پھر کوئی رنجش باقی نہ رہی۔ اور میر ضمیر صاحب کی گھر کی مجلس میں جو ماہواری ہوتی تھی مرزا صاحب پڑھا کئے۔ اور میر ضمیر صاحب کے سوم کی مجلس میں بھی میر انیس صاحب کے اصرار سے مرزا صاحب پڑھے[2]۔ نانا مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ یہ مجلس سرائے معالی خاں میں (ماہواری) میر ضمیر صاحب کرتے تھے۔ اور تبرک مجالس میں میں خود تقسیم کیا کرتا تھا۔ دیکھئے مرزا صاحب کی نیک طینتی۔ کہ میر عابد علی بشیر کی خطا بھی معاف کرائی۔ انتقام لینا تو کیسا۔ یہ انسانیت کے جوہر خداداد ہیں۔ میں نے اس مضمون کو ایک رباعی میں نظم کیا ہے۔ جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ رباعی

عادت اچھی نہیں بدی کرنے کی + خصلت بد ہے جلی کٹی کرنے کی

نیکی کے لئے بنا ہے تو اے ثابت + ممکن ہو تو دشمنوں سے بھی کر نیکی

---

[1] دفتر ماتم کی جلد سالویں میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ پہلا یہ مطلع ہے سے قرآں سے فضیلت دُر و مرجاں کی عیاں ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر ہوگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس کے بعد میر عابد علی صاحب بشیر اور اکثر میر ضمیر صاحب کے شاگرد اُن کے حکم سے اپنا اپنا کلام مرزا دبیر صاحب کو دکھایا کرتے تھے ع دشمن بھی دوست ہو گئے خلق حسن یہ ہے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے جو حکایت آب حیات میں اس باب میں لکھی ہے وہ غلط ہے۔ اور اگر آزاد مرحوم اُس کے بعد مجنون نہ ہو جاتے۔ تو غالباً آب حیات ہی میں اُس حکایت کی وہ تصحیح فرما دیتے۔ جیسا کہ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا اور میں نا نا مرحوم کی کتاب تنقید آب حیات اور شمس الضحے بھی اُن کو بھیج دیتا۔ مگر کُلّ اَمْرٍ مَرْھُوْنٌ بِاَوْقَاتِھَا یہ کام اب ہونا تھا اب ہُوا۔ اس موقع پر آب حیات کا نام آگیا ہے۔ اس لئے میں اور واقعات غلط مندرجہ آب حیات کی صحت بھی کر دوں۔

تنقید بعض مضامین آب حیات

آب حیات کے ساتھ تنقید آب حیات کے مضامین (مختصر عبارت میں) لکھے دیتا ہوں امید کہ مولانا آزاد دہلوی اور حضرت ظہیر لکھنوی کی رُوحیں خوش ہو ہو کر مجھے دعائیں دیتی ہوں گی +

حکایت بے اصل مندرجہ آب حیات

"ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح مرزا دبیر کو پسند نہ آئی شیخ ناسخ کے پاس گئے۔ اُنھوں نے کہدیا۔ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی۔ اُنھوں نے کہا کتابیں نو نوں لکھا ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ اُنے نوں کتاب کو کیا جانے۔ ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصہ ہوئے کہ لکڑی لیکر اُٹھے۔ یہ بھاگے۔ دروازہ تک اُن کا تعاقب کیا۔" میر ظہیر مرحوم فرماتے ہیں۔ یہ بہتان عظیم ہے۔ خود یہ عبارت پیر بخارا کے پاک شہدوں کی لوٹیوں کا سماں دکھلاتی ہے۔ اخلاق ذمیمہ کی بو آتی ہے۔ کبھی مرزا صاحب شیخ ناسخ کے پاس نہیں گئے۔ حالانکہ اُن کو حسرت رہی۔ نہ شیخ ناسخ مرحوم کے اخلاق کی شان کے یہ حکایت شایاں ہے۔ اور شیخ ناسخ صاحب کے پاس مرزا صاحب

ہو ہر کام اپنے وقت پر ہونا ہے +

کے نہ جانے کی یہ وجہ تھی کہ میر ضمیر صاحب اور شیخ صاحب میں چشمک تھی۔ کہ میر ضمیر صاحب مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور شاگردانِ مصحفی شیخ صاحب کو تنہا شاگردِ مصحفی کا تعلیم یافتہ بتاتے تھے۔ شیخ صاحب اور اُن کے تمام شاگردوں کو اس سے انکار تھا۔ ایسی ایسی رکاوٹیں مانع تھیں۔ نواب حسین علی خاں اثر کے یہاں شیخ ناسخ آتے تھے۔ مرزا صاحب کو رغبت سے سُننے تھے۔ وہاں کبھی کبھی اس قسم کی (خلافِ انسانیت) گفتگو کا موقع نہیں آیا۔ یہ تو میر ظہیر مرحوم کے ارشاد کا خلاصہ تھا۔ اب میں عرض کرتا ہوں کہ مرزا صاحب کی پیدائش ۱۲۱۸ھ کی۔ اور صاحب شمس الضحیٰ کی تحریر سے اور لکھنؤ کے معمر آدمیوں کی تقریر سے ثابت ہے کہ بارہ برس کی عمر میں مرزا صاحب میر ضمیر صاحب کے شاگرد ہوئے۔ اس کو ۱۲۳۰ھ سمجھئے۔ ادھر تحصیل علوم ادھر مشقِ سخن کرتے رہے۔ چار پانچ برس ہی میں خوب شہرت ہوگئی۔ پس [illegible] اور نواب غازی الدین [illegible] شہرت ہوگئی تھی کہ وہ اُستاد [illegible] کی عبارت مذکورہ شاہد ہے [illegible] کہ اس میں میر ضمیر [illegible] کے ساتھ [illegible] کا نام بھی ہے۔ اچھا اب شیخ ناسخ مرحوم کے حالات [illegible] ملاحظہ فرمائیے [illegible] آب حیات کے صفحہ ۳۲۱ پر لکھا ہے کہ خود شیخ ناسخ [illegible] غزل [illegible] مگر میر [illegible] مرحوم نے اصلاح نہ دی۔ [illegible] اور خود

مولانا [illegible] وہ ان کے شاگرد نہیں تھے درست ہوتا [illegible] اُس کا شاگرد خیال کیا کرتے تھے [illegible] مصحفی نے شیخ صاحب کو شاگرد [illegible] سے مرزا صاحب [illegible] برس کی عمر میں شاگرد ہوئے [illegible] مرزا صاحب کی [illegible]

اصلاح کرتا اور رکھ دیتا تھا۔ غزل مشاعرہ میں پڑھنا تو درکنار کسی کو سناتا نہ تھا۔ سید انشا جرأت مصحفی سب کو مشاعرہ میں سنتا تھا۔ مگر وہاں خود کچھ نہ کہتا تھا۔ انشا و مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے۔ اور زمانہ سارے ورق الٹ چکا۔ اور میدان صاف ہوگیا۔ تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ یہ روایت جناب رغمی کی زبانی پروفیسر آزاد نے بہت وثوق سے لکھی ہے۔ جو رغمی شیخ صاحب کے شاگرد تھے۔ اب اس پر آپ غور فرمائینگے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ شیخ صاحب نے مصحفی کے مرنے پر یا کم سے کم بالکل اخیر زمانہ میں غزل مشاعرہ میں پڑھنا شروع کی تھی۔ اور مصحفی کا سال وفات آبحیات میں سنہ ۱۲۴۰ ہجری ہے شیخ صاحب مدت سے پوشیدہ مشق فرماتے تھے۔ [illegible] ادیب و ذی علم و صاحب ثروت تھے۔ برس دو برس ہی میں شہرت ہوگئی۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ سنہ ۱۲۳۵ھ سے سنہ ۱۲۴۰ھ تک جو زمانہ مرزا دبیر کی شہرت کا ہے۔ وہی تو شیخ صاحب کی شہرت کا ہے۔ فرق اس قدر ہے۔ کہ مرزا صاحب سنہ ۱۲۴۰ھ میں بائیس سال کے جوان تھے۔ اور شیخ صاحب قریباً چالیس پچاس برس کے تھے۔ مگر یہ کب ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شاعر اپنے معاصر کو گو وہ نوجوان ہی کیوں نہ ہو اس طرح پھٹکارے اور دھتکارے۔ اور ایسے ایسے کلمات تحقیر کہے۔ کہ "ارے تو کتاب کو کیا جانے"۔ "ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے"۔ اور لکڑی ٹیک مارنے کو دوڑے اور معاصر نوجوان بھی وہ کہ جس کے علم و تقدس کا بھی شہرہ ہو۔ شاگرد بھی بڑے بڑے شہزادے اور شہزادیاں اور نواب و نواب زادے اور اہل علم ہوں۔ کہ یہ امر بھی آدمی کے اقتدار کا باعث ہوا کرتا ہے۔ یہ حکایت ضرور کسی ایسے شخص کی تراشی ہوئی ہے۔ جو شیخ ناسخ کی متانت و تہذیب اور مرزا صاحب کے تقدس و کمال بلکہ حال سے بھی ناواقف تھا +

فصل ۹

شیخ صاحب کے دل میں جو وقعت مرزا صاحب کی تھی۔ اس کا اندازہ ناظرین کتاب کو حکایت ذیل سے ہوگا۔ جو نانا مرحوم (میر ظہیر) اکثر بیان فرمایا کرتے تھے +

حکایت صحیحہ۔ میں ایک روز محلہ ٹکسال میں ایک مجلس پڑھنے گیا۔ جو شیخ صاحب کے پڑوس

میں تھی۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ اُس وقت تک سامعین میں سے
کوئی نہ آیا تھا۔ میں بانیٔ مجلس سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ مجھ سے
مخاطب ہو کر بولے۔ تمکو جناب شیخ صاحب یاد فرماتے ہیں۔ میں پہنچا۔ دیکھا جناب
شیخ ناسخ ایک کھاروے کی لنگی باندھے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر
مونڈھوں پر خواجہ وزیر۔ میر علی اوسط رشک وغیرہ شاگرد حاضر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔
بھئی محمد رضا تم تو مہینوں نظر نہیں آتے۔ میں نے عرض کی۔ کیا عرض کروں۔ فرصت نہیں
ہوتی۔ فرمایا آج یہاں تم اپنے اُستاد کا کوئی نیا مرثیہ پڑھو گے۔ میں نے عرض کی۔
حضور ایسا ہی ارادہ ہے۔ فرمایا۔ افسوس گرمی بہت ہے۔ میں مجلس میں شریک نہیں
ہو سکتا۔ اچھا تم میرے حصے کے ایک دو بند کسی مقام سراپا یا چہرہ کے یہیں مجھے
سُنا دو۔ میں نے اس خیال سے سکوت کیا کہ ایسا نہ ہو۔ میں کوئی بند پڑھوں۔ یہ کہہ
دیں۔ مرزا نے یوں نہیں یوں کہا ہوگا۔ اور اس پردہ میں یہ اعتراض کریں۔ مرزا صاحب
کو خبر ہو۔ وہ جواب دیں۔ بات کا بتنگڑ ہو جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے جناب میر
خلیق کے دو مصرعوں پر شیخ صاحب در پردہ دو اعتراض فرما چکے تھے جن کی اُس
زمانہ میں بہت شہرت تھی۔ (۱) لیلاف پڑھا جب کہ اُسے دُودھ پلایا۔ (۲) اکبر علی
اللہ نگہبان تمہارا۔ مصرع اوّل کو یوں بنایا تھا کہ ع پڑھ پڑھ کے لایلاف اُسے دودھ پلایا۔
اور مصرع دویم کو یوں پلٹا تھا۔ ع پیارے مرے اللہ نگہبان تمہارا۔ اور یہ خود ہی کہدیا
تھا کہ میر خلیق نے بھی یوں ہی کہا ہوگا۔ میر خلیق تو سُن کر چپ ہو گئے تھے۔ مرزا دبیر
جن کے بازوؤں میں علم کی قوت ہے۔ ذہن بھی اقبال بھی حافظ بھی شباب و اوج
پہ ہے۔ چپ ہونے والے نہیں ہیں۔ ضرور جھگڑا ہوگا۔ اِدھر میں چُپ۔ اُدھر
پھر شیخ صاحب نے فرمایا۔ ہاں بھئی پڑھو نا۔ میں نے پھر عرض کی۔ میں مرثیہ آواز بلند پڑھونگا
یہاں تک میری آواز آئیگی۔ ذاکر کے پڑھنے کا مقام نہ ہے ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے

دارد۔ حضور اُسی وقت سُن لیں۔ شیخ صاحب بولے۔ اس وقت تو دل یہی چاہتا ہے۔ اچھا تم سراپا میں سے ایک ہی بند پڑھ دو۔ اِدھر میر علی اوسط رشک اُدھر خواجہ وزیر بولے۔ جناب فرماتے ہیں ایک بند پڑھ دیجئے۔ مَیں نے اُسی مرثیہ میں سے جو پڑھنے والا تھا حسب ذیل ایک بند پڑھا:۔

گردشِ چشم کا مضمون

کیوں مدِ نظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار + پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردم بیمار
ابرو کے تَنیے سے کُھلا چشم کا اَسرار + ہیں نور کے گہوارے میں عیسیٰؑ خوش اطوار
یاں پنجۂ مریمؑ کہوں پنجے کو پلک کے
گہوارے میں عیسےٰؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے

یہ بند سُن کر شیخ ناسخ اُچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانہ میں چلے گئے تین چار منٹ میں ایک کتاب لیکر آئے۔ فرمایا دیکھو یہ ظہیر فاریابی کا دیوان ہے۔ ظہیر نے بھی یہ دعوےٰ کیا تھا۔ اور پُتلی کو عیسےٰؑ سے تشبیہ دی۔ مگر وہ ثابت نہ کرسکا۔ مرزا نے کمال کیا ہے۔ پنجہ پلک کو پنجۂ مریمؑ کہکر ثابت کر دیا۔ کہ ع گہوارے میں عیسیٰؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے۔ پھر فرمایا۔ کہ سلامت علی سا طبیعت دار خلّاقِ مضامین نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ لطفِ تخیل یہی ہے۔ کہ شاعر جو دعوےٰ کرے۔ اُس کو ثابت کردے۔ کیا ثابت کیا ہے +

فصل ۱۰ حکایت ۲ بے اصل متعلق آتش مرحوم۔

اسی طرح دُوسری حکایت خواجہ حیدر علی آتش کے متعلق آب حیات میں بے اصل لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خواجہ صاحب نے مرزا صاحب کی زبانی ایک پہلوان کی طولانی لڑائی سُن کر فرما دیا۔ کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی۔ آتش مرحوم تو شیخ

ــــــــ

ـــہ یہ بند اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے۔ اُس زمانہ میں یہ مرثیہ مرزا صاحب نے نیا کہا تھا۔ جلد اوّل دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے +

سے ایسے کہدئے۔ کہ جس رنگ کو وہ زیادہ پسند نہ فرماتے تھے۔ مثلاً لکھنؤ میں مجھے ۱۳۲۰ھ میں معلوم ہوا۔ کہ سلطان عالیہ کی فرمائش سے مرزا صاحب نے انکو چالیس پچاس مرثئے ایسے کہدئے۔ جن میں محض سلاست بندش اور لطف زبان ہے۔ استعارات اور صنائع و بدائع کا نام نہیں ہے۔ وہ مرثئے اُن کے عزیزوں میں کوئی بیگم صاحب ہیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ مَیں نے کوشش بھی کی۔ مگر اُن مرثیوں کی زیارت نصیب نہ ہوئی +

(۲) مرزا صاحب کے بعض کامل شعراء مرثیہ گو شاگرد منیر شکوہ آبادی۔ قدیر الدولہ قدیر۔ مولوی فقیر حسین عظیم۔ شیخ گوہر علی مشیر۔ نظیر لکھنوی۔ میر صفدر علی صفدر وغیرہ کے سیکڑوں مرثئے ہیں۔ جن کو عام لوگ مرزا صاحب کے مرثئے سمجھ رہے ہیں +

(۳) مرزا صاحب کا ایک خاص ایجاد یہ ہے۔ کہ ایک ایک مرثیہ میں موقع موقع سے چار چار پانچ پانچ مطلع کہدئے ہیں۔ کہ ذاکر جس موقع سے چاہے پڑھدے۔ اس صورت میں اگر ایک ہزار مرثیہ بھی کہے۔ تو خواہ مخواہ چار پانچ ہزار مرثئے مشہور ہوسکتے ہیں +

(۳) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے ۲۵ محرم ۱۲۹۲ھ کو انتقال فرمایا۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ ہجری کو رحلت فرمائی۔ عمر تخمیناً لکھی ہے وہ کچھ غلط نہیں ہے۔ اس لئے کہ ۷۴ سال کی عمر قمری حساب سے تھی۔ ہر ۳۶ سال میں شمسی و قمری حساب کی مطابقت سے ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ پس ۷۴ سال کے ۷۲ سال بحساب شمسی باقی رہ جاتے ہیں +

(۴) باقی آزاد مرحوم نے جو انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں لکھی ہیں۔ وہ بطور رمز ہیں۔ اور آخر میں خود فیصلہ فرما دیا ہے۔ اور منصفی کی زبانی فیصلہ دیا ہے۔ کہ دونوں اس لئے اس پر مَیں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ میر انیس مرحوم کے حال کے اخیر بلکہ گویا آب حیات کے خاتمہ پر جو فقرہ لکھا ہے۔ اُس کو مَیں یہاں لکھ کر کچھ لکھنا چاہتا وہ فقرہ یہ ہے "یہ بات درست ہے۔ کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ

لیکن حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ اُن کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے" میں اس فقرہ کی دل سے داد دینے کو طیار رہوں۔ مگر اس کے ساتھ اتنا اور کہونگا۔ کہ غالبؔ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو مرثیہ پڑھتے ہوئے کبھی سُنا نہ تھا۔ ورنہ وہ جس طرح میر صاحب کا چشم دید مرثیہ پڑھنا آب حیات میں لکھ چکے ہیں۔ مرزا صاحب کا سُننا بھی ضرور لکھتے۔ میں نے میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں بزرگوں کو سُنا ہے۔ حقیقت میں میر صاحب کا پڑھنا لاجواب تھا۔ وہ خود گویا مضمون کی تصویر بن جاتے تھے۔ ایسا بتاتے تھے+۔ اور مرزا صاحب کا کم بتلانا اور وہ اُس کی سادگی۔ ایک ایسی قدرتی چیز تھی۔ کہ جس پر تمام مجلس تصویر حیرت بن جاتی تھی۔ میں نے میر صاحب کے سُننے کے بعد حاضرین مجلس کو یہ کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ کہ آج مرزا صاحب کو بھول گئے۔ اور مرزا صاحب کے سُننے کے بعد انہیں لوگوں کو یہ کہتے سُنا۔ کہ میر صاحب کو بھول گئے۔ اگر مرزا صاحب کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی۔ تو سامعین و حاضرین ایسا فقرہ کیوں کہتے تھے۔ ہاں یہ بات مولانا آزاد پتہ کی کہہ گئے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا مرثیہ اور بھی کوئی پڑھتا ہے۔ تو زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میر صاحب کا کلام ایک طرز خاص کے بتانے کا مُحتاج ہے۔ اور مرزا صاحب کا کلام اکثر اداؤں (موشنس) کو خود ادا کرتا ہے۔ اور مرزا صاحب کے مرثیوں کی مجلسوں میں خواہ وہ سوز میں پڑھے جائیں خواہ تحت لفظ۔ رقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا آزاد نے یہ رائے بہت تجربہ کے بعد غالباً قائم فرمائی تھی۔ کیونکہ مجھ سے حکیم

+ میں نے میر صاحب کے خاندان کے اکثر ممبروں کو اور اُن کے شاگردوں میں شیخ امیر علی مرحوم کو سُنا ہے۔ اپنے اپنے مقام پر سب اچھا پڑھتے تھے۔ مگر میر صاحب کا طرز خاص سوا اُن کے چھوٹے صاحبزادے میر محمد صاحب مونس کے اور کسی میں نہ پایا۔ لکھنؤ محلہ ٹکسال میں میر محمد صاحب مرحوم خوب خوب مجلسیں پڑھتے رہے۔ صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں۔ کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہوگئیں + ۱۲۔ ثابت حقیر۔

محمد حسین صاحب دہلوی (جن کا ابھی شاید دو سال ہوئے بمقام ڈبائی ضلع بلند شہر انتقال ہُوا ہے) بیان فرماتے تھے۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء والد ماجد آزاد مرحوم جناب مولوی مرزا محمد باقر صاحب مرحوم بڑی سیر چشمی اور خوش اعتقادی سے مجلس کرتے تھے۔ اُس مجلس میں آزاد مرحوم میر صاحب کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اور اَور ذاکر کوئی میر صاحب کا کوئی مرزا صاحب کا کلام پڑھتا تھا۔ ان مجلسوں میں غالباً آزاد مرحوم کو اس بات کا اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ مرزا صاحب کے مرثیے پر مجلس میں رقت زیادہ ہوتی ہے +

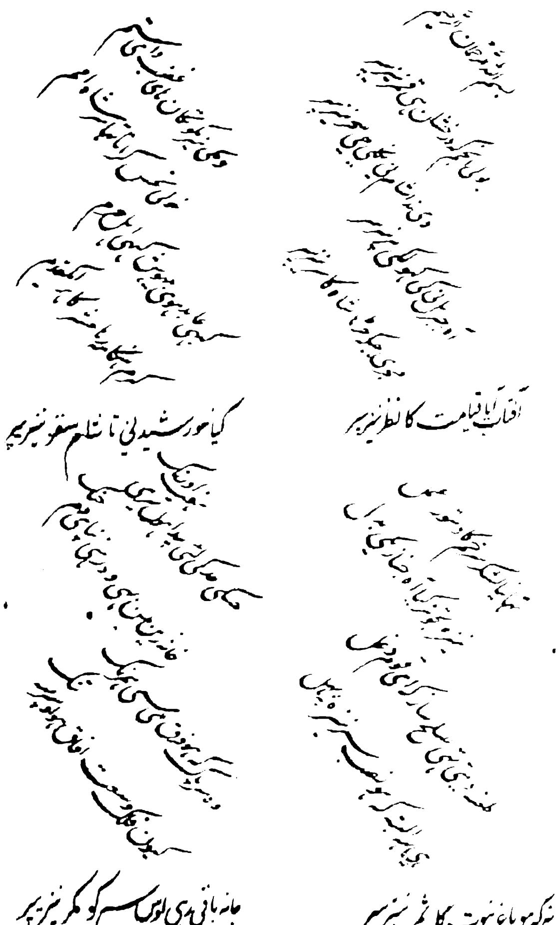
اب مَیں میر صاحب اور مرزا صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد اور جناب نظمیہ مرحوم کی پاک رُوحوں پر بھی فاتحہ خیر پڑھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہُوں +

خط۔ مرزا صاحب نہایت خوش خط اور با وصف خوش خطی زود نویس تھے۔ چنانچہ ایک مخمس کے چار بند اُن کے دست مبارک کے لکھے ہُوئے جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ نے مجھے مرحمت فرمائے۔ مَیں نے اپنے عنایت فرما مولوی نظیر حسین صاحب سخا دہلوی مشنری اسلام و فوٹو گرافر کو دکھائے۔ اُنھوں نے اُس کا فوٹو لیا۔ جو ہدیہ ناظرین کرتا ہُوں +

اس خط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کا خط بہت پختہ اور روشن و با قاعدہ ہے۔ اور اُس زمانے کے عام آدمیوں خصوصاً ایرانیوں کی روش پر ہے۔ کہ تمام حرفوں پر نقطے نہیں ہیں۔ نہ کاف فارسی پر دو مرکز ہیں۔ بلکہ نقطے وہ بہت کم دیتے ہیں۔ اس سے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اُن کے قلمی مرثیوں سے جن کم علم کاتبوں نے اوّل اوّل نقلیں لی ہونگی بعض لفظوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر تصرّف کیا ہوگا۔ اور یہیں سے تحریف کی ابتدا ہوئی۔ پھر نقل در نقل مرثیوں میں اکثر الفاظ بدلتے گئے۔ یہی سبب ہے۔ کہ اکثر مرثیوں کے الفاظ میں آج ہم بہت اختلاف و فرق پاتے ہیں +

وصف مرزا
خط مرزا
صاحب قبلہ

خط قلمی جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر مرحوم کا عکس جو مولوی نظیر حسین صاحب سخا مشنری اسلام فوٹوگرافر نے فوٹو لیا مئی ۱۹۱۲ء میں بمقام ریاست کوٹہ +



اصل ورق عطیہ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مؤلف حقیر کے پاس ہے +

نوٹ:- مرزا صاحب کے خط کے فوٹو کا ٹریس منشی محمد اسمٰعیل کاتب ونقاش لاہوری نے چھپنے کے واسطے لیا +

باب چہارم۔ انداز تصنیف

باب چہارم فصل ۱ تصنیف کا انداز

مرزا صاحب اکثر باوضو جانماز پر بیٹھ کر تصنیف فرماتے تھے۔ کبھی کبھی بعد نماز شب اور کبھی بعد نماز صبح اور کھانا کھانے کے بعد گیارہ بجے دن کے کہا کرتے تھے۔ بعض بعض مصرعوں پر ایسا وجد طاری ہوتا تھا کہ جھوما کرتے تھے۔ اور اکثر بین کے مضامین پر مسلسل آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ع موتی کی اک لڑی تھی کہ آنکھوں سے گر گئی۔[۵۱] اس عالم وجد وجوش میں کہنے کا اثر اُن کے کلام میں سخن سنجوں کو نظر آتا ہے۔ جب تک طبیعت حاضر نہ ہوتی تھی۔ نہ کہتے تھے۔ اور جب حضور قلب کا عالم ہوتا تھا۔ کہتے تھے۔ اور جلد جلد کہتے تھے جس کی تصدیق آپ کو ذیل کی روایت سے ہو جائیگی۔

جو میرے محسن جناب ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب لندنی بیرسٹری عالم علوم مشرقی و مغربی سابق ممبر کونسل کورٹ و جے پور نے اپنے خط مورخہ ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھ کر مجھے بھیجی ہے:-

فصل ۲ روایت حکایت

"آپ کا خط جس وقت مجھے پہنچا۔ اس وقت میر باقر حسین صاحب بیرسٹری جو یہاں (جے پور میں) وکالت کرتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے کلام سے بہت انس رکھتے ہیں۔ اور مرثیہ خواں بھی ہیں موجود ہیں۔ میں نے آپ کا خط اُن کو سنایا۔ تو کہنے لگے۔ کہ سنہ ۱۸۷۱ء یا سنہ ۱۸۷۲ء میں میر وزیر حسین صاحب (مولف جیل مجلس شمشیر وغیرہ وغیرہ) لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ میں مجسٹریٹ رہتا تھا۔ انہیں کے پاس رہتا تھا۔ اُس اثنا میں ایک مجلس میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں ہوئی۔ مرزا صاحب مرحوم نے نیا مرثیہ پڑھا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔[۵۲] منقتل سے جو چمن فصل بہار کی ہے آمد۔ ہجوم کی یہ کیفیت تھی کہ

---

[۵۱] سبب یہ تھا کہ نانا مرحوم اور جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور آدمیوں کی زبان سے سنی ہوئی بات [illegible] جوان لوگوں نے [illegible] بار بار کہی تھیں۔

[۵۲] جلد دوم دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔

چھتوں پر لوگ لدے ہوئے تھے۔ اور منڈیروں پر مثل گھوڑے کے سوار تھے۔ اور درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی۔ تو میر وزیر حسین صاحب نے جو مجلس میں موجود تھے مرزا صاحب سے درخواست کی۔ کہ مرثیہ جو ابھی پڑھا ہے مجھکو مرحمت ہو۔ مرزا صاحب نے وعدہ فرمایا۔ کہ بہت اچھا۔ دو تین روز بعد میر وزیر حسین صاحب نے مجھکو مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ تاکہ وعدہ کو یاد دلاؤں۔ مَیں جس وقت مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ دوپہر یعنی دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مرزا صاحب خاصہ نوش فرماکر پلنگ پر استراحت فرما تھے۔ دو کاتب پلنگ کے اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے بعد آداب کے میر وزیر حسین صاحب کا پیغام عرض کیا۔ فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ مرثیہ لے جانا۔ مَیں بیٹھ گیا۔ مرزا صاحب کاتبوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور دونوں کاتبوں کو نو تصنیف دو مرثیہ لکھوانے لگے۔ کبھی اس کاتب کو دو تین مصرع بتا دیتے تھے کبھی اُس کاتب کو بعض مصرع یا بیت پر اُن کو ایسا جوش آجاتا تھا۔ کہ بیٹھ جاتے تھے۔ چار بجے تک یہی سماں رہا۔ چار بجے نماز (ظہرین) کے واسطے اُٹھے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ہر کاتب نے ساٹھ ساٹھ بند دو مرثیوں کے لکھے ہیں۔ ایک مرثیہ حال حضرت علی اکبرؑ میں اور دوسرا امام حسینؑ کے حال میں تھا۔ میرا ابھی جی ایسا لگا۔ کہ چار گھنٹے ایک آن میں ختم ہو گئے۔ نماز سے پیشتر مرزا صاحب نے مرثیہ موعود مجھکو دیدیا۔ اور یہ کہا۔ کہ راتوں رات یا کل تک نقل کر کے دے جانا۔ مَیں مرثیہ لیکر چلا آیا"۔

ناظرین دیکھئے ایسی آمد آپنے کسی شاعر کی طبیعت میں دیکھی ہے۔ جو چار گھنٹہ میں ایک سو بیس بند کہ ڈالے۔ دُوسرا شخص اتنی جلدی نثر بھی تو اس قدر نہیں لکھوا سکتا۔ ع

بحر رواں تھی یا کہ طبیعت دبیر کی۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ کلام اچھا۔ یہ ممکن ہے۔ کہ ہر روز طبیعت میں ایسی روانی نہ ہو۔ مگر پھر بھی جو شخص ہفتہ میں ایک دن ڈیڑھ سو بند کہتا ہو۔ اُس کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں پر پہنچ جانا ممکن ہے۔ جبھی تو اکثر واقفان راز فرماتے ہیں۔ کہ بیس جلدیں جو دفتر ماتم کی چھپی ہیں۔ کلام مرزا صاحب کا دسواں

حصّہ ہے +

فصل ۲ حکایت ثانی طبیعت کی روانی

اب ایک دُوسری حکایت مرزا صاحب کی روانی طبیعت کی سُن لیجے۔ میرے کرم فرما جناب میر دستور علی صاحب بلگرامی سابق منصرم حجی سیکرٹری راجہ صاحب جہانگیرآباد جنوری یا فروری ۱۹۱۲؁ء میں بمقام لکھنؤ فرماتے تھے۔ کہ میں ایک روز ماہ رمضان میں والد مرحوم کے ہمراہ صبح کے وقت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُس دن داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے یہاں مجلس پڑھنے کو جانیوالے تھے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میر واجد علی صاحب کاتب سے فرما رہے تھے۔ کہ وہ ٹیپ جو میں نے پہلے کہی ہے ذرا سُست ہے۔ وہ کاٹ دو۔ اور یہ ٹیپ لکھ دو۔ ؎

تابوت اُٹھانے کی توانائی نہیں ہے + بیٹوں نے علیؑ کے سحری کھائی نہیں ہے

یہ ٹیپ رات کو سوچی ہے۔ میں نے دیکھا۔ کہ مرزا صاحب کے پڑھنے کا مرثیہ میر واجد علی کاتب نے کھولا۔ اُس کے ہر صفحہ پر نہایت جلی قلم سے ایک بند لکھا ہُوا تھا۔ پہلے کی ٹیپ اُنہوں نے کاٹ کر بخط جلی یہ ٹیپ مذکورہ لکھ دی +

مرزا صاحب والد ماجد (میر محمد رضا صاحب بلگرامی) سے باتیں کرنے لگے۔ کہ یکایک ایک صاحب آئے۔ اور بعد معمولی آداب تسلیمات کے اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ کہ مجھے اس وقت بارہ تیرہ بند اس حال میں کہہ دیجئے۔ کہ بعد شہادت علی اصغرؑ علیؑ اصغر کی ماں قبر علی اصغرؑ پر آئیں۔ کہ میں آج ہی اُن پر سوز رکھ کر کل اُن رئیس (نام رئیس کا یاد نہیں رہا) کے یہاں پڑھوں۔ کہ اس حال کا مرثیہ پڑھنے کی اُن رئیس نے مجھ سے فرمائش کی ہے۔ مرزا صاحب بولے۔ جناب اب تو میں مجلس میں جا رہا ہوں۔ اس وقت تو معاف فرمائیے۔ اُنھوں نے عرض کی۔ حضور میرے رزق کا معاملہ ہے۔ اگر ایسا مرثیہ نہ پڑھونگا۔ تو شاید مجھے نقصان پہنچ جائے۔ فرمایا تو اچھا۔ لکھنے جائیے۔ کھڑے کھڑے چودہ یا پندرہ بند کہہ دئے۔ وہ سوز خوان لکھتے گئے۔ اور اُن کے ساتھ ساتھ

میں لکھتا گیا۔ مرزا صاحب نے اپنے پاس اُس کی کوئی نقل نہیں رکھی۔ اس طبیعت حاضر اور زود گوئی پر والد ماجد کو اور مجھ کو سخت تعجب ہُوا۔ وہ بند اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ نہ دفتر ماتم میں چھپے ہیں اور نہ مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایسے ایسے سیکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے منتشر یا تلف ہو گئے۔ جن کی نقل کچھ اُن کے گھر میں نہیں رہی +

فصل ۴

اصلاح دینے کا طریقہ۔ میر فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی (جو غزل میں مرزا غالب و سحر لکھنوی کے اور مرثیہ میں مرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے) اپنے تذکرہ مطبوعہ جلد دوم جلوہ خضر[2] میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شاگرد سے اُس کا کلام سُنتے جاتے تھے۔ اور جس مصرع یا بند پر اصلاح دینا ہوتا تھا۔ تو مرثیہ لیکر اپنے ہاتھ سے بنا دیتے تھے۔ اور اکثر مرثئے تو خود دیکھ دیکھ کر بنا تے تھے[سلہ]۔ اور میں نے اُن کے اور شاگردوں سے سُنا ہے۔ کہ جو لفظ کاٹتے یا بناتے تھے۔ اُس کی وجہ اگر وہ شاگرد حاضر ہوتا تھا۔ تو زبانی بتا دیتے تھے۔ ورنہ حاشیہ پر بطور اشارہ لکھ دیتے تھے۔ ایسے لفظ رکھ دیتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ سادہ کار نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا +

حکایت

میر واجد حسین مرحوم جو اخیر کو نثر پڑھنے لگے تھے۔ مجھ سے بمقام آگرہ ۱۸۸۱ء میں ناقل تھے۔ کہ ایک مرثیہ کسی شاگرد کا کہا ہُوا[سلہ۲] مجھے مرزا صاحب نے دیا۔ کہ اس کو صاف کر دو۔ حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ تھا۔ اُس موقع پر کہ جب حضرت عباسؑ خیمے سے باہر برآمد ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب نے اصلاحاً یہ ٹیپ لکھی تھی۔ ع

شاگرد کرنے کا طریقہ

سلہ۱ اور جس وقت کوئی شاگرد ہوتا تھا تو وہ کچھ شیرینی لاتا تھا جس پر باب مدینہ علم جناب امیرؑ کی نذر دیکر اُس شاگرد کو اور تمام شاگردوں اور خاص خاص دوستوں کو تقسیم فرما دیتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سلہ۲ یہ میر واجد حسین پہلے مرثیہ پڑھتے تھے مرزا صاحب کے شاگرد تھے پھر نثر پڑھتے تھے میر فدا علی صاحب فدا مشہور اُستاد نثر کے شاگرد تھے۔ اکثر عشرہ محرم میں گوالیار جاکر پڑھتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے

اقبال سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے

مجھے جو شرارت سُوجھی۔ تو مَیں نے دُوسرا مصرع یُوں لکھ دیا۔ ہاں **فتح** سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے۔ مَیں گردن جُھکائے ہوئے لکھ رہا تھا۔ کہ مرزا صاحب آہستہ آہستہ آکر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مجھے خبر نہ ہوئی۔ اس ٹیپ کو پڑھ کر ہنسے۔ اور فرمایا واہ میر واجد حسین صاحب آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دیدی۔ اب مَیں نے گردن اُٹھائی۔ دیکھا کہ مرزا صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ مَیں چُپ۔ فرمایا کیا اقبال سے آپ فتح کو اس موقع پر ترجیح دیتے ہیں۔ مَیں نے عرض کی۔ جی نہیں۔ اس وقت میرے خیال میں یونہیں آگیا۔ مَیں اب اس کو مٹائے دیتا ہوں۔ کپڑا پانی میں ڈوبا ہوا سامنے رکھا تھا مَیں نے اُٹھایا۔ فرمایا ذرا ٹھیرو سمجھ تو لو۔ لفظ فتح میں کیا بُرائی اور اقبال میں کیا خوبی ہے۔ مَیں نے کہا فرمائیے۔ فرمایا۔ اقبال اُردو میں مذکر اور فتح مؤنث ہے۔ پس جب شاعر اچھے شگون کے خیال سے یہ کہتا ہے۔ کہ عورت نہ کوئی سامنے آئے۔ تو فتح کا جو مؤنث ہے سامنے آنا کب مناسب ہوگا۔ اس کے سوا اقبال کے لفظی معنے پر غور کرو۔ اقبال کے خود معنے آگے آنے کے ہیں۔ لفظ فتح میں یہ بات کہاں۔" مَیں نے عرض کی "درست ہے"۔ فرمایا "اکثر بزرگوار (ذاکر) ازبسکہ میرے مرثیوں میں الفاظ کی خوبی اور اثر کو نہیں سمجھتے۔ اپنی سمجھ کے موافق الفاظ بدل دیتے ہیں۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے مصنف نے یوہیں کہا ہوگا۔ وہ اعتراض کرتا ہے۔ اُس کو کیا خبر کہ دبیر کے اصلاح دینے والے

۔ یہ اُس مرثیہ میں ٹیپ ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع ہر رہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ یہ مرثیہ نظیر برادر دبیر مرحوم کی تصنیف سے اور دبیر مرحوم کا اصلاحی ہے۔ نولکشور کے مطبع میں جلد دوا میں یہ مرثیہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ غلطی ہے۔ پورا بند یہ ہے۔ [illegible]

۵ آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے۔ اقبال سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے۔ ٹیپ مرزا صاحب نے اصلاح کی تھی ملاحظہ ہو جلد اول ص ۲۲ نولکشور پریس مرثیہ ہائے دبیر مرحوم

بے انتہا ہیں"+

میں عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت اکثر ذاکروں نے مرزا صاحب کے الفاظ اپنی سمجھ کے موافق بدل دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قلمی مرثیوں میں بےحد اختلاف ہیں۔ اور چھاپہ میں جو کاپی لکھنے والے یا مصلح سنگ نے اصلاح دی ہے۔ وہ مزید بے برآں۔ اس لئے بعض لفظ کو گھنٹوں بعض کو منٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے کیا کہا ہوگا۔ ایسی حالت میں بعض ناواقف معترضوں کا یہ کہدینا کہ ہر جگہ چھاپہ کی غلطی کا عذر نہیں چل سکتا کس قدر ظلم کی بات ہے۔ میر علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ والبقاہ (یادگار خاندان میر انیس مرحوم) ایک روز بسبیل تذکرہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ آپ دیکھئے۔ قرآن شریف مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اس کی صحت کا کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اہل ہنود صاحبوں کے مطبعوں میں عموماً کاتب قرآن مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جو صحت کو اپنا ایمان سمجھکر بہت کوشش کرتے ہونگے۔ کہ یہ کلام اللہ صحیح چھپے۔ مگر پھر بھی ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ پھر کلام دبیر و انیس (علیہما الرحمہ) پر معترض کا اعتراض کرنا اور یہ بتانا کہ اُن مرحوم نے یوں نہیں یوں کہا تھا۔ یہ جواب دینا کہ چھاپہ کی غلطی کا عذر ہر جگہ نہیں چل سکتا کس قدر نامناسب اور سینہ زوری ہے۔ خدا ایسے معترضوں کو ہدایت نیک دے +

فصل ۵ پڑھنے کا انداز

پڑھنے کا انداز۔ جوش معرفت میں سینہ کے زور سے پڑھتے تھے۔ اور مجلس میں جب کبھی پڑھنے کو جاتے تھے وضو کرکے جاتے تھے۔ اکثر با وضو مرثیہ پڑھتے تھے۔ آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ فطرتی طور پر کہیں خود بخود ہاتھ اٹھ جاتا تھا تو اٹھ جاتا تھا۔ ورنہ منبر پر بیٹھ کر بتلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے۔ آنکھ اور ابرو کا اشارہ بھی اسی قدر ہوتا تھا۔ جتنا باتوں میں ہوتا تھا[1]۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ ارتھ موسیقی میں داخل ہیں۔ مگر

[1] اس موقع پر میرے مکرم جناب سید نادر علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے کہ منشوں نے فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے وہ بات فرمادی کہ جو اس فن کی اصل اصول (یورپ میں) کہی جاتی ہے۔ حقیقتاً اسی قدر ہوتا ہے کہ اس فن کے عالم اچھا سمجھتے ہیں جتنا آدمی باتوں میں بتاتا ہے زیادہ بتائیگا تو وہاں بھی معیوب سمجھا جائیگا۔ میں کہتا ہوں اسی طرح کبھی باہم آدمیوں کی عادات میں اختلاف ہوتا ہے کہ کوئی باتیں کرے

سوزخوانی میں بھی بتانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ پس مرثیہ خوانی سے بتانے کو کیا علاقہ ہے چنانچہ ایک رباعی میں اس مضمون کو وہ کہہ بھی گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:۔

ناحق کا نہ چیخنا نہ چلانا ہے　+　بیکار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ابن شہ مرداں کا ثناخواں ہے دبیر　+　صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے

انہوں نے کبھی کسی اپنے شاگرد کو اپنے پڑھنے کا طرز نہیں سکھایا۔ نہ کسی شاگرد کو بجز ایک شخص آغا حیدر[۱] مرحوم کے اُن کا طرز آیا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے میں ایسا وقار تھا۔ کہ سننے والا ہمہ تن گوش اور محو حیرت ہو جاتا تھا۔ اور بعد تعریف کرنے پر آمادہ بلکہ مجبور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میر محمد شاہ[۲] صاحب مرحوم حدیث خواں مجھ سے بیان فرماتے تھے۔ کہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ (چوک لکھنؤ) میں ایک مرتبہ مرزا صاحب مرحوم مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بڑا مجمع تھا۔ میں منبر سے دور اندر کے درجہ میں تھا۔ میرے پاس ایک نواب زادے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو میر انیس صاحب سے بہت حسن عقیدت رکھتے تھے۔ اور ایسے پکے انیسئے تھے۔ کہ مرزا صاحب کی تعریف کرنا گویا گناہ اخلاقی سمجھتے تھے۔ بعض مصرع سُن سُن کر تعریف کے بدلے مجھ سے چپکے چپکے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھئے اس موقع کو میر صاحب کہتے تو یوں نہ کہتے۔ میں انکو منع کرتا تھا۔ کہ حضت (حضرت) کیا کسی دبیرئے سے لڑوائیگا۔ اگر آپکو کلام پسند نہیں۔ تو خیر چپکے سُنا کیجیے۔ اب وہ میرے تین چار بار کے کہنے سے چپ ہو گئے۔ اور دیر تک چپ چاپ

(بقیہ نوٹ نمبر ۱) میں بالکل ہاتھ نہیں ہلانا۔ کوئی کم ہلاتا ہے کوئی زیادہ۔ آخر یہ ہو کر یہی عقل سلیم فیصلہ کرتی ہے۔ کہ متوسط درجہ اچھا ہے خیر الامور اوسطہا پر عمل کرو + ۱۲ مؤلف۔

[۱] آغا حیدر مرحوم مرزا صاحب کے شاگرد رشید آغا حسن ازل مرحوم کے بڑے بھائی تھے سُنا ہے کہ اُنکی آواز بھی مرزا صاحب سے مشابہ تھی اور اُسی طرز سے پڑھتے بھی تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ اور آغا حسن ازل مرحوم میر احسن صاحب مؤلف واقعات انیس کے نانا تھے + ۱۲ مؤلف۔

[۲] یہ مرحوم زیادہ تر میر صاحب کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ اور اکثر میرے چھوٹے بھائی سے مرزا صاحب کے کلام پر مزاحاً اعتراض کرتے تھے جس کے جواب میں وہ میر نفیس صاحب کے بھانجے کلام میر صاحب پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ عجب صحبتیں تھیں عجب وقت تھا + ۱۲ مؤلف۔

سنا گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب پڑھتے پڑھتے اس موقع پر پہنچے :-

ناگاہ آئے شمر و عمر روبروئے شاہ بولے سپاہ کیا ہوئی؟ اے شاہ کم سپاہ
کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے کہ اب تم ہوئے تباہ اس لشکر قلیل پہ۔ یہ تھا غرور۔ واہ
ہرگز نہ بندگان خلیفہ سے ڈرتے تھے
اس فوج کے بھروسے پہ بیعت نہ کرتے تھے

شمر نے کہا نہ تم میں ہے انصاف نے حیا یہ فوج۔ کیسی فوج۔ کہ جرّار۔ باوفا
اس بیکسی میں اب بھی ہے۔ وہی حوصلہ مرا بندہ جائیں ہات بوذر کی یا سر ہوا جدا
واللہ ہات دونگا نہ۔ فاسق کے ہات میں
سر جائے گا۔ پہ فرق نہ آئیگا بات میں*

ظالم پکارے بس نہ کٹاؤ تو کیا کرو اب اختیار کیا ہے جو قصد دغا کرو
بیعت کرو حسنؑ کی طرح تو بھی اگر کرو تیغ بنی امیہ غضب ہے۔ ڈرا کرو
ہاشم کے خاندان [illegible] سب ولی ہوئے
لشکر شکن [illegible] علی ہوئے

شہ بولے تم [illegible] [illegible] سبط احمدؐ مختار ہے حسینؑ
کرار [illegible] بیعت [illegible] فرو جلال حیدر و قہار ہے حسینؑ

---

* اس مرثیہ کے پہلے بند میں جس کا مطلع یہ ہے [illegible] کی معرفت چھپ ہوئی۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد [illegible] میں چھپ چکا ہے۔ دیکھئے [illegible] جیسے ہی [illegible] میں انکی صفت [illegible] الفاظ [illegible] [illegible] [illegible]

اچھا۔ بھلا۔ کھڑے تو رہو۔ تم۔ میں آتا ہوں
اک فاقہ کش ✻ کے دُودھ کی طاقت دکھاتا ہوں

تصویر جنگ۔ لفظوں میں

شہ اک قدم بڑھے تھے کہ وہ دونوں ہٹ گئے
اُلٹی جو آستین دو عالم اُلٹ گئے
رکھا جو ہاتھ قبضے پہ دل سب کے پھٹ گئے
ہر سمت پیک دوڑے کہ طالع پلٹ گئے
بے پیر و۔ بھاگو۔ تم کو قسم اپنے پیر کی
کھنچتی ہے ذوالفقار جناب امیرؑ کی

اوپر کے چار مسلسل بند اور پانچویں بند کے چار رواں مصرع تو وہ چپ چاپ سُنا کئے۔ مگر جب پانچویں بند کی ٹیپ مرزا صاحب نے جوش میں آکر دردار آواز سے پڑھی۔ تو بیتاب ہوکر چلاّئے۔ اے سبحان اللہ۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جواب نہیں۔ میں آہستہ سے بولا۔ ہائیں یہ کیا؟ آپ تو تعریف کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کہا۔ میر صاحب۔ واللہ دل بے قابو ہوگیا۔ حقیقت میں میر صاحب اپنی طرز کے بادشاہ ہیں۔ یہ اپنے رنگ میں کامل و یکتا ہیں۔ بس بات وہی ہے۔ جو میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اُن کے کم بتلانے کے سبب سے حاضرین اپنی پوری توجہ سے متحاطب رہتے تھے۔ اور سُنتے سُنتے محو حیرت ہو جاتے تھے۔ اور تمام واقعات کی تصویر خود اُن کا کلام کھینچ دیتا تھا۔ اسی طرح میر دستور علی صاحب بلگرامی منصرم حجی و سیکرٹری جناب راجہ تصدق رسول صاحب راجہ جہانگیر آباد سلمہ اللہ البقاء مجھ سے ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ ناقل تھے۔ کہ میں اپنے والد ماجد میر حیدر رضا صاحب

میرانیس کے بیٹے کی نسبت دوسری حکایت

✻ یہاں بھی فاقہ کش کے لفظ مصنف نے میں بھی وہ کن یہ دا شت ہے ہیں۔ جو کلام میں ذرا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس موقع پر صنعت ہی یا اور کوئی شاندار لفظ لاتے۔ تو ہرگز سامعین و ناظرین کے دلوں پر یہ اثر نہ ہوتا۔ یہی جوہر مرثیہ کی جان ہیں۔ جناب سیدہ کی فاقہ کشی ہر شے باعث انتہا رہے کہ وہ دُوسروں کو اپنا کھانا کھلا کر خود بھوکی رہتی تھیں جسکو ایثار کہتے ہیں۔ یہ سخاوت کی اعلیٰ قسم ہے۔ پس یہ کہنا صحیح ہے کہ فاقہ کش کی بات سنتے ہی ذہن اُس کے ایثار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ + ۔ حقیر

بلگرامی (رضا تخلص) مرحوم کے ساتھ غالباً ۱۸۷۲ء میں (جن دنوں کیننگ کالج میں پڑھتا تھا) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے امام باڑہ (واقعہ گولا گنج لکھنؤ) کی مجلس میں پہنچا۔ میری عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس قدر وہاں مجمع ہو گیا تھا۔ کہ صدر پھاٹک کے سامنے جو دیوار پردہ کی تھی۔ اُس کو تڑوا دیا گیا تھا۔ پھر بھی ایک آدمی سے ملا ہوا دوسرا آدمی بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ **پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی*** وہ مرثیہ سُن سُن کر والد ماجد مجھ سے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھو۔ بعض ناواقف کہتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب سلیس نظم نہیں کہتے۔ صرف مضمون آفرینی طبیعت میں ہے۔ دقیق نظم ہی کہتے ہیں۔ اس مرثیہ میں دیکھو کس قدر زبان میں سلاست اور بندش میں صفائی ہے۔ اور واقعات کی تصویریں دیکھو کس عمدگی سے کھینچی ہیں۔ یہ بھی خیال کرو۔ کہ ان کا پڑھنا کس قدر دلوں پر مؤثر ہے۔ کہ تمام مجلس تصویر بنی ہوئی ہمہ تن گوش ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب اس موقع پر پہنچے۔ کہ حضرت زینب اپنے بچوں پر خفا ہو رہی ہیں۔ کہ تم نے شمر سے بات کیوں کی۔ اس موقع پر ایک مصرع مرزا صاحب تین طرح سے پڑھتے ہیں ؎ کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔ ہر مرتبہ مصرع کے ایک نئے معنی سامعین کے ذہن میں آئے۔ (۱) گھُڑکی کے لہجہ میں۔ کیوں۔ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی؟ (۲) استفہامیہ طور پر۔ کیوں؟ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی؟ (۳) تاسف و حسرت کے لہجہ میں۔ کیوں! تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی! اس قدر اس مصرع پر رقت ہوئی۔ کہ مرزا آگے نہ پڑھ سکے۔ والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا۔ اب کہو۔ مرزا صاحب سے بہتر کوئی شخص کلام کو ادا کر سکتا ہے۔ ایک ہی مصرع کو تین طرح پڑھ کر تین معنی پیدا کر دیئے۔ یہ محض پڑھنے کی خوبی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا بیشک ان کا ہی حصہ ہے۔ خاص کر بین کے مقامات پڑھنے

* جلد اول دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے + [illegible]

میں مرزا صاحب کو جو کمال حاصل تھا۔ شاید وہ کسی دوسرے ذاکر کو ہو۔ جناب استاذ مکرم (مرزا اوج صاحب قبلہ) فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ بنارس میں ایک ایرانی سوداگر نے مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلس کی تھی کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اوّل پیش خوانی میں میں پڑھا مجلس بالکل ٹھس تھی۔ اکثر آدمی صورت دیکھتے ہیں۔ نہ آہ ہے نہ واہ مجھے سخت تعجب ہوا۔ کہ الٰہی ماجرا کیا ہے۔ اکثر شکستہ دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں۔ یہ بات کیا ہے۔ میرے بعد جناب مرزا (دبیر) صاحب منبر پر گئے۔ اور خوب جی لگا کر یہی مرثیہ (پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی) انصاف اخیر اس مطلع سے پڑھا "بخشش میں دو۔ پر ایک صغیر اک کبیر ہے" مگر مجلس گم صم۔ میں حیرت میں یا اللہ یہ بات ہی کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے لڑائی ختم کی۔ اب بین کے موقع پر جب وہ پہنچے۔ تو فرمایا۔ اس کا سبب۔ میں سمجھ گیا۔ کہ آپ لوگ کیوں متاثر نہیں ہوتے۔ خیر اب آپ چند بند بین کے بھی سن لیجیے۔ اور آپ کو قسم ہے اگر آپ ضبط کریں۔ مجھے یہ منظور ہے کہ میں آپ کو رلاؤں۔ یہ کہکر جو بین پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہرام برپا تھا۔ سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے بیٹھے بیٹھے غش آ گیا۔ بعد ختم مجلس کچھ آدمیوں نے مرزا صاحب سے آکر عفو تقصیر چاہی۔ اور صاف اقرار کیا۔ کہ ہم میں آپس میں یہ عہد ہو چکا تھا۔ کہ کیسا ہی اچھا کلام کیوں نہ ہو۔ ہم نہ تعریف کرینگے۔ اور نہ روئینگے۔ ہمارے دل آپ کی نظم کے مزے اٹھا رہے تھے۔ اور لب گویا سئے ہوئے تھے جب آپ نے بین کے بند پڑھے۔ دل بے قابو ہو گئے اوّل آہستہ آہستہ اور پھر مجبوراً باواز بلند ہم روئے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ع میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا۔ مگر انسیت اور دبیریت کا ایسا خیال ایمان کا بگاڑنے والا ہے۔ آئندہ کیلئے آپ خدا سے توبہ کیجئے۔ اور کبھی کسی ذاکر کے پڑھنے میں ایسا تعصب کیجیئگا۔ ۱ے

۱ے یہ لوگ بچے انیسئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس صاحب کو بھی کبھی ایسا موقع پیش آیا تھا۔ چنانچہ وہ اسکی شکایت

فصل ۶
قوت حافظہ

قوت حافظہ۔ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ ایک دن دیوان خانہ میں دس یا نو بجے صبح کے مَیں پہنچا۔ مولوی کمال الدینؒ[1] صاحب مرحوم بھائی مرزا محمد جعفر (اوج مدظلہ) کو پڑھا رہے تھے۔ وہ مشکل مقام تھا۔ شاید حکمت کا کوئی دقیق مسئلہ تھا۔ مرزا صاحب نے مولوی صاحب ممدوح سے کہا۔ کہ حضت (حضرت) ہمکو تو ہمارے اُستاد نے یوں سمجھایا تھا۔ بڑی دیر تک مولوی کمال الدین صاحب سے بحث ہوئی۔ مرزا صاحب نے مرزا محمد جعفر سے فرمایا۔ کہ ذرا اندر جاکر ہماری کتابوں میں سے یہ کتاب اُٹھا لاؤ۔ جس میں ہم نے پڑھا تھا۔ جب تک وہ کتاب لائیں لائیں۔ مرزا صاحب کے قول کو مولانا کمال الدین نے قبول فرمالیا تھا۔ مولوی کمال الدین صاحب نے وہ کتاب لی۔ اور وہ مقام نکالا۔ تو حاشیہ پر بالکل وہی مضامین لکھے ہوئے تھے۔ جو مرزا صاحب نے بیان فرمائے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ مرزا صاحب کیا آپ نے زمانہ قریب میں اس کتاب میں یہ بحث دیکھی تھی؟ فرمایا۔ نہیں۔ جب پڑھا تھا جبھی کا یہ مضمون یاد تھا۔ مولوی کمال الدین مرحوم اور مَیں اس حافظہ پر تعجب کرتے تھے۔ کہ اس یاد کا کیا ٹھکانہ ہے۔ ۵۰ سال بعد وہی یاد ہے۔ جو پڑھا تھا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ افسوس جابجا سے یہ کتاب دیمک کھاگئی۔ اور بہت سے حاشیہ ضائع ہو گئے۔ ورنہ یہ کتاب محمد جعفر کے بہت کام آتی۔ مَیں نے اکثر موقع پر حاشیہ لکھے تھے۔ یہ بھی نانا مرحوم

قوت حافظہ کی دُوسری حکایت

(بقیہ نوٹ نمبر۱) ایک مرثیہ میں یوں نظم کر گئے ہیں سے خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں۔ اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں۔ خدا ایسے طرفداروں کو توفیق دے کہ وہ کلام کی خوبی طرفداری و تعصب کی عینک اتار کر دیکھا کریں۔ ۱۲ مؤلف

[1] مولوی کمال الدین مرحوم لکھنؤ کے چوٹی کے عالموں میں سے ایک عالم تھے مفتی میر عباس صاحب اور وہ ساتھ ساتھ سید العلما اور سلطان العلما سے پڑھے تھے۔ ان دونوں صاحبوں میں مدت مدید تک مباحثہ اور مناظرہ ہوا کیا ہے جیسا کہ لکھنؤ کے بڈھے بڈھے اہل علم بیان کیا کرتے ہیں۔ سلطان العلما اعلے اللہ مقامہ نے پھر وہ مباحثہ موقوف کرا دیا۔ لکھنؤ کے اکثر مجتہدین و علما ان دونوں صاحبوں کے پڑھائے ہوئے تھے۔ اور آج بھی بالواسطہ اُن کے کئی شاگرد مجتہد ہیں + ۱۲ مؤلف دبیر

بیان فرماتے تھے۔ کہ مرزا صاحب سے منشی دلگیر مرحوم کو بہت محبّت تھی۔ اور وہ بہت قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں جو شاید میر علی صاحب سوز خواں ہی کے امام باڑہ میں تھی۔ میر صاحب موصوف نے سوز میں منشی دلگیر مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا۔ سامعین میں مرزا صاحب بھی تھے۔ شام کو حسبِ معمول مرزا صاحب کے مکان پر مجمع ہوا۔ ایک صاحب حاضرین میں سے بولے۔ کہ میر علی صاحب نے آج جو مرثیہ پڑھا بے مثل تھا۔ مرزا صاحب نے بھی تعریف کی۔ کہ درحقیقت ایک ایک مصرع موتیوں میں تولنے کے قابل تھا۔ وہ صاحب بولے۔ بڑی مشکل یہ ہے۔ کہ اب جب تک میر علی صاحب اس کو نہ تقسیم کر دیں جناب منشی دلگیر کسی کو نہ دینگے۔ (یہی منشی دلگیر مرحوم کا قاعدہ تھا) اور میرا دل اس مرثیہ کو چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ مرثیہ کے کل پندرہ سولہ بند تھے۔ اگر کسی کی قوت حافظہ اچھی ہو۔ تو وہ ایک۔ دو دفعہ میں مرثیہ غور سے سُنکر یاد کر سکتا ہے۔ میر علی صاحب ابھی تو کئی مرثیہ پڑھینگے۔ اُنھوں نے کہا حضرت (حضرت) یہ ممکن نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا ذرا آپ لکھتے تو سہی۔ اب جو وہ لکھنے بیٹھے۔ تو مرزا صاحب نے ایک ایک بند کر کے وہ سب بند لکھوا دئے۔ اُنھوں نے مرثیہ لیکر بجائے شکریہ ادا کرنے کے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ حضرت (حضرت) لوگ کہا کرتے ہیں کہ منشی دلگیر اور آپ مل کر مرثیہ کہا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ استغفر اللہ۔ جھوٹے ہیں۔ جو ایسا کہتے ہیں۔ بھلا جناب دلگیر ایسے مشاق کو مجھ سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مرثیہ مجھے دیجئے۔ اُنھوں نے مرثیہ دیدیا۔ مرزا صاحب نے وضو کے لوٹے میں جو پاس رکھا ہوا تھا اُس مرثیہ کو ڈبو دیا۔ اُنھوں نے کہا۔ ہائیں قبلہ یہ آپ نے کیا کیا۔ فرمایا۔ آپ مجھے بدنام کرتے۔ اور صاف بجا کہتے پھرتے۔ کہ دبیر نے منشی دلگیر صاحب کا مرثیہ مجھے زبانی لکھوا دیا۔ وہ جناب دلگیر کو مدد دیتا ہے۔ جناب دلگیر کو خبر ہوتی۔ اُن کو صدمہ ہوتا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ کہ میں اُن کا دل دکھاؤں اور ایک کامل فن کی

تنقیص کی شہرت کا باعث ہوں +

وقت حافظ کی تیسری حکایت مرزا احمد مرحوم ظہور تخلص کی زبانی

میرزا احمد صاحب ظہور تخلص جن کا انتقال زمانہ قریب میں ابھی تین برس ہوئے جب ہوا ہے مجھ سے ناقل تھے۔ کہ ایک دن میر صفدر علی صفدر مرحوم میری موجودگی میں اپنا کہا ہوا مرثیہ سُناتے جاتے تھے۔ اور مرزا مرحوم سُن سُن کر جا بجا اصلاح دیتے جاتے تھے۔ کہ انھوں نے ایک مقام پر تلوار کی تعریف میں یہ ٹیپ پڑھی ؎

سدِّ سکندری کی ترتیب اڑا دی آتی تھی + دیوار قہقہہ بھی کھڑی تھر تھراتی تھی

فرمایا۔ اس کو یوں بناؤ ؎

سدِّ سکندری پہ جو بھڑکی گِرا دیا + دیوار قہقہہ پہ جو کڑکی رُلا دیا

میر صفدر علی مرحوم نے وہ اپنی کہی ہوئی ٹیپ کاٹ دی۔ اور یہ ٹیپ لکھ دی۔ مجھے اُن کی ٹیپ بھی یاد ہو گئی تھی۔ کہہ آکر لکھ لی۔ تیئیس چھبیس[25] برس کے بعد ایک اپنے مرثیہ میں وہی میر صفدر علی مرحوم کی ٹیپ بالفاظہٖ میں نے لکھ دی۔ وہ مرثیہ جب میں نے مرزا صاحب مرحوم کو سُنایا۔ تو وہ اس ٹیپ کو سُن کر کچھ سوچنے لگے۔ اور پھر فرمایا۔ یہ ٹیپ تو میں نے کبھی سُنی ہے۔ نہ معلوم کس نے پڑھی تھی۔ اور میں نے اس کو کٹوا دیا تھا۔ مجھے اُن کے اس حافظہ پر سخت تعجب ہوا اور پھر میں نے صاف حال بیان کیا۔ کہ یہ ٹیپ میر صفدر علی نے کہی تھی۔ اور آپ نے اُسکو کاٹ کر یہ ٹیپ بنائی تھی۔ مجھے اُن کی ٹیپ پسند آئی۔ میں نے لکھ لی تھی۔ وہی ٹیپ میں نے اپنے اس مرثیہ میں لکھی ہے۔ فرمایا اسے کاٹ دو۔ اور پھر کہو +

فصل ۷ پابندی اوقات

پابندی اوقات۔ مرزا صاحب کے اوقات مقرر تھے۔ سرِ شام سے ۹ بجے تک وہ نماز مع تعقیبات سے فارغ ہوتے تھے۔ پھر بارہ بجے رات تک حباب اور شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بڑے بڑے شاہزادے اور نواب اور [illegible] دولت پر حاضر ہوتے تھے علمی چرچے رہتے تھے۔ مگر اُن کی صحبت میں جب کوئی کسی کی نسبت کرتا تھا۔ تو اس کو [illegible] دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی کے شعر پر اعتراض کرتا

تھا۔ تو وہ اس کو ایک علمی بات سمجھ کر اپنے کسی شاگرد سے فرماتے تھے۔ کہ اس کا جواب دو۔ وہ جواب دیتا تھا تو خود سنا کرتے تھے۔ ورنہ خود جواب دیتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ جناب میر انیس صاحب مرحوم کی تنقیص[51] کرے۔ میر صاحب سے اُن کو دلی محبت تھی۔ اور وہ اُن کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ حقیقت میں سچ کہتے ہیں۔ اِنَّ اَھْلَ الْفَضْلِ یَعْرِفُ اَھْلَہٗ[52] کامل ہی کامل کی قدر سمجھتا ہے۔ (بقول مصنف حقیر) بیت

سخنور جانتے ہیں واقعی قدر سخنور کو ✦ پرکھ لیتے ہیں مشکل جوہری تمام اہل جوہر کو

آدھی رات کو جب یہ مجمع برخاست ہوتا تھا۔ تو پھر مرزا صاحب نماز شب میں مصروف ہوجاتے تھے۔ ٹھیک حال نہیں معلوم کہ رات میں کس وقت سے کس وقت تک سوتے تھے ✦

نماز صبح کا سلسلہ دو گھڑی دن چڑھے ختم ہوتا تھا۔ پھر کھانا کھاتے تھے۔ دوپہر کو اکثر اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ اور کبھی خود بھی وہ اسی وقت کہہ لیتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں یہ اس کثرت سے تصنیف فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ وہ مداحی اہل بیتؑ کو بھی عبادت خدا سمجھتے تھے۔ اکثر تعقیبات کے وقت بھی مناقب و مصائب اہلبیتؑ کہتے تھے ✦

---

[51] [illegible] بمقام پٹنہ ربیع الاول ۱۳۲۲ ھ [illegible] ایک دن باتوں باتوں میں خود میں نے ان سے پوچھا کہ جیسے میر صاحب و مرزا صاحب کی نسبت باہم اختلاف لوگوں میں ہے۔ کیا ان دونوں صاحبوں میں بھی کوئی اختلاف تھا۔ یا ایک دوسرے کو کسی دوسری [illegible] کسی قسم کی [illegible] جناب [illegible] بہت بہت اور قدر کرتے تھے [illegible] کمال شاید پھر پیدا ہو ✦ ۱۲ مؤلف حقیر

[52] [illegible] ✦ ۱۲ مؤلف حقیر

فصل ۸ مہمان نوازی

مہمان نوازی بھی مرزا صاحب کی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اکثر باہر کے اہلِ کمال ان کے در دولت پر ٹھیرتے تھے۔ اور مہینوں رہتے تھے۔ مرزا صاحب مہمانوں کے گویا مشتاق رہتے تھے۔ اور آنکھیں بچھاتے تھے۔ جناب سید اشفاق حسین عرف نواب [illegible] ہمشیرہ زادہ نواب [illegible] مرحوم رئیس [illegible] آباد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اس صفت میں [illegible] تھے [illegible] جلیس ان کے [illegible] الفاظ [illegible] خوان [illegible] تھے۔ اور عموماً پردیسیوں کی وہ عزت و تعظیم فرماتے تھے۔ اگر مجلس میں کوئی مہمان باہر کے ہوتے تھے۔ تو اُن کو محبت سے بلا کر عزت سے قریب منبر بٹھلاتے تھے جہاں بعض وقت بڑے بڑے لکھنؤ کے امیروں کو جگہ ملنا دشوار ہوتا تھا[1] +

فصل ۹ سخاوت

سخاوت ۔ مرزا صاحب کی سخاوت سے لکھنؤ کا [illegible] واقف ہے۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ میں [illegible] شاعر یا [illegible] کو [illegible] صاحب کو [illegible]

---

[1] [illegible] مرزا صاحب [illegible] ذی علم [illegible] لکھنؤ [illegible] مرزا صاحب [illegible] سننے کی [illegible] اور [illegible] ہو جاتے تھے [illegible] کے رہنے والے اور بالفعل [illegible] میں ایک ایک علم دوست [illegible] ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] [illegible] صاحب نواب [illegible] مرزا صاحب کے صاحبزادوں وغیرہ سے تحقیق کر کے فرمایا تھا کہ علاوہ

اپنے واسطے صرف مایحتاج (خرچ ضروری) رکھ لیتے تھے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء جب تپنہ عظیم آباد جانا ہُوا۔ اُن کے اکثر ملنے والے نہایت عسرت میں بسر کرتے تھے۔ وہ بے سوال کئے ہوئے توانگر کر دیتے اُن لوگوں کو کچھ بھیجتے ہوتے کبھی جیا آتی تھی۔ مرزا صاحب بنارس کے پارچہ ریشمی و زریں اکثر لاتے تھے۔ اور ایسے دوستوں کو بطور تحفہ دے دیتے تھے۔ اگر کوئی صاحب دختر ہوتے۔ تو اُن سے کہہ دیتے تھے۔ کہ یہ میری بھتیجی کے جہیز کے اسباب میں شامل فرما دیجیگا۔ دبیر کے واقف الاتفاق مرزا صاحب کی سخاوت کی مجھ سے سیکڑوں روایتیں بیان کرتے تھے۔ اگر اس زمانہ میں وہ کام لکھے نہیں لکھی جاتیں۔ تو نہ معلوم نئے تعلیم یافتہ اُن کو غیبی (گپیں) سمجھیں یا کیا۔ مگر اس لئے کہ اگر سب کو نہ بیان کروں۔ تو سب کو چھوڑنا بھی نامناسب۔ اور اُن لوگوں کی دلشکنی کا باعث ہوگا۔ جو ایسی روایات سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں سے بخیلوں کو بھی کچھ نہ کچھ حوصلہ سخاوت کا ہوتا ہے ✤

(۱) نانا مرحوم ناقل تھے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء میر محمد جعفر نام ایک میر [illegible] مجھ سے ایک روز بولے۔ کہ بھائی ایک دن ہمارے والد ماجد کے پاس رات میں چاندرات کے چاند رات آیا کرتا تھا۔ اور اُن کو پانچ روپے مل جاتا تھا۔ کل والد ماجد کا انتقال ہو گیا اب وہ آمدنی بھی [illegible] گئی۔ وہ جن شاید اُن کے مرنے پر مطلع نہ ہوا ہو۔ آج چاندرات ہے۔ شاید آج [illegible] وقت آتا ہے۔ وہ بولے۔ دوپہر رات [illegible] قریب [illegible] آج تم نے دیکھا۔ وہ بولے کبھی میں کہا کرونگا تم میرے پاس آج رات میں آنا [illegible] مگر اُن کے پاس جا آدھی رات کی ایک شخص نے زنجیر ہلائی۔ انہوں نے پوچھا کے [illegible] کہا۔ تم [illegible] پہنچا دو [illegible] ایک ہاتھ اُس نے [illegible]

وصف [illegible] سخاوت

(بقیہ حاشیہ [illegible]) [illegible] کی تنخواہ کے (سلطان عالم کی ماں ملکہ [illegible] زوجہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ) عشرہ محرم میں دس ہزار روپیہ مرزا صاحب کو نذر پیشکش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں جو ملتا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ اور اور [illegible] سلاطین [illegible] کرتے تھے۔ اُن تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے۔ تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

نے اُس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ روپیہ چھین سے زمین پر گر پڑے۔ گھبراہٹ میں مَیں نے ہاتھ پھٹکر جو اُس کو اس خیال سے گھسیٹا کہ یہ مجھے اُڑا نہ لے جائے۔ تو وہ شخص گر پڑا۔ اب جو مَیں دیکھتا ہوں۔ تو مرزا دبیر مرحوم ہیں۔ فرمایا۔ ہائیں میر محمد رضا۔ یہ کیا حرکت تھی؟ مَیں نے اُن سید کے مرنے کا حال کہا۔ اور محمد جعفر نے اور مَیں نے عفو تقصیر چاہی۔ مرزا صاحب نے مجھے اور محمد جعفر کو قسم دی۔ کہ جب تک مَیں زندہ رہوں۔ اس واقعہ کو تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جب دوسرے دن تخلیہ میں مَیں نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو فرمایا کہ میر صاحب بڑے ناموس دار و ناقدکش تھے۔ اگر مَیں اُن کو بتا دیتا۔ تو نہ لیتے۔ اس لئے پوشیدہ طور پر دیا کرتا تھا۔ یہ واقعہ میر مرحوم مرزا صاحب کے مرنے کے بعد اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔

قصہ عطیہ

بندگان خدا کی مطلب برآری۔ اس عبادت کو مرزا صاحب سب عبادتوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ آدمی نہیں ہے۔ جو دوسروں کے کام نہ آئے۔ چنانچہ ان کا یہ شیوہ تھا۔ جب کبھی کوئی اہل حاجت اُن سے اپنی حاجت بیان کرتا تھا۔ اگر خود اس کی امداد کر سکتے تھے۔ تو خود دیتے تھے۔ ورنہ کسی بیگم یا شاہزادہ یا نواب یا وزیر کو سفارشی رقعہ لکھ دیتے تھے۔ ان کا رقعہ پرمیسری نوٹ یا ہنڈوی کا کام دیتا تھا۔ اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور سفارش کر کے دلوا دیتے تھے۔ غرض یوں حاجت ہر ایک کی روا فرماتے تھے۔

حکایت (۱۰)

مولوی سید حیدر مرزا صاحب سلمہ خلف مغفور نواب مرزا صاحب مرحوم مجھ سے ناقل ہیں کہ جناب میر انیس مرحوم کے ایک شاگرد نے ایک روز زمانہ شاہی لکھنؤ میں مرزا صاحب سے آ کر کہا کہ مجھے ملکہ زمانی کی مجلس میں آج پڑھوا دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا۔ اپنے پاس سے تمام قیمتی شاہانہ کپڑے اُن کو پہنوا دئے۔ ایک بنیس[1] میں خود دوسری میں

[1] بنیس عام طور پر تمام ہندوستان میں بولا جاتا ہے۔ ... کی زبان کی یہ لفظ ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں ... ہوئی لفظ ہے۔ مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ... بنیس ... ہیں جو کہ یہ

مدّت تک مرزا صاحب میری تنخواہ خزانہ شاہی سے لیکر بھجوایا کئے ۔ مرزا صاحب سیرت و صورت میں فرشتہ صفات تھے +

مطلب برآری بندگان خدا کی چوتھی حکایت

ایک بزرگ مجھ سے ناقل تھے ۔ کہ زمانہ شاہی میں مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا تھا۔ **ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ۔** تمام مرثیہ بالخصوص اس کا بَین مرزا صاحب کو بہت پسند تھا ۔ اکثر اُن کے شاگردوں اور دوستوں نے مانگا ۔ مگر مرزا صاحب نے کسی کو نہ دیا ۔ نواب محسن الدولہ مرحوم جو لکھنؤ کے ایک فیاض رئیس (بادشاہ اول اودھ غازالدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کے داماد) تھے اس مرثیہ کے بہت مشتاق تھے ۔ وہ کسی رئیس کے یہاں مجلس میں نہ جاتے تھے ۔ اور کلام مرزا صاحب کے گویا عاشق تھے ۔ اُنہوں نے بارہا اپنے جلسہ میں فرمایا ۔ کہ جو شخص یہ اصلی مرثیہ مرزا صاحب کا مجھے کسی ترکیب سے لادے ۔ میں اُس کو پانچ سو روپیہ انعام دُوں ۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی خبر ہو گئی ۔ وہ مرثیوں کو اور خصوصاً نئے مرثیوں کو بہت احتیاط سے رکھتے تھے ۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء ہو گیا ۔ بعد غدر ایک سیّد صاحب مرزا صاحب کے پاس آئے ۔ اور اُن سے کہا ۔ کہ میں لڑکی کی شادی کرونگا ۔ اور پھر کربلائے معلّیٰ جاؤنگا ۔ آپ پانچ سو روپیہ کسی رئیس سے مجھے دلوا دیجئے ۔ وہ زمانہ لکھنؤ کی تباہی کا تھا ۔ اکثر رئیس اپنے حال میں مبتلا تھے ۔ مگر نواب محسن الدولہ کے پاس کئی لاکھ روپیہ کے نوٹ اور پنشن معقول اور جائداد تھی ۔ مرزا صاحب نے کچھ سوچ کر اُن کو اپنا یہی مرثیہ دیدیا ۔ اور کہا ۔ کہ آپ نواب محسن الدولہ کی ڈیوڑھی پر جا کر اطلاع دیجئیگا ۔ کہ میرے پاس یہ مرثیہ ہے ع کس شیر کی آمد ہے ۔ اور یہ بھی کہئیگا ۔ کہ میں نے سُنا ہے ۔ کہ آپ کا اشتہار ہے ۔ کہ جو شخص یہ مرثیہ لادے میں اُس کو پانچ سو روپیہ دُونگا اب مجھے ۵۰۰ روپیہ دیجئے ۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا ۔ پہلے تو محسن الدولہ مرحوم سمجھے ۔ کہ صرف وہ مطلع ہے ۔ اور کسی نے اور بند لکھکر لگا دئے ہیں ۔ مگر جب اُن سیّد صاحب نے کہا ۔ کہ آپ تو اُن کے خط کو پہچانتے ہیں (اور وہ واقعی

خط کو پہچانتے تھے۔ کہ اُن کی زوجہ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں) تو اُنہوں نے خط پہچان کر مرثیہ کی نقل لے لی۔ اور ۰۰۰ ۵ دیدئے۔ اور اصل مرثیہ واپس دیدیا۔ سید صاحب سے یہ بھی پُوچھا۔ کہ یہ مرثیہ آپ کو کیونکر ملا۔ مگر اُنہوں نے کہا۔ یہ مَیں نہ بتاؤنگا۔

فصل ۱۱
متانت۔ خود داری، وضعداری، حاضرجوابی، وعدالت۔

متانت و خود داری اور وضعداری و حاضر جوابی و عدالت۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔ کہ جو وضع مرزا صاحب نے اختیار فرمائی۔ خدا کے فضل سے مرتے مرتے نباہ دی۔ چنانچہ وہ کبھی شہر میں پیدل نہیں پھرے۔ ہمیشہ لوگوں نے اُن کو پینس میں دیکھا۔ اور متانت ایسی تھی۔ کہ با وصف ایک شاعر و مرثیہ گو کی حیثیت میں رہنے کے بڑے بڑے صاحبان علم اُن کو اپنا قبلہ و کعبہ اور لائق احترام جانتے تھے۔ اور جن امور میں دبنا اور عجز کرنا غیر مستحسن ہے۔ اُن میں وہ کبھی کسی سے دب کر نہیں رہے[۱]۔

عدالت کا اس قدر خیال رکھتے تھے۔ کہ کبھی کسی غریب کے مقابلہ میں کسی امیر کی بدآبندو بد اصل طرفداری نہیں کی۔ نہ کبھی کسی بادشاہ یا رئیس کی اُنہوں نے خوشامد کی۔

حاضر جوابی کی حکایت

[۱] چنانچہ یہ واقعہ میرے روبرو فرمایا سید احمد صاحب نقوی جائسی زاد کرمہ جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ کے بھتیجے اور شاگرد رشید جناب ممدوح سے سند لکھتے ہیں۔ کہ ایک روز جناب علیین مکان (سید العلماء سید حسین صاحب قبلہ) کی صحبت میں میں حاضر تھا۔ اور سید امداد علی صاحب مرحوم مصنف بحر المصائب جنکو امیریت میں حد درجہ غلو تھا۔ اور اور چند اہل علم حاضر تھے۔ کہ مرزا صاحب کے اس مرثیہ کا ذکر ہوا ؎ کس کے گل حدوث میں خوشبوِ قدم کی ہے۔ مولوی امداد علی صاحب مرحوم نے (خدا اُن کی مغفرت کرے) سید ن صاحب قبلہ سے عرض کی۔ کہ دیکھیں حضور۔ اب تو مرزا صاحب نے حد درجہ غلو فرمایا ہے۔ کہ صفت قدم کو جو خدا سے مختص ہے آنحضرت صلعم سے منسوب کردیا۔ اس پر میں نے کچھ اُن کے اعتراض کے جواب میں کہنا شروع کیا۔ کہ اتفاق سے مرزا دبیر صاحب بھی آگئے۔ اُنہوں نے غالباً مکان میں آتے آتے کچھ الفاظ اس بحث کے سنے تھے۔ کہ جناب سید العلماء سے عرض کیا کہ اس وقت حدوث و قدم کی کیا بحث تھی۔ مولوی امداد علی صاحب نے کہا۔ کہ جناب آپ نے قدم کو صفات رسول مقبول صلعم سے متعلق فرمادیا۔ مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا۔ مَیں نے تو قدم نہیں بلکہ خوشبوئے قدم کا دعوے کیا ہے۔ حق تعالے تو آنحضرت کی نسبت قدم صدق ارشاد فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ یٰس میں ہے۔ والقمر قدرناہ منازل حتیٰ

نہ لباس درباری سے کہیں گئے۔ نہ مدۃ العمر کسی بادشاہ کو خداوند کہا۔ (حقیر ثابت) سے

رہے جہاں میں انساں آن بان کے ساتھ ✦ کہ جوہری جو ہیں۔ موتی کی آب دیکھتے ہیں

فصل ۱۲ برکت شاگردی سے اور اس متعلق حکایت

برکتِ شاگردی۔ نواب منّی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اس کو ہم خرق عادت کہ سکتے ہیں۔ کہ جو اُن کا شاگرد ہُوا۔ خوب پھلا پھُولا ✦

درحقیقت مرزا صاحب کے شاگرد جس کثرت سے کامل و قابل ہُوئے ہیں۔ ایسے کم (شاعروں کے شاگرد) نکلینگے۔ مَیں نے اسی خیال سے اُن کے بالواسطہ و بلاواسطہ اکثر شاگردوں کے بھی حالات لکھ دئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا۔ کہ ملک کو اُن سے کس قدر فیض پہنچا۔ اس موقع پر نواب منّی صاحب کی زبانی یہ دِکھانا چاہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب کے تلمذ کی برکت کس قدر تھی۔ اور وہ محض ہمندی کو بھی بتانے میں تامل نہ فرماتے تھے۔ نواب منی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ایک بار میرے ماموں نواب دولھا صاحب شمس آبادی مرحوم ایک منت ادا کرنے کی تقریب سے (کہ درگاہ حضرت عباسؑ میں علم چڑھانا تھا) مع متعلقین کے لکھنؤ تشریف لیگئے۔ مرزا صاحب سے پہلے سے تعارف تھا۔ مرزا صاحب نے نواب صاحب کی اعلےٰ درجہ کی دعوت کی۔ اُسی زمانہ قیام لکھنؤ میں نواب صاحب نے مجھ سے اور بھائی نواب پیارے صاحب[سلہ] اپنے منجھلے بیٹے سے فرمایا۔ کہ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ برکت کے لئے تمکو جناب مرزا صاحب کا شاگرد کرادوں۔ ہم نے عرض کی۔ بہت

از نواب منی صاحب کی زبانی ۱۲

(بقیہ نوٹ نمبر۱) عادکا العرجن القدیم۔ اس پر مولوی صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ اب تو مَیں مایوس ہوگیا۔ فوراً مرزا صاحب بولے آپ مایوس نہیں بلکہ آئس ہیں۔ اس پر تمام مجمع اہل علم میں ریشخند (ہنسی) ہوئی۔ اور جناب مرزا صاحب کی صحت کی تائید کی۔ (حقیقت میں مایوس بجائے آئس غلط ہے کیونکہ عربی کے قاعدہ سے اس کے معنی پر آئس آتا ہے۔ مایوس اُس کا مفعول ہے) اور جب مرزا صاحب چلے گئے تو میرن صاحب قبلہ نے مولوی محمد علی صاحب سے فرمایا۔ کہ کچھ بھی کاہی تیجہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس وقت نصیب ہوا۔ اللہ اللہ کس پایہ کی معلومات تھی۔ اور کیا حاضر جواب طبیعت پائی تھی ✦ ۱۲ مولف حقیر۔

سلہ نواب پیارے صاحب کے بھی مختصر حالات تلامذہ مرزا صاحب کے سلسلہ میں (انشاءاللہ) لکھونگا ✦ ۱۲ مولف حقیر۔

مناسب ہے ۔ چنانچہ ایک دن کچھ مٹھائی اور کچھ آدمی ساتھ کر کے ہم دونوں کو جناب مرزا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ ہم نے جا کر دیکھا۔ کہ اتنے بڑے نامی گرامی حضرت کی نشست گاہ میں (بشان اہل اللہ) چند چارپائیاں خالی پڑی ہیں۔ اور ایک تخت پر سفید بچھونا ہے ۔ اُس پر جناب مرزا صاحب کچھ عبادت و اشغال میں مشغول ہیں۔ میرا اور بھائی پیارے صاحب کا سن غالباً نو دس برس سے زیادہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ کم عمر اپنے عزیز بچوں سے باتیں کرنے کا طریقہ ہے ۔ اُس طرح کی دو چار باتیں کر کے مرزا صاحب نے بھائی پیارے صاحب سے پوچھا۔ تم کچھ موزون کر لیتے ہو؟ شاید اُنھوں نے "جی ہاں" کہا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کچھ کہو۔ بھائی نے یہ ایک مصرع موزون کر کے سُنایا۔ ع خوف غالب ہے آپ سے مجھکو۔ یہ سُن کے بہت عمدہ طرز سے کہ ناگوار نہ گذرے فرمایا۔ کہ بھائی "آپ سے خوف غالب ہے" کا محاورہ نہیں ہے ۔ بلکہ یہ محاورہ ہے ۔ کہ "آپ کا خوف غالب ہے"۔ یہ سُنکر مَیں فوراً بول اُٹھا۔ کہ ع خوف غالب ہے آپ کا مجھکو۔ یہ سُن کر میری طبیعت اور بھائی پیارے صاحب کی موزونیت کی تعریف کی۔ بس دو ایک باتوں کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے ۔ مگر صرف اُس برائے نام شاگردی کا یہ اثر ہے ۔ کہ بھائی پیارے صاحب اُن کے مرثئے وغیرہ دیکھ کر ایسے تاریخ گو شاعر ہوئے ۔ کہ اس وقت ضلع فرخ آباد تو کیا اور اضلاع میں بھی ایسا جلد و خوب تاریخ کہنے والا شاعر دوسرا نہ ہوگا۔ اور کمترین (منّی صاحب) کو صرف مشہور درسی فارسی کتب کی استعداد ہے ۔ بایں ہمہ اپنی حیثیت سے زیادہ نظم و نثر لکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس کو دیکھکر عقل اس کی قائل ہوئی۔ کہ یہ صرف اُنہیں کی شاگردی اور دعائے خیر کی برکت ہے +

دوسرے کو احمق بنانے کی عادت سے نفرت

دوسرے کو احمق بنانے اور ہجو ملیح کرنیکی بعض حضرات کو عادت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کو اس سے کمال نفرت تھی۔ اور وہ ایسی تعریف کو منافقانہ کہا کرتے تھے +

حسد اور رشک سے بھی اُن کو جلن تھی۔ اور اکثر اپنا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

مذہب میں مرے رشک خفی شرک جلی ہے + واللہ کہ یہ ولولۂ حُبِّ علیؑ ہے

ایفائے وعدہ۔ آندھی آئے مینہ آئے۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔ وہ سو کام چھوڑکر وعدہ ضرور وفا فرماتے تھے۔ چنانچہ جناب مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا و مقتدانا سید علی حسن صاحب قبلہ دام ظلہ[۱] تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ مجلس میں مرزا صاحب نے ایک نیا مرثیہ پڑھا۔ جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ مرزا صاحب سے مانگا۔ فرمایا بروز روانگی وطن آپ کو ملیگا۔ میں عشرۂ محرم ہمیشہ جائس میں کیا کرتا تھا۔ آخر ماہ ذیحجہ میں جب لکھنؤ سے قصد روانگی وطن کیا۔ تو میں نے شہر کے ناکے پر اپنے پہنچنے سے پہلے مرزا صاحب کی پالکی موجود پائی۔ مرزا صاحب ملے۔ تو وہی مرثیہ ہاتھ میں تھا۔ مجھے عنایت فرمایا۔ میں مرثیہ لیکر وطن کو روانہ ہوا[۲] +

دل جوئی۔ مرزا صاحب کبھی اپنے دشمن کی بھی دل شکنی گوارا نہ فرماتے تھے۔ اور دل آزاری کو بدترین خصائل ذمیمہ سمجھتے تھے۔ اور خلاف حیا و مروت اُن سے کوئی بات ظہور میں نہ آتی تھی۔ یہ اُن کا شعر بالکل اُن کے حسب حال ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو + مانند غبار اُٹھنے ہیں نقش قدم ہوا کو

میر ضمیر صاحب سے جب لوگوں نے بگڑوا دی ہے۔ تو کیسے کیسے لوگوں نے ملے گئے۔ مگر میر ضمیر صاحب کی شان اقدس میں تو کوئی کلمہ کہنا مرزا صاحب کفر سمجھتے تھے۔ اُن لوگوں کی زبان درازیاں سُن سُنکر کبھی زبان نہ ہلائی۔ اور کہا تو بس یہ کہا۔ کہ جو بالکل زمانہ کے حسب حال

---

[۱] صدر الافاضل جناب مولوی سید سبط حسن صاحب جائسی جو آجکل محدث و ذاکرِ بے بدل کا عنوان ہندوستان مانے جاتے ہیں۔ انہیں کے نواسے اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ع قیاس کُن ز گلستان من بہار مرا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] آج یہ مرثیہ کہیں نہیں ملتا۔ نہ معلوم جناب قبلہ و کعبہ سے کون لے گیا۔ ایسے ایسے بہکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے بے پتہ ہیں۔ کہ جن کے مصرع لوگوں کو یاد ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سینے ۔ اور اپنے دلی خیال کی تصویر کھینچ دی ہے ۔ ؎

برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے ✤ آئینہ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے

آستینوں اور زمینوں والے سلام پر جو طرفداران میرانیس مرحوم نے ایک جھگڑا کھڑا کر دیا تھا جس کا بیان اس کتاب میں اپنے مقام پر ہوگا ۔ اُس زمانہ میں بھی کسی کو کوئی کلمہ جناب میرانیس مرحوم کی تحقیر کا نہیں کہنے دیا ✤

خوش اخلاقی کی وجہ

معلوم ہوتا ہے ۔ کہ محمد و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق و عادات کتب احادیث و سیر میں دیکھتے دیکھتے اور اُن کے مناقب و فضائل نظم کرتے کرتے اخلاق حسنہ نے مرزا صاحب کے دل پر پورا پورا اثر کیا تھا جس طرح بعض تصوف کی کتابوں میں محبوب کے ہم رنگ ہونے کی تشبیہ مذکور ہے ۔ کہ لوہا باوصفیکہ آگ نہیں ہے ۔ مگر جب آگ میں پڑیگا ۔ تو آگ کا ہم رنگ و ہم اثر ہو جائیگا ۔ کہ جو شخص اُس وقت چھو لیگا ۔ جل جائیگا ۔ پس آگ کی صحبت نے لوہے کو اپنا ہم رنگ و ہم اثر بنا دیا ۔ یہی حالت مرزا صاحب کی ہو گئی تھی ۔ کہ محمد و آل محمد کے اخلاق حسنہ نے اُن کے دل میں (ولائے محمد و آل محمد کی طرح) اپنا گھر کر لیا تھا ۔ وہ آل محمد کے ایسے غلام تھے ۔ کہ جس غلام میں آقا کی صحبت کی بدولت آقا کی عادتیں سرایت کر [illegible] شاگرد جن کو اخیر زمانہ میں یہ شکایت رہتی تھی کہ نیا مرثیہ نہیں ملتا ایسے ایسے ڈھبوں سے اپنا مطلب نکال لیتے تھے ۔ چنانچہ

لطیفہ ایک سید صاحب کی حکایت

نانا مرحوم فرمایا کرتے تھے ۔ کہ ایک روز نگینہ کی طرف کے ایک کہن سال سید جو شاید نوّے اور سو برس کے درمیان میں ہونگے ۔ مرزا صاحب کے پاس (بعد زمانہ دراز غدر ۱۸۵۷ء کے) آئے ۔ میں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا بیٹھک کے مکان میں آتے ہی پوچھا ۔ دبیر کس کا نام ہے ؟ مرزا صاحب بولے ۔ فرمائیے حقیر ہی دبیر ہے ۔ خیر ۔ بیٹھے ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بولے ۔ میرا نام حسین بخش ہے ۔ اور میں صحیح النسب سید ہوں ۔ میرے نام کا سجع کہہ دیجئے ۔ مرزا صاحب بولے ۔ کہ آپ کا نام ایسا مسجع اور اچھا

ہے۔ کہ اُس کے واسطے پہلے سے سجع موجود ہے*۔ پُوچھا وہ کیا؟ فرمایا ع یارب گناہِ ما بطفیلِ حسینؑ بخش۔ بڑے میاں خوش ہو گئے۔ مرزا صاحب کو دعائیں دے کر کہا۔ کہ ذرا ایک پرچہ پر اسے اپنے ہاتھ سے لکھ بھی دو۔ شاید میں بھول جاؤں۔ مرزا صاحب نے جلی قلم سے لکھ دیا۔ کہا اب میں چوک میں جاتا ہُوں۔ اور اس مصرع کو ھکاک سے ایک عقیق کے نگینے پر کھدوا کر ابھی انگوٹھی بنواتا ہُوں۔ یہ مصرع آپ کا یادگار میرے پاس رہیگا۔ یہ کہکر تشریف لیگئے۔ مَیں (محمد رضا طمیر) کچھ دنوں سے نیا مرثیہ مرزا صاحب کے نہ دینے کے سبب ملول تھا۔ اُن کے بعد اُٹھا۔ بڑے میاں آہستہ آہستہ جب ٹیکتے ہُوئے نخاس کی سڑک کے قریب پہنچے تھے۔ کہ مَیں بھی برابر پہنچ گیا۔ وہ بار بار اُس لکھے ہُوئے مصرع سجع کو دیکھتے اور خوش ہوتے جاتے تھے۔ مَیں نے پُوچھا۔ حضت (حضرت) کہاں تشریف لے جائیگا۔ فرمایا۔ بس ذرا چوک تک۔ وہی سجع کا مصرع کندہ کراؤنگا۔ کیوں میاں لاجواب مصرع ہے؟ مَیں نے سر جھکا کر کہا۔ جی ہاں! آپ کی پسند ہے۔ ہم تو اس کو کیا کہیں۔ کیسا سمجھتے ہیں۔ بڑے میاں بولے۔ کیوں صاحب آپ اس کو کیسا سمجھتے ہیں۔ مَیں بولا۔ جناب آپ اس کے کچھ معنی بھی سمجھے۔ کہا۔ ہاں میاں یہی معنی ہیں۔ کہ اے خدا میرے گناہ امام حسین علیہ السّلام کے صدقہ سے بخش دے۔ مَیں نے کہا۔ جی ہاں یہ تو سیدھے سادے معنی ہوئے۔ مگر دُوسرے معنی بھی آپ سمجھے۔ اُنہوں نے کہا۔ وہ تم کہو۔ مَیں نے کہا۔ ایک اس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اے خدا۔ مَیں نے حسین بخش کی طفیل یعنی سبب سے گناہ کئے ہیں وہ بخش دے۔ یہ مرزا صاحب نے آپ سے مزاح فرمائی ہے۔ بڈھا یہ سُنکر آگ بگولا ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ ہاں میاں واقعی یہ معنی بھی ہو تو سکتے ہیں۔ مگر مَیں تو سو برس کا بڈھا ہُوں۔ کیا مجھ سے بھی مرزا صاحب نے دل لگی کی۔ مَیں چلا۔

* پہلے سے سجع موجود ہونا شاید اس خیال سے فرمایا ہو کہ شیخ ناسخ مرحوم کا سجع خود اُنہیں کا کہا ہُوا بہت مشہور ہے ع یارب گناہِ ما بطفیل امام بخش۔ ناسخ مرحوم کا نام امام بخش تھا۔ ان سید صاحب کا نام حسین بخش تھا۔ یہ خفیف فرق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب آپ کیا سمجھتے ہیں ہم شہر والوں کی عادت ہوتی ہے ۔ بیرونیوں ۔ دیہاتیوں کو اُلّو بناتے ہیں ۔ وہ بزرگوار اُسی پاؤں پھر کر مرزا صاحب کے پاس آئے ۔ مرزا صاحب بیٹھے ہوئے تھے ۔ پرچہ اُن کے سامنے غصہ میں پھینک دیا ۔ اور کہا ۔ مرزا صاحب افسوس کا مقام ہے میرے پوتے تمہارے برابر ہیں ۔ میں سید تم مغل تمکو شرم نہیں آتی ۔ مجھ سے دل لگی کرتے ہو ۔ میرے طفیل میں تم نے کون کون سے گناہ کئے ہیں جنکی معافی خدا سے چاہتے ہو ۔ اب مرزا صاحب ہیں کہ گردن جھکائے تصویرِ حیرت بنے ہوئے چپ بیٹھے ہیں ۔ (بقول مؤلف حقیر)

ہر اک کے شکوۂ بے جا پہ سر نگوں رہنا ✦ پسند آئی یہ پیرِ فلک کی چال مجھے

جب وہ بزرگوار خوب خوب دل کے پھپولے پھوڑ چکے ۔ تو مرزا صاحب نے سر اُٹھا کر فرمایا ۔ بھلا میر صاحب ۔ میں آپ ایسے مقدس معمر بزرگ سے دل لگی کرونگا ۔ پہلے یہ فرمائیے ۔ یہ معنی آپکو کس نے بتلائے ۔ وہ جو صاحب ابھی یہاں آپکے برابر بیٹھے ہوئے تھے ۔ کیا اُنھوں نے یہ معنی سمجھائے ہیں ۔ بڈھا اِس کلمہ سے اور بھی بھڑک اُٹھا ۔ گویا جلتی ہوئی آگ پر تیل پڑا ۔ بولا ۔ سبحان اللہ ۔ کیا آپ نے مجھے کندہ ناتراش ہی سمجھ لیا ۔ آپ لکھنؤ والوں میں یہ بھی سخت عیب ہوتا ہے ۔ کہ سمجھتے ہو ۔ بس ہم ہی پڑھے لکھے ہیں ۔ ہمیں سمجھتے ہیں ۔ بیرونی ۔ دیہاتی تو سب احمق ہی ہوتے ہیں ۔ جناب گلستاں ۔ بوستاں ۔ شاہنامہ ۔ سکندر نامہ ۔ یوسف زلیخا ۔ سہ نثر ظہوری ۔ پنج رقعہ ۔ وقائع نعمت خاں عالی سب چاٹے بیٹھا ہوں ۔ جاہل مطلق نہیں ہوں ۔ گاؤں کا رہنے والا ہوں ۔ آپکی طرح تڑاق پڑاق زبان چلانا نہیں آتا ۔ مرزا صاحب نے بہت منت سماجت سے اُن سید صاحب کو راضی کیا ۔ بااینہمہ اس کے معنی اُن کے ذہن نشین ایسے ہو چکے تھے ۔ کہ جبتک دوسرا مصرع سجع مرزا صاحب نے نہ کہدیا وہ وہاں سے نہ اُٹھے ✦

جب حسب معمول میں رات کو پہنچا ۔ مرزا صاحب بولے ۔ کیوں بھئی میر محمد رضا ؟ اب تم ایسی ایسی رہزنیاں کرنے لگے ۔ اُلٹے پُلٹے معنی سمجھا کر سادات کی دل شکنی کے مرتکب

ہوتے ہو۔ اور مجھے گالیاں سنواتے ہو۔ مَیں نے کہا۔ جناب! یہ محمد رضا بھی سیّد ہے۔
چمار نہیں ہے۔ اس کی دلشکنی چھ مہینہ سے ہو رہی ہے۔ اس کا آپ کو خیال ہی نہیں آ
گیا گاؤں میں رہنے سے اُن کی سیادت سندی ہو گئی۔ اور میرا رتبۂ سیادت شہر میں رہکر گھٹ
گیا۔ فرمایا۔ تم یہ تو سوچو۔ اب تک برابر سالانہ تمکو دو تین مرثیے نئے ایسے دیتا رہا۔ کہ
پھر جب تک تم اُس مرثیہ کو عام طور پر تقسیم کرنیکی رائے نہ دیتے تھے۔ مَیں سب شاگردوں
اور دوستوں کو نہ دیتا تھا۔ اب کچھ محمد جعفر اور محمد ہادی حسین کا بھی حق ہے یا نہیں۔ کچھ
ان کے واسطے رہنے دو۔ مَیں نے کہا۔ حضرت (حضرت) بھائی محمد جعفر* ماشاء اللہ
چشم بد دُور ابتدائے مشق میں خود اچھا کہنے لگے ہیں۔ چند روز میں اور اچھا کہنے لگینگے۔ آپ
اُن کی فکر کیوں فرماتے ہیں۔ بھلا انصاف فرمائیے۔ یہ بیچارے بھائی محمد جعفر کی کیسی بیکسی ہے ۵
کانٹا جو گل سے نوک کی لیتا ہے خوار ہے + سبزہ فروتنی سے چمن کی بہار ہے
ہم تو مر کے بھی جی اُٹھیں جب بھی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ یہ آپ کی دعائے نیم شبی کا اثر
ہے۔ فرمایا۔ محض خدا کی عنایت ہے۔ یہ فرما کر اندر سے حبیب ابن مظاہر (امام کے رفیق
امام حسینؑ) کے حال کا مرثیہ لائے۔ اور فرمایا۔ لیجئے۔ مگر یہیں بیٹھ کر دیکھ لیجئے۔ پھر آپ گھر
پر لے جا کر دوپہر کے بعد مسودہ کر کے مرثیہ واپس لائیگا۔ اور فرمائیگا۔ کہ دوسرا مرثیہ
دو۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ تو مَیں نہ مانونگا۔ یہ مرثیہ میرا سُنا ہوا تھا۔ مَیں نے ایک
دو بند دیکھ کر کہدیا۔ حضرت امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ مجھے چاہئیے۔ فرمایا۔ کیوں۔
مَیں نے کہا۔ وجہ کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ تم ان کے مرتبہ سے واقف ہو۔ یہ کون بزرگوار
ہیں۔ یہ جناب رسول خدا صلعم کے وفادار صحابی۔ جناب امیرؑ کے غمگسار۔ امام حسینؑ کے
جاں نثار ہیں۔ یہ مرثیہ بہت اچھا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ سب سہی (صحیح) مگر امام حسینؑ
۶۳ نہ تھے۔ میرے پڑھنے سے ان کے حال پر لوگ بہت کم روئینگے۔ آخر یہ سوچینگے کہ

* یہ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کا اسم سامی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

سال کے بُڈھے تھے۔ امام حسینؑ پہ سے صدقے ہو گئے۔ مجھے تو وہ مرثیہ دیجئے سے "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے"۔ فرمایا۔ یہ سب خیالات بیہودہ و جاہلانہ ہیں۔ حبیب ابن مُظاہر اسدی کے مرتبہ کو بڑے سے بڑا عالم و محدث و مجتہد بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ وہ بندگوار تھے۔ جن کی نسبت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پہ نثار ہوں[1]۔ مَیں نے عرض کی۔ خیر ان کے مرتبہ میں مجھے کلام نہیں۔ مجھے تو وہی مرثیہ چاہئے۔ مرزا صاحب نے وہی مرثیہ "اے دبدبۂ نظم الخ" دیا۔ اور پھر جب تک مَیں نے اجازت نہ دی عام طور پر (مرزا صاحب نے) تقسیم نہیں فرمایا۔ اللھم اغفرہ +

فصل ۱۴ غیرت اور آن بان

غیرت اور آن بان۔ (المؤلفہ) سے

رہے جہاں میں انساں آن بان کے ساتھ + کہ جوہری جو ہیں۔ موتی کی آب دیکھتے ہیں

یہ بات بھی لکھنؤ میں مشہور ہے۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت اُن اسباب سے نہیں ہوئی۔ جن کو عرف میں کوشش و سعی وغیرہ کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے جب ابتدائً قریباً ۱۲۳۰ھ میں مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اُس زمانہ میں اکثر مرثیہ گو شاعر گو یا سوزخوانوں کے دست نگر تھے۔ اور ایک بڑے کامل سوزخواں **میر علی** صاحب[2] موجود تھے۔ جن کے در دولت پر بڑے بڑے شاہزادے

---

[1] بابی انتم و اُمی کی طرف اشارہ ہے جو فقرہ زیارت ماثورہ میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی وارد ہے۔ کہ وہ جناب شہدائے کربلا سے خطاب فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پہ نثار ہوں۔ اللہ اللہ کیا مرتبہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مرزا محمد جان مرحوم (جو بعد غدر ۱۸۵۷ء لکھنؤ سے ٹونک میں آ رہے تھے اور اکثر کوٹہ میں مخدومی ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب جعفری زید بلندی بیرسٹری کے ہیاں عشرہ محرم میں پڑھنے کو آتے تھے ابھی چار پانچ برس ہوئے کہ ٹونک میں انتقال کر گئے) میر علی صاحب کے جوابی مجھ سے کہتے تھے کہ میر علی صاحب خواجہ میر درد دہلوی کے نواسے تھے۔ محسن الدولہ نے بہت کوشش کی کہ میر علی صاحب میرے ہیاں آ کر رہیں مگر وہ نہ گئے۔ اکثر حالات میر علی صاحب کے متعلق مجھے انہیں سے معلوم ہوئے۔ مرزا محمد جان مرحوم اس زمانہ میں خوش گلو اور فن سوزخوانی کے ماہر اُستاد بلکہ اخیر زمانہ میں لاجواب سوزخواں تھے۔ آب حیات میں میر انشا مرحوم کے حالات میں کچھ حال میر علی صاحب کا پروفیسر آزاد مرحوم نے لکھا ہے۔ اور صحیح لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور کلام سُننے کو آتے تھے۔ اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ میر علی صاحب زیادہ تر منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز رکھتے تھے۔ کہ جن کے کلام میں قدرتی طور پر سوز بہت ہے۔ اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیہ میر علی صاحب کے پاس لے جاتے تھے۔ جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی صاحب ایک مرتبہ پڑھ دیتے تھے۔ تمام لکھنؤ میں اور دُور دُور اُس کی شہرت ہو جاتی تھی۔ مرزا دبیر کی شہرت سُن کر میر علی صاحب نے کہلا بھیجا۔ کہ میاں اپنے ایک دو مرثئے میرے پاس بھیج دو۔ مرزا صاحب نے شاید تین[3] مرثئے یکے بعد دیگرے (۱) باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے (۲) بخدا تاج سرِ عرش خدا ہے شبیر (۳) جب ہوئی ظہر فلک قتل سیاہ شبیر۔ بھیجے۔ اور میر صاحب نے سوز رکھ کر پڑھے۔ اور خوب رنگ ہوا۔ ان مرثیوں کی زبان اور بندش میر صاحب کو بہت پسند آئی۔ اتفاق سے ایک روز درگاہ یا کربلا میں کسی شخص نے انہیں مرثیوں میں سے ایک مرثیہ منبر پر پڑھ دیا۔ میر علی صاحب بھی موجود تھے۔ اُن ذاکر سے پوچھا۔ یہ مرثیہ تمکو کس نے دیا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب کا نام لیا۔ میر علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اپنے کسی بازو یا جوابی کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ صاحبزادے۔ میر علی امام حسین ؑ کے تصدّق سے وہ شخص ہے۔ کہ جس مصنّف کا مرثیہ پڑھ دے۔ وہ تمام ہندوستان میں مستند مرثیہ گو مانا جاتا ہے۔ منشی دلگیر اتنے بڑے مشّاق مرثیہ گو ہو کر جو مرثیہ مجھکو دیتے ہیں۔ وہ تین برس تک بغیر میری اجازت کے دُوسرے کو نہیں دیتے۔ تم نے یہ مرثیہ جو میر علی کو دیا تھا۔ دُوسرے کو کیوں دیدیا۔ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا چاہتے۔ آئندہ اگر تمکو یہ منظور ہو۔ کہ تمہارا کلام میر علی پڑھے۔ اور تم مرثیہ گو مستند ہو۔ تو جو مرثیہ مجھکو دینا وہ تین برس تک دُوسرے کو نہ دینا۔ مرزا صاحب نے یہ پیام سُن کر (اُن بازو یا جوابی کو) جواب دیا۔ کہ میری طرف سے اداب عرض کیجئیگا۔ اور عرض کیجئیگا۔ کہ آپ اوّل[1] تو سید دُوسرے[2] بزرگ تیسرے[3] ذاکر۔ ہر طرح واجب التعظیم ہیں۔ میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں

مگر یہ جو ارشاد ہُوا۔ کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو۔ تو جو مجھے مرثیہ دینا وہ تین سال تک دوسرے کو نہ دینا۔ اس کا یہ جواب ہے۔ کہ [1]

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است + رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں۔ تو امام حسینؑ کی امداد اور اپنی محنت و طبع خداداد سے۔ اور یہ بات تو پھر میری مروت سے بھی دُور ہوگی۔ کہ کوئی ذاکر وغیرہ مجھ سے مرثیہ مانگے اور میں یہ عذر کر کے اس کی دل شکنی کروں۔ کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں۔ اس لئے مرثیہ میں نہیں دے سکتا۔ لہٰذا آپ کی یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ میں مجبور ہوں +

اُس دن سے پھر میر علی صاحب نے مرزا صاحب کی تصنیف کوئی اور مرثیہ نہیں پڑھا۔ مگر تین مرثیوں کے پڑھنے سے مرزا صاحب کے کلام نے ایسا اُن کے دل پر اثر ڈالا تھا۔ کہ اُن کا دل مرزا صاحب کی بندشوں اور دلکش اور درد انگیز الفاظ اور اشاروں کو یاد کیا کرتا تھا۔ [illegible] بہت مجبور تھے۔ آخر [illegible] ترکیب کی۔ کہ مرزا صاحب کے اصلاحی مرثیوں [illegible] لگا کر سوز رکھے۔ اور پڑھے۔ چنانچہ [illegible] بین تھی صغرا جو فراق [illegible] سے۔ بشیر (رام پرشاد)[2] سے منگوایا۔ اور سوز

شاگرد مرزا دبیر کا مرثیہ میر علی صاحب نے پڑھا

[1] [illegible] کا مطلب یہ ہے کہ [illegible] محنت کی [illegible] بہشت میں [illegible] وہ دوزخ کے [illegible] ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] رام پرشاد [illegible] مرحوم [illegible] تھے سلام و مرثیہ کہتے تھے۔ [illegible] باہر سمجھتے تھے۔ [illegible] مطلع کا [illegible] اُٹھ [illegible] نسیم سحری سے [illegible] نرگس [illegible] چشم سوئے [illegible] ٹکسال باہر ہے۔ [illegible] ایک [illegible] جس کو [illegible] حضور [illegible] کا نسخہ ہوں

مرزا صاحب کے مرثیے سوزخوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں

رکھ کر پڑھا۔ جو آج تک بعض سوزخواں پڑھتے ہیں۔ از بسکہ یہاں ایک نامی گرامی سوزخواں کا ذکر آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اور بھی چند سوزخوانوں کا حال لکھوں۔ اور یہ بھی کہ مرزا صاحب کے مرثئے سوزخوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں +

میر احمد صاحب سوزخواں

سُنا ہے۔ کہ میر علی صاحب کا شہرہ کمال سُن کر میر احمد صاحب لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ کے لئے تشریف لائے۔ یہ بھی علم موسیقی میں یکتائے فن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ایک آنکھ کچھ دبا کر دیکھتے تھے۔ لوگ کانا کہتے تھے۔ شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم نے کس خوبصورتی سے اس عیب کی طرف ایک مرثیہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ جو قابل داد ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎ میر احمد کانِ علم موسیقی۔ مگر میر احمد صاحب کے لکھنؤ میں آتے ہی میر علی صاحب نے بستر اُٹھایا۔ سچ ہے ؎

عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر + کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

میر علی صاحب کے بعد تین سوزخوانوں نے نام نکالا۔ (۱) میر احمد صاحب۔ (۲) احمد علی خاں صاحب۔ (۳) میر زکی صاحب۔ میر احمد صاحب نے عموماً مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوزخوانی کے لئے چھانٹا۔ حسب ذیل مرثیوں پر ان کے سوز رکھے ہوئے سُنے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) س لفظ سے میری اصلی زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کو میرا تخلص قومی سمجھ کر رہنے دیجئے۔ مرزا صاحب نے رہنے دیا۔ یہ بشیر تو مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ دوسرے بشیر (میر عابد علی صاحب) میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے۔ میر ضمیر صاحب سے صفائی ہو جانے کے بعد وہ بشیر بھی مرزا صاحب ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ مدام پر خاد بشیر نے شاید اسی خیال سے یہ لقطے اپنے دئے۔ کہ اُن کے مرثیہ کو کوئی شخص میر عابد علی بشیر کا مرثیہ نہ سمجھے + ۱۲ مؤلف

۳؎ مشیر مرحوم کے مرثیوں میں لکھنؤ کے اکثر اہل کمال کا اسی طور پر بیان ہے۔ افسوس کہ اس لعل بے بہا کی کوئی قدر و محافظت نہیں کرتا۔ ہزاروں بازاری محاورات نظم ہیں۔ جو دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے۔ چند روز میں زبان اردو کے طالب چراغ لیکر ڈھونڈھیں گے۔ تو یہ لعل شب چراغ نہ ملینگے۔ مشیر ارشد تلامذہ دبیر تھے۔ اور تمام اصناف سخن میں ان کا کلام ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر شعرا اور اہل علم زمانہ محمد علی شاہ و امجد علی شاہ و واجد علی شاہ میں ایک سے ایک بہتر ان کے شاگرد تھے۔ سراپا سخن میں

جاتے ہیں۔(۱) آمد ہند کا غلِ عترتِ شبیر میں ہے۔(۲) ہند جس وقت محل سے سوئے زنداں آئی۔(۳) جب یزید اپنے گناہوں سے پشیماں ہُوا۔(۴) دل صاحبِ ولادے انصاف طلب ہے۔(۵) عابد کو جب یزید سے بابا کا سر ملا+ میر احمد صاحب کے شاگردوں میں میر علی حسن صاحب اور میر بندہ حسین صاحب[سکہ] (دونوں بھائی) بڑے نامی گرامی سوزخواں ہوئے۔ان دونوں صاحبوں کی رئیس مرشد آباد نے بڑی قدر و عزت کی۔مرشد آباد یا لندن میں یا جہاں کہیں رہے۔پاس رکھا۔خصوصاً میر بندہ حسین صاحب کو ایک دم جدا نہ کرتے تھے۔(۱) میر مہدی حسین۔(۲) محمد مرزا خاں۔(۳) سید سجاد حسین۔(۴) نواب اچھے صاحب خویش جناب اوج مدظلہ (۵) نادر صاحب۔یہ سب اس زمانہ کے نامی گرامی سوزخوان بلاواسطہ یا بالواسطہ انہیں دونوں بھائیوں کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں+

(۲) احمد علی خاں مرحوم بھی اُس زمانہ میں ایک کامل سوزخوان مشہور تھے۔یہ مرزا صاحب کے گویا فدائی تھے۔ان کے یہاں ۱۴-۸ تاریخوں میں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں بڑی دھوم دھام کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔جس کا مفصل بیان میں نے دوسرے مقام پر اسی کتاب میں کیا ہے۔انہوں نے بھی مرزا صاحب کے بعض سلام اور مرثیوں پر سوز رکھے+

(۳) میر زکی مرحوم۔یہ نہایت خوش الحان۔خوش گلو۔حسین آدمی سُنے جاتے ہیں۔واجد علی شاہ مرحوم کے مصاحب ہونیکے سبب سے ان کی بڑی شہرت و عزت تھی۔بڑی دھوم دھام کی مجلسیں کرتے تھے۔اور نخشو کاغذی کے تعزیہ کے مقابلہ پر بڑی شان و شوکت سے تعزیہ اُٹھاتے تھے۔مجلس میں خود پڑھتے تھے۔اور پلاؤ کی چوٹی دار رکابی

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۳) بھی شیر کے بعض تلامذہ نظر آتے ہیں شیعہ پارٹی میں شیر کی شہرت دبیرؔ و انیسؔ سے کچھ کم نہیں ہے +۱۲ مولف

[سکہ] میر بندہ حسین صاحب مرحوم حقیر مؤلف کے خسر تھے۔اپنے زمانہ میں اہلِ فن تھے۔باایں ہمہ ان کے بڑے بھائی میر علی حسن صاحب ان سے بہتر تھے +۱۲ مؤلف حقیر۔

ایک مرتبہ تمام حاضرین مجلس کو بٹ جانے کے بعد جو خاص خاص ان کے ملنے والے بیٹھے رہتے تھے (غالباً ان کے کہنے سے بیٹھے رہتے ہونگے) اُن کو دستارخوان بچھوا کر کھانا بھی کھلاتے تھے۔ دُنیا کے لوگوں کا کس نے منہ پکڑا ہے۔ بعض حاسد لوگ یہ کہتے تھے۔ کہ ان کے پڑھنے پر جو لوگ زیادہ روتے ہیں۔ اُن کو یہ ڈبل حصّہ ملتا ہے۔ چنانچہ مشیر مرحوم کے ایک ہجیہ میں اسی خیال کی طرف اشارہ ہے ؎

جس سمت دیکھتا ہوں اُدھر کھاؤ کھاؤ ہے + پڑھوائیگا یہ میرزکی کا پلاؤ ہے

ہائے دولت تیری چاٹ بھی نہ رہی۔ مگر بالوں پر افسانے رہ گئے۔ وہ بھی اب چند روز میں نیست و نابود ہو جائینگے ؎

مٹا حسن خوباں دلخواہ کا + ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرزکی مرحوم کے شاید بھانجے اور شاگرد رشید میر محمود مرحوم اور میر محمود کے فرزند اور یادگار میر علی محمد صاحب مرحوم تھے +

میر علی محمد بھی مرشد آباد میں ملازم تھے۔ اور بعد میر بندہ حسین صاحب کے یکتائے فن سمجھے جاتے تھے۔ میر علی محمد صاحب بھی مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ وہ سوزخواں بھی تھے تحت لفظ خواں بھی تھے۔ اور شاید سلام وغیرہ بھی کہتے تھے۔ میر علی محمد صاحب کے بھانجے اور داماد میر منجھو صاحب بھی فی زمانا سوزخوانی میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ اور سوز واقعی خوب پڑھتے ہیں۔ المختصر یہ سوزخوانوں کے تمام گھرانے اس طرف جھک پڑے اور سبھوں نے مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوزخوانی کے لئے منتخب کیا۔ یہی سبب ہے۔ کہ مرزا صاحب کے مرثئے سوز میں جس کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔ دُوسرے کسی مرثیہ گو شاعر کے مرثئے نہیں پڑھے جاتے۔ اور سنا ہے۔ کہ میر بندہ حسین صاحب اور میر علی محمد صاحب کا یہ قول تھا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے الفاظ اور ترکیبیں اور بندشیں سوز میں پڑھنے کے لئے جیسی مناسب واقع ہوئی ہیں۔ دُوسرے کی نہیں ہیں۔ مرزا صاحب

کے مرثیئے میں یہ ایک آسانی کتنی بڑی ہے۔ کہ ۲۰۰ یا ۱۵۰ بند کے مرثیہ میں سے ۱۰ یا ۱۲ بند سوز میں پڑھنے کو چھانٹ لو۔ مرثیہ بے ربط نہ ہوگا۔ جا بجا مطلع لگے ہوئے ہیں جس مطلع سے چاہو۔ مرثیہ شروع کردو۔ گویا ایک سنہری زنجیر ہے۔ جس کی کڑیاں پیوستہ و مسلسل بھی ہیں۔ اور الگ بھی ہیں۔ حسب ضرورت چند کڑیاں لیکر چھوٹی چھوٹی زنجیریں بن سکتی ہیں۔ ہر زنجیر خورد عروس سخن کے لئے زیور بن جاتی ہے۔ ان کا مرثیہ ایسا خوشنما سانچہ ہے۔ جس میں سوز آسانی سے ڈھل جاتا ہے۔ اور جو سوز خواں اس فن کو تھوڑا بھی جانتا ہے۔ وہ بھی ان کے مرثیہ پر سوز آسانی سے رکھ لیگا۔ دوسروں کے مرثیوں کا مختصر کرنا اور سوز رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں کوئی سوز خواں تحت لفظ خوانوں کی طرح چالیس چالیس پچاس پچاس بند پڑھے۔ تو مضائقہ نہیں۔ اوروں کے مرثیہ بھی خوب پڑھ سکتا ہے۔ عموماً سوز خوانوں کا یہ مقولہ اور عقیدہ ہے۔ کہ جس مجلس کو ہم درہم برہم دیکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ رنگ نہ ہوگا۔ اُس میں ہم مرزا صاحب ہی کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ وہی رنگ دیتا ہے۔ دوسرے کا مرثیہ رنگ نہیں دیتا۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ فی صدی ستر اسی مرثیہ مرزا صاحب کے سوز میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور اصلی سبب مقبولیت من جانب اللہ ہے۔ سچ ہے۔ ع

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

باب پنجم
فصل ۱
غزل اور مرزا صاحب

غزلیں بھی ابتدا میں مرزا صاحب نے کہیں۔ اور کثرت سے کہیں۔ مگر خود ہی اُن کے عدم شہرت کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے۔

دُنیا کے شاعر متمنی رہتے ہیں۔ کہ ارباب نشاط اُن کی غزلیں گائیں۔ مگر مرزا صاحب اس سے بھاگتے رہے۔ سُنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی غزلوں کے تین دیوان تھے۔ اُن میں سے ایک یا دو دیوان میر بادشاہ علی بقا مرحوم اُس زمانہ میں مانگ لائے تھے۔ جب وہ مشق سخن کرتے تھے۔ باقی ایک یا دونوں دیوان مرزا صاحب نے تلف کر دئے۔ وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب مرحوم کے یہاں (مکان لکھنؤ شاہ گنج میں)

جب آگ لگی۔ جب اور اسباب کے ساتھ جل گیا۔ آج مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہیں ملی۔ جو میں بالیقین کلام دبیر مرحوم کہکر ناظرین کے سامنے پیش کر دوں۔ اُن کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ اُن کی غزلیں گائی جائیں۔ چنانچہ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ قبل غدر ۱۸۵۷ء ایک شادی میں جناب مرزا صاحب بھی شریک تھے۔ مَیں بھی تھا۔ ازبسکہ محفل میں ارباب نشاط بھی تھے۔ صاحب خانہ نے ثقہ آدمیوں کے واسطے علیحدہ ایک مکان تجویز کر دیا تھا۔ باقی ہمہ شما سب محفل رقص و سرود میں تھے۔ مرزا صاحب ثقہ آدمیوں میں تھے۔ مجھے دس بجے رات کے بُلا بھیجا۔ مَیں دُوسری محفل میں سے گیا۔ تو دیکھا کہ شعر و شاعری کے نکات بیان ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور مرزا صاحب کو اُس بحث میں محو دیکھکر پھر دُوسری محفل میں چلا آیا۔ جب باتوں سے مرزا صاحب کو فراغت ہوئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ پھر آدمی میرے بُلانے کو بھیجا۔ مجبور ہو کر مَیں محفل رقص و سرود میں سے گیا۔ فرمایا۔ ہم تو تمکو جنت کی طرف کھینچتے ہیں۔ تم بھاگتے ہو۔ مَیں اُن جناب کی خدمت میں بہت گستاخ تھا۔ عرض کی۔ کیا یہ محفل جنت ہے۔ فرمایا۔ اس وقت ایسی ایسی باتیں ہوئیں۔ کہ تم سُنتے تو رُوح خوش ہو جاتی۔ مَیں نے عرض کی۔ حضت (حضرت) انما الاعمال بالنیات[1] خدا پلک نواز ہے۔ وہ چاہے۔ تو وہاں بھی بخشش کا وسیلہ پیدا کر دے۔ فرمایا۔ توبہ کرو۔ استغفر اللہ۔ محفل رقص کی نسبت ایسا کہتے ہو۔ الغناء اشد من الزناء[2]۔ مَیں نے عرض کی سُنئے تو سہی۔ مَیں تو خدا کی رحمت کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ چاہے۔ تو اُسی جگہ وسیلۂ بخشش پیدا کر دے۔ فرمایا۔ بھلا مجھے سمجھائیے تو وہاں کیونکر وسیلۂ بخشش ہو سکتا ہے۔ مَیں نے عرض کی۔ مثلاً آپ کا کلام منظوم کوئی طوائف گائے۔ اور ہمارا دل کسی شعر پر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ تو فرمائیے خدا دل کو دیکھتا ہے۔ ظاہر کو نہیں دیکھتا۔

---

[1] یعنی تمام عمل نیتوں کے ساتھ ہیں جیسی نیت ہوگی۔ ویسا ہی پھل ملیگا۔ یہ مشہور حدیث ہے +

[2] یعنی غنا شدید تر ہے زنا سے +

ممکن ہے گناہ بخش دے۔ فرمایا۔ یہ تو بناء فاسد علے الفاسد ہوئی۔ جب گانا حرام ہے تو جو اشعار گائے جائینگے۔ چاہے وہ معرفت ہی میں ہوں۔ باعثِ مغفرت نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کیا آپنے فرمایا۔ کیا میری غزل کسی طوائف نے گائی تھی۔ مَیں چُپ ہو گیا۔ فرمایا سچ کہو۔ مَیں نے کہا۔ جی ہاں۔ اور اُس غزل کا مطلع سُنا کر کہا۔ یہ غزل حسین باندی طوائف نے گائی تھی۔ مرزا صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور کچھ وظیفہ پڑھ کر نمازِ شب پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ خیر رات گئی بات گئی۔ دُوسرے دن جو مَیں لو دس بجے پہنچا۔ تو اُن کے آدمی نے کہا۔ کہ دیوان خانہ میں مرزا صاحب ہیں۔ اور حسین باندی طوائف ہے۔ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ چاہے جائیے چاہے نہ جائیے۔ مَیں اُلٹے پاؤں پھر آیا۔ مگر دل میں کہتا تھا۔ کہ یا تو مرزا صاحب نے میرے قول کی تصدیق کی غرض سے حسین باندی کو بُلایا ہو گا۔ یا اُس سے سیدھے سادے طور پر اپنی غزل سُنی ہوگی۔ دُوسرے روز جو مَیں شاہ گنج میں ہو کر نکلا۔ تو حسین باندی کا لڑکا ملا۔ اُس نے حسین باندی کا یہ پیام دیا۔ کہ آپ اجازت دیں۔ تو مَیں کسی وقت حاضر ہوں۔ مَیں نے کہا۔ اچھا پانچ بجے شام کو آنا۔ شام کو جب وہ آئی۔ تو مجھ سے کہا۔ میر صاحب آپنے مرزا صاحب سے یہ ذکر کر دیا۔ کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی۔ مَیں بولا۔ ہاں باتوں باتوں میں مَیں نے کہا تو تھا۔ پھر کیا ہُوا؟ کہا۔ مرزا صاحب نے اول تو مجھ سے پوچھا۔ تمکو میری غزلیں یاد ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ بس ایک غزل۔ اُنھوں نے مطلع پوچھا۔ مَیں نے مطلع پڑھ دیا۔ پوچھا کے شعر یاد ہیں؟ مَیں بولی۔ لو دس شعر۔ پوچھا رات کو یہ غزل گائی تھی؟ مَیں نے کہا۔ جی ہاں۔ یہ سُن کر وہ گھر میں اُٹھے ہوئے چلے گئے۔ اور ایک توڑہ پانچسو روپیہ کا ایک رُومال میں باندھ کر لائے۔ مجھسے فرمایا۔ یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ لو۔ آج سے اس غزل کو نہ گانا۔ مَیں نے بہتیرا کہا۔ کہ مَیں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤنگی۔

* یعنی فاسد کی بُنیاد فاسد پر ہے۔

آپ روپیہ رہنے دیجئے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا۔ نہیں۔ اب میں یہ روپیہ نکال چکا۔ تم اس کو کسی کارِ خیر عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا۔ جب قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا۔ تو میں وہ توڑہ ڈولی میں رکھ کر لے آئی۔ اس حکایت کے لکھنے سے غرض یہ ہے۔ کہ خود مرزا صاحب نے کوشش کی۔ کہ اُن کا عاشقانہ کلام نہ مشہور ہو۔ اور ارباب نشاط نہ گائیں اور اُن کی خواہش و کوشش پوری ہوئی +

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں حسب ذیل معلوم ہوئی ہیں:-

مجالس مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

(۱) ملکہ زمانی کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں عشرۂ محرم میں بڑی شان و شوکت کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ بیگم نصیر الدین حیدر کی محل خاص تھیں[۱]۔ اور مرزا صاحب سے اعتقاد رکھتی تھیں۔ ان کے یہاں سے مرزا صاحب کو ماہواری تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اور مرزا صاحب کی سفارش پر سالانہ لاکھوں روپیہ اہل حاجت کو ملا کرتا تھا۔ ان کی فیاضی کا لکھنؤ میں شہرہ ہے۔ ان کی بیٹی سلطان عالیہ شاعرہ اہلبیت مرزا صاحب کی شاگرد تھیں۔ جو نواب ممتاز الدولہ مرحوم کی زوجہ تھیں +

(۲) افتخار الدولہ مرحوم کے یہاں جناب میر ضمیر مرحوم اور مرزا صاحب پڑھتے تھے جن کا ذکر خیر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بڑے خوش اعتقاد رئیس تھے۔ اور بڑے سخی رئیس گذرے ہیں[۲] +

---

[۱] جلد ۲ تذکرہ خمخانہ جاوید میں ان کا حال نصیر الدین حیدر بادشاہ دویم اودھ کے حال میں لکھا ہے۔ کہ جس سے انکی دولت و ثروت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] افتخار الدولہ کی سخاوت کی مدح میں مرزا صاحب کی تصنیف میں ایک رباعی ملی ہے وہ یہ ہے ؎ اس در پہ ہر ایک شاد ماں ہوتا ہے۔ خنداں گلِ امید یہاں ہوتا ہے۔ ہر فصل میں دستِ افتخار الدولہ۔ نیساں کی طرح گہر فشاں ہوتا ہے۔ آخر عمر میں یہ بزرگوار کربلائے معلے میں جا کر روضۂ حضرت (امام حسینؑ) کے کلید بردار ہو گئے تھے۔ وہیں سے سیدھے جنت میں گئے ع کیا سخاوت کا ثمر پایا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) حسین علی خاں اثر مرحوم خلف مرزا حیدر بیگ نائب آصف الدولہ کے یہاں تمام چہلم کی مجلسیں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ پھر جب عہد امجد علی شاہ میں میر انیس مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ تو ایک دن میر صاحب اور ایک دن مرزا صاحب اُن کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھے۔ یہ نواب خود بھی شاعر تھے۔ اور شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید تھے شیخ ناسخ مرحوم بھی انکے یہاں مجلسوں میں کبھی کبھی آتے تھے +

(۴) میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقعہ لکھنؤ چوک میں پہلے تو پچیسویں کی مجلس میں میر ضمیر صاحب پڑھا کئے۔ پھر عہد محمد علی شاہ مرحوم سے مرزا دبیر صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ اور مدۃ العمر ۲۵ رجب اور ۲۵ ذیقعدہ کی مجلس میں پڑھا کئے۔ یہ دونوں مجلسیں بڑی شان و شوکت اور مجمع کثیر کے ساتھ ہوتی تھیں بعد زمانہ غدر میر اعظم علی مرحوم نے ۲۵ رجب کی ایک مجلس مقرر فرمائی۔ جو چوپٹیوں پر ہوا کرتی تھی۔ وہ مجلس اسی مجلس کے مقابلہ پر میر صاحب کے طرفداروں نے مقرر فرمائی تھی۔ اور میرے ہوش میں اُس مجلس میں میر خورشید علی صاحب نفیس دلآرام کی بارہ دری میں پڑھتے تھے۔ لمؤلفہ ؎

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں + کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہوگئیں

یہ مجلسیں بحمداللہ آج تک دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ میں جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور اُدھر دولہا صاحب پسر میر نفیس مرحوم پڑھتے ہیں +

(۵) وزیر خاں داروغہ دیوان خانہ شاہ اودھ کے یہاں (مفتی گنج احاطہ مرزا علی خاں میں) ہر مہینہ کی تئیسویں کو عہد واجد علی شاہ مرحوم میں مرزا صاحب اور اُن کے مقابلہ پر محمد خاں داروغہ فیل خانہ شاہی کے یہاں اُسی تاریخ اُسی محلہ میں میر صاحب پڑھتے تھے +

(۶) جواہر علی خاں خواجہ سرائے ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں محلہ گولا گنج میں ہر مہینہ کی بائیسویں کو اور نواب ناظر فیروز الدولہ خواجہ سرائے شاہی کے یہاں ہر مہینہ کی بارھویں کو مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ فیروز الدولہ کا مکان بھی گولہ گنج میں اُس تراہہ سڑک پر تھا جہاں

سے اب ایک سڑک شفاخانہ درنیجے سنگھ کو جاتی ہے۔ یہ مجلسیں بھی عہد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ہُوا کرتی تھیں۔ اب نہ مکینوں کا نام و نشان ہے۔ نہ کوئی مکان ہے۔ خدا کی شان ہے۔ لمؤلفہ ؎

فلک نے بیں کے برباد کر دئے وہ محل + اجل یہ کس کی نظر کھا گئی مکینوں کو

(۷) ہر مہینے کی گیارھویں کو جو مرزا صاحب کی ولادت کا دن ہے خود مرزا صاحب کے مکان پر مجلس برسوں ہُوا کی۔ اور اب اُن کی قبر پر تیسویں یا پہلی کو (بروز وفات) مجلس ہوتی ہے +

(۸) ہر مہینے کی تیرھویں کو اور ماہ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علی خاں سوزخوان مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے۔ اُدھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انہیں تاریخوں میں میر صاحب پڑھتے تھے +

چنانچہ جناب مجتہد العصر مولانا السید علی حسن صاحب قبلہ علامہ جائسی مدظلہ العالی ایک سال کی اٹھارھویں ماہ صفر کی نسبت یُوں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ احمد علی خاں مرحوم زمانہ شاہی میں قریباً پچاس مجلسیں کیا کرتے تھے۔ امام باڑہ آغا باقر مرحوم کے قریب اُن کا مکان تھا۔ جو مکانات اب بالکل کھد گئے ہیں۔ ہر روز اُن کے یہاں ایک ذاکر کامل پڑھتا تھا۔ اٹھارھویں صفر کو پچاسویں مجلس ہوتی تھی۔ اُس مجلس میں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ اور کچھ فاصلہ پر میر صاحب حیدر خاں مغفور کے یہاں پڑھتے تھے۔ دونوں مجلسیں بالمقابل ایک وقت پر ہوتی تھیں۔ مَیں اور میرے اُستاد جناب سیّد العلماء (سیّد حسین عرف میرن صاحب قبلہ علیئین مکان طاب ثراہ) بھی احمد علی خاں کے یہاں شریک ہُوا کرتے تھے۔ ایک روز مرزا صاحب مرحوم حیدر خاں کے یہاں کچھ پہلے پڑھ چکے۔ تو وہاں کے اکثر سامعین بھی یہاں آئے۔ یہاں یہ آدمیوں کی کثرت تھی۔ کہ زانو بدلنا مشکل تھا۔ اُوپر نیچے کے تمام مکانات شائقین سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک کنوآں جو صحن مکان میں تھا۔ اُس پر تخت پٹا ہُوا تھا۔ اور

اُس تخت پر بھی آدمی تھے۔ جب آدمیوں کے بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر لگا دی تھی۔ اب جو دُوسری مجلس کے آدمی آئے اُنھوں نے باہر سے زور لگایا۔ تڑاق سے زنجیر ٹوٹ گئی۔ اکثر آدمی اندر چلے آئے۔ آدمیوں کے جزر و مد سے ایسا کچھ تلاطم ہُوا۔ کہ مرزا صاحب منبر پر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ بالآخر جہاں تہاں کر کے اُس مجمع کو بھی مجلس میں لے لیا۔ مجلس تو برہم ہو چکی تھی۔ مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال۔ بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں۔ کہ مجلس ہمہ تن گوش تھی۔

(رباعی ۱)

یاں مجھکو بچھانا تھا ضرور آنکھوں کا + اس پردے میں تھا عین سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ + آنکھوں کے عوض بچھاؤنگا نور آنکھوں کا

(رباعی ۲)

ہر عضو سے سر بلند گو آنکھیں ہیں + پر فرش کی ہو کمی تو لو۔ آنکھیں ہیں
کس کس کے بزیر پا بچھاؤں میں دبیر + ہم چشم بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اور مہینوں لوگوں میں اُس مجلس کے چرچے ہُوا کئے +

اس مجلس میں مرزا صاحب ہمیشہ ایک رباعی اس قافیہ و ردیف میں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ حقیر آیا ہے۔ دبیر آیا ہے۔ چنانچہ دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں (جو رباعیوں کی جلد ہے) جس قدر رباعیاں اس ردیف و قافیہ میں ہیں۔ وہ اسی مجلس کی نسبت ہیں۔ دو تین رباعیاں اس موقع پر لکھتا ہوں:۔

(۱) تیرھویں تاریخ کی مجلس کی نسبت ہے

کیوں آج یہ انبوہ کثیر آیا ہے + ہاں حضرتِ مقبل کا نظیر آیا ہے
ہوگا مہِ چاردہ کا منبر پہ کمال + تاریخ ہے تیرھویں دبیر آیا ہے

(رباعی ۲)

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + ہونے کو مرید چرخ پیر آیا ہے
چودہ معصوم کے موالی ہیں جمع + تاریخ ہے تیرھویں دبیر آیا ہے

رباعی (۳) اٹھارھویں کی مجلس کی نسبت فرماتے ہیں

مضمون سے وہ معنی پرضو نکلا + ٹھنڈا جس سے قمر کا پرتو نکلا
ہر مصرع کُہنہ کی چمک پر یہ غل + اٹھارھویں تاریخ مہِ نو نکلا

انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں تو مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ اس مجلس کے آنے والوں سے رستہ میں بعض اُدھر کے آدمیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آج تو مرزا صاحب احمد علی خاں کی مجلس میں نہیں آئے۔ شاید وہ مجلس آج نہ ہو۔ اس فقرے میں آکر کچھ آدمی جو اس مجلس میں آرہے تھے۔ حیدر خاں مرحوم کی مجلس میں چلے گئے۔ کچھ اپنے گھر پھر گئے۔ بعض آدمی یہاں آئے۔ تو مرزا صاحب کو موجود پایا۔ راہ کی کہانی بیان کی۔ مگر پھر بھی اس مجلس آدمی بہت آگئے تھے۔ مرزا صاحب منبر پہ گئے۔ تو اول یہ رباعی پڑھی:۔

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + سُننے کو بھی انبوہ کثیر آیا ہے
کیوں راہ میں بہکاتے ہیں مشتاقوں کو + یہ کون ہے۔ جو نہیں دبیر آیا ہے

ایک سال اس مجلس میں مرزا صاحب پڑھ رہے تھے۔ کہ یکایک بہت سے آدمی آگئے۔ اُن میں سے اکثر نے قریب منبر جانا چاہا۔ جو لوگ پہلے سے منبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو بُرا معلوم ہوا۔ آپس میں تکرار ہوگئی۔ قریب تھا کہ مار پیٹ کی نوبت پہنچے۔ کچھ لوگوں نے اصلاح کرادی۔ اتنی دیر میں مرزا صاحب نے منبر پہ یہ رباعی کہ لی۔ اور جب اہل مجلس مطمئن ہوئے۔ تو یہ رباعی پڑھ کر پراگندہ مجلس کو متوجہ کرلیا۔ ؎

دریائے ثواب میں تلاطم۔ کیسا + مجلس میں تاخّر و تقدُّم کیسا
بیجا ہے غبار اشکباروں کے لئے + پانی موجود ہے۔ تیمّم کیسا

قبلہ وکعبہ فرماتے ہیں۔ کہ افسوس جب زمانہ شاہی نہ رہا۔ اور احمد علی خاں مرحوم کی بھی وہ حالت نہ رہی۔ اور اٹھارھویں صفر کی مجلس ہوئی۔ تو اُس مجلس میں بھی مَیں شریک تھا۔ یہ چھوٹی سی مجلس تھی۔ حاضرین وہ مجمع عہد شاہی یاد کر کر کے افسوس کر رہے تھے۔ کہ مرزا صاحب نے منبر پہ جا کر یہ رباعی حسب حال پڑھی۔ جو غالباً فی البدیہ کہی تھی +

(رباعی)

پھر چرخ پر آسمان پیر آیا ہے + ہر کوچہ میں وقت دار وگیر آیا ہے
اگلا سا نہ مجمع ہے نہ اگلے سے وہ لوگ + یاں آن کے حسرت میں دبیر آیا ہے*

احمد علی خاں مرحوم کے یہاں کی یہ گویا آخری مجلس تھی۔ سہ

اے مصحفی میں رو دوں کیا اگلی صحبتوں کو + بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۹) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم بھی مرزا صاحب کے ایک معتقد بلکہ فدائی بالواسطہ و بلا واسطہ شاگرد تھے۔ یعنی اوّل اوّل وہ شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر خود مشیر مرحوم نے ان کو مرزا صاحب کا شاگرد کرا دیا تھا۔ غزل میں یہ جناب اسیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ کہ مرزا صاحب کو غزل پہ اصلاح دینے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء میں کمپنی کے خیر خواہ رہے تھے۔ کئی معزز انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ اس صلہ میں گورنمنٹ سے معقول انعام ملا تھا۔ ان کے حالات ان کے فرزند ارجمند میر امیر حسن صاحب فروغ سلمہ اللہ والبقاہ نے جو مجھے لکھ کر بھیجے ہیں۔ وہ حال تلامذۂ مرزا صاحب میں ملاحظہ فرمائیگا۔ یہاں یہ لکھنا ہے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء ان کے یہاں محلہ گولہ گنج میں ہر سال اکیسویں ماہ رمضان کو مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ انکا امام باڑہ

* یہ رباعی دفتر ماتم کی جلدوں میں نہیں ہے۔ محض قبلہ وکعبہ کے ذریعہ سے حقیر تک پہنچی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ہمارے سر پر ان نائب امام کا سایہ رہے۔ اور میں نے عنایت فرما قبلہ وکعبہ کے بھتیجے اور شاگرد جناب منشی احمد رضا صاحب حاذق کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے یہ حالات قبلہ وکعبہ کے ارشاد کے موافق انکی زبان سے سنکر اور لکھکر مجھے بھجوائے تا کہ میں اس کتاب کی رونق بڑھاؤں اور اس میں درج کردوں + ۱۲ مولف حقیر۔

بہت بڑا ہے۔ وہ سب آدمیوں سے بھر جاتا تھا۔ ان کے یہاں بعض مجلسوں میں حقیر شریک ہوا ہے[سلہ] +

(۱۰) داروغہ شیخ محمد عباس صاحب (والد مرحوم شیخ علی عباس صاحب وکیل) کے یہاں کنکر کے کنوئیں پر میر انیس صاحب مرحوم اور اُسی کے قریب خان بہادر شیخ الطاف حسین صاحب مرحوم کے یہاں ۸ / صفر کو مرزا صاحب مغفور پڑھا کرتے تھے[سلہ]۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء یہ مجلسیں بھی ہوتی تھیں۔ حقیر ان بعض مجلسوں میں بھی شریک ہوا ہے۔ اور یہ مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ پڑھنے والے نہیں ہیں۔ بقول میر انیس مرحوم ؎

پھولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں + افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

(۱۱) نواب ممتاز الدولہ مرحوم (داماد نصیر الدین حیدر شاہ دوم اودھ) بھی مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں بھی اربعین میں کبھی ایک کبھی دو مجلسیں مرزا صاحب ہر سال پڑھا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں حقیر بھی شریک ہوا تھا +

(۱۲) بابو بینی پرشاد وکیل ہائی کورٹ آگرہ سے لکھنؤ میں گئے تھے اور نواب آغا علی خاں عرف آغائے صاحب (ناظم صاحب) سے درخواست کی تھی۔ کہ مجھے

سلہ اسی مجلس کی کیفیت میں اُوپر مخدومی میر دستور علی صاحب بلگرامی سکرٹری جناب راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبانی اس کتاب میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سلہ میرے مکرم مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کے یہ خسر تھے اور اشفاق حسین صاحب خاں بہادر مرحوم کے فرزند ہیں وہ اب اٹھارھویں صفر کی مجلس کرتے ہیں۔ مدت تک جناب مرزا اوج صاحب کو وہ بھی پڑھوا لیا کئے۔ مگر ایک سال امروہہ کے سادات نے مجھ سے آکر اجازت چاہی کہ عشرۂ دویم صفر میں جناب مرزا اوج صاحب کو ہم امروہہ لے جائیں اور وہاں پڑھوائیں۔ وہ جناب آپ کی مجلس کے خیال سے نہیں جاتے۔ انہوں نے ان سادات کی مجالس عزا کو اپنی مجلس پر مقدم رکھ کر مرزا اوج صاحب قبلہ سے عرض کر کے اُن کو امروہہ بھجوا دیا اور خود اپنی مجلس میں حدیث خواں کو پڑھوایا چنانچہ اب اس مجلس میں حدیث خوانی ہوتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مرزا صاحب کو سُنوا دیجئے۔ چنانچہ آغائی صاحب نے کہ یہ بھی مرزا صاحب کے معتقد تھے ایک بہت بڑی مجلس کر کے مرزا صاحب کو پڑھوایا تھا۔ حقیر کو یہ مجلس یاد تو ہے۔ مگر مَیں اس میں شریک نہیں ہُوا +

(۱۳۱) شاہ پنجم اودھ واجد علی شاہ مرحوم کے یہاں مجلس عشرہ محرم میں بھی مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اور شاہ مرحوم وہ عزت افزائی فرماتے تھے۔ جو کسی بادشاہ نے آج تک کسی شاعر اہلبیتؑ کی بھی نہ کی ہوگی۔ بھلا معمولی شاعروں کا تو کیا ذکر ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ شاعروں کا عروج بادشاہوں کی بدولت ہُوا کرتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا عروج بادشاہان دین و دُنیا ائمہ اطہارؑ اور شہدائے کربلا کے سبب سے ہُوا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

خاقانی و فردوسی و سعدی و نظامی — شاہوں کی مدد سے ہوئے آفاق میں نامی
عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی — دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے خطِ غلامی
ہیں دو ہی دبیر۔ اس میں نہیں ایک کو ننگ ہے
منبر مری جاگیر۔ مقام اُس کا فلک ہے

فصل ۳ حکایت مرزا صاحب کا بادشاہ اودھ کو خداوند کہنا

علامہ حائری مدظلہ العالی کے ارشاد سے معلوم ہُوا کہ مرزا صاحب ایک مجلس میں واجد علی شاہ مرحوم کے روبرو جب گئے۔ تو باتوں میں اُنہوں نے معمولی لفظ خداوند جو لکھنؤ کے اہل دربار کا تکیہ کلام تھا نہیں کہی*۔ جب بعد ختم مجلس مرزا صاحب چلے آئے۔ تو بادشاہ سے ایک مصاحب خاص نے تخلیہ میں عرض کی۔ کہ جہاں پناہ کی نسبت لفظ خداوند کہنے میں شاید مرزا صاحب کو کچھ اکراہ ہے۔ عالی ظرف بادشاہ نے اُنکی بات کو ٹال دیا۔ کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز کی مجلس میں منبر پر مرزا صاحب نے یہ دو

*۔ اسی طرح راجپوتانہ میں عام طور پر راجاؤں کو اہل دربار اَن داتا کہتے ہیں جس کے لفظی معنی رازق کے ہیں۔ یہ لفظ خداوند سے بھی بڑھ کر ہے۔ بحمد اللہ حقیر نے ۲۹ برس کی ملازمت میں کبھی یہ لفظ نہیں کہی ۱۲ مؤلف حقیر

رباعیاں پڑھیں۔ ؎

(رباعی ۱)

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں + یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو مُنہ دکھانا ہے دبیر + بندوں کو میں کس مُنہ سے خداوند کہوں

(رباعی ۲ منقبت میں)

حیدر کو غنی سب کو غرض مند کہوں + بیحد ہیں شرف ان کے میں تا چند کہوں
ہے شیرِ خدا میں بخدا شانِ خدا + اس بندے کو سو بار خداوند کہوں

بادشاہ مرحوم نے اُن مصاحب خاص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ سُنئے! کیوں! ان شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے یا نہیں۔ کچھ سمجھے۔ اُن مصاحب نے عرض کی بیشک جب بعد اختتام مجلس اُن مصاحب کے ایک رازدار نے پُوچھا۔ کہ آپ سے بادشاہ نے کیا فرمایا تھا۔ تو انھوں نے کہا۔ کہ کل میں نے تخلیہ میں بادشاہ سے عرض کیا تھا۔ کہ مرزا صاحب حضور کو خداوند نہیں کہتے۔ شاید اُن کو یہ لفظ کہنا مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ اور میرے اور بادشاہ کے سوا تیسرے شخص کو اس بات کا علم نہ تھا۔ مرزا صاحب نے آج گویا وہی مضمون نظم کرکے پڑھ دیا۔ اُس کل کی بات کا جہاں پناہ نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔ اور فرمایا تھا۔ کہ ان شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر ایشیائی شاعروں کے کلام بادشاہوں اور دولتمندوں کی بیجا خوشامدیں ہیں۔ انھوں نے اپنی فطرتی شاعری کو مال دُنیا کے لالچ میں آکر ضائع کر دیا۔ جس کی مثالیں تاریخوں اور تذکروں میں اہل علم کو کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر مرزا صاحب نے اپنی شاعری کا صحیح مصرف خوب سمجھا۔ اور قانون فطرت کے مطابق (جو رضائے خدا کا گویا پرتو ہے) شاعری کو بہت خوبصورتی سے صرف فرمایا۔ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ شاعر کا کمال یہ ہے۔ کہ وہ عالم مادّی و غیر مادّی کے واقعات کو رضائے خدا کے مطابق بیان کرے۔ مرزا صاحب نے

دونوں قسم کے مضامین کو بہت خوبی و خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ صبح۔ شام۔ گرمی۔ تہذیب۔ عدالت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ صبر۔ علم۔ رضا۔ تسلیم۔ حلم۔ تواضع و انکسار۔ توحید۔ عدل۔ نبوّت۔ امامت۔ معاد کی مدح میں کلام کے دریا بہا دئے ہیں۔ بادشاہ اور امیروں کے دربار میں جانے سے وہ اکثر پرہیز کرتے تھے۔ اور جب جاتے تھے۔ تو اپنے معمولی لباس سے جاتے تھے۔ اور معمولی بات چیت فرماتے تھے۔ دُنیا کے لالچ سے کبھی کوئی کلمہ خلافِ حق نہیں کہتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

سرکارِ سلاطین سے سروکار نہیں + جز مجلسِ مولا کوئی دربار نہیں
مدّاح ہوں تیں امام بے سر کا دبیرؔ + ساماں کیسا کہ سر بھی درکار نہیں[1]

خوشامد بیجا کرنیوالوں کی مذمت

ایک مقام پر وہ بے جا خوشامد کرنے والوں کی مذمت حسبِ ذیل فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

پیشِ امرا طالبِ زر جھکتے ہیں + سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح + ہو مال سدا جدھر۔ اُدھر جھکتے ہیں

اگر کسی بادشاہ یا امیر کی مدح بھی کبھی کی۔ تو جب کہ اُس کو اُس مدح کا اہل و مستحق پایا چنانچہ امجد علی شاہ مرحوم کی مدح میں چند بند اُن کے مرثیہ (طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے[2]) میں موجود ہیں۔

---

[1] سر و ساماں ایک معمولی لفظ ہے۔ اُس کے دو ٹکڑے کس خوبصورتی سے کر کے مضمون پیدا کر لیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں سب سے پہلے چھپا ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت کے بعد بادشاہ موصوف کی تعریف اور بعض علمائے اسلام و ایمان کی مدح فرمائی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا ہے کہ سب انصاف کھا رہا ہے مر قول پر قسم مطلوب اور نظم ہے نے شہرۂ رقم۔ واقف ہے کبریا کہ دروغ در یا نہیں۔ مطلب (مقصد) کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں۔ پس ایسے نیک نفسوں کی مدح کو مرزا صاحب عین رضائے خدا کے مطابق سمجھتے تھے۔ اس لئے تعریف کی ہے۔ اور صاف صاف کہدیا ہے۔ کہ ع مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُن دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح و ثنا کے قابل سمجھتے تھے۔ اس لئے مدح کی۔ کہ دُوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔ بے جا خوشامد و طمع کے زنگ سے اپنی آئینہ شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس نیک نیتی کا پھل اُن کو دنیا میں خدا نے یہ دیا۔ کہ بادشاہ نے گویا اُن کی خدمت کی۔ چنانچہ شمس الضحےٰ میں جو زمانہ شاہی کی ایک تصنیف فارسی کی ہے۔ یہ واقعہ لکھا ہے۔ اور مَیں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔ کہ زمانہ سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ایک روز شاہ مرحوم ممدوح کی مجلس میں مرزا صاحب منبر پر مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بالائے منبر جو شامیانہ تھا اتفاقاً وہ ہوا سے پراگندہ ہوکر ایک طرف ہوگیا۔ مرزا صاحب کے منہ پر دُھوپ آگئی۔ فی الفور قدر شناس علم دوست بادشاہ نے چتر طلب فرمایا۔ اور خود قریب منبر چتر لگائے ہُوئے کھڑے رہے۔ مرزا صاحب نے بہت عذر کیا۔ مگر فرمایا۔ کہ آپ پڑھے جائیے۔ اور پُورا مرثیہ پڑھئیگا۔ مَیں مشتاق ہُوں۔ مرزا صاحب نے الامر فوق الادب[۱] پر عمل کیا۔ اور مرثیہ پورا پڑھا۔ اللہ اللہ ظل اللہ جس شاعر اہلبیتؑ کے سر پر چتر شاہی لگائیں۔ اُس کی عزت و آبرو کی کیا حد ہوسکتی ہے۔ اور بادشاہ مرحوم کی قدر شناسی اور تواضع کی تو تعریف ہی نہیں ہوسکتی سچ ہے ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست ✣ گدا اگر تواضع کند خوے اوست[۲]

دنیا کے لوگ شاعر کی معراج عزت و کمال اس میں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کسی بادشاہ کا مدّاح ہو۔

---

[۱] یعنی حکم ادب کے اُوپر ہے ✣ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] مولوی محمد علی صاحب اشرفی نے حیات انیس میں صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ پر لکھا ہے کہ حضور نظام دکن میر محبوب علی خاں صاحب مرحوم نے عشرہ چہلم ماہ صفر ۱۳۲۲ھ میں نواب فیاض علی خاں صاحب کے امام باڑہ میں تشریف لیجاکر جناب مرزا اوج صاحب کی اعجاز بیانی کو سماعت فرمایا۔ اور منبر کے سامنے بغیر مسند و تکیہ کے آخر مجلس تک بیٹھے رہے۔ اور پھر وہ کتنے سال گذر گئے اور خود دیندوں کی سمجھ میں ایسا موقع اُن کے والد ماجد جناب مرزا دبیر مرحوم کو بھی حاصل نہیں ہُوا تھا۔ اور نہ ہو اس سے بڑھکر کوئی اوج نہیں ہو سکتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کو پُورا علم نہ تھا۔ ورنہ وہ یُوں لکھتے کہ یہ درج و اعزاز مرزا اوج صاحب سے قبل کیوا سطے گویا موروثی تھا۔ کہ اُن کے والد ماجد کی شاہ اودھ اس سے زیادہ عزت افزائی فرما چکے تھے ✣ ۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر بادشاہ دین و دنیا کی قدر و منزلت کم سے کم یہ ہونی چاہئے کہ خود دنیا کے بادشاہ اُس کے مدح خواں ہوں۔ چنانچہ یہ عزت بھی مرزا صاحب کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح کی بدولت حاصل ہوئی تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ قریب ۱۲۹۱ھ کے مرزا صاحب نابینا ہو گئے تھے۔ سنا ہے کہ کلکتہ میں کوئی جرمن کا ڈاکٹر آیا تھا۔ جو آنکھیں بناتا تھا۔ اور وہ مٹیا برج میں بادشاہ اودھ مرحوم کا مہمان تھا۔ شاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے اشارہ سے اُن کے کسی رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ تو آپ کی آنکھیں بن جائیں۔ بادشاہ اودھ کی بھی یہی خواہش ہے۔ مرزا صاحب کلکتہ مٹیا برج میں پہنچ کر بادشاہ مرحوم کے مہمان اور نواب مونس الدولہ کی کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ عرضداشت اطلاعی شاہ جم جاہ کی خدمت میں بھجوائی۔ بادشاہ مرحوم نے عرضداشت کو ان الفاظ دستخط خاص سے مزیّن فرمایا۔

گر برسر چشم من بیائی + بر قلب منم کہ کیمیائی

۵ ذی الحجہ ۱۲۹۱ ہجری [illegible] بمقام سلطان خانہ مبارک و سبطین آباد مبارک بادشاہ ممدوح مرزا صاحب کے استقبال کو تشریف لائے۔ اور اپنے ہمراہ مرزا صاحب کو لے گئے۔ اور پھر بازدید کی ملاقات کو جس کوٹھی میں مرزا صاحب ٹھیرے تھے۔ قدر شناس بادشاہ آئے۔ اور اپنی مجلس عزا میں خود بادشاہ مرحوم نے مرزا صاحب کی موجودگی میں بر سر منبر مرزا صاحب کی مدح میں تقریباً پچیس ۲۵ بند پڑھے۔ جن میں سے یہ ایک ٹیپ بہت مشہور ہے۔

بچپن سے ان کے دامِ محبت میں اسیر ہوں + ہیں کم سنی سے عاشقِ [illegible]

پھر مرزا صاحب کی آنکھیں اُس ڈاکٹر سے بنوائیں۔ فتح چشم کے ساتھ ہی [illegible]

بادشاہ کا مہمان ہونا اور بادشاہ کا استقبال و بازدید کو [illegible]

سوا اصل کتاب [illegible] ۱۲۹۱ [illegible] مرزا صاحب

اوا خر ۱۲۹۰ھ میں کلکتہ مٹیا برج گئے [illegible] ۱۲۹۱ [illegible] ۱۲۹۰ [illegible]

۱۲۹۱ [illegible] چشم [illegible] مرزا صاحب کی [illegible]

[illegible] ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۹۱ ہجری [illegible]

کرآئی۔ مرزا صاحب نے یہ رباعی تاریخیہ کہکر شکرِ خدا ادا کیا۔

رباعی تاریخِ عودِ بصارت

امدادِ علیؑ گاہ خفی گاہ جلی است ✤ برمن ز ازل عین عنایاتِ ولی است

چوں مادّہ[۵] دفع شد بگفتم تاریخ ✤ چشم۔ بدِ دور۔ عینِ اعجاز علی است[۱] ۱۲۹۱

عودِ بصارت اور رباعی تاریخی

فصل ۶ جبتک سلطنت اودھ قائم رہی مرزا صاحب اودھ سے باہر نہ گئے

جب تک لکھنؤ کی سلطنت قائم رہی۔ مرزا صاحب ملکِ اودھ سے کہیں باہر نہیں گئے۔ باہر سے بہتیرے بلاوے آئے۔ مگر ہمیشہ انکار فرماتے رہے جب کوئی اس کا سبب پوچھتا تھا۔ تو فرماتے تھے۔ کہ ہماری زبان کے جاننے والے یا دہلی میں ہیں یا لکھنؤ میں۔ تیسری جگہ یہ بات کہاں ہے۔ (دہلی ویران ہو چکی تھی۔ وہاں سے کبھی طلب نہیں آئی) یہاں تک کہ زمانہ کی پریشان ہوائے وہ ورق اُلٹا۔ اول سلطنت اودھ جاتی رہی۔ برس ڈیڑھ برس کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ مگر اُس شہر آشوب زمانہ میں مرزا صاحب نہایت مستقل رہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب بہت مستقل رہے

رباعی غدر ۱۸۵۷ء کے حال میں

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا ✤ گر عدل گئے ظلم گئے جور ہوا

اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر ✤ کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

غدر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور جانا

لکھنؤ سے مرزا صاحب اُس انتشار میں مع اہل و عیال چل کر سیتاپور میں پہنچے۔ اور مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب مرحوم اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم ہوئے[۲]۔

---

[۱] اس میں نہایت لطیف تخرجہ خارجی مادّہ کے پچاس[۵] عدد کا ہے یعنی ۵۰ عدد کم کرنے سے مصرعِ آخر سے تاریخ نکلتی ہے۔ ایک تو یہی معنی ہوئے کہ جب ۵۰ عدد مادہ کے دفع ہوئے تاریخ نکلی۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب مادۂ فاسد دفع ہوا جب تاریخ کہی اس صنعت کو صنعت ایہام کہتے ہیں ۔۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] میرے مکرم فرما علامہ سید غلام علی خاں صاحب ساکن لدھیانہ جو ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں مقیم اور ادارہ سیر[illegible] فرماتے تھے کہ میں جب ۱۹۰۰ء میں سیتاپور میں ملازم و مقیم تھا مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب جو قریباً ۷۰ سال کی عمر کے تھے اور بڑے ثقہ

ایک فقیرنی بڑھیا نے اُسی پُر آشوب زمانہ میں مجلس کی۔ اور مرزا صاحب اُسی بے سروسامانی کے عالم میں مرثیہ پڑھے۔ یہ واقعہ آج تک سیتاپور میں مشہور ہے۔ اُسی خانہ بربادی کے عالم میں یہ رباعی بھی کہی تھی۔ جس میں واقعی حالت (خانہ بربادی) کی تصویر کھینچ دی ہے۔

رباعی

شطرنج دو رنگی[۵۳] سے ہیں ششدر بندے + آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل + تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

اسی زمانہ پُر آشوب میں یہ رباعی بھی فرمائی تھی۔

سیارے سے چشم مہر نادانی ہے + اس دور میں دل بھی دشمن جانی ہے
مشکل ہے کہ ہاتھ آئے عنانِ آرام + تبدیلِ فلک ستارہ پیشانی ہے[۵۴]

بعد غدر واپسی لکھنؤ کی ۱۸۵۷ء

پھر لکھنؤ میں امن ہو جانے پر مع اہل و عیال واپس تشریف لائے۔ اور اکثر اپنے دوستوں کی موت اور بربادی کی خبریں سُن سُن کر نہایت ملال کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لکھنؤ میں نہ شاہ اودھ تھے۔ نہ وہ قدردان امیر۔ اکثر امیر فقیر ہو گئے تھے۔ اکثر سرکاریں مٹ گئیں تھیں۔ اور سامان خانہ داری کے ساتھ اکثر مرثئے بھی لُوٹ میں تلف

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۲) اور وضعدار زمانہ شاہی کی تعلیم یافتہ تھے مجھ سے ناقل تھے کہ یہ مجلس جس فقیرنی نے کی تھی اُس کے گھر میں ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا تھا۔ اُس نے مرزا صاحب سے معذرت کی کہ میرے پاس اور کوئی کرسی وغیرہ نہیں ہے اور نہ کوئی بچھانا ہے یہ مونڈھا ہے مرزا صاحب نے فوراً اُس مونڈھے پر بیٹھ کر پڑھا تھا۔ یہ خلق و انکسار مرزا صاحب کا سیتاپور میں آج تک مشہور ہے مخدومی جناب مرزا اوج صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء وہ بڑھیا اکثر لکھنؤ میں آتی تھی اور جناب مرزا صاحب مرحوم اُس سے ہمیشہ مسلوک ہوتے رہتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۳ شطرنج دو رنگی میں ایک لطیف استعادہ ہے شطرنج کے مہرے عموماً سرخ و سبز دو رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح اکثر خانہ بھی دو رنگ کے ہوتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۴ اکثر لوگ نجومیوں سے اپنا ستارہ دکھلایا کرتے ہیں غالباً اُن کے کسی فیق نے کسی نجومی سے اپنے ستارہ کے دیکھنے کو کہا ہوگا۔ اُس پر فرماتے ہیں کہ سیارے سے مہربانی کی امید رکھنا نادانی ہے۔ کیونکہ یہ ایسا غدر کا زمانہ ہے کہ جس میں اپنا دل بھی دشمن جان ہو رہا ہے۔

ہو گئے تھے۔ پھر شاید ۱۸۵۸ء میں کانپور کے مشہور ذی علم امیر کبیر نواب دولھا صاحب نے بُلایا۔ وہاں تشریف لے گئے۔ اور عشرہ محرم میں پڑھے۔ ایک رباعی اُس موقع پر اُن نئی نئی صورتوں کو دیکھ کر فرمائی تھی۔ وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہُوں۔

اس بزم میں ارباب شعور آئے ہیں + یہ شیعہ ہیں یا آیۂ نور آئے ہیں
پڑھ مرثیہ لے دادِ سخن ان سے دبیر + کیا کیا حضرات کانپور آئے ہیں[۵۵]

پھر شاید ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد سے سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ نے اپنے بعض اعزہ کو بھیج کر مرزا صاحب کو بُلوایا۔ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی کے آئے ہُوئے آباد تھے۔ وہاں زبان و کمال کے جوہر شناس اچھے تھے۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کی آمدنی صرف سَو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد اور ۳۰ ماہوار وثیقۂ حسینیہ (امام باڑہ) میر باقر تاجر مرحوم اور ایک گاؤں اور کچھ مکانات کے کرایہ کی رہ گئی تھی۔ جو مرزا صاحب ایسے حاتم مزاج کے واسطے کچھ بھی نہ تھی۔ ہر چند ہنوز عظیم آباد دُور جگہ تھی۔ اور شاید اُس زمانہ میں مسلسل ریل بھی نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب کو اہل عظیم آباد کا خلق کھینچ لے گیا۔ اور کبھی بعض رئیسوں کی طلب پر جناب میر انیس مرحوم و میر مونس مغفور و میر ظہیر مرحوم

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۴۴) آرام کی لگام ہاتھ آنا مشکل ہے کیونکہ شب برآسمان خود ستارہ پیشانی ہے یعنی ستارہ پیشانی گھوڑا عرف عام میں منحوس مشہور ہے۔ آسمان کا ستارہ پیشانی ہونا ظاہر ہے کہ اُس کی پیشانی پر ستارے ہیں + ۱۲ مؤلف۔

[۵۵] کانپور سے لکھنؤ ۵۲ کوس دور ہے مگر رسم و رواج و عادات میں بہت فرق ہے شاید مرزا صاحب نے نہایت مخفی اشارہ اسی کا اس رباعی میں فرمایا ہے۔ مرزا صاحب کے بعد ایک اور ذاکر باکمال (رگرنا نک داغ) لکھنؤ کے کانپور میں نئیس رئیس کے یہاں پڑھنے گئے تھے۔ لوگ مجلس میں منبر سے دُور دُور بیٹھے تھے منبر کے گرد بڑا سناٹا تھا۔ اُن ذاکر کامل نے فرمایا آپ لوگ ذرا منبر کے پاس آ جائیے۔ تو ایک جاہل مُڈ کا نذر بولے کہ آپ اپنا منبر ہی ادھر کچھ سرکا لیجیے تا اُن ذاکر نے تو جواب سے پُوچھا کیا حضور یہی کانپور کی خلقت ہے۔ بھلا لکھنؤ میں ذاکر کے کہنے پر کس کی مجال ہے کہ کوئی زیر منبر نہ آجاتا یا ایسا بے تکا جواب دیتا۔ ہائے لکھنؤ! ۱۲ مؤلف حقیر

[۵۶] میر محمد رضا زاہد مرحوم جو حقیر کے نانا تھے اور مرثیہ پڑھنے میں ایک مرزا صاحب کے مریدوں میں تھے اور بلبل پڑھتے تھے عمر بھر کی

وصلا عربی نواب دولھا صاحب سی طلب پر کانپور جانا اُن مجلس پڑھنا رباعی کی پڑھنا
عظیم آباد سے بلاوا آنا
جناب میر انیس و میر مونس و میر ظہیر صاحب کا بھی عظیم آباد میں جانا

اُسی سال عظیم آباد تشریف لے گئے تھے۔ یہ پہلا سال تھا۔ جو لکھنؤ کے اتنے باکمال ذاکر لکھنؤ سے باہر ایک مقام پر جمع ہوئے تھے عظیم آباد میں دُور دُور سے لوگ ان کے سُننے کو آئے تھے۔ اکثر کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا۔ کہ نہ لکھنؤ اُجڑتا نہ یہ کامل یہاں آتے۔ سچ ہے۔ (بقول مؤلف) ؎

مضرتوں میں بھی اکثر مفاد ہوتے ہیں + کہیں ملول کہیں قلب شاد ہوتے ہیں

مرزا صاحب یکم محرم کو مجلس موصوف (گلزار باغ پٹنہ) میں منبر پر تشریف لائے۔ اول حمد و نعت و منقبت میں حسب معمول چند رباعیاں پڑھ کر ذیل کی دو رباعیاں اس مضمون میں پڑھیں کہ سفر اہل کمال کے واسطے باعث نقص نہیں ہے۔ بلکہ کمال کو بڑھانے اور چمکانے کا ذریعہ ہے۔ اور گردش فلک آدمی کو سفر پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس فلسفہ کلام کو بغور دیکھئے۔ کیسی تخیل ہے اور کیسی زبان ہے۔

(رباعی ۱)

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے + اس دَور میں جَورِ آسماں سے نکلے

صد شکر کہ شہر لکھنؤ۔ جنت تھا + آدمؔ ٹھہرے[۵] جو ہم جناں سے نکلے

(رباعی ۲)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا + قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا

تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل + پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

(بقیہ نوٹ نمبر ۶) تعلیم کسی قدر فرق کیساتھ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ بعد (میر گل صاحب سعید مرحوم دبیر و لادحسین صاحب قوی مخلص و میر بادشاہ علی صاحب بقا) نے فرمائی۔ کہ یہ سب صاحب بھی اس خاندان کے اچھے پڑھنے والوں میں تھے۔ (میر محمد رضا) ظہیر مرحوم شاید نواب لطف علی خاں یا ولایت علی خاں کے یہاں پڑھتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۵] آدم ٹھہرے خاص روزمرہ ہے مطلب ہے کہ ازبسکہ ہم آدم ہیں آدم کیواسطے جنت سے نکلنا لازم ہے۔ اور ٹھہرے اور نکلے میں صنعت تضاد بظاہر ہے۔ کہ ایک دوسرے کی ضد ہے حالانکہ ٹھہرے کے یہاں معنی ٹھہرنے کے نہیں ہیں۔ اس کو صنعت ایہام بھی کہہ سکتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۶ پٹنہ میں مرزا صاحب کی عزت و قدر وغیرہ

ازبسکہ پٹنہ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی والوں کے جمع تھے۔ جو مرزا صاحب کی زبان کے قدر شناس تھے۔ اور زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کو جو ہر شاعری سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب کی اہل عظیم آباد نے ایسی خاطر و مدارات کی۔ کہ پھر مرزا صاحب نے دُوسری طرف کا رُخ نہ کیا۔ قریباً تمام اہل عظیم آباد بالاتفاق مرزا صاحب کو تمام ہندوستان کے شاعروں پر ترجیح دیتے تھے۔ بڑے بڑے رئیس وہاں کے مرزا صاحب کے فدائی بن گئے تھے۔ جن میں سے دو بزرگوار میر محسن صاحب اور میر عباس صاحب مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد[*] کے چچا اور والد بھی تھے۔ جو خود بھی ذی علم تھے۔ اور اہل کمال کے قدر شناس بھی تھے۔ الحاصل تمام قدردانوں کے اخلاق نے مرزا صاحب سے یہ رباعی کہوائی ہے ۵

[*] مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد بھی مرزا صاحب کے ایک شاگرد ہیں۔ جن کا دم اس وقت بہت غنیمت ہے۔ ملک کا ذکر خیر میں انشاء اللہ کرونگا۔ حقیر پر بیس برس سے شفقت فرماتے ہیں۔ خطوط و کتب مصنفہ اکثر ارسال فرما کر زیر بار احسان فرماتے رہتے ہیں۔ یہ بات کہ مرزا صاحب سب شاعران ہند سے اُس زمانہ میں بھی بہتر سمجھے جاتے تھے۔ واقعات انیس حصہ ۲ سے بھی ظاہر ہے۔ جو رائے نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال نے لکھکر بھیجی ہے اور واقعات انیس میں درج ہے۔ وہ بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ نواب صاحب موصوف بھی انہیں بزرگوں کے یادگار ہیں۔ مگر نئے خیال کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دکن ریویو میں جو انہوں نے بعض مضامین لکھے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اپنے بزرگوں سے خیالات میں بہت مختلف اور دُور ہیں۔ میر علی محمد صاحب شاد ضرور میر انیس مرحوم کے کلام کو دل سے پسند فرماتے ہیں۔ با ایں ہمہ مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے سرفراز نامہ ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں حقیر کو تحریر فرماتے ہیں۔ "کہ میں نے مرزا دبیر صاحب سے سنہ ۱۲۷۶ھ میں اصلاح لی ہے۔ اور میں اُن کو اپنا اور اس فن (شاعری) کا اُستاد جانتا ہوں۔ اور مرزا صاحب با اعتبار کریکٹر بزرگی اور کمال الفن صاحب اخلاق حمیدہ اور مومن کامل تھے۔ میں اُنکی مخالفت کیونکر کرتا اور کس منہ سے کر سکتا ہوں۔ ہاں ۳۵ برس ہوئے کہ جناب مرزا صاحب کے بعض نادان دوستوں نے مجھ کو کچھ ایسا پریشان کر دیا۔ کہ جوش جوانی میں میں ناخود رفتہ ہو گیا۔ نوائے وطن میں بعض بیہودہ کلمے میرے قلم سے ایسے نکلے کہ میں شرمندہ ہوں۔ اور اُنکی رُوح پر فتوح سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس کے بعد سے آج تک حاشا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایۃً خواہ صراحتاً نکلا ہو"۔ یہ خط طولانی ہے۔ اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے۔ "کہ میں میر انیس صاحب کا طرز فطرتاً پسند کرتا ہوں"۔ اور اور بھی مضامین ہیں۔ جن کا اس موقع پر لکھنا ضرور نہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

این شہر بخاطر ملولاں شاد است ◆ معمورۂ خلق و علم و عمل و داد است
ہر فرد بشر دفتر خلق ست دبیر ◆ این شہر بخلاق عظیم آباد است

باب ششم۔ صدمات اواخر عمر

فصل ۱ صدمات اواخر عمر

مرنے سے دو سال پہلے مرزا صاحب کو چند صدمہ روحانی بہت سخت پہنچے۔

پہلا صدمہ۔ محمد ہادی حسین عطا تخلص نوجوان فرزند کا مرنا۔ جو ۵ شعبان ۱۲۷۰ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ عین شباب کے عالم ۲۰ برس کی عمر میں جمادی الاول ۱۲۹۰ھ کی پانچویں کو یکایک تخمہ کر کے انتقال کر گئے۔ یہ شاعر مبتدی تھے۔ سلام کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ مولوی سید علی صاحب کامل عرف علی میاں مرحوم نے (جن سے مرزا صاحب کو خاص اس وجہ سے زیادہ محبت تھی۔ کہ اُن کی زوجہ دختر حکیم میر علی صاحب کو مرزا صاحب گویا اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ حکیم میر علی صاحب مرزا صاحب کے ساتھ کے کھیلے ہوئے دوست تھے۔ جن سے اور مرزا صاحب سے مدۃ العمر وہی محبت قائم رہی۔ جو اُس زمانہ کے یکرنگ دوستوں میں ہوتی تھی۔ انہیں کے سبب سے مولوی کامل مرحوم سے بھی محبت تھی۔ کہ یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کی حضوری سے اکثر فیضیاب ہوتے رہتے تھے) تاریخ وفات لاجواب فرمائی۔ جو یہ ہے۔

تاریخ وفات عطا مصنفہ مولوی کامل مرحوم

روزگار ست گلشن نیرنگ ◆ از جمال امید و صورت بیم
صبر کن صبر بر جفائے فلک ◆ اے ترا طبع ورائے ہر دو سلیم
از علی اکبر حسین شہید ◆ یاد کن در عزائے نخل کریم
بود ہادی حسین رعناتر ◆ یا کہ فرزند آں امام کظیم
آہ از مرگ نوجوانے داد ◆ پیش روئے پدر بحال سقیم
برگزیدت خدا برائے بلا ◆ شکر کن شکر اے نبیہ حلیم

نورِ چشمِ ترا نہاد بسر ایزد از لطفِ سرمدی و بیم
غم ز دفنش مخور کہ بعدِ رحیل او بہ کنجِ لحد نماند مقیم
ہاتفے گفت سست دوش بمن شد عطاردِ مکینِ بیت نعیم

۱۲۹۰ء

اس صدمۂ عظیم کے بعد مرزا صاحب کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ کہ ادھر تو نورِ نظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ اُدھر چودہ رات میں چند گھنٹے سو رہتے تھے۔ وہ سونا بھی نورِ نظر کے داغ کی نذر ہوگیا۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا۔ مرزا صاحب پھر نمازِ شب اور وظائف پڑھتے تھے۔ اُس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے۔ تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ اکثر مَیں دن میں آٹھ نو بجے جب جاتا تھا۔ تو سوچ میں بیٹھا ہُوا دیکھا کرتا تھا عرض کرتا۔ کیوں جناب کیا فکر فرما رہے ہیں۔ فرماتے۔ بھئی محمد رضا۔ رات کو تین بند کہے تھے۔ کچھ مصرع یاد رہ گئے۔ کچھ بھول گیا۔ اب بہتیرا سوچتا ہُوں۔ نہ وہ مصرع یاد آتے ہیں۔ نہ ویسے دُوسرے مصرع خیال میں آتے ہیں۔ مَیں عرض کرتا تھا۔ کہ حضور نے بھائی محمد جعفر کو جگا دیا ہوتا وہ لکھ لیتے۔ تو آبدیدہ ہوکر فرماتے۔ کہ ہاں ایک (ہادی حسین) کو تو راتوں کو جگا جگا کر ہاتھوں سے کھو چکا۔ اب خدانخواستہ ان کو جگاؤں۔ تو ان سے بھی ہاتھ دھوؤں۔ اس صدمۂ عظیم کے بعد دُوسرا صدمہ رُوحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر مرحوم کے مرنے کا تھا۔ جو اٹھائیسویں صفر ۱۲۹۱ سنہ ہجری کو آخرت کا سفر کر گئے۔ یہ بڑے بھائی تھے۔ مگر مرزا صاحب کے تقدس و کمال کے سبب سے مرزا صاحب کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے چھوٹے۔ پہلے یہ بھی میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے پھر اُنہیں کے حکم سے مرزا صاحب کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ان کے سو مرثیے سے اُوپر اور سیکڑوں سلام ہیں۔ یہ مشہور و مقبول مرثیہ "ع ہر آہ عام ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔" جو نولکشور صاحب کے مطبع میں مرزا صاحب کی جلدوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ بھی

وفات ... بھائی ... برادر ...

انہیں نظیر مرحوم کا ہے۔ اسی طرح بہت سے ان کے مرثئے ایسے ہیں۔ جن کو ناواقف راز مرزا صاحب کا کلام سمجھتے ہیں۔ ان کے فرزند مرزا محمد عباس صاحب سفیر مرحوم تھے نظیر مرحوم کو تو کیمیائی نسبت تھی۔ اُس میں محو رہتے تھے۔ سفیر مرحوم کو خود مرزا صاحب نے عروض وغیرہ پڑھایا تھا۔ تیسرا صدمہ جو ان دونوں صدموں سے بڑھ کر کاہش جان ہوا۔

فصل ۲ — تیسرا صدمہ وفات انیس مرحوم

وہ بروز دوشنبہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو قریب مغرب میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کا مرنا تھا۔ یہ شیرِ نیستان سخن کیا مر گیا۔ مرزا صاحب کی شاعری نہیں نہیں زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ اُس زمانہ میں میر صاحب کے کمالات کا اکثر ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے۔ کہ اب نہ پڑھنے کا لطف ہے نہ کہنے کا مزہ ہے۔ اب ہمیں بھی چراغ سحری سمجھ لو۔ کوئی جھونکا آیا۔ اور خاموش ہو گئے

(بقول جناب اوج مدظلہ)

تصنیف کا نہ لطف نہ خوانندگی کا لطف ✦ وہ کیا اُٹھے کہ اُٹھ گیا سب زندگی کا لطف

مرزا صاحب نے خونِ جگر سے رنگین ایک تاریخ وصالِ میر صاحب کی لکھی۔ اور میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی تھی۔ میں اُس مجلس میں موجود تھا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی۔ تو مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔ چند شعر یہاں لکھتا ہوں۔ یہ تاریخ اُن کے کلیات دفتر ماتم میں نہیں چھپی ہے۔ بلکہ اب ۲۲ سال پہلے شمس الضحٰی کے بعد جو تتمہ مولوی بہادر حسین صاحب وحید نے لگایا ہے۔ اُس میں چھپی ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات میر انیس مرحوم

قطعۂ تاریخ

(۱) دادخواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث ✦ ازکہ دل مالوس گردد بے سخنور بے انیس

(۲) عبرۃ للناظرین گردید افلاک و زمیں ✦ دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس

(۱) خلاصہ یہ ہے کہ کوئی ایسا سخنور نہیں رہا جس سے دل بہلے ۱۲ مؤلف حقیر

(۲) ایضاً افلاک و زمین سراپا عبرت ہو گئے ہیں۔ آفتاب۔ ماہتاب۔ ستارے کوئی چیز قابل دیکھنے کے نہیں ہی۔ ایسا دل بیزار ہے ۱۲ مؤلف

(۳) ماہ رفیع و معینی و دینی دو بازو بہم شکست	بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس
(۴) یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں	چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس
(۵) الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوق نظم	شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس
(۶) پوست کندہ موشگافان سخن گویند حیف	ہر سر مو بر رگ جانست نشتر بے انیس
(۷) اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما	رفتہ رفتہ رفت تا دامان محشر بے انیس
(۸) بسکہ در بزم ہم بسوز داغ بر بالائے داغ	نیست جز طاؤس دل پروانہ دیگر بے انیس
(۹) نیست ایام تماشائے چمن اکنوں کہ ہست	مائۂ شبنم سپند و غنچہ مجمر بے انیس
(۱۰) تا نہ مضمون نظم میسر بود در بحر شعر	چشمۂ چشمم شود ہم چشم کوثر بے انیس

(۱۱) سال تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

زبر و بینہ میں	زبر میں	زبر و بینہ میں	زبر میں
۵۷۲	۱۸۴	۴۰۴	۱۳۱

میزان ۱۲۹۱ سنہ بارہ سو اکیانوے ہجری نکلے

(۳) ایک ہی سال دو بازو ٹوٹ گئے اول سال میں نظیر برادر یعنی اور آخر سال میں انیس کے اور دبیر گذر گئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۴) ہم گذشتگان کا یادگار ہوں چند روز چند دن دنیا میں ہوں۔ ایسا ہی ہوا کہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ کو تاریخ پڑھی اور ڈیڑھ ہفتہ اور چند دن کے بعد ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ کو رحلت ہے +

(۵) اے ذوق و شوق تصنیف نظم لو اب رخصت ہو کہ اب ان سے جو حواس خمسہ ہیں نہ درست ہیں نہ عقل + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۶) بات میں بات نکالنے والے شاعروں کا مذاق میں یہ حال ہے کہ تن کو ہر بال کا سر رگ جان پر نشتر معلوم ہوتا ہے + ۱۲ مؤلف۔

(۷) آنسو کو دامن سے تعلق لگاؤ ہے کہ دامن پر گرتا ہے مگر صدمہ کی حد ہو گئی ہمارا آنسو دامن محشر تک پہنچیگا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۸) داغ پر داغ تھا اگر پروانۂ دل طاؤس کی طرح ہو گیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۹) اب تو زمین میں پھر بھی تماشے کے قابل نہ رہا (جو تفریح کی جگہ ہے) اور جو آب ہے ایک قطرہ کا رداد معلوم ہوتا ہے اور غنچہ انگیٹھی کی صورت نظر آتا ہے یہ تشبیہ اچھی ہے +
(بمعنی شبنم)

(۱۰) ہر بحر میں تازہ مضمون کہتے تھے۔ ان کے فراق میں میری آنکھ کا چشمہ بھی ہم چشم کوثر ہو جائے تو عجب نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۱) تاریخ زبر و بینہ میں کہ طور سینا کے زبر و بینہ میں ۵۷۲ ۔ بے کلیم اللہ کے صرف زبر میں ۱۸۴ منبر بے کے زبر و بینہ میں ۴۰۴ ۔
۳ انیس کے صرف زبر میں ۱۳۱ اعداد لینے سے ۱۲۹۱ھ نکل آتے ہیں سینا و سینا ایک دوسرے کا معکوس ہے۔ اس کو صنعت مقلوب کہتے ہیں + ۱۲ مؤلف

(۱۲) در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف | گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
(۱۳) آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین | طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۹۲۹ ۹۴۵

میزان

سنہ ۱۸۷۴ عیسوی

زبر و بینہ کا حساب و قاعدہ

اب زبر و بینہ کا حساب بھی لکھ دوں۔ کہ اس زمانے میں یہ حساب کتاب علوم مشرقی کے ساتھ ساتھ خواب و خیال ہوتا جاتا ہے۔ پھر لوگ وقت ضرورت ڈھونڈینگے تو مشکل سے ملیگا۔ واضح ہو کہ زبر و بینہ دو لفظ ہیں۔ زبر اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر حرف کے نام کے اول حرف کا عدد لیا جائے۔ اور بیّنہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر اسم حرف کے اول حرف کو چھوڑ کر باقی حروف کے عدد لیں۔ اور زبر و بینہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ شروع کے حرف کا عدد بھی لے لیں۔ اور باقی حروف کے عدد بھی لے لیں جیسے الف میں تین حروف ہیں۔ ا ل ف۔ پس آ کا ایک عدد لیا۔ اس کو زبر کہینگے۔ ل ف کے ۳۰ و ۸۰ کل ۱۱۰ عدد لئے۔ اس کو بینہ کہینگے۔ اور تینوں حروف کے عدد ۱۱۱ لیلیں۔ تو اس کو زبر و بینہ کہینگے۔ اب جب کہ یہ حساب سمجھ میں آگیا تو یہ بھی سُنئے کہ میزان التاریخ میں جو فن تاریخ گوئی کی ایک معتبر کتاب عربی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ

یجوز فی المعمّیٰ والتاریخ ان یوخذ اعداد الحروف بحساب الجمل وان یوخذ بطریق الزبر والبینات وان یوخذ اعداد بعض الکلمات بحساب الجمل وبعضھا بالزبر و البینات وحینئذ یجب ان یشار الیھا بوجہٍ ما لئلا یلزم خلاف اما قصود	معمّے و تاریخ میں یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب حرفوں کے عدد بحساب زبر لیں[۱] اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب کے عدد زبر و بینات میں لیں[۲]۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بعض کلمات کے اعداد زبر ہیں[۳]۔ اور بعض کے زبر و بینات میں لیں۔ مگر صورت آخر الذکر (۳)

میں یہ واجب و ضرور ہے۔ کہ شاعر کسی طرح اس کا اشارہ کردے۔ تاکہ پڑھنے والا خلاف مقصود عدد نہ جوڑے۔ اور غلطی سے بچے + پس اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے حسب ہدایت مذکورہ کوئی اشارہ بھی کیا ہے یا نہیں۔ مرزا صاحب کے بعض معتقد اور شاگرد کہتے ہیں۔ کہ وہ اشارہ اسی قدر کافی ہے۔ کہ طور سینا کے نیچے ۵۷۲ زبر بینہ بے کلیم اللہ کے نیچے ۱۸۴ زبر۔ اور منبر بے کے تحت میں ۲۹۴ زبر و بینہ۔ اور انیس کے نیچے ۱۲۱ زبر۔ اور پھر سب کے مجموعی اعداد ۱۲۹۱ لکھ دئے۔ بس یہ اشارہ کافی ہے۔

مگر حقیر کہتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ایک اور بھی نہایت صاف اشارہ فرمایا ہے (ذرا ناظرین اس مقام کو کہ علمی بحث ہے غور و انصاف سے ملاحظہ فرمائیں) وہ فرماتے ہیں۔ اشارہ صاف

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف + گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

یعنی وفات انیس کے سبب سے طبیعت رنجیدہ و پریشان تھی۔ اور یہ جو مادہ تاریخ ہے۔ وہ کسی قدر دقیق و پیچیدہ ہے۔ پس اب اُس کو تاریخ عیسوی میں صاف صاف بحساب زبر کہکر میں عام فہم کئے دیتا ہوں۔ تمکو اگر سنہ ہجری میں شک ہے۔ تو سنہ عیسوی سے مطابق کرلو۔ کہ سنہ عیسوی جاننے والے اب ہندوستان میں بہت ہیں۔ اور سنہ عیسوی اس پورے شعر میں سے بحساب زبر بلا کم و کاست نکلتے ہیں۔

آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامیں + طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

سنہ ۱۸۷۴ع

یہ ۱۸۷۴ع سنہ ۱۲۹۱ھ کے مطابق ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئیگا۔ کہ حقیر نے اپنے بالواسطہ اُستاد (دبیر مرحوم) کی طرفداری میں سنین عیسوی والے دو شعر خود گھڑ لئے ہیں۔ یہ پوری تاریخ جن میں یہ دو شعر بھی ہیں۔ آج سے قریباً ۳۲ برس پہلے کتاب شمس الضحٰے کے ساتھ بطور ضمیمہ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپ کر شائع و مشتہر ہو چکی ہے +

دفع دخل۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی صاحب یہ اعتراض فرمائیں۔ کہ یہ آخر الذکر دفع دخل

عیسوی تاریخ پورے شعر میں ہے۔ ایک مصرع میں نہیں ہے۔ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ جب تاریخ ایک مصرع سے کم ایک یا دو لفظ میں کہنا جائز ہے۔ اور اسی طرح پورے ایک فقرہ میں یا آیت میں جائز ہے۔ تو پورے شعر میں بھی جائز ہے۔ کیونکہ جس طرح نثر میں ایک فقرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح نظم میں اُس کا قائم مقام عروضیوں کے نزدیک شعر ہے۔ عروضی جب تقطیع کریگا۔ پورے شعر کی۔ بلکہ عربی میں تو کبھی کبھی ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ایک جزو مصرع اول کے اخیر میں اور دوسرا مصرع ثانی کے اول میں لاتے ہیں۔ یہاں تک جائز ہے۔ جیسے شیخ سعدیؒ کا یہ شعر ہے۔ ؎

یا معشر الخلّان قولوا للمعا + فی لست تدری بالقلب المرجع

یہاں ایک لفظ معافی کے شاعر نے دو ٹکڑے کر دئے۔ مصرع اول میں معا لائے۔ ثانی میں فی لائے۔ اس میں کوئی کیا فی نکال سکتا ہے۔ اس پر بھی اگر کسی کو اطمینان و تسکین نہ ہو۔ اور یہ کہے۔ کہ شیخ سعدیؒ ایرانی تھے عرب نہ تھے۔ اُن کا کلام فارسی مستند ہے۔ کلام عربی قابل سند نہیں۔ (حالانکہ سعدیؒ کا کمال یہ ہے۔ کہ اُن کا کلام عربی بھی سند مانا جاتا ہے) تو اب اُن اہل زبان بزرگ کا کلام سُنئے۔ کہ بلاغت و فصاحت جن کی زبان سے نکلی ہے۔ قرآن شریف جن کے گھر میں گویا زبان حال سے یہ آیت پڑھتا ہوا اُترا ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ [1] وہ بزرگوار محمدؐ و آل محمدؐ ہیں۔ چنانچہ جناب امام حسینؑ کا یہ مشہور شعر لیجئے۔ جو اُن جناب نے اپنے دوستوں کی یاد میں فرمایا تھا۔ ؎

لیتکم فی یوم عاشو + را جمیعاً تنظرونی [2]

دیکھئے اس شعر میں بھی ایک لفظ عاشورا کے اسی طرح دو ٹکڑے کر کے دونوں مصرعوں

[1] ظاہر الفاظ کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اللہ جانتا ہے۔ کہ کس گھر میں رسالت ہونی چاہئے ۱۲ مؤلف۔

[2] (اے میرے دوستو!) کاش تم سب کے سب مجھے یوم عاشورا دیکھتے ۱۲ مؤلف غفرلہٗ

میں لائے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ایسے مصرع میں اتفاقیہ تاریخ نکالے۔ تو وہ جزو لفظ مصرع سے خارج ہونے کے سبب سے ایسی تاریخ نہ ہوگی۔ کہ جس کے معنی نکل سکیں۔ حالانکہ تاریخ کے لئے یہ ضرور ہے۔ کہ وہ مہمل الفاظ میں نہ ہو۔ اور جب ایک فقرہ میں تاریخ کہنا جائز ہے۔ خواہ وہ فقرہ کتنا ہی بڑا ہو۔ تو ایک شعر میں کیوں نہ جائز ہوگا۔ کہ فقرہ کا مقابل نظم میں ہمیشہ بیت سمجھا جاتا ہے نہ کہ مصرع +

اس تاریخ پر بعض انیسیوں کا اعتراض

مرزا صاحب کے اس تاریخ پڑھنے پر اُن لوگوں میں جو نہ سمجھے تھے ایک ہُلّڑ مچ گیا۔ میر صاحب تو فرما گئے تھے ؎

سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس + جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

مگر اُن کے طرفداروں اور شاگردوں نے اُن کے مرنے کے بعد بھی جھگڑا کیا۔ اور گویا ثابت کر دیا۔ کہ ع بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا۔ پہلے کچھ مرزا صاحب نے سکوت فرمایا۔ جب اُن سے عرض کیا گیا۔ کہ لوگوں کے اعتراضوں کے باب میں کوئی رسالہ نکال دیجے۔ فرمایا۔ کہ ابھی ناواقفوں کو اور غوطے کھانے دو۔ جو واقف ہوگا۔ وہ اعتراض نہ کریگا۔

مولوی عبدالعلی صاحب مدراسی کا تائید مرزا صاحب میں رسالہ لکھنا

علمائے اہل سنت وجماعت میں سے مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی ایک عالم متبحر* تھے۔ اُنہوں نے ایک لاجواب رسالہ مرزا صاحب کی تائید میں لکھا۔ پھر میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم اور اور لوگوں نے بھی اس کے جواز میں کئی رسالے لکھے مہینوں اس کے چرچے رہے۔ یہاں تک کہ اہل علم اور انصاف پسندوں نے مان لیا۔ کہ تاریخ صحیح ہے۔ اور مصرع بلکہ تمام شعر آخر کا لاجواب ہے۔ یعنی آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامین۔ طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس +

واقعات انیس کی تنقید

افسوس وہ کارواں بھی دُور چلا گیا۔ وہ گرد کارواں بھی اب نظر نہیں آتی۔

*۔ جن کے انتقال کو ابھی دو تین برس ہوئے ہیں۔ بہت کتابیں ان بزرگوار کی تصنیف ہیں۔ اور بہت درسی کتابوں پر حاشیے ہیں۔ لکھنؤ میں یہ تمام عمر گوبا رہے۔ وہیں انتقال فرما گئے۔ بڑے ادیب و علامہ تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر کبھی کبھی جب تیز ہوا چلتی ہے۔ یا آندھی آتی ہے تو اُس گرد کی بُو دماغوں میں کبھی کبھی آجاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے کرم فرما میر مہدی حسن صاحب احسن سلمہ اللہ والبقاء (۱) واقعات انیس کے نمبر۱ صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ پر صرف ایک مصرعؔ "طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" لکھ کر لکھتے ہیں کہ "پوری تاریخ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں موجود ہے۔ اس مادہ میں مرزا صاحب مرحوم نے صنعت زبر و بینہ کا دعوے کیا ہے۔ لیکن گروہ شعرا کو اس میں کلام ہے۔ کیونکہ زبر و بینہ کے قاعدہ سے سن مقصود کا استخراج نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے فاضل صاحبزادہ نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار میں تاویلاً تصحیح کی ہے۔ مگر واقفان فن کی تسلی نہیں ہوئی"+

مَیں دوستانہ احسن صاحب سے عرض کرتا ہوں۔ کہ جب آپ واقعات انیس لکھنے بیٹھے تھے۔ تو کلیات مطبوعہ مرزا صاحب و دفتر ماتم و شمس الضحےٰ و تنقید آب حیات یعنی (حیات حالات مرزا صاحب میں برسوں کی تصنیف شدہ مطبوعہ کتابیں ہیں) دیکھ لیتے۔ تو آپکو معلوم ہو جاتا۔ کہ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں یہ قطعہ تاریخ (قطعی طور پر) نہیں ہے۔ شمیمہ شمس الضحےٰ میں پُورا قطعہ تاریخ چھپا ہے۔ اُس سے آپ یہ پُوری تاریخ لکھ دیتے۔ کہ پُوری بات سُن کر منصف مزاج سخن فہم ذی علم ناظر کتاب خود انصاف کر لیتا۔ کہ واقعی تاریخ نکلتی ہے اور مرزا صاحب کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اور یہ تاریخ مرزا صاحب کے کمال محبت کی خبر دے رہی ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب کی زبان سے میر صاحب کے کمالات کی مدح و ثنا ہے۔ ایک کامل دوسرے کامل کی قدر خوب کر سکتا ہے۔ اور تاریخ دیکھنے سے ناظر ذی علم کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ اللہ ایک مدمقابل کی موت سے کیسا سخت صدمہ مرزا صاحب کے دل پر پہنچا ہے۔ اور کس قدر میر صاحب کا وقار اُن کے دل میں تھا۔ مگر افسوس نہ معلوم کیوں آپ نے قطعہ درج نہ فرمایا۔ اور صرف ایک مصرع لکھ کر اس کا موقع ناظرین واقعات انیس کو نہیں دیا۔ اب مَیں نے ہندسی کی چیندی کر کے ناظرین کو سمجھا دیا۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین۔ ذی علم منصف مزاج کی تسلی اس سے ہو جائیگی۔ اب جبکہ واقعات انیس کا

نمبر ۸ ملکہ کشور کی مجلس میں میر صاحب و مرزا صاحب کا پڑھنا

یہاں نام آگیا ہے۔ تو اور اُن بعض مضامین کی تنقید بھی میں کر دوں۔ جو میر صاحب کے متعلق واقعات انیس میں آگئے ہیں۔ (۲) صفحہ ۸۰ تا ۸۲ پر لکھا ہے (کہ جس کا خلاصہ یہ ہے)۔ (۱) کہ مرزا صاحب ملکہ کشور والدہ واجد علی شاہ مرحوم کی مجلس میں پڑھنے کو قبائے درباری پر عمامہ باندھے ہوئے گئے۔ اور میر صاحب سادہ لباس سے گئے۔ (۲) اوّل مرزا صاحب نے منبر پر جا کر حسب تقتضائے وقت بادشاہ اودھ کی مدح میں کچھ نظم پڑھی۔ شاہ ممدوح سُن رہے تھے۔ (۳) پھر میر صاحب نے منبر پر جا کر یہ سلام میر مونس کا پڑھا ؎

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر + مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

(۴) یہ کہ میر انیس مرحوم نے لکھا ہے نظم خاندان رسالت کے مقدس مزاروں پر چڑھائے ہیں۔ دولتمندوں کے دربار میں اُن کی نظموں کے گلدستے آرائش محفل نہیں ہوئے۔ اس تمام صغرے وکبرے کو آپ ملا دیگا۔ تو یہ نتیجہ نکلیگا۔ کہ مرزا صاحب لباس درباری سے گئے۔ اور میر صاحب اپنی معمولی پوشاک سے گئے۔ اور اُن کی نظم کے گلدستہ بادشاہ اودھ کی محفل کی زینت ہوئے۔ (برخلاف میر صاحب کے)۔ اور از بسکہ میر صاحب اس قسم کی مدح وثنائے اُمرا کو بُرا سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اُسی دم فوراً بادشاہ ممدوح کی سماعت میں مرزا صاحب پر چوٹ کی۔ کہ ہائیں۔ غیر کی مدح کرتے ہو۔ اپنی ہوا کھوتے ہو۔ ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم سلیمان ہو کر اپنی ہوا نہ کھوئینگے۔ نہ خود ڈوبینگے۔ نہ کمال کو ڈبوئینگے۔ اگر یہ واقعات صحیح ہوتے۔ تو ضرور میر صاحب کے کمال اور مرزا صاحب کے نقص پر دال ہوتے۔ مگر لکھنؤ میں بڑے بڑے آدمیوں سے تحقیق کرنے پر جو ایسی مجلسوں میں بار بار ہوا کرتے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ یہ سب محض غپ (گپ) اور غلط ہے۔ مرزا صاحب مدۃ العمر کبھی کسی [illegible] یا بادشاہ کے یہاں لباس درباری سے نہیں گئے۔ مجلس عزا کا تو کیا ذکر ہے۔ نہ جہاں ہوا آداب مجلس کے اور کسی کا ادب کرنا گویا دو گناہ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی غلط ہے۔ کہ مرزا صاحب ملکہ کشور

مرحومہ کے یہاں پڑھے۔ وہاں ہمیشہ میر صاحب پڑھا کئے۔ مرزا صاحب کبھی اُس مجلس میں نہیں پڑھے۔ جس طرح ملکہ زمانی کے یہاں کبھی میر صاحب نہیں پڑھے۔ (۲) جب ملکہ کشور کے یہاں مرزا صاحب کبھی مجلس ہی میں نہیں پڑھے۔ تو بادشاہ کی مدح میں وہاں [illegible] پڑھنا کیسا۔ (۳) یہ بھی خلاف عقل ہے۔ کہ میر صاحب ایسے متین و مہذب [illegible] صاحب پر بادشاہ کی حضوری میں سر منبر ایسا اعتراض اور طعن کریں۔ حالانکہ خود میر صاحب [illegible] بادشاہ اودھ کی بیگم صاحب کی شان میں اپنے ایک مرثیہ کے مقطع میں [illegible] چکے تھے ؏ نواب مبارک محل و ثانی مریم۔ اگر بادشاہ کی مدح غیر کی مدح ہے۔ تو [illegible] بیگم کی مدح بدرجہ اولے مدح غیر اور غیر مستحسن ہوگی۔ (۴) دولتمندوں کی محفلوں [illegible] میر صاحب کی نظم کے گلدستے ہوئے یا نہیں۔ اس کا جواب خود اسی [illegible] سے نکل آیا ؏ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ صفحہ ۹۷ پر جو پھول میر احسن صاحب کی زبان سے جھڑے تھے (اگرچہ وہ مرزا صاحب کے حق میں کانٹے تھے) اور ہم اُن کو بھی چُننے کو طیار رہتے۔ مگر خود میر احسن صاحب نے صفحہ ۱۲۱ پر پہنچ کر تمام باغیچہ کا سارا رنگ ہی بدل دیا۔ (گویا اُن کی کتاب زبان حال سے کہہ [illegible] آتش

(ہم [illegible] ہے + او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے)

یعنی [illegible] صاحب نے حیدرآباد دکن میں بر سر منبر یہ رباعیاں پڑھیں [illegible] وزیر دکن ہے :-

نظام دکن و وزیر نظام دکن کی مدح زبانی میر انیس صاحب

(رباعی ۱)

اللہ [illegible] کی امداد رہے + سر سبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب [illegible] رئیس اعظم ایسے + یارب آباد حیدرآباد رہے

(رباعی ۲)

علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں + موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں

رحمت ۔ رحمت پہ ۔ نور پر نور ہے یاں + مختار الملک و بندگان عالی

کیا ایک آزاد طبیعت انصاف پسند ان رباعیوں کو سن کر یہ نہیں کہیگا کہ یہ امیروں کے بزم دولت کے گلدستہ نہی پھول تو ہیں پر مثل مشہور ہے ۔ پھول نہیں پنکھڑی سہی ۔ کیا شاہ اودھ کی (میر صاحب جن کی رعایا بھی تھے) مدح غیر کی مدح تھی ۔ اور نظام دکن اور وزیر دکن کی مدح (معاذ اللہ) آل محمدؐ کی ثنا خوانی تھی ۔ اور پھر مدح کے ساتھ دعا بھی ۔ ع

وہ پھول ہے کہ رنگ بھی ہے جس میں اور بو بھی ہے ۔ ناظرین مجھے آپ بھی معاف فرمائیں ۔ اور میر صاحب کی روح سے بھی میں معافی کا خواستگار ہوں ۔ کہ احسن صاحب نے خلاف واقع حالات (مرزا صاحب کی نسبت) لکھے کہ مجھے اتنا کہنے پر مجبور کیا ۔ ورنہ میرے نزدیک جناب میر صاحب کی وضعداری میں کوئی کلام نہیں ۔ نہ میرے اعتقاد میں اُن سے کوئی لغزش ہوئی ۔ بات یہ ہے کہ غیر کی مدح سے مرحوم کی مراد دشمنان اہلبیت کی مدح سے ہے ۔ شاہ اودھ یا نظام دکن یا وزیر دکن اُن کے کلمہ گو اور یا اُمت میں ہیں ۔ یہ تو سب اپنے ہیں ۔ غیر کب ہیں ۔ پس ان کی مدح قابل قدح ہے ۔ نہ ان کے لئے نا سزا کوئی شرم کی بات ہے ۔ جس طرح مصنوعی دستاویز میں کوئی نہ کوئی فقرہ یا لفظ گھبراہٹ میں ایسا درج ہو جاتا ہے کہ جس کو دیکھ کر منصف مزاج حاکم اسکی مصنوعیت کا یقین کر لیتا ہے ۔ اسی طرح بنائی ہوئی بات میں کوئی بات ایسی نکل آتی ہے جس سے اُس کی بناوٹ اور قلعی کھل جاتی ہے ۔ یہ خدا کی شان ہے ۔ یہی انجام اس مصنوعی و فرضی حکایت کا ہوا*۔ مسدس مرثیہ کی نسبت جو واقعات انیس

*مولوی امجد علی صاحب اشہری مرحوم نے بھی یہی حکایت بے اصل لکھدی ہے ۔ مگر ۔۔۔ غالباً میر حسن صاحب کے کسی دوست سے لکھنؤ میں اُنہوں نے سنا ہوگا وہی لکھدیا جس طرح حیات انیس میں ۔۔۔ واقعات غلط ہیں ۔۔۔ کی تردید واقعات انیس میں ہوئی ہے اور بعض کی میں نے اس کتاب میں کی ہے ۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی غلط ہے ۱۲ مؤلف

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق میں چار مصرعی (مربع) مرثیے کہے جاتے تھے۔ میر انیس صاحب نے اس (چہ مصرعی) کو رواج دیا۔ مگر یہ بھی خلاف واقع ہے۔ سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کہا۔ وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں۔ اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے۔ ع [illegible] کسی کا تھا رسول۔ یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انہیں کا تخلص اُڑا کر مرزا سودا نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی۔ جس کا مفصل ذکر آب حیات میں ہے۔ حق بات کہنا فرض ہے۔ حق پوشی فرض وقائع نگاری کے خلاف ہے۔ اس سے شکستہ ہوں کہ دہلی و لکھنؤ والے اپنے مرکز زبان و کمال ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر یہ [illegible] کی شان ہے کہ اکثر باتوں کی درستی اور ایجاد کا سہرا باہر والوں کے سر رہتا ہے۔ ولی دکنی کو دیکھئے۔ جو اردو کی شاعری کے بابا آدم ہیں۔ وہ دکن کے سکندر موجد طرز مسدس مرثیہ پنجاب کے ہیں۔ میر ضمیر مرحوم رزم و سراپا وغیرہ بلکہ مرثیہ موجودہ کی طرز کے موجد ہیں۔ گھوڑا ایک قصبہ کے رہنے والے تھے۔ میر ضمیر اور میر خلیق بلکہ اکثر اہل لکھنؤ کے اُستاد میاں مصحفی امروہہ کے تھے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر یہ لوگ دہلی و لکھنؤ میں نہ آتے۔ تو غالباً ان کو یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ اثر فیض دہلی و لکھنؤ کا ہر بات کے ساتھ ضرور ہے + ایک مسدس مختصر سودا مرحوم کے کلیات میں بھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ع کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی۔ مگر وہ کتاب ہی میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے۔ مگر عام شاعر تھے۔ اور سکندر خاص مرثیہ گو مشہور ہیں۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کے ایجاد کا سہرا ہمارے نزدیک سکندر کے سر ہے۔ یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصروں میں سے

پہلا مسدس مرثیہ سکندر کا

مسدس مرثیہ سودا و مقبولیت مرثیہ سکندر اور دونوں کے مرثیوں میں فرق

✻ میر ضاحک میر حسن کے والد ماجد میر انیس مرحوم کے پردادا ہیں۔ جن پر مرزا صاحب نے ہجو کہی [illegible] غالباً۔ [illegible] قریب قریب اصل ہے۔
کیا تماشا ہے کہ سو برس پہلے کی بات کو سو برس بعد کی ایجاد بتایا جاتا ہے + مؤلف حقیر

اقل کس نے کیا۔ تو سکندر و سودا دونوں کو موجد ماننا چاہئے + (۳۳) صفحہ ۱۴۱ پر میر احسن صاحب نے لکھا ہے (جس کا خلاصہ یہ ہے)۔ کہ "ایک سلام میر صاحب نے پڑھا جس کے شعر مندرجہ تحت کی عالمگیر شہرت ہوئی۔ ؎

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے + چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

اس سلام (میر صاحب) کی زمین مرزا صاحب کو پسند آئی۔ انہوں نے بھی سلام کہا۔ کسی مجلس میں پڑھے سب بے فکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا۔ رشک فن داخل خواص شعرا ہے۔ خصوصاً ایسا شخص جس کی طبیعت تقابل پسند نہ ہو۔ پھر تو دونوں جانب سے طبع آزمائیاں ہوگئیں۔ بلند پروازیوں نے زمین شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ دونوں صاحبوں کے سلام کلیات مطبوعہ میں موجود ہیں۔ پھر اہل لکھنؤ نے اصلاح کی کوشش کی۔ میر صاحب و مرزا صاحب کی طبیعتیں بغض و نفسانیت سے پاک تھیں۔ صفائی ہوگئی" +

اب میں میر احسن صاحب سے کہتا ہوں۔ بقول سحر ؎

چلے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے + کہ ہم اور بھی اک نظر دیکھ لیتے

مہربان! کم سے کم آپ کلیات مطبوعہ دبیر تو ایک نظر دیکھ لیتے۔ دفتر ماتم کی بیسیوں جلدیں بندہ نے چھان ڈالیں۔ یہ سلام نہیں ملا۔ اوسے ملے تو کیونکر۔ مرزا دبیر مرحوم نے کوئی سلام ہی اس زمین میں نہیں فرمایا۔ جھگڑا ہی بھی انیس [illegible] ہوا تھا۔ مگر یہ محض غلط ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم نے جواب میں سلام لکھا تھا۔ اصل واقعہ جہاں تک میرے علم و یاد میں ہے اور جناب شیخ محمد جان صاحب شاد [illegible] بادی نے اپنی کتاب تردید موازنہ (مولوی شبلی صاحب)[1] میں لکھا ہے یہ ہے۔ کہ جناب میر صاحب نے یہ سلام فرمایا تھا۔ ؎

---

[1] یہ کتاب دفتر مشرقی نور مظفرپور میں مصنف مدظلہ نے چھپوائی ہے۔ وہیں سے مل سکتی ہے + ۱۲ مؤلف غفرلہ

[illegible]

سدا ہے فکرِ ترقی مآل بینوں کو + ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس پر اور شعرا نے سلام کہے۔ مرزا اوج صاحب قبلہ نے بھی سلام کہا۔ اُس کے بعد ۲۶ ویں کی مجلس میں جو آغا میر کی ڈیوڑھی پر نواب میر محمد حسین صاحب مرحوم کے یہاں ہوا کرتی تھی۔ میر نواب صاحب مونس مرحوم نے اسی زمین میں ایک سلام نواب ممتاز الدولہ مرحوم (شاہزادہ اودھ) کو مخاطب کر کے پڑھا۔ کہ وہ بھی مجلس میں موجود تھے۔ اُس سلام میں یہ طنزیہ شعر بھی تھا ؎

بھلا تردد بے جا سے اُن میں کیا حاصل + اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

اور شاید یہ شعر بھی تھا ؎

نیا مزہ ہے کہ مضمون تو دستیاب نہیں + مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

نواب ممتاز الدولہ کو جو مرزا صاحب کے شاگرد تھے سخت ملال ہوا۔ اور مجلس میں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر انیسیوں اور دبیریوں میں (تمام شہر میں) شور مچ گیا۔ دبیریوں نے بعض متقدمین کی غزلیں اور شاید ایک دو سلام بھی دکھائے۔ کہ پہلے بھی لوگ اس زمین میں کہہ چکے ہیں۔ مشیر مرحوم بھی زندہ تھے۔ انہوں نے بھی مرزا صاحب کی شاگردی کے جوش میں بہت کچھ کہا۔ چنانچہ یہ ایک شعر اُسی زمانہ کا یاد ہے ؎

مشیر کا دبیر (اپنے اُستاد) کی طرفداری کرنا

اساتذہ کی ہیں غزلیں، سلام بھی اکثر + نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

نظیر برادر دبیر مرحوم نے ایک سلام کے مقطع میں کہا ؎

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیر + کیا نہیں جانتے وہ اہلِ زباں اور بھی ہے

سب سے زیادہ انیسیوں کو اس شعر پر فخر و ناز تھا ؎

میر تقی میر کا شعر

یہ جھریاں نہیں ہاتوں پہ ضعفِ پیری سے + چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

دبیریوں نے میر تقی میر کے دیوان میں یہ شعر دکھا دیا ؎

ہیں ضعف سے جھریاں بدن پر + پیری جامہ کو چن رہی ہے

اور یہ کہنا۔ کہ دیکھئے۔ خدائے سخن میر کس قدر مختصر لفظوں میں ۷۰ برس پہلے اور عمدہ بندش میں کہ گیا ہے کسی صاحب نے مطلع پر اعتراض جمایا۔ کہ دعوے تو یہ فرمایا ہے۔ کہ فکر رسا ہے۔ اور بجائے ترقی کے دُوسرے مصرع میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ع ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو۔ یہ ترقی کا پُورا پُورا ثبوت کب ہُوا۔ یُوں فرماتے۔ تو ترقی ثابت ہوتی۔ ع ملی ہے عرش پہ معراج ان زمینوں کو۔ غرض چندروز کی دبیریوں اور انیسیوں کی بحثوں میں پالی کا لطف آیا۔ اور اسی میں کچھ علم و ادب کی معلومات بھی بڑھتی رہتی تھی۔ مشیر مرحوم نے جو ہجوئیں کی ہیں۔ وہ اشعار مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں ہیں۔ اور مَیں اُن کو اس کتاب میں لکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ ناظرین کتاب میں سے بعض کی دل شکنی ہو۔ (بقول انیس مرحوم) ؎

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم + انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

صفائی المختصر اُدھر میر صاحب میر مونس مرحوم پر اور ادھر مرزا صاحب مشیر مغفور پر بہت خفا ہُوئے اور ملیر مونس مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کی حضوری میں آکر عذر خواہ ہُوئے۔ اور وہ گرد کدورت دلوں سے دھو گئی۔ واقعی طبیعتیں میر صاحب اور مرزا صاحب کی (بقول احسن صاحب) بغض و حسد سے پاک تھیں۔ اور زیادہ صفائی اور آئینہ قلب پر جلا ہو گئی +

(۴) صفحہ ۱۱۲ سے صفحہ ۱۱۴ تک میر احسن صاحب نے نواب مبارک محل کے للغہ ماہوار وثیقہ کا جو میر انیس مرحوم کو ملتا تھا ذکر لکھا ہے۔ کہ متولی صاحب نے پہلے مجلس کا ذکر نہ کیا۔ عین وقت پر جب مجلس جمع تھی۔ سواری بھیجی۔ تو میر صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ اُنھوں نے وثیقہ بند کر دیا۔ میر صاحب نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ جب متولی صاحب نے مدت کے بعد معافی مانگی۔ تو میر صاحب نے فرمایا۔ وہ وثیقہ چڑھا ہُوا بھیج دیں۔ اس کو اُنھوں نے منظور نہ کیا۔ میر صاحب کے بعد اُن کے جانشین میر نفیس مرحوم

نے بھی یہی جواب دیا۔ آخر کچھ نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کو مشرح لکھکر تحریر کیا ہے۔
کہ "البتہ مرزا محمد جعفر صاحب اوج نے اپنے والد کے بعد اپنے موروثی متوفی امام باڑہ میر باقر سوداگر سے جو کچھ حصے تھے بچارہ جوئی عدالت وصول کر لئے اور استحقاق دکھا دیا"۔

جس طرح میں نے مختصر کر کے واقعات انیس سے یہ حال لکھا ہے۔ اُسی طرح ردّ واقعات انیس مؤلفہ جناب سردار مرزا صاحب سلمہ اللہ سے واقعہ مختصر لکھتا ہُوں (کہ واقعات انیس و ردّ واقعات انیس ایک ہی مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپی ہیں اور طالب مشتاق کو مل سکتی ہیں) وُہی حکیم بندہ مہدی صاحب متولی نجف و وثیقہ نواب مبارک محل میر صاحب اور مرزا صاحب کے انتقال کے بعد نواب مصطفٰے حسین خاں صاحب کے ساتھ جناب اوج مدظلہ کی خدمت میں ایک مخمس کہکر لائے۔ شیرینی رکھی گئی شاگرد ہوئے۔ شیرینی شاگردوں اور دوستوں میں بٹی۔ پھر اُنھوں نے اپنے امام باڑہ میں مجلس کی۔ پہلے خود وہی مخمس پڑھا۔ پھر مرزا اوج صاحب قبلہ کو پڑھوایا۔ بعد مجلس کچھ نذر کرنا چاہا۔ تو مرزا صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ میں نے حالی کے روسائے لکھنؤ سے کچھ لینا اپنے نفس پر حرام کر لیا ہے۔ چنانچہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والئے محمود آباد کے عرسلہ دو شالوں کا اور امیر محل مرحومہ کے پیشکش کا پھیر دینا بیان کر دیا۔ حکیم صاحب اُس وقت چُپ ہو گئے۔ پھر چند روز بعد یہ ذکر نکالا۔ کہ میں چاہتا ہُوں۔ کہ نجف کی تنخواہ (وہی للعہ ماہوار جو میر انیس مرحوم کو ملتے تھے) آپ کے نام جاری کی جائے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ میں آپ کے شاگرد ہونیکا مطلب پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس تنخواہ میں سے ایک حبہ لینا میں اپنے نفس پر حرام سمجھتا ہُوں۔ اُنھوں نے فرمایا۔ کہ آپ کے صاحبزادے کے نام پر وہ تنخواہ جاری ہو جائے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ جب تک میں زندہ ہُوں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میرے

حکیم بندہ مہدی صاحب متولی وثیقہ نجف کا شاگرد جناب اوج ہونا

مرزا اوج صاحب کی وضعداری

جناب مرزا اوج مظلہ نے کیا۔ (یعنی سکوت)۔ اور یہاں وقعت حسینیہ میر یا قتدا مرحوم میں یہی روش اختیار کرنا مناسب تھا۔ جو مرزا اوج صاحب نے فرمائی۔ اور اس وقعت میں متولی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کی اولاد کو موقوف کر دے۔ بظاہر یہ ذکر اس کتاب سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ مگر احسن صاحب نے واقعات انیس میں اس کی چھیڑ کی۔ میں نے اصلیت دکھا دی۔ تاکہ ناظرین ناواقف نہ رہیں۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست + وگر خاموش بنشینم گناہ ست

(۵) واقعات انیس کے صفحہ ۵۶ پر لکھا ہے۔ کہ "میر انیس (مرحوم) کی شاعری نے جب لکھنؤ میں نشو و نما کیا۔ تو اُس وقت ناسخ مرحوم کی شاعری کا آفتاب نصف النہار ترقی پر تھا۔ مرزا دبیر مرحوم مضمون آفرینیوں میں امام وقت کی تقلید کر رہے تھے۔ انداز مقبول سے طبیعتیں مانوس ہو رہی تھیں۔ اور زمانے کی نظریں اسی رنگ میں لوٹی ہوئی تھیں۔ ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا + طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس کے بعد یہ بیان کیا ہے۔ کہ میر صاحب کا رنگ خاص اور اُس سے الگ تھا۔ اب میں کہتا ہوں۔ کہ نہ میں میر صاحب کے کمالات کا منکر ہوں۔ نہ اُن کی تردید کرنا چاہتا ہوں ہاں اتنا عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کا کلام مختلف رنگوں میں ہے۔ اور اُن کا یہ دعوےٰ ہے ع ہر طرز میں جو خوب کہے خوب ہے وہ۔ بالکل بجا ہے۔ اس لئے مرزا صاحب کو نہ کوئی ناسخ مرحوم کا مقلد کہہ سکتا ہے نہ آتش مغفور کا۔ اُن کی ابتدائی شاعری کا زمانہ میر تقی مرحوم کے پانچ سات برس بعد کا ہے۔ اور عروج کا وہی زمانہ ہے۔ جو ناسخ مرحوم کی شہرت کا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر مفصل لکھ چکا ہوں۔ اور مرزا صاحب خود مجتہد ہیں۔ دوسرے اُن کے مقلد ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

دزدان مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید

تو مجتہد نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

میر انیس صاحب کی شہرت کا زمانہ اور رعایت لفظی کی گرم بازاری

جب مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا٭ اُس زمانہ میں بات میں سے بات نکالنے کو اصل شاعری سمجھا جاتا تھا۔ کوری رعایت لفظی پر لوگ تعریفوں کے پُل نہیں باندھ دیتے تھے۔ بقول شخصے ع دریا کے ساتھ جب مگر آیا اُچھل پڑے۔ البتہ بقول میر احسن صاحب جناب میر انیس مرحوم کی شہرت اور لکھنؤ میں آنے کا زمانہ عہد امجد علی شاہ مرحوم ہے۔ جو ۱۲۵۸ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ (ناسخ مرحوم ۱۲۵۴ھ میں راہی جنت ہو چکے تھے)۔ اور اُس زمانہ میں لکھنؤ میں عموماً اور شاگردانِ شیخ ناسخ میں خصوصاً صنعت مراعات النظیر (رعایت لفظی) کا بڑا زور شور تھا۔ اور کانوں میں یہ صدائیں گونج رہی تھیں:۔

(۱) مرغِ دل کو تو رنگی تلی اگر دروازے کی۔ رخصت نن کو کتر یگا جو ہا تمہاری ناک کا۔

(۲) بیر لیوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں۔

(۳) مہندی نے شعلہ پاؤں تمہارا بنا دیا۔ کیا گرم ہے کہ لوٹ کو ہولا بنا دیا۔

(۴) عید بھی وصل سے چلی خالی۔ کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں۔

(۵) ساون میں بھی وعدہ کبھی پورا نہیں کرتے۔ باتوں میں جھلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔

(۶) بھیڑئیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر۔

بعض شعرا نے اس رعایت لفظی کا پردہ ایسا باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کی طرح چھن کر ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئی تھی۔ مرزا صاحب مرحوم اُس آندھی میں بھی اپنے رنگ پر قائم رہے۔ مگر جناب میر ببر علی انیس مرحوم نے ان معاصرین مجتہدین نظم میں سے غالباً کسی کی تقلید پر کمر باندھی۔ اور رعایت لفظی کی صنعت کو اس طرح برتا:۔

٭ یعنی سنہ ۱۲۳۰ھ میں یا اُس کے قریب قریب مرزا صاحب کی شاعری شروع ہوئی۔ اور ۱۲۲۵ھ میں ۵ برس پہلے میر تقی میر انتقال فرما چکے تھے۔ شاہ مصحفی کا بازار شاعری گرم تھا۔ اور میر کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱) مُنہ پہ کہتا ہُوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا۔

(۲) فال ٹریم دیکھا تو گھر خالقہ لگ جائیگا۔

(۳) کہیں کوثر کے تو چھنٹوں میں نہیں آیا ہے۔

(۴) جو لیں ہوئیں ڈھیلی درخیبر کی ہمیں سے۔

طرفداران جناب میر صاحب مجھے معاف فرمائیں۔ مَیں مضمون آفرینی کی طرح رعایت لفظی کو بھی قابل مدح سمجھتا ہُوں۔ مگرع ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے۔ میر احسن صاحب کے مُنہ سے میرے ممدوح کے حق میں جو پھول جھڑے تھے۔ اُسی مصالحہ سے یہ پھُل جھڑی طیار ہوگئی۔ جس کا تماشا آپ دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ مَیں میر صاحب مرحوم کو اُن کے رنگ میں کامل سمجھتا ہُوں۔ اور رعایت لفظی کو بھی ایک صنعت (فی حدہ) سمجھتا ہُوں۔ اور اُبھری ہُوئی رعایت نہ ہو۔ تو کلام میں مزہ آجاتا ہے۔ اور جن لوگوں سے مثل میرے ایسا رنگین کلام نہیں نظم ہوسکتا۔ اُن کا اور اپنا قصور طبیعت سمجھتا ہوں۔ اور تو کیا کہوں ٭

(۶) صفحہ ۹۱ پر جناب غالب مرحوم کا ذکر خیر کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ "اُنھوں نے تین بند مرثیہ کے کہکر میر صاحب (انیس مرحوم) کے پاس اصلاح کو روانہ کئے اور اُس کے ساتھ لکھا کہ اِمتثالِ امر سے مجبور تھا۔ مرثیہ کا ہے کو ہے۔ داسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ یہ آپ ہی کا کام ہے"۔ مَیں اس کی تنقید اس موقع پر اس لئے نہیں کرتا۔ کہ ایک دُوسرے مقام پر مَیں نے تذکرہ جلوۂ خضر و سرو رسیاض سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ مرزا غالبؔ مرحوم مرثیہ گوئی کو فقط دبیر کا حق فرمایا کرتے تھے۔ اور عود ہندی کے ایک رقعہ سے وہ اعتراضات بھی لکھ دئے ہیں۔ جو غالب مرحوم نے میر صاحب کے اس بیت پر کئے ہیں ؎

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا ٭ برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

تنقید سبب / ثمات زہیمی

نہیں ... / بسبب

(اور پھر اپنی سمجھ کے موافق میر صاحب کی طرف سے جواب بھی دے دئے ہیں) جس سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں۔ کہ غالب شاگرد تھے یا معترض تھے ۔

حقیقت تعلقات انیس و دبیر با خاندان میر احسن صاحب

میر مہدی حسن صاحب احسن کے کلام کی جو تنقید دل کھول کر میں نے کی ہے۔ اس کا حق مجھے یوں حاصل ہوا۔ کہ اُن کے بزرگ محض طرفداران میر صاحب نہیں ہیں۔ بلکہ مرزا صاحب سے بھی اُن کا ویسا ہی تعلق ہے۔ جیسا کہ خود انھوں نے واقعات انیس کے صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر فخریہ لکھا ہے۔ کہ والد ماجد ہر مہینے کی سولھویں تاریخ مجلس کیا کرتے تھے۔ اُس میں عجیب قسم کا متضاد مجمع ہوا کرتا تھا۔ وہ نظارہ دیکھنے کو لوگ مشتاق ہو کر آتے تھے۔ یعنی میر انیس و مرزا دبیر و میر عشق مرحومین مع اپنے خاندانی ممبروں کے تشریف لاتے تھے۔ اور راقم کے بزرگوں کے تعلقات ان سب بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے تھے۔ اب مجھ سے سنئے۔ وہ تعلقات کیا تھے۔ احسن صاحب کے والد مرحوم تو خالص میر انیس مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔ اور اُن کے حقیقی نانا سید آغا حسن صاحب امانت مغفور غزل میں میر وزیر علی صاحب صبا مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور مرثیوں پر اُنھوں نے اصلاح میر صاحب و مرزا صاحب و آغا صاحب (میر عشق صاحب مرحوم) سے الگ الگ لی تھی۔ اور کمال یہ کہ ہر ایک اُستاد سے اجازت لیکر ایک کے بعد دوسرے کو مرثیہ دکھائے تھے۔ کچھ مرثئے میر صاحب کو دکھائے۔ پھر اُن سے اجازت مانگی کہ حکم ہو۔ تو کچھ اور مرثئے مرزا صاحب کو بھی دکھلاؤں۔ اور اس نیک نفس پاک طینت نے نہایت خوشی سے اجازت بھی دے دی تھی۔ یہ وجہ تھی جو سب خاندانوں کے سرگروہ و ممبر تشریف لاتے تھے۔ اور سُنا ہے۔ کہ وہ مرثئے میر احسن صاحب کے والد مرحوم پڑھتے تھے۔ اور صاف کہ دیتے تھے۔ کہ یہ مرثیہ میر صاحب کا یہ مرزا صاحب کا یہ آغا صاحب کا اصلاحی ہے۔ لکھنؤ میں یہ روایت مجھ سے بڑے بڑے معتبر آدمیوں نے بیان کی۔ اور جناب مرزا اوج قبلہ مدظلہ

و میر حسین جان صاحب ساکن محمود نگر نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اور میر آغا حسن صاحب انس مرحوم کے حقیقی بڑے بھائی میر آغا حیدر صاحب مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد رشید اور ہم آواز بھی تھے۔ تمام ملک میں ایک وہی بزرگوار تھے۔ جو مرزا صاحب کا طرز پڑھتے تھے۔ جیسا اُوپر ذکر ہوا۔ اور آواز زبان حال سے تصدیق کرتی تھی۔ کہ بیشک مرزا صاحب کا یہ اصلی طرز ہے۔ جو تیسرا نہیں پڑھ سکتا۔ اور آغا حسن صاحب مرحوم کے خسر حکیم نواب مرزا صاحب شوق مرحوم (جو زبان کے لحاظ سے قابل رشک شاعر تھے) بھی مرزا صاحب کے گہرے دوست تھے۔ کبھی کبھی رات کے جلسہ میں مرزا صاحب کے یہاں آتے تھے۔ اور مرزا صاحب کے کمالات کے دل سے مدّاح تھے پس ان حقوق و تعلقات کی بنا پر مَیں میر احسن صاحب سے دوستانہ کہتا ہُوں۔ کہ احسن کما احسن اللہ الیک الآیہ[+]۔ اور اس کتاب میں شکایت کبھی کہیں ہے تو دوستانہ ہے ؎

بے محبت نہیں آے ذوق شکایت کے مزے + بے شکایت نہیں آے ذوق محبّت کے مزے

اب مَیں مختصر حال وفات جناب مرزا صاحب مرحوم کا لکھتا

ہُوں۔ میر انیس مرحوم کے مرنے کے بعد مرزا صاحب مرحوم تین مہینے اور ایک دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے رئیسہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرہ محرم میں ہر روز مجلس جناب اوج مدظلہ پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے۔ کہ علیل تھے۔ کچھ سادات و مومنین دُور دُور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ محرم کی مجلسوں کو چھوڑ کر محض مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخری نویں محرم کو بعض مومنین نے مرزا صاحب مرحوم سے افسوس کے لہجہ میں عرض کیا۔ کہ ہم حضور کے

فصل ۱۰ حال انتقال دبیر مرحوم

نویں محرم ۱۲۹۲ھ کی آخری مجلس عظیم آباد میں بہ ضد

[+] یعنی نیکی کر جیسے خدا نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے۔ کہ لئے یہ کس شناس سخن فہم سخن سنج خاندان میں تمکو خدا نے پیدا کیا۔ لہٰذا آئندہ ایڈیشن میں اقوامات مذکورہ میں کچھ حالات کی اصلاح کردو۔ بشرطیکہ مناسب ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سُننے کو آتے تھے۔ اپنے گھر کی مجلسیں بھی چھوڑیں۔ اور حضور کو سُنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ حضور علیل ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ انشاءاللہ آج میں پڑھونگا۔ جتنا پڑھا جائیگا خدا جانے پھر عشرۂ محرم نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیاں پڑھ کر چند بند بین کے پڑھے۔ اللہ اللہ مرزا صاحب مرحوم کا بے تصنع حضورِ قلب سے پڑھنا۔ ایسی رقت ہوئی۔ کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔ مرزا صاحب منبر پر رو دیا کئے۔ طاقت خود سے اُترنے کی نہ تھی۔ بڑی دیر کے بعد جب جوش رقت کم ہُوا۔ لوگوں نے منبر سے اُتارا۔ بعد سویم ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ کے ایک ایک دو دو روز راستہ میں بمقام آرہ و حسین گنج مقام کرتے ہُوئے لکھنؤ میں تشریف لائے۔* ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا۔ مگر مرض الموت کا کیا علاج۔ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر اُسی عارضہ ورم کبد میں ۳۰ (تیسویں) ماہ محرم کی رات میں قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری و مدّاحی غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون +

دن میں جنازہ اُٹھا۔ دریا پر غسل میت کے واسطے جنازہ کو لے گئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ علما و صلحا و شعرا تھے۔ اور اکثر اُن مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے ہُوئے روتے پیٹتے چلے جاتے تھے :۔

رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہُوں + مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل + تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

* پھر لکھنؤ میں مرزا صاحب نے کوئی مجلس ۱۲۹۲ھ میں نہیں پڑھی۔ آخری مجلس وہی ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ کو پڑھے تھے۔ جس میں حقیر شریک تھا۔ اور یہ مرثیہ پڑھے تھے ع انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباسؑ۔ مرثیہ نا تمام تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے آپ ساکت ہوئے۔ لوگوں نے عرض کی حضور کچھ اور عنایت ہو۔ تو مرثیہ کا آخری سادہ ورق دکھا کر فرمایا۔ کہ بس اتنا ہی کہا ہے۔ افسوس اس کے بعد ہوائے زمانہ نے وہ ورق ہی اُلٹ دیا۔ وہ نقشہ ہی مٹا دیا۔ ہمیشہ ہے نام اللہ کا نقش حقیر

جناب سید ابراہیم صاحب اعلی اللہ مقامہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے ... دفن ہوئے۔ جو مقبرہ چھوٹا سا اب تک برقرار ہے ؎

انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں ✦ سرتاج فصیحان زمانہ اٹھا

اُن کی موت کا صرف شیعوں کو نہیں۔ بلکہ سُنّیوں اور ہندوؤں کو بھی صدمۂ عظیم ہوا ہزاروں شاعروں نے تاریخیں کہیں ان میں سے منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم کی تاریخیں جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ اکثر لاجواب ہیں۔ یہ مرحوم بھی مرزا صاحب کے ارشد تلامذہ سے تھے٭

مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی نے (جو فرقۂ احناف کے ایک مشہور و مستند عالم و شاعر تھے) بھی لاجواب تاریخ فرمائی تھی جس میں سے ایک شعر یاد ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

چوں نداشت ذوق ذکر شہیدان کربلا ✦ سلخ محرم آمدہ روز وصال او

مرزا صاحب کے سویم کی مجلس میں جو میری یاد و علم میں میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقع لکھنؤ چوک میں ہوئی تھی بہت بڑا مجمع تھا۔ میں اُس زمانہ میں مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں پڑھتا تھا۔ اُس روز مدرسہ میں اسی تقریب سویم کے سبب سے تعطیل ہو گئی تھی جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ نے عین انتشار و کمال رنج میں حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہکر پڑھا تھا:۔

قطعۂ تاریخ وصال دبیر مرحوم

خاک بر سر کن صبا۔ در ماتم سلطان نظم	حیف شد برباد اقلیم بلاغت بے دبیر
بلکہ اندر بوستاں ہر نخل نخل ماتم ست	در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر

٭ منیر مرحوم ... وقت تاریخ ... ہے جس ... وقت و تاریخ ... سال ۱۲۹۲ھ ... ہے۔ ... منیر مرحوم ... کمال کیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

تیست ایں بستم الله دیبا پہ معنی و لفظ — ہست اکنوں با حراجت حلاوت بے دبیر

خو نہ کن طالب دیدار را شام و سحر — اندریں فرقت سرائے یک لحظہ راحت بے دبیر

نے دل رنجور را آرام بے وصل حبیب — نے مذاق زندگانی را حلاوت بے دبیر

مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت

۱۲ ۹۲

آسماں بے مہر و دیہیم فصاحت بے دبیر

تمام ہندوستان میں دبیر و انیس آفتاب و ماہتاب کہلاتے تھے کبھی اُن کو آفتاب کہتے تھے کبھی ماہ اُن کو۔ جناب سید حسین مرزا صاحب عشق مرحوم نے ایک رباعی اُسی زمانے میں فرمائی تھی۔ جو حسب ذیل ہے:۔

رباعی آغا عشق مرحوم

ہے نظم کے جوہر کا خزینہ خالی ✦ گویا جگر و دل سے ہے سینہ خالی

اے عشق نہیں ہیں جو انیس اور دبیر ✦ ہے شمس و قمر سے یہ مہینہ خالی

حقیر ثابت نے بھی تاریخ کہی تھی جس میں سے فقط دو مصرع آخر کے عرض کرتا ہوں ہر مصرع میں سے سال وفات نکلتے ہیں۔ ؎

۱۲ ۹۲

آسماں بے ماہ تاباں سدرہ بے رُوح الامیں

۱۲ ۹۲

طور بے موسے۔ ادب بے شمع۔ منبر بے دبیر

اس موقع پر انصاف کا خون ہوگا۔ اگر میں یہ ذکر نہ کروں۔ کہ فخر خاقانی و قاآنی جناب سید احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم نے جو قطعہ تاریخ وفات مرزا صاحب فرمایا ہے۔ وہ (۱۰۷) شعر کا ہے۔ اور ہر شعر لاجواب ہے۔ اس کے بعض شعروں میں اُس بشارت کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جو انکو

مو مرزا صاحب مرحوم کا مصرع تھا ع آسمان بماہ کامل سدرہ بے رُوح الامین۔ میں نے کامل کی جگہ تاباں کہکر سنہ ۱۲۹۲ھ نکال لئے یہ بھی انیس مرحوم کی رُوح اور استاد کا فیض ہے۔ کہ گویا انیس کے مصرع میں سے ایک لفظ کی تبدیل سے تاریخ بے کم و کاست بے تکلف نکل آئی ۱۲ مؤلف حقیر۔

حسب مذکورہ تھی۔ اور مرزا صاحب مرحوم اپنے امثال فیاضیوں کی دو یادگار چھوڑ گئے تھے۔ ایک اپنے نور نظر لخت جگر مرزا اوج صاحب (مد ظلہ) کو دوسرے کثیر قرضہ کو۔ بعد مرزا صاحب مرحوم کے بعض منتظمان حسین آباد نے ایسی شرائط پیش کیں۔ جن کی تعمیل کرنا جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے خلاف اخلاق و انسانیت و وضعداری سمجھا۔ یعنی سب سے بڑھ کر یہ شرط تھی۔ کہ عشرہ محرم میں لکھنؤ سے باہر نہ جایا کریں۔ {کیونکہ پہلی شرط کو کہ درباری کلاہ سے مرزا اوج صاحب اگر پڑھا کریں (مرزا صاحب موصوف کے اس فقرہ پر کہ میرے والد مرحوم نے اور میں نے کبھی ایسا نہیں کیا) واپس لینے پر اکثر متولی طیار تھے} لکھنؤ سے عشرہ محرم میں باہر نہ جانے کی شرط کو مرزا اوج صاحب نے اس خلاف وضعداری سمجھا۔ کہ جناب (دبیر) مرحوم وصیت فرما گئے تھے۔ کہ پٹنہ عظیم آباد کا جانا تم خود نہ چھوڑنا۔ اور یہی وعدہ خود انہوں نے سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ مرحومہ سے فرمایا تھا۔ کہ تاحیات میں آؤنگا۔ اور میرے بعد میری اولاد انشاء اللہ حاضر ہوگی۔ اُس وقت وصیت کے موافق حسین آباد کے وثیقہ کو مرزا اوج صاحب نے چھوڑ دیا۔ اور پٹنہ عظیم آباد عشرہ محرم میں ہمیشہ جاتے رہے۔ اور جاتے ہیں۔ جناب نواب سید عباس صاحب سعید دام اقبالہ رئیس عظیم آباد جو سیدہ ممدوحہ کے جانشین اور ذی علم نواسے اور مرزا اوج صاحب قبلہ کے شاگرد رشید اور قدرشناس ہیں۔ ویسی ہی عزت و قدر کرتے ہیں +

پس قرضہ کی کثرت اور آمدنی کی قلت کی وجہ سے یہ مقبرہ ایک چھوٹا سا مکان تھا اور ہے* مرزا صاحب مرحوم کے فدائیوں میں داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم اور

* پہلے خام تھا۔ اب پختہ ہے۔ مگر بہت مختصر ہے۔ اور اس میں بھی جناب مرزا صاحب مرحوم کے اعزہ میں سے بعض صاحب مدفون ہیں۔ بعض وقت بعض معتقدین آتے ہیں اور مقبرہ میں فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر پردہ نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بعض صاحب مجھ سے اس کا افسوس فرماتے تھے۔ اور میں خود بھی اسی سبب سے اکثر قبر پر فاتحہ خوانی سے محروم رہا ہوں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب اور نواب آغا علی خاں عرف آغائی و ناظم صاحب تھے۔ ان لوگوں نے مرزا اوج صاحب سے بار بار خواہش کی۔ کہ ہم پختہ مکان عالیشان مقبرہ کا بنوا دیں۔ مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ اور یہی عذر فرمایا۔ کہ وصیت جناب مرحوم کے موافق جب کبھی جس حیثیت سے بنواؤنگا۔ میں بنواؤنگا۔ ایک خواجہ سرائے شاہی بڑے مالدار میاں فیروز الدولہ ساکن گولہ گنج لکھنؤ تھے*۔ انہوں نے ایک روز زبردستی ایک ہزار روپیہ کا توڑہ مرزا اوج صاحب کی پینس میں (جبکہ مرزا اوج صاحب اُن کے یہاں کسی تقریب سے گئے تھے) رکھ دیا۔ اور یہاں تک مصر ہوئے۔ کہ اگر آپ یہ روپیہ لیکر مقبرہ نہ بنوائینگے۔ تو میں اپنا خون کرلونگا۔ مرزا اوج صاحب اُس وقت وہ توڑہ لے آئے۔ مگر پھر دو تین روز کے بعد جب سمجھ لیا۔ کہ اُن کا غصہ دھیما پڑ گیا ہوگا وہ توڑہ مع معذرت نامہ کے اُن کے پاس بھیج دیا۔ اور لکھ دیا۔ کہ وصیت جناب مرحوم مانع ہے +

یادگار انیس و اوج میں

یہ حکایت میں نے اس غرض سے لکھی ہے۔ کہ مولوی اشہری صاحب نے اپنی کتاب حیات انیس میں رؤسائے لکھنؤ وغیرہ کو میر صاحب کی یادگار قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جس سے غالباً مراد کسی عالی شان عمارت کی معلوم ہوتی ہے۔ اور عمارت یادگار سب سے بہتر مقبرہ ہے۔ کہ اور بھی صاحبوں کو اس کا افسوس ہے۔ مگر اُن لوگوں کو معلوم نہیں۔ کہ ان باکمال غیرت مندوں کے وارث بھی ویسے ہی صاحب غیرت ہیں۔ کہ اس قسم کی اعانتوں کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں۔ ورنہ اب تک نہ معلوم کس شان و شوکت کے ان کے مقبرے طیار ہو جاتے۔ ہر چند صاحب مزار کو اس کی حاجت نہیں۔ وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے ہیں بقول سحر ؎

* ان کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں ماہانہ مجلس پڑھا کرتے تھے۔ یہ مرزا صاحب کے معتقد تھے۔ اوپر مفصل ذکر ان کے یہاں کی مجلس کا ہو چکا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے　+　یہ سب کچھ ہؤا ہم اکیلے رہے ٭

اُن کے کمال کی یادگار اُن کے مختلف کلام ہیں - جو دلوں پر اپنی یادگار قائم کئے ہوئے ہیں - اور جن کے سکّہ اہلِ زبان کی زبانوں پڑے ہوئے ہیں - (بقول مؤلف) ؎

زبانوں پہ لفظ اور دلوں پر ہو سکّہ　+　یہ لطفِ زباں ہے یہ حسنِ بیاں ہے

فصل ۱ رنگارنگ کلام و ترقی سخن کی مثالیں

باب ہفتم - مرزا صاحب مرحوم کی ترقی سخن کی مثالیں اور رنگا رنگ کلام کا بیان

حقیر کے نزدیک اچھے کلام کی تین قسمیں ہیں :-

(۱) مزہ دار سادہ - وہ کلام جس میں سادگی کے ساتھ مزہ ہو - سادگی کے ساتھ مزہ کی قید اس لئے میں نے لگا دی ہے کہ ایسا کلام نہ ہو - جیسا یہ مشہور شعر ہے ؎

دنداں تو جملہ در دہانند　+　چشماں تو زیر ابروانند

(۲) مؤثر - وہ کلام جس کو سُن کر اثر پیدا ہو - خواہ طبیعت میں خوشی کا بیان سُن کر خوشی کا کچھ اثر ہو - خواہ غم کا حال سُن کر دل کچھ محزون ہو +

(۳) درد انگیز یا مسرت خیز - جس کو سُن کر آدمی مارے غم کے بے چین یا خوشی کے

٭ اس موقع پر میرے کرم فرماؤں اور علم دوست احباب نے مجھ سے بحث کی اور فرمایا کہ اس زمانہ کی رفتار کے موافق سید مرزا کی یادگار مقبرہ عالیشان یا اور کوئی چیز محض اہل لکھنؤ کو نہیں بلکہ تمام ممالک متحدہ کے روشن خیال اہل علم کو بنانا لازم و واجب ہے - خود ان کے وارث راضی ہوں یا نہ ہوں - ورنہ ہم لوگوں کی جہالت و ناقدردانی اہل کمال پائی جاتی ہے جو قابل افسوس ہے - اسی طرح مرزا غالب مرحوم کا مقبرہ یادگار قائم ہونے کی تحریک علم دوست روشن خیال مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے چند نگر زیلی جلسوں میں فرمائی - اور کچھ تھوڑا سا چندہ بھی بعض لوگوں نے کیا - مگر سرانجام نہ ہوا - ہمارے ناقدردانی اہل کمال پر واقعی افسوس ہے ؎ کریماں را بدست اندر درم نیست　خداوندان دولت را کرم نیست + ۱۲ مؤلف حقیر

سب جانتے ہیں ہو جائے۔ اسی طرح الفاظ کی تین قسمیں ہیں۔ دلگداز۔ دلچسپ۔ دلکش۔ کلام کے درست ہیں یہ شرط ہے۔ کہ سننے والا بھی صحیح مذاق سخن رکھتا ہو۔ دل رکھتا ہو۔ محض منجمد خون کا قطرہ پہلو میں نہ ہو۔ ورنہ جس کو مذاق صحیح حاصل نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک گھاس کچی تو لہلہا کسی تو سب برابر ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ جن لوگوں کے دلوں میں مثل ابولہب و ابوجہل وغیرہ کے مادۂ قبولیت نہیں تھا۔ اُن پر کلام خدا (قرآن مجید) کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔* دلکش یا دردانگیز کلام کی نسبت کسی شخص کا یہ شعر مشہور ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعار این قوم + ورائے شاعری چیزے دگر ہست

یہی چیز دیگر کہیں زبان کی شیرینی کہلاتی ہے۔ کہیں طرز بیان کی خوبی کا خطاب پاتی ہے کبھی اس کو نازک خیالی کہتے ہیں۔ کبھی سین دکھلانے اور تصویر کھینچ دینے سے تعبیر کرتے ہیں۔

مرثیہ اردو میں زمانہ کیا چیز ہے۔ اُس کی مختصر تعریف یہ ہے۔ کہ تمام اقسام سخن غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ناول۔ ڈرامہ۔ حکایت و روایت واقعی جس نظم میں جمع ہیں۔ اب اُس کا نام مرثیہ ہے۔ اور وہ زیادہ تر شہدائے کربلا کے حال میں کہا جاتا ہے۔ مرثیہ کے حصے مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ جن کو مرثیہ گویوں کی اصطلاح میں (۱) چہرہ (۲) رخصت (۳) سراپا (۴) آمد (۵) رجز (۶) لڑائی (۷) بیان شہادت یا بین کہتے ہیں۔

(۱) مرزا صاحب مرحوم چہرہ بہت شاندار کہتے ہیں۔ اور مطلع ہر مرثیہ کا نہایت پھڑکتا ہوا ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کا اور بالخصوص مولوی احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ مرزا صاحب سے بڑھ کر مطلع مرثیہ کسی مرثیہ گو کا نہیں ہوتا۔ اور اکثر مرثیوں میں نئے انداز کا مطلع کہتے ہیں۔ میں نے جا بجا اس کتاب میں اُن کے مرثیوں کے مطلع لکھے ہیں۔

* ملٹن کا قول مشہور کہ سب سے عمدہ نظم وہ ہے۔ جو سادہ۔ نازک خیال۔ موثر ہو۔ ایک حد تک قابل تسلیم ہے۔ مگر تینوں صفات ایک ہی کلام میں جمع ہونا اور سب کلام کا ایک ہی رتبہ کا ہونا محال ہے جس شاعر کے کلام میں معقول حصہ ایسے عمدہ کلام کا ہے وہ ضرور قابل مدح ہے۔ ورنہ شاعر ہمیں تک بند ہے ۱۲ مؤلف حقیر

مطلع میں براعتِ استہلال

اُن پر غور کرنے سے میرے قول اور اس مشہور مقولہ کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ چہرہ میں شوکت دار دیگر موثر الفاظ لانے سے کلام مرصع ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی مطلع میں صنعت براعت استہلال کا التزام کرتے ہیں۔ کہ اگر صحیح المذاق سامع ہے۔ تو سمجھ لیتا ہے۔ کہ (آئندہ) مرثیہ اس حال میں ہوگا۔ وہ الفاظ جو قصیدہ کے واسطے ہیں اکثر چہرہ میں نظم فرماتے ہیں جس سے سامعین کے دلوں کو ایک حظِ خاص حاصل ہوتا ہے۔ اور دل آئندہ کلام سُننے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ اور تمہید مرثیہ کی بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ پھر جس موقع پر تمہید ختم کر کے وہ رخصت وغیرہ (اصل حال) شروع کرتے ہیں۔ وہاں تمہید کی تشبیب و گریز کا لطف آتا ہے۔

(۲) رخصت

(۲) رخصت کے موقع پر وہ اکثر سادہ مگر مزہ دار دلگداز الفاظ لاتے ہیں۔ اگر (مخدراتِ عصمت میں سے) کسی بی بی کی زبانی کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو اکثر وہی الفاظ وہی محاورے لاتے ہیں۔ جو محلات شاہی میں رائج تھے۔ یا دہلی و لکھنؤ کی شریف زادیاں بولتی تھیں۔ اور اکثر اب بھی اُسی طرح بولتی ہیں۔ رسم و رواج سے بھی اس موقع کو زیادہ تعلق ہے۔ مرزا صاحب کے بزرگ شاہانِ دہلی کے اتالیق تھے۔ اور خود مرزا صاحب کی شاگرد اکثر شاہزادیاں اور محلات شاہی کی باعفت بیبیاں تھیں[1]۔ اس لئے جس قدر عورتوں کے رواجوں سے وہ واقف تھے شاید کوئی دُوسرا شاعر واقف ہوگا۔ اکثر رخصت کے موقع پر اور جا بجا ہندو شیر ہیں اور جناب فاطمہ زہراؑ کے حالات کے مرثیوں میں اُنہوں نے زبانِ محلات شاہی اور شریف عورتوں کے رسم و رواج کی کیفیت جوں کی توں دکھا دی ہے۔ رواج میں کہیں ہندوستان کی عورتوں کا برتاؤ بیان کیا ہے۔ کہیں عرب کا رواج مدِنظر رکھا ہے[2]۔

[1] اور اُن کی والدہ لکھنؤ کے ایک شریف خاندان کی بیٹی اور اُن کی زوجہ میر انشاء اللہ خاں مرحوم کی حقیقی نواسی تھیں۔ عورتوں کے صحیح محاورے اور رواج عورتوں ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[2] اس کی مختصر مثالیں ہم نے اسی جلد اول میں اور بکثرت نظائر جلد ثانی میں پیش کئے ہیں۔ اور جلد ثانی میں ہند کے حالات و زنانہ بیانیہ مرثیوں کا انتخاب کثرت سے اسی خیال سے کیا ہے۔ جو دیکھنے کے قابل ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) سراپا میں اکثر صنائع و بدائع لاتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ مضامین خیالی کو نازک خیالی کے معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا مینہ برساتے ہیں۔ اور ایک خاص امتیاز جو اُن کے مرثیوں میں (اکثر) نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ امام حسینؑ یا اُن کے کسی عزیز یا رفیق کی سراپا میں وہ شان دکھاتے ہیں۔ جو دُنیا کے اعلےٰ تریں یا اشجع آدمی سے بھی بڑھی ہُوئی ہو +

(۴) آمد میں بھی وہی خیال وہی انداز قائم ہے۔ کہ وہ اپنے عقیدہ میں (جس کی گواہی صحیح تاریخ عالم دے رہی ہے) امام حسینؑ کو رُوئے زمین کے بہادروں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ محض بہادر ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اُن کو رُوئے زمین پر خدا اور رسولؐ کا قائم مقام بھی جانتے ہیں۔ جن کے جلال و جبروت کا اثر ہر شے میں ہے۔ آمد رزم کو سُننے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فوج کوفہ و شام کے ہزاروں یا لاکھوں بُزدل آدمی تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور آدمیوں کے دلوں کے اثر سے ہر چیز میں خوف و خطر پیٹھ گیا ہے۔ اور اگر وہ آمد علمدار فوج خدا یا ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ یا قاسم ابن حسنؑ کی ہے۔ تو ان شاہزادوں کی ان کے رتبہ کے موافق شان شجاعت و ہیبت دکھاتے ہیں۔ جو امام حسینؑ سے کم مگر بہادر سے بہادر آدمی سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی ہے۔ اب اس کو نا واقف راز چاہے مبالغہ یا حسن اعتقاد یا ما فوق العادہ یا خلاف قدرت (ان نیچرل) سمجھے یا کہے۔ مگر ہر کلام کا اندازہ متکلم کے خیالات کی بنا پر صحیح المذاق کرتے ہیں۔ آمد کے موقع پر شوکت دار اور ہیبت ناک الفاظ اور چُست بندشیں سامعین کے دلوں پر بہت کچھ اثر کر جاتی ہیں۔ جو باتیں بیان میں نہیں آسکتی ہیں +

(۵) رجز میں عموماً وہ الفاظ لاتے ہیں۔ جو بلاغت کے کانٹے پر تلے ہُوئے ہوں۔ الفاظ فصیح و عالمانہ اور مضامین عالی ہوں۔ اگر امام حسینؑ کا رجز ہے۔ تو اُس میں اس بات کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ کہ اُن کی مصیبت واقعی یا پیاس کا بھی بیان ہو۔ تو کوئی کلمہ زبان قلم سے ایسا نہ نکلے۔ جو منصب امامت کی شان کے شایاں نہ ہو۔ اور شہدائے بنی ہاشم یا بہادر

رفیقوں کے رجز میں اُن کے مرتبۂ عالی کا لحاظ رہتا ہے +

(۶) **لڑائی** کے موقع پر بھی ہیبت ناک الفاظ لاتے ہیں۔ جس سے سامع کو گمان ہوتا ہے۔ کہ میدانِ جنگ سامنے ہے۔ تلواروں کی بجلیاں اور برچھیاں چمک رہی ہیں گُرز اُٹھے ہُوئے ہیں۔ تیر سن سن جا رہے ہیں۔ اگر کسی پہلوان کی لڑائی ہے۔ تو اُس کے قابل الہول ڈیل ڈول اور طاقت کی تصویر نہایت مختصر لفظوں میں کھینچ دیتے ہیں +

(۶) لڑائی

مگر مرزا مرحوم میں یہ بات **خصوصیّت** کے ساتھ دیکھی گئی۔ کہ آمد ہو یا رجز ہو۔ یا سراپا یا رزم ہر موقع پر وہ دو ایک بند یا دو چار مصرع ایسے کر دیتے ہیں۔ جن کو غم انگیز کنایہ اشارے کہتے ہیں۔ اور یہی چیزیں مرثیہ کی جان ہیں۔ کیونکہ مرثیہ وہی ہے۔ جس میں ہر مقام پر مرثیت یعنی بَین کا پہلو قائم رہے۔ اس کی مثال یہ سمجھئے۔ کہ امام حسینؑ سے ایک پہلوان یزید ابطحی {ابطح پتھریلی زمین کو کہتے ہیں۔ شاید وہ یا اُس کے باپ دادا کسی ایسے ہی پتھریلے (کوہستانی) مقام کے باشندے ہونگے} امام حسینؑ سے لڑنے کو آیا ہے۔ وہ اور باتیں رجز وغیرہ کی کہکر اور امام حسینؑ سے جواب سُنکر (کہتا ہے)۔

مثال از قاصی دبیر

یُوں گرمِ سخن نور خدا سے ہُوا ناری — لاریب اجل اب ہے ہماری کہ تمہاری*
یاں فوج ہے سب لاش اُٹھانیکو ہماری — تم بھی کسی یاور کو بُلا لو پئے یاری
جب تیغ مری۔ آپ کی تصویر مٹا دے
لے جا کے تمہیں گنجِ شہیداں میں لٹا دے

قاسمؑ کو بُلا لیجئے؟ عباسؑ علی کو — خیمے سے طلب کیجئے ہمشکل نبیؐ کو
شہ بولے کہ تم لوگوں نے چھوڑا ہے کسی کو — ششما ہے کے بھی غم میں کُڑھایا مرے جی کو
مَیں نے ہی سبھوں کے تنِ صد پاش اُٹھائے
باقی نہیں کوئی۔ جو مری لاش اُٹھائے

* رزم میں مرثیت کا پہلو دیکھئے + ۱۲ مؤلف حقیر

فصل ۴ (۱۵) بَین

(۷) **شہادت وبین** - یہ بات مشہور ہے - کہ مرزا صاحب تمام مرثیہ گویوں سے بہتر شہادت وبَین کہتے ہیں - پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی بہت شرح و بسط سے اس کو دبیر و انیس کے حالات کے اخیر میں بلکہ تمام آبِ حیات کے خاتمہ پر بیان فرمایا ہے - جو آبِ حیات کا دورِ آخر بلکہ جامِ آخر سمجھنا چاہیئے - اور مرثیہ کی جان یہی ہے - اس لئے مَیں اس مقام کو ذرا شرح و بسط سے بیان کرنا چاہتا ہوں - (تاکہ زمانہ حال کے مرثیہ گویوں کے واسطے وہ دستور العمل کا کام دے - کیونکہ آج کل یہ شکایت زبانوں سے ترقی کرکے اخباروں میں چھپ کر عام ہوگئی ہے - کہ آج کل کے مرثیوں میں سب کچھ ہوتا ہے - مگر بَین یا مرثیت نہیں ہوتی) اصل مطلب سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سُن لیجئے - زمانہ حال کی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے - کہ ہر سکنڈ (ثانیہ) میں قریباً ایک آدمی مر جاتا ہے - (قریباً) ایک پیدا ہوتا ہے - پس کیا عقلِ سلیم تسلیم کرسکتی ہے - کہ ہر اچھے بُرے آدمی کا سوگ کیا جائے - ماتم کیا جائے - نہیں ہرگز نہیں - بلکہ اُس شخص کا سوگ رکھنا (قانونِ اخلاق کے موافق) ضرور ہے - جو دُوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہو - نیک ہو - جس طرح ایک سے بڑھ کر دُوسرا بد آدمی دیکھنے میں آتا ہے - یہاں تک کہ بدترین خلائق کے مقابلہ میں ایک معمولی بد آدمی کو اچھا یا غنیمت سمجھا جاتا ہے - اسی طرح نیکوں اور نفع پہنچانے والوں کے درجے ہیں - پس جو بزرگوار سب اہلِ دُنیا سے بڑھ کر نیک اور نفع رساں ہو - وہ ہم مسلمانوں کے نزدیک پیغمبرِ خدا صلعم کا جانشین حقیقی ہے - کوئی اُس کو خلیفہ کہتا ہے - کوئی امام - کوئی غوث*- پس ۶۰ سنہ ہجری میں خلیفہ برحق اور امام اور غوث سب باالکثر مختلف العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک امام حسینؑ ہی قرار پاتے ہیں - افسوس کا مقام یہ ہے - کہ ایسے مقدس نبیؐ کے نواسے کو انہیں لوگوں نے جو اُن کے نانا کا کلمہ پڑھتے تھے تین دن کا بھوکا پیاسا محض دُنیا کے لالچ سے یزید اور ابن زیاد وغیرہ چند دُنیا داروں بدکاروں کا ساتھ دیکر ایسا

* صوفیوں کی اصطلاح میں اُس کو غوث کہتے ہیں - اور شیعہ امام و خلیفہ کہتے ہیں اسی طرح اور فرقہ مسلمانوں کے کوئی خلیفہ کوئی امام کہتا ہے - مرتب

تین سیکنڈ

شہید ا قتل کردیا۔ امام حسینؑ اور اُن کے بہتّر بہادر ساتھیوں نے کربلا میں جو داد شجاعت دی ہے۔ اور حق کی ایسی طرفداری کی ہے۔ جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ پس جب کہ اُن کے اخلاق۔ شجاعت۔ صبر۔ عبادت۔ سخاوت وغیرہ کا روئے زمین پر نظیر نہیں ہے۔ توضرور ہے کہ اُن کا بیان بھی اس خوبصورتی سے کیا جائے۔ جو عام لوگوں سے اعلےٰ و بالا ہو۔ اور الفاظ بھی ایسے لائے جائیں۔ جو اگرچہ زبان ولغت میں داخل ہوں۔ مگر بظاہر وہ فرشتوں کی زبان معلوم ہوتی ہو۔ اس کو بعض آدمی شوکت الفاظ کہتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ بلاغت کی جان یہی ہے۔ ملا محتشمؒ اور مقبلؒ کے کلام میں یہی بات ہے۔ اس لئے وہ محتشم و مقبول ہوئے۔ میں اس موقع پر فقط ایک شعر ان دونوں بزرگواروں میں سے ایک آخر الذکر ممدوح کا لکھتا ہوں ۔ ؎

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں افتاد + اگر غلط نکنم عرش بر زمیں افتاد

اگر شاعر فقط اتنا ہی کہدیتا۔ کہ حسینؑ بر زمیں افتاد۔ تو مطلب تو ضرور حاصل ہو جاتا۔ مگر ممدوح کی شان نہ معلوم ہوتی۔ اور جب شان اعلےٰ نہ معلوم ہوتی۔ تو دل پر چوٹ نہ لگتی۔ شاعر نے اول تو کہا۔ بلند مرتبہ۔ پھر شاہ کہا۔ پھر صرف زین نہیں کہا۔ بلکہ صدر زین کہا۔ اسی طرح ترقی دے کر ممدوح کی شان و رفعت دکھائی۔ پھر دوسرے مصرع میں کہا کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو یہ کہونگا۔ کہ عرش خدا زمین پر گر پڑا۔ امام حسینؑ کو عرش سے تشبیہ دیکر رفعت پیدا کی۔ اب عرش کا گرنا یہ بتا رہا ہے۔ کہ اللہ اکبر کس قدر عظیم الشان صدمہ پہنچا۔ اس لئے اس شعر کو سنکر دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور امام حسینؑ کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ترکیب مرزا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اب میں ایک مشہور مطلع کا ایک پورا بند مع شرح لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ ؎ جس دم نگین خاتم پیغمبراں گرا۔ ایک پیغمبراں کی شوکت دار لفظ فرمائی۔ پھر اُس پر ترقی یہ کی۔ کہ خاتم پیغمبراں کہا۔ خاتَم (بفتح تا) انگوٹھی اور زینت کے معنی کو آتا ہے۔ یہاں خاتم پیغمبراں سے مراد جناب محمد مصطفےٰ صلعم سے ہے۔ پھر اُس پر ترقی

بھی۔ کہ اُس انگوٹھی کا نگینہ گر پڑا۔ وہ کون؟ امام حسینؑ نگینہ انگوٹھی کے اوپر رہتا ہے۔ یہاں امام حسینؑ اپنے نانا کی پیٹھ پر اکثر سوار ہوا کرتے تھے۔ یہ شان اعلےٰ دکھا کر کہتے ہیں ع رونق انگوٹھی زمین سے امام زماں گرا۔ مذہب شیعہ کے موافق امام اور مذہب صوفیہ کے موافق غوث گویا تمام دنیا کی جان ہے۔ ہر جز اُس سے وابستہ ہے۔ پس فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ گھوڑے سے کیا گرے کہ دنیا بھر سے رونق اُٹھ گئی۔ زمین و زمان میں جو نسبت و صنعت ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور نہایت بے تکلف ڈھلے ہوئے لفظ لائے ہیں۔

اب جب یہ شان عالی دکھا چکے۔ تو ظالموں کے ظلم کی تشریح کرتے ہیں۔ ع گرنے پہ سب گروہ لئے برچھیاں گرا۔ اب اس ظلم پر افسوس و تعجب ظاہر کرتے ہیں ع ہے ہے نہ ان جفاؤں پہ بھی آسماں گرا۔ یعنی ایسی جفا سے شدید ہو گئی۔ اور پھر آسمان قائم رہا۔ عجب اور افسوس ہے۔ اب اس ظلم کی زیادہ تشریح کرتے ہیں ع زہراؑ سے پوچھئے یہ قلق نور عین کا۔ ماں کو جو محبت ہوتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں ہوتی۔ اس لئے اُن کی مادر گرامی دختر جناب رسول خدا صلعم سے اس قلق کو پوچھئے۔ ع تپنا زمیں کا اور تڑپنا حسینؑ کا۔ ادھر تو زمین تپ رہی تھی۔ ادھر امام حسینؑ زخمی پیاسے تڑپ رہے تھے۔

ظاہر ہے۔ کہ اس رفعت و شان کے بیان سے جو صدمہ سُننے والے کو پہنچیگا۔ وہ معمولی طور پر یہ کہدینے سے کہ "امام حسینؑ گرم زمین پر گرے۔ ظالم برچھیاں لئے ہوئے ٹوٹ پڑے" ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بلاغت کے نکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر شخص مجبور ہو کر یہ کہتا ہے۔ کہ جس قدر رقت مرزا صاحب کے مرثیہ پر مجلس میں ہوتی ہے۔ خواہ وہ سوز میں پڑھا جائے خواہ منبر پر۔ دُوسرے کے مرثیہ میں نہیں ہوتی۔ بعض صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شوکت دار الفاظ بہت لاتے ہیں جس سے کم علموں کے سمجھنے میں پیچ پڑجاتا ہے۔ دُوسرے شعراء اہلبیت صاف صاف کہتے ہیں۔ مگر اُن کہنے والوں سے یہ کون کہے۔ کہ ایسے ہی ایسے شوکت دار الفاظ لانے اور پیچ ڈالنے سے تو

دلوں پر چوٹ لگتی ہے۔ اور ممدوح کی شان معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ ہزاروں قتل بھی ہوتے ہیں۔ پیاسے بھی مرجاتے ہیں۔ سب کے واسطے نہ یہ سامان ماتم ہوسکتے ہیں۔ نہ یہ مجلسیں نہ مرثیے کہے جاتے ہیں*۔ المختصر مرزا صاحب بین میں شان ممدوح دکھلانے کا خاص التزام فرماتے ہیں۔ اور خاندان رسالت کے حفظ مراتب کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ اس کے سوا نہایت سریع الفہم اور آسان الفاظ لاتے ہیں۔ تاکہ بین کے مضامین و واقعات کو ذی علم و بے علم ہر ایک بخوبی سمجھے۔ زبان کی صفائی اور بیان کے عام فہم ہونے کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی لڑائی اور سراپا میں گویا دوسرا مصنف تھا۔ بین میں دوسرا شخص متکلم ہے۔ اور اس فرق کو وہ خود ایک رباعی میں کہ گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:-

ہے رزم و سراپا تو زباں اور ہی ہے + اور بین کے مابین بیاں اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تری فکر دبیر + کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بعض الفاظ دیکھنے میں بہت ہی کم وزن معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کثرت استعمال یا بندش وغیرہ کے لحاظ سے دل پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم جو ہمارے زمانے میں ایک شاعر اکمل مانے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر یہ چار مصرع (جو ایک پہلوان کی لڑائی کے موقع پر مرزا صاحب نے کہے ہیں) پڑھتے تھے:-

ترچھا کبھی نیزے کو ہلایا کبھی آڑا + پڑھ پڑھ کے رجز باغ فصاحت کو اجاڑا
ظالم نے کئی پشت کے مردوں کو اکھاڑا + بولا مری ہیبت نے جگر شیروں کا پھاڑا

حفظ مراتب کا خیال

بین میں مرثیہ کی زبان سے علیحدہ دوسرے شخص کی زبان معلوم ہوتی ہے

فصاحت کا

الفاظ سے تاثیر

جوش کے قافیہ اور ...

*محرم و صفر ۱۳۳۰ ہجری کے شیعہ و اثنا عشری وغیرہ پرچوں کے ناظرین کو بعض مرثیہ گویان حال کی یہ شکایت ہے کہ ان کے پڑھنے سے گل و بلبل مدح ذوالفقار، مدح ذوالجناح، سراپا وغیرہ کے بیان پر اس قدر مجلس میں واہ واہ ہوئی کہ مجلس ماتم محفل مشاعرہ سے مشابہ ہوگئی۔ مگر جہاں غائی رقت دکھانی تھی وہ قطعی نہیں ہوئی۔ وہ لوگ ان مضمون پر غور کریں جب تک حال کے ایسے مرثیہ گو اس طرز خاص دبیر کی پوری تقلید و اتباع نہ کریں گے۔ مرثیہ کبھی نہ ہو سکیگا گو شاعر غزل گو اعلیٰ رتبہ کے ہو جائیں + ۱۲ مؤلف حقیر

اور فرماتے تھے۔ کہ دیکھو کیسے بھونڈے قافیہ ہیں۔ مگر شان اُستادی و کمال کو دیکھو۔ کہ کس عمدگی سے بندش دی ہے۔ کہ اس واقعہ کے بیان کرنے کے واسطے اب اس سے بہتر الفاظ شاعر کو نہیں مل سکتے۔ واقعی جو پہلوان میدان جنگ میں آتا ہے۔ وہ جنگ کی اُمنگ میں نیزے کو کبھی ترچھا کبھی آڑا ہلاتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں اُس کی رجز خوانی کی ہجو کس خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں کی ہے۔ کہ باغ فصاحت کو رجز پڑھکر اُجاڑا۔ رجز کے موقع پر عرب کا عام دستور تھا۔ کہ اپنے باپ دادا کے نام لیکر کارنامے بیان کرتے تھے۔ اس کے واسطے خاص ایک روزمرہ اردو کا صرف فرمایا ہے۔ کہ کئی پُشت کے مُردوں کو اُکھاڑا۔ یعنی مُردوں کے حالات بیان کئے۔ غزل میں خواجہ آتش مرحوم نے بھی یہ روزمرہ ایک موقع پر خوب نظم کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

کہتے ہیں ذکر لیلی و مجنوں جو چھیڑیئے + چپ رہئے بس گور کے مُردے اُکھیڑیئے

اب وہ پہلوان اپنا اور اپنے باپ کا نام لیتا ہے۔

ہم پنجہ نہ رُستم ہے نہ سہراب ہے میرا + مرحب بن عبد القمر القاب* ہے میرا

اب میں مرزا صاحب کی وقت وقت کی ترقی سخن کی مثالیں بیان کرنے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب نے جب سنہ ۱۲۳۰ھ یا سنہ ۱۲۳۲ھ کے قریب قریب مرثیہ کہنا شروع کیا۔ تو اُس وقت تک رزم دسراپا مرثیہ میں نہیں کہا جاتا تھا۔ ہر مرثیہ گو کی توجہ بین پر تھی۔ سب سے بہتر وہ مرثیہ گو سمجھا جاتا تھا۔ جسکو مصیبت کے موقعوں کے روزمرے کثرت سے معلوم ہوں۔ کہ وہ موقع سے کھپا دے۔ مرثیہ اُس زمانہ میں ۱۲ یا ۱۵ بند سے لے کر ۳۵ یا ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ اس کی وجہ

وقتاً فوقتاً کی ترقی سخن کی مثالیں

* اس موقع پر جو بزرگوار اردو محاورے کی باریکیوں سے ناواقف ہیں وہ غالباً مولوی شبلی صاحب کی طرح یہ اعتراض فرمائینگے کہ القاب جمع ہے بجائے واحد کیوں باندھا ہا مگر اردو محاورے کے وارث شعرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ جانتے ہیں کہ القاب اردو میں واحد کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً روزمرہ میں کہتے ہیں۔ کہ تم اُن کا القاب کیا لکھا کرتے ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اکثر مرثیہ سوز خواں پڑھتے تھے۔ سُنا ہے۔ کہ ابتدائی مشق کے مرثیوں میں سے یہ مرثیہ مرزا صاحب کا بہت مشہور ہوا تھا۔ ؎

ابتدائی مشق کا مرثیہ مرزا صاحب کا جس نے بہت شہرت پائی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے*
ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا سوتی ہے

اس مرثیہ میں مادر علی اصغر کا اپنے بچہ کی یاد میں گھبرانا اور تنہا رونا بیان کیا ہے۔ چنانچہ رات اور تنہائی کی تصویریں لفظوں میں کھینچی ہے:۔

تصویر تنہائی اور رات کا سماں

تصویر تنہائی

سوگ کا فرش ہے۔ اور سامنے جلتا ہے چراغ — شانے میں داغ رسن۔ سینے میں اولاد کا داغ
جان آندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ — نہ وہ گل ہیں۔ نہ وہ غنچے۔ نہ وہ زہرا کا باغ
گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

اس سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا صاحب قدرتی شاعر تھے۔ اور بڑے بڑے واقعہ کو مختصر لفظوں میں تصویر کھینچ کر دکھا دینے کا جوہر قدرت نے اُن کی طبیعت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اب اضطراب کی چلتی پھرتی تصویر دیکھئے:۔

اضطراب

کبھی گوشے میں وہ مُنہ ڈھانپ کے چلاتی ہے — اور کبھی صحن میں گھبرا کے نکل آتی ہے
گود کو پکڑے ہوئے پھر ایک طرف جاتی ہے — ڈھونڈتی ہے مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے
تن کو لغزش ہے جُدا۔ اور ہے مُنہ زرد جُدا
دل تڑپتا ہے جُدا۔ سینے میں ہے درد جُدا

پھر علی اصغر کی ماں کہتی ہیں۔ ؎

* بعض آدمی فرماتے تھے کہ یہ مرزا صاحب کا پہلا مرثیہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ پہلا یہ نہیں ہے مگر ابتدائی مرثیوں میں اس کی بہت شہرت ہوئی تھی + ۱۲ مؤلف حقیر

نونہالی کے لئے ہائے تری جان گئی + اماں صدقے گئی۔ واری گئی۔ قربان گئی

پھر کہتی ہیں۔ سے

تم نے بیٹا مری گودی کو کیا کیا خالی + بخدا میرے حسابوں ہوئی دنیا خالی

میرے حسابوں خاص عورتوں کا محاورہ ہے۔ گو بعض مرد بھی بولتے ہیں۔ آگے چل کر اپنی مصیبت میں محویت بیان کرتی ہیں کہ سے

مصیبت میں محویت

میں نہیں جانتی ہوتا ہے زمانے میں کیا + ہوں وہ بے خود کہ نہیں مجھ کو خبر ہوتی ہے

شام کب ہوتی ہے۔ کس وقت سحر ہوتی ہے

باوصف عطف و اضافت اعلان نون

اس زمانے میں باوصف عطف و اضافت بھی نون کا اعلان شاعروں میں جائز ہی نہیں تھا۔ بلکہ فصیح سمجھا جاتا تھا۔ کہ بولنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جزدان قرآن کے بولنے میں عام طور پر ہر شخص نون کا اعلان کرتا ہے۔ اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب بھی اُس زمانہ کے مرثیوں میں باوصف عطف و اضافت نون کا اعلان کرتے ہیں۔ اور بہت سے الفاظ اور ترکیبیں جو زمانہ مابعد میں متروک ہوئے۔ اور خود مرزا صاحب نے بھی ترک کر دئے۔ اُس زمانہ کے مرثیوں میں جو نظم کر چکے تھے۔ وہ یوں ہیں اب تک چلے آتے ہیں۔ گویا زبان حال سے اپنی تاریخ تصنیف بتا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر فہرست ایسے الفاظ کی پیش کرتا ہوں:۔

فصل ۵ فہرست بعض الفاظ کی جن کو مرزا صاحب نے بعد کو [illegible] ترک کر دئے

نمبر شمار	مصرع	جلد مراثی نمبر	صفحہ نمبر	کیفیت
۱	ہے گور بیاباں میں شہنشاہ عرب نے	۱	۱۹۸	پڑا اور ہے میں فصل ہے +
۲	شمع حرم و سر دل و جان سے قربان علی	۲	۱۴۴	دل و جان میں عطف ہے۔ پھر بھی نون کا اعلان ہے۔ ہر چند دل او رجان بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اُس وقت تک ایسا اعلان فصیح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جو

نمبر شمار	مصرع	نمبر جلد	صفحہ	کیفیت
				دل وجان چھپا ہے۔ وہی صحیح پایا جاتا ہے +
۳	قیمت ان کی مجھے یا حیدر صفدر دیجئے	۳	۱۰۵	دیجئے بعد کو ترک فرما دیا۔ دیجئے لاتے ہیں +
۴	کربلا کو حرم سرور ذی شان چلے	۳	۱۶۵	ذی شان میں بحالت اضافت نون کا اعلان ہے۔ ہرچند بعض شعرا کا خیال یہ ہے۔ کہ یہ مرکب عربی کی لفظ ہے۔ اس لئے اس میں بحالت اضافت بھی اعلان نون جائز ہے۔ مگر بعد میں خود مرزا صاحب نے احتیاطاً ترک فرما دیا ہے +
۵	دین احمد مختار کا مقبول کیا ہے	۳	۱۹۰	بجائے قبول کیا ہے کے اُس زمانہ کا روزمرہ ہے +
۶	خوش ہونگے پاپوش آنکھوں کے ملنے سے	۴	۷۷	اب ایسے مقام پر ملنے سے بولتے ہیں۔ یہ پرانا محاورہ تھا +
۷	وہ بولی تسلی تمہیں دینے آتی ہے بھائی	۴	۲۱۸	اب یوں بولتے ہیں۔ دینے آتی ہے یا دینا آتی ہے +
۸	دُلھن کا محافہ جو لگا آن کے در سے	۹	۱۱۰	دُلھن فعلن کے وزن پر۔ بعد کو ترک کر دیا۔ فعُل کے وزن پر رہا +
۹	وہاں سے جا کے بقبر رسول رو رو کر	۵	۱۹۳	بقبر کی ترکیب فارسی آمیز بعد کو ترک کر دی +
۱۰	باطل کو حق سے تیغ نے یوں کر دیا پرے	۸	۱۷۴	پرے دہلی کا محاورہ ہے۔ لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مرزا صاحب کا بچپن کا محاورہ اُن سے نہیں چھوٹا۔ کہ دہلی کی پیدائش تھی۔ پانچ سات برس کی عمر تک وہاں رہے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء تک کے مرثیوں میں نظر آتا ہے +
۱۱	جب عنقریب شست نجف کے ہوا گذار	۵	۱۴	عن قریب ایسے موقع پر بعد کو ترک کر دیا۔ اب صرف رہاز

نمبر شمار	مصرع	نمبر مرثیہ	نمبر بند	کیفیت
				کے لئے بولتے ہیں +
۱۲	یہ صدا آئی بگوشِ پسرِ شاہ نجف	۵	۵۸	بگوش کی ترکیب کو بعد کو ترک کر دیا +
۱۳	قتل حسینؑ ہیں تا خیراب ذری	۵	۱۶۸	ذری کو بعد میں ترک کر دیا۔ ذرا ہر موقع پہ آتا ہے +
۱۴	ہمسائے میں ترے ہیں یہ سب بھوکی پیاسیاں			بجائے بھوکی پیاسی کے بھوکی پیاسیاں دہلی کی زبان کی ترکیب ہے۔ جو لکھنؤ والوں شیخ ناسخ وغیرہ اور ان کے معاصرین نے ترک کی۔ مرزا صاحب کے بھی ابتدا کے مرثیوں میں نہیں ہے جس میں یہ مصرع ہے۔ اُس کا مطلع یہ ہے۔ ع جب قیدیوں کو راہ میں ماہ صفر ہوا +

۱۲۴۰ھ سے بعد مرثیہ ۵۰ بند سے زیادہ کا ہوا جس میں روایت نظم کی

سنہ ۱۲۴۰ھ کے قریب اور اُس کے بعد مرثیہ کی لے بڑھی۔ مرثیوں میں روایتیں نظم ہونے کے سبب سے مرثیہ ۵۰ بندوں سے آگے بڑھا۔ ستر اسّی بند کا ہونے لگا۔ یہ میر ضمیر مرحوم کا پہلا ایجاد تھا۔ روایت کے نظم کرنے میں علاوہ محاورہ بندی کے رسم و رواج کا بھی خیال کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کا مرزا صاحب کا یہ مرثیہ ہے۔ ؎

اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو

اس میں وہ روایت نظم کی ہے۔ کہ ایک شخص ایک ہرنی کا بچہ جناب رسول خدا صلعم کے واسطے تحفہ لایا تھا۔ (امام حسنؑ پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے اُن کو دے دیا۔ وہ گھر لیکر پہنچے۔ اپنی ماں اور بھائی کو دکھایا۔ (امام حسینؑ بھی مسجد میں آئے۔ کہ میرے حصہ کا بھی بچہ ہوگا۔ یہاں دوسرا بچہ نہ پاکر اپنے ناز اُٹھانیوالے نانا سے رُوٹھ گئے۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولے۔ حضور صلعم نے پوچھا۔ ؎

کس چیز کی خواہش ہے تمہیں کیا نہیں ملتا — دیکھو تو سہی ملتا ہے اب یا نہیں ملتا
سب کچھ تمہیں موجود ہے فوراً جو کہے تو — بس دیر ترے ہونٹ ہلانے کی ہے گلرو

آ گئے تو نہ تھی ایسی تری رُوٹھنے کی خُو — کیا لوگے بتاؤ؟ کہا شبیرؑ نے - آہو
آہو کہا اور لوٹ گئے خاک کے اُوپر
صدمہ ہُوا رُوحِ شہِ لولاک کے اُوپر

اب جناب رسول خدا صلعم اس کے جواب میں فرماتے ہیں - ؎

سمجھا کے حسنؑ کو یہی آہو تجھے دُوں — وہ کہنے لگے کاہیکو لُوں - بھائی کیوں لُوں
لُوں میں تو کوئی اور ہی لُوں - ورنہ خفا ہُوں — کم پیار ہمارا ہُوا - اور بھائی کا افزوں
شہ نے کہا ہم اور ہی آہو تمہیں دینگے
وہ بولے کہ وعدہ نہیں - ہم تو ابھی لینگے

نازوں کا پالا نواسا اپنے ناز بردار نانا سے ناز کرتا ہے -

مانونگا نہ میں دیجئے لاکھ آپ دلاسے — ہوگا یہ گلہ - فاطمہؑ و شبیرؑ خدا سے
اور دو ہمیں آہو اگر الطاف و عطا سے — پھر تم وہی نانا ہو وہی ہم ہیں نواسے
غمگین ہے پر آہو جو ابھی پاتا ہے شبیرؑ
نانا کے گلے ہنس کے لپٹ جاتا ہے شبیرؑ

المختصر دُوسرا بچہ آہو امام حسینؑ کے واسطے جب آیا - اور جناب رسول خداؐ نے ان کو عطا فرمایا -

تب سر کو جھکائے ہُوئے ہاتوں کو بڑھایا — باہیں گلے میں ڈال کے نانا کو سُنایا
اماں سے نہ کہنا کہ یہ گودی میں نہ آیا — بابا سے نہ کہیو کہ مجھے اس نے ستایا
نازاں ہیں سب اطفال تو ماں باپ کے اُوپر
پر ناز ہمارے ہیں فقط آپ کے اُوپر

دوسری روایت

یہ روایت آہو نظم کر کے پھر اسی مرثیہ میں ربط دیکر امام حسینؑ کا سفر کرنا اور کربلا میں آنا اور شب عاشور عمر ابن سعد سردار لشکر یزید کو تنہائی میں بُلوانا اور اُس کا مع ایک فرزند اور ایک غلام کے آنا نظم کیا ہے جب حضرت کو معلوم ہو گیا - کہ وہ متمنی خلوت

پڑا گیا۔ تو آپ چلے۔ علی اکبرؑ ساتھ ہوتے۔ پوچھا تم کیوں چلتے ہو۔ کہا اُس کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ آیا ہے۔ پھر آگے بڑھے۔ کہ پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ پھر کر دیکھا۔ کہ جاں نثار بھائی (حضرت عباسؑ) چلے آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نہ تکلیف کرو۔ میں اسد اللہ الغالبؑ کا فرزند ہوں۔ میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔

عباسؑ نے کی عرض نہ مانینگے کبھی ہم ہمراہ عمر کے ہے غلام عمر اس دم
کس طرح میں چھوڑوں تمہیں اے سید اکرم میں خاص غلام اور تم آقائے دوعالم
تم جاتے ہو۔ اعدا میں نہ ساتھ آؤں میں کیونکر
ایمان مرا جاتا ہے۔ پھر جاؤں میں کیونکر

مضمون کی ترقی و تنزل

اس مصرع آخر کے معنی کی بلاغت پر غور کیجئے۔ ایک معنی تو یہ ہوئے۔ کہ خود امام حسینؑ کو اپنا ایمان قرار دیتے ہیں۔ کہ آپ میرے ایمان ہیں پھر میں ساتھ کیوں نہ چلوں۔ کیونکر پھر جاؤں۔ دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ میرے لوٹ جانے میں میرا ایمان جاتا رہیگا۔ میں ضرور ساتھ چلونگا۔ بعض صاحب مرزا صاحب کے کلام پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ بعض مضمون تو مرزا صاحب کے بہت بلند ہوتے ہیں۔ مگر پھر وہ سلسلہ ترقی مضامین کا قائم نہیں رہتا۔ اُس کے بعد مضامین گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ شاعر یا مبصر کلام شعرا ہو کر تو کوئی منصف مزاج ایسا اعتراض نہ کریگا کیونکہ یہ بات تو کسی انسان (غیر معصوم) کے کلام میں ممکن نہیں۔ کہ سب کلام یکساں ہو۔ پھر مرزا صاحب کی تخصیص کیوں۔ بات یہ ہے۔ کہ جس بلندی پر پہنچ کر مرزا صاحب کا شہباز طبیعت شکار لاتا ہے۔ عام شاعروں کے شکرے وہاں تک رسائی سے مجبور ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ کبھی کبھی جب مرزا صاحب کو کوئی عالی درجہ کا مضمون مل جاتا ہے۔ تو پھر بہت دیر تک وہ خود بھی ویسے یا اُس سے بہتر مضمون لانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ ع یہی ہے فرق بندے اور خدا میں۔ آپ اسی مصرع کو دیکھ لیجئے۔ ع ایمان مرا جاتا ہے پھر جاؤں میں کیونکر کیا دوسرے شاعر کے خیال میں آسکتا ہے۔ المختصر یہ داستان نظم فرمائی ہے۔ کہ امام حسینؑ نے ابن سعد کو بہت سمجھایا۔ اور اُس وقت وہ مکار نیم راضی بھی ہو گیا۔ کہ

اپنی یاد کو صلح کے لئے لکھیگا۔ مگر سپہر صبح کو انجام یہ ہوا کہ ؎

واں کفر کی صف۔ یہاں صف اسلام کھڑی تھی ۔ اور فیصلے کو بیچ میں تلوار پڑی تھی

مرزا صاحب کی معلومات بہت بڑھ گئی تھی۔ کہ شاعری کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا تھا اس لئے روایتیں (جو عربی زبان کے محفوظ ماخذوں میں منقول تھیں) انہوں نے خوب خوب نظم کیں۔ اُن کے اور معاصر جو اتنی لیاقت علمی نہ رکھتے تھے۔ اُن کے مقابلہ کی کوشش کرتے تھے۔ مگر کچھ خداداد دماغ اور کچھ لیاقت علمی کے (کمال کے) سامنے اُن کا چراغ نہ جلتا تھا۔

روایات مرزا صاحب نے شعر میں کہیں۔ سبب انقلاب مرثیہ۔ سراپا و رزم مرثیہ میں داخل ہوا

اب مرثیہ گوئی نے تیسرا پلٹا کھایا۔

جناب میر ضمیر صاحب مرحوم نے سراپا و رزم و طولانی رجز کو مرثیہ میں بڑھایا۔ اور چہرہ خاص آب و تاب کے ساتھ نظم فرمایا۔ تمہید بیان کرکے مطلب کی طرف گریز فرمائی۔ جس طرح قصیدہ میں ہوتی ہے۔ اور ان مضامین کے بڑھنے کے ساتھ مرثیہ کے بندوں کی تعداد بھی ۱۰۰ یا اس سے زیادہ (نمبروں) عددوں پر پہنچا دی۔ اور اس کے ساتھ ہی صاف لفظوں میں یہ دعوے بھی کر دیا۔ کہ میں اس طرز خاص کا موجد ہوں چنانچہ مرثیہ میں جس کا یہ مطلع ہے کہ ع کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے مقطع میں فرماتے ہیں۔

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبیؐ کے ۔ سنہ بارہ سو اُنچاس (۱۲۴۹ھ) تھے ہجر نبیؐ کے
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے ۔ اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے

دس (۱۰) میں کہوں سو (۱۰۰) میں کہوں یہ ورثہ ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر صاحب کے برابر کے اُستادوں میں میر خلیق۔ مرزا فصیح۔ منشی دلگیر موجود تھے۔ میر خلیق و منشی دلگیر تو وہی بندیہ مختصر مرثیہ کہتے رہے۔ مگر مرزا فصیح مرحوم نے بعض مرثیہ رزمیہ فرمائے۔ اور خوب فرمائے۔ اُدھر مرزا دبیر نے اپنے اُستاد کی تقلید میں اُسی

حال شاہزادہ علی اکبرؑ میں اُسی طرز کا ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیہ کے مطلع میں بھی وہی شان ہے مطلع یہ ہے۔ ؎ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل[1] سنہ ۱۲۵۰ھ بارہ سو پچاس اور اُس کے بعد کے اکثر مرثئے مرزا صاحب کے سو ڈیڑھ سو یا زیادہ بند کے ہیں۔ اور اُن میں سراپا اور رزم وغیرہ ہے +

فصل ۱۱ — مرزا صاحب کی شہرت کے زمانہ میں لکھنؤ میں تین قسم کے شاعر تھے

اب یہ بھی کہہ دوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت کے زمانے میں تین طرح کے شاعر لکھنؤ میں تھے۔ اور ہر فرقہ اپنی زبان کو زیادہ فصیح اور ٹکسالی سمجھتا تھا۔ (۱) وہ شعرا جو خود دہلی کے تھے یا اُن کے والدین دہلی کے تھے۔ اور وہ لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ مرزا صاحب اس صنف میں سے تھے۔ اور یہ لوگ بعض الفاظ یا بعض ترکیبیں زبان دہلی کی اپنے کلام میں ضرور لاتے تھے۔ اور اس کو اپنا تمغائے زبان سمجھتے تھے جیسے مرزا صاحب کے کلام میں ورے۔ پرے۔ اور راتے سے اور بعض الفاظ نظر آتے ہیں۔ (۲) وہ شعرا جو دہلی وغیرہ سے فیض آباد میں جا بسے تھے۔ اور پھر جوانی یا بڑھاپے میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے کلام میں بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی تھیں۔ جو فیض آباد میں فیض پانے کی خبر دیتی تھیں[2]۔ (۳) وہ شعرا جو محض لکھنؤ کی

[1] ہائے اردوئے معلے سے ناواقفی بھی کیا بُری بلا ہے مولوی عصمت اللہ [illegible] ہمارے اُستاد منشی [illegible] صاحب کے اس شعر کے [illegible] محفل پر اعتراض کرتے ہیں کہ محفل و مجلس مرادف ہے۔ [illegible] نہیں [illegible] سنا ہی کیا ہے [illegible] ہر [illegible] محفل زیادہ ہوتے تھے اب مجلس [illegible] پیش ہیں + ۱۲ مؤلف

[2] [illegible] صاحب [illegible] لکھنؤ [illegible] فیض آبادی [illegible] فرمایا کرتے تھے [illegible] دہلی کی زبان [illegible] لکھنؤ [illegible] فیض آباد [illegible] افسوس بعد

[illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] ۱۹۱۲ء میں انتقال فرما گئے + ۱۲ مؤلف حقیر

پیدائش سے تھے۔ خواہ اُن کے والدین بھی لکھنؤ کے تھے۔ خواہ دہلی کے سوا کہیں اور سے آئے تھے۔ از بسکہ اُسی زمانے میں اہلِ لکھنؤ نے اہلِ زبان ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو اہلِ زبان سمجھتے تھے +

المختصر مرزا صاحب نے اوّل اوّل مرثیوں میں تین عمدہ کہکر نام پیدا کیا۔ اور محاورہ بندی کا خیال رکھکر سلیس اردو میں سیدھے سادے مرثئے کہے۔ پھر جو جو لکھنؤ میں باریکیاں اور صنعتیں بڑھتی گئیں۔ وہ بھی ہر رنگ میں مرثئے کہتے گئے۔ ادھر قدرتی شاعری پر علم کی صیقل ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر رنگ میں اُن کا کلام نظر آتا ہے۔ اور اس کثرت سے ہر رنگ میں کہا ہے۔ کہ دریا بہا دئے ہیں۔ چنانچہ خود وہ دعوے فرماتے ہیں ؎

اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام + ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

کہیں تو وہ اس قدر صاف و سلیس نظم کہتے ہیں۔ جو اس شعر (حقیر ثابت) کی مصداق ہے ؎

یہ نظم مصفّا پہ دھوکا ہُوا + کوئی باتیں کرتا ہے بیٹھا ہُوا

اور کہیں ایسا دقیق کلام نظر آتا ہے۔ کہ بڑے بڑے شعرا و علما گھنٹوں غور فرماتے ہیں۔ باریکیوں کو سمجھ کر لطف و حظ اٹھاتے ہیں۔ اگر غور سے آپ دیکھینگے۔ تو ہر صاحب علم مصنّف کے کلام میں آپ کو (خواہ وہ کلام نثر ہو یا نظم ہو) ایسا دقیق کلام ضرور ملیگا۔ میں اپنے دعوے کی تائید میں اُن بزرگوار کا کلام پیش کرتا ہُوں۔ جن کا کلام کلام اللہ کے بعد فصاحت و بلاغت میں یکتا مانا گیا ہے۔ وہ کون؟ جناب امیر علیہ السلام ہیں۔ کتاب مستطاب نہج البلاغہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ اوّل تو اکثر خطبوں میں بعض دقیق جملے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص خطبۂ شقشقیہ میں۔ پھر ایک خاص فصل ایسے دقیق جملوں کی ہے جس کی سرخی (سیدنا نگ) سید رضی (رضی اللہ عنہ) نے یہ لکھی ہے۔ فصل نذکر فیہ شیئاً عن اختیار کلامہ المحتاج الی التفسیر*۔ افسوس اب علوم مشرقیہ کی ایسی کچھ کمی ہوتی

* یعنی اب ہم کچھ ایسا اُن حضرت کا کلام لکھتے ہیں جو تفسیر کا محتاج ہے۔ جو مطبع عبد اللہ المصری کا [illegible] نہج البلاغہ میں صفحہ ۲۰۲ سے یہ فصل شروع ہوتی ہے ۱۲ مؤلف

جاتی ہے۔ کہ لوگ دقیق کلام کو جو معنی نغزسے مزین ہے ایک عیب سمجھتے ہیں۔ خیر جاہلوں سے ہمیں کیا شکایت۔ جو شخص اہلِ علم بنتا ہے۔ اور پھر ایسی شکایت کرتا ہے۔ کہ وہ کلام بہت مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ اُس سے ضرور شکایت ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ مرزا صاحب کا لکھنؤ میں وہ زمانہ تھا۔ کہ جب لکھنؤ علومِ مشرقی کا مجمع و مرکز ہو رہا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ ہے اُس کے قریب قریب کی اکثر بستیاں بلگرام۔ کاکوری۔ موہان۔ کنتور۔ جعل۔ جائس۔ بدایوں۔ نصیر آباد۔ سندیلہ۔ خیر آباد وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کی خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ عربی و فارسی کے علوم کے ساتھ ساتھ سیکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ لکھنؤ کے عالم سے لیکر جاہل تک بولتے تھے* ۔ اور ہر لفظ و محاورہ وہ لوگ موقع سے استعمال کرتے تھے۔ اب جوں جوں عربی۔ فارسی اس ملک میں کم ہوتی جاتی ہے۔ وہ بیچارے الفاظ بھی اپنا بستر باندھتے جاتے ہیں۔ لوگ اُن کو غریب سمجھتے ہیں۔ خیر اس زمانے میں اگر کوئی نیا شاعر وہ الفاظ لائے اور کوئی اُن کو غریب و ثقیل بتائے۔ تو چنداں مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ جس کلام کو یقیناً ستر اسی برس پہلے کا سمجھتے ہیں۔ اور اُن میں اہلِ علم کی زبان کے الفاظ

* دہلی میں بھی عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے عالم سے لیکر جاہل تک بولتے تھے۔ چنانچہ بابو شیو پرشاد صاحب ستارۂ ہند اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۳ء (در سوانح عمری بیان اپنی زبان کا) میں لکھتے ہیں کہ ایک شاعر دہلی کے کوچے میں پہنچا پوچھا قلعہ کتنی دور ہے۔ لوگوں نے جواب دیا پاس ہے۔ آگے بڑھ کر پوچھا۔ جواب ملا نزدیک ہے پھر پوچھا تو جواب پایا نزدیک ہے۔ آگے بڑھ کر پھر پوچھا لوگوں نے کہا قریب ہے۔ جب قلعہ کا دروازہ دکھلائی دیا پھر پوچھا۔ وہاں لوگوں نے بتایا متصل ہے۔ بلا اس کے کہ لوگوں کو قلعہ کی اس دوری کے معنی کی بالکل حقیقت دریافت ہو جائیگی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوں جوں دہلی نزدیک آتی گئی عربی و فارسی الفاظ کی زیادہ بھرمار ہوتی گئی۔ دہلی کے قصبات قریبہ میں شاید اس کثرت سے اہلِ علم نہ تھے جتنے لکھنؤ کے قریب قصبات و دیہات میں تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے گرد و نواح میں بھی عربی و فارسی الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ اور مفہوم کو جاہل بھی صحیح طور پر سمجھ لیتے تھے۔ گو لغوی معنی نہ جانتے تھے۔ پس اُن زمانوں کی نظم میں جو کثرت سے عربی و فارسی کے الفاظ تمام شعرا کے یہاں نظم ہیں۔ اُن کو غریب و ثقیل و غیر فصیح کوئی اہلِ عقل نہیں کہہ سکتا۔ یہ غلط مشہور ہے ۱۸۵۷ء سے تقریباً بیس سال بعد پیدا ہوا ہے۔ کہ عربی و فارسی کے الفاظ نظم میں کم آئیں۔ اور اُسی زمانے سے الفاظ عربی و فارسی بھی زبان سے ترتے جاتے ہیں۔ اور اُن کی عوض اکثر یا انگریزی کے الفاظ زبانوں پر جاری ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھئے کس کا قدم کس کی جگہ مقام ہوتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

پاتے ہیں۔ اُن کو ثقیل و غریب بتاتے ہیں۔ جن لوگوں کو علم السنہ سے کام پڑا ہے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں۔ کہ جو الفاظ جس زمانہ میں بولے جاتے ہوں۔ اگر وہ اُسی زمانہ کے شاعر یا ناثر کے کلام میں ہوں۔ (ہرچند زمانہ مابعد میں متروک ہو گئے ہوں) وہ ثقیل (ہرگز) نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جناب مفتی عبدربہ مفتی دیارِ مصر نے جو اس زمانہ کے ادیب کامل و فاضل متبحر تھے۔ اپنی کتاب شرح (حل الفاظ) نہج البلاغہ کے دیباچہ میں فرمایا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ "چونکہ عبارت کتاب نہج البلاغہ دقیق ہے۔ اور ہم لوگ اُس زمانہ میں ہیں۔ کہ اصل زبان عرب سے بہت کچھ ناآشنا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا بعض بعض الفاظ غریب ملتے ہیں۔ مگر وحشت و تنافر سے معرا و پاک ہیں۔ بعض ایسی دقیق ترکیبیں ملتی ہیں۔ مگر تعقید سے مبرا ہیں۔ یہ قصور ہمارے فہم کی کمی کا ہے۔ معاذ اللہ مصنف کا ہرگز نہیں ہے"۔ مرزا صاحب کے یہاں جس طرح عربی و فارسی کے الفاظ اور بعض ترکیبیں فارسی آمیز نظر آتی ہیں۔ ویسی ہی حالت اُن کے تمام اہل علم معاصرین شعرا کی ہے۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ۔ وزیرؔ۔ برقؔ۔ رشکؔ وغیرہ سب کو دیکھ جائیے۔ پس اس کو رواج یا فیشن کہنا چاہیئے۔ اس پر بجز کم فہم یا جاہل شخص کے کوئی اہل علم معترض نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اُن کی بندشوں میں عطف و اضافت کی بھی کثرت ہے۔ جس طرح اُن کے معاصرین اہل علم کے کلام میں ہے۔ والد مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جناب میر کلو عرش مغفور پسر میر مرحوم نے بہت کوشش کی۔ کہ عطف و اضافت کم آئے۔ مگر اُن کی ایک نئے رنگ کی مرثیہ گویوں میں دلگیر مرحوم عطف و اضافت کم لاتے تھے۔ اُن کی مشق سلیس کلام کی پرانی تھی۔ شیخ ناسخ مرحوم کو بھی وہ کلام دکھاتے رہے۔ جب بھی وہ اپنے رنگ پر قائم رہے۔ ناسخ مرحوم نے بھی اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سمجھ لیا۔ کہ یہ مشق ان کی پرانی ہے۔ اپنی طرز کو یہ نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ پرانی [illegible] جو میر مرحوم کو مصحفی کی تھی۔ سیکھی

الفاظ غریب نہج البلاغہ میں ہیں

معاصرین مرزا دبیر کے کلام میں الفاظ عربی و فارسی

عطف و اضافت کی کثرت

بھی تھی پرانی روش سیدھی سادی تھی

محاورہ بندی کی سیدھی سادی تھی۔ تا اوّل سید انشا نے اور پھر شیخ ناسخ اور اُن کے معاصرین آتش و ضمیر اور اُن کے ساتھ ساتھ دبیر مرحوم نے نظم اردو میں رنگینیاں پیدا کیں۔ پرانے مشاقوں کے دلوں میں اس نئی تراش و خراش نے خلش پیدا کیا۔ چنانچہ مصحفی اپنے آخر زمانہ کے ایک قطعہ میں اس کی شکایت بالفاظ ذیل فرماتے ہیں۔

(مصحفی کی شکایت معنی بندی کی نسبت)

تھا جو شعر راست سرو بوستانِ ریختہ ۔۔۔ اب وہی ہے لالۂ زرد خزانِ ریختہ
آگے کچھ دے کی کماں کے قدر کیا اس کی رہی ۔۔۔ تھی فسردیا بادی گو اپنی کمانِ ریختہ
پیچ دیئے لفظ و معنی کو بتاتے ہیں کلفت ۔۔۔ اور وہ پھر اس پہ رکھتے ہیں گمانِ ریختہ
فہم میں اتنا نہیں آتا بحکم رائے پست ۔۔۔ اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شانِ ریختہ
خوان لغیا بن کے پہنچا ہر کس و ناکس کے ہات ۔۔۔ قطع سلطاں کا جو تھا مخصوص خوانِ ریختہ
جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفی ۔۔۔ غلط میں جاتا رہا حسن زبانِ ریختہ

مگر معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اپنی روش پہ اس بڈھے مشاق سخن کو بھی کھینچ لایا۔ کہ مصحفی کے دیوان ششم میں کہیں کہیں اس طرز جدید کی جھلک نظر آتی ہے۔ المختصر مرزا صاحب مرثیہ کو اپنے اُستاد کے ساتھ ساتھ اس رنگین پٹری پر لائے۔ اور اُس میں طبیعت کی روانی اور علم کی روشنی نے علاوہ نئے مضمون کے اور اور جدتیں پیدا کیں۔ ہزار ہا آیتوں اور حدیثوں کے مضامین آسان الفاظ اردو میں نظم کر دئے۔ چنانچہ وہ اس بات کو جابجا کہتے ہیں۔ ؎

(آیات و احادیث کے مضامین نظم مرزا صاحب کے)

ہے مجھ کو استفادہ حدیثوں کی سیر سے + واللہ ننگ و عار ہے مضمون غیر سے
شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں + ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

کلام معصومین علیہم السلام سے جو مضامین مرزا صاحب نے لئے ہیں۔ وہ مفصل لکھوں۔ تو بارہ چودہ جزو کی ایک مستقل کتاب ہو جائیگی۔ اس لئے فقط دو تین نمونے دکھاتا ہوں

(۱) جناب امیرؑ ایک مختصر خطبہ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں۔ ان المرء اذا ھلک

قال الناس ما ترك وقالت الملئکه ما قدّم؎۔ اس کا ماحصل اس رباعی میں نظم فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی عزت بڑھاتے ہیں :۔

مال وزرِ دنیا جسے ہات آیا ہے + مشکل سے کفن بعد فنا پایا ہے
چرچے یہ یہاں ہوتے ہیں کیا چھوڑ گیا + پرسش یہ وہاں اُس سے ہے کیا لایا ہے

(۲) امام حسینؑ نے اتمام حجت کے واسطے لشکریان یزید سے یہ بھی فرمایا تھا انا سبط المصطفٰے وسنقتل عطشانا؎۔ اس کا مضمون کس خوبصورتی سے اس ٹیپ میں نظم کیا ہے ؎

اک دم میں پسر احمدؐ کا نواسا نہ ملیگا + دریا کے کنارے تمہیں پیاسا نہ ملیگا

(۳) امام حسینؑ رجز میں فرماتے ہیں ؎

فَاَبِی شَمْسٌ وَاُمّی قَمَرٌ + فَاَنَا الکَوکَبُ وَابْنُ القَمَرَیْنِ

اس کا خلاصہ و ماحصل مرزا مرحوم نے نظم کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :۔

ہے مشرق و مغرب میں کوئی میرے برابر بابا مرا خورشید ہے مادر مری نور
اور اُس مہ و خورشید سے نکلا ہے جو اختر وہ میں ہوں چھپاتے ہو جسے خاک کے اندر
ہے نحس تمہیں کو یہ عمل حکم خدا سے
عقرب کا طریقہ نہ کرو آلِ عباؑ سے

دوسرا شعر امام مظلومؑ کے رجز کا یہ ہے ؎

فِضَّۃٌ قَدْ خَلَصَتْ مِنْ ذَھَبٍ + فَاَنَا الفِضَّۃُ وَابْنُ الذَّھَبَیْنِ

مرزا مرحوم نے اس کا ماحصل یہ نظم کیا ہے :۔

؎ جب آدمی مرجاتا ہے۔ تو دنیا کے آدمی پوچھتے ہیں۔ کیا مال چھوڑ گیا۔ اور فرشتے اُس سے پوچھتے ہیں کیا اعمال خیر لایا ہے ؎ یہاں ہے مال کی پرسش وہاں اعمال کی پرسش ۱۲ مؤلف حقیر۔

؎ میں محمد مصطفٰےؐ کا نواسا ہوں۔ اور پھر عنقریب پیاسا قتل ہوا چاہتا ہوں ۱۲ مؤلف حقیر۔

وہ نقرہ بے عیب کہ زر سے ہوئے پیدا ہے ذات مری۔ اوسعہ زر جیدۂ دو زہرا
جیتے ہوئے اُن کے کوئی آنچ نہ آئی اصلا تم کرتے ہو کُشتہ ہئے سیم و زر دُنیا

کُشتہ بھی جو ہم ہونگے تو اکسیر بقا ہیں
اب عیسےٰ دوراں ہیں تو پھر خاک شفا ہیں

تیسرے مصرع میں ایک روزمرّہ لطیف عین موقع پر نظم فرمایا ہے۔ آنچ آنا آفت آنے کے معنی پر اردو میں بولا جاتا ہے۔ اور چاندی اور سونے کو تپاتے ہیں۔ یہ آنچ آنیکی خصوصیت سیم و زر سے ہے۔ چوتھے مصرع میں کُشتہ کی لفظ عجیب لطیف آئی ہے۔ کُشتہ ایک تو مقتول کے معنی پر آتا ہے۔ دُوسرے چاندی کا کُشتہ ہوتا ہے۔ کُشتہ سے اکسیر بنتی ہے۔ پس کُشتہ ہو کر اکسیر ہو جانیکا ثبوت کس قدر عمدہ ہے۔ کہ بعد شہادت ہم خاک شفا ہونگے۔ خاک شفا تربت امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حیات و ممات میں ہم یکساں فیض رساں ہیں۔ اب اگر عیسےٰؑ عہد میں تو مرنے پر شہید راہ خدا ہو کر خاک شفا کا کام دینگے*۔

صنائع لفظی و معنوی

فصل ما صنائع لفظی و معنوی

جب مرزا صاحب کو سلیس نظم پر (اور زبان پر) مشق و قدرت ہوگئی۔ اور معلومات بھی بڑھ گئی۔ تو صنائع و بدائع کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس بات کا خیال رکھا۔ کہ ایسے اشعار بے تکلّف (حتے الامکان) ہوں۔ اور اس میں ایک حد تک وُہ کامیاب بھی ہُوئے۔ اور اُن کا اس قسم کا کلام بھی اکثر شعرا سے بہتر ہے۔ یہ بات جب صاف نظر آتی ہے۔ جب دُوسروں کا کلام صنائع و بدائع مرزا صاحب

* اور بھی اشعار رجنا امام حسینؑ کا ماحصل مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے جس کو میں نے جلد دوم حیات دبیر میں نقل کیا ہے۔ وہ مقام دیکھنے کے قابل ہے ۰۰ ۱۲ مؤلف حقیر

کے کلام کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس باب میں ایک ایک صنعت لکھ کر چند اشعار مرزا صاحب کے لکھتا ہوں۔ سخن فہم غور فرمائیں ۔

طباق۔ اس صنعت کو تقابل۔ تضاد۔ مطابقت۔ تطبیق۔ تکافو بھی کہتے ہیں۔ اسی کی ایک شاخ صنعت مقابلہ ہے۔ یہ صنعت قرآن شریف میں بھی موجود ہے۔ تحسبھم ایقاظاً وھم رقود الآیۃ[۲]۔ یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کر دیں۔ جو آپس میں مطابق یا متقابل یا متضاد ہوں لہٰذا ایسے اشعار مرزا صاحب کے سُنیئے:۔

(۱) شجاع ازلی حسینؑ ابن علیؑ لڑنے کو میدان میں آتے ہیں۔ لشکریان یزید کہہ رہے ہیں:۔

حق یہ ہے رگ و ریشہ میں ڈر بیٹھ گیا ہے ۔ کیا پاؤں اُٹھیں سن کو کہی بیٹھ گیا ہے

اُٹھیں اور بیٹھ گیا میں تضاد ہے ۔

۱؎ مولوی شبلی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۰۰ پر گویا مانتا ہے کہ مرزا صاحب میر صاحب سے ان اوصاف میں گھٹے ہوئے ہیں مگر از بسکہ ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ کسی صنف کلام میں بھی مرزا صاحب کو ترجیح و تفضیل دی جائے اس وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں کہ میر صاحب کی اصل فطرت میں سلامت و اعتدال تھا اس لئے وہ خیال بندی و مضمون آفرینی میں باوجود ان کے حریفوں کے مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھئے یہ خیال بندی و مضمون آفرینی کو شاعری کی وہ صنعت ہے خلاف اعتدال و فطرت بتاتے ہیں جبکہ میں اکثر صنائع قرآن شریف میں دکھاتے ہیں تو کیسے ان کو خلاف فطرت بتاتے ہیں یا ضد اعتدال و سلامت قرار دیتے ہیں خصوصاً جب کلام دبیر صنائع میں سلیس بھی ہے تو اس کو دیکھا کیجئے اگر اب بھی نہ مانیں تو میں کہوں گا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں ع مقتضائے طبیعتش این ست ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

۲؎ تو ان کو جاگتا ہوا سمجھتا ہے اور وہ سو رہے ہیں۔ جاگنے اور سونے میں تضاد ہے بعض بزرگوار ان صنائع کی نسبت میر کی حد میں آ کر فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں یا فصاحت و بلاغت میں نامقبول ہو چکی ہیں جیسا کہ پروفیسر آزاد مرحوم نے بعض لکھنو کا قول نقل فرمایا ہے میں ان سے پوچھتا ہوں کیا قرآن شریف سے بڑھکر مسلمانوں کے اعتقاد میں کوئی بافصاحت بلاغت کلام ہے اور کوئی نہیں ہے اور مرزا صاحب نے صنائع و بدائع بے تکلف نظم فرمائے ہیں ان کو حذف کرنا ہے کہ اگر بلاغت و فصاحت کے مرزا صاحب خلاف دائرہ بیان ہیں تو کوئی مسلمان ہرگز نہ مانیگے میں آپ کی شان میں ادا کرونگا کہ قرآن شریف کی صنعت کرے اور کسی شخص مخفی کی تعریف کی دیکھا دیجئے ہو صنائع و بدائع کو کلام خالی ہے وہ شاعر نہیں بلکہ تک بند ہے۔ بیشک صنائع کا کلام میں کھپا دینا ایک خوبی ہے مگر جب کلام تصنع سے خالی اور صاف ہو اور صنائع بھی آ جائیں جیسا کلام دبیر میں ہے تب ہی کلام اعلیٰ درجہ کا ہوگا نہیں ۔ مؤلف حقیر۔

(۲) رجز میں امام حسینؑ فرماتے ہیں۔

جب روزِ حساب آئیگا فریاد کرو گے + بھولے ہوئے ہو خیر کبھی یاد کرو گے

(۳) عید آئی ہے۔ اور حسنینؑ کے پاس پوشاک نہیں ہے۔ اُس موقع پہ کہتے ہیں ۔ ؎

رنگین لباس سے تو یہ خود نا اُمید تھے + نیرنگ دیکھنا کہ نہ رخت سفید تھے*

(۴) رات اخیر ہوئی۔ صبح نمودار ہے۔ ؎

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا + پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہو گیا

(۵) دُنیا مقام عبرت ہے۔ ہر شخص مرنے کو پیدا ہوا ہے۔ ؎

جو مر گئے مٹی ہیں جو زندہ ہیں مریں گے + تجھ کو بھی تو ہیں بعد ترے یاد کریں گے

(۶) شجاعت جناب امیرؑ اور بیر السلم میں جنوں پر فتح پانا۔ ؎

جنات پہ تو فتح نہ پائی تھی کسی نے + اس آگ کو پانی کیا کس طرح علیؑ نے

(۷) حبیب ابن مظاہر اسدیؓ کی بڑھاپے میں ثابت قدمی (میدان جنگ میں)۔ ؎

سر ہلتا ہے پر ہر کف پا رن میں جمی ہے + جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

(۸) جناب زینبؑ دربار یزید میں سفیر سلطان روم سے فرما رہی ہیں (امام حسینؑ کی نسبت) ؎

حق پر سوا ہے فرقہ باطل سے پوچھ لے + سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

(۹) حضرت عباسؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ خوف و رعب چھایا ہوا ہے۔ ؎

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحہ خیر + کہتے ہیں انا العبد لرزکر صنم و دیر

(۱۰) اے خانہ خراب قبر تیری خاطر + کھویا بھی جو نقد جان تو کیا خاک کیا +

(۱۱) آتے ہیں وہ دن لطف جوانی نہ ملیگا + ہم خاک میں مل جائینگے پانی نہ ملیگا +

(۱۲) اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر + جو اوڑھنا ہو گا وہ بچھونا ہو گا +

(۱۳) منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے + انصاف تو کہتا ہے خداوند سلو ہیں ہے +

* جن جن الفاظ میں مطابقت یا تضاد ہے میں نے ان پر ا۔ ۲ کے ہندسے بنا دئیے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۴) حق عاشقی حق کا ادا شہ نے کر دیا + دشمن کو راہ دوست میں خوش ہو کے سر دیا +

(۵) پھسلا نہیں کھلتا ہے فلک دور کسی کا + یاں آج تلا ہے دور کھل اور کسی کا +

(۶) ہے فاش ہر اک شامی بدذات کا پردہ + چھپ چھپا نیکو دن ڈھونڈتا ہے رات کا پردہ +

(۷) لینا نہ منہ پہ ڈھال کر دینا جناب سے + دینا نہ آبرو کہ یہ موتی کی آب ہے +

ایہام

ایہام - یہ بھی صنعت طباق کی ایک پھلی پھولی شاخ ہے - اس کی قسمیں ایہام التضاد و ایہام تناسب ہیں - ایہام کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں - یعنی ایسے دو لفظ آئیں جو بظاہر آدمی کو وہم میں ڈالیں - کہ یہ باہم ضد و متقابل یا متناسب ہیں - مگر اُن میں سے کسی ایک کے معنی مصنف نے دُوسرے لئے ہوں - قرآن شریف میں بھی یہ صنعت اس آیت میں موجود ہے - والشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان - نجم کے دو معنی ہیں - ایک ستارہ - دُوسرے وہ نبات جو ساق نہیں رکھتی - جیسے ساگ وغیرہ - اور جو نبات ساق دار ہے - اُس کو شجر کہتے ہیں - پس شمس و قمر کے ساتھ ساتھ نجم آنے سے یہ وہم ہوتا ہے - کہ نجم سے مراد ستارہ سے ہوگی - مگر یہاں نبات بے ساق کے معنی پر آیا ہے - یہ صنعت بھی مرزا صاحب کے یہاں ہے +

(۱) عرش فلکی برج کے نقیبانہ پکارے + ہشیار - خبردار - پرے[۱] سے - دُور کنارے +

(۲) سر سے ہے نجف کا یہ سخن گرد نہیں ہے + آمد[۲] کے مضامین ہیں آورد نہیں ہے +

(۳) عبداللہ ابن عامر صحابی جناب رسول خدا کے گھر لڑکی (ہند) پیدا ہوئی ہے - وہ جناب فاطمہ زہرا کے قدم کے نیچے کی خاک خوش اعتقادی کے دامن میں باندھ کر گھر لے گیا - اور

سلہ پرے کے ایک معنی لشکر کی ایک ٹولی - دُوسرے معنی پرے ہو یعنی ہٹ کے ہو جاؤ - جو ورے کی ضد ہے دہلی والے بولتے ہیں - عام اہل لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے - یہاں معنی آخر لئے ہیں + ۱۲ مؤلف عفی عنہ -

سلہ آمد کے دو معنی ہیں - ایک تو حضرت عباسؑ کے میدان جنگ میں آنے کے مضمون ہیں - دُوسرے آمد کے مضامین جو فی الفور ذہن میں آ جائیں - اس کی ضد آورد ہے - یہاں معنی آخر مراد ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

لڑکی کی آنکھوں میں بجائے سُرمہ لگائی - اُس روایت کو نظم کرتے ہُوئے لکھتے ہیں :-

اُس خاک کا سُرمہ جو دیا آنکھوں میں گھرا ہر چشم میں اک نُور کا چشمہ گیا لہرا

تھا خاک میں نورِ قدمِ فاطمہ زہرا پارا ہُوا کاجل نہ کسی آنکھ میں ٹھہرا

یہاں مصرع چہارم میں صنعت ایہام ہے - ایک تو یہ معنی ہیں - کہ کاجل پارہ ہوگیا - مٹ گیا - اُڑ گیا - دُوسرے یہ کہ عورتیں کاجل پارتی ہیں یعنی دلیسی تیل چراغ میں جلا کر ایک سکورا اُس پر ڈھکر کاجل اُس کے دھوئیں سے لیتی ہیں - اُس کو پارا ہُوا کاجل کہتی ہیں - یہاں یہی اصطلاح رکھی ہے - اس لئے صنعت ایہام ہے :-

مراعات النظیر اور اس پر ایک بحث

مراعات النظیر - اس صنعت کو توفیق - تناسب - ایتلاف - رعایت لفظی بھی کہتے ہیں - یہ صنعت بھی طباق کی گویا چھوٹی بہن ہے - فرق صرف اسقدر ہے - کہ اس میں ایسی چند چیزیں مذکور ہوتی ہیں - جو باہم ضد و مقابل تو نہ ہوں - مگر متناسب ہوں - صاحب حدائق البلاغہ نے ایہام متناسب کو اسی سے ملحق بتایا ہے - اس صنعت کا حسن یہ ہے - کہ بہت اُبھری ہُوئی رعایت نہ ہو - ورنہ پھر اُس کو ضلع جگت کہینگے - اُس میں ایک قسم کا ابتذال ہو جاتا ہے - اُردو کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ وَلی دکھنی کے بعد جو دہلی وغیرہ میں شاعرانِ اردو ہُوئے - اُن کو اس کا اور ایہام کا بڑا شوق تھا - حضرت سوداؔ کے وقت میں بھی عام شاعروں کو یہ سودا تھا - حضرت سوداؔ اور جناب میرؔ مرحوم نے جو اس کا فیصلہ فرمایا ہے - اُس سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ دونوں قُدرتی شاعر اس کی بھلائی اور بُرائی اور قابل استعمال مقدار مناسب کو خوب جانتے تھے - اور ذوق سلیم پایا تھا - چنانچہ حضرت سوداؔ فرماتے ہیں -

کامل فنِ سخن کہتے ہیں اُس کو اکمل ہر ورش لفظ کی منظور ہو جس کو آوَّل

پر نہ یاں تک کہ عبارت ہی کو کردیں مہمل اعتقاد اُن کا ہے یُوں - وہ جو کہے ہیں اجہل

مُو نہ ہو پرورش شانہ میں تو ہم مُوسَل

میر صاحب ایہام کے باب میں فرماتے ہیں[1] "در شاعران سلف این فن رواج داشت اکنوں طبعہا مالوف بایں صفت کم است مگر بسیار برجستگی و رفتگی بستہ شود۔ یعنی ایہام این ست کہ لفظے کہ برا و بنائے بیت بود۔ آں دو معنی دارد۔ یکے قریب۔ دویم بعید۔ و بعید منظور شاعر باشد۔ و قریب متروک۔" اُس کے بعد انشا و مصحفی کے زمانہ میں بھی اس کا رواج کم رہا۔ ناسخ کے زمانہ میں تو متانت اس قدر رواج پا گئی تھی کہ اُبھری ہُوئی رعایت لفظی اور ایہام وغیرہ کے پر جلتے تھے۔ آتش بھی سلجھے ہُوئے شاعر تھے۔ ناسخ کے بعض شاگردوں میں پھر اس رعایت لفظی نے آکر جنم لیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اور بھی لکھنؤ کے شاعروں میں یہ رنگ اُچھلا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اس کو لکھنؤ کا ہی رنگ کہنے لگے۔ مگر بعض شعرائے لکھنؤ نے اس تہذیب و متانت سے اس رنگ کو اختیار کیا۔ کہ زمانہ (حالانکہ اس رنگ کے گویا خلاف ہے۔ مگر پھر بھی) اُن کا لوہا مانے جاتا ہے۔ جیسے گلزار نسیم مشہور و مقبول مثنوی یا صبا وغیرہ کی بعض غزلوں میں ہے[2]۔ میں نے لکھنؤ کے بُڈھے بُڈھے اہل سخن سے اس رنگ کے عام پسند ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اُس زمانہ کے شعرا میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا تھا۔ کہ اردو کا مکمل لغت (مع مصطلحات) کلام شعرا سے طیار ہو۔ اور زبان اردو میں وسعت پیدا کی جائے۔ کہ ہر قسم کے روزمرے۔ محاورے۔ اصطلاحات۔ امثال کثرت سے نظم ہوں۔ ان سب کے

---

[1] اگلے شاعروں میں ایہام بہت شائع تھا۔ اب طبیعتیں اس سے کم مانوس ہیں۔ مگر بہت خوبی و صفائی سے باندھا جائے۔ ایہام کی تعریف یہ ہے کہ جس لفظ پر بنائے بیت ہو۔ اُس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب فہم۔ دوسرے بعید فہم۔ اور شاعر نے بعید الفہم معنی رکھے ہوں۔ اور قریب الفہم کو چھوڑ دیا ہو ۱۲ مؤلف

[2] گلزار نسیم میں اس صنعت کے بیشمار رنگا رنگ گُل کھلے ہوئے ہیں۔ مزہ دار پھل لگے ہوئے ہیں۔ ہر چند زمانہ میں دوسری ہوا چلنے لگی اور لوگ ایسی صنعتوں کو تکلف بلکہ تکلیف دہ سمجھنے لگے مگر بحمد اللہ چشم بد دور گلزار نسیم خزاں سے محفوظ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُس کی رعایت لفظی اُبھری پھُبتی نہیں ہے۔ اور نسیم باتیں ہی نہیں بناتے۔ بلکہ رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ مضامین کا گلدستہ پیش کرتے ہیں خواجہ حالی بھی لفظی کے سوا ہر اہل سخن اُس کا ہوا خواہ ہے۔ ملاحظہ ہو خواجہ حالی صاحب کا دیباچہ دیوان بہت شعر و شاعری پر ۱۲ مؤلف

واسطے رعایت لفظی وایہام سے بڑھ کر کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے اکثر شعرا ناسخ مرحوم کے انتقال کے بعد ادھر جھک پڑے۔ اور رعایت لفظی وایہام وغیرہ کے خوب گل کھلائے۔ گل چھرے اُڑائے۔ جناب امانت مصنف اندرسبھا کو اس صنعت کا بڑا شوق تھا۔ اُن کے قدم بقدم مشیر لکھنوی مرثیہ گو نے چل کر سرسبیوں میں سرسوں کے پھول کھلائے ہیں۔ باغ نظم میں نئے گل بُوٹے لگائے ہیں۔ جن کا مثل ونظیر آج رُوئے زمین شاعری پر مجھ کو نہیں ملتا۔ جن بعض ذیعلم ومتین شعرا نے اُس کو اُبھرنے نہ دیا۔ اور مضمون کو مقدم رکھا۔ اُنہیں میں سے ہمارے ممدوح دبیر مرحوم ہیں +

بیان رعایت لفظی

اس میں شک نہیں۔ کہ اگر یہ رعایت لفظی وایہام خوبصورتی سے بندھ جائے۔ تو کلام میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک شعر بہادر شاہ ظفر مرحوم اخیر بادشاہ دہلی کا مجھے بہت پسند ہے۔ وہ یہ ہے ۔ؔ

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑے کی طرح صاف جواب + اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

اس میں ایک محاورہ ٹکڑے کی طرح توڑ کے جواب دینے کا اور دوسرا گھر کے ٹکڑے کھا کر پلنے کا نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔ اور ٹکڑے کے لفظ میں صنعت مراعات النظیر ہے۔ یہ شعر ضرور قابل تعریف ہے۔ جو لوگ اس رنگ کو محض اس خیال سے ناپسند کرتے ہیں۔ کہ یہ لکھنؤ کا رنگ خاص ہے۔ اور وہ خود دہلی کے رنگ کے پسند کرنے والے ہیں۔ وہ زبان کا مذاق سلیم نہیں رکھتے۔ یا تعصب زبانی ومقامی سے کام لیتے ہیں

حکایت ولطیفہ

(حکایت ولطیفہ) نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جس زمانے میں (عہد اختر محمد علی شاہ و عہد امجد علی شاہ مرحومین میں) لکھنؤ میں یہ رنگ اُچھل رہا تھا۔ مرزا صاحب نے تلوار کی شررافشانی میں ایک مرثیہ میں یہ ایک بند کہا تھا ۔ؔ

شامی کباب تھے یہ ہوئے جب شرر فشاں | اہل تتار بن گئے ہرن۔ بن سے تھے رواں
مصری نہ بات کر سکے سنتے ہی الاماں | بُت بن کے گبر رہ گئے پتھرائیں پتلیاں

زرداِر۔ زرد ہو کے گلِ اشرفی بنے
نصرانی۔ خاک ہو کے گلِ ارمنی بنے

لوگوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دئے۔ لکھنؤ میں بڑا شہرہ ہُوا۔ حالانکہ مرزا صاحب کو نہ اس رنگ پر فخر و ناز تھا۔ نہ وہ اس کو دل سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ مگر ازبسکہ ہر رنگ میں کہتے تھے۔ اس طرز میں بھی کہدیا۔ اُس زمانے کے ایک مشہور شاعر تھے جو مرزا صاحب کے مقابلہ کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیاب نہ ہوتے تھے[1] اُنھوں نے بھی اسی طرز میں ایک بند کہا۔ اور لوگوں سے کہا کہ مَیں نے ایک مرثیہ کہا ہے۔ جس میں اکثر صنائع و بدائع ہیں۔ اگر کوئی بڑی مجلس ہو۔ تو مَیں پڑھوں۔ مگر دبیرؔ و انیسؔ کے لکھنؤ میں ایسے جھنڈے گڑے ہُوئے تھے۔ کہ ان دونوں کے سوا کسی تیسرے ذاکر کے پڑھنے کی مجلس میں ویسا مجمع مشکل سے ہوتا تھا[2]۔ آخر جب بڑی مجلس میں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ تو اُنھوں نے ایک بڑے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے پوچھا۔ صاحبو۔ اگر اجازت ہو۔ تو ایک اپنے نئے مرثیہ کے (رزم کے) چند بند غزل سے پہلے سناؤں؟ چاروں طرف سے (اُن کے شاگردوں اور طرفداروں کی) آوازیں بلند ہُوئیں بسم اللہ۔ ضرور عنایت کیجے۔ اُنھوں نے چند بند پڑھ کر ایک بند کا صرف ایک مصرع (مندرجہ تحت) پڑھا۔ شامی کباب تھے جو پسندِ قضا ہُوئے۔ اس میں شامی کباب کی

---

[1] مَیں نام نہیں لونگا۔ کیونکہ کسی اُستاد کی منقصت کرنیکو مَیں ناپسند کرتا ہُوں ۱۲+ مؤلف حقیر۔

[2] اور اگر مجمع کثیر ہوتا تھا۔ تو پھر انہیں دونوں (دبیرؔ و انیسؔ) کے کسی مشہور شاگرد کی مجلس میں۔ آغا میر اور شیخ امیر علی میر صاحب کے شاگردوں میں۔ اور میر شرف الدین و میر محمد رضا و میرزا مغل مرزا صاحب کے شاگردوں میں لکھنؤ میں بہت اچھے پڑھنے والے ذاکر زمانہ شاہی میں مشہور تھے۔ میر مظفر حسین صاحب مدظلہ (جن کا ذکر پہلے ہو چکا) مجھ سے فرماتے تھے کہ مقبولیت میں تھے میر محمد رضا ظہیر کے پڑھنے کی مجلس میں دیکھی کہ اُسی محلہ میں میر صاحب یا مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ ہیں قریب یہ پڑھ رہے ہیں۔ اور دونوں جگہ معقول مجمع ہے ۱۲+ مؤلف حقیر۔

رعایت لفظی پسند سے کے ساتھ تھی۔ اور وہ بزرگوار رومی کالبادہ پہنے ہوئے تھے کچھ پہلے سے پھولے ہوئے تھے۔ کچھ اہلِ مشاعرہ کی تعریفوں سے اور بالیدہ ہو گئے۔ کہ اتنے سبحان اللہ۔ واہ وا۔ ماشاء اللہ۔ کیا کہنا۔ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ایسی ایسی آوازیں بلند ہوئیں۔ انہیں آوازوں میں ایک شخص نے آوازہ کسا۔ کہ "چھوڑ دے بغل سے بھیڑ کا بچہ"۔ ایسی پھبتی پھبی۔ اور ایسا قہقہہ ہوا۔ کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے بعض شاگرد بولے۔ ہائیں یہ کون تھا۔ کوئی بولا۔ اِدھر سے آواز آئی۔ کوئی بولا اُدھر سے۔ مگر تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ کون ذات شریف تھے۔ وہ شاعر کچھ ایسے غصہ ہوئے۔ کہ معمولی غزل بھی انہوں نے نہ پڑھی۔ اور مشاعرہ بھی برخاست ہو گیا+

المختصر مرزا صاحب کے کلام میں رعایت لفظی اُبھری ہوئی بہت کم ملیگی۔ گویا نہیں ملیگی۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جن میں رعایت متانت کے ساتھ ہے۔

(۱) بحرِ تلاطم — واللہ ہات دونوں گے فاسق کے ہات میں / سر جائیگا پہ فرق نہ آئیگا بات میں

(۲) ایضاً — ہر موج پہ لرزاں ہے۔ سلیماں کی ہے آمد / فرعونیوں پہ موسیٰ عمراں کی ہے آمد

(۳) ایضاً — جن سیر کو نکلے تھے پہ رستے سے مڑے ہیں / پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اُڑے ہیں

(۴) منسرح حال میں — *ہر شمعے پہ سرگرم خواصیں ہوئیں آکر / منہ ہات دھلانے لگی اک اشک بہا کر

اک جامہ سے باہر ہوئی پوشاک پہنا کر / اک تکیہ بزانو۔ ہوئی مسند کو بچھا کر

آئینہ دکھا کر۔ اُسے حیران ہوئی کوئی

سر گوندھ کے بی بی کا۔ پریشاں ہوئی کوئی

(۵) خوفِ غم — دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں / پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں

(۶) امام عصر — نظارہ غنیمت رُخِ پر نور کا جانا / موسیٰ کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا

(۷) رجوعِ امام حسین علیہ السلام — مشہور زباں نبی عرش نشیں ہیں / واللہ کسی بات میں ہم بند نہیں ہیں

* جن الفاظ میں رعایت لفظی ہے۔ ان پر خط کھچا ہوا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جس کو مرض الموت ہو ہم اس کو شفا دیں ۔ خود پیاسے ہیں جو چاہیں جسے آب بقا دیں

عکس۔ اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں۔ پھر اُن دونوں کو اُلٹ پلٹ دیں یعنی دوسرے کو پہلے لے آئیں اور اوّل کو ثانی کر دیں۔ یہ صنعت قرآن شریف کی اس مشہور آیت میں ہے۔ یخرج الحیّ من المیّت و یخرج المیّت من الحیّ[1] مرزا صاحب اس صنعت میں فرماتے ہیں۔

دل صاف کہاں ہے جو کہ انصاف نہیں ہے + انصاف کہاں ہے جو کہ دل صاف نہیں ہے

ناظرین انصاف سے دیکھیں۔ الفاظ انصاف و دل صاف کو کس صفائی سے عکس و تبدیل کیا ہے۔ صنعت کا کمال دکھایا ہے[2]۔ صنائع و بدائع کے پسند کرنے والوں پر منحصر نہیں۔ عام

---

[1] لفظی معنی یہ ہوئے کہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو خدا نکالتا ہے۔ مرادی معنی یہ مشہور ہیں کہ عالم سے جاہل کو اور جاہل سے عالم کو خدا پیدا کرتا ہے۔ ۱۲ مؤلف عفی عنہ

[2] اس موقع پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی صنعت لطیف کو ایک مسلمان عالم بلکہ شمس العلماء وہ کون؟ مولوی شبلی صاحب یعنی اس شعر کو مکروہ بتاتے ہیں جن کی ہر ایک غلط مرزا صاحب کے محاسن کلام دیکھ کر خود استادہ ہو جاتی ہے۔ اور فوراً یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عیب نکالوں۔ ملاحظہ ہو موازنہ کا صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۸۔ دوسرا الزام یہ لگایا ہے کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے اس شعر کو اُلٹا ہے ؎ عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے ۔ اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے ۔ حالانکہ یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ میر صاحب کا شعر مقدم ہے۔ اس سے زیادہ میں اس جگہ لکھتا مگر مرزا صاحب مجھے اپنا شعر پڑھ کر منع فرما رہے ہیں ؎ برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے ۔ آئینۂ دل اپنا ہر اک سے صاف ہے ۔ مطلب یہ نکلا کہ اس صنعت عکس میں مرزا صاحب سے مولوی شبلی صاحب برعکس و برخلاف ہیں مگر مرزا صاحب کا آئینۂ دل اُن سے بھی صاف ہے۔ اس لئے میں نے سمجھا کہ مرزا صاحب نے مولوی صاحب کو بخش دیا مگر میں مشفقانہ و مخلصانہ مولوی صاحب کو مشورہ دیتا ہوں کہ زندگی کا اعتبار نہیں۔ قرآن شریف میں جو صنعت ہے اس کو مکروہ بتاتے ہیں یہ اعتراض اُن کا جناب احدیت تک پہنچتا ہے۔ جلد توبہ کر کے غلطی سے اپنی صفائی حاصل کر لیں۔ میں نے دوستانہ عرض کیا ہے مولوی صاحب کو ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے ؎ حافظا وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس ۔ دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید ۔ ۱۲ مؤلف عفی عنہ

طبیعتوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور کیسی سچی بات کہی ہے۔ کہ جس شخص کا دل صاف نہ ہوگا انصاف کیا خاک کریگا۔ اور جس کی طبیعت میں انصاف نہ ہوگا۔ کبھی اُس کا دل صاف نہ ہوگا۔

امثلہ

رجوع۔ یہ صنعت اس طرح پہ ہے۔ کہ خود ہی شاعر پہلے ایک بات کہتا ہے۔ پھر خود ہی اُس کی تردید کر کے دوسری بات کہتا ہے۔ اور اسی طرح مدح میں ترقی کرتا ہے۔ مرزا صاحب سراپائے جناب علی اکبرؑ میں فرماتے ہیں:۔

بینی کی مثال مثل قلم زیب ورق ہے — انگشت ید قدرت حق کہئے تو حق ہے
ابرو کے شرف کا سر بینی پہ سبق ہے — یہ ناخن انگشت ید قدرت حق ہے
دل شیعوں کا چھیدہ نہ کیوں اس سے سدا ہو
ممکن نہیں ناخن سے کبھی گوشت جدا ہو*

خورشید جبیں کا سر بینی ہے یہ اظہار — خورشید لہو میں نیزے پہ کل ہوگا نمودار
تو ہے کہاں نیزہ کہاں۔ بینی خوش اطوار — چشم علی اکبر ہے در رحمت غفار
دربان کہوں ابرو کو یہاں میں تو بجا ہے
بینی مبین حاجب ابرو کا عصا ہے

* پہلے بینی کو قلم سے مثال دی پھر دست قدرت حق کی انگشت بتا کر ابرو کو ناخن سے تشبیہ دی پھر نیزہ سے تشبیہ دیکر پیشانی کو آفتاب بتا کر یہ مضمون پیدا کیا کہ کل ہی آفتاب (سر علی اکبر جو مثل آفتاب تھا) نیزے پر طلوع ہوگا جس طرح مشہور ہے کہ قیامت میں سوا نیزے پر ہوگا پھر اس سے ترقی دیکر آنکھ کو رحمت غفار کا دروازہ بتایا اور ابروؤں کو دربان اور دربان کا عصا بینی کو بتایا پھر غرض ترقی دیکر یہ مضمون پیدا کیا کہ ناک دونوں آنکھوں کے درمیان میں حق بجانب ہے [illegible] نہیں کہتے [illegible] تحسین کرتے ہیں تمام مضامین پر ترقی کر کے فرماتے ہیں کہ یہ قلم ہے نہ نیزہ نہ عصا ہے نہ تکیہ بلکہ [illegible] حضرت موسیٰ [illegible] کا نقش [illegible] تو دیکھو نقش ناک ایک [illegible] آنکھوں [illegible] پس گویا دو عالم چشم کا [illegible] ہو گیا [illegible] ۱۲ مؤلف حقیر۔

بینی کا کھلا بیچ میں آنکھوں کے یہ اسرار　　　ہے بیچ میں اک تکیہ تو دو جانب ہیں دو بیمار
بیمار ہیں مخمورِ مئے الفتِ غفار　　　بیہوشی میں بھی شبیر یہ تکیہ نہیں زنہار
پلکوں کے سوا نام کو بستر نہیں رکھا
سونا کہاں تکئے پہ کبھی سر نہیں رکھا

پھر مدحت بینی میں مری عقل رسا ہے　　　نیزہ ہے نہ تکیہ ہے نہ خامہ نہ عصا ہے
اب ہم سے محبان علیؑ پوچھیں یہ کیا ہے　　　ہشیار رہو ہشیار یہ غش ہونے کی جا ہے
بینی کی زیارت کرو آداب سے ہٹ کر
اک جا ہوا ہے۔ نور دو عالم کا سمٹ کر

(۲) صنعت رجوع میں ایک یہ بند بھی مدح سراپائے ہمشکل محبوب خداؐ میں قابل صاد ہے۔

تاروں کا ہے دعوے کہ یہ رخ بدر دجیٰ ہے　　　پر بدر ہے منکر۔ یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذروں کا اشارہ ہے کہ یہ شمس ضحیٰ ہے　　　خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے
پروانہ و بلبل میں جدا بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

لف و نشر۔ لف کے معنی لپیٹنے کے اور نشر کے معنی بکھیرنے کے ہیں۔ یہ صنعت اس طور پر ہے۔ کہ اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ پس اگر منسوبات نمبروار لائیں۔ تو اُس کو لف و نشر مرتب کہتے ہیں۔ اور یہ اعلےٰ قسم ہے۔ ورنہ غیر مرتب کہینگے +

خدائے سخن فردوسی طوسیؒ کا ایک مشہور قطعہ ایرانیوں میں لاجواب مانا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند　　　بشمشیر و خنجر و بگرز و کمند

بدرید و ببرید و بشکست و ببست یلاں را سر و سینہ و پا و دست*

خلاصہ اس کا ظاہر ہے کہ بہت بڑا مضمون تھوڑے لفظوں میں آگیا۔ یہ صنعت نظم و نثر دونوں میں آتی ہے۔

اب اردو کے خدائے سخن دبیر کی نظم اس صنعت میں سنئے۔ اور انصاف فرمائیے کہ کس کی نظم بہتر ہے۔ یہ میں عرض کرونگا۔ کہ ایجاد و تقدّم کا فخر تو فردوسی کو ہے۔ مگر وہ ایک معمولی پہلوان کی مدح کرتا ہے۔ جو اُسی (فردوسی) کا بڑھایا ہُوا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

منش کردہ ام رستم داستاں وگرنہ یلے بود در سیستاں

اور دبیر کے ممدوح معمولی پہلوان نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کا زور خدا داد ایسا ہے۔ کہ ویسے بہادر خدا کی خدائی میں نہیں ہوئے۔ واقعہ کربلا زبان حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ دبیر کے ممدوح کو خدا نے بڑھایا ہے۔ بہرحال کلام دبیر ایسے شجاع ازلی ولی ابن ولی جانِ محمدؐ دلبندِ علیؑ کی مدح میں ہونے سے ضرور فردوسی کے کلام پر ترجیح و تفضیل پانیکا حق رکھتا ہے۔ یا اُن کے بھائی (ابو الفضل العباسؑ) یا فرزند (علی اکبرؑ) کی مدح میں ہے۔ تو وہ کلام بھی مرتبہ میں قریب قریب اُسی مدح امامؑ کی ہے۔ یا اور شہدائے کربلا کی ثنا میں ہے جب بھی دُنیا کے معمولی لوگوں سے بدرجہا بہتر و اعلےٰ ہے۔ اس لحاظ سے کلام دبیر کلام فردوسی سے بہتر ہے۔ اور جو صفائی اور بیساختہ پن مرزا کے کلام میں ہے۔ اُس سے بھی ضرور مرزا کے حق میں افضلیت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے۔ کہ فردوسی نے تو صرف ایک قطعہ کہا۔ مرزا نے لف و نشر کے دفتر لکھ دئے ہیں۔

(۱) شجیع عالم امام زماں امام حسینؑ جہاد راہ خدا کے واسطے آرہے ہیں۔ اُس امام کی ہیبت سے جو عالم کی کیفیت ہے۔ اُس کی تصویر دیکھئے۔ اس تصویر دیکھنے کے واسطے تھوڑی دیر

* میں نے لف و نشر الفاظ پر نمبر لگا دئے ہیں۔ تاکہ سمجھنے والے نمبر ملا کر سمجھ لیں یعنی تلوار سے سر پھاڑا (کاٹا) خنجر سے سینہ کاٹا۔ گرز سے پاؤں توڑے۔ کمند سے ہاتھ باندھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے لئے دوسرے عقیدہ رکھنے والوں کو بھی مصنف کی عقیدت کی جھلک لگانا چاہئے کہ جو امامؑ کو خدا کا جانشین زمین پر سمجھتے ہیں۔ اور ہر شے کو امامؑ کا تابع جانتے ہیں۔ جیسے صوفی غوث کو سمجھتے ہیں۔ اور اُس زمانہ کا غوث صوفی بھی امام حسین علیہ السلام ہی کو سمجھتے ہیں۔

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم　　وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم[۱]
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم　　جس طرح سے آندھی میں گریں خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خوں سے۔ اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

(۲) امام حسینؑ میدانِ جنگ میں تشریف لاتے ہیں۔ عالم پر ہیبت طاری ہے۔

یاں بخت وہاں عمر ادھر عقل اُدھر ہوش　　خوابیدہ و برباد و پراگندہ و روپوش
یاں ناطقہ واں حافظہ خاموش و فراموش　　بے نور ادھر چشم تو بے بہرہ اُدھر گوش
واں شیرِ فلک جھکتا ہے تسلیم کی خاطر
یاں گاوِ زمیں اٹھتی ہے تعظیم کی خاطر

(۳) جہاد میں امام حسینؑ کی شمشیر شرربار (ذوالفقار) علم ہے۔

ایمان و کفر و توبہ و عصیان دمِ جہاد　　یہ زندہ اور وہ مردہ یہ خوشدل وہ نامراد[۲]
کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیر خوش نہاد　　جوہر کمند۔ نوک سناں۔ رعد برق و باد
دشمن کو قید آب و خورش سے چھڑا دیا
کھینچا۔ گرایا۔ مارا۔ جلایا۔ اڑا دیا

۱؎ صرف دل کے دو مصرعوں میں لف و نشر مرتب ہے۔ چرخ کو سکتہ۔ دشت کو گرد۔ کہسار (پہاڑ) کو رعشہ اور سمندر کو تلاطم عطا کرنے قرار دیا ہے۔ باقی چار مصرعے میں نے اس خیال سے لکھ دئے ہیں کہ بغور اہل نظر تشبیہ و مضمون کا لطف اٹھائیں …
۲؎ ایمان زندہ ہو گیا کفر مردہ۔ توبہ خوشدل گناہ نامراد ہو گئے۔ کمالات متضاد ہیں …

تمہید علم عباس

(۴) حضرت عباسؑ کا تھے انداز سے سراپا لف و نشر - امفتر طلیک بند ہیں -

طیار مرقع ہو - اگر نور خدا کا ہو زیب رقم اسم اگر عرش علا کا
قالب جو بنے شاہ شہیداں کی ولا کا اور عطر کھنچے صاف گل مہر و وفا کا

مداح علمدار کہے قدرت حق ہے
عباسؑ کا یہ سر ہے - یہ تن ہے یہ عرق ہے

(۵) جناب رسول خدا صلعم کا خاص گھوڑا عقاب نام جس پر ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ (شہید) سوار ہو کر جہاد کو جا رہے ہیں - اُس کی مدح -

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب
خورشید و سحاب و فلک و انجم و مہتاب سوزاں و خروشاں و سراسیمہ و بے خواب

بازار گل و موج و صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے وہ آب ہے - وہ گرد ہے اس سے

بدحواسی

(۶) آمدِ علی اکبرؑ سے لشکرِ مخالف میں جو انتشار اور بدحواسی ہے - اُس کی تصویر اور عام چیزوں پر اُس کا اثر شاعرانہ -

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۲) بہنے کی تیسرے سے بجھ گیا دیا کہ وہ مرگیا کھانے پینے کی فکر نہ رہی تلوار کند کام دیا کہ دشمن کو کھینچا یعنی اپنی طرف کو کھینچا کہ کمر کو بلند ادھیلی کی طرح جھایا آندھی کی طرح آڑا دیا - سبحان اللہ کتنا بامضمون ایک بند ہیں صفائی سے لائے ہیں ۰

ایک بات

اب ایک بات فردوسی کے قطعہ میں ہر ایک چیز کے دو منسوبات تھے - اِس کے مرزا صاحب کے کلام کے نظائر میں ہر چیز کا ایک ہی منسوب آیا ہے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فردوسی کا کمال بڑھا ہوا ہے - اس لیے اب میں مرزا صاحب کا ایک بند سنانا چاہتا ہوں جس میں ایک ایک چیز کے گویا پانچ پانچ منسوبات ہیں - اور پھر لف و نشر مرتب ہے - غیر مرتب نہیں ہے - یہ وہ کمال ہے کہ جس میں مرزا صاحب پنجتن پاک کے مداح ہیں اس لئے منسوبات بھی پانچ پانچ نکلے - وہ بند نمبر ۷ پر میں لکھتا ہوں سنئے اور انصاف فرمائیے کہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کا یہ قول کہ "تمام شاعروں سے فردوسی و جامی اور فردوسی جامی سے دبیر و انیس بہتر ہیں" کس قدر صحیح ہے ۰ ۱۲ مؤلف حقیر

بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا

کمال یہ کیا ہے۔ کہ دُنیا بھر کی اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہر قسم کی بیان کر کے سب کے عیب بیان فرما کر

چہرہ ممدوح کو بے عیب اور سب سے بہتر ثابت فرمایا ہے۔

(۴) مرثیہ امام حسینؑ میں بہت سی چیزوں کو ایک دوسرے انداز بیان سے جمع کیا ہے

قریباً دُنیا بھر کے تمام منوّر اور قیمتی چیزیں آگئی ہیں۔

شمع[۱] و چراغ[۲] و آئینہ[۳] و صبح[۴] و آفتاب[۵] ‏ ‏ باغ[۶] و بہار[۷] و یاسمن[۸] و لالہ[۹] و گلاب[۱۰]

ناہید[۱۱] و بدر[۱۲] و مشتری[۱۳] و قطب[۱۴] و ماہتاب[۱۵] ‏ ‏ آب حیات[۱۶]۔ لعل بدخشاں[۱۷]۔ دُرِ خوش آب[۱۸]

یوسف[۱۹]۔ اور اُن کے سارے خریدار اک طرف

سب اک طرف۔ یہ رُوئے ضیا بار اک طرف

انیس[۱۹] چیزیں جمع کر کے فیصلہ کر دیا کہ سب سے رُوئے انور بہتر (بہتر) ہے۔

(۵) یہ دو بند بھی مرثیہ حضرت عباسؑ میں صنعت جمع میں مجھے بہت پسند ہیں۔

(۱) ہر کلیہ میں جزو یہ ہیں چیدہ تقدیر ‏ ‏ مردوں میں علیؑ تیغوں میں کرار کی شمشیر

فرقان کتابوں میں اور ارکان میں تکبیر ‏ ‏ عباسؑ علمداروں میں سرداروں میں شبیرؑ

سقائے حرم سا کوئی سقا نہیں دیکھا

اور ایسا علمدار بھی حقا نہیں دیکھا

(۲) شبیرؑ کے بازو بھی ہیں اور زور کمر بھی* ‏ ‏ رشتہ میں برادر بھی ہیں اُلفت میں پسر بھی

خادم بھی مصاحب بھی دل و جاں بھی جگر بھی ‏ ‏ اللہ کی شمشیر شہ دیں کی سپر بھی

* کمر کے لفظ میں ایک بلیغ کنایہ شہرت کا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت عباسؑ قتل ہوئے تو امام حسینؑ فرماتے تھے اس وقت میری کمر ٹوٹ گئی۔ بہر صورت یہ بین وقت کا پہلو نکالنا یہ مرزا صاحب کا خاص کمال ہے۔ ترتیب میں کمال کیا ہے۔ شمشیر و سپر کے تو عام خیال ہیں جاتے ہیں مگر [illegible] عنایت کی ہے کہ جب تیروں سے [illegible] تو خون سے [illegible] ہو گئے۔ [illegible] کنایہ ہے کہ حضرت عباسؑ [illegible] کی [illegible]

ثابت یہ ہوا۔ رن میں جو تیروں سے چھنتے ہیں
شبیرؑ کی خاطر سے زرہ حفظ بنتے ہیں

تفریق

صنعت تفریق۔ دو امروں میں جو ایک طرح کے ہوں۔ فرق ظاہر کرنیکو صنعت تفریق کہتے ہیں۔ مرزا صاحب اس صنعت میں کہتے ہیں۔

(رباعی مناقب میں)

(۱) رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہوکر — حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہوکر
مانا کہ کہر بخش ہے نیساں بھی مگر — وہ دیتا ہے رو روکے یہ خنداں ہوکر[1]

صفائے قلب اور آئینہ میں فرق

(۲) آئینہ کے آئین پہ میں نے جو کیا غور — مُنہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور — پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور
جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے[2]

(۳) آئینہ اور روئے انور جناب عباسؑ میں نہایت عمدہ فرق بتاتے ہیں۔
آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی — صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی

---

[1] شعرا فیاض ممدوح کو ابر بحر کرم سحاب کہتے ہیں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں ابر بھی موتی دیتا ہے۔ مگر میرے ممدوح میں اور ابر میں فرق یہ ہے کہ وہ رو رو کے دیتا ہے۔ ابر کے برسنے کو رونا قرار دیا۔ اور حضرت ممدوح ہنس ہنس کے دیتے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کی بدولت دبیر دبیر مشہور ہوئے ۱۲ مؤلف عفی عنہ۔

[2] شعرا دل کو اور بعض سینہ کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ شاید طالب آملی کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے کہ کفر است در طریقت ما کینہ داشتن۔ آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن۔ مگر مرزا صاحب دل اور آئینہ میں ایک عجیب و غریب تفریق بیان فرماتے ہیں وہ یہ کہ آئینہ منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ اور ہے۔ یہ بُری صفت ہے۔ مگر میرا دل دونوں طرف چمک کر دو صفا و جلا میں یکساں ہے۔ پس اس کی تشبیہ آفتاب سے درست ہے۔ جو دونوں طرف یکساں چمک و روشنی رکھتا ہے ۱۲ مؤلف۔

واں خاک نے صیقل۔ یہاں قدرت نے جلا کی طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اُس رُخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

(۴) یاقوت اور لب حضرت عباسؑ میں تفریق۔

شیریں ہیں قسموں میں رقم اس لب کی جُدا ہے اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقُوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے یاقُوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے
چُوسا ہے یہ لب مثلِ رُطب حق کے ولی نے
یاقُوت کا بوسہ لیا۔ کس روز؟ علیؑ نے

(۵) اسپ جناب رسول خدا صلعم کی مدح جس پر روز عاشورا امام حسینؑ سوار تھے۔

آئینے آفتاب کے اتنے کہاں سے آئے صانع نے گوندھ گوندھ کے ہیکل میں جو لگائے
اور نعلبند چار مہ نو کہاں سے لائے لائے تو سُم کی آنکھ میں وہ کس طرح سمائے
سانچہ بنا جو بدر کا۔ نو شکل سُم بنی
خورشید کی کرن جو ہُوئی جمع دُم بنی

تقسیم۔ جمع و تفریق کے بعد تقسیم بھی ایک صنعت ہے*۔ اس میں اور لف و نشر میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کہ لف و نشر میں اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ سُننے والا خود بخود ہر ایک شے کو منسوب الیہ کی طرف منسوب و تعیّن کر لیتا ہے۔ اور تقسیم میں کہنے والا چند چیزیں بیان کرتا ہے۔ یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعیّن بیان کرتا ہے۔ اور اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ کہ کسی شے کی

لطیفہ *۔ مجھے علم معانی و بیان کے عالموں اور شاعروں سے تعجب ہے۔ کہ جمع و تفریق و تقسیم تک تو صنعتوں کو لیا۔ مگر بیچاری ضرب کو چھوڑ دیا۔ لا الٰہ الا اللہ کہ اگر ایک ضرب اس پر بھی لگائی ہوتی۔ اور ایک صنعت کا نام ضرب بھی رکھ دیا ہوتا ۱۲ مؤلف حقیر

تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

اس صنعت تقسیم میں مرزا صاحب عزاداران امام حسینؑ کی مدح فرماتے ہیں۔

پابندی طاعت پہ ہے اس مشغلہ کو فوق سجادؑ کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دلدلؑ کے بنانیکا کسی شیعہ کو ہے ذوق عباسؑ کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ۔ زہراؑ کے خلف کا
تابوتؑ اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

(اب ان سب کی تقسیم دیکھئے۔ ہر ایک کے ثواب کو اپنے عقیدہ کے موافق بیان فرماتے ہیں)۔

تابوتؑ اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت دلدلؑ کے بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائیؑ کے انعام میں کوثر کی حکومت دولتؑ ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابدؑ کے لئے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرہ حفظ خدا ہے

جمع و تفریق کو اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو ساتھ ساتھ لاتے ہیں۔ اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں یعنی چند چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا فرق بیان کر دیں یا ان کو تقسیم کر دیں۔ یا دونوں باتیں کریں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں:۔

(حضرت عباسؑ کی مدح میں)

پیدا ہوں جو ایسے چمنستان جہاں لاکھ افلاک کروڑ اور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کے ہر اک قطرے سے طوفاں ہوں عیاں لاکھ گھر گھر ہوں مسن خضر سے یوسف سے جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دور کی شکلیں
سب نور کے رخسار ہوں سب نور کی شکلیں

کیا منہ جو نقابوں سے حسیں منہ کو نکالیں عیسےؑ قسم انجیل کی ہمیا ختہ کھالیں
توریت کو موسےؑ ید بیضا پہ اٹھالیں فرقان مبیں فرق پہ خاصان خدا لیں

انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کہ یونہیں ہے
استغفر ہیں کوئی ثنا ئے عباسؑ نہیں ہے

صنعت تجرید۔ یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ کے قصد سے اُسی شے کی مانند دُوسری چیز حاصل کریں اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے۔ کہ شاعر اپنے آپ کو دُوسرا شخص قرار دے کر اپنے نفس سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے کوئی شاعر خالی نہیں ہے۔ کیونکہ فی زمانہ مقطع میں ہر شاعر اسی طرح خطاب کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے نفس سے خطاب کرتے ہیں ؎

آغاز ترا خاک تھا۔ ہے خاک ہی انجام　　دیکھ اپنی بدی خوب۔ بدو نیک سے کیا کام
گر مُہر نہیں دل پہ۔ تو نخوت کا نہ لے نام　　نازاں نہ ہو دُنیا پہ۔ نہ کر شکوۂ ایام
ارشاد کیا۔ طُور پہ مُوسےٰ سے خدا نے
اچھا وہ ہے۔ جو سب سے بُرا آپ کو جانے

(یعنی اپنے نفس کو)

(پھر اپنے نفس سے خطاب ہے)

بالوں کی سفیدی سے سرِ مُو نہیں رنجُور　　دھوپ آگئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستُور
ہُشیار کہ نزدیک رہا اب سفر دُور　　ہاں ڈھونڈ کفن مُشکِ جوانی ہُوا کافُور
اے مُلکِ عدم کے سفری زادِ سفر لے
مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے*

مبالغہ مقبول۔ مقبول کی قید اس لئے لگا دی ہے۔ کہ اگر وہ طبیعتیں جن کو مذاق سلیم حاصل ہے قبول نہ کرینگی۔ تو پھر وہ صنعت نہ رہیگی۔ اس صنعت میں تو مرزا صاحب ایسے مشہور و مقبول ہیں کہ جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ و سہ نے ایک سائل کے جواب میں اُن کے

* واقعی یہ ہمارے سخت دشوار گذار گھاٹیاں در پیش ہیں۔ خدا آسان کرے ۱۲ مؤلف حقیر۔

مشہور بیت کی شرح (عشرۂ کاملہ) میں لکھ کر مدح فرمائی ہے۔ اور سنا فہموں کو سمجھایا ہے۔ وہ بیت یہ ہے،

اس رخش کے منہ پر کوئی دم چڑھ نہیں سکتا ✦ چلنے میں یہ سرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

میں نے جناب مفتی صاحب کی عبارت اس کتاب میں ایک دوسرے موقع پر لکھی ہے۔ اس لئے یہاں طول نہ دونگا۔ مبالغہ سے یہ مراد ہے۔ کہ کسی شے کی صفت کو شدت یا ضعف میں اس حد تک پہنچائیں۔ کہ عادتاً یا عقلاً بعید و محال ہو۔ اگر عقلاً ممکن ہو۔ تو اس کو اغراق۔ اور عقلاً و عادتاً ممکن ہو۔ تو تبلیغ کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں مقبول ہیں۔ اور اگر عادتاً یا عقلاً دونوں طرح محال ہو۔ تو پھر اس کو غلو کہینگے۔ یہ جب مقبول ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی ایسا لفظ لائیں۔ جو کلام کو صحت کے قریب کردے۔ یا خیالات نازک و لطیف پیدا کریں[۱]۔

(۱) مرزا صاحب کے کلام میں سے اب چند مثالیں اس کی پیش کرتا ہوں عقاب نام اسپ خاصۂ جناب رسالتمآب صلعم کی مدح میں فرماتے ہیں۔ جس پر بعد عاشورا سنہ ۶۱ھ علی اکبر سوار تھے۔

چلنے میں یہ شمشیر ہے پلے میں یہ ہے تیر ✦ لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں ہے تدبیر
چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر ✦ جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر

مضمون ہیں بہت۔ پر کوئی دلچسپ نہیں ہے[۲]،
اسرار ہے۔ اعجاز ہے۔ یہ اسپ نہیں ہے

---

[۱] اس نئی روشنی میں مبالغہ اکثر آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اور اکثر لوگ مذمت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ایشیائی شاعری بیچاری اسکی بدولت بدنام ہے مگر وہ بزرگوار یورپ والوں کی اندھادھند تقلید میں نہیں سوچتے کہ مبالغہ سے کلام میں اثر و زور پیدا ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں جنکو وہ دل آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں مثلاً بائبل کی یہ مشہور آیت کہ تجھکو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں سجھائی دیتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے۔ اس بحث کو مفصل میں نے مولوی شبلی صاحب کے جوابات اعتراضات میں لکھا ہے + ۱۲ مؤلف۔

[۲] یہ روزمرہ ہے کہ تلوار چلے اور تیر کا پلہ مشہور ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں چلنے میں (گھوڑا) گویا تلوار ہے۔ پلہ میں تیر ہی تیر کی طرح جاتا ہے۔ لڑنے میں تقدیر ہے۔ یہ بھی روزمرہ ہے کہ کہتے ہیں فلاں شخص کی تقدیر لڑ گئی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تدبیر بگڑ گئی۔

(۲) یہ بند اسپ جناب امام حسینؑ کی مدح میں ہے۔ یہ گھوڑا بھی جناب محمد عربی صلعم کا وفادار گھوڑا ہے۔ جس کو عام لوگ ذوالجناح کہتے ہیں۔ اور لسان الملک مرزا محمد تقی خاں سپہر مرحوم صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق مرتجز اس کا نام معلوم ہوتا ہے۔

لڑنے میں یہ ہے عقل۔ بگڑنے میں جہالت   بڑھنے میں ہے حرص۔ تو گھٹنے میں قناعت
جانے میں حواس آنے میں عاشق کی طبیعت   مخفی ہے تو اسرار عیاں ہے تو کرامت

ہر سُو جو نسیم اس کے طرارے کی بھی ہے
سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے

مذہب کلامی ۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ کسی کلام کو دلیل کے ساتھ بیان کریں۔ اور اگر تمثیل یعنی قیاس فقہا کے ساتھ کلام ہوگا۔ تو اس کو مذہب فقہی کہینگے۔ قرآن شریف میں یہ آیت اول الذکر صنعت میں ہے۔ لو کان فیہما الھۃ الا اللہ لفسدتا یعنی اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے۔ تو زمین و آسمان فاسد ہو جاتے۔ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد حضرت اوج مدظلہ کا مطلع یاد آگیا۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

فسادِ حکم و عمل میں جدا جدا ہوتے + خلل خدائی میں پڑتا جو دو خدا ہوتے

اب مرزا صاحب کا کلام اس صنعت میں سُنئے۔

(۱) ہوتی تھیں صفیں آب دمِ تیغ سے بے دم   پانی جو گھٹے آب کے پیو ہوتا ہے سن کم
حل کرتی تھی۔ ہر مسئلہ تیغ شہِ عالم   ہے خون نجس اس میں یہ آلودہ تھی ہر دم

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۲) یہاں یہ غرض ہے کہ یہ اسپ اس طرح لڑتا ہے جیسے عقل اور غصہ میں قوت بگڑتا ہے جیسے تدبیر فوراً بگڑ جاتی ہے جیسے خواب جلیسوں سے ہوتا ہے کہ اس طرح چھپو خفیہ ہے اور تعبیر خواب کی مانند ظاہر ہوتا ہے جانے میں سہل کی دُعا ہے کہ کسی سے رکتی ہی نہیں ہے اور آنے میں تاثیر اجابت دعا ہے کہ انبیا کی دُعا بہ فوراً تاثیر قبول نازل ہوتی ہے۔ ایسے چار مصرعوں میں ٹیپ لگانا بہت مشکل تھا۔ مگر واہ وا کیا خیال بلند اور دماغ عرشی پایا ہے غور فرماتے ہیں ان سب خوبیوں سے بڑھکر یہ ہے کہ یہ اسرار اور اعجاز ہے ساحر گرمی ہے مگر واہ مد کے معنی یہ اعداد میں مستعمل ہے اسرار اور اعجاز نے اُوپر کے تمام مضامین کو معمہ کے قریب کر دیا۔ کہ اسرار اور معجزہ سے بڑھنا ممکن ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

پر اس پہ نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
*
یعنی کہ نجس آبِ رواں ہو نہیں سکتا

امام حسین علیہ السلام لشکریان یزید کو وعظ فرماتے ہیں

(۲) باطل ہے سوا حق کے بد ذہنیک کا سجدہ ہے ایک جبیں فرض ہے بس ایک کا سجدہ

اس میں یہ استدلال ہے۔ کہ اگر کئی خدا ہوتے۔ تو ایک انسان کے ماتھے بھی کئی ہوتے۔ پس ایک پیشانی ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ایک ہی خدا ہے۔ اُسی ایک کو سجدہ کرو۔ اُسی کو مانو +

فصل ۸ حسن تعلیل

حسن تعلیل۔ اس صنعت کی تعریف یہ ہے۔ کہ کسی وصف کے واسطے ایسی علت مناسب کا دعوے کریں۔ جو درحقیقت اُس کی علت نہ ہو۔ مگر اس کا لطف یہ ہے۔ کہ ثابت کر دیں۔ باقی اس کی تعریف معانی و بیان کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیے +

واضح ہو۔ کہ شاعری کی جان یہی صنعت ہے۔ حافظ و صائب کو اسی صنعت کی بدولت لاجواب شاعر مانا جاتا ہے۔ مولوی روم کی مثنوی اسی صنعت کے سبب سے ممتاز و مقبول ہے۔ غرضکہ ہر شاعر کامل کے یہاں یہ صنعت بکثرت ہے۔ جس شاعر کی قوت دماغی جس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ اُسی قدر اُس کے کلام میں لطف تخیل و حسن تعلیل زیادہ ہے۔ شاعری کی معراج کمال گویا یہ صنعت ہے۔ اسی صنعت کے سبب دبیر مرحوم کو ملک نے لاجواب شاعر مانا ہے۔ اسی مقام پر اور شعرا مرزا مرحوم سے نیچے نظر آتے ہیں۔ جن کو خدا نے شاعر پیدا کیا ہے۔ وہ (شاعر) نازک خیالیاں اسی صنعت کے لباس میں دکھاتے ہیں۔ اس کتاب کی جلد دوم میں اس کی ہزار سے مثالیں (غالباً) آپ کو ملینگی۔ یہاں دو چار مثالیں لکھتا ہوں۔ کہ طول نہ ہو +

* کیا اچھا استدلال ہے۔ فرماتے ہیں۔ آبِ دم تیغ تو آبِ رواں کا حکم رکھتا ہے۔ گو دشمنوں کا خون نجس ہے۔ مگر آب رواں سے مل کر آبِ رواں کو نجس نہیں کر سکتا۔ اوپر کے مصرعوں میں ایک مشہور مثل بیان کی ہے۔ کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے عمر گھٹتی ہے۔ لشکری کھڑے کھڑے تیغ کا پانی پی رہے تھے۔ عمریں گھٹتی جاتی تھیں مرتے جاتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱) عبرتِ عالم و بے ثباتیِ زمانہ۔ — عبرت عالم

گُل پانچ روز باغ میں گُل میہماں ہے　　سبزہ۔ گُلِ بہار کی رخصت کا پان[1] ہے

(۲) انکسار و فروتنی کی مدح۔ اور قلم کے کاغذ پر جھکنے کی وجہ (حسنِ تعلیل)۔ — فروتنی

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے　　جھک کر شرفا اور نُجبا ملتے ہیں سب سے[2]

(۳) خلق و مروّت و انکسار کی معراجِ کمال۔ — مروت

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو　　مانندِ غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو[3]

(۴) صبحِ عاشورا امام حسینؑ نے علمِ رسالت پناہ صلعم نکال کر نصب فرمایا ہے۔ ابھی تک کسی کو دیا نہیں۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔ — تمہید

کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں　　اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

(۵) حضرت عباسؑ علمدار کی شہادت کے بعد علم امام حسینؑ گھر میں لاتے ہیں۔ — تمہید

ڈیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر　　ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لرز کر

(۶) ذوالفقارِ آبدار میں سے دشمنوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ — شمشیر زنی / حسنِ تیغ

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حُسن کا　　جو بن ٹپک رہا تھا جوانی کے حُسن کا

(۷) ذوالفقار نے اُن بے حیاؤں کی ناک بھی اُڑا دی۔ — تلوار

---

[1] رخصت کا پان چلتے وقت مہمان کو دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ باغ میں سبزہ نکلا۔ کہ گویا بہار کو رخصت کا پان پہنچا۔ اب بہار رخصت ہے۔ یہ مضمون عرب و عجم کے یہاں تو کیوں ہوتا۔ کہ وہاں پان کا رواج ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک میرا علم ہے کسی ہندی شاعر نے بھی نہیں کہا ہے۔ بالکل نیا اور نازک خیال ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] فرماتے ہیں۔ قلم جو کاغذ پر جھکتا ہے یہ ادب کی افراط و زیادتی سے (کہ جو انکسار ہُوا) جھکتا ہے جیسے شریف و نجیب سب سے جھک کر ملتے ہیں۔ ویسے کاغذ سے قلم جھک کر ملتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] ہوا اُڑ کر غبار کو پریشان کر دیتی ہے۔ گویا دشمن ہے۔ مگر غبار اپنی دشمن (ہوا) کی بھی تعظیم کرتا ہے اسی طرح میں دشمن سے بھی خلافِ مروت دغا نہیں کرتا اور آ سے بھی تعظیم دیتا ہوں۔ یہ بیت گویا مرزا مرحوم کے حسنِ اخلاق کا آئینہ یا فوٹو ہے ۱۲ مؤلف حقیر

چہرے سے بینی صفِ لشکر بھی دُور کی — بُت خانے سے شباہت منبر بھی دُور کی

زرہ حرؑ

(۸) حضرت حُر جری کے جسم پر جو زرہ ہے۔ اُس کی نسبت حسنِ تعلیل۔

دل صاف، سینہ صاف، بدن صاف واہ وا — تن پر زرہ بتاتے ہیں گو صاحبِ نگاہ
پر عقل کہہ رہی ہے کہ سب کو ہے اشتباہ — حُر کی صفائے قلب ہے اس بات پر گواہ
دل حُر کا مضطرب غم شاہ زمنؑ میں ہے
یہ دل کا پیچ و تاب نمایاں بدن میں ہے

یہ عجیب بات کہی ہے۔ کہ زرہ نہیں ہے۔ بلکہ دل کا پیچ و تاب صفائی قلب کی بدولت نظر آرہا ہے۔ دور سے دیکھنے والے اُس کو زرہ سمجھتے ہیں۔ رعب دلاوری کی وجہ سے پاس کون جاکر دیکھ سکتا ہے۔

باغ میں فوّارہ جاری ہے

فوّارہ

(۹) فوّارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا — پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اُٹھا تھا

گرمی کی شدّت میں فوّارہ کی حسن تعلیل

گرمی فوّارہ

(۱۰) فوّارہ کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی — پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

گرمی کا سماں

گرمی اور دھوپ

(۱۱) چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

شب عقد جناب امیرؑ

شب عقد جناب امیرؑ

(۱۲) ناگاہ وہ شام آئی کہ جو صبح سے لے باج — غازۂ رُخ نوروز کا عیدین کی سرتاج
حُسن شب قدر و شب بدر و شب معراج — تھی رات بھی نازاں کہ علیؑ کی ہے برات آج
کثرت وہ ستاروں کی شب جلوہ فگن پر
مشاطوں کا جھرمٹ تھا شب عقد دُلہن پر

سج دھج تھی عروسِ شب شادی کی نرالی — پھولی شفق شام کے لالے کی جو لالی
ہلکی سی لبِ بامِ فلک اُس نے جما لی — پازیب بھی اور کان کے بُندے بھی ہلالی

معاف زری نظم کیا کاہکشاں کو

مضموں یہی چوٹی کا ملا اہلِ زباں کو

تاکید المدح بمایشبہ الذم - یعنی مدح میں ایسی تاکید کی جائے کہ مذمت کے مشابہ معلوم ہو۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:-

(۱) بے مہری فلک سے کیوں خاک بسر ہوں ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہلِ ہنر ہوں[۲]

(۲) میں کون ہوں صاحب علم کلک جہانگیر نوبت زن نہ بام عروجِ فلک پیر

تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر خاک قدم محتشم و مقبل شبیرؑ[۳]

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

انصاف تو کہتا ہے - خداوند یوہیں ہے

---

[۱] یورپ میں ایسے نامور و مشہور شعرا کے کلام میں چھانا پنا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلے پہل کون کون سے محاورے الفاظ نظم کئے خوش سلیقگی و صفائی سے نظم کئے ہیں یا نہیں ہمارا ملک اب تک ایسے جزئیات سننے کا مشتاق ہے نہ کوئی شخص ایسی سعادت کی نیکو طلب کرتا ہے ورنہ دبیر مرحوم کے ایسے محاوروں اور الفاظ کو کوئی شخص جمع کرے تو معلوم ہو کہ جس کثرت سے اس قادر الکلام شاعر نے الفاظ و محاورے (عمدگی و روانی سے) نظم فرمائے ہیں شاید کسی شاعر نے نظم کئے ہوں اسی بند میں دیکھ لیجئے سیج کو مہمیز بنالی لالی جھلکی سی جھلی بازیب بوبند وغیرہ وغیرہ سامان آرائش کے کتنے الفاظ کس حسن و خوبی سے جمع کر دئے ہیں یہ احتمال نہیں پیدا ہوتا کہ چوٹی کے لفظ میں صنعت ایہام ہے ایک تو یہ مراد ہے کہ چوٹی کے واسطے موباف زری کی کہکشاں کو بنایا دوسرے چوٹی کا مضمون یعنی اعلیٰ درجہ کا مضمون ہاتھ آیا۔

[۲] آسمان جو میرا دشمن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں ایک بڑا عیب ہے بظاہر سننے والا یہ سمجھا کہ شاعر اپنا عیب بیان کرتا ہے جب اس عیب کی تشریح کی تو یہ کہ میں صاحب ہنر ہوں لہٰذا یہ مدح ہوئی کہ صاحب ہنر ہونا فی الحقیقت عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ مگر دشمنی فلک کا باعث یہی ہنر ہے اسی کی بدولت زمانہ دشمن ہو رہا ہے پس گویا مجھ میں یہی بڑا عیب ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] یہ چوتھا مصرع اس صورت میں ہے کہ خاک قدم ایک ناقص حقیر ہے بلحاظ ہر نہ مدحت پائی گئی۔ مگر جب الفاظ ما بعد پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اہلبیت محمد صلعم کے مقبول و معروف (محتشم و منقبت) کی خاک قدم شاعر خاکسار اپنے آپکو کہہ رہا ہے۔ یہ در اصل مدح میں تاکید ہو گئی مولوی شبلی صاحب کو بھی لطف دیتے ہیں۔ بالعموم ان کی ناواقفی ان کی منہ خواہ ہے یا مقتضائے طبیعت عالی ہے۔ (پہلا مصرع حذف کر کے پڑھئے) عیب نما یہ بند ہوش و نظر مفصل بحث تا دیہ اعتراضات مولوی شبلی صاحب میں ملاحظہ فرمائیے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) معصوم کی صفت میں کہتے ہیں۔

قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی لیکن نہ ہے نہ ہوئیگی قدرت گناہ کی[1]

(۴) حضرت علی اکبرؑ رجز میں فرماتے ہیں

جز دستِ گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے تجبیہ کرم حق پہ ہے۔ بستر نہیں رکھتے[2]

(۵) مدح سخاوت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

ہوتے جو نہ تیس[۳۰] روزے وجیب تو۔ علیؑ اک روز بھی اُمت کو نہ بھوکا رکھتے[3]

(۶) منقبت جناب امیرؑ میں کہتے ہیں۔

کیا زہد ہے کیا فیض کہ رغبت سے کبھی روزے کے سوا کچھ نہ علیؑ نے رکھا[4]

استتباع

استتباع۔ اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دُوسری مدح حاصل ہو۔

(۱) منقبت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت

گردوں نے بلندی لی۔ زمیں نے زر و دولت یوسفؑ نے لیا حُسن۔ سلیماںؑ نے حشمت

پر ان کی قناعت ہے فزوں حدِ بیاں سے

جُز نامِ خدا۔ آپ لیا کچھ نہ زباں سے[5]

[1] طاقت و قدرت دینا بظاہر ایک نقص ہے مگر گناہ کی قید لگا دی کہ گناہ کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ یہ مدح ہو گئی ۱۲ مؤلف

[2] زر رکھنا نہیں کہنا گویا عیب ہے مگر اس کے ساتھ یہ کہا کہ جز دستِ گدا تو یہ اعلیٰ درجہ کی مدح ہو گئی کہ یہ سخی فقیر کے ہاتھ میں زر رکھتے ہیں اور کہیں نہیں رکھتے ۱۲ مؤلف

[3] دوسرے کو بھوکا رکھنا بظاہر بری بات ہے مگر روزہ کی قید سے مدح ہو گئی کہ روزہ کی وجہ سے تیس[۳۰] روز بھوکا رکھا ۱۲ مؤلف

[4] کچھ پاس نہ رکھنا نہیں کہنا گویا عیب ہے مگر روزہ کے استثنا نے اسکو مدح کر دیا کہ بس روزہ ہی رکھا اور کچھ نہ رکھا۔ اور یہ بھی صنعت استتباع میں ہو سکتی ہے جس صنعت کا اس کے بعد بیان ہے۔ کہ مدح عبادت میں سے مدح سخاوت بھی نکلتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر

[5] نام خدا کے سوا کچھ زبان سے نہ لیا پس صفت قناعت میں سے صفت عبادت نام خدا لینے کو نکالا۔ اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ علیؑ خدا کا نام ہے۔ نام خدا کا بس لیا ۱۲ مؤلف حقیر

(۲) امام حسینؑ کی میدانِ جنگ میں آمد ہے۔ فوجِ یزید پر ہیبت و ابتری طاری ہے۔

درہم میں یوں پرے۔ کہ قرار اب محال ہے درہم کا شہ کے دستِ کرم میں جو حال ہے[۱]

(۳) حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں۔

دُنیائے دنی ان کا نشانِ کفِ پا ہے لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جُدا ہے[۲]

عقبےٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو۔ کیا ہے؟ وہ اک رہ باریک ہے۔ یہ راہ نما ہے

لوسُن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے

بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

ادماج۔ یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے۔ کہ ایہام میں ایک لفظ ذو معنیین ہوتا ہے۔ اور ادماج میں تمام کلام سے دُوسرے معنی نکلتے ہیں۔ اور ادماج عام ہے۔ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔ ادماج

مرزا صاحب اس صنعت میں اُس موقع پر فرماتے ہیں۔ کہ جب شمر نے عونؑ و محمدؑ پسران جناب زینبؑ کو دو علم پیش کر کے ملانا چاہا ہے۔ ع

بہکا اُنہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں کہ اُن سے یہ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں[۳]

تعجب۔ یعنی کلام میں کسی فائدہ یا غرض کے واسطے تعجب ظاہر کریں۔ اور ایسے تعجب سے اکثر شاعر کی غرض مبالغۂ مدح ہوتی ہے۔ تعجب

---

[۱] اس میں شجاعت کی مدح ہے کہ ہیبت آنے سے پرے درہم و برہم ہو رہے ہیں اور تشبیہ یہ دی کہ جیسے امام حسینؑ کے دست کرم میں آ کر درہم بے قرار رہتا ہے۔ کہ وہ جناب کسی کو دیدیں۔ اس سے ایک دُوسری مدح سخاوت کی نکلی درہم و درہم میں تجنیس خطی بھی ہے یہ مزید براں ہے ۱۲ مؤلف

[۲] دُنیا کو انکی کفِ پا کا نشان بتایا پھر اسی میں سے دُوسری مدح نکالی۔ کہ وہ ایسا نشان ہے جو کفِ پا سے جُدا ہے۔ واقعی نشان کفِ پا سے ہر قدم پر مٹتا ہوتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا انکی بدولت قائم ہوتی ہے تاہم یہ دُنیا سے ہمیشہ الگ رہتے ہیں (ٹیپ میں) پانچویں مصرع میں حق خدا کے معنی پر ہے۔ چھٹے میں حق باطل کی ضد ہے۔ اختلافِ معنی کے سبب سے قافیہ ایطا کی تعریف سے نکل گیا اور جائز ہو گیا ۱۲ مؤلف حقیر

[۳] ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ انکو بہکا جو تجھکو نہ جانتے ہوں دُوسرے معنی یہ نکلے کہ انکو بہکا جو تجھکو شقی نہ سمجھتے ہوں ۱۲ مؤلف حقیر

آمد جناب علی اکبرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں

(۱) نورِ نظر شاہ جو گھر سے نکل آیا حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

(۲) ہنستے تھے آہ رونے پہ ابن بتولؑ کے کیسے یہ کلمہ گو تھے جناب رسولؐ کے

صنائع لفظی

فصل ۹ صنائع لفظی

اُوپر جتنی صنعتیں بیان ہوئیں۔ اُن کا تعلق معانی (مضامین) سے تھا۔ اب جو صنعتیں بیان کرونگا۔ اُن کا تعلق الفاظ سے ہوگا۔ علمائے معانی و بیان کا ارشاد ہے۔ کہ ہر شاعر و ناثر صنائع لفظی پر معانی کو مقدم رکھے۔ ایسی صنعت نہ ہو۔ کہ الفاظ تو پیارے معلوم ہوں۔ مگر مطلب خاک نہ نکلے۔ اب دیکھئے۔ کہ ان مشکل صنائع میں مرزا صاحب کس قدر کامیاب ہوتے ہیں۔ اور اُن کی نظم کس قدر بامعنی ہوتی ہے۔ ان صنائع میں بیساختہ پن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ عموماً آورد ہوتی ہے۔ مگر جن شعرا کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ اور طبیعت تیز اور دماغ سلیم ہے۔ اُن کے کلام میں باوصف ایسے صنائع کے بھی کبھی کبھی روانی و بیساختہ پن قائم رہتا ہے۔ ہمارے مرزا صاحب ایسے کاملوں کے سرتاج ہیں۔ وزیر صاحب مرحوم پسر جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ اکثر مرزا صاحب کے بے نقط مرثیہ (ع مہر علم سرور اکرم ہوا طالع) کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ فیضی نے سواطع الالہام تفسیر قرآن بے نقط لکھی۔ مگر جا بجا ٹھوکریں کھائیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کو ولد الاعمٰی لکھا ہے۔ لفظ اعمٰی ایک نبی معصوم (یعقوبؑ) کی نسبت سوءِ ادب ہے۔ مرزا صاحب کا مرثیہ ان لغزشوں سے پاک ہے۔* ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔ اب چند صنعتیں (لفظی) سنئے:۔

* اس حکایت کو میں نے دوسرے مقام پر بھی اس کتاب میں لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

تجنیس

صنعت تجنیس۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) دو لفظ ایسے لائیں جو صورت میں ایک ہی ہوں۔ مگر معنی مختلف ہوں۔ (۲) دونوں الفاظ کے اجزا میں مشابہت ہو۔ (۳) قریب المخرج الفاظ ہوں۔ (۴) تجنیس قلب کہ ایک لفظ کو الٹیں۔ تو دوسرا لفظ پیدا ہو۔ اس صنعت کی سے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی۔ کہ پورے مصرع یا فقرہ کو الٹیں۔ اور وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دوسرا فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ اس کو **مقلوب مستوی** کہتے ہیں۔ **تجنیس** کی ایک قسم **تجنیس تام** ہے۔ جو قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ یوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعۃ[۱]۔ اس میں ساعۃ کے لفظ اول قیامت کے معنی پر دوسری گھڑی بھر کے معنی پر ہے۔ اسکی مثالیں مرزا صاحب کے کلام میں بہت ہیں حسب ذیل پیش کرتا ہوں:۔

(۱) رباعی ذیل میں ایک لفظ زاری کو تین جگہ تینوں قافیوں میں لائے ہیں۔

رباعی

مومن کو سہاک بکا سے بیزاری ہے　　　واجب غم شہ میں گریہ و زاری ہے
جز ماتم نور عین زہرا رونا　　　آنکھیں کہتی ہیں مردم آزاری[۲] ہے

(۲) رجز میں حضرت عباسؑ فضیلت جناب امیرؑ کی بیان فرماتے ہیں۔

جب قبلہ کو ہم نے رخ امید پھرایا　　　مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا[۳]

---

[۱] ظاہری الفاظ کے معنی یہ ہیں "جس روز قیامت قائم ہوگی۔ گنہگار قسم کھائینگے کہ رہ ٹھیرے وہ مگر ایک گھڑی" ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] پہلے مصرع میں بیزاری نفرت کے معنی پر ہے۔ دوسرے میں زاری رونے کے معنی پر۔ جو تھے میں مردم آزاری آدمیوں کو دکھ دینے کے معنی پر ہے۔ مگر اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ اپنی آنکھوں کو آزار دینا۔ کیونکہ مردم کے دوسرے معنی پتلی کے بھی ہیں۔ یہ دوسری صنعت ہے جس کو ایہام کہتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] پہلے مصرع میں منہ پھرایا کے معنی منہ کو پھیرا کے ہیں۔ دوسرے میں پھر آیا کے معنی پلٹ آنیکے ہیں۔ رجعت خورشید کے مشہور معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بیت ذوقافتین بھی ہے۔ ایک قافیہ امید و خورشید دوسرا پھرایا۔ پھر آیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

لفظ بار چار معنی

(۳) ذیل کے چاروں مصرعوں میں (قافیہ میں) بار کی لفظ ہر جگہ ایک نئے معنی پہ ہے اور پھر تکلّف یہ ہے کہ بے تکلّف نظم ہے۔ حضرت عبّاسؑ کی مدح میں ہے۔

ہوتا ہے جو حاضر پہ بہادر سرِ دَربار ‏ ‏ دَربار میں دُربارِ علیؑ ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدّق مرا گھر بار ‏ ‏ عارض ہیں قمر بار لبِ لعل گہربار

یہ والیِ اقلیمِ ولایت کا ولی ہے
تصویر تو لگتے حسینؑ ابن علیؑ ہے[1]

تجنیس خطی

تجنیسِ خطّی بھی اسی کی شاخ ہے۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ وَھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ[2] اس میں یسقین و یشفین میں تجنیسِ خطی ہے۔ کہ ایک طرح لکھا جاتا ہے۔ فقط نقطوں کا فرق ہے۔ قرآن ناطق جناب امیرؑ کا ایک خطبہ بھی اس صنعت میں مولوی ظہیر الدین صاحب بلگرامی کی کسی کتاب شاید ظہیر الانشا میں میری نظر سے گذرا ہے۔ مگر اس وقت وہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ ورنہ لکھ دیتا۔ اور نہج البلاغہ میں وہ خطبہ مجھے نہیں ملا۔ شاید نہج البلاغہ کے علاوہ جو خطب ہیں۔ اُن میں ہو۔ مرزا صاحب کا اس صنعت میں ایک بند لکھتا ہوں۔

حبیب ابن مظاہر پیغامِ عقد جناب امیرؑ لیکر والد ماجد حمیدہ (حمیدہ کا نام ام البنینؑ ہے) کے پاس گئے ہیں۔ اُس موقع پر والد حمیدہ جناب امیرؑ کے اوصاف حمیدہ میں کہتے ہیں۔

---

[1] دَربار مصرع اول میں ایک مستعمل لفظ لائے پھر دوسرے میں دُربار لائے۔ جو کتابت میں دربار سے مشابہ ہے اس میں تجنیس خطی ہے۔ پھر ہر بار لائے جس کے معنی ہر دفعہ کے ہیں۔ تیسرے مصرع میں گھربار زبان اردو کا ایک محاورہ لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں مکان اور تمام سامان اور اسبابِ مکان کا۔ چوتھے مصرع میں گہربار لائے جس میں اور گھربار میں تجنیس خطی ہے۔ اور گہربار کے معنی موتی برسانے والا۔ ٹیپ میں والی ولایت ولی۔ تو لاکے الفاظ میں صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق ہے۔ یہ صنعتیں اسی تجنیس کی سرسبز و خوش نما شاخیں ہیں۔ ناظرین! دیکھئے باایں ہمہ کس قدر سلیس نظم ہے ع یہ نظم مسلسل ہے کہ موتی کی لڑی ہے صل علےٰ محمدؐ و آل محمدؐ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] وہ (خدا) مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں۔ تو مجھے شفا دیتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

بولا صدف عقل کا وہ دُرِ یگانہ آدم کے پسر ہیں بشر فخرِ زمانہ

مَیں نم ہوں وہ یم ہیں مَیں خرابہ وہ خزانہ تجنیس سہی فرق تلفّظ بھی ہے یادنہ[1]

صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق سبھی صنعت تجنیس کی گویا مُنہ بولی بہنیں ہیں۔ اشتقاق

اشتقاق یہ کہ دو لفظ ایسے لائیں۔ جن کا ایک مادّہ ہو۔ اور شبہ اشتقاق یہ کہ ایک مادّہ تو نہ ہو شبہ اشتقاق

مگر بظاہر ایک مادّہ معلوم ہوتا ہو۔ صنعت شبہ اشتقاق میں یہ آیت قرآن مجید پائی جاتی ہے۔

قَالَ اِنّی لِعَمَلِکُم مِّنَ الْقَالِیْنَ[2]۔ اس میں قال اور قالین میں شبہ اشتقاق ہے۔ مرزا صاحب

کہتے ہیں۔

(۱) بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق

اس میں طاقت و طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے ✦

(۲) بند ذیل کے اوّل کے چاروں مصرعوں میں یہ صنعت اور اس کے ساتھ صنعت ذوالقافیتین

دیکھئے شمشیر حسینی کی مدح (جہادِ امام حسینؑ) کے بیان میں کہتے ہیں۔ شبہ اشتقاق ذوالقافیتین

یاں سب کو تھا یقین وہاں تھی وہیں نہ تھی واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی

ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی نہیں نہ تھی

اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے

(شبہ اشتقاق)

واں تھے جہاں زمیں نہ تھی۔ آسماں نہ تھے

(۳) حضرت حُرِّ دلیر کی آمد سے لشکر دشمن میں انتشار ہے۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہر چند اولاد آدم ہونے کے رشتے سے میں مثل آپ کے ہوں۔ مگر کہاں وہ کہاں میں۔ نم یم نہیں ہو سکتا۔ خرابہ خزانہ کا ہمسر نہیں ہو سکتا ہر چند تجنیس خطی ہے مگر تلفظ کا فرق ہے۔ یہ اُس کا جواب ہے کہ مصعب ابن مطلب نے کہا تھا کہ جناب امیرؑ سے ایسے ہی فروتن کرنے کو لے ہے یہ ہر دم۔ جو بندہ حق سب بنی آدم ہیں وہی ہم۔ پیدا کیا کعبہ میں یہ قسمت ہے خدا کی بخشی جو امامت یہ عنایت ہے خدا کی ✦ ۱۲ مؤلف حقیر

[2] کہا کہ میں تمہارے اعمال کے سبب سے تمہارے دشمنوں (بغض رکھنے والوں) میں سے ہوں ✦ ۱۲ مؤلف حقیر

مشبہ
اشتقاق

کھولا کسی نے جینے سے ہو کر بہ تنگ تنگ گوشے میں کوئی رکھ کے کمان و خدنگ دنگ
بے وقفہ ہوش اُڑ گیا اور بے درنگ رنگ یہ کیا تھا منزلوں ہوئے پائے پلنگ لنگ
گو مکر و حیلہ۔ ظالموں کی آب و گل میں تھا
اُس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل میں تھا

مقلوب

صنعت مقلوب ۔ ایک لفظ کو لوٹنے سے دُوسرا لفظ پیدا ہو۔ یہ بھی ان اقسام تجنیس کی ایک **قسم** ہے۔ اور سب سے زیادہ مشکل صنعت مقلوب مستوی ہے۔ کہ ایک فقرہ یا مصرع کے اُلٹنے سے وُہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ سب سے پہلے قرآن شریف میں یہ صنعت ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) **ربّک فکبّر** ۔ (۲) **کلّ فی فلک** میں الگ الگ حرف لکھتا ہُوں۔ آپ چاہے دہنی طرف سے پڑھیں۔ چاہے بائیں طرف سے۔ وہی فقرہ پڑھا جائیگا۔ ر ب ك ف ك ب ر ۔ ك ل ف ی ف ل ك

مقلوب مستوی قرآن شریف میں ہے

اس صنعت میں امیر خسروؒ کی ایک بیت بہت مشہور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ ؎

(۱) شکر بترازوے وزارت برکش (۲) شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش
(۱) ش ک ر ب ت ر ا ز و ی و ز ا ر ت ب ر ک ش (۲) ش و ہ م ر ہ ب ل ب ل ب ل ب ہ ر م ہ و ش

بعض بے درد جو خود ایسی نظم کہنے سے عاجز ہیں۔ اس بیت پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ اس میں بہ تکلف جب معنی پہناؤ۔ جب مطلب شعر کا نکلتا ہے۔ صاف نہیں ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ گو بہ تکلف معنی حاصل ہوں۔ مگر پھر بھی کمال شاعری ہے۔ دُوسرا کہنے بیٹھے جب حقیقت کھلتی ہے۔ اب ہمارے اردوئے معلےٰ کے خسرو معانی کی بیت فارسی دیکھئے۔ اور انصاف سے فرمائیے۔ کس قدر صاف و بامعنی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے۔ تو جب تک اُس سے کہا نہ جائے۔ کہ یہ مقلوب مستوی ہے۔ اُس کا خیال بھی شاید نہ پہنچے۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

بیت دبیرؔ

(۱)	(۲)
امید آشنایان شادی ما	امید آباد بد آبادی ما
(۱) ام ی د اش ن ای ان ش ا د ی م ا	(۲) ام ی د اب اد ب د اب ا د ی م ا

یہ تو کلیات فارسی جناب مرحوم میں سے بیت عرض کی۔ اب اردو میں اس صنعت کو کلام مرحوم سے دکھاؤں۔ سُنا ہے۔ کہ ایک خاص مرثیہ صنائع مشکلہ میں فرمایا ہے۔ جو ابھی تک محفوظ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح سن کی زمیں ہے۔ استاذی حضرت اوج مدظلہ نے اس کتاب کی عزت بڑھانے کے لئے میری عرض کرنے پر چند بند اُس میں سے مرحمت فرمائے ہیں۔ (اس عنایت کا شکریہ نہیں ادا ہوسکتا) اُس میں سے ذیل کا بند لکھتا ہوں:۔

(۲) امام حسینؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

چلّاتے ہیں مخدوم لئے جاروب پلک کی ۔۔۔ ہاں جھاڑ دو جلوہ گاہ شہ ارض و فلک کی

تسلیم کو خلق آئی ہے فردوس تلک کی ۔۔۔ ہیں فرش سر راہ صفیں حور و ملک کی

آقائے امم عرش معلّےٰ کا شرف ہے

یہ فرش باداب۔ اک آقا کا شرف ہے (صنعت مقلوب) مقلوب

(ی ہ ۔ ر ش ب ا د ا ب اک ا ق اک ا ش ر ف ہ ے)

یہ مصرع قلب ہونے پر جوں کا توں باقی نہیں رہتا۔ مگر ایک ایسا مصرع پیدا ہوتا ہے۔ جو وہی معنی دیتا ہے یعنی ع یہ فرش اک آقا کا باداب شرف ہے۔ اور جب مصرع آخر الذکر کو قلب کرینگے۔ تو مصرع اول الذکر ع یہ فرش باداب اک آقا کا شرف ہے پیدا ہوگا*+

* جو لوگ ایسی صنعتوں کو گورکھ دھندہ کہتے ہیں۔ مگر ایسے دو چار مصرع کہدیں جب تو ہم بھی انکی ہاں میں ہاں ملانے کو طیار ہوجائیں۔ بلکہ ہماری تکمیل کریں۔ اور جب ایسی صنعتیں کہنے سے عاجز ہیں۔ تو انکی یہ مثل سمجھی جائیگی کہ کھسیانے کا گھمی گرا۔ اُس نے کہا مجھے آبالا ہی بھاتا ہے خود عاجز ہیں۔ اہل کمال پر فضول اعتراض کرتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) اب مَیں اسی مرثیۂ غیر منقسم میں سے ایک مصرع ایسا بھی پیش کرتا ہُوں جس کو اُلٹنے سے وہی مصرع حاصل ہوتا ہے۔ وہ بند مندرجہ ذیل کا چھٹا مصرع ہے۔ امام حسینؑ لشکریان یزید کو (رجز میں) وعظ فرماتے ہیں۔

دو مال رہِ حق میں یہ سودا بر رضا ہے — لو نقدِ عمل صاف کہ صرّاف خدا ہے
اس نقد کا سکّہ شہِ مرداں کی ولا ہے — کیا زیست کا دم بھر ہے ہوا اک دم میں فنا ہے

پھر زرے نہ کرو مصحفِ اسلام ہمارا
آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا ※۱ (مقلوب مستوی)

ا ر ا م ہ م ا ر ا ہ ے ی ہ ا ر ا م ہ م ا ر ا

مقلوب مستوی

(۴) مقلوب کل اوّل بھی اسی کی ایک قسم ہے جس کو مقلوب مجنح بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو لفظ ایک مصرع کے اوّل یا آخر میں ہے۔ اُس کا معکوس دُوسرے مصرعوں میں ہے۔ اس صنعت میں بند مندرجہ تحت ملاحظہ فرمائیے:-

مقلوب کل اوّل یا مقلوب مجنح

(اُسی مرثیہ غیر منقسم میں رزم کے موقع پر کہتے ہیں)

راہ ایسی سیہ بختی لشکر سے ہُوئی تار — رات ایک طرف ظلمت دوزخ تھی نگوں سار
راس آئی نہ یہ جنگ ہُوئے جینے سے بیزار — راز اس میں یہ تھا تیغ گلے کا ہُوئی تھی ہار

ہے صنعت مقلوب کل اوّل تو بجا ※ ہے
آخر ولد القلب ہر اک اہل جفا ہے

※ چاروں مصرعوں میں حسب ذیل الفاظ معکوس ہیں:-
(۱) راہ کا اُلٹا ہار۔ ہار کا معکوس راہ +
(۲) تار کا اُلٹا رات۔ رات کا معکوس تار +
(۳) سار کا اُلٹا راس۔ راس کا معکوس سار +
(۴) زار کا اُلٹا راز۔ راز کا معکوس زار +

※۲ ذیل کی رباعی کا چوتھا مصرع بھی اسی صنعت مقلوب مستوی میں ہے:-

رباعی

جب پیاس سے رن میں ہوئے اکبر بے تاب
کملا کے ہوا زرد گل باغ شباب
جب شہ نے کہا آئیں کمک تو کب
بابا یہ کمک ہے یہ کمک ہے آب آب
(ب ا ب ا ی ہ ک م ک ہ ی ی ہ ک م ک ہ ی ا ب ا ب)
۱۲ مؤلف حقیر

ردّ العجز علی الصدر۔ یہ صنعت علم عروض کی بعض اصطلاحات سمجھنے پر سمجھ میں بخوبی آتی ہے۔ شعر کو بیت (گھر) کہتے ہیں۔ جس کے دو مصرع (کنواڑ) ہوتے ہیں پہلے مصرع کے پہلے جزو کو صدر اور پچھلے (آخر) کو عروض۔ اور دوسرے مصرع کے پہلے جزو کو ابتدا اور آخر جزو کو عجز (اور ضرب) کہتے ہیں۔ باقی جو الفاظ دونوں مصرعوں میں رہ جاتے ہیں۔ اُن کو حشو (بھرتی) کہتے ہیں۔ اب یہ بھی سمجھ لیجئے۔ کہ جو لفظ آخر مصرع میں آئیں۔ اگر وہی مصرع ثانی کے اوّل میں لائیں۔ تو اُس کو بھی ردّ العجز علی الصدر کہتے ہیں۔ (بعض کتب معانی و بیان میں اس کا نام معاد بھی ہے۔ مگر مشہور اُسی نام سے ہے) حالانکہ اس کو ردّ العجز علی الابتدا کہنا چاہئے تھا۔ مگر غالباً جو موجد اوّل نے نام رکھ دیا۔ وہی اب تک چلا آتا ہے یہ سچ ہے۔ باپ گورے بچہ کا بھی نام کلّو رکھ دے۔ تو سب کلّو ہی کلّو کہینگے۔ اور یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ آخر مصرع اوّل کے دو تین لفظوں میں سے ایک لفظ بھی دُوسرے مصرع کے شروع میں آ جائیگا جب بھی یہ صنعت ردّ العجز علی الصدر کہلائیگی

اس کی مثالیں کلام دبیرؔ میں سے حسب ذیل پیش ہیں:۔

(۱) پہلوان کی لڑائی میں سے ایک بند لکھتا ہوں۔

خنجر کو جو کاٹا تو وہ۔ ٹھہری نہ سپر پر | ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر | تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامن زیں پر
تھی دامن زیں پر۔ تو نہ مرکب تھا زمیں پر*

(۲) تین بند ذیل مسلسل امام حسینؑ کی رجز میں فرماتے ہیں۔

کوثر کی آبرو ہوں میں رضواں کی آبرو | رضواں کی آبرو ہوں میں سلماں کی آبرو

* الفاظ کی بندش میں کیا صفائی ہے کہ تلوار گویا چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس بے تکلفی سے کہنے پر جب شاعر قادر ہو جائے جب ایسی صنعتیں کہنے کا لطف ہے ۔ ۱۲ مؤلف۔

مسلماں کی آبرو ہُوں۔ میں ایماں کی آبرو ایماں کی آبرو ہوں۔ میں قرآں کی آبرو

قرآں کی آبرو ہوں۔ تو آدم کا فخر ہوں

آدم کا فخر ہُوں۔ تو دو عالم کا فخر ہوں

عالم کا فخر ہوں کہ میں عالی وقار ہوں عالی وقار ہوں کہ میں حق پر نثار ہوں

حق پر نثار ہوں کہ میں طاعت گذار ہوں طاعت گذار ہوں کہ میں اُلفت شعار ہوں

اُلفت شعار ہوں کہ میں عاشق خدا کا ہوں

عاشق خدا کا ہوں کہ میں دل مصطفٰے کا ہوں[1]

دل مصطفٰے کا ہوں کہ میں نور اللہ ہوں نور اللہ ہوں۔ میں ہی زہرا کا ماہ ہوں

زہرا کا ماہ ہوں۔ شہ انجم سپاہ ہوں انجم سپاہ ہوں تمہیں شاہوں کا شاہ ہوں

شاہوں کا شاہ ہوں تمہیں کل کا امیر ہوں

کل کا امیر ہوں۔ میں علیؑ کا وزیر ہوں[2]

مثال (۱) ردالعجز علی الصدر

(۳) ردّ العجز علی الصدر میں ایک مرثیہ حال جناب علی اکبرؑ کا مطلع سُنیئے :-

معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے ہے ذہن رسا اَوج پہ اکبر کی ثنا سے

اکبر کی ثنا کرتا ہوں افضال خدا سے افضال خدا ہے مدد خیر ورا سے

جب ہو مددِ خیر ورا ذہن رسا پر

پھر ذہن رسا کا ہو گذر عرش علا پر

صنعت لزوم مالا یلزم

لزوم مالا یلزم۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے۔ جس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ یعنی جو صنعت چاہے۔ شاعر و ناثر لازم کرلے۔ جیسے مقید قافیہ لانا۔ اسکی مثال قرآن شریف

[1] اس میں ایک باریک نکتہ ہے جسکی داد صرف اہل دل اہل عشق دے سکتے ہیں۔ کہ حضور صلعم خود محبوب و معشوق خدا ہیں۔ اور اُن کا دل خدا کا عاشق ہے۔ اور امام حسینؑ گویا اُن کے دل ہیں۔ تو یہ بھی عاشق خدا ہوئے ۱۲ مؤلف۔

[2] ماشاءاللہ کس قدر زبان پر قدرت حاصل ہے معلوم ہوتا ہے۔ بے تکلف نثر کے فقرے فرما رہے ہیں ۱۲ مؤلف۔

میں یہ آیت ہے۔ فامّا الیتیم فلا تقہر واما السائل فلا تنہر۔ اس میں یہ التزام کر لیا ہے کہ حرفِ آخر رے کے ماقبل ہائے ہوز ہو۔ حالانکہ تقہر کا قافیہ تسخر بھی ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے کلام میں متقید قافئے ہزاروں ہیں۔ مثلاً ایک بند ذیل کے چار مصرع پیش کرتا ہوں:۔

حضرت عباسؑ کی مدح میں عونؑ محمدؑ شمر سے کر رہے ہیں

(متقید قافیہ)

اس بار کے اُٹھانے کو طاقت بھی چاہئے ۔۔۔ طاقت فقط بخیر لیاقت بھی چاہئے

صاحب علم کو حسنِ رفاقت بھی چاہئے ۔۔۔ دل کو وفا زباں کو صداقت بھی چاہئے

ایسا ہے منتظم کوئی تیرے قیاس میں

لاکھوں سے جو لڑائے بہتّر کو پیاس میں

(غیر منقوطہ)

صنعت غیر منقوط بھی اسی لزوم مالا یلزم میں سے ہے۔ جس کو صنعت مہملہ اور بے نقط بھی کہتے ہیں۔ اس صنعت میں پُورا ایک مرثیہ جناب مرزا مرحوم کا ہے۔ جو غیر منقسم ہے۔ جس کا یہ مطلع ہے ع مہرِ علم سرورِ اکرم ہُوا طالع۔ میں اس موقع پر صرف تین بند دُوسرے مرثیوں سے لکھتا ہُوں٭:۔

(بند غیر منقوطہ)

(۱) صمصام کو الہام ہُوا سر کو علم کر ۔۔۔ گہ سورۂ الحمد کو گہ صورہ کو دم کر

اک وار لگا اور دو اعدا کا علم کر ۔۔۔ ہر دم عمر سعد کا دم محو عدم کر

دو حصّہ کمر کر کہ الگ کاسۂ سر کر

ہر طرح مہم سہل کرا ور کہ سر کر

(۲) حُر رضی اللہ عنہ کے حال میں۔

(غیر منقوطہ)

حُر حملہ ور ہُوا کہ اسد حملہ ور ہُوا ۔۔۔ وہ حملہ ور اُدھر اِدھر اسلام ور ہُوا

سرگرمِ معرکہ سرِ اعدا اگر ہُوا ۔۔۔ وہ گُل کھلا کہ لالہ کہسار سر ہُوا

٭ کیونکہ نہ وہ مرثیہ میرے پاس ہے نہ اور کسی کے پاس ہے۔ بجز جانشین جناب معدوم حضرت اوج مدظلّہ کے۔ مؤلف

اہلِ حسد کو درس اُدھر آہ آہ کا

حور و ملک کو ورد اِدھر واہ واہ کا

(۴۲) ہمدم دمِ حسام کا اعدا کا دم ہُوا — درد و الم سوا ہُوا آرام کم ہُوا

صمصام سکّہ اور دلِ اعدا درم ہُوا — وہ دل اگر درم ہُوا مال عدم ہُوا

مدّاح حر کا سرور و الا گہر ہُوا

اور رہروِ عدم وہ گروہ عمر ہُوا

منقوط منقوط۔ جس کے ہر حرف پر نقطہ ہو۔ یہ صنعت بہ نسبت غیر منقوطہ کے اس لئے زیادہ مشکل ہے۔ کہ حروف منقوط کے الفاظ کم ہیں۔ مرزا صاحب کا اس صنعت میں کلام ملاحظہ فرمائیے! اور اوروں کے منقوط کلام سے ملائیے۔ تو معلوم ہو کہ کس قدر بے تکلف ہے*۔

منقوط رباعی (۱) زہیر بن قین جو میمنۂ لشکرِ امام حسینؑ کے بروزِ عاشورا ۶۱ھ علمدار تھے۔ اُن کی مدح میں رباعی۔

جب بخت بن قین نے زینت بخشی — زینب نے تشفّی تب بشفقت بخشی

تیغیں جز تن جبیں شق۔ جی بے چین — جنت بخشی نبی نے جنّت بخشی

صنعت موصل بشکل نثاری اس رباعی کے دو مصرع (ثانی و رابع) میں ایک اور صنعت بھی ہے جس کو موصل کہتے ہیں یعنی تمام حروف ملا کر لکھ سکتے ہیں سوائے حرف اول کے (اس طور پر):۔

(۱) زینبنیتشفیتببشفقتبخشی (۲) جنتبخشینبینیجنتبخشی

مقابلۂ نگارش منقوط از تذکرۃ البلاغہ *۔ مولوی ذوالفقار علی صاحب نے کتاب تذکرۃ البلاغہ اردو میں لکھی ہے۔ (جس کے صلہ میں فیّاض علم دوست گورنمنٹ نے پانچ سو روپیہ بخشے ہیں) اور انہوں نے اس صنعت میں حسب ذیل نظم و نثر اپنی کتاب مذکور میں لکھی ہے۔ (مثال نثر) بی بی زینب نے تین شب تتبع۔ (مثال نظم) جب ترتیب غضنفر بخشش نبی بخشش فیض حشن تحت نشیں۔ اس لکھنے سے مصنف ممدوح کی مجھے تنقیص منظور نہیں ہے۔ بلکہ مقابلہ کر کے صرف یہ دکھانا ہے کہ مرزا صاحب کی نظم کس قدر با معنی اور بے تکلف ہے ۲۰ مؤلف حقیر۔

ان کے لکھنے میں ارّہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے اس کو موصل منشاری کہینگے +

(۲) صنعت منقوط کی دُوسری مثال تلوار کی مدح میں۔

تیزی تپ تیغ سے نے بخشی نئی خفّت　　بے چین شقی۔ بخت بلی جبن بہ نیّت
چینی فتنی۔ چین بجبیں پشت بجنّت　　نے جی نہ پچھے نے تن نہ بچے نے زین نہ ہمت
نے چین جبیں نے ذقن زشت نہ بینی
نے نبض نجنبش نہ تنِ زشت نہ بینی*

اس کے دُوسرے اور تیسرے مصرع میں صنعت موصل منشاری ہے۔

بیچینشقیبختبلیجبنبہنیّت　　چینیفتنیچینبجبینپشتبجنت

سجع۔ ایک لفظ کے مقابل جب دُوسرے ہموزن لفظ لائیں۔ تو اُس کو سجع کہتے ہیں
اس میں اختلاف ہے۔ کہ سجع نظم و نثر دونوں کے واسطے آتا ہے۔ یا صرف نثر سے مختص ہے۔
صاحب حدائق البلاغہ اور تقریبًا تمام متاخرین کے نزدیک نظم و نثر دونوں میں آتا ہے۔ وزن
سے یہاں مراد وزنِ عروضی ہے۔ جیسے فاعلُن لُوَرتَنْ کے وزن پر ہے۔ جس میں حرکات
الفاظ کا باہم متفق ہونا ضرور نہیں ہے۔ اور اگر متفق ہوں۔ تو اور خوبی ہے۔ اور جب وہ
الفاظ باہم قافیہ بھی ہوسکیں۔ تو اُس کو نثر صیع کہتے ہیں۔ اس کا مرتبہ سجع سے اعلےٰ ہے

(۱) حضرت علی اکبرؑ کے رجز میں مرزا صاحب کا ایک بند ہے۔

ہم	قابض	ارواح	ہیں	کفّار	کی	خاطر
ہم	مرہم	آرام	ہیں	دیندار	کی	خاطر

صنعت منقوط ... (margin)

سجع کی تعریف ... (margin)

مثال سجع (۱) (margin)

* واضح ہو کہ اظہار حرکت کے واسطے جو ہمزہ یا ہائے ہوز لکھی جاتی ہے۔ اُس کا شمار حروف میں نہیں ہے
پس نہ جنبش نہ تن زشت نہ بینی وغیرہ میں نہ کو ملا کر بھی لکھو جب بھی اس کو منقوط ہی مانا جائیگا۔ کیونکہ واسطے اظہار
حرکت کے ہے۔ اسی طرح تیزیٔ اور نئی کے اُوپر کا ہمزہ ہے +۱۲ مؤلف حقیر۔

ہم	ضربت	صمصام	ہیں	اشرار	کی	خاطر
ہم	قوت	اسلام	ہیں	ابرار	کی	خاطر
ہم	پردۂ	ستاری	و	غفاری	رب	ہیں
ہم	خنجر	قہاری	و	جبّاری	رب	ہیں

مثال (۲) سجع

(۲)

لے	ہدیۂ	تائیدِ	قدیرِ ازلی	لے
لے	خلعتِ	تحسین	حسینؑ ابن علیؑ	لے

مثال (۱) ترصیع

(۱) صنعت ترصیع ـ رجز امام حسینؑ کے موقع پر چاروں مصرع کے ہیں۔

معبود جز و کل	نے	کریمانہ	رضا	دی
اور صاحبِ دلدل	نے	بزرگانہ	دُعا	دی
فوج اپنی توکل	نے	دلیرانہ	بڑھا	دی
آمد کے تجمّل	نے	نقیبانہ	ندا	دی

مثال (۲) ترصیع (باغ)

(۲) ترصیع میں یہ ٹیپ ایک باغ کی تعریف میں ہے۔ دیکھئے اس رنگ میں بھی مرثیت کا پہلو موجود ہے۔

ہر غنچہ	ہے	دفتر	غم	شاہ دوسرا کا
ہر لالہ	ہے	محضر	گل	زخم شہدا کا

مثال (۳) ترصیع تلوار کا کاٹ

(۳)

تھا شور وہ تڑپی	وہ گری	فوج پر آکر
وہ جسم میں ڈوبی	وہ تری	خون میں نہا کر
چمکی وہ زمین پر وہ	پھری	چرخ پہ جاکر
وہ خون میں ڈوبی وہ	اُٹھی	سر کو گرا کر

وہ پے کیا پیدل کو وہ اسوار کو کاٹا

وہ تنگ میں در آئی وہ رہوار کو کاٹا*

* دیکھئے پہلا اور دوسرا مصرع بے تکلف صنعت ترصیع میں نظم ہو گیا۔ انیس کے بعد کسی نے لکھا کہ اس صنعت میں بے تکلف نظم ہونا [illegible] صنعت [illegible] کی۔
[illegible]
[illegible]

ذوالقافیتین

ذوالقافیتین۔ ہر ایک مصرع میں دو قافیہ ہوں۔ اور جو ہر مصرع میں تین یا زیادہ قافیہ ہوں۔ تو ذوالقوافی کہتے ہیں۔

ذو قافیتین

سردار لشکر کو فوج شام اپنی فوج سے کر رہا ہے

ہاں سر فروشو جان لڑانا لڑائی میں — پیاسوں کے خون کی نہر بہانا ترائی میں

تلمیح

تلمیح۔ جس میں کسی مشہور واقعہ کا اشارہ ہو۔ یہ صنعت مرزا صاحب کے مرثیوں میں بہت ہے۔

مثال (۱)

(۱) زعفر جن کو جب جنوں نے خبر دی ہے۔ کہ امام حسینؑ ایک میدان میں تنہا تین دن کے پیاسے کھڑے ہوئے ہیں۔ زعفر اُن جنوں سے کہتا ہے۔

دم غم سے اُلجھتا ہے یہ کھلتا نہیں ہم پر — پانی بھی ہوا بند شہنشاہ امم پر
تم لوگوں کا پہرہ تھا اسی بیر علم پر — آئے جو علیؑ گر پڑے سر کٹ کے قدم پر
پتھر تھے کناروں پہ مگر ہو گئے پانی
یوں لے گئے پانی کہ جگر ہو گئے پانی

اس میں مشہور واقعہ جنگ بیر العلم کی طرف اشارہ ہے۔ جو جنات اور جناب امیرؑ میں ہوئی تھی +

مثال (۲)

(۲) مناقب جناب امام حسینؑ میں مناقب جناب رسول خداؐ و علیؑ مرتضےٰ سے مشابہت بیان کرتے ہیں۔

روشن ہے مثل مہر یہ اعجاز مرتضےٰ — مغرب سے آفتاب نے رجعت کی بارہا
روزہ مگر حسینؑ نے طفلی میں جو رکھا — پیش از زوال چھپ گیا مہر جہاں نما
انگشتِ مصطفےٰ سے دو پارہ قمر ہوا
اور خاطر حسینؑ سے ٹکڑے گہر ہوا

اس ایک بند میں حسب ذیل واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) جناب امیرؑ کے واسطے آفتاب نے (غروب ہوکر) رجعت کی۔ (۲) امام حسینؑ نے بچپن میں روزہ رکھا۔ تو آفتاب پہلے سے غروب ہوگیا۔ (۳) جناب رسول خدا صلعم کے واسطے شق القمر ہوا۔ (۴) امام حسینؑ کی خاطر سے بحکم خدا جبرئیلؑ نے آکر پر مارکر ایک موتی کے دو ٹکڑے برابر کر دئے۔ کہ ایک ٹکڑا امام حسنؑ نے دوسرا ٹکڑا امام حسینؑ نے لیا +

سیاق الاعداد

سیاق الاعداد۔ عددوں کو باترتیب یا بے ترتیب ایک جگہ نظم کر دینے کو صنعت سیاق الاعداد کہتے ہیں۔

مدح پنجتن پاکؑ میں کہتے ہیں

واجب ہے شش جہت پہ تولائے پنجتن ہیں ہشت خلد بہر احبائے پنجتن
ساتوں سقر ہیں مسکن اعدائے پنجتن چرخ نہم ہے گرسئے زیبائے پنجتن
ایماں پناہ ہیں یہ شریعت پناہ ہیں
ان کے شرف یہ پانچ نمازیں گواہ ہیں*

ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس تا حق پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموس ان کے پانچ نماز عمل کا ہے اساس جن کو کہ ان کا پاس ہے وہ ہیں خدا کے پاس
پانچ انگلیوں سے ہم نے چُنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

تنسیق الصفات

تنسیق الصفات۔ ممدوح کی چند صفات ایک جگہ جمع کر دینے کو صنعت تنسیق الصفات کہتے ہیں۔

قرآن شریف کی آیت مندرجہ ذیل اس صنعت سے متصف ہے۔

هو الله الذی لا اله الا هو۔ الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن

* ۵۔۶۔۸۔۷۔۹۔ یہ سب اعداد جمع کر دئے ہیں۔ مؤلف حقیر۔

العزیز الجبار المتکبر۔

اس میں خدا نے اپنی صفات ملک۔ قدوس۔ سلام۔ مومن۔ مہیمن۔ عزیز۔ جبار۔ متکبر بیان فرمائی ہیں

مثال (۱) (۱) مرزا صاحب مدح امام حسینؑ میں کہتے ہیں۔

سرتاج عرش۔ زیب دہ کرسی بلند — سرکار حق کے کارگذار اور کاربند
عاشق۔ مطیع۔ فدیہ۔ مصاحب۔ نیازمند — راضی رضا بہ۔ محو شہادت۔ بلا پسند *
سب کچھ خدائے عز و جل کے حسینؑ ہیں
مالک ابد کے اور ازل کے حسینؑ ہیں

مثال (۲) (۲) ذوالفقار شہریار حیدر کرارؑ کی مدح میں فرماتے ہیں۔

پھل وزن میں تھا پھول تجلی میں نخل طور — گرمی میں محض نار۔ تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ۔ چال پری۔ قبضہ چشم حور — خود لہر۔ آب زہر۔ تڑپ قہر۔ شور صور
نکلی بس اور زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر

مثال (۳) (۳) اقربائے امام حسینؑ کی صفات حمیدہ میں مصنف کہتے ہیں۔

گل پیرہن و گلبدن و گل رخ و گل فام — شمشاد قد و غنچہ دہان و سمن اندام
خوش قامت و خوش رو و خوش آغاز و خوش انجام — حسن چمن شرع۔ بہار گل اسلام
کس عرصہ میں یہ فاطمہؑ کا باغ کھلا تھا
سو ظہر تلک رن میں تہ خاک ملا تھا

مثال (۴) (۴) حضرت عباسؑ کی تلوار کی تعریف (صنعت تنسیق الصفات میں)۔

بجلی کا جست۔ شیر کی آمد۔ ہوا کا شور — قدرت کا کھیل۔ قہر کی طاقت۔ بلا کا زور
راہ عدم۔ جبنا رہ ہستی۔ دہان گور — جلوہ وہ تھا کہ دیکھنے سے مدعی تھے کور

* بارہ صفات حمیدہ کو چار مصرعوں میں کس خوبی سے جمع فرمایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

رن میں جدھر یہ پارۂ الماس مڑ گئی
مانند ہوش اہل جفا۔ دھوپ اڑ گئی

تضمین

صنعت تضمین۔ بعض الفاظ عربی یا بعض کلام عربی و فارسی کو صفائی و خوبصورتی سے لانے کو صنعت تضمین کہتے ہیں۔

حبیب ابن مظاہر کی مدح میں کہتے ہیں

(۱) سنتے ہی یہ قاب سوئے شبیرؑ پکارا ۔۔۔ القلب علیٰ بابک لیلاً ونہاراً

لشکر امام حسینؑ کی کیفیت صبح عاشورا محرم ۶۱ھ

(۲) پڑھتا تھا کوئی فاعتبروا یا اولی الابصار ۔۔۔ اک سمت توکلت علی اللہ کی تکرار
اک جا فسیکفیکہم اللہ کی گفتار ۔۔۔ منہ سے کہیں وجہت الی اللہ کا اظہار
وہ مصحف ناطق کی حفاظت میں سدا تھے
گر حافظ قرآں رفقا تھے تو بجا تھے

باب ہشتم۔ فصیح و سلیس کلام دبیرؒ

فصل ۱ فصیح و سلیس کلام

ناظرین! آپ نے تصویر کا ایک رُخ دیکھا۔ کلام بلیغ و دقیق کے چند نمونے نظر آئے۔ اب کلام دبیرؒ میں سے چند نمونے سلیس و فصیح کلام کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جن لوگوں کو کلام دبیر دیکھنے کا موقع کم ملا ہے۔ (اکثر) اُن کا یہ خیال ہے۔ کہ مرزا صاحب کلام دقیق ہی اچھا کہتے ہیں۔ مگر اُن کے ہر قسم کے کلام پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب وہ سلیس و فصیح نظم کرنے پر آتے ہیں۔ تو اس میں بھی وہ ویسے ہی کامیاب ہو کر دریا بہاتے ہیں۔ اسی کے ذیل میں چند واقعات کی تصویریں بھی آپ کو نظر آئینگی۔ وہ دیکھ کر انصاف سے فرمائیگا۔ کہ وہ واقعات کے مرقع کتنے خوشنما (اور مختصر اور دلکش) کھینچتے ہیں۔ یہاں تھوڑے سے نمونے دکھاتا

ہوں۔ جلد دویم میں بکثرت یہ مرقع ہیں۔

(۱) ایک پہلوان حضرت علی اکبرؑ پر اپنا وار کر چکا ہے۔ اب علی اکبرؑ اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں:۔

اکبرؑ نے کہا۔ سیکھ ابھی تیغ لگانا لے دیکھ۔ مری ضرب۔ مرا ہات اٹھانا
ہاں تیغ مری آئی۔ ارے سر کو بچانا اس کہنے میں نے سر تھا نہ گردن تھی نہ شانا
دم تن سے نہ نکلا کہ وہ چھپنے کی گھڑی تھی
ڈر سے نہ اجل آئی کہ تلوار کھڑی تھی

تلوار سے کٹنے کے بعد مضروب میں تھوڑی دیر تک جان باقی رہتی ہے۔ اس کی حسن تعلیل یہ فرمائی۔ کہ تلوار کے ڈر سے نہ موت آئی۔ نہ دم بدن سے نکلا کہ تلوار کھڑی ہوئی تھی جب یہ کاٹ کر ہٹی۔ تو موت بھی آئی۔ اور دم بھی نکلا۔ اوپر کے چاروں مصرع بھی کس قدر سلیس ہیں اور جیسی اصیل تلوار میں صفائی ہوتی ہے۔ ویسی ہی بندش میں بھی صفائی دکھائی ہے۔ ع
کٹے جاتے ہیں جس کو سن سن کے حاسد +

(۲) دو پہلوانوں سے ایک ساتھ شاہزادہ علی اکبرؑ کی لڑائی۔

دو دیوؤں سے کی ایک سلیماں نے لڑائی روکی سپر اس سمت۔ ادھر تیغ لگائی
تلوار ادھر کو گئی۔ ڈھال اس طرف آئی کاندھوں پہ فرشتوں کا وظیفہ تھا دہائی
دونوں طرف اک بار صفائی نظر آئی
نے ہات نہ تیغیں نہ کلائی۔ نظر آئی

گھوڑے کی عناں تھام لی اکبرؑ نے کمر سے زانو کے تلے تیغ و سپر رکھ لی ہنر سے
اور دونوں کی گردن لی۔ ادھر اور ادھر سے سر ایک کا ٹکرانے لگے۔ ایک کے سر سے
اکبرؑ کے تصرف میں خدائی نظر آئی
جنگل میں پہاڑوں کی لڑائی نظر آئی

(۳) (اضطرابِ ہیبت) (۳) حرمؑ کی میدان جنگ میں آمد کے وقت دشمنوں کے اضطرار کی تصویر (نہایت مختصر لفظوں میں)۔

میداں سے پاؤں اُٹھ گئے اور خود گر گئے — مارا طمانچہ خوف نے مُنہ سب کے پھر گئے

(۴) جنابِ سیدہ کا جناب رسولِ خدا کے سوگ میں جو حال تھا اس کا مرقع ۔

(۴) جناب رسالت مآب صلعم کی وفات کے بعد اُن کی اکلوتی چاہیتی بیٹی (جناب فاطمہؑ) کی کیفیت حسب ذیل سیدھے سادے مگر دلکش الفاظ میں مصنف بیان کرتے ہیں:۔

کھانے کو۔ کھالیا۔ جو کسی نے کھلا دیا — لیکن عزا میں۔ کچھ نہ۔ غذا نے مزا دیا
غش میں کسی نے مُنہ میں جو پانی چُوا دیا — قطرہ پیا اور آنکھوں سے دریا بہادیا

نسبت ہے کس سے فاطمہؑ کے شور و شین کو
زہراؑ کے بعد۔ روئی ہیں زینبؑ۔ حسینؑ کو[۵۱]

سِن کم۔ قلق زیادہ۔ قلق سے فغاں سوا — سینے سے دل۔ تو دل سے جگر ناتواں سوا
اور بین میں نبیؐ کے کرم کا بیاں سوا — تپ وہ کہ نبضوں سے طپش استخواں سوا[۵۲]

جب فاطمہؑ نے ہائے پدر۔ کہکے آہ کی
واں ہل گئی۔ ضریح رسالتؐ پناہ کی

(کمال غم کی تصویر) فِضّہ کنیز فاطمہؑ کرتی ہیں یہ بیاں — گھر سے ہُوا جنازہ پیمبرؐ کا جب رواں
ک ہفتہ رات دن اُسی حُجرے میں نیم جاں[۵۳] — بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں مخدومۂ جہاں

دیکھا جو میں نے جھانک کے۔ تو۔ آنکھ بند ہے
آواز آہ آہ کی دل سے بلند ہے

---

۵۱ یہی بین کے کنایہ اشارے ہیں کہ واقعہ کربلا کو جا بجا لفظوں نہیں بلکہ دلکو ساعین نظارہ کے دکھلا کو تڑپا دیا۔ ملت فاطمہؑ کی خوشی کی ہے۔ بعد اس کے مرزا صاحب موصوف بانداز میں غزہ شقندہ مزا یہ الفاظ یاس یاس ایک ہی مصرع میں لانے سے جو دلوں پر اثر ہوتا ہے۔ اسکی کیفیت اہل زبان کے دل سے پوچھئے + ۱۲ مولف حقیر

۵۲ اس میں ردیف ہے اور مشکل ردیف ہے۔ مگر غور سے دیکھئے قافیہ سے کس قدر چسپاں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

۵۳ کمال غم کی حالت اس سے بڑھکر کوئی شخص نہیں بیان کر سکتا۔ کہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں + ۱۲ مؤلف حقیر

ہمسائیاں یہ کہتی تھیں اے عاشقِ پدر دیدارِ مصطفےٰ تو ہے موقوف حشر پر
اُن کے عوض تو اپنی زیارت سے شاد کر حجرے میں بیٹھتی تھی یہ کہکر وہ نوحہ گر

اب میں ہوں اور ہر ایک حقارت سے صاحبو
بابا موئی [1] کی خاک زیارت ہے صاحبو

القصّہ بعد ہفتہ کے دن آٹھواں ہوا اور نیل پوش ظلمتِ شب سے جہاں ہوا
یاں مہرِ برجِ حجرۂ ماتم عیاں ہوا پر اس طرح کہ مُردے کا سب کو گماں ہوا

یہ شکل ہوگئی تھی عزا میں رسولؐ کی
پہچانی بیٹیوں نے نہ صورت بتولؑ کی

تصویر حجرہ جناب زینب

وہ وقت شام اور وہ اندھیرا ادھر اُدھر ششدر ہر ایک رہ گیا مُنہ دیکھ دیکھ کر
زینبؑ نے جاکے حجرے میں ڈھونڈا بچشمِ تر چلّائی ہائے لوگو نکل جاؤں میں کدھر

ماں میری کیا ہوئی۔ میں قلق سے ملول ہوں
مُڑکر پکاریں آپ۔ تمہیں تو بتولؑ ہوں

فِضّہ بیان کرتی ہیں اُس وقت کا یہ حال دُبلاپے سے ہُوا تھا بدن صورت ہلال
ماتم کے نیل سینے پہ۔ رونے سے آنکھیں لال مُنہ زرد۔ ہونٹ خشک۔ پریشان سر کے بال

تصویر جناب فاطمہ اور مزار رسول صلعم پر جانا

روتی چلیں مزار رسولؐ انام کو
جس طرح شمع۔ گورِ غریباں پہ شام کو [2]

[1] بابا موئی خاص عورتوں کی زبان کی لفظ ہے یعنی وہ عورت جس کا باپ مرگیا ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] ناظرین دیکھئے کس قدر مختصر لفظوں میں جناب فاطمہؑ کی شکل پریشان و غمگین دکھائی ہے اور تشبیہ کس قدر معقول ہے شام کا وقت بھی ہے۔ اور قبر پر جاتی بھی ہیں اور روتی ہوئی جاتی ہیں شمع بھی گورِ غریباں پہ شام کو روتی ہوئی جاتی ہے۔ ایسی تشبیہ کو تشبیہ تام کہتے ہیں بعض ناواقف ایسی باتوں کو مبالغہ مذموم سمجھتے ہیں مگر مصیبت زدہ انسان جانتے ہیں کہ انتہا مصیبت میں زمین کا نپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چنانچہ ممدوح مسٹر نواب حاجی علی خاں صاحب بہادر سالار جنگ الملک مرحوم ایک شعر میں کیا خوب کہتے ہیں جس سے بیکسی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یعنی آپ کی فرقت سے دکھایا واقعی بات جس کو مختصر الفاظ میں ادا کیا ہے یہ بھی ایک نکتہ بلاغت ہے۔ ۱۲

گھر سے نکلنے کا حال

اندھیر فاطمہؑ کے نکلنے سے ہو گیا طوفان نوحؑ اشکوں کے ڈھلنے سے ہو گیا
برہم زمانہ ہاتھوں کے ملنے سے ہو گیا عاجز فلک بھی راہ کے چلنے سے ہو گیا
حواؑ کفن سے قبر میں منہ ڈھانپنے لگی
آدمؑ لحد میں تڑپے۔ زمیں کانپنے لگی

راہ چلنے کی حالت اور اضطراب کی تصویر

راہ چلنے کی حالت زار

جز اشک و منزل آنکھوں میں ہر شے تھی خار خار گر گر کے ردا الجھتی تھی پاؤں سے بار بار
اور ماتمی قبا کا گریبان تار تار دل تھا ضعیف و زار پہ روتی تھیں زار زار ۵۱
جب آہ کی۔ تو چاروں طرف بجلیاں گریں
ٹھہرا کے یاں گریں کبھی غش کھا کے واں گریں

ادب [illegible] کا ماتم

رستے کے لوگ فضہؓ نے بڑھ کر ہٹا دئے ہمسائیوں نے غرفوں کے پردے گرا دئے
مردوں کے منہ پہ دوڑ کے دامن اٹھا دئے سب نے چراغ اپنے گھروں کے بجھا دئے ۵۲
کہتی تھیں فاطمہؑ کے پدر کا یہ شہر ہے
نامحرموں نے بی بی کو دیکھا تو قہر ہے
یثرب میں وقت شام جو زہراؑ کا تھا ادب دن کو پھرایا بلوے میں زینبؑ کو ہے غضب ۵۳

---

۵۱ ہائے مضمون کیسا ہے ہر مصرع میں [illegible] شاعر نے تمام مضامین جو کہتے ہیں سب نظم کئے ہیں یہ سب زبان پہ قدرت ہونے کی وجہ ہے [illegible] زبان کے پورا قابو [illegible] محاورات و بندش [illegible] واقعہ تاریخی ہے جب آج تیرہ سو برس بعد [illegible] کیا کیفیت ہوتی ہوگی [illegible]

۵۲ اس زمانے کے بعض خوش اعتقاد شیعہ مسلمانوں کی حسن عقیدت کی تصویر کھینچی ہے اور بتا دیا ہے کہ جناب فاطمہؑ کے گھر سے نکلنے پر اہل مدینہ میں کیا تھلکہ پڑ گیا تھا ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

۵۳ ایک اور غم کا پہلو اپنی قوت تخیل سے نکال لیا کہ مدینہ منورہ میں تو شام کے وقت مسلمانوں نے رسول اللہؐ کی بیٹی کا یہ ادب کیا کہ چراغ تک گھروں کے بڑھا دئے اور ایک وہ دن تھا کہ دن دہاڑے انہیں کی بیٹی جناب زینبؑ بعد شہادت امام حسینؑ اونٹوں پر پھرائی گئیں ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

القصہ آئی قبر پہ وہ کشتۂ تعب پر کس گھڑی کہ ملی تھی قبرِ رسولؐ رب

تربت کے گرد پھرنے سے طاقت جو گھٹ گئی

لیکر بلائیں قبر کی - زہراؑ لپٹ گئی

چلائی آہ وا ابتا وا محمداہ نور اللہ - وا ابتا وا محمداہ

شاہوں کے شاہ - وا ابتا وا محمداہ وا سیداہ - وا ابتا وا محمداہ[1]

بابا - بتولؑ آئی ہے - تسلیم کے لئے

اُٹھئے - یتیم بیٹی کی تعظیم کے لئے[2]

اور بَین اور محبت کی باتیں سُنئے ـ بین

گذرے ہیں آٹھ دن کہ زیارت نہیں ہوئی اس بے نصیب سے کوئی خدمت نہیں ہوئی

منبر ہے سونا وعظ و نصیحت نہیں ہوئی مسجد میں بھی نماز جماعت نہیں ہوئی

حضرتؐ کے مُنہ سے وحیِ خدا بھی نہیں سُنی

جبریلؑ کے پروں کی صدا بھی نہیں سُنی

حجرہ وہی ہے گھر ہے وہی - ایک تم نہیں تارے وہی قمر ہے وہی - ایک تم نہیں

شب ہے وہی سحر ہے وہی - ایک تم نہیں ہے ہے یہ سب ہیں در پہ وہی - ایک تم نہیں

دیتے ہیں سب دعا کہ ٹھہر جائے فاطمہؑ

اور فاطمہؑ یہ کہتی ہے مر جائے فاطمہؑ

---

[1] الفاظ عربیہ وا ابتا وا محمداہ کی تضمین کو دیکھئے مگر بجائے اس کے اُردو کے الفاظ لاتے ہر گز یہ اثر نہ ہوتا ۱۲ مؤلف۔

[2] ٹیپ میں اُس مشہور فضیلت جناب فاطمہؑ کی طرف اشارہ ہے جسکو تمام مؤرخ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ جب جناب سیدہ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں جاتی تھیں وہ جناب صلعم تعظیم کو سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس بیان کی علامت کو بلحاظ حق ہی دیکھئے کہ بیٹی اپنے باپ سے تسلیم دینے کو موجود ہی نہیں کر سکتی ہے دوسرے مقام پر نہیں کر سکتی یہ بلاغت کے نکتے ہیں جنکو دیکھکر بالغ نظر کلام دبیر یہ مان دیتے ہیں ممکن ہے کہ کوئی ناواقف کہے کہ بیٹی کی باپ عام طور پر کب تعظیم کرتا ہے۔ مگر ایسے عوام سے کیا کام ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(محبت کی باتیں)

تسلیم میری اے پدر نامدار لو یہ بال بکھرے۔ ہاتوں سے اپنے سنوار لو
راضی ہوں میں نہ گود میں بھی زینہار لو قربان جاؤں فاطمہ کہکر پکار لو
پوچھو یہ تم ۔ مزاج تو تیرا ۔ بخیر ہے
لونڈی کہے کہ حال جدائی سے غیر ہے[۱]

محبت کی باتیں

مشہور ہے ۔کہ بیٹے کا داغ سب صدموں سے بڑھ کر ہے۔ مگر مصنف ایک عجیب دعوے جناب فاطمہ کی زبانی کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں ۔کہ باپ کا داغ اُس سے بھی بڑھ کر ہے ۔ شاعری میں جائز ہے کہ ایک شخص تمام دُنیا کے خیال و مقولے کے خلاف دعوے کرے ۔ مگر یہ شرط ہے ۔کہ ثابت کر دے ۔ یہی تمثیل کی خوبی و کمال ہے ۔جیسے تمام شعرا کہتے ہیں کہ شمع معشوق اور پروانہ عاشق ہے ۔ برخلاف اس کے ایک ایرانی شاعر نے دونوں میں دشمنی ہونیکا دعوے کیا ہے ۔ مگر کمال یہ کیا ۔کہ ثابت کر دیا ۔ وہ شعر یہ ہے ۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[۲]

اب ناظرین دیکھیں ۔کہ تمام شاعروں بلکہ تمام دُنیا کے خلاف مرزا صاحب مرحوم جناب سیدہ کے واسطے باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے بڑھ کر مشکل ثابت کرتے ہیں یا نہیں ۔ وہ فرماتے ہیں :۔

آساں پسر کا داغ ہے مشکل پدر کا داغ وہ کچھ دنوں کا داغ ہے یہ عمر بھر کا داغ
یہ تن بدن کا داغ ہے وہ اک جگر کا داغ پیدا ہوا پسر تو مٹا اُس پسر کا داغ

باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے بڑھ کر ہے

۱؎ مرثیہ گو شاعر کی قلعی یہیں بین میں کھلتی ہے ۔ دیکھئے جیسی محبت سید الابرار صلعم باپ اور سیدۃ النساء بیٹی میں تھی ۔ ویسی ہی محبت ان بندوں میں بین لکھکر دکھائی ہے ۔ دل کی تڑپ کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ بس یہی مشکل ہے ۔ سراپا لڑائی وغیرہ کے ہزار بند کہنے آسان ہیں ۔ اور ایسے بین کا ایک بند مشکل ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

۲؎ یہ شعر عالباً شیدا کا مشہور ہے ۔ مگر مجھے اُن کے دیوان میں اب تک نہیں ملا ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

اولاد کا ملال ہے۔ پدر کا ملال نہیں
یہ وہ درد ہے۔ جس کی دوا۔ جز اجل نہیں[1]

اور باپ بھی وہ باپ کہ سرتاج انبیا — نورِ خدا۔ جلالِ خدا۔ رحمتِ خدا
روزِ ازل سے تا بابد کُل کا پیشوا — بیٹی پہ صدقے۔ بیٹی کے بچوں پہ بھی فدا
کیونکر نہ اپنی موت مجھے اب قبول ہو
دُنیا میں ایسا باپ نہ ہو۔ اور بتولؑ ہو

(خیر اب ذرا یہ جگر خراش بین بھی سُنئے۔ یہ باتیں مرثیہ کی جان ہیں) *جگر خراش بین*

کیا سو رہے ہو قبر میں بابا جواب دو — چلّا رہی ہے آپ کی زہراؑ جواب دو
مولا جواب دو۔ مرے آقا جواب دو — دل مانتا نہیں میں کروں کیا؟ جواب دو
بولو میں صدقے جاؤں بہت دل ملول ہوں
بابا بتولؑ ہوں میں۔ تمہاری بتولؑ ہوں

پھرتے تھے جب سفر سے مرے پاس آتے تھے — لونڈی کے بے ملے نہ کبھی حج کو جاتے تھے
فاقہ جو میرا سُنتے تھے کھانا نہ کھاتے تھے — جو جو میں ناز کرتی تھی حضرتؐ اُٹھاتے تھے
کیسی حقیر بعد رسولؐ کریم ہوں[2]
دُرِّ یتیم آگے تھی۔ اب تو یتیم ہوں

---

[1] دیکھئے کیسی عمدہ دلیل سے ثابت کر دیا کہ باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے مشکل ہے کہ دوسرے بیٹے کے پیدا ہونے پر وہ داغ مٹ سکتا ہے مگر باپ کا داغ نہیں مٹ سکتا بس اسکی دوا یہی ہے کہ عاشق بیٹی بھی مر کر باپ سے جا ملے اپنی دلیل کو کوادتر تی دیتے ہیں اور کہتے ہیں باپ بھی وہ باپ جو تمام خدا کی خدائی سے بہتر ہو۔ یہ حفظِ خاندانِ رسالتؐ کے ۔۔ اب ہیں جنکا اکثر متوسطین مرزا صاحب خیال رکھتے ہیں اور یہی باب بلاغت میں سے ایک سبب ہے جس وجہ سے وہ اپنے معاصرین سے بہتر سمجھے جاتے ہیں لوگ نیچرل نیچرل پکارتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ خاصانِ خدا کی شان علم کالانعام سے الگ کر کے دکھانا یہی تو (نیچر) قدرت کا نظارہ ہے + ۲۰ مولف حقیر۔

[2] مرثیہ کے اصلی معنی یہی ہیں کہ کسی بزرگ) مرحوم کے اخلاق و عادات حسنہ یاد کر کے رونا۔ یہ اگلی عادات حضور صلعم کی نظم کی گئیں

(۵) صبح عاشورا جناب امام حسینؑ اپنے بعض عزیزوں کو بعض تبرکات سلاح وغیرہ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کہ اب لڑائی ٹھہر گئی ہے۔

پردہ اٹھا کے ڈیوڑھی سے زینبؑ کی نظر — دیکھا سلاح بانٹتے ہیں شاہ بحر و بر
بے ساختہ پکاریں۔ بہن صدقے آپ پر — حقدار۔ امیدوار کھڑے ہیں ادھر ادھر[۱]
آقا ہر اک غلام کے جوہر شناس ہیں
دو نیمچے بھی تیغ حسینیؑ کے پاس ہیں

تصویر واقعہ

تصویر

گردن ہلا کے شاہ نے وہ نیمچے اٹھائے — اور پہلوؤں سے سامنے ہمشیر زادے آئے
ننھے سے ہات قبلۂ دیں کی طرف بڑھائے — ماں اس طرف۔ ادھر شہ ابرار مسکرائے
فرمایا اپنی ماں کے اشارے سمجھ گئے
کی عرض۔ ہاں۔ غلام تمہارے سمجھ گئے[۲]

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) جیسا کہ مؤرخین و محدثین نے لکھا ہے کہ وہ جناب جب سفر سے پھرتے تھے جناب فاطمہ کے گھر میں آیا کرتے تھے اور جاتے تھے تو ضرور اور سب کے بعد جناب سیدہ سے ملتے تھے۔ جناب سیدہ فاقہ سے ہوتی تھیں تو خود بھی بھوکے رہتے تھے اس بند کی بندش اور مضامین عالیہ و زبان کی خوبیاں تو کہتے ہیں کہ اور کچھ بھی لکھوں مگر خیال طول کتاب مانع ہے۔ تیسری جلد دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپ چکا ہے مقطع میں اپنے والد کی مغفرت کے واسطے مرزا صاحب نے دعا کی ہے۔ سنا ہے کہ ان کی چہلم کی مجلس میں پڑھا تھا جو شاید ۱۲۳۱ھ کے قریب قریب انتقال فرما گئے تھے۔ عجیب و غریب بات ہے کہ ایسے فصیح و سلیس شعر مرزا صاحب نے اس زمانہ میں لکھے ہیں کہ جب تک میر انیس مرحوم لکھنؤ میں تشریف لائے تھے و مشہور ہوئے تھے۔ پھر وہ مضمون آفرینی و مشکل و دقیق نظم پر متوجہ ہو گئے ۔ مؤلف حقیر

[۲] اس مصرع میں حقدار امیدوار دو لفظ مصنف علام لائے ہیں بلاغت کا نکتہ یہ ہے کہ لکھنؤ کی شرفا نے یہاں لوگ یہی لیتی ہیں اس کے بدلے اگر مستحق سزاوار لائق یا اور کوئی لفظ لاتے تو یہ بات حاصل نہ ہوتی اور کمال بلاغت یہ ہے۔ کہ یہ بھانجے بھی وہی ہیں ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[۳] اس بند میں امام حسینؑ کے نیمچے اٹھانے بھانجوں کے سامنے آنے اور ہاتھ بڑھانے کی تصویر مختصر لفظوں میں کھینچی ہے سہ ننھے سے ہاتھ کہکر گریز کر کے یہ نظم فرمایا ہے کہ مجلس عزا میں سامعین کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ افسوس کیسے چھوٹے چھوٹے نونہال تھے کٹ گئے ۔ ۱۲ مؤلف

اب دیکھئے کہ پیارے بھانجے اپنے ناز بھرے ماموں سے کیا کہتے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے

شفقت سے والدہ نے کئی ہیں گھڑی آیات ۔۔۔ خود ہم پہ آپکو ہے نگاہِ تفضّلات

دُنیا میں آنکھ کھول کے دیکھا تمہارا ہات ۔۔۔ دعوے یہ ماں کے ساتھ نہ ہم کو بڑے کمالات

اماں اگر نہ کہتیں تو حضرت نہ دیتے کیا؟

نیچے حضور سے خادم نہ لیتے کیا؟

زینبؑ پکاریں بس بس ہے اخلاص میں نہ آؤ[۱] ۔۔۔ عاشق سہی مگر نہ ادب قاعدہ بھلاؤ

باور مجھے تو جب ہو کہ قدموں پہ سر کٹاؤ ۔۔۔ آئی ہو جو حسینؑ پہ ساتھ اپنے لیتے جاؤ[۱]

کچھ آج تو نئے نئے انداز کرتے ہو

کیا سر فدا کئے ہیں جو یہ ناز کرتے ہو

اب ان شیروں کا بانکپن پہلو لئے ہوئے جواب بھی سُن لیجئے :۔

بیٹوں نے دی ندا کہ ہے مرنا محال کیا ۔۔۔ ہم سر فروش ہیں سر و تن کا خیال کیا

ماموں سے بڑھ کے عرض کریں یہ مجال کیا ۔۔۔ دُنیا ہے چند روز پھر اس کا ملال کیا

اب یا کہ وقت عصر ہے سامان کیجئے

جب چاہئے۔ غلاموں کو قربان کیجئے

حضرتؑ نے بھانجوں کو گلے سے لگا لیا ۔۔۔ خود نیچوں کو پیار سے زیبِ کمر کیا

زینبؑ نے واں زمیں پہ سر اپنا جھکا دیا[۲] ۔۔۔ ناگہ ہوا وفورِ تجلّی کبریا

---

[۱] بس بس ہے اخلاص میں نہ آؤ استریف دلوں کا رد ہتر ہے جو ایسے ہی موقع پر بولی ہیں اسی طرح چوتھے مصرع میں فرمایا کہ آئی ہو جو حسینؑ پہ ساتھ اپنے لیتے جاؤ۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ بلا جاتی ہو۔ اس کی یہ درخواست لکھنؤ کی شریف زادیاں لوگوں میں بولتی ہیں + ۲ اشرف حقیر۔

[۲] زمیں پہ سر جھکانے سے مراد سجدۂ شکر کرنے سے ہے۔ الکنایۃ ابلغ من التصریح کے یہی معنی ہیں ایسا ہی کنایہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے جو چوتھے پانچویں مصرعوں میں کیسی مناسب بات کہہ کے کنایۃً بیان کیا ہے اس کو اہل علم ہی سمجھیں گے۔ اب کیا بیان کیجئے گا۔ اب کسی ایسی جگہ کا (تبرکات میں) ذکر کریں گے جو جناب رسول خدا صلعم سے زیادہ متعلق رہتی تھی ادھر ہی غرض شبیہ جسم حضرت صلعم سے ہات کہی گئی ہے۔ اس کا بیان حقیر مقدمے میں کر چکا ۔ ۲ اشرف حقیر

عرشِ علا پہ صلِّ علیٰ کی صدا گئی
خوشبو نبیؐ کی سب کے دماغوں میں آ گئی

(٦) تفسیرِ تاج

(٦) زینبؑ نے پھر نظارہ کیا رُوئے شاہ کا — دیکھا کہ سر جھکا ہے شہِ کم سپاہ کا
اک ہات میں ہے تاج رسالت پناہ کا — اک ہات میں نشان ہے شیرِ اِلٰہ کا
تجویز کر رہے ہیں۔ کسے یہ عطا کروں
منصب ہیں دو۔ عزیز بہت۔ عذر کیا کروں

ازبسکہ حضور صلعم بادشاہ دین و دنیا تھے۔ حضورؐ کی کلاہ کو مصنف نے تاج سے تعبیر کیا۔ اسی کی خوشبو آئی تھی۔ اس موقع پر میں کئی بند چھوڑ کر وہ رائے بیان کروں۔ جو جناب زینبؑ نے دی۔

لشکر کی افسری انہیں دونوں کو آج دو — عباسؑ کو علم۔ مرے اکبرؑ کو تاج دو
مشتاق اس کلام کے تھے شاہ اتقیا — بوسہ جبینِ اکبرِ گلفام کا لیا
اور مسکرا کے تاج نبیؐ سر پہ رکھ دیا — آنکھوں کے آگے پھر گئے [illegible]
سرتاجِ عرش روشنیٔ تاج ہو گئی
اکبرؑ کے سر سے تاج کو معراج ہو گئی

(٧) علم بخشی کی تقریر

(٧) علم جناب رسول خدا صلعم کس کو ملتا ہے۔ مختصر لفظوں میں اب یہ بھی سُنئے۔

یہ تہنیت سُنی جو سکینہؑ نے بار بار — عباسؑ کی ولا نے کیا اُس کو بے قرار
پردے سے مُنہ نکال کے بولی وہ گلعذار — بھیا ہوئے پھوپھی کی سفارش سے تاجدار
خاطر مری بھی۔ قبلۂ ابرار۔ کیجئے
بابا۔ مرے چچا کو۔ علمدار۔ کیجئے

تصویرِ واقعہ

ہمنس [illegible] شاہ نے اپنے فدائی کو — لبیک کی ندا دی۔ بہادر نے بھائی کو

دامن علم کا اُڑ کے چلا پیشوائی کو ٹھنڈی ہوا نے یاد دلایا ترائی کو
رایت تھا یا کہ قاصد ربِّ انام تھا
گویا علم کے شُقّے میں غازی کا نام تھا

اب ذرا بے مثل تشبیہات و تمثیلات کو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

کھنچا تھا یوں علم طرف بازوئے امام دل جس طرح سے شیعوں کا سوئے علی مدام
شکل نِہالِ بنا تھا نشانِ شہِ انام گویا پکارا چاہتا تھا لے کے اُن کا نام
عالم جو دیکھا دوشِ مبارک کی شان کا
بے ساختہ پھڑک گیا شانہ نشان کا

ابنِ علی کے بختِ رسا نے رسائی کی پائی علم کے پردے میں دولت خدائی کی
عزت بڑھائی بھائی نے جانباز بھائی کی دیکھی نشان دے کے جو شان اُس فدائی کی
نظروں سے دُور۔ اَوجِ شرف کے قریب تھا
پنجہ سپاہ پنجتنی کا۔ نصیب تھا[۲]

(۸) جب صبحِ عاشور حسبِ الحکم امام حسین جناب عباس ڈیرے سے علم لیکر نکلے ہیں اُس موقع پر مصنف کہتے ہیں

القصہ لے کے رایت شاہِ امم چلے جنّت کو سیدھی چوبِ علم کر کے خم چلے
اور ہات میں سپر پرہ اُٹھائے حرم چلے گودی میں بچّے لے کے بزیرِ علم چلے

[۱] امام حسین کا ہنس کر پکارنا اور پیارے بہادر بھائی کا لبیک (حاضر) کہنا کیسی محبت و تعات کی لطیف تصویر ہیں۔ اب مضمون آفرینی کو دیکھئے کہ ہوا کے سبب سے دامن جو علم کا اڑ کے آگے کو چلا۔ تو مصنف اس کو پیشوائی علمدار قرار دیتے ہیں یہ بطف تمثیل حسنِ تعلیل ہے پھر کہتے ہیں کہ اُس ہوا سرد نے ترائی کو یاد دلا دیا۔ ترائی متعلق حضرت عباس ہے یہ کیسی تعبیر کیا ہے۔ شقہ فرمان شاہی کے معنی پر بھی بولا جاتا ہے۔ شقہ علم بھی کہلاتا ہے۔ اس لئے یہ کیسا دلچسپ استعارہ ہے کہ گویا شقہ علم میں نام حضرت عباس علمدار کا مرقوم تھا۔ اور وہ رایت قاصد خدا تھا کہ علمدار کو بلانے آیا تھا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] پنجۂ نشان کا کیا چمک رہا تھا۔ گویا فوجِ پنجتنِ پاک کا نصیبہ چمک رہا تھا ۱۲ مؤلف حقیر۔

زینب گلے میں شانہ محبت سے ڈالتی ہیں
کس شان سے علم لئے عباسؑ جاتے ہیں

(بڑی بہن دعا دیتی ہیں)

(بڑی بہن دعا دیتی ہیں)

یارب نشان والے کا نام و نشاں رہے — یہ شمس بے زوال یہ گل بے خزاں رہے
لشکر رہے حسینؑ رہیں یہ نشاں رہے — اس حاملِ علم پہ علیؑ کی اماں رہے
روشن رہے قمر شہِ بدر و حنین کا
وہ خاک میں ملے جو ہو دشمن حسینؑ کا

سکینہ دخترِ امام حسینؑ کو حضرت عباسؑ سے انس و محبت ہے۔ کہ گود میں پلی ہیں۔ وہ اس موقع پر کیا کہتی ہیں

(شاہزادی سکینہ کی باتیں)

بڑھ کر سکینہ بولی ذرا منہ ادھر تو پھیراؤ — پیاسوں کو اس علم کی خوشی میں نہ بھول جاؤ
بابا تو کچھ خفا ہیں۔ تمہیں مجھ پہ رحم کھاؤ — اچھے مرے چچا ابھی دریا سے پانی لاؤ
ایسا نہ ہو کہ جا کے فراموش کیجئے
اپنے علم میں مشک مری باندھ لیجئے

(نکاتِ بلاغت)

اس بلاغتِ بیان کو دیکھئے۔ بچے جس طرح اپنے چاہنے والوں سے ناز کرتے ہیں۔ اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اللہ اللہ کیا شان دکھائی ہے۔ ذرا منہ ادھر پھیراؤ۔ اس اقتضائے مقام کی بلاغت پر نظر کیجئے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا کہ علم ملنے کی خوشی میں کہیں ہم پیاسے بچوں کو نہ بھول جانا۔ کیسی نازِ محبت کی باتیں ہیں۔ تین روز سے پیاسی ہیں۔ اس کا گلہ بھی کرتی ہیں تو کس طرح۔ کہ "بابا تو کچھ خفا ہیں تمہیں مجھ پہ رحم کھاؤ" اچھے مرے چچا کتنا پیارا ردیف ہے۔ بچے اپنے ناز بردار بزرگوں سے یہی کہا کرتے ہیں۔ اس سب پر طرہ یہ کہ "کہیں بھول نہ جانا" یاد رکھنے کے واسطے معمول ہے۔ کہ کوئی بند میں گرہ دے لیتا ہے۔ کوئی نشان کے طور پر کچھ چیز لے لیتا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ ع اپنے علم میں مشک مری

مجرہ ناظرین منصف انصاف سے دیکھئے کیا اس سے بہتر سلیس و فصیح نظم اور پر اثر کوئی دوسرا لا سکتا ہے [illegible] کا حصہ [illegible] میں گم اثر ہے۔ (بقول حقیر) [illegible] لفظ [illegible] ہو سکے۔ یہ لطف [illegible] بیان ہے ۱۲ مؤلف حقیر

[illegible] فرماتے ہیں کہ کوئی شخص یہی کام کو نثر میں بیان کرنا چاہے تو [illegible]
رہ سکتا ہے۔ یہ زبان پر قدرت ہے۔ اس کا نام بلاغت ہے۔ اس کو تفضل سے مل کے [illegible]
کہتے ہیں۔ ع ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ⁂

(۹) دو یتیم کم سن بچوں (پسران مسلم بن عقیل) کو حارث نامی قاتل قتل کرنے کو دریا سے فرات پر آبادی سے دور لاتا ہے۔ اس موقع کا مرقع دیکھئے:۔

صبح کا وقت ہے دریا سے دھواں اُٹھتا ہے ۔۔۔ دل سے بچوں کے ادھر شور فغاں اُٹھتا ہے
قبر سے شیر خدا ۔ نعرہ زناں اُٹھتا ہے ۔۔۔ آسماں گرتا ہے مسلم کا نشاں اُٹھتا ہے
طوق کا نیل ابھی گردن پہ ابھی باقی* ہے
اور گلے ملنے کی تلوار کو مشتاقی ہے

یاس سے بھائی کا منہ دیکھ رہا ہے بھائی ۔۔۔ کوئی کو سوں نظر آتا نہیں۔ جز تنہائی
دل آگاہ یہ کہتا ہے کہ اب موت آئی ۔۔۔ خوف سے بند ہے آواز۔ دم گویائی
عذر سنتا ہے۔ نہ منت نہ قسم مانتا ہے
قتل بچوں کا ثواب اہل ستم جانتا ہے

(۱۰) لشکر ابن زیاد کی بدحواسی کی تصویر۔

(۱) ترکش میں عدو ڈھونڈتے تھے نیزے کو ہر بار ۔۔۔ زہ کرتے تھے نیزوں کو کمانوں میں کماندار
مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار ۔۔۔ تیغوں کی جگہ ڈھالوں کا کرتے تھے کبھی وار
اک نہر زرہ پوشوں کے خون کی جو بہی تھی

---

* لشکر یزید پلید سے ابن زیاد نے ان بچوں کو قید کر دیا تھا۔ مگر مشکور نامی داروغہ محبس (جیل) نے رحم کھا کر انہیں [illegible]
ابن زیاد نے اشتہار دیا تھا کہ جو کوئی ان بچوں کو گرفتار کر کے لائیگا اسکو دو ہزار درہم دونگا [illegible] مسلم
تلاش [illegible] قاتل [illegible] فرات [illegible]
[illegible] انعام دیگا ۔ مؤلف حقیر

موجوں کی طرح آپ زرہ کا تپ رہی تھی

(۲) ایک دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

گھبرا کے تاسعد جو عدد کرتے تھے سن میں
انگشت کی جا تیروں کو رکھتے تھے دہن میں

(۳) تیسرے مرثیہ میں آمد حضرت عباسؑ کے وقت جو بدحواسی لشکر یزید پر چھائی ہوئی ہے۔ اُس کو بیان کرتے ہیں:۔

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کی فکر میں بے پیر
ترکش میں رکھیں تیغیں نیاموں میں رکھے تیر
جی کڑے کیے جو ٹھہرے بھی دم دار دم گیر
قبضہ کے عوض ہات میں پکڑا سرِ شمشیر
تیروں کے بدل ہات فقط جوڑ رہے تھے
ہاتوں سے کماندار کماں چھوڑ رہے تھے

(۴) چوتھے مرثیہ میں کہتے ہیں:۔

خود رفتہ تھا ہر تیر یہ رفتار نئی تھی
انگڑائی کا لینا بھی کماں بھول گئی تھی

(۱۱) دریائے فرات کو فوج یزید گھیرے ہوئے ہے۔ اُس کی نسبت کہتے ہیں:۔

چاروں طرف تھا بسکہ ہجوم سپاہِ شام
گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام
بالکل اُلٹ دئے تھے حبابوں نے اپنے جام
دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
مُنہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

(۱۲) صبح عاشورہ عمر بن سعد سردار لشکر یزید جاسوسوں سے امام حسینؑ کے خیموں کا حال پُوچھ رہا ہے۔ جو حالات وہ پُوچھتا ہے وہ سب ضروری ہیں۔ مَیں نے اُن پر نمبر ڈال دئے ہیں:۔

جاسوسوں کو قریب بُلا کر کہی یہ بات
لو تم بھی اب کہو خبرِ شاہِ نیک ذات
بن پانی کس طرح سے کٹی یہ تمام رات
شب کیا تھی واردات اور اب کیا ہے واردات
نامہ تو کوئی اہلِ وطن کو لکھا نہیں

بہرِ کمک۔ طلب تو کسی کو کیا نہیں

کس کس کو شہ نے اسلحہ بخشا ہے کچھ سُنا
شمشیر حیدری ہتوئی کس شیر کو عطا
پچھلے کو خیمہ گاہ میں کیوں حشر تھا بپا
ہم کو تو دیتے ہو مگے شبیرؑ بد دعا

مشتاق اجل ہے۔ کہ شوق جہاد* ہے
جاسوس نے کہا کہ فقط حق کی یاد ہے

ہر سجدے میں شفاعت امت کی ہے دعا
کیسی مدد حسینؑ کو ہے احتیاج کیا
اکبرؑ سے شاہ کہتے تھے بیٹا وطن کو جا
تنہائی کی اجل میں ہے پیارے بڑا مزا

کب اسلحہ کسی کو دیا ہے حسینؑ نے
تقسیم سب کو صبر کیا ہے حسینؑ نے

پچھلے پہر کے رونیکا مضموں ہے دردناک
شبیرؑ نے سکینہ کا کُرتہ کیا تھا چاک
مُنہ پر ملی تھی اُس کے یتیموں کی طرح خاک
روتے تھے سب کہ صلح نہ ٹھہری امامؑ پاک

سمجھاتے تھے حسینؑ کہ کل صلح ہوئیگی
لیکن وہ صلح ہوگی کہ سب خلق روئیگی

حضرتؑ نے بیکسی سے کہا جب کہ یہ سخن
مل کر گلے سے بھائی کے رونے لگی بہن
پہنائے اپنے بیٹوں کو چھوٹے سے دو کفن
مادر ہوئی جوانیٔ اکبرؑ پہ نعرہ زن

غش آیا۔ تین بار شہ بے نظیر کو
بانوؑ سے بخشوایا جو اکبرؑ نے شیر کو

(۱۳) فوج یزید کی طیاری کی مختصر تصویر۔

* اُوپر کے دس سوالوں کا جواب مجمل گویا ایک مصرع میں دے دیا ہے ع جاسوس نے کہا کہ فقط حق کی یاد ہے۔ اب بعد اجمال کے تفصیل وار ہر بات کا جواب جاسوس دیتا ہے اس میں جس کنایہ اشاروں کو دیکھنا چاہئیے جو نشتر و خنجر کا کام (مجلس ماتم میں) دیتے ہیں۔ اور مرثیہ کی علت غائی اور جان ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

دس سوالوں کا جواب ایک مصرع میں

(۱۳) فوج یزید کی طیاری کی تصویر

لشکریان امام حسینؑ کا رن پر چڑھنا

ناگاہ۔ اُقتلوا[1]۔ کی صدا تا فلک گئی — آواز طبل جنگ کی عیوق[2] تک گئی
چلّے[3] کھچے۔ کمانِ کیانی کڑک گئی — ہر سمت مغربی[4] و جنوبی[5] چمک گئی
رن کے ورق پہ جنگ کے آئین کھنچ گئے
ہندی شرونیاں[6]۔ عربی زین۔ کھنچ گئے[7]

اللہ اللہ[8] کے پھیلے رن میں بگولے نشانوں کے — ٹاپوں[9] کے غل سے کان کھلے آسمانوں کے
شکلِ زبانِ مار[10]۔ ہے پھل سنانوں کے — جھومے وغا کے نشہ میں سر[11] نوجوانوں کے
مستوں سے مثل شیشہ وہاں قہقہے کئے
طوبے کے عندلیبوں نے یاں چہچہے کئے (یعنی لشکر امام حسینؑ نے)

امام حسینؑ اور اُنکے جاں نثار عزیز اور انصار سوار ہوتے ہیں سارے واقعہ کی مختصر مگر لاجواب تصویر دیکھئے:۔

فرما کے یا علیؑ شہ صفدر ہوئے سوار[2] — ہٹ کر عقاب پہ علی اکبرؑ ہوئے سوار
عباسؑ لے کے رایت حیدر ہوئے سوار — بتیس[32] شہسوار برابر ہوئے سوار

سلہ اقتلوا کے معنی ہیں لشکر والو قتل کرو۔ عیوق ایک ستارہ کا نام ہے جو مشہور ہے کہ اس میں بہت عیب ہے۔ ملا محتشم فرماتے ہیں "زال تشنگان ہنوز بعیوق میرسد آواز العطش زبیابان کربلا"۔ اس شعر مرثیہ ملا محتشم کے سبب سے عیوق ستارہ بہت مشہور ہو چکا تھا اس لئے مرزا صاحب نے بھی عیوق نظم کیا۔ مغربی و جنوبی تلواروں کی مشہور قسمیں ہیں یعنی مغرب جنوب کی بنی ہوئی۔ اور ہندی سرو ہی اسقدر عرب میں مشہور تھی کہ وہاں تلوار کو مہند کہتے تھے۔ نشانوں کے بگولے پھیلنا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے آسمانوں کے کانوں کا کھلنا اور سانپ کی زبان کی طرح برچھیوں کے پھلوں کا ہلنا اور لڑائی کے نشہ میں نوجوانوں کے سروں کا جھومنا عجب مضامین و واقعات ہیں۔ اتنی باتیں دوسرا شاعر اگر ایک جگہ جمع بھی کہہ دیگا تو اتنے مختصر الفاظ میں غالباً جمع نہ کر سکے ٹیپ میں لشکر امام حسینؑ کا ذکر چھیڑ دیا ۱۲ مؤلف

سلہ عام اہل اسلام لڑائی کیواسطے جب سوار ہوتے ہیں تو یا علیؑ کہتے ہیں پہلا امام حسینؑ کو مصنف نے بنام قسم میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جنگ کا نام بھی مصنف نے پہلے امام حسینؑ کا سوار ہونا بیان کیا۔ اسکے بعد شبیہ رسول خدا علی اکبرؑ کا سوار ہونا کہ جنکی نسبت مسلمانوں میں مشہور ہے کہ فوج خدا کا سپہ سالار امام حسینؑ نے انکو مقرر فرمایا تھا۔ علی اکبرؑ کی شان سواری کو دیکھئے کہ اپنے والد ماجد کے پیچھے ہٹ کر سوار ہوئے شہسوار کا قاعدہ ہے کہ ذرا پیچھے سرک کر سوار ہوتے ہیں۔ اسکے بعد علمدار علم لیکر سوار ہوئے اور ساتھ ہی (اُن کے) تمام شہسوار انصار جو شمار میں ۳۲ تھے سوار ہو گئے۔ اب سواروں کے بعد پیدلوں کو بھی بتا دیا کہ چالیس پیادے تھے۔ ہمتیں انکی دیکھئے کہ ہزاروں یا لاکھوں سے لڑنیکو سرکف جا رہے ہیں۔ اس مختصر نظم کو اور اس ترتیب و تہذیب فوج کو اور اس شان و شوکت نظم کو دیکھئے ۱۲ مؤلف حقیر

چالیس پیدل آگے جلو میں بہم چلے
یہ فوج لے کے لڑنے کو شاہِ امم چلے

امام حسینؑ اور اُن کے بہتّر ساتھی ہتیلی پر جان لئے ہوئے لڑتے مرنے کو جا رہے ہیں۔ بھلا ان سے مقابلہ کرنے کی کس کو تاب ہے۔ ان کی شجاعت میں جس قدر مبالغہ کیا جائے کم ہے۔ یہ حسنِ اعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ جاں بازی اور سرفروشی کی شان ہے۔ اُس شانِ ہیبت و دبدبہ کو مصنف یوں دکھاتے ہیں:۔ شانِ شجاعت دبدبہ

باگیں حسینیوں نے اُٹھائیں جو ناگہاں　　دستِ فلک سے چھُٹ گئی جوزا کی بھی عناں
اللہ رے دبدبہ کہ دبا اوجِ آسماں　　اللہ رے طنطنہ کہ تنا پھر نہ اک جواں
آئینہ ہو کے شرع کا آئین رہ گیا
رستوں سے کفر بھاگ گیا دین رہ گیا*

(۱۴) علی اکبرؑ ہم شکل محمد مصطفےٰ صلعم لڑنے اور مرنے کو میدان میں آئے ہیں مرگِ شباب اور حسن کا اثر دشمنوں کے دلوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس مضمون کو مرزا صاحب کہتے ہیں:۔ (۱۴) علی اکبرؑ کی مرگِ شباب و حسن کا اثر دشمنوں کے دلوں پر

رن میں عقاب کو جو اُڑاتے ہوئے یہ آئے　　اکبرؑ کے قصدِ مرگ پہ دشمن بھی تھرتھرائے
تیغیں چمک دیں ہاتھوں کو مل کر کہا کہ ہائے　　سچ ہے متابعت میں کوئی دین کیا بچائے

* دبدبہ۔ دبا۔ طنطنہ۔ تنا۔ ان الفاظ کی مناسبت کی داد صرف اہلِ زبان یا خوش مذاق زباندان دے سکتے ہیں۔ کمالِ شجاعت کی مدح یہ ہے کہ ان بہتّر شہیدوں کی بدولت دینِ اسلام کی حقانیت آئینہ ہو گئی۔ کفر رستوں سے بھاگ گیا دین قائم رہ گیا۔ ورنہ یزید کو لوگ خلیفہ مان چکے تھے۔ اسلام مٹ جاتا۔ اس مضمون کو اکثر شعرا نے خوب خوب پیرایوں میں ادا فرمایا ہے چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ فرماتے ہیں:۔ (رباعی) شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ۔ دین ہست حسینؑ دین پناہ ہست حسینؑ۔ سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ۔ جناب میر انیس مرحوم نے بھی خوب فرمایا ہے:۔ تباہی میں سفینہ آچکا تھا امت جد کا۔ یہ کشتی بحرِ خوں میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے۔ اس مضمون کے قدردان یہ ایک بے بضاعت نے بھی کہنا چاہا ہے۔ تین آفتابوں کو چراغ دکھانا ہے۔ (یعنی حقیر نے شہدائے کربلا کی مدح میں ایک مرثیہ میں کہا ہے) سے باغ دیں بہار کر دیا ریتی کو دین کی سینچا ہے اپنے خون سے کھیتی کو دین کی +۲۰ مؤلف حقیر۔

ایسے جوان مرتے ہیں عقبےٰ کے واسطے
ہم ان کا خون کرتے ہیں دُنیا کے واسطے*

اولاد والے اپنے کلیجوں کو تھام کر رو کر پکارے الحذر اے موت الحذر
کس نا امید باپ کا لائی ہے تو پسر کس بے نصیب ماں کا شکستہ کیا جگر
جاہ و جلال ہیں نبیؐ ذوالجلال کے
لائی ہے موت کس کا کلیجہ نکال کے*

(۱۵) علی اصغرؑ دودھ پینے ہوئے چھ ماہ کے بچے پیاس کے سبب سے جھولے میں بیہوش ہیں اُن کی ماں جھولے کے پاس بیٹھی بَین کر رہی ہیں:۔

مَیں کہتی تھی نجف میں انہیں لیکے جاؤنگی شاہ نجف کا ان کو مجاور بناؤنگی
اُنگلی پکڑ کے گرد لحد کے پھراؤنگی ہے ہے انہیں کو قبر میں اب مَیں سلاؤنگی
منت کے طوق بڑھ چکے۔ پروان چڑھ چکے
یٰسین کا وقت آگیا۔ قرآن پڑھ چکے

اب کس کی بامراد بڑھاؤنگی ہنسلیاں ہے ہے کرخت ہوگئیں یہ نرم انگلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پُتلیاں لے لے کے اُلٹے سانس گراتے ہیں بجلیاں
باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
منہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

شریف عورتوں کی زبان اور خیالات۔ اور ننھے بچوں کی عادتیں۔

* دیکھئے۔ یہ بیت ذو قافیتین ہے۔ ایک قافیہ مرتے ہیں کرتے ہیں۔ دُوسرا دُنیا و عقبےٰ ہے۔ مگر کس سلاست و فصاحت سے کہا ہے۔ کہ جبتک غور نہ کرو نہیں معلوم ہوتا۔ لشکر والوں کی گفتگو دلوں پر خنجر و نشتر کا کام دیتی ہے۔ اور دُنیا طلبی کی مذمت کس پیرایہ میں کی ہے کہ ہم انکا خون کرتے ہیں دُنیا کیواسطے ورنہ کلمہ گو ہمشکل محمدؐ مصطفےٰ کو کیوں شہید کرتے۔ اخیر کا مصرع کس غضب کا کہا ہے۔ ع لائی ہے موت کس کا کلیجہ نکال کے۔ یہ باتیں دُوسروں کو نصیب نہیں ہیں + ۱۲ مولف حقیر۔

رونا نہ جانتے تھے سدا مسکراتے تھے
پھیلا کے ہات گود میں سب کی یہ آتے تھے
خاطر سے میری جھولے میں بس لیٹ جاتے تھے
جاتی تھی میں جدھر یہ ادھر منہ پھراتے تھے

کس کی نظر لگی۔ کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاؤ پیار اب نہ رہا۔ آنکھ پھر گئی

بہن کی بھائی سے محبت کی باتیں جن سے بچپن کی عادتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے
ہاتوں میں لیکے ان کے کھلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سناتی ہے
من جاؤ۔ بھائی جان۔ سکینہ مناتی ہے

کڑھتی میں آہا۔ آنکھیں تم کھولتے نہیں
اللہ۔ ہم پکارتے ہیں۔ بولتے نہیں

علی اصغرؑ کے جھولے کے گرد گریہ و زاری میں ننھا بیمار ٹھنڈی ہوائی میں اس کی تصویر بے مثل کھینچی ہے۔

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم
سہلا رہے ہیں بیٹھے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیئے پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم
پھیلائی ہے ہات کے کبھی دیکھتے ہیں دم

قرآن کی ہوا۔ کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بالو کو دیکھتے ہیں۔ تو منہ پھیر لیتے ہیں

گھر میں تو یہ تشویش پھیلی ہوئی ہے اب باہر سے امام حسینؑ تشریف لاتے ہیں مگر کس شان سے وہ مصرع تحت میں ملاحظہ فرمائیے:۔

منہ پر جوان بیٹے کا تازہ لہو لگائے
ماتم سرا میں گنج شہیداں سے شاہ آئے
جھولے پہ ہات پکڑے ہوئے اہلبیت لائے
نبیؐ کے ہات پاؤں ملا کر انہیں دکھائے

رو کر کہا کہ سانس فقط آشکار ہے
سو اس کا کیا حساب کہ دم کا شمار ہے

*۔ یہ خاص بچوں اور عورتوں کے الفاظ ہیں۔

(تصویر)

(امام حسینؑ جھولے کے سرہانے بیٹھے ہیں۔ اور کچھ لب اعجاز نما سے فرماتے ہیں)۔

بیٹھے سرہانے جھولے کے شبیرؑ سر جھکائے — اصغرؑ کے کان سے لب معجز نما ملائے
چپکے سے کچھ کہا کہ وہ سنتے ہی مسکرائے — سوئے حسینؑ ہات بھی بیساختہ بڑھائے
بولی بہن۔ نصیب نے اب تو بھلائی کی
اماں۔ مبارک آنکھ کھلی میرے بھائی کی (چھوٹے بچوں سے چھپایا نہیں جاتا)

امام حسینؑ علی اصغرؑ کو لئے جاتے ہیں۔ اس کی بے مثل مختصر لفظوں میں تصویر۔

ہاتوں پہ لے چلے جو اُسے شاہِ اتقیا — بانو پکاری۔ لونڈی کو صاحب بھلا لیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا — بولی خدا نے سب کی دعا سے کرم کیا
لب پر تبسم۔ آنکھوں شہ کے نظارے ہیں
ہم۔ تم کوئی نہیں۔ انہیں بابا ہی پیارے ہیں

(ماں کی مامتہ اور وہم)

ماں کی مامتہ پہ خیال کیجئے۔ امام حسینؑ بچہ کو پانی پلانے کی غرض و خیال موہوم سے دشمنوں میں لئے جاتے ہیں۔ ماں کو وہم آتے ہیں۔ انکار کر نہیں سکتی ہیں کہتی ہیں:۔

دیکھوں پھر آج گود میں کب تم کو لیتی ہوں — اللہ و پنجتن کی ضمانت میں دیتی ہوں

عورتوں کی عادت ہے۔ کہ جب یہ فقرہ کہتی ہیں۔ کہ خدا و رسول یا اللہ و پنجتن کی ضمانت میں دیتی ہوں تو اپنے بچوں سے کہتی ہیں۔ کہ کہو قبول کیا۔ علی اصغرؑ بات نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس نازک خیال کو دیکھئے۔ کس طرح (مصنف) ادا کرتے ہیں:۔

کس دھوپ میں سدھارتے ہو آ علیؑ کے پھول — سر پر خدا کا سایہ ہو۔ اور پشت پہ رسولؐ
اور دستے بانہیں پیار کے ہوں حیدرؑ و بتولؑ — واری گئی۔ اشارے سے کہہ دو کیا قبول
کھیلے نہ ہم سنوں سے نہ تم گھٹنیوں چلے
میں ہات مل کے رہ گئی۔ دنیا سے یوں چلے

۱۔ دشمنوں میں بچہ جاتا ہے دلمیں ... ۱۲ مؤلف جعفر

زینت بیٹی حسینؑ

اصغرؑ کو لے چلے جو شہنشاہ بحر و بر مڑ مڑ کے اس نے گنبد حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہات ماتھے پہ رکھا جھکا کے سر بانو پکاریں پھیر کے منہ کو ادھر ادھر

لوگو۔ مرا کلیجہ نکلتا ہے تھام لو
اصغرؑ سدھارتے ہیں سفر کو سلام لو ✱

علی اصغرؑ کی شہادت کی تصویر ایک بند میں

(۱۶) ذیل کے بند میں علی اصغرؑ کی شہادت کی افسوسناک تصویر مصنف نے کھینچی ہے۔ اس سے بہتر تصویر واقعہ غم اس بے بضاعت کی نظر سے نہیں گذری۔ یہ اصل واقعہ بہت مشہور ہے۔ کہ اس بچہ کو ایک دشمن نے امام حسینؑ کے ہاتھوں پہ تیر مارا تھا:۔

تصویر غم

دم توڑا عجب شان سے ہاتوں پہ پدر کے اک ہات پہ گردن ڈھلی اور رہ گئے مر کے
اک ہات پہ سمٹے ہوئے تھے پاؤں پسر کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے شہ دیں کے جگر کے

اس تیر کی آواز سے ڈر کر جو موئے تھے
بابا سے گلے ملنے کو ہاتھ اٹھے ہوئے تھے

✱ یہ مرثیہ "بانو کے شیر خوار کو ہمت سے پیاس ہے" جلد ۳ دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ اس میں سے چند بند میں نے موقع پر انتخاب کئے ہیں ورنہ تمام مرثیہ بلیغ و فصیح و عام فہم ہے۔ حیات دبیر کی دوسری جلد میں اکثر مسدس کے میں نے پیش کئے ہیں۔ یہ مرثیہ محمد علی شاہ مرحوم شاہ سوم اودھ کی زمانہ سلطنت کی تصنیف ہے کہ جس زمانہ تک جناب میر انیس مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں نہ آئے تھے نہ ان کے کلام کی لکھنؤ میں شہرت تھی پس مولوی شبلی صاحب کا موازنہ میں لکھنا کہ مرزا صاحب میر صاحب کی تقلید بھی کرتے تھے کس قدر خلاف واقع افسوس کے قابل ہے اس مرثیہ کا وہی رنگ ہے جس رنگ میں میر صاحب نے اکثر مرثیے کہے شہرت پائی اس کے مقطع سے بھی زمانہ کا پتہ چلتا ہے چنانچہ دبیر عکس کوئی لو کوئی ... آسمان دل ... صاف ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت میر صاحب بگانہ تھا اور ان کے تمام تلامذہ ... ہوتے تھے یہ زمانہ میر انیس صاحب کے لکھنؤ میں آنے سے کچھ پہلے کا ہے صفحہ ۲۷۹ پر موازنہ میں مولوی شبلی صاحب نے بھی اس مرثیہ کے چند بند انتخاب کئے منقول فرمایا ہے کہ جناب حضرت علی اصغرؑ کا تمام واقعہ کربلا میں نازک، عجیب و غریب ہے اور یہ بھی ... ہے کہ مرزا صاحب نے اس حال کو تمام مرثیہ گویوں اور میر صاحب سے بہتر نظم کیا ہے مگر ... کمال مرزا صاحب کے منکر ہیں ... اس کو ایک الفاظ ... داخل مستثنیات کرتے ہیں۔ یہ خیال نہیں فرماتے کہ جو شاعر ایسے نازک عجیب و غریب حال کو سب سے بہتر نظم کرے گا وہ غریب حالات کو اوروں سے بہتر کیوں نہیں کہہ سکتا ۱۲ مؤلف۔

(۱۷) حضرت عباسؑ علمدار سے ایک پہلوان کی لڑائی منظم کی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

(۱۷) حضرت عباسؑ کی تلوار کے وار

جُگ کی سپر کے مقابل ہوا دشمن بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ یہ بازو یہ کمر اور یہ گردن یہ خود یہ چار آئینہ یہ ڈھال یہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا تلوار کہاں تھی
آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی[۱]

(۱۸) عون و محمدؑ امام حسینؑ کے بھانجوں کی بہادرانہ موت کی تصویر۔

بہادروں کی موت

یہ سُن کے مطمئن ہوئے وہ غازی و غنی منکا ڈھلا نہ اشک بہا وقت جاں کنی
لوکاں کی مُڑی نہ پھری منہ پہ مردنی پتھرا نا کیسا آنکھ میں ڈونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے
رگ رگ سے دم نکلتا تھا او مسکراتے تھے[۲]

عام لوگوں کی موت کی طرح بہادروں کی موت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ شجاع کی شجاعت اُس وقت بھی نظر آتی ہے۔ اس بند میں چھ چیزیں ایسی بیان کی ہیں جن میں شجاعت کی شان نظر آتی ہے۔ یہی وہ کمالات ہیں جن کو عام لوگ دیکھتے ہیں۔ مگر بیان نہیں کر سکتے۔ قدرتی شاعر ہی بیان کر سکتا ہے +

(۱۹) جناب قاسم کے تلوار لگانے کی شان

(۱۹) جناب قاسم ابن حسنؑ کے تلوار لگانے کی تصویر۔

---

[۱] یہ بند اس مشہور مرثیہ میں ہے ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے :: دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔ نولکشور صاحب کی مطبوعہ جلد میں بھی چھپا ہے مگر وہ بہت غلط اور بہت سے بند کسی اور شاعر کے کہے ہوئے اُس میں ملا دئے ہیں۔ آٹھ مصرعے تک ایک کس صفائی سے نظم کئے ہیں کہ جس صفائی سے تلوار چلتی ہے جو لوگ جوہر جانتے ہیں اُن کے دل سے پوچھئے۔ وہ داد دے سکتے ہیں۔ پھر سب میں تلوار کی صفائی کس بلاغت سے بیان فرمائی ہے کہ ع آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] یہ بند اس مرثیہ مشہور میں ہے جو دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے اور جس کا مطلع مشہور یہ ہے ع پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی ۱۲ مؤلف

گر وار کر کے بیٹھ گیا کوئی نابکار | قاسم نے واں کیا ہنرِ جنگ آشکار
گھٹنوں کے بل زمیں پہ پھسلا کے راہوار | اور تول کر حسام شرر ریز و آبدار
ضربت لگائی آپ نے یوں اُس لعین پر
اک پاؤں تھا رکاب میں اور ایک زین پر

(۲۰) امام حسینؑ نے بے تاب ہو کر علمدار بھائی عباسؑ کو جس شان سے پایا اُس کی تصویر

ناگاہ ملا لاشۂ ابن شہ مرداں | اک دست بریدہ میں علم خاک پہ غلطاں
اُڑ اُڑ کے پھریرا رخ پرخوں پہ مگس راں | اک ہاتھ کٹے تیغے میں حسام شرر افشاں
ہر چار طرف زخموں سے فوارے بہے ہیں
گویا کہ مصلے پہ علیؑ لوٹ رہے ہیں[۱]

سر گرز سے دو ٹکڑے جبیں خوں سے بھری ہے | منہ مشک پہ ہے مشک کلیجے پہ دھری ہے
ہر سمت سے جز یاد خدا بے خبری ہے | دم سینے میں رکتا ہے پریشاں سفری ہے
لو حق سے لگی ہے جو عدم کے سفری کی
آنکھوں پہ اُداسی ہے چراغ سحری کی

(۲۱) عمر ابن سعد نے شمر کو دو علم اور کشتیوں میں میوے اور سرد پانی دے کر بھیجا ہے۔ کہ عونؑ و محمدؑ پسران جناب زینبؑ کو بہکا کر اور یہ لالچ دے کر کہ تم کو امام حسینؑ نے تو علم نہ دیا ہم علمدار کرتے ہیں لے آئے۔

آگے گمان بد تو آپہنچے یہ بد گماں | تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیاں
رہ عشق کی ہر قدم تھی نہ بھٹک یہاں وہاں | آیا وہاں کھڑے تھے یہ دونوں خضر جہاں[۲]

[۱] یہ بند اس تیرے بند جو دفتر ماتم کی جلد اول میں نہیں ہے جس کا مطلع ہے۔ ... دی کون تا اثر فصیح ہے ۱۲ مؤلف

[۲] اس مصرع پر خضر کہا ... اس لئے کہ شمر بہکا سکتا ہے وہ گویا رہزن ... کہ خود بھٹک ... یہاں یا شبیہ انکو خضر دی ہے کہ خضر راہ بہت بتلانے میں ... بلاغت کی جان ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

دونوں کی آنکھ شمر پہ جو یک بیک پڑی
نخوت پسینہ بن کے جبیں سے ٹپک پڑی

شمر کی ... کی تصویر اور تعاپلوسی کی چالیں۔

شمر کی مکاری و خوشامد

تم ہو کے نیم قد یہ کیا شمر نے کلام ✲ | اے وارثان حیدرؑ و جعفرؑ مراسلام
یہ آن بان۔ مان گئے رستمانِ شام | واللہ واہ تم پہ ہے جرأت کا اختتام

یہ بانکپن نظر میں کھبا۔ جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

جب عونؑ و محمدؑ نے شمر کی باتیں سُنیں۔ اور اُس کو جواب شافی دے دیا۔ تو اب وہ ناکام جاتا ہے۔ ادھر خیمہ عصمت میں اس واقعہ کی خبر ہوگئی۔ ان کی والدہ جناب زینبؑ نے بھی سُنا۔ کہ شمر سے جو امام حسینؑ کا جانی دشمن ہے بات چیت ہوئی۔ وہ غصّہ میں بھری ہوئی بیٹھی ہیں۔ فضہ کنیز جناب فاطمہؑ نے ان بچوں کو آواز دے کر خیمہ میں بُلایا ہے اُس موقع پر کہتے ہیں:۔

تصویر

شیروں سے ڈر کے بھاگ گیا شمر بدخصال | جس طرح چوٹ کھا کے بھرے چوکڑی غزال
راہی حرم سرا کو ہوئے یہ ملک خصال | کچھ غصہ کچھ حجاب کچھ افسوس کچھ ملال

چلنے میں ہر قدم سو قدم آگے بڑھی ہوئی
منہ اُترا اُترا غصہ سے تیوری چڑھی ہوئی

(۲۲)
میدان میں جناب عباسؑ آتے ہیں نقیب نور آواز دے رہا ہے

(۲۲) میدان جنگ میں حضرت عباسؑ آتے ہیں۔ نقیب نور آواز دے رہا ہے۔

✲ شمر نے جس جس طرح لالچ دئے ہیں۔ اور ان بچوں کو بہکایا ہے اور انہوں نے دندان شکن جواب دئے ہیں۔ وہ تمام تقریر لاجواب ہے۔ اگر دیکھنا منظور ہے۔ تو اس کتاب کی جلد دوم میں دیکھئے۔ یہ بھی اُسی مرثیہ کے بند ہیں۔ جو جلد اول دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ اور جس کا مطلع یہ ہے ع جب ہاتھ اُس علم کا شعاع آفتاب کی۔ وارثان حیدرؑ و جعفرؑ اس لئے کہا۔ کہ سیدہ بزرگوار ان صاحبزادوں کے نانا اور جعفر طیار دادا ہیں۔ یہ دونوں بزرگوار جناب رسول خدا کے علمدار تھے ✚ ۱۲ مؤلف حفیر

مرکب جو بڑھا فخرِ شجاعانِ زمن کا ۔۔۔ ڈنکا ہوا [illegible] تھا ستم و ظلم کا ٹھنکا
چاؤش قمر دوڑا عصا لیکے کرن کا ۔۔۔ میدانی نوبت نے میدان لیا رن کا

کرنا کا یہ دبا واہ رے شان وکر است
اقبال بلند۔ اوج دوچند۔ آپکا امت*

(۲۳) زعفر جن سے چند جن جو حال امام حسینؑ دیکھ آئے تھے وہ بیان کرتے ہیں:-

جس وقت زیارت سے مشرف ہوئے ہم ہائے ۔۔۔ ننھی سی ایک گود میں تھے شاہِ امم ہائے
اک رشکِ قمر توڑتا تھا گود میں دم ہائے ۔۔۔ دودھ اور لہو ڈالتا تھا ہائے ستم ہائے

اب شہ سے کلیجے کو سنبھالا نہیں جاتا
تیر اُس کے گلے میں ہے نکالا نہیں جاتا

(۲۴) میدان کربلا میں لاشہ امام حسینؑ کو شانِ [illegible] تصویر

اصغر کی ننھی لاش کو مولا گلے لگائے ۔۔۔ [illegible]
سوتے تھے قتل گاہ میں فرش سر پہ ہائے ۔۔۔ اور تیر دو پہلو تیز آقا رہے کٹائے

تھا فرشِ ریگِ گرم امامِ جلیل کا
دامن نہ فاطمہؑ کا نہ پرِ جبرئیل کا

علی اصغرؑ کی لاش کی تصویر

سر کے جھنڈولے بالوں پہ گو خاک ہے جمی ۔۔۔ [illegible] سو نہیں کمی
ہے مثلِ زلف پلکوں کے بالوں کی برہمی ۔۔۔ بہتے ہیں دو لوں پتلیاں لپٹا کے ماتمی

* چاؤش اور میدانی یہ نا ہی الفاظ ہیں میدانی وہ نوبت ہے جو میدانِ جنگ میں بجا کرتی ہے [illegible] کہتے ہیں مرزا صاحب کے بزرگ شاہانِ دلی کے تابع و متوسل رہے تھے [illegible] لکھنؤ شاہی تک جب گئے تھے [illegible]
وہی الفاظ لائے ہیں مگر [illegible] جنگ میں [illegible] فرماتے ہیں
ستم کا ماتھا ٹھنکا ڈھنکا ہو گیا ساتھا ٹھنکنا خاص محاورہ ہے کسی کا ہمیں ظلم کے زیر [illegible] ستم و ظلم ایسا کا کچھ

زعفر جن کا حالِ امام حسین بیان کرتے ہیں

(۲۴) لاشہ امام حسینؑ اور میدانِ [illegible]

بیدا ہے نور چہرے کا گرد و غبار سے
لکھا ہے سورۂ نور کا خطِ غبار سے×

(۲۵) جنابِ شہربانو کی [illegible] بےخودی کا سماں ۔

جنابِ شہربانو کی تشویش و غم کا عالم

اندوہ میں کچھ [illegible] بہت [illegible] کہنا | کہہ دینا جواب آپ ہی کہہ سکتے ہیں بہنا
وہ یاس کا رونا وہ [illegible] کا ہنسنا | وال [illegible] کا رکنا اور ادھر اشکوں کا بہنا
پوچھے جو کسی [illegible] ہے کھانا
[illegible] شوار ہے کھانا

(۲۶) [illegible] فرزند کا داغ

رفتِ فرزند کا داغ

وہ درد ہے [illegible] | [illegible] یاں نہیں کھلنا
کس زخم کا مرہم [illegible] | کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا
[illegible] ہر ایک بشر ہے
[illegible] داغ بسر ہے
جس دل کی شکستن [illegible] | وہ درد ہے کیا؟ رحلتِ فرزند جگر بند
جب دست و گریباں [illegible] | وہ چاک یہی چاک ہے جس کا نہیں پیوند
سچ پوچھو تو فرزند کا [illegible] پدر کا
[illegible] لختِ جگر کا
یہ حالِ سکندر ہے [illegible] | فرزند نہ تھا اور ہر ایک شے تھی مہیا
جاہ و حشم و مال و زر [illegible] | کہتا تھا [illegible] حسرت و دردا

× خطِ غبار [illegible] ایک قسم [illegible] میں لکھے جاتے ہیں جو [illegible] ہمارے سامنے [illegible] کے چاروں مصرعوں کو غور سے دیکھئے [illegible] مقصد میں [illegible] صفائی [illegible] خوب [illegible] ۔

(۲۹) بیکسی وتنہائی میں امام حسینؑ کے حواس کا درست رہنا۔

نازاں تھا صبر۔ صبر شہ حق شناس پر — قربان تھا ہوش ابن علیؑ کے حواس پر
دریا کا زہرہ آب تھا سیّد کی پیاس پر — مایوسی آس پاس تھی مرنے کی آس پر
ماں سن میں اور خیمے میں ماں جائی روتی تھی
تنہائی پر حسینؑ کی تنہائی روتی تھی

(۳۰) شاہزادہ علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد گھر کی حالت اور مادر علی اکبرؑ کی غم کی تصویر

وہ شمع گُل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا — نبیؐ کی آل کا گھر صبح و شام روشن تھا
دلِ حسین علیہ السلام روشن تھا — مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا
نصیب بانو کے دل کو جگر کا داغ ہوا
پکارتی تھی کہ ٹھنڈا مرا چراغ ہوا

(بَین)

یہ میری آنکھوں کے آگے ہے کیا سیاہ سیاہ — یہ کیا جگر میں کھٹکتا ہے جس سے دل ہے تباہ
کدھر گئے علی اکبرؑ۔ انہیں علیؑ کی پناہ — حسینؑ امام کہاں ہیں پکارو للہ
تڑپ کے منہ سے نکلتا ہے اب جگر میرا
چھٹا ہے پہلے پہل نوجواں پسر میرا

(۳۱) ایمان کے جوش میں جو کیفیت ایماندار کے دل کی ہوتی ہے۔ اس کی تصویر

مرزا صاحب نے ایک مومنہ کا حال لکھ کر سلیس نظم میں کھینچی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُحد کی لڑائی میں لشکر اسلام نے فرار کیا۔ اور مدینہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضور صلعم شہید ہو گئے۔ اُس وقت مدینہ منورہ میں ایک تلاطم تھا۔ اور خانہ رسالت کی حالت حسب ذیل تھی:-

پر فاطمہؑ نے جب یہ خبر قہر کی پائی — سر پیٹتی بے ساختہ باہر نکل آئی
جو پوچھتا تھا کیا ہے۔ تو کہتی تھی دُہائی — اعدا نے مرے باپ کی تصویر مٹائی

روز بیکسی میں وتنہائی حواس

علی اکبر کے بعد گھر کی پریشانی

بین

(۳۱) احد میں خبر قتل حضور صلعم کی شہرت مدینہ میں ہونا

ویران مدینہ کو اجل کر گئی۔ ہے ہے

بابا کی بلا لیکے نہ مَیں مر گئی۔ ہے ہے

فاطمہ زہراؑ کی بے قراری کی **تصویر**۔ اور ایک **مومنہ** کا وقت پر کام آنا:۔

(بے قراری جناب فاطمہ و ایک مومنہ کا کام آنا)

یہ کہتی تھی اور دوڑتی تھی جانب جنگاہ — بسمل کی طرح گرتی تھی اور اُٹھتی تھی مع آہ

اک مومنہ نے عرض یہ کی آکے سرِ راہ — زہراؑ میں تری قاصدی اب کرتی ہوں واللہ

فرمایا کہ۔ احسان کر۔ اللہ جزا دے

اچھا۔ مَیں ترے صدقے۔ خبر باپ کی لادے*

گر زندہ ملیں فضل خدا سے شہِ ابرار — بابا سے حقیقت مری سب کیجیو اظہار

آنکھوں کو جو پوچھیں تو بتانا کہ ہیں خوں بار — دریافت کریں دل کو۔ تو کہنا کہ ہے افگار

باتوں کو جو پوچھیں تو بتانا یہ قرینہ

اک ہات سے سر پیٹتی ہے ایک سے سینہ

گر پوچھیں وہ۔ کیا حجرے میں بیہوش پڑی ہے — کہنا کہ بھیو رستے میں سراسیمہ کھڑی ہے

فرمائیں جو بابا کہ وہ صابر تو بڑی ہے — کہنا یہ نہیں صبر و تحمل کی گھڑی ہے

جنگاہ میں خود آنے کو طیار ہے زہراؑ

پر کانپنے سے پاؤں کے ناچار ہے زہراؑ

(حسن عقیدت)

اُس زمانہ کے سچے مسلمانوں کے جوش محبت اور جذبۂ ایمان کی دلکش تصویر۔ یہ مومنہ کس شوق و حسن عقیدت سے جاتی ہے:۔

یہ سُن کے پیادہ وہ چلی ڈھانپا نہ سر بھی — مقتل میں جو پہنچی نہ رہی اپنی خبر بھی

بسمل ملا بیٹا بھی برادر بھی پسر بھی — پرواہ نہ کی اس نے نہ کی اُن پہ نظر بھی

بھائی نے کہا۔ گود میں سر رکھ لے ہمارا

---

* اضطراب میں جیسے چھوٹے چھوٹے جملے شریف زادیاں بولتی ہیں ویسے ہی نظم کئے ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر

فرزند و پدر نے کیا پانی کا اشارا*

منہ پھیر کے وہ بولی۔ نہ ٹھیروں گی میں حاشا میں سوئے محمدؐ ہوں فرستادۂ زہراؑ
اس وقت بھلا گود میں سر لوں گی میں کس کا ہے خاک پہ وہ تاجِ سرِ مریمؑ و حواؑ
اب تو کسی پیاسے کی نہیں مجھ کو خبر ہے
سیدانی مری۔ تشنۂ دیدارِ پدر ہے

اب چاہئے کیا۔ دولتِ عقبیٰ ہو مبارک جنت ہو مبارک تمہیں طوبیٰ ہو مبارک
ہمسائگی حمزہ کا رتبا ہو مبارک مجھ کو شرفِ خدمتِ زہراؑ ہو مبارک
ہر ایک ہے اب فکرِ سعادت طلبی میں
میں فاطمہؑ کی رہ میں تم راہِ نبیؐ میں

القصہ نہ ٹھہری کسی کشتے پہ وہ زنہار آگے جو بڑھی وہ تو ملے احمدِ مختار
استادہ تھے زیرِ علمِ حیدرِ کرار دیکھا جو پریشاں اسے بولے شہِ ابرار
ہے خیر تو۔ کیوں آئی ہے۔ چھوڑے ہوئے سر کو
کیا بھیجا ہے زہراؑ نے۔ تجھے میری خبر کو

وہ رو کے یہ چلائی کہ ہاں اے شہِ والا بی بی مری رستے میں کھڑی کرتی ہیں نالا
فرمایا حبیبیؐ یاں مرا دل تہ و بالا جا فاطمہؑ کو جلد مرے پاس بلا لا
کہنا تو ہے بیتاب ہمارے لئے زہراؑ
بابا بھی تڑپتا ہے تمہارے لئے زہراؑ

(اس جہاد میں حضور صلعم زخمی ہوئے تھے۔ دندان مبارک بھی ٹوٹ گیا تھا۔ فرماتے ہیں):۔

* حقیقت میں ایماندار وہی ہے۔ جس کو سب عزیزوں سے اور اپنی جان سے بھی بڑھ کر حضور صلعم کی محبت ہے۔ جیسا کہ خود حدیث شریف میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

لیکن مرے زخموں کا سُنانا نہ اُسے حال   فریاد کو فوراً نہ کہیں کھول دے وہ بال
ہوگا چمن ہستی اُمت ابھی پامال   اُلٹے ہی قدم واں سے پھری یاں وہ خوش اعمال

زہرا سے کہا حال شہنشاہ عرب کا
اک مژدہ دیا خیر کا۔ اور ایک طلب کا

(باپ بیٹی کی محبت)

(باپ بیٹی کی محبت)

ساتھ اُس کے چلیں فاطمہؑ خوش خوش سُہیداں   لینے کو بڑھے واں سے نبیؐ خرم و خنداں
آغوش کے اندر لیا بیٹا بدنِ جاں   یہ بولے میں صدقے ترے وہ بولی میں قرباں

زہرا نے بلائیں لیں۔ پیمبرؐ نے دعا دی
دونوں نے جبیں شکر کے سجدے میں جھکا دی[۵۱]

باغ کا سماں خواب میں

(۳۲) باغ کا سماں جو ایک شخص خواب میں دیکھ رہا ہے۔

شبنم کا عجب لطف ہے ہر برگ چمن پر   سچا نے پہ ہے لوٹ گیا سبحۂ گوہر
ہر شاخ ہے معراج بہارِ گلِ احمر   جس طرح سناں پر سرِ فاطمہؑ کا سر[۵۲]

ہر غنچہ ہے دفترِ غمِ شاہ دوسرا کا
ہر لالہ ہے محضر گلِ زخمِ شہدا کا

دیوار باغ کی صفائی

رشکِ ورقِ نقرہ ہے اُس باغ کی دیوار   ہے اُس کی سپیدی و تجلی سے نمودار
خورشید نے مہرہ کیا ہے صبح نے آہار   ہر خشت کے قالب میں نگہ ہوتی ہے تیار

---

۵۱ جس طرح کسی بات کے کہنے سے پہلے کوئی مقدمہ سید اُٹھاتا ہے یا شاعر قصیدے میں تشبیب کی بہار دکھا کر اصل مطلب پر آتا ہے۔ اسی طرح مرزا صاحب مرحوم بعض مرثیوں میں اول اول (چہرے میں) ایسی روایات دکھ کر اصل مرثیہ شروع فرماتے ہیں۔ چنانچہ جناب فاطمۂ زہرا کا باپ سے ملنا لکھ کر اس مرثیہ میں آئندہ یہ حال کہا ہے۔ کہ اُن کی ہمنام و ہمشکل یعنی فاطمہ صغرا اپنے باپ امام حسینؑ کی انتظار و اشتیاق ہی میں رہیں۔ دریا [illegible] امام حسینؑ کے اُن کی سنائی اور سیدانیاں مدینہ میں آئیں + ۱۲ مؤلف حقیر

۵۲ یہاں بھی ایک کنایہ مرثیہ کا کر گئے۔ یہی کمال مرثیہ گوئی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

باغ اِرم اُس باغ کے اک خار کی قیمت
اقبالِ ہُما سایۂ دیوار کی قیمت

باغ میں فوارہ کی حسن تعلیل

فوارہ

فوارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا — پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اُٹھا تھا
فوارہ وہ تھا۔ خضر کی پیری کا عصا تھا — رفعت سے ستونِ فلکِ پیر بنا تھا
ازبسکہ حباب اُس کی تجلّی میں بھرے تھے
بِلّور کے پیمانۂ معکوس دھرے تھے

(۲۲) دعبل خزاعی اہلبیت کا انجام بخیر

(۳۲) دوسری صدی میں دعبل خُزاعی ایک مشہور مرثیہ گو شاعر عرب میں گذرا ہے۔ جس کو امام رضاؑ کی مداحی اور اُن جناب کے حضور میں مرثیہ امام حسینؑ پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ اپنے زمانہ میں عرب میں یہ شاعر فرد مانا جاتا تھا۔ اس کا واقعہ مرزا صاحب نے ایک مرثیہ میں نظم کیا ہے۔ مگر دو بند کتنے دلچسپ و مختصر ہیں:-

عاصی کی سیہ روئی سے نجات

مشہور ہے مے خوار رہا دعبلِ دیندار — پر مومنوں کو رائگ تھا تا ہے۔ جو غفّار
مُنہ اُس کا دمِ نزع سیہ ہو گیا اک بار — روشن کیدو اُس نے اُس کے رُخ کا مَیں اسرار
مرنے پہ زیادہ اُسے توفیق ملی تھی
وہ رُخ کی سیاہی پئے تحریر ملی تھی*

مانندِ گنہ بیٹے نے موت اُس کی چھپائی — جب ترسے کیا پردہ تو قبر اُس کی بنائی
مرقد میں علیؑ آئے پئے عقدہ کشائی — فانوس نمط قبر اُسے روشن نظر آئی

*شاعر کے واسطے عوارضی طور پر کاتب بھی ہونا ہے۔ سیاہی کی تو کتنی معقول ہے۔ پھر اُس کے بعد (تشبیہ) ع مانندِ گنہ بیٹے نے موت اُس کی چھپائی۔ ایسے شخص کے بیان میں کہ جو ایک گناہ کبیرہ شراب خواری کا عادی تھا یہ بھی معقول تمثال ہے کہ ہر شخص گناہ چھپایا کرتا ہے۔ اس نے گنہگار کی موت دوستوں سے چھپائی + ۱۲ مؤلف حقیر

مرقد میں یہ کہتے ہوئے خیر الامم آئے
مشتاق سخن کے ترے جنت سے ہم آئے

طوبیٰ لک[2] اے خاص شہ کرب و بلائی
لے مرثیہ پڑھ تو مرے مظلوم کا بھائی

دعبل نے پڑھا مرثیہ رقت انہیں آئی
چہرہ پہ کفِ دست پیمبر نے پھرائی

کافور وہ ظلمت ہوئی رخسار سے ہٹ کر
زیبِ سر کا نشان بن گئی ماتھے پہ سمٹ کر

پھر حلّہ نور اپنا پیمبر نے اُتارا
یہ کہکے اُسے قامتِ دعبل میں سنوارا

نکلا جو ترے مرثیہ پر اشک ہمارا
[illegible] عصیاں ترا دھو یا گیا سارا

لے خاص تبرک ہے [illegible] بدن کا
تو مرثیہ گو ہے [illegible] کفن کا

(۲۴) ہند [illegible] مرثیہ [illegible] سے بات [illegible] ہی ہے۔ اب اس کمال کو دیکھیے [illegible] ہند کا [illegible] بھی ہے اور [illegible] بھی ہے [illegible] تھا ربلاغت کی [illegible] ماقل ودل [illegible] مد ہے:۔

---

[1] فانوس نمطکی بگہ فانوس [illegible] فانوس [illegible] کی [illegible] زیادہ [illegible] تھا۔ لہذا مصنف مرحوم نے [illegible] کے یہاں یہ لفظ [illegible] ہے [illegible] بولا جاتا ہے۔ تو ستراتی [illegible] سے مراد ہے ۱۲ مولف حقیر۔

[2] طوبیٰ لک [illegible] ہے طوبیٰ [illegible] درخت بہشت [illegible] تہنیت کے موقع پر بولتے ہیں جیسے اردو [illegible] مبارک ہو حضور [illegible] اس موقع پر اس لفظ کی [illegible] کیا لطف کلام میں پیدا کیا ہے کافور ہونا [illegible] کافور سفید [illegible] ظلمت سیاہی کو کہتے ہیں ایک دوسرے کی ضد ہے صنعت تضاد ہوئی [illegible] کیسا عمدہ مضمون بتا تا ہے۔ [illegible] عالم میں دوسرے معاصرین [illegible] سے پیچھے اور نیچے [illegible] اثنا عشری ہے ۱۲ مولف حقیر۔

بند سے سوال دبیر ایڈیشن [illegible] میں سوال بھی جواب بھی

بیٹے نے پوچھا۔ مرض کیا ہے؟ کہا بے پدری — رو کے وہ بولی۔ دوا کیا ہے؟ کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا۔ کہنے لگے۔ دربدری — بولی لیتا ہے خبر کون؟ کہا۔ بے خبری
آہ۔ کرنے کا سبب پوچھا۔ تو شرمانے لگے
تازیوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے[1]

(۳۵) یزید بعد شہادت امام حسینؑ اپنے عروج اقبال پر فخر و مباہات کر رہا ہے جیسے بعض ظالموں کی عادت ہوتی ہے۔ دیکھئے اُس کے خیالات وا رندانہ کو کس کس لطیف و عبرت خیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اور زبان کتنی پیاری ہے:- یزید کے ظالمانہ خیالات کا نقشہ

جلاد کھائینگے مری تلوار کی قسم — اک بار پنجتنؑ کے گلوں کو کیا قلم
اب چرخ ہفتمین پہ علم ہے مرا علم — اکسٹھ[2] برس کے بعد گرا دین کا علم
نوبت اب آئی دین نبیؐ کے مٹانے کی
ہے عرش پر صدا مرے نقارخانے کی
نمرود سے کچھ آنچ[3] نہ پہنچی خلیل کو — میں نے جلا یا قلب رسولؐ جلیل کو

---

[1] ہند کے حال میں مرزا صاحب کے کئی مرثئے ہیں اور زبان نہایت سلیس ہے جنمیں اکثر محلات شاہی کی روزمرہ مثال جوں کی توں ملتی ہیں مرزا صاحب کے زمانہ میں شاہی محلات میں ان کے کلام سے زبان کی سند لیجاتی تھی۔ روزمرہ بیگمات کی زبان مستند مانی جاتی تھی اس شعر میں مرزا صاحب کی زبان کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ بیت بند میں در غور فرمائیے۔ ایک مصرع میں کہا یا "بیٹے نے پوچھا" دوسرے مصرع میں کہا "رو کے وہ بولی" تیسرے میں "گھر جو دریافت کیا" چوتھے میں "بولی" لائے۔ اگر ہر مصرع میں ایک ہی لفظ پوچھا یا دریافت کیا اور کچھ لاتے تو بلاغت کی شان نہ قائم رہتی۔ ایسے ایسے نکات بلاغت کلام دبیر میں ہزاروں لاکھوں ہیں مبصر جو ہیں کامل مانتے ہیں + ۱۲ مؤلف

[2] سنہ ۶۱ ھ میں واقعہ کربلا ہوا۔ عروج اسلام سنہ ہجری سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اکسٹھ برس کہا + ۱۲ "از حقیر"

[3] آنچ پہنچنا اردو میں گزند پہنچنے کے معنی پر محاورہ ہے۔ از بسکہ نمرود نے جناب ابراہیمؑ کو جلانا چاہا تھا۔ اس لئے اس بیان میں اس روزمرہ نے جان ڈال دی ہے جناب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کے بانی ہیں اُن کے دل کے ساتھ جناب رسولؐ کے کعبہ دل ہونے کا اور جناب امیرؑ کے مولود کعبہ ہونے کا بلا سلسلہ تقریر کے واسطے کیا اس سبب ہے + ۱۲ مؤلف۔ حقیر۔

قابو ہوا نہ کعبے پر اصحابِ فیل کو میں نے گرایا تاجِ سرِ جبرئیلؑ کو

مارا اُسے جو قبلۂ آلِ خلیل تھا

فرزندِ خانہ زادِ خدائے جلیل تھا

(خدا کی شان صابروں کا امتحان۔ دُنیا کی نیرنگی۔ اہلِ دُنیا کی دُنیا پرستی)

خدا کی شان

جلوہ دکھا رہا ہے خدا کبریائیؑ کا ناحق بہاؤں خون میں حق کے فدائیؑ کا

ہو میری نذر کے لئے بلوہ خدائیؑ کا پرسا نہ جا کے دے کوئی زینبؑ کو بھائی کا

اُمت کو ناگوار بھی یہ تہنیت نہ ہو

مرجائے ابنِ فاطمہؑ اور تعزیت نہ ہو

زینب کی جرأت و فصاحت

(۳۶) جنابِ زینبؑ درِ خیمہ پر آ کر حُرؑ کی لاش دیکھ کر اُس کی شجاعت و ایمانداری کی مدح فرماتی ہیں۔ اور اپنے بیٹوں کو جوشِ مردانگی و غیرت دلاتی ہیں۔ جب اُنھوں نے ایمان و اعتقاد کی آنکھوں سے

دیکھا کہ حرا دل کا بدن خون میں تر ہے جنت میں قدم زانوئے شبیرؑ پہ سر ہے

تو اپنے بیٹوں سے خطاب فرماتی ہیں۔

سچا لو تو پیارو۔ یہ فرشتہ ہے کہ حُر ہے یہ وہی بہادر ہے کہ غلطاں کوئی دُر ہے

رُخ مہر سے اللہ کی رشک مہ و خور ہے شبیر کا بندہ ہوا دوزخ سے یہی حُر ہے*

کیا خوب مدم جنگ۔ نصیب اس کا لڑا ہے

مُردہ ہے یا چودھویں کا چاند پڑا ہے

کیا تختۂ تن پر چمن زخم کھلے ہیں کیا خدمتِ شبیرؑ کے پھل اس کو ملے ہیں

لے پیاس کے شکوے ہیں نہ فاقوں کے گلے ہیں اب آٹھ بہشت اس کی شہادت کے صلے ہیں

* مصرع اوّل میں حر نام ہے۔ اور اس چوتھے مصرع میں حر کے معنی آزاد کے ہیں۔ مگر دو معنی جدا جدا نہ ہوتے۔ تو یہ قافیہ شائگاں (ایطا) ہو جاتا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جو مرد ہیں وہ نام پہ سر دیتے ہیں پیارو
سر دیتے ہیں اور تاج شرف لیتے ہیں پیارو

اس موت میں جینے کا مزہ مل گیا حر کو   شبیرؑ کے ملنے سے خدا مل گیا حر کو

(۳۷) بعد شہادت حضرت عباسؑ راوی نے جناب امام حسینؑ اور ان کے ساتھ ایک چار سالہ لڑکی (سکینہ) کو گھبرا کر خیمہ سے نکلتے دیکھا۔ اس کی مختصر تصویر۔

ہائے اس لڑکی کا بین کیا کہوں کیا عالم تھا   زلفیں بکھری ہوئیں۔ کرتے کا گریباں پھٹا
ٹوپی اک سمت پڑی۔ ایک طرف سر کی ردا   آنکھیں دریا کی طرف۔ اور بدن میں رعشا
گر کوئی پوچھتا تھا۔ کون ترا قتل ہوا؟
رو کے کہتی تھی۔ کہ فریاد۔ چچا قتل ہوا

(۳۸) جناب عباسؑ علمدار کی آمد جنگاہ کے موقع پر لشکر یزید میں غل ہو رہا ہے۔

غل ہے کہ علمدارو۔ علم اپنے سنبھالو   ہاں پیدلو۔ ہاں راکبو۔ ہاں برچھیوں والو
ہر مشک تو سوکھی ہوئی نیزے پہ اٹھالو   غازی نے کہا۔ جان ہی تم اپنی بچالو
لو آؤ۔ بڑھو نیزے سنبھالو۔ تو میں جانوں
کاندھے سے بھلا مشک اٹھالو۔ تو میں جانوں

(۳۹) حضرت عباسؑ کی دلیرانہ تقریر اور دریا میں در آنے کی شیرانہ تصویر

دریا کے نگہبانوں کو عباسؑ نے ٹوکا   لو روک لو دریا کہیں بھ [illegible]
وہ بولے کہ روکا ہے یہ بولے نہیں روکا   وا۔ دیدۂ بنیار ہا نے [illegible]
یوں گھوڑے کو چمکایا کہ سب غش میں پڑے تھے
عباسؑ یہاں دبیرؔ سے دریا میں کھڑے تھے

(۴۰) جناب عباسؑ شہید کی عالم نزع کی مختصر تصویر

یہ کہتے تھے جو نزع کی ہچکی ہوئی طاری   گردن جو ڈھلی بھائی کو دیکھا کئی باری

تن کانپا ملیں انگلیاں پاؤں کی بھی ساری — اشک آنکھوں سے اور کلمہ زباں سے ہوا جاری

جھپکی نہ پلک بھی کہ قضا کر گئے عباسؑ

آنکھیں سوئے مولد رہیں اور مر گئے عباسؑ

(۴۱) جناب امام حسینؑ اپنے فرزند نوجوان ہم شکل محمد مصطفےٰ صلعم کی لاش اٹھانے کو جا رہے ہیں۔

لکھا ہے وا ابتا کی جو رن میں صدا آئی — حسینؑ امام کے چہرے پہ مُردنی چھائی

وہ آہ کی کہ ضریح رسولؐ تھرّائی — روانہ ہو گئی اشکوں کے ساتھ بینائی

سوارِ دوشِ پیمبرؐ کی آس ٹوٹ گئی

عنانِ صبر تو تھامی۔ لگام چھوٹ گئی

تصویرِ واقعاتِ غم

قدم قدم پہ ٹھہرتے تھے شاہ تشنہ گلو — ہوا میں سونگھتے تھے اپنے لال کی خوشبو

زمیں پہ بیٹھ کے گاہے بہاتے تھے آنسو — تلاش کرتے تھے ہاتوں سے لاش کو ہر سو

جو کوئی پوچھتا تھا۔ کیا حضور ڈھونڈتے ہیں؟

تو رو کے کہتے تھے۔ آنکھوں کا نور ڈھونڈتے ہیں

اس بند کو دیکھئے کیا اس سے بہتر و مختصر کوئی شخص نثر میں بھی یہ مضمون ادا کر سکتا ہے (نظم تو در کنار)

تمہارے تیرِ جفا کا تو میں نشانا تھا — بھلا نبیؐ کے مرقع کو کیوں مٹانا تھا

کہ فیضیاب زیارت سے اک زمانا تھا — جو نیزہ سینے پہ مارا تھا دل بچانا تھا

گلہ کسی کا نہیں۔ جو ہوا۔ سو خوب ہوا

بتاؤ چاند ہمارا کہاں غروب ہوا؟

جواب سنئے

پکارا شمر۔ یہ۔ کوئی نہیں بتانے کا — بڑا ثواب ہے سادات کے رلانے کا

نہ زندہ چھوڑینگے بچہ بھی پاس گھرانے کا
ارادہ ہے۔ علی اصغرؑ کے خوں بہانے کا

جو تیر ملا ہو ننھے گلے سے رشید
تمہاری گود میں شش ماہے کو شہید کریں

یہ سُن کے اور طرف شاہ حق شناس چلے
کبھی حواس میں اور گاہ بے حواس چلے
نہ تھا یہ ہوش کدھر آئے کس کے پاس چلے
پکارتے ہوئے ہر سُو بحال یاس چلے

مرے جوان۔ مرے عاشق۔ مرے جگر بولو
کہاں سدھارے۔ کدھر چھپ رہے پسر بولو

(ایک شخص نے بتا دیا)

ایک شخص نے رستہ بتا دیا

یہ کہتے تھے۔ کہ پکارا کوئی ترس کھا کر
کہ ایک شیر وہ گھائل پڑا ہے زیر شجر
کہاں کہاں؟ کہا۔ اور دوڑے سبط پیمبرؐ
دعائیں دے کے اُسے پوچھنے لگے سرور

بھلا نشان تو دے۔ کیا ثبوت ہوتا ہے
یہ شیر اور ہے۔ یا شیر حق کا پوتا ہے

(سراپا نئی شان کا)

نئی شان سراپا

وہ رو کے بولا سنو۔ لمبے لمبے گیسو ہیں
ستارہ خال۔ قمر رُخ۔ ہلال ابرو ہیں
علیؑ کے زور کا سانچہ وہ گول بازو ہیں
پسینہ عطر ہے۔ کپڑے تمام خوشبو ہیں

بڑا۔ پتہ تو یہ ہے۔ وہ نبیؐ کا ثانی ہے
وداع عمر ہے۔ اور موسم جوانی ہے

(اور نشانات۔ مثریت کے پہلو)

نشانات

دہان خشک سے باہر نکل پڑی ہے زباں
زباں کے ساتھ ہے انگشتری بھی منہ سے عیاں
کہا حسینؑ نے بس بس وہی ہے میرا جواں
انہیں کے واسطے رن میں ہوں کب سے سرگرداں

نشان پسر کا ہمیں تجھ سے بھائی جان ملا*

* وہ شخص دشمن کی فوج کا کوئی آدمی ہے مگر پھر بھی آپ کو بھائی جان کہہ رہے ہیں۔ کہ اُس نے علی اکبرؑ کا پتہ بتایا ہے۔ یہ لفظ (بھائی جان) خلق محمدی کی خبر دے رہا ہے۔ جو امام حسینؑ کی طبیعت میں تھا۔ ۱۲ مؤلف حقیر

امام حسینؑ علی اکبرؑ کے پاس

پر آج خاک میں بالکل مرا نشان ملا

(امام حسینؑ آگے بڑھے)

گئے جو زیرِ شجر اپنے گُل کی بُو پائی ۔۔۔ مگر نہ لاش مفصّل اُنہیں نظر آئی
وہ شوق دیکھنے کا اور وہ ضعفِ بینائی ۔۔۔ تڑپ تڑپ گیا دل اور رُوح گھبرائی

جدھر سے آئی تھی بُو۔ اُس طرف کو جانے لگے
پسینہ آنے لگا۔ پاؤں تھرتھرانے لگے

آخری باتیں

پکارے گر کے۔ کدھر ہو۔ کہاں ہو اے بیٹا ۔۔۔ پسر نے ہات اُٹھایا۔ اِدھر اِدھر بابا[1]
یہ حال قبلہ و کعبہ کا آہ کب سے ہُوا؟ ۔۔۔ حسینؑ بولے۔ تمہارا مزاج ہے کیسا[2]؟

کہا پسر نے۔ کوئی دم کی اور ایذا ہے
قدم حضور کے دیکھے۔ غلام اچھا ہے

(سلاست و فصاحت کا کمال۔ بھلا اسکو نثر تو کیجئے)

سلاست، اختصار و ربط

یہ سُن کے جانبِ آوازِ شاہِ تشنہ چلے ۔۔۔ قریب جاتے ہی ملنے لگے پسر کے گلے
جبیں جبیں سے ملی۔ لب پسر کے لب سے ملے ۔۔۔ اُٹھا کے سر کو رکھا ایک ہاتھ سر کے تلے

پکارے ہائے غضب۔ چہرہ زرد ہوتا ہے
وہ بولے۔ میرے کلیجہ میں درد ہوتا ہے

(علی اکبرؑ کا جواب)

علی اکبرؑ کا جواب

---

[1] پسر نے ہاتھ اُٹھایا۔ اِدھر اِدھر بابا۔ یہ کمالِ بلاغت یہ ہے کہ اضطراب در انتہائے قلق و درد میں جس طرح مجروح آدمی بات کرتا ہے اور منہ سے کلمہ نکلتا ہے اسی طرح نظم کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اِدھر اِدھر آیئے۔ یا اِدھر میں موجود ہوں ۔۔ مؤلف حقیر۔

[2] یہ تقریر امام حسینؑ کی مصیبت و محبت کی خبر دے رہی ہے کہ علی اکبرؑ تو امام حسینؑ کا حال پوچھتے ہیں امام حسینؑ اپنا حال کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ تمہارا مزاج کیسا ہے۔ کیونکہ مصیبت زدہ کی اِس بات کا جواب نہیں دیا کرتا۔ اور محبت کے سبب سے مجروح یا علیل ہی کا حال پوچھا جاتا ہے ۔۔ مؤلف حقیر۔

وداع ہوتے ہیں جنّت کو جاتے ہیں بابا
یہ دیکھئے۔ وہ پیمبرؐ بُلاتے ہیں بابا
برہنہ سر مرے دادا ابھی آتے ہیں بابا
چچا حسنؑ بھی وہ تشریف لاتے ہیں بابا

جبیں پہ موت کا ٹھنڈا پسینہ آتا ہے
رگوں کے کھنچنے سے جی سَن سَنایا جاتا ہے

خاندانِ رسالت کے شہید کی موت کی **صورتِ حال**۔

خاندانِ رسالت کے شہید کی موت

یہ کہکے کلمہ کی اُنگلی بلند کی ناگاہ
کہا کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
پھرا کے آنکھوں کو کی جانبِ حسینؑ نگاہ
حسینؑ رونے لگے اور پکارے وا اسفاہ

مَیں زندہ بیٹھا ہوں تم میرے آگے مرتے ہو
پدر کو کلمہ کا اپنے گواہ کرتے ہو

(۲۴۳) امام حسینؑ بنا بر ایک روایت کے مدینہ منوّرہ میں اپنی ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغرےٰ کو چھوڑ کر سفرِ عراق کو گئے ہیں۔ اُن (فاطمہ صغرےٰ) کی تنہائی و اضطرار کی **تصویر**۔

فاطمہ صغریٰ کی تنہائی کی تصویر

بالوں کو کبھی کھولنا اور خاک سے بھرنا
بند آنکھیں کئے۔ دل سے بیاں باپ کا کرنا
اُٹھ بیٹھنا۔ اور بیٹھ کے سر تکئے پہ دھرنا
سنسان مکاں دیکھنا۔ اور دیکھ کے ڈرنا

خود کہنا کہ بابا سے نہ دُنیا میں ملیں گے
پھر آپ ہی سمجھانا کہ عُقبا میں ملیں گے

اضطرار اور انتشار

مایوسی کے عالم میں بڑھانا کبھی زیور
یعنی نہ ملاقات پدر ہوگی مُیَسّر
گہنے کو پہننا کبھی اور کہنا یہ ہنس کر
اللہ کرے آتے ہوں فرزندِ پیمبرؐ

گہ ذکرِ شہِ دیں۔ کبھی عبّاسؑ کی باتیں
گہ یاس کی باتیں تو کبھی آس کی باتیں

سمجھاتی تھیں نانی* تو یہ کہتی تھی وہ بیمار
جو جو تھا مقدّر میں وہ ہوتا ہے نمودار

* نانی سے یہاں مراد اُمّ المومنین اُمِّ سلمہؓ سے ہے۔ جن کو امام حسینؑ مدینہ میں چھوڑ گئے تھے ۱۲ مؤلف حقیر

آگے تھا بخار اب ہُوا وحشت کا بھی آزار | اس حال سے ہوتی ہے غفالت[1] مجھے ہر بار
غفلت میں تو کیا کیا نہیں کہہ جاتی ہوں نانی
پھر ہوش جو آتا ہے تو شرماتی ہوں نانی

سب رنج و قلق میرے مقدر کے لئے تھا | سوز تپ ہجراں تن لاغر کے لئے تھا
داغِ غمِ فرقت دلِ مضطر کے لئے تھا | دوران زمانے کا مرے سر کے لئے تھا
نے دیکھنے کو شاہ کے۔ نے سونے کی خاطر
تقدیر نے دی آنکھ ہمیں رونے کی خاطر

(۳۴) مناجات امام حسینؑ

(۳۴) امام حسینؑ روز عاشورا درگاہ خدا میں مناجات فرماتے ہیں۔

تُو نے بچپن میں کھلائے ثمرِ خلدِ بریں | اب اگر تیسرا فاقہ ہے نہیں کچھ میں حزیں
چوسی چھٹپن میں زباں نبیؐ عرش نشیں | آج اگر پینے کو پانی نہیں۔ تو خیر نہیں
ایک دن حلق تھا اور فاطمہؑ کے شیر کی دھار
آج راضی ہوں گلے پر چلے شمشیر کی دھار

[illegible]

دُرِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا | لے گئیں نذر کو داغِ غمِ احمدؐ زہراؑ
سر عمو ہے ترے دربار میں بابا مرا | دل کے ٹکڑے سے مرے بھائی کے[2] تجھ پہ فدا
آج شبیرؑ بھی ان سب کے مقابل ہو جائے
سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے

سلہ فی الاصل لفظ غفالت ہے غفلت صحیح ہے مگر حقیقی حالت یہی لکھی ہے یہ [illegible] زبان کا لفظ نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے مگر اس میں یہ بات کمال ہے ۔ مولف حقیر

سلہ جناب سرور کائنات صلعم کا دندان مبارک معرکہ کی لڑائی میں شہید ہوا تھا مصرع اول میں اس مصیبت کی طرف اشارہ ہے مصرع دوم میں جناب فاطمہ زہراؑ کو جو مصائب وفات حضور صلعم پیش آئے ان کی طرف اشارہ ہے تیسرے مصرع میں جناب امیرؑ کے مسجد کوفہ میں سر پر تلوار رکھ [illegible] ہے کہ سر کے خون سے ریش مبارک سرخ ہو گیا تھا چوتھے مصرع میں امام حسنؑ کے حال کو بیان کیا کہ زہر [illegible] کے ذریعے [illegible] لیکن [illegible] (ہم کبھی نہیں [illegible]) [illegible] مجھے بھی [illegible] کامیاب کر دے۔ اور حضرت [illegible] نے کتنا بڑا مضمون ایک بند میں نظم فرما دیا یہ بیان پر انتہائی قدرت ہے ۔ مولف حقیر

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بار خدا ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطر عاشق جاں باز ہے اللہ جدا اے خوشا حال کہ جس سے ہو ترا عشق ادا
حلق پر تیغ رہے سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا۔ دل میں تری یاد رہے[1]

(۴۴) مادرِ علی اصغر کا علی اصغر کو قید خانۂ شام میں یاد کرنا۔ (تصویر[2])

یاد آتے ہیں اصغر مجھے ابتک نہیں بھولے چھوٹا سا وہ قد۔ چاند سا منہ۔ بال جھنڈولے
ایسے گئے گہوارے میں پھر آکے نہ جھولے پھل تیر کا کھایا نہ پھلے اور نہ پھولے
اب جا کے میں اصغر کو وہاں پیار کروں گی
اُس چھوٹی سی میت کو کلیجے پہ دھروں گی

(۴۵) عہد حضور صلعم میں ایک ایسی عید آئی۔ کہ حسنین کے پاس نئی پوشاک نہ تھی۔

القصہ سُن کے چار طرف عید کی خبر آئے حضور فاطمہ۔ سبطین نامور
باہیں گلے میں ایک نے ڈالیں ادھر اُدھر اک سینے سے لپٹ گیا جلدی جھکا کے سر
بولے حسنؑ۔ ہمیں پہ بہت مہربان ہیں
شبیرؑ بولے۔ واہ مری اماں جان ہیں[3]

اب دیکھئے۔ جناب فاطمہ زہراؑ ایسا جواب دیتی ہیں۔ کہ دونوں میں سے کسی سے محبت کم نہ ثابت ہو۔ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

ماں بولی۔ ہم تو دونوں کے قربان جاتے ہیں اتنا نہ چاہو تم۔ مجھے وسواس آتے ہیں
حاسد کی چشم زخم سے ہم ہول کھاتے ہیں سب سے چھپا کے تم کو گلے سے لگاتے ہیں

[1] یہ مشہور و مقبول شعر جس کا مطلع یہ ہے ع جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے تا قتل پیاس شبیر ابتدا انتہا تک ایسا ہی صحیح ہے کہ کسی مناجات کا جواب جلد دوم میں جو تبرکاً بہت سے انتخاب کئے ہیں ۔ فقرات کی بابت جو علماء میں ... شرح چھپ چکا ہے ... سلام مثنوی ... حلق ... انتخاب ... مرثیے ... [illegible]

[2] بچے جس طرح ماں سے لاڈ کرتے ہیں اُس کی تصویر بالمقابل پر کھینچ دی ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

خاصانِ حق کے خاص ہوئیگی ملکے نیک ہو

مثلِ نگاہ۔ تم مری آنکھوں میں ایک ہو[1]

(۴۶) حضرت امام حسینؑ کی تنہائی اور جاں نثار بھائی اور نوجوان فرزند کی یاد۔

حال کمرو چشم پہ کہتے ہیں بصد یاس — کیوں بندِ کمر توڑ گئے تجھ کو بھی عباسؑ

میں جانتا تھا بھائی سے تو رہی ہے فقط آس — عباسؑ کو کیا روؤں کہ اکبرؑ بھی نہیں پاس

میں جانتا تھا دردِ جگر دے گئے اکبرؑ

کیوں چشم بصارت بھی تری لے گئے اکبرؑ

اے چشم جواں مرگ کے حق کو تو ادا کر — جس نے تجھے بے نور کیا اُس پہ بکا کر

اے سینۂ محزون علم آہ بپا کر — مظلوم علمدار حسینی کی عزا کر

اے دل نہ تڑپ۔ یاد سکینہ کی بھلا دے

اے خشک زباں۔ نانا کی اُمت کو دعا دے[2]

(۴۷) عرب کی دھوپ اور گرمی ضرب المثل ہے مرزا صاحب روزِ عاشورا سنہ ۶۱ھ کی گرمی کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

کیا گرم ہوا قہر کی مقتل میں چلی ہے — دن ڈھل گیا ہے دھوپ نہیں دن کی ڈھلی ہے

وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا — بس ہات دھرا قبضے پہ اور پڑ گیا چھالا

برباں ہُوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا — اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا

پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر

پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر[3]

---

[1] آدمی کی آنکھیں دو ہوتی ہیں مگر نگاہ ایک ہوتی ہے۔ دونوں نورِ چشموں کا ایک ہی مرتبہ ہونا کس خوبی سے ثابت کیا ہے کیا حسنِ تعلیل اس سے بہتر ہو سکتی ہے تمام عرب و عجم کے دیوان چھان ڈالئے ایسے مضامین نہیں ملینگے۔ یہ بند بھی دفترِ ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپ چکا ہے جس کا مطلع یہ ہے ع تاج کائنات حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ مؤلف

[2] دفترِ ماتم کی تیرھویں[13] جلد میں یہ مرثیہ چھپ چکا ہے اس کا مطلع یہ ہے ع بنیچ امامت جگری خاک شفا پر۔ اچھا مرثیہ ہے۔ مؤلف حقیر۔

[3] دفترِ ماتم کی چودھویں[14] جلد میں یہ مرثیہ چھپ چکا ہے اس کا مطلع یہ ہے ع جب سکۂ زن اشرفیٔ مہر ہوا روز۔ مؤلف حقیر۔

(۴۶) تنہائی حسینؑ امام حسینؑ کی بیکسی اور عزیزوں کی یاد

(۴۷) گرمی اور دھوپ

سایہ کے تجسس میں بشر پھرتے ہیں ششدر　　سایہ تہ دیوار و شجر بیٹھا ہے چھپ کر
سب لیتے پناہ اپنے ہی سایہ میں مقرر　　پر دھوپ نے سایہ ہی جلا ڈالا سراسر
مضمون عدم سایہ کا یہ میں نے نکالا
سایہ نے بھی آج آپ کو دریا میں ہے ڈالا

نایاب ہیں مرغان ہوا صورت عنقا　　بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لب دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا　　پر اوج امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے۔ سایہ نہیں۔ اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے۔ پانی نہیں۔ اور پیاس بڑی ہے

سرسام فلک کو ہوا ہے گرم ہوا سے　　شب ہو تو ملے شیر کو اک کف پا سے
کافور قمر اڑ گیا ہے دار شفا سے　　گرمی یہ ہے اور عابد بیمار ہیں پیاسے
بالائے زمیں دھوپ کی زردی سے عیاں ہے
گردوں کو ہے سرسام زمیں کو یرقان[۲] ہے

اب ایک ایسے مرثیہ میں سے تحت کے چند بند لکھتا ہوں۔ جو نہ تقسیم ہوا ہے۔ نہ چھپا ہے بلکہ اس کتاب کی رونق و عزت بڑھانے کے واسطے جناب استاذی و ملاذی حضرت اوج مدظلہ نے یہ چند بند عنایت فرمائے ہیں۔ کہ یہ سب کلام حسب وصیت جناب دبیر مرحوم محفوظ ہے۔ میں جناب ممدوح کے شکریہ کے ساتھ ان جواہرات کو ناظرین جوہر شناس کے روبرو پیش کرتا ہوں۔

تنہا کھڑے ہیں رن میں امام فلک جناب　　گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب

سلہ یہ عجیب سجع ہے کہ ہر مصرع کے تین تین حرف بالمقابل وزن میں آئے ہیں۔ مگر کس قدر بے ساختہ پن ہے ۱۲ مولف

سلہ ملاحظہ کیجئے اس بند کو بغور دیکھیں اور اس تمثیل کی داد دیں۔ یہ تینوں بند بھی اسی مرثیہ سے ہیں جس کا مطلع اوپر لکھ چکا ہوں۔ ع تسبیح امامت و گری فلک شعار ۱۲ مولف حقیر

بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب خیطِ غبار سے ہے لپی ابرئی سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردن کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی[1]

آتش بدل سمندر ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر سے مردمِ آبی ہیں نالہ کش نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زاہد کو بے آبرو کریں
تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں[2]

جو نخل سایہ دار ہیں وہ بے نشان ہیں بالائے سر کھنچے ہوئے نو سائبان ہیں[3]
اک سایۂ حسینؑ میں دونوں جہان ہیں جو گرد سات چتر لئے آسمان ہیں

---

[1] مولوی شبلی صاحب نے موازنہ میں شعر مرزا صاحب کا صفحہ ۱۳۵ پر لکھا ہے۔ نیست پر فتم او ہر جلوہ مگر در حوض ہا کردہ است از تشنگی ہر بن ہا جنس آب [illegible] جاہلیت میں [illegible] اکثر تو بد ذوق ہوتا ہے اور جو شخص نیک طینت تجربہ کار رہتا ہے وہ ضرور ایسا خیال کرتا ہے اور جو دوسری طرح کی طبیعت رکھتا ہے [illegible] نے ایک سلام میں کہا [illegible] خیال اچھا ہے [illegible] ایسا ہی دیکھتے ہیں [illegible] مرزا صاحب کے شعر کا علم ہوگا [illegible] فرما رہے ہیں اپنی زبان نکال دی گویا فعل اختیاری ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ زبان دہن سے نکل پڑی [illegible] پانی کی کمال شدت کا اظہار کرتا ہے کہ گرمی دریا کی شدت میں [illegible] زبان منہ سے نکل پڑتی ہے [illegible] میر مرحوم [illegible] بہت [illegible] ہوا ہے ابھی تک میری نظر سے یہ شعر [illegible] نہیں گذرا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] زاہد کو بے آبرو کرنے کی وجہ جو [illegible] ہے کہ تردامنی [illegible] وضو کریں مطلب یہ ہے کہ اس قحط (عالم میں) [illegible] ہو گئی ہے کہ زاہدان پانی کی [illegible] ذلیل عبادت الٰہی کرنا چاہتے ہیں یہی حال آج کل سنہ [illegible] میں عام مسلمانوں کا تھا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] نو سائبان سے مراد نو آسمان ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

قامت کی زیب گیسوئے شاہِ جلیل ہیں
پر کھولے۔ ایک سدرے پہ۔ دُو۔ جبرئیل ہیں*

(۸۴) عرب آج بھی اپنے گھوڑوں سے باتیں کرتے ہیں۔ اور گھوڑے زبان اشارہ سے جواب دیتے ہیں۔ اس مضمون کو دیکھئے کیسی سلاست و لطافت سے مرزا صاحب ادا کرتے ہیں۔

امام حسینؑ کے حال میں

راکب پہ بھی مرکب پہ بھی ہے تیسرا فاقا
بند آنکھیں ہیں ہر ہوا کی اور غش میں ہیں آقا
فرصت نہ انہیں ضعف سے نے اُس کو افاقا
دُنیا میں ہیں۔ لیکن نہیں دُنیا سے علاقا
مولا کے رکابوں سے قدم چھوٹ چکے ہیں
اتنا بھی فقط گھوڑے کے روکے سے رُکے ہیں

مرکب کا ہے یہ حال کہ جب ہوش میں آنا
راکب کی طرف خوں بھری گردن کو پھرانا
اور دیکھ کے بے حال اُنہیں یہ حرف سُنانا
آقا مجھے بے صاحب و وارث نہ بنانا
مولا مرے سنبھلو کہ مجھے خوف بڑے ہیں
تم غش میں ہو اور تاک میں جلّاد کھڑے ہیں

شہ کہتے ہیں مجھ کو غمِ اکبرؑ ہے گراتا
گھوڑے مَیں سنبھلتا ہوں پہ سنبھلا نہیں جاتا
طاقت مَیں بھلا پاتا تو گردن کو جھکاتا
اس وقت۔ مَیں۔ ملنے کو سکینہ سے نہ جاتا
جانے وہی جس پر یہ بلا آئی ہے گھوڑے
مجبوری ہے۔ ناچاری ہے تنہائی ہے گھوڑے

* ایک سدرہ پہ دو پر کھولے ہوئے جبرئیلؑ ہیں۔ اس میں قامت امام حسینؑ کو مصنف نے سدرۃ المنتہیٰ قرار دیا۔ اور دونوں گیسوئے امامؑ کو جبرئیلؑ کے دو پروں سے تعبیر کیا۔ اس میں دُو کی لفظ ضرور اپنے مقام سے کچھ ہٹی ہوئی ہے مگر ایسی تعقیب سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں ہے۔ بعض شاعر وزن و قافیہ کی رعایت سے نظم میں الفاظ آگے پیچھے لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر للبیان سہر تو نظم و نثر میں کچھ فرق ہی کیا ہے۔ سمع و الفت خن کرام الناس مقبول۔ ہشواہد حقیر

اعدا کا اگر ہوش بجا ہے تو بجا ہے
اُن کا علی اکبر سا پسر کون مُوا ہے
بچوں کے لئے سایہ ہے پروا نہیں کیا ہے
یاں دُھوپ میں لاشہ مرے اصغر کا پڑا ہے
ناموس عدو خیمہ میں بے رنج و محن ہے
اور در پہ وہ سر ننگے کھڑی میری بہن ہے[۱]

(۴۹) معنی خیز بیان

(۴۹) دربار یزید میں جس وقت اور شہیدوں کا ذکر ہوتے ہوتے علی اصغرؑ کا ذکر ہُوا۔ تو ایک قاتل (حرملہ بن کاہل) نے کہا۔ کہ اُس دُودھ پینے بچّے کو میں نے تیر سے مارا تھا۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

زانو پہ ہات مار کے چلّایا وہ شریر
بچّہ کا کیا قصُور تھا کیوں مارا اُس کو تیر
اُس نے کہا خوشی کیلئے تیری۔ اے امیر
حاضر ہے سر بھی ہاتھوں میں اشک بھر آئے شیر
بولا یزید عذر و سماجت کرُونگا میں
لا۔ بے خطا کے سر کی زیارت کرُونگا میں

جب سر علی اصغرؑ رُوبرو آیا۔ اُس موقع کی تصویر دیکھئے۔

تصویر مختصر لفظوں میں

دیکھا بہت یزید نے ششماہے کا جمال
وہ بھولی بھولی شکل وہ بکھرے جھنڈولے بال
آنکھوں کو ڈبڈبا کے[۲] کیا شمر سے مقال
پھُولوں کے ساتھ ہو گئیں کلیاں بھی پائمال
میرے تو ہوش دیکھ کے یہ سر بجا نہیں
بتلا کہیں کُڑھا تھا ترا دل بھی یا نہیں

[۱] یہ بند بھی اُسی مرثیہ میں سے ہیں۔ ع جب سکۂ زن اشرفی مہر ہُوا زر ۱۲ مؤلف بے بضاعت۔

[۲] اگر یورپ کی طرح آج ہمارا ملک بھی علوم و فنون کا قدر دان ہوتا۔ اور وہاں کے شعرا کی طرح شعرائے اردو کے الفاظ کی بھی چھان بین کی جاتی۔ تو معلوم ہوتا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے سب شعرائے اردو سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی سے نظم کئے ہیں۔ کیونکہ وقتاً ہر قسم کے ان کے مرثیوں میں ہیں۔ میرے خیال میں روزمرّۂ "آنکھوں کو ڈبڈبا کے" بھی اوّل اوّل مرزا صاحب نے باندھا ہے۔ اور اس مصرع کا نتھ اب ہی نہیں ع پھُولوں کے ساتھ ہو گئیں کلیاں بھی پائمال جس مرثیہ سے یہ بند لئے ہیں وہ بھی ابھی تک نہیں چھپا۔ میرے پاس قلمی ہے مطلع اس کا یہ ہے ع لے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۵۰) جس مضمون کو میں ذیل میں ایک مرثیہ غیر تقسیمی سے لکھنا چاہتا ہوں یہ ایک مشہور مضمون ہے۔ اور تقریب قریب اکثر شعراء نے اس کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ اور آیہ کریمہ تحت سے یہ مضمون لیا ہے [۱] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ جس کا مفہوم ظاہری یہ ہے۔ کہ اُس بارِ امانت خدا کو صرف انسان نے اُٹھایا ہے جس کے اُٹھانے سے آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ بارِ امانت سے مراد علماء نے راہ خدا میں مصیبت اُٹھانے سے لی ہے [۲]۔ حافظ شیراز فرماتے ہیں

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

آتش مرحوم فرماتے ہیں [۳]

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

کتاب کے حجم بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ تو اور بھی شعراء کے کچھ اشعار یہاں میں لکھتا۔ خیر اب مرزا صاحب مرحوم کی نظم اُس بزرگوار کے حال میں سُنئے۔ جس سے بڑھ کر روئے زمین پر کسی نے خدا کے واسطے مصیبتیں نہیں اُٹھائیں۔ مثل مشہور ہے۔ کہ حصّہ بقدر جُثّہ۔ ازبسکہ امام حسینؑ پر مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ فلہذا حضرت سب سے بڑے امانت دار خدا کے ہوئے۔ اس امانت کو مصنف ممدوح نے عشقِ خدا سے تعبیر کیا ہے۔ اور کمال یہ کیا ہے۔ کہ اسی لفظ (عشقِ خدا) سے مرثیہ شروع کیا ہے۔

مطلع

عشقِ خدا کا بار نہ کہسار سے اُٹھا افلاک سے نہ عرشِ ضیا بار سے اُٹھا

۱۔ لفظی ترجمہ اس آیت کا یہ ہو سکتا ہے کہ تحقیق کہ ہم نے امانت کو زمینوں و آسمانوں و پہاڑوں پر عرض کیا مگر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ اس لئے کہ وہ ظلوم و جہول ہے ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

۳۔ جس کو عشقِ حقیقی و عشقِ خدا اور آزمائش و امتحان و بلا بھی کہتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہ کیا۔ وہ انبیا کے خوش اطوار سے اُٹھا لیکن حسینؑ ہے کسں و بے یار سے اُٹھا
رُخ زرد۔ آدم و ملک و جن کا ہو گیا
یہ ہو گئے خدا کے خدا ان کا ہو گیا[1]

اللہ رے حسن عقل کہ عشق خدا لیا لُبِّ لُبابِ[2] چشمۂ آبِ بقا لیا
نعمت وہ لی کہ دل کی زباں نے مزا لیا تریاق زہرِ تشنگی کربلا لیا[3]
بارگراں عشق کے حامل حسینؑ ہیں
شاہد خدا ہے عاشق کامل حسینؑ ہیں

خودبیں نہیں ازل سے خدا بیں حسینؑ ہیں چشم مبیں۔ صاحب لیسیں حسینؑ ہیں
گلزار حسن کے گل رنگیں حسینؑ ہیں پر حق کے باغ عشق کے گلچیں حسینؑ ہیں

---

[1] اس موقع پر خود مصنف مرحوم نے حاشیہ پر ایک حدیث قدسی لکھی ہے جو اسلام کے دو بڑے فرقوں سُنّی و شیعہ میں متفق علیہ پائی جاتی ہے میں بھی اسکو لکھدوں جس سے اس بند کا لطف زیادہ ہو جائیگا۔ یہ بھی عطیہ حضرت ابوجعفر علیہ السلام ہیں۔ مَنْ طَلَبَنِیْ فَطَلَبْتُہٗ۔ وَمَنْ طَلَبْتُہٗ وَجَدَنِیْ وَمَنْ وَجَدَنِیْ فَعَرَفَنِیْ۔ وَمَنْ عَرَفَنِیْ فَعَشِقَنِیْ۔ وَمَنْ عَشِقَنِیْ فَعَشِقْتُہٗ۔ وَمَنْ عَشِقْتُہٗ فَقَتَلْتُہٗ۔ وَمَنْ قَتَلْتُہٗ فَاَنَا دِیَتُہٗ۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ (خدا فرماتا ہے) جو میرا طالب ہوا میں بھی اس کا طالب ہوا اور جو میرا طالب ہوا اس نے مجھے پایا اور جس نے مجھے پایا اس نے مجھے پہچانا اور جس نے مجھے پہچانا وہ مجھ پر عاشق ہوا اور جو مجھ پر عاشق ہوا میں بھی اس کا عاشق ہوا اور جس کا میں عاشق ہوا اس کو میں نے قتل کیا۔ اور جس کو میں نے قتل کیا اس کا خون بہا میں خود ہوں گویا میں نے اپنی ذات کو اس کے اختیار میں دیدیا جو اس کے معشوق کی رضا ہے وہی میری رضا ہے اس بنا پر مصنف مرحوم نے کہا ع یہ ہو گئے خدا کے خدا ان کا ہو گیا ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ بھی ایسی ہی لفظ معلوم ہوتی ہے جس کو شاید مرزا صاحب کے زمانہ تک کے شعراء متقدمین میں سے بجز ان کے کسی نے نظم نہیں کیا۔ لُبِّ لُباب یعنی مغز میں کا انتخاب کیا ہوا۔ جیسے پھول خوشبو دار ہوتا ہے اس کا عطر بنایا پھر عطر کی روح کھینچی مصنف کہتے ہیں کہ امام حسینؑ جو شیدا خدا ہو کر زندہ جاوید ہو گئے تھے مثل چشمۂ آب بقا کا لُبِّ لباب لیا جو لوگ مرزا صاحب کے کلام میں اس بنا پر کلام کرتے ہیں کہ وہ ثقیل لفظ بہت لاتے ہیں ان سے آپ میری طرف سے غلام مچھو کہ جناب اس جگہ آپ اردو یا فارسی کی دوسری لفظ لغو رما دے جس میں یہ مضمون ادا ہو اور یہ مطلب ادا ہو سکے ۱۲ مؤلف۔

[3] اس مطلع تریاق زہر تشنگی کربلا کو دیکھئے کہ اس کا لطف مختصر الفاظ شاید ملیگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

کی طاعت خدا وہ خدا کے فدائی نے

جو مان لی خدا کی خدائی۔ خدائی[۱] نے

اب یہ مسئلہ مصنف ممدوح بیان فرماتے ہیں کہ عشق خدا تو ہر ایک شخص میں پایا جاتا ہے۔ مگر درجات کا فرق ہے۔ سب سے اعلیٰ درجہ امام حسینؑ کو ملا ہے۔ کہ وہ جناب امتحان میں پورے اترے۔

ہر جزو و کل کو عشق خدا ہے بقدر حال
پر امتحان عشق کی برداشت ہے محال
وہ کیا ہے یاس و حسرت و رنج و غم و ملال
شمع مراد گل۔ گل امید پائمال
یہ بار قابل شہ عالی تبار تھا
ہوگا۔ نہ ہے۔ نہ ایسا کوئی بردبار تھا

اب مصنف اُن مصائب کی (جس میں امام حسینؑ کا امتحان ہوا) بالاجمال گویا فہرست بیان کرتے ہیں۔

مصائب کی فہرست بالاجمال

وہ بار کیا تھا ہجرت یثرب۔ سفر کا داغ
سوزش عطش کی دل میں اور اُس پر جگر کا داغ
اکبرؑ کا داغ مثل قمر۔ عمر بھر کا داغ
بھائی کا داغ شکل میں مرگ پدر کا داغ
یہ داغ کس نبیؐ نے سہے کس رسول نے
غم کے پہاڑ اٹھا لئے زہراؑ کے پھول[۲] نے
وہ بار کیا تھا دربدری اہلبیتؑ کی
بے وارثی و بے پدری اہلبیتؑ کی
بچوں کی موت نوحہ گری اہلبیتؑ کی
درباروں میں برہنہ سری اہلبیتؑ کی

۱؎ خدا اور خدائی میں دو لفظوں کی تکرار سے بطلافت ادا کی ہے خدا کے فدائی نے اپنے خدا کی عبادت کی کہ خدا کی خدائی (معبودیت) کو تمام خدائی یعنی مخلوقات نے مان لیا۔ ایک لفظ خدائی کو دو معنی پر ایک ہی مصرع میں لانے سے الفاظ مضمون بن گئے ہیں۔ ۱۲ مؤلف۔

۲؎ یہ بار کا خیال شاعر کے خیال میں نہیں آتی ہے سہل ممتنع ایسی نظم کو کہتے ہیں جیسے یہ شعر ہے حق تو یہ ہے کہ کلام کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے اس کے بیان کے لئے زبان مجبور ہے اگر دل کو فطرتاً ایک علیحدہ زبان ہوتی تو شاید اس کی خوبی و کمال کو بیان کر سکتا آیہ کریمہ کو پیش نظر رکھ کر دیکھا تو معلوم ہوگا کہ اس بار کے اٹھانے سے زمینوں و آسمانوں نے انکار کیا اور انسان ضعیف نے اس کو اٹھا لیا تو یہی عظیم الشان بار آسمان کے مقابلہ میں انسان ضعیف ایک پھول کی سی ہے اور دو بار عظیم پہاڑ میں یہ غم کے پہاڑ اٹھا لئے زہرا کے پھول نے یہ مضمون بعینہ اسی مصرع میں ہے گو بظاہر تو معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔

گریاں سکینہؑ شاہِ مدینہ کے واسطے
تسکینؑ کو طمانچے سکینہ کے واسطے

(امام حسینؑ کی کارگذاری)

ہمت یہ کی حسینؑ نے اُمت کے واسطے — سر پر لیا یہ بارِ شفاعت کے واسطے
باندھا کمر کو چُست شہادت کے واسطے — سب کچھ کیا مُحِبّوں کی راحت کے واسطے
غربت میں ننھے بچّوں سے آ کر بچھڑ گئے
اُمت کو عافیت دی۔ خود آفت میں پڑ گئے[1]

یہ بار جب پسندِ شہِ کربلاؑ ہُوا — ارشادِ ذوالجلال کا یہ برملا ہُوا
احسنت اے حسینؑ بہت خوش خدا ہُوا — پر خُون کی دیت میں بھی سب کچھ عطا ہُوا
ہر شے پہ اختیار ہمیشہ رہا ترا
تو فدیۂ خُدا ہے۔ خدا خُوں بہا[2] ترا

[1] عافیت اور آفت دو لفظوں کے ایک مصرع میں آنے سے جان پڑ گئی ہے۔ جو دونوں الفاظ ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ مگر معنی ہر گُم یا متضاد ہیں۔ صنائع ایسی سلاست سے نظم ہوں جب قابلِ تعریف ہیں۔ ۱۲ مؤلّف حقیر۔

[2] حدیثِ قدسی جو اُوپر میں لکھ چکا ہوں۔ وہ اس موقع پر پھر پڑھ جانا چاہئے خصوصاً یہ فقرہ "فانا دِیَۃٌ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ میں خود اُس بندۂ مظلوم و مقتول کا خُون بہا ہوں۔ اسی کا مضمون اس ٹیپ میں نظم ہے۔

نوٹ:۔ یہ چار اُس نمونے اس مقام پر میں نے لکھ دئے ہیں علاوہ اس کے اکثر کلام جابجا متفرق درج ہے مسلسل کلام جس صاحب کو دیکھنا ہو۔ وہ اس کتاب کی جلد ثانی ملاحظہ فرمائیں جو انشاء اللہ تعالیٰ کے بعد چھپیگی بالکل طیار لکھی ہوئی ہے۔ یا اصل بیس جلدیں دفترِ ماتم کی جو لکھنؤ چوک۔ میر عبد الحسین صاحب تاجرِ کتب سے دس۱۰ روپیہ میں ملتی ہیں منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔ سب لوگوں کی آسانی کے خیال سے میں نے جابجا مرثیوں کے مطلع لکھ دیا ہے۔ کہ مرثیہ کس جلد میں چھپا ہے۔ اب اصل مرثیے اُنہی جلدوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ جو انتخاب کلام غیر مطبوعہ غیر تقسیمی کا میں نے لکھ لیا ہے وہ اُن جلدوں میں نہیں ملیگا۔ بلکہ انشاء اللہ وہ کلام حیاتِ دبیر جلد ثانی میں آپ کے ملاحظہ سے گذریگا۔ ۱۲ مؤلّف حقیر۔

ناظرین حق بین!! اچھا اب مَیں اُن چیزوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو مرثیہ میں جناب مرزا مرحوم نے ایجاد فرمائی ہیں۔

باب نہم۔ ایجادات دبیر رح

فصل ۱

یہ بات اس کتاب کے دیکھنے والے سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ مرزا صاحب نے تخمیناً بارہ برس کی عمر میں مرثیہ پڑھنا اور کہنا شروع کیا۔ ۱۲۱۸ھ کی اُن کی پیدائش تھی ۱۲۳۰ھ میں تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ تین چار برس میں مرزا صاحب کو لکھنؤ میں شہرت ہو گئی۔ کہ مجالس عزا کا بہت چرچا تھا۔ تصنیف کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۳۵ھ ہجری میں غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب ملا۔ ادھر بادشاہ اودھ کا سکّہ پڑا۔ ادھر دلوں پر اس شاہ نظم کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اُس زمانہ میں جو مرثیہ گو شاعر تھے۔ اُن میں سے ضمیر۔ خلیق۔ دلگیر۔ فصیح اُستاد مانے جاتے تھے۔ پس مرزا صاحب کے پُرانے مرثیوں کو اُن بزرگواروں کے مرثیوں سے ملانے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے بہت سی باتوں میں ایجاد و اختراع کی ان چاروں مرثیہ گو شاعروں کی موجودگی میں ہی ملک نے مرزا صاحب کو مستند مرثیہ گو مان لیا تھا۔ جیسا کہ میں اُوپر فسانۂ عجائب کی عبارت سے (جو عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر میں کئی برس کی محنت شاقہ کے بعد مسجّع و مقفّے عبارت میں لکھا گیا) ثابت کر چکا ہوں۔ میر انیس صاحب جو آج مرزا صاحب کے مدمقابل سمجھے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کی شاعری و شہرت کے عرصہ دراز ۲۵ یا ۳۰ سال کے بعد عہد امجد علی شاہ میں فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ اُس زمانہ تک مرزا صاحب کو اس قدر مقبولیت ہو چکی تھی۔ کہ شاہزادوں اور شاہزادیوں اور شرفا و اہل علم میں سے ہزاروں ان کے شاگرد تھے۔ شاگردوں کے شاگرد بھی نظر آتے ہیں چنانچہ

مرزا صاحب کی شہرت کا زمانہ

تذکرہ سراپا سخن میں صفحہ ۴۳ پر شاہزادہ مالکو بہ قیصر (شاہزادہ دہلی) کو شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم کا شاگرد لکھا ہے۔ جناب ناسخ مرحوم اور حضرت آتش مغفور کے شاگردوں میں بھی جو صاحب مرثیہ کہنا چاہتے تھے۔ وہ اُن بزرگواروں کے حکم و ارشاد سے مرثیہ اپنا مرزا صاحب کو دکھاتے تھے۔ چنانچہ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم شاگرد ناسخ مرحوم اور مولوی بہادر حسین صاحب و حید تلمیذ آتش مغفور اور بہت سے بزرگوار ایسے نظر آتے ہیں۔ اسی خیال سے مَیں نے ایک مستقل باب میں تلامذۂ مرزا صاحب کے حالات لوگوں سے دریافت کر کے لکھے ہیں +

اس تمام تمہید سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ جو باتیں میر ضمیر و میر خلیق و منشی دلگیر و مرزا فصیح مرحومین کے کلام میں نظر نہیں آتیں۔ اور دبیرؒ و انیسؒ کے کلام میں موجود ہیں۔ اُن کا شرف ایجاد و اختراع غالباً مرزا صاحب کو حاصل ہے۔ خصوصاً ایسے مرثیوں میں جو میری تحقیق کے موافق عہد امجد علی شاہ سے پہلے مرزا صاحب کہہ چکے ہیں۔ مگر یہ امر میرے اکثر احباب کو جو میر صاحب کے شاگرد یا طرفدار ہیں سخت ناگوار ہوگا۔ اور وہ غالباً اس بات کو مشکل سے قبول فرمائینگے۔ کہ یہ مرثئے عہد امجد علی شاہ سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ اس خیال سے اور نیز اس خیال سے کہ شاید کوئی بات اِدھر مرزا صاحب نے لکھنؤ میں اُدھر میر صاحب نے فیض آباد میں ایجاد کی ہو۔ اور ایک کو دُوسرے کی ایجاد و اختراع کی خبر نہ ہو[۵۲]۔ مَیں ایسے ایجادوں میں (جو میر صاحب و مرزا صاحب کے یہاں نظر آتے ہیں) (میر و مرزا) دونوں بزرگواروں کو

---

۵۱ کتاب سراپا سخن عہد امجد علی شاہ میں شروع اور عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ختم ہوئی۔ اور جناب میر انیسؒ مرحوم کے لکھنؤ میں آنے اور شہرت پانے کا بھی یہی زمانہ ہے۔ اس زمانے میں میر صاحب مرحوم لکھنؤ میں آ چکے تھے۔ مگر سراپا سخن میں اُن کا کلام و نام نہیں ہے حالانکہ اُن کے والد ماجد اور بھائیوں کا نام و کلام ہے۔ اُس وقت مرزا صاحب مرحوم کو اس قدر مقبولیت ہو چکی تھی کہ اُن کے شاگردوں کے شاگرد ایسے ایسے ذی علم صاحب کمال شاہزادے نظر آتے ہیں جیسے شاہزادہ مالکو بہ قیصر مرحوم + مؤلف حقیر۔

۵۲ کیونکہ میر صاحب لکھنؤ میں آنے سے پہلے فیض آباد میں مرثیہ کہتے ہونگے۔ مشہور نہ ہونا دُوسری بات ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شریک قرار دیتا ہوں۔ اور ایسے ایجادوں کو اس باب میں بیان نہیں کرتا۔ اگر زندہ رہا۔ اور یہ کتاب دوبارہ چھپی۔ تو میں ایک ایسا باب بڑھا دونگا۔ جس سے وہ تمام ایجادات و اختراعات معلوم ہوں۔ جو میر و مرزا کے قبل نہ تھیں۔ اور انہیں کے کلام میں ہیں۔

اس موقع پر صرف وہ ایجادات بیان کرتا ہوں۔ جن کے موجد یقیناً مرزا صاحب ہیں۔ اور جو چیزیں میرے علم میں میر صاحب کے کلام میں نہیں ہیں۔ اور ان ایجادوں کو میں چند نمبروں میں لکھتا ہوں:-

ابتدا میں حمد و نعت

(۱) مرثیہ کو حمد و نعت و منقبت سے شروع کیا۔ اور بادشاہ و مجتہدین عصر کی بھی مدح فرمائی۔ یہ مرثیہ بہت مشہور ہے۔ اور دفتر ماتم کی جلد اوّل میں سب سے اوّل چھپا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے۔

چہاردہ معصومین کے حال میں علیحدہ مرثیے

(۲) چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حال میں علیحدہ علیحدہ مرثیے کہے۔ چنانچہ دفتر ماتم کی چودہ جلدوں میں یہ ترتیب مبارک ہے۔ کہ ہر جلد ایک معصومؑ کے حال کے مرثیہ سے شروع ہوتی ہے۔ ان مرثیوں کی تصنیف کی نسبت استاذی حضرت اوج مدظلہ فرماتے تھے۔ کہ نواب نادر مرزا صاحب فیض آبادی* نے مرزا صاحب کو فیض آباد میں زمانہ شاہی اودھ میں بلوایا تھا۔ (یہ بزرگ خاندان امرائے نیشاپور کے ایک معزز ممبر تھے۔ جو دو ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے۔ خود بھی اعلےٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزل میں جناب آتش مرحوم کے اور مرثیہ میں جناب مرزا صاحب مغفور کے شاگرد تھے) اور عرض کی تھی۔ کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مختصر مرثئے کہدیجئے۔ کہ ہر معصوم کی وفات کے دن میں مجلس کیا کرتا ہوں۔ پڑھا کرونگا۔ مرزا صاحب فیض آباد سے جب چلے ہیں۔ تو اُن کے چند نوکر ہمرکاب آئے تھے۔ مرزا صاحب پالکی میں آئے تھے۔ راستہ میں

* پروفیسر جناب آزاد مرحوم نے کتاب حیات کے صفحہ ۴۱۲ پر تلامذہ آتش مغفور کے ذکر میں ان کا نام لکھا ہے۔ اور نامور شاگرد لکھ کر لکھا ہے۔ کہ مرتبہ اُستادی رکھتے تھے۔ مؤلف حقیر۔

یہ تمام مرثئے کہتے آئے تھے لکھنؤ آکر جب اُن کے ملازم رخصت ہوئے۔ تو وہ تمام مرثئے مرزا صاحب نے اُن کے ہاتھ نواب صاحب کو بھجوا دئے۔ ازبسکہ یہ مرثئے روا روی میں بہت جلد و مختصر کہے تھے۔ مرزا صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ طولانی اور کہونگا۔[۱] چنانچہ امام موسیٰ کاظمؑ کے حال میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا۔ جو حسبِ وصیّت محفوظ ہے مگر چند مرتبہ خود اُن مرحوم نے پڑھا تھا اُس کی یہ ایک ٹیپ بہت مشہور و مقبول ہے۔ جس کو مرزا عبد التقی مرحوم نے بھی اپنی کتاب اخسا[۲] میں لکھا ہے۔

(امام موسیٰ کاظمؑ کے باب میں کہتے ہیں)

حضرتؑ پر انتہائے اسیری گذر گئی — زندان میں جوانی و پیری گذر گئی

(۳) حال ولادت جناب امیرؑ و جناب امام حسینؑ میں تو اور بھی معاصرین مرزا صاحب کے مرثئے ہیں۔ مگر حال ولادت جناب عباسؑ میں مرزا صاحب نے مرثیہ فرمایا جس کا مطلع مشہور یہ ہے۔ ع انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں عباسؑ[۳] اور حال ولادت جناب علی اکبرؑ میں یہ مرثیہ فرمایا۔ ع جب رونق مرقع کون و مکاں ہوئی[۴] +

[حاشیہ: مرثیے میں حال ولادت]

(۴) جناب امیرؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ کی شادی کا حال مرثیہ میں نظم فرمایا جس کا مطلع

[حاشیہ: مرثیہ میں حال شادی]

---

[۱] پنجتن پاکؑ کے حالات میں اُس کے بعد چند مرثئے کہے۔ جو دفتر ماتم میں چھپے ہیں۔ باقی ائمۂ اطہارؑ کے حالات میں پھر شاید مرثئے کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف امام موسیٰ کاظمؑ کے حال میں مرثیہ فرمایا۔ جو نہ تقسیم ہوا ہے نہ چھپا ہے۔ اور ایک لاجواب مرثیہ سُنا جاتا ہے +

[۲] اخسا مناظرہ کی ایک مشہور و مقبول کتاب ہے۔ جو مرزا عبد التقی صاحب مہتمم رسالہ "روشنی" نے لکھی ہے۔ یہ مرحوم بھی ہمارے استاد بھائی اور عنایت فرما تھے۔ نہایت ذکی و ذہین تھے جن کی جھلک روشنی کے پرچوں میں ہے + ۱۲ مؤلف ہیچدان۔

[۳] جلد سوم میں (دفتر ماتم کی) یہ مرثیہ (انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں عباسؑ) چھپ چکا ہے +

[۴] یہ مرثیہ جب رونق مرقع (الخ) جلد اول دفتر ماتم میں چھپا ہے +

مشہور یہ ہے۔ ؎ جب فاطمہؑ سے عقد شہ لافتےٰ ہوا[1] اسی طرح حال عقد جناب امیرؑ جو حمیدہ ام البنین سے ہوا تھا۔ مرثیہ مذکورہ (؎ انجیل مسیحؑ لب شبیرؑ ہیں عباسؑ) میں نظم فرمایا۔ اور حضرت عباسؑ کے عقد کا حال اس مرثیہ میں نظم کیا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ جب اختر یعقوب پہ کی مہر خدا نے[2] میرزا صاحب کا کمال قابل داد ہے۔ کہ حال ولادت یا حال شادی وغیرہ میں ہر مقام پر مرثیت کے پہلو نکالتے گئے ہیں۔ اور گویا ثابت کرتے گئے ہیں۔ کہ دنیا میں شادی وغم توام ہے +

فصل ۲ مرثیہ میں مناظرہ

(۵) مرزا صاحب کے زمانے میں ایک شخص نے بڑی شدومد سے تعزیہ داری کا رد لکھا تھا۔ مرزا صاحب نے اُن کے رد میں ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎ اے شمع قلم انجمن افروز رقم ہو[3]۔ اور اس ایجاد کے ذریعہ سے فن مناظرہ کو بھی گویا مرثیہ میں داخل کر دیا۔ اس میں بھی یہی کمال کیا ہے۔ کہ مرثیت کو قائم رکھا ہے +

(۶) مرزا صاحب کے عہد میں ترکوں نے کربلائے معلےٰ میں قتل عام کیا تھا جس میں بعض علمائے اسلام بھی شہید ہو گئے تھے۔ ازبسکہ علما کا قتل بالخصوص اہل علم کے دلوں پر بہت صدمہ پہنچاتا ہے۔ اسی عالم غم و رنج میں مرزا صاحب نے بھی (کہ اہل علم میں سے تھے) ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر[4] یہاں رومیوں سے وہی رومی مراد تھے جنہوں نے روضۂ اقدس میں یہ ظلم کیا تھا۔ عام رومی مراد نہیں ہو سکتے۔ کہ جو شریک ظلم نہ تھے۔ (عام رومیوں کو مرزا صاحب کب ظالم کہہ سکتے

[1] یہ مرثیہ "جب فاطمہؑ سے عقد" الخ دفتر ماتم کی چودھویں جلد میں چھپا ہے +

[2] "جب اختر یعقوبؑ" الخ۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی نویں جلد میں چھپا ہے +

[3] "اے شمع قلم انجمن" الخ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپا ہے +

[4] اے قہر خدا" الخ۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی بارھویں جلد میں ہے +

تھے کیونکہ اُن میں تو اہلِ انصاف و اہلِ ایمان و اہلِ درد بھی تھے) اس مرثیہ میں بھی مرثیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور جو جو واقعات اُن کو معلوم ہوتے تھے نظم کر دئے +

ایک مرثیہ بطور حالات تاریخی

(۷) بطور حالاتِ تاریخی ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ سہ فہرست یہ شبیرؑ کے لشکر کی رقم ہے [۱]۔ اس مرثیہ میں جناب علی اکبرؑ کی عمر کی نسبت لکھا ہے۔ کہ بعض مؤرخوں نے پچیس (۲۵) سال کی بھی عمر لکھی ہے۔ مگر مشہور اٹھارہ (۱۸) سال ہے پچیس سال کی عمر پر بہت لوگوں نے کان کھڑے کئے تھے۔ مگر علما نے مرزا صاحب کی تائید کی۔ اُس زمانے میں کتابیں نہ عام طور پر ملتی تھیں۔ نہ ایسے فارسی و اُردو میں ترجمے ہوئے تھے۔ اب تو علامہ ابن شہر آشوبؒ مازندرانی کی کتاب مناقب بھی بمبئی میں چھپ کر مشتہر ہو چکی ہے۔ جس میں جناب علی اکبرؑ کی عمر کی نسبت دونوں روایتیں موجود ہیں۔ اس تحریر سے غرض یہ ہے۔ کہ بہت سی باتیں جو عربی کی نایاب و کمیاب کتابوں میں مقفل و محفوظ تھیں۔ مرزا صاحب کے اُردو مرثیوں کی بدولت ہندوستان میں مشہور ہوئیں +

حضرت زینبؑ کی زبانی امام حسینؑ کی کہانی

(۸) مرثیوں میں طرزِ بیان کے ہزار ہا نئے نئے پہلو نکالے۔ چنانچہ دو مرثیوں میں (یکے بعد دیگرے) قید خانہ شام میں جناب سکینہؑ کے سو جانے کے لئے جناب زینبؑ کا کہانی کہنا بیان کیا ہے۔ اور وہ کہانی خود امام حسینؑ کی ہے۔ ایک مرثیہ کا یہ مطلع ہے سہ جب کہ زنداں میں نبیؐ زادیوں کو رات ہوئی [۲]۔ دوسرے کا یہ مطلع ہے سہ جس دم اسیر عترت مشکل کشا ہوئی [۳]۔ مرثیۂ اول الذکر حسبِ زبان اس کی سلیس و فصیح اور بیان دلکش زیادہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا

---

[۱] فہرست یہ الخ۔ یہ مرثیہ دفترِ ماتم کی تیسری جلد میں مطبوع ہوا ہے +

[۲] یہ مرثیہ جب کہ زنداں میں الخ دفترِ ماتم کی چھٹی جلد میں چھپا ہے +

[۳] یہ مرثیہ جس دم اسیر عترت الخ دفترِ ماتم کی آٹھویں جلد میں چھپا ہے +

کوئی بی بی کہانی کہہ رہی ہیں +

(۹) بہت سی روایتیں نظم کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تواریخ و سیر و مقاتل وغیرہ کی کتابیں کثرت سے مرزا صاحب نے دیکھی تھیں چنانچہ یہ مرثیہ "جب رن میں بعد فتح عدو ایک شب[۱] رہے" ایسا سلیس و فصیح ہے اور کربلا کے میدان وحشت ناک کا ایسا سماں دکھایا ہے۔ جس کو سن کر آدمی محو حیرت ہو جاتا ہے۔ روایت یہ نظم کی ہے۔ کہ ایک نصرانیہ تاجرہ کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت کے دو تین روز بعد آنکلی ہے۔ اُس نے لاشوں کو دیکھا ہے۔ جب اس عورت نے علی اصغرؑ کی لاش دیکھی ہے۔ اُس موقع پہ کہتے ہیں ؎

لب پر انگوٹھا منہ سے تبسّم ہے آشکار + گویا پکارا چاہتا ہے ماں کو شیر خوار

جب دریا کے کنارے پر جناب عباسؑ کی لاش دیکھی ہے۔ تو کہتے ہیں ؎

مشکیزہ سوکھا ننھّا سا سینے پہ برقرار گویا ہُوا ہے داغ کلیجہ کا آشکار

اسی طرح ایک دوسرے مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ "واجب ہے شش جہت پہ تولا[۲] ئے پنجتن" ایک دیندار باہمت عاشق حسینؑ کی حکایت نظم کی ہے۔ کہ جس نے اس عزم بالجزم پر کمر ہمت چُست باندھی تھی۔ کہ سر امام حسینؑ شام سے لاکر نجف میں دفن کر دیگا۔ مگر یہ شخص مفلس تھا۔ اس کی ناداری کو مرزا صاحب ایک نئے طرز سے بیان فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎ نادار اس قدر تھا کہ تھے اقربا بھی کم۔ سچ ہے۔ امیر آدمی کے سو عزیز بن جاتے ہیں۔ غریب کے عزیز قریب بھی رشتہ داری سے انکار کر جاتے ہیں۔ المختصر یہ شخص شام میں پہنچا۔ یزید کا نوکر و مقرّب ہُوا۔ اور آخر کار اُس کنوئیں کا محافظ (پاسبان) ہوگیا۔ جس میں سر امام حسینؑ مقید تھا

[۱] دفتر ماتم کی جلد دوم میں یہ مرثیہ چھپا ہے ؎ جب رن میں بعد فتح الخ +

[۲] واجب ہے شش جہت پہ الخ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی دسویں جلد میں چھپا ہے +

اور ایک بات وہ سر کنوئیں سے نکال لیا۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔ ؎

ہات اپنا دھو کے ابروُ جاں سے ایک بات اُس چاہ سے نکالا سرِ شاہ نیک ذات
بے آبرُو زمیں میں ہوا چشمۂ حیات اور آبرُو دے ہر دو جہاں آئی اُس کے ہات
سر ابنِ فاطمہؓ کا کنوئیں سے جُدا ہوا
نورِ خدا کا شعلہ دُھوئیں سے جُدا ہوا

(لطفِ تشبیہات)

نکلی دہن سے شیشے کے نکہت گلاب کی یا چاہ مشرقی سے کرن آفتاب کی
یا آب و تابِ دُرج سے دُرِّ خوش آب کی یا نافۂ بہشت سے بو مشکِ ناب کی
ذرّوں نے مہر سے کہا ماہی نے ماہ سے
شمع نبیؐ جُدا ہوئی فانوسِ چاہ سے

پھر آگے جاکر لکھا ہے۔ کہ یہ باہمّت سرِ امام حسینؓ لایا جاتا تھا۔ کہ رستہ میں وہاں آکر اُترا۔ جہاں ایک تاجرہ عیسائی مع اپنی چالیس لونڈیوں کے فروکش تھی۔ اُس نے اوّل حضرت عیسٰےؑ کو خواب میں دیکھا۔ پھر سرِ امام حسینؓ دیکھ کر مسلمان ہوئی۔ یہ تمام مرثیہ نہایت سلیس و فصیح ہے۔ ہر واقعہ کی تصویر کھینچ کر دکھائی ہے۔ ہر موقع پر آمد معلوم ہوتی ہے۔ اورد کا گویا کہیں نام نہیں ہے۔ واقعات کی تصویریں دیکھنا ہو۔ تو ناظرین اس مرثیہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دو مرثئے بطور نمونہ میں نے لکھے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مرثئے ہیں۔ جن میں بہت سی روایات نظم کی ہیں۔ پس کسی واقعہ کے نظم کرنے والے شاعر کو جو کلام دبیر سے مدد ملتی ہے۔ دُوسرے کسی شاعر کے کلام سے نہیں مل سکتی۔ اور مختلف روایتوں کے نظم کرنے کے سبب سے جس کثرت سے الفاظ دبیرؒ نے نظم کئے ہیں۔ دُوسرے کسی شاعر نے نہیں[1] کئے ۔

[1] چنانچہ حالِ شہادت محمدؐ بن عباس علمدار میں مرزا صاحب کا مرثیہ ہے۔ جس کا یہ مطلع ہے ؎ عباس علی رونقِ سلطانِ عرب ہے

(۱۰) پانی اور آگ کا مناظرہ عجیب عمدہ پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ اور ان دونوں عنصروں کے سبب سے جو ظلم اہلبیتؑ پر ہوئے۔ اُن کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع ہے ع آتش سے سبب دشمنی آب کا کیا ہے[۲]

(۱۱) امام حسینؑ کے قتل کے بعد ہی اُن مسلمانوں نے جو دل سے آل محمدؐ کے دوست تھے قاتلانِ امام حسینؑ کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ طوفان انتقام پانچ چھ برس تک اُٹھتا رہا۔ جس سے یزید وغیرہ بنی اُمیہ کی سلطنت کو بہت صدمہ پہنچا۔ ان بدلہ لینے والوں میں سے مسیب و سلیمان صرد وغیرہ کئی صحابی مقبول تھے۔ اور بعض اصحاب علی و حسنین علیہم السلام سے تھے۔ سب سے زیادہ جس دلیر جاں باز کو کامیابی ہوئی۔ وہ مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی ہیں۔ جنہوں نے ۶۶ھ کے قریب قریب ایک لشکر فراہم کر کے ابراہیمؑ ابن مالک اشتر کو سپہ سالار فوج بنا کر قریباً تمام قاتلان حسینؑ و اصحاب حسینؑ کو قتل کیا۔ اور خوب ہی بدلا لیا۔ اس حال میں بھی مرزا صاحب نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ کہ ع جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی۔ از بسکہ اس حال میں یہی ایک مرثیہ کہا گیا تھا۔ اور مرزا صاحب نے سخت محنت و کوشش سے کہا تھا۔ تمام مرثیہ لاجواب ہے۔ مرزا صاحب سے اکثر شاگردوں اور دوستوں نے مانگا۔ مگر انہوں نے نہ دیا۔ اب شاگردوں نے یہ تدبیر کی

حال مختار منتقم خون حسینؑ کا

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) جلد ششم دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ اس حال میں ایک مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے ع جب خضر خالق عالم ہوئی پیدا۔ ہاشمی کے ساتھ ایک شخص ہاشمی نے اپنی دختر کی شادی چاہی تھی جس کا مطلع ہے ع جب دن مرقع کون و مکان ہوئی۔ یہ جلد اوّل دفتر ماتم میں ہے۔ تیرھویں ... مرثیہ مرزا صاحب نے کہا تھا ایک لاجواب مرثیہ ہے۔ راہ شام میں ایک راہب امام حسینؑ کا سر دیکھ کر مسلمان ہوا اس حال کو بھی مرثیہ کے آخیر میں نظم کیا ہے جس کا مطلع ع آتش سے سبب دشمنی آب ہے۔ قبل مسلمان ... یزید کے دربار میں حاضر تھا اور سر امام حسینؑ و اہلبیتؑ کو دیکھ کر یزید کو ... مسلمان ہو کر شہید ہوا اس کا حال اس مرثیہ میں نظم کیا ہے ع دختر کا ... گم کیا۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپا ہے۔ راہ شام میں جناب زینبؑ سے ایک عورت نے ملاقات کی جس نے اپنی دختر کا نام زینب رکھا تھا اس مرثیہ کا یہ مطلع ہے ع فلک نے کار قضا جب سے انصرام کیا۔ مختصر یہ کہ کس کثرت سے مرزا صاحب نے روایات نظم فرمائی ہیں کسی مرثیہ گو نے نہیں نظم کیں ۱۲ مؤلف۔

[۲] مرثیہ آتش سے سبب دشمنی آب جلد سوم دفتر ماتم میں چھپا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

کہ جا بجا سے چند بند یاد کر لئے۔ اور ایک شخص نے اور بند کہکر جا بجا لگا لئے۔ اور وہ پہنچاتی مرثیہ لوگوں میں اس مطلع سے تقسیم ہوا ؎ جب نخل انتقام میں تیغوں کے پھل لگے۔ اس کارستانی کی مرزا صاحب کو بھی خبر ہوئی۔ انہوں نے جو بند نکل گئے تھے۔ اُن کے عوض اور بند کہے۔ جو پہلے بندوں سے بھی زیادہ چست ہیں۔ اکثر مرزا صاحب کے شاگردوں کا یہ خیال ہے۔ کہ مرزا صاحب کے اور تمام مرثئے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ایک طرف اور یہ ایک مرثیہ ایک طرف ہے۔ مَیں نے بھی اس کے چند بند جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ سے ایک مجلس میں (جو صفر ۱۳۲۳ھ میں بمقام لکھنؤ حسین آباد۔ رئیس منزل ہوئی تھی) سُنے۔ میرا خیال بھی یہ ہے۔ کہ اگرچہ تمام مرثیوں کے برابر نہیں۔ تو ایک چوتھائی تصنیف کے برابر ضرور یہ ایک مرثیہ ہے۔ از بسکہ جناب اوج مدظلہ نے بھی ایک مرثیہ حال مختار میں کہا ہے۔ مَیں نے جناب ممدوح سے عرض کیا۔ کہ اب جناب مرحوم والا مرثیہ تقسیم فرما دیجے۔ کہ آن کے زیادہ کمالات کا ملک میں اظہار ہو۔ فرمایا کہ وصیت جناب مرحوم کی مانع ہے۔ میرا مصنفہ مرثیہ تو چاہے۔ تو میں تجھ کو دے سکتا ہوں + المختصر اس حال میں بھی پہلے پہل مرثیہ کہنے کا فخر جناب مرحوم کو حاصل ہے +

(۱۲) اصحاب امام حسینؑ میں سے صرف حضرت حُرؑ ریاحی کے حال میں عام طور پر مرثیہ گویوں نے مرثیہ کہے ہیں۔ مگر حضرت حر کا سراپا پہلے پہل مرزا صاحب نے فرمایا۔ چنانچہ خود وہ اس دعوے کو نظم فرما گئے ہیں ؎

اب تک کسی نے حر کا سراپا نہیں کہا ۔ گنجینہ فیض سے ہے خدا کا بھرا ہوا
مضمون میرے حصہ کا یہ تھا دھرا ہوا

علاوہ اس ایجاد کے حالات حبیب ابن مظاہر اسدی و زہیر ابن قین بجلی و وہب بن عبداللہ کلبی میں کہ یہ سب بزرگوار امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہوئے مرزا صاحب نے مستقل مرثئے کہے اور عام طور پر مشتہر ہوئے۔ اور چھپے[۱]۔ مگر خود مرزا صاحب نے حبیب ابن مظاہر کے

---

[۱] حال حبیب ابن مظاہر کے مرثیہ کا یہ مطلع اوّل ہے ؎ معروف تخمہ شت شہنشاہ نظم ہے۔ دوم ماتم کی چھٹی جلد

مرثیہ میں فرمایا ہے۔ کہ یہ ایجاد اُن کے اُستاد حضرت ضمیر مرحوم کی ہے۔ البتہ روایت جو اس حال میں نظم کی ہے۔ اُس کا میں موجد ہُوں*

مصلح بحور مرثیہ

(۱۲) میر ضمیر (مرحوم) کے زمانے سے پہلے عموماً چھوٹے چھوٹے بنیہ مرثئے کہے جاتے تھے۔ اور اکثر مرثیہ گو اپنے مرثئے سوزخوانوں سے پڑھواتے تھے۔ بعض خود بھی پڑھتے تھے تو بتاتے نہ تھے۔ میر ضمیر صاحب نے منبر پر ہاتھ اور اشارات چشم و ابرُو سے بتانا شروع کیا۔ اور مرثیہ میں سراپا۔ لڑائی۔ رجز وغیرہ بڑھایا۔ اور عموماً مرثیوں کو ان چار بحروں میں کہا۔ رمل۔ ہزج۔ مضارع۔ مجتث[۱] کیونکہ مختلف راگوں کے سبب سے مختلف بحروں میں مرثئے زیادہ تر سوزخواں ہی کہواتے تھے۔ اب گویا وہ ضرورت باقی نہ رہی۔ کہ میر ضمیر صاحب اپنا مرثیہ خود پڑھتے تھے۔ اُس زمانہ کے سوزخواں یا شعراے سابق مسکین۔ سودا۔ احسان۔ افسردہ وغیرہ کے مرثئے پڑھتے تھے۔ یا خلیق و دلگیر مرحوم کے۔ ان چار بحروں کے خاص کر لینے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی۔ کہ تحت لفظ پڑھنے میں جس قدر ان بحروں میں رنگ ہوتا ہے۔ دُوسرے بحروں میں نہیں ہوتا۔ دُوسرے اکثر ایسے شاگرد بھی مرثیہ کہتے تھے۔ جو علم عروض سے ناواقف ہوتے تھے۔ اور ان بحروں میں وہ شخص جو بالطبع موزوں ہو بغیر علم عروض پڑھے ہُوئے بھی مرثیہ کہ سکتا ہے۔ دُوسرے بحروں میں یہ بات مشکل ہے۔ اب جبکہ مرزا صاحب کی شہرت کمال ہُوئی۔ اور سوزخواں پُرانے مرثیہ پڑھتے پڑھتے

(بقیہ نوٹ نمبر ۱) میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ اور حال زہیر بن قین بجلی میں یہ مرثیہ ہے سہ جب نقش کُن سے زینت لوح بقا ہوئی۔ دفتر ماتم کی گیارھویں جلد میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ اور حال وہب بن عبداللہ میں یہ مرثیہ ہے سہ مونس بیکس و بے یار ہے مظلوم حسین۔ دفتر ماتم کی پانچویں جلد میں ہے ۱۲+ مؤلف حقیر۔

[۱] بحر رمل سہ جب ہُوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر۔ بحر مجتث سہ روانہ نہیں کہ جو شیر خوار ہُوا۔ بحر ہزج سہ الٰہی دبۂ نظم دو عالم کو ملادے۔ بحر مضارع سہ فولاد کی ضریح میں کس کا مزار ہے ۱۲+ مؤلف حقیر۔

اکتا گئے۔ تو انہوں نے مرزا صاحب کو آگھیرا۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے اُتار چڑھاؤ کے لحاظ سے مختلف بحروں میں مرثیہ چاہے۔ مرزا صاحب ایک تو قدرتی شاعر۔ دوسرے علم عروض سے بخوبی ماہر تھے (چنانچہ وہ خود اس کا فخریہ اشارہ ایک مرثیہ میں کرتے ہیں ؎ ہر بحر میں ہے بحر طبیعت کی روانی) اس لئے مختلف بحروں میں بھی سوز خوانوں کو مرثیہ کہہ دئے۔ چنانچہ چار معروف بحروں کے علاوہ حسب ذیل مرثیے مختلف بحروں میں (مرزا صاحب کے) ہیں:۔

مختلف بحور مرثیہ

نمبر شمار	مطلع مرثیہ	نمبر جلد دفتر ماتم کا جس میں یہ مرثیہ چھپا ہے
۱	روز و شب [illegible] ہے	جلد [illegible]
۲	عزیزو آج [illegible] ہے ماہ محرم کی	ایضاً
۳	جب سے میدان میں تنہا حسینؑ	جلد چہارم
۴	جعفر صادقؑ کا رتبہ ضمن میں مشہور ہے	جلد ہشتم
۵	جب شب عاشور سے نور سحر پیدا ہوا	ایضاً
۶	جب اہلبیتؑ آئے لاشوں پہ اقربا کے	ایضاً
۷	جب صف آرائی کی میدان میں سپاہ شام نے	جلد ۱۲ دوازدہم

مسدس نگاری ابتدائے سکندر و سودا

۱۔ سکندر و سودا کے وقت میں مرثیہ عموماً مربع (چو مصرع) کہے جاتے تھے۔ پہلے پہل سکندر نے یہ مسدس مرثیہ کہا ؎ ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول۔ اور سودا نے بھی ایک مسدس مرثیہ نہ معلوم اس سے قبل یا بعد کہا۔ ضمیر و خلیق و فصیح و دلگیر کے مرثئے عموماً مسدس ہیں۔ مرزا صاحب سے کسی سوز خواں نے فرمائش کی۔ کہ اس سودا کے مربع مرثئے پر مربع مرثیہ کہہ دیجئے ؎ یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے۔ مرزا صاحبؒ یہ مرثیہ مربع کہا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے۔ مگر مقطع میں سودا مرحوم کے فضل تقدم کا صاف اعتراف کیا۔ کہتے ہیں۔ بس ہے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب۔ سودا کے مرثئے کا تو ممکن نہیں جواب۔

مربع مرثیہ دربارہ سودا مرحوم

پفضل حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب۔ کافی ہے تجھ کو بخشش محشر کے واسطے۔ یہ مرثیہ بھی دفتر ماتم کی چوتھی جلد میں چھپا ہے +

ایک مرثیہ میں جا بجا کئی مطلع

(۱۴) یہ بھی ایجادات مرزا صاحب سے ہے۔ کہ ایک ایک مرثیہ میں جا بجا رخصت لڑائی شہادت وغیرہ کے موقع پر کئی مطلع کر دیتے ہیں۔ اس سے حسب ذیل فائدے ہوئے۔

(۱) مجلس مختصر میں جس مطلع سے چاہو۔ چند بند پڑھ دو۔ اچھا رنگ ہو جائیگا۔ گویا ایک استاد کامل فن کی (طلائی حلقہ دار) زنجیر بنائی ہوئی ہے۔ کہ جس جس حلقہ پر کاریگر نے نشان کر دیا ہے۔ وہاں سے چاہو۔ تو ان حلقوں کو نکال کر ایک زنجیر کی کئی خوشنما [illegible] بنا کر کام میں لاؤ +

(۲) اگر ایک ہزار مرثیے مرزا صاحب [illegible] لئے گئے تو خواہ [illegible] چند ہزار مرثیے مشہور ہوئے +

(۳) اکثر سوز خوانوں کو جب مرثیے [illegible] ایک صحیح [illegible] وہاں سے بند لے لئے۔ اور پڑھ دئیے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کا کلام سوز میں بھی [illegible] کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ دوسرے مرثیہ گو شاعر کا کلام نہیں پڑھا جاتا +

ذبیح عظیم

(۱۵) شرع اسلام میں ذبیحہ (عید اضحٰی) کے واسطے جس قدر شرائط (کتب فقہ میں) ہیں۔ سب کو ایک مقام پر بطور تمہید بیان فرما کر (صاحب ذبح عظیم) امام حسینؑ کی تشنہ دہنی اور مصائب ذبح وقتل کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے۔ ؂ آمد ہوئے کعبۂ قربانی دادرس ہے حسینؑ [۹۱]۔ اور زیارت ناحیہ مقدسہ کے اکثر فقرے کا اس مرثیہ میں مطلب بیان کیا ہے ؂ کیا شان روضہ خلف بوتراب [۹۲] ہے +

سلام میں حالات مسلسل

(۱۶) سلام میں بھی مرزا صاحب نے ایک خاص بات ایجاد کی۔ وہ یہ کہ کسی واقعہ مسلسل کو دس پندرہ بیس شعروں میں (بطور قطعہ) نظم کیا۔ جیسے حضرت حر اور ابن سعد کی گفتگو

[۹۱] آمد ہوئے کعبہ الخ۔ یہ مرثیہ جلد دوم دفتر ماتم میں چھپا ہے +

[۹۲] کیا شان روضہ خلف الخ۔ یہ مرثیہ چوتھی جلد دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ مؤلف

یا جناب زینبؑ اور ہند زوجہ یزید کی قید خانہ شام میں بات چیت یا اور کوئی واقعہ +
چنانچہ اُن کے اور اُن کے شاگردوں کے سلاموں میں ایسے قطعے کثرت سے پائے جاتے ہیں※۔ اور جب ذاکر اس قطعہ کو مسلسل طور پر ایک سانس میں پڑھتا ہے جب اور بھی یہ نظم مجلس عزا میں خوش نما معلوم ہوتی ہے +

اس زمانہ کے بعض مغربی تعلیم یافتہ (اہل علم) ہماری غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلسل مضامین غزل میں نہیں ہوتے۔ ہر چند اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ غزل کے ہر شعر کا مضمون علیحدہ ہونا بہتر ہے۔ یا مسلسل ہونا۔ کیونکہ جس طرح ایک قسم کے کھانے سے آدمی اکتا جاتا ہے۔ کہ دوسرے مزہ کا اب طعام ملے۔ اُسی طرح ایک ہی حال مسلسل دیکھتے دیکھتے دل چاہتا ہے۔ کہ اب دوسرا حال دیکھوں۔ بہر حال سلام میں (جو گویا غزل کی ایک شاخ ہے) یہ ایجاد مرزا صاحب مرحوم ہی نے اپنی طبع موزون سے فرمایا۔ کہ اُن کے معاصر شعرا قطعہ کو عجز طبیعت شاعر سمجھے ہوئے تھے۔ (کہ جب ایک شعر میں مضمون نہ آسکتا تھا۔ تو دوسرے اور تیسرے شعر میں کہتے تھے)۔ مگر مرزا صاحب ور اُن کے شاگردوں نے لمبے لمبے قطعے عمداً مختلف واقعات کے نظم کر دئے۔ اور بتا دیا۔ کہ یہ بھی شاعر کی کمال کی دلیل ہے۔ عجز طبیعت نہیں ہے +

فصل ۱

بابِ دہم تعدادِ کلام مرزا صاحب

مرزا صاحب کا یہ کمال تمام ملک میں مشہور و مسلّم ہے۔ کہ وہ بہت جلد اور کثرت سے کہتے تھے۔ اور پھر اچھا کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ خدا نے اُن کو شاعر پیدا کیا تھا۔

※ میر عبدالوہاب (وہاب) تخلص حیدرآبادی مرحوم نے ایک سلام کے قطعہ میں جناب علی اکبر کا میدان میں آنا اور جنگ کرنا اور رزم سب کچھ نظم کر کے آخر میں بین کے کئی شعر کہہ کر ختم کیا ہے گویا پورا ایک مرثیہ ایک قطعہ میں ہے یہ سلام دفتر ماتم میں چھپ چکا ہے اور مرزا صاحب مرحوم کا اصلاحی ہے۔ مجھے اس کا ایک شعر بہت پسند ہے جس کا مضمون بالکل اچھوتا ہے وہ یہ ہے کسی کو یاں نہیں آسودگی میں بھی آرام - وہیں میں سکن ہے اور گرد نشتر آسیا کیلئے + ۱۲ مؤلف

لیکن کسی ناقل یا تذکرہ نویس نے اُن کے کلام کی صحیح تعداد نہیں بیان کی کسی نے اُن کے فقط مرثیوں کی تعداد دس ہزار لکھ دی[1]۔ کسی نے تین ہزار۔ اس تین تیرہ میں اصلی مقدار کلام کی ابتک نہ معلوم ہو سکی۔ مگر قبل اس کے کہ مَیں موجودہ کلام کی مقدار لکھوں یہ کہنا چاہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب کے ہزاروں مرثئے مشہور ہونے کی چند وجوہ ذیل ہیں:-

(۱) وہ جب کبھی طبیعت حاضر ہوتی تھی۔ تو دو دو چار چار گھنٹے میں ستّر ستّر اسّی اسّی بند کہکر اُٹھتے تھے۔ اس سماں کے دیکھنے والے (اہل بصیرت) بحمد اللہ ابتک موجود ہیں جیسا کہ مَیں نے اسی کتاب میں ایک جگہ اپنے محسن ڈپٹی حاجی سیّد جعفر حسین صاحب لندنی جعفری بہرسری کے خط کے حوالے سے میر باقر حسین صاحب بہرسری وکیل ریاست ... پور کی زبانی ایک اُن کی چشم دید حکایت لکھی ہے۔ کہ ان کے روبرو دو دکانوں کے چار پانچ گھنٹے میں ۱۲۰ بند کہکر لکھوا دئے تھے۔ پس ایسے واقعات دیکھنے والے ضرور یہ خیال فرماتے ہیں۔ کہ ہزاروں مرثئے کہے ہونگے۔ کہ انہوں نے تمام عمر گویا یہی کام کیا[2] +

(۲) مرزا صاحب نے ۷۴ برس کی عمر پائی۔ بارہ برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ۶۲ برس کامل اس کام کو کیا۔ برسوں یہ ربط رہا۔ کہ ہر مہینے میں کم سے کم ایک مرثیہ ضرور کہکر اپنی گھر مجلس میں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ مَیں مفصّل ایک دُوسرے مقام پر لکھ چکا ہُوں۔ اور بعض مہینے میں دو دو تین تین مرثئے کہ بیٹے تھے۔ اور چھوٹے چھو...

[1] آبِ حیات کے صفحہ ۵۵۴ پر حضرت آزاد مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے اس مدت عمر ۷۲ سال میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ کہا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ پھر صفحہ ۵۵۰ پر مضامین مرثیہ کی تفصیلی حالت لکھکر (جناب میر انیس مرحوم کے حالات لکھتے ہُوئے جناب آزاد مغفور) تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا دبیر مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔ اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے۔ رباعیاں تو باتیں تھیں + ۱۲ مؤلّف حقیر۔

[2] پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی غالباً کسی معتبر ذی علم راوی سے ایسی ہی ایسی غلط حکایتیں سُن کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ دس ہزار مرثئے ضرور کہے ہونگے + ۱۲ مؤلّف۔

مرثئے اس سے بھی زیادہ۔ اس خیالی حساب سے بھی نوبت سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچتی ہے +

رات بھر میں ایک مرثیہ کہا

(۳) بعض موقع پر رات بھر میں مرثیہ کہا۔ اور پڑھ دیا۔ جیسا کہ اس مرثیہ کی نسبت مشہور ہے سہ جب رونق مرقع کون ومکاں ہوئی۔ اس کا واقعہ بھی میں ایک جگہ مفصل لکھ چکا ہوں +

تین چار گھنٹہ میں ایک مرثیہ کہا

(۴) بعض موقع پر تین چار گھنٹہ میں ایک مرثیہ کہا اور پڑھ دیا چنانچہ ایک مرثیہ کے مقطع میں خود کہتے ہیں ع کل چار ساعتوں میں ہے یہ مرثیہ کہا +

[illegible] ۲ مرثیہ کہکر دوسرے کا تخلص ڈال دیا

(۵) اکثر دوستوں اور شاگردوں کی فرمائش سے کبھی مرثیہ کہکر انہیں کا تخلص ڈال دیا کرتے تھے۔ اور ان مرثیوں میں ان پابندیوں کا لحاظ بھی کم رکھتے تھے۔ جو اپنے خاص مرثیوں میں رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء میں تحقیق کرنے پر بعض رشتہ داران و متوسلین سلطان عالیہ مرحومہ کے پاس مرزا صاحب کے ساٹھ ستر مرثئے ایسے فصیح وسلیس سننے گئے۔ کہ بعض بند کے بند گویا نثر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے چاہا بھی۔ کہ کچھ روپیہ صرف کرکے اس دُرِ بے بہا کو لے لوں۔ اور ملک کے سامنے پیش کردوں۔ کہ وہ مرثئے جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس بھی نہیں ہیں۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح جناب

دفتر پریشان

میر دستور علی صاحب بلگرامی سلمہ اللہ والبقاہ منصرم ججی و پرائیویٹ سکرٹری راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ مرزا صاحب کی تصنیفات سے ان کے پاس ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جو نہ مرزا اوج صاحب کے پاس ہے۔ نہ اور کہیں۔ اس مجموعہ کا نام "دفتر پریشان" ہے۔ وہ سب ایک بحر میں ہے۔ اس میں بتیس چہرے۔ بتیس رخصتیں۔ بتیس لڑائیاں۔ بتیس رجز۔ بتیس سراپا۔ بتیس بین در بیان شہادت نظم ہیں۔ تاکہ ذاکر جب چاہے ایک مرثیہ نیا ترتیب دے لے۔ اور پڑھ دے۔ میر صاحب ممدوح کے والد ماجد مرزا صاحب کے شاگرد اور ان کے دادا جناب میر ضمیر مرحوم کے شاگرد تھے مرزا صاحب نے

یہ مجموعہ اُن کے داد (اپنے اُستاد بھائی) کو دیا تھا جو ابتک اُن کے پاس چلا آتا ہے۔ میر صاحب نے باتوں باتوں میں اُس مجموعہ خوبی کے بعض مصرع سُنائے تھے۔ جو میں نے لکھ لئے تھے۔ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ایک موقع پر جہاں ایک پہلوان کی (امام حسینؑ سے) لڑائی نظم کی ہے۔ امام حسینؑ کی زبانی کہتے ہیں۔ (اے کاش) یہ معرکہ شبیہ پیمبرؐ بھی دیکھتے۔ لڑنا ضعیف باپ کا اکبرؑ بھی دیکھتے۔ اسی موقع کے قریب کا ایک بند حسب ذیل سُنا تھا ؎

تلوار کی چمک سے ہلا دشت ہولناک — تابین تھیں اُس کی رشتۂ تسبیح خاک پاک
جب جوہروں پہ اُس کے جمی کربلا کی خاک — غُل تھا کہ بس عدوئے امام اب ہوئے ہلاک
کاٹوں گی سر قسم یہی کھائی ہے تیغ نے
تسبیح خاک پاک اُٹھائی ہے تیغ نے

ایک ٹیپ یہ بھی پڑھی تھی ؎

مشکل کشا کا ذکر قوی ہیکلوں میں ہے — پہلے سے آب تیغ کی گرمی گلوں میں ہے

اسی طرح وہ مرثیہ جو مرزا صاحب نے جناب مجتہد العصر علامۂ جائسی مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ کو دیا تھا۔ اور جس کا ایک مصرع اُن جناب نے یہ تحریر فرمایا ہے۔ ع اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے۔ نہ اب جناب کے پاس ہے۔ نہ مرزا اوج صاحب کے یہاں ہے۔ نہ اور کہیں ملتا ہے؎۔ پس اس طرح سینکڑوں یا ہزاروں مرثیئے مرزا مرحوم کی طبعی سخاوت و بے پروائی کی نذر ہو گئے۔ بہت کلام غدر ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ سیکڑوں مرثیئے

؎ مرزا صاحب کے بہت سے مرثیے اس طرح بھی تلف ہوئے کہ مرثیہ پڑھ کر وہ منبر سے اُترے اور کسی ایسے دوست یا شاگرد نے مانگ لیا جن کا سوال رد کرنا مرزا صاحب کی خوش اخلاقی کے خلاف تھا۔ مرزا صاحب نے کبھی تامل کر کے دور دراز ملک والوں کو نہیں سمجھا۔ وہ کسی مجبوری میں مبتلا ہو گئے اور مرثیہ واپس نہ کر سکے۔ اور وہ مرثیہ تلف ہو گیا۔ یہ خوش معاملگی کا ذکر تھا۔ اب یہ لوگ جو مرثیے لے کر دینا ہی خلاف اخلاق سمجھتے ہیں۔ وہ مرثیہ و تسبیح کو مال وقف سمجھے ہوئے ہیں ایسے تو مرثیہ واپس ملنا ہی محال ہے۔ منجملہ خود ایسے لوگوں کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور بعض مرثیے ایسے احباب نما غاصبوں کی نذر کر چکا ہوں۔ مؤلف عفی عنہ

دُوسروں کے نام سے شائع و مشتہر ہو کر تلف ہو ہو گئے۔ مگر سخاوت کا عوض ضرور ملتا ہے۔ اس کا بدلا بظاہر یوں ملنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج بہت سے مرزا صاحب کے شاگردوں کے مرثئے اُن کے نام سے مشہور ہیں۔ ازبسکہ یہ سب قلمی ہیں۔ کچھ دنوں میں یا تلف ہو جائینگے۔ یا دُوسرے مرثیہ گو شعرا وغیرہ کچھ تغیر کر کے اپنے نام سے منسوب کرینگے۔ اسی خیال سے میرا عزم ہے۔ کہ اس حیات دبیر کی تالیف و طبع سے فارغ ہو کر بشرط حیات مرزا صاحب کے تلامذہ کے مرثیوں کی چند جلدیں چھپوادوں +

ایک مرثیہ میں پانچ چھ مطلع

(۶) ایک ایک مرثئے میں پانچ پانچ چھ چھ مطلع کہنے کے سبب سے بھی مرزا صاحب نے اگر ایک ہزار مرثئے کہے ہونگے۔ تو پانچ سات یا دس ہزار مشہور ہو گئے +

بہرحال اب جو مرزا صاحب کا کلام میرے علم میں موجود ہے۔ وہ حسب ذیل دو قسم کا ہے۔ (۱) مطبوعہ (۲) غیر مطبوعہ۔ مطبوعہ کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مطلع اودھ اخبار میں دو جلدوں میں چھپا ہے۔ دُوسرا وہ جو اور مصنفوں کے کلام کے ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مرثئے چھپے ہیں۔ ان سب مرثیوں میں اکثر کلام غلط اور ایسا پیوندی کلام شامل ہے۔ جس کا چھانٹنا دشوار ہے۔ بلکہ مطلع اودھ اخبار کی جلدوں میں تو بعض مرثئے ایسے ہیں۔ جن کا ایک بند بھی کلام مرزا صاحب سے نہیں ہے جیسے یہ مرثیہ سے ۵ ہر آہ غلم ہے بہ عزا اغا ہے کس کا۔ مرزا نظیر برادر مرزا دبیر مرحوم کی تصنیف ہے۔ پیوندی مرثیوں میں اب یہ امتیاز کرنا کہ کون سا بند مرزا صاحب کا ہے کونسا دُوسرے کا ہے بہت مشکل ہے پیوندی یا

پیوندی مرثئے

اصلی مرثیوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ ذاکروں میں یہ عادت جاری تھی۔ اور اب بھی ہے۔ کہ پانچ سات مرثیوں کے چُست چُست بند چھانٹ کر ایک مرثیہ کسی ذاکر نے بنا لیا اور پڑھا ظاہر ہے کہ معمولی مرثیہ سے زیادہ اُس پر مجلس میں رنگ ہوگا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ (مثل مشہور ہے)۔ اب جو دُوسرا ذاکر ذاکر اول کا مدمقابل منبر پر گیا۔ تو اُس نے بھی یہ سمجھ کر کہ معمولی مرثئے پر شاید یہ رنگ نہ ہو۔ ایسا ہی پیوندی مرثیہ

ان سلاموں میں بھی چُست و سُست ہر قسم کا کلام ہے۔ اور سب سے زیادہ سُست میرا کلام ہے۔ انیسویں جلد میں ۴ مخمس سلاموں پر ہیں۔ اسی میں وہ مخمس بھی ہے۔ جو ہفت بند ملا کاشی علیہ الرحمہ پر فارسی میں مصرع لگا کر مرزا صاحب نے مخمس کیا ہے۔ اور جو اس سے پہلے شمس المشرقین کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مصرع اکثر ایسے اچھے لگائے ہیں کہ پانچوں مصرع ایک شخص کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حال اکثر مخمسوں کا ہے۔ اور یہی کیفیت ہفت بند ملا کاشی کے مخمس کی نظر آتی ہے۔ اہل زبان (ایرانی) کے کلام پر ایسے مصرع لگانا کہ جو کل کلام اہل زبان کا معلوم ہو۔ بیشک کمال مرزا مرحوم کا ہے۔ اور یہ بات ہر ہندی شاعر کو نصیب نہیں* ہوتی +

دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں ردیف وار رباعیاں اور نوحے اور واقعات اور تضمینیں اور مناجات و قطعات وغیرہ متفرق کلام ہے۔ جن کی تعداد سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں پر پہنچتی ہے۔ ان میں بھی چُست و سُست کلام ہر رنگ کا ہے +

دفتر ماتم میں کوئی قصیدہ مرزا صاحب کا نہیں چھپا۔ مگر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے اپنی کتاب علم عروض (مقیاس) میں جو ایک قصیدہ مرزا صاحب مرحوم کا بجواب قصیدہ رشید وطواط لکھا ہے۔ اُس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ قصیدہ اوسط درجہ کا کہتے تھے۔ اور اگر اُن کو زیادہ قصائد کہنے کا موقع ملتا۔ تو غالباً جمیع اصناف سخن سے وہ قصیدہ بہتر کہتے۔ کیونکہ اُن کے بعض مرثیوں میں بھی بعض موقع پر قصیدہ کی اعلےٰ شان نظر آتی ہے +

ازبسکہ میں کلام مطبوعہ کا حال لکھ رہا ہوں۔ اس لئے اس موقع پر وہ فہرست بھی پیش

* ایرانیوں کے ساتھ برسوں رہنے اور بولنے کے بعد یہ بات حاصل ہوتی ہے مرزا صاحب کے ایک اُستاد مجتہد مازندرانی تھے جن کا تخلص ... کر چکا ہوں غالباً یہ انہیں کی تعلیم و صحبت کا فیض ہے۔ بعد اس قدر لکھنے کے مجھے جناب ... حضرت اوج صاحب سے معلوم ہوا کہ شمس المشرقین پر آں مجتہد مازندرانی (طالب شاہ) کی اصلاح ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کر دئیے۔ جو مرثئے سرسری نظر سے دیکھنے پر مجھے مرزا صاحب کے نہیں معلوم ہوئے ۔ وہ حسب ذیل ہیں :۔

نمبر	مطلع مرثیہ کا	کس جلد میں ہے	کیفیت
۱	جو زائر حسین علیہ السلام ہو	۲	مرزا مرحوم کی زبان نہیں معلوم ہوتی اس لئے اُن کا کلام نہیں ہے ۔
۲	شیر خدا کا شیر ہے آہوئے مصطفےٰ	۵	ایضاً
۳	عباسؑ کو جو سبط نبیؐ نے علم دیا	۷	نہ مرزا صاحب کی زبان ہے نہ طرز بیان ہے ۔ غالباً اُن کے کسی شاگرد کا ہے ۔
۴	شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامان مرتضےٰ	۸	زبان سے بھی مشیر مرحوم کا معلوم ہوتا ہے ۔ اور مجھے تحقیق بھی ایسا ہی ہوا ہے ۔
۵	یارو غم حسینؑ کی عزت عظیم ہے	۹	مرزا صاحب کی زبان نہیں ۔ غالباً مشیر مرحوم کا ہے ۔
۶	کیا ذات ذوالجلال غفور و رحیم ہے	۱۱	مرزا صاحب کی زبان نہیں معلوم ہوتی

مرثیے جو زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہیں

اب یہ بھی لکھ دوں ۔ کہ میرے علم میں جس قدر مرثئے دفتر ماتم میں چھپے ہیں ۔ بجز پانچ مرثئے مندرجہ تحت کے سب زمانہ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل کی تصنیف ہیں :۔

نمبر	مطلع	حال
۱	اے صبح وفا کون ترا شمس ضحےٰ ہے	حضرت عباسؑ کے حال میں جلد اوّل دفتر ماتم میں چھپا ہے ۔
۲	انجیل مسیحؑ لب شبیرؑ ہیں عباس	حال حضرت عباسؑ میں ناتمام مرثیہ ہے جلد دوئم میں چھپا ہے

نمبر	مطلع	حال
۳	یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا	حضرت امام حسینؑ کے حال میں جلد پنجم میں ہے۔
۴	پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی	عونؑ و محمدؑ کے حال میں ہے۔ جلد اوّل میں چھپا ہے۔
۵	گل گشت گلستاں اجل کرتے ہیں اکبرؑ	حال شہزادہ علی اکبرؑ میں ہے۔ جلد دویم میں چھپا ہے۔

تاریخ گوئی میں بھی مرزا صاحب کو کمال تھا۔ چند منٹ میں اکثر تاریخ کہہ دیتے تھے۔ ہزار ہا تاریخیں کہی ہیں۔ مگر دفترِ ماتم میں ایسی تاریخیں نہیں چھپیں۔ یہانتک کہ میرانیس مرحوم کے انتقال کی تاریخ بھی دفترِ ماتم میں نہیں چھپی +

غزل۔ سُنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے تین دیوان مکمل تھے۔ مگر اُنھوں نے خود مشتہر نہیں کئے۔ جس زمانہ میں اُن کے داماد میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم (پسر میر وزیر علی صبا مغفور) ابتداءً غزل کہتے تھے۔ مرزا صاحب سے مانگ کر ایک یا دو دیوان وہ لے گئے۔ برسوں یہ اُن کے یہاں رہے۔ پھر ایک زمانہ میں اُن کے یہاں آگ لگی۔ وہ دیوان بھی سُنا ہے کہ اور اسباب کے ساتھ جل گئے۔ بعض غزلیں جو مرزا صاحب کے تخلص سے ایک آدھ تذکرہ میں پائی جاتی ہیں۔ نہ معلوم اُن کی ہیں یا نہیں +

نثر اُردو۔ مرزا صاحب خط تو ہمیشہ فارسی میں لکھا کرتے تھے۔ اور بہت کم لکھتے تھے۔ اس لئے اُن کا اُردو کا (بلکہ فارسی کا بھی) کوئی خط ابتک نہیں ملا۔ البتہ ایک اُردو نثر کی کتاب مصائب میں مطبع یوسفی دہلی میں چھپی ہے جس کا نام ابواب المصائب ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہُوا۔ کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پس یہ کتاب بالتحقیق اُنہیں کی تصنیف پائی جاتی ہے میرے کرم فرما سید صغیر حسین صاحب شمس مالک مطبع یوسفی دہلی مینیجر اخبار اثنا عشری دہلی کی

فصل ۴

شعاع توجہ و مہربانی سے یہ کتاب مجھے پہنچی۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کے عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے لکھی۔ حضرت یوسفؑ کے واقعات جا بجا لکھ کر حالات امام حسینؑ کا پیوند لگایا ہے۔ باوصفیکہ اب سے اسّی پچاسی سال پہلے کی تصنیف ہے۔ مگر زبان سلیس ہے۔ عبارت میں اُس زمانہ کی روش کے موافق فارسی و عربی کے الفاظ بہت ہیں۔ مگر عبارت کو خواہ مخواہ مقفّیٰ نہیں بنایا ہے۔ اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے ✦

مرثیے جو ابتک نہیں چھپے

اب مَیں اپنے علم کے موافق اُن مرثیوں کے مطلع بھی لکھ دوں۔ جو اب تک چھپے نہیں ہیں:-

نمبر	مطلع	کیفیت
۱	جب حرم قلعۂ شبیر میں کے برابر آئے	ایک پُرانا مرثیہ ہے۔ میرے پاس بھی موجود ہے۔ نہایت فصیح و سلیس نظم ہے۔
	اے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج	اہلبیتؑ کے دربار یزید میں آنیکے حال کو نظم کیا ہے۔ یہ مرثیہ بھی میرے پاس اور بہت صاحبوں کے پاس ہے۔ شان نظم اور زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد شاہی کی تصنیف ہے۔ عمدہ مرثیہ ہے
۳	کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے	یہ ایک بہت بڑا مرثیہ ایک ہزار بند کے قریب سُنا جاتا ہے۔ سُنا ہے۔ کہ اکثر اقربائے امام حسینؑ کے حالات نظم فرمائے ہیں۔ میرے پاس ایک ٹکڑا اس کا ہے جو شاید ساٹھ ستر بند کا ہوگا۔ یہ بھی عہد شاہی کی تصنیف عمدہ مرثیہ ہے۔

نمبر	مطلع	کیفیت
۴	مہرِ علم سرورِ اکرم ہُوا طالع	یہ بے نقط مرثیہ ڈیڑھ سو بند سے کچھ اُوپر سُنا جاتا ہے۔ اس صنعت میں یہ لاجواب مرثیہ قابلِ دید ہے مگر بوجہ وصیّت مصنّف تقسیم نہیں ہُوا۔
۵	آمد ہے خداوند شجاعانِ زمن کی	امام حسینؑ کے حال میں ایک لاجواب مرثیہ ہے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء کی تصنیف اور غیر تقسیمی ہے۔
۶	ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے	امام حسینؑ کی مدینہ منورہ سے روانگی اور فاطمہ صغرٰی سے مفارقت نظم کی ہے۔ یہ بھی بعد غدر ۱۸۵۷ء کی تصنیف اور لاجواب غیر تقسیمی مرثیہ ہے۔
۷	اے کلک رقم سلک قلمداں سے جُدا ہو	بس یہی ایک مصرع سُنا ہے۔ اور یہ سُنا ہے کہ لاجواب مرثیہ ہے۔ اور حال معلوم نہیں۔
۸	جب تیغِ انتقام برہنہ خدا نے کی	مختار کے حال میں ایک غیر تقسیمی مرثیہ ہے جس کی نسبت مرزا صاحب کے شاگردوں و طرفداروں کا یہ خیال ہے کہ تمام تصنیفات مرزا صاحب کی ایک پلّہ میں اور یہ مرثیہ دوسرے پلّہ میں رکھنے پر بھی شاید یہی پلّہ جھکتا ہُوا ہوگا۔ میں اس کا حال اُوپر بھی لکھ چکا ہُوں۔ مرثیہ بہت اچھا ہے۔
۹	کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے	حال حضرتِ امام حسینؑ میں لاجواب مرثیہ ہے صنائع بدائع میں اکثر بند ہیں جن میں سے بعض بند جناب استاذی ادج مدظلہ نے مجھے عنایت فرمائے۔ اور میں نے اس کتاب میں لکھ دئے ہیں۔

نمبر	مطلع	کیفیت
۱۰	قبضہ ہے علقمہ کی ترائی پہ شیر کا	مطلع کے مصرع کی طرح تمام مرثیہ حال حضرت عباسؑ میں شاندار اور لاجواب ہے سگر مشتہر نہیں ہوا۔
۱۱	....	مطلع مجھے یاد نہیں رہا۔ حال حضرت امام موسیٰ کاظمؑ میں لاجواب مرثیہ ہے۔ جس کا کچھ ذکر میں نے ایک جگہ اس کتاب میں لکھا ہے۔

مرزا صاحب کے مرثیے میر صاحب سے بہت زیادہ ہیں

ناظرین! آپ مجھے معاف فرمائیگا۔ میر انیس صاحب مرحوم کی کسی طرح تنقیص (معاذاللہ) مقصود نہیں ہے۔ بلکہ مؤرخی کی شان مجھے اس کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ کہ جب ملک نے **میر صاحب** کو مرزا صاحب کا مدمقابل مان لیا ہے۔ اور مرزا صاحب و میر صاحب کا کمالات میں مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو میں اپنے علم کے موافق یہ بھی عرض کروں کہ ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے کلام کی تعداد کس قدر ہے۔ کیونکہ عام طور پر لوگ یہی کہدیتے ہیں۔ کہ ان کے بھی ہزاروں مرثئے ہیں۔ ان کے بھی ہزاروں ہیں۔ حالانکہ واقعی ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک مجھ کو علم ہے۔ میر صاحب کے سَو سوا سَو (۱۲۵) مرثیوں سے زیادہ نہیں ملتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں عرض کروں۔ کہ میر صاحب کی کل ۴ جلدیں چھپی ہیں۔ اور مرزا صاحب کی ۲۰ جلدیں کچھ کلام غیر ان میں بھی شامل ہے۔ ان میں بھی ہے سا اس کے ساتھ اور ایک بات بھی سُن لیجئے۔ میر ضمیرؔ۔ میرزا فصیحؔ۔ منشی دلگیرؔ ان سب کے مرثیوں کی جلدیں چھپ گئیں۔ انہیں صاحبوں کے معاصر و ہم پلہ میر خلیق مرحوم تھے۔ (جو میر انیس مرحوم کے والد ماجد اور اُستاد تھے)۔ ان کے مرثیوں کی کوئی جلد نہیں چھپی۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ ان کے مرثئے کہاں مرگئے۔ مگر مولوی شبلی صاحب کی تحقیق صحیح ہے۔ (جیسا کہ انہوں نے مفصّل و مدلل موازنہ انیسؒ و دبیرؒ کے صفحہ پندرہ پر لکھا ہے)۔ تو یہ

نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ بعض مرثئے جو آج میر انیس مرحوم کے نام سے مشہور ہیں (اور وہ بھی ان چند جلدوں میں ہیں) وہ درحقیقت میر خلیق مرحوم کی تصنیف ہیں۔ پس جو لوگ بے تعصبی سے دبیرؔ و انیسؔ کا مقابلہ کرنا چاہیں۔ وہ اس بات پر بھی خیال فرمائیں۔ کہ ایک شاعر کثیر الکلام کے ساتھ ایک قصیر الکلام شاعر کا مقابلہ ہے*۔ ایک ہی قسم کا مضمون اگر ایک ابتدائی مشق کے مرثیہ میں مرزا صاحب کے یہاں سُست بندھا ہُوا ہے۔ تو وہی یا ویسا ہی مضمون ایک دُوسرے درمیانی مشق کے زمانہ کے مرثیہ میں (مرزا صاحب کے یہاں) آپکو چُست ملیگا۔ پس اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے۔ تو میر صاحب کے ہم مضمون نظم کو مرزا صاحب کے اُسی نظم سے نہ ملائیے۔ جو ابتدائی زمانہ کی ہے۔ بلکہ دونوں زمانوں کی نظم سے ملائیے۔ اور انصاف فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب باوصف اس قدر پرگو ہونے کے کس قدر اچھا کہتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر جو شعرا اہل پرگو ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام اکثر سُست ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا جتنا کلام مطبوعہ اس وقت موجود ہے۔ اُتنا کلام بھی کسی مشہور شاعر عرب یا عجم یا ہند کا مجھے تو نظر نہیں آتا۔ اور کثیر الکلام شاعر کے کلام میں سُست و چُست کلام ہونا ایک لازمی بات ہے۔ بلکہ جو شاعر پھونک پھونک کے قدم رکھتے ہیں۔ بار بار کاٹتے اور بناتے ہیں۔ اُن کا بھی کلام چُست و سُست نظر آتا ہے۔ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد بھائی نغمی یعنی میرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے کا ایک شعر یاد آیا ہے۔ جو ایسے محتاط شاعروں کی شان میں ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ؎

شعر اپنے جب بھائے الفاظ کچھ بنائے + پیوند تو لگائے پیراہن کہن میں

کثرت کلام کے باوصف اکثر عمدہ کلام ہے

* پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی آب حیات میں انیسیوں اور دبیریوں کی فرضی بحث میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے۔ "دبیری کہتے تھے کہ کس کا منہ ہے۔ جو ہمارے [illegible] [illegible] تک [illegible] رسائی کی۔ [illegible] پر دس بندرہ مرثئے لکھ کر لیا کرتے تھے۔ لکھا کئے۔ وہ بھی [illegible] اور بھائیوں کے شعر سے ملاکر [illegible] صاحبوں کے پیچھے بھاگا کر" + بہت مولف حقیر۔

(۱) مقابلۂ کلام انتخابِ غالب و جناب سحر

جن شاعروں نے اپنا سُست کلام نکال دیا ہے۔ اُن میں سے مَیں مثال کے طور پر دو مسلم الثبوت شاعروں کو پیش کرتا ہُوں۔ ایک بزرگوار دہلی کے دُوسرے لکھنؤ کے ہیں۔ دہلی کے جناب **غالب** مغفور اور لکھنؤ کے سحؔر مرحوم ہیں +

مرزا غالب مرحوم نے اپنے اردو کے بڑے کلیات میں سے ہزاروں اشعار حذف کر کے ایک بہت مختصر دیوان اردو باقی رکھا۔ جس پر خود اُن کا قول شاہد عادل ہے ؎

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ + شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

یہاں تک اشعار دیوان سے نکال دئے۔ کہ وہ مشہور سہرہ بھی۔ جس پر شیخ ابراہیم صاحب **ذوق** رہ سے جھگڑا ہُوا تھا۔ دیوان اردو میں نہیں ہے*۔ (اور جس کو پروفیسر آزاد مرحوم نے اپنی آزادی یا اپنے اُستاد کی طرفداری کے خیال سے کہ ذوق کا سہرہ غالب کے سہرہ سے چُست معلوم ہوتا ہے۔ آبِ حیات میں آب و تاب سے لکھا)۔ غالب مرحوم نے تو عاشقوں کے فرضی گریبان کی طرح سہرہ کا تار تار الگ کر کے ایسا پھینک دیا تھا۔ کہ آج شاید اُس کا ایک تار یا سُوکھا ہُوا ایک پھُول بھی ہم کو نہ ملتا۔ مگر آبِ حیات نے یہ جان بخشی کی۔ کہ دونوں سہروں کے مقابلہ کا آج موقع مل گیا۔ بہرحال اس کثرت سے اشعار نکال دینے کے بعد بھی دیوان اردوے غالب مرحوم میں بہت سُست شعر موجود ہیں۔ اسی طرح شیخ امان علی صاحب سحر مرحوم نے اپنا پُرانا دیوان جس میں رعایت لفظی بہت اُبھری ہُوئی تھی۔ اُس رنگ کو ناپسند کر کے پھاڑ پھینکا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

سودا ہے نئی بات کا لے جان پُرانا + سب پھینک دیا پھاڑ کے دیوان پُرانا

گو اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے۔ کہ سحر مرحوم نے مضمون کو رعایت لفظی خصوصاً اُبھری ہُوئی رعایت لفظی پر مقدم رکھا۔ جس سے وہ ایک صحیح المذاق شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

* حالانکہ اُس کی معذرت میں جو نظم کہی تھی۔ وہ دیوان میں موجود ہے۔ جس کا ایک شعر لاجواب یہ ہے ؎ قسمت بُری سہی پہ
طبیعت بُری نہیں۔ ہے شُکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے + ۱۲ مؤلف

اور جس شخص نے اتنے بڑے دیوان کو تلف کر دیا۔ اُس سے یہ بھی بعید نہیں۔ کہ جو شعر سُست سمجھے ہوں۔ اُن کو بھی نکال دیا ہو۔ پھر بھی ان کے دیوان میں چُست و سُست اشعار موجود ہیں۔ ان پر کیا منحصر ہے۔ ہر شاعر کے یہاں چُست و سُست کلام (چاہے وہ کتنا ہی کلام کاٹ چھانٹ کر باقی رکھے) ضرور ملتا ہے ع یہی ہے فرق بندے اور خدا میں۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ اس میری تحریر کو دیکھ کر کوئی صاحب یہ نتیجہ نہ نکالیں۔ کہ معاذ اللہ مرزا غالب مرحوم قصیر الکلام تھے۔ نہیں بلکہ وہ بہت پرگو تھے۔ اُن کا فارسی کا کلیات بہت بڑا موجود ہے۔ اردو میں علاوہ نظم کے نثر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اور وہ خود عود ہندی کے ایک رقعہ میں اپنے پرگو ہونے پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ اور یہ ناز و فخر ان کا بیجا نہیں ہے۔ درحقیقت جس شخص کا کلام بہت ہے اور پھر اچھا بھی ہے۔ وہ ضرور فخر کریگا۔ اور فخر اُس کو زیبا بھی ہے +

ناظرین! جب کہ میں نے اس کثرت کلام کی بحث میں اس قدر آپ کا وقت لیا ہے۔ تو ایک نقل بطور لطیفہ کے شاعر گر شاعر میاں مصحفی کی بھی سُنا دُوں:۔

[illegible] مصحفی

۔ مصحفی سے ایک شاگرد نے کہا۔ اُستاد آپ بُرا نہ مانئے۔ تو میں ایک بات عرض کر دوں +

میاں مصحفی۔ کہو کہو۔

شاگرد۔ بعض شعر تو آپ کا ایسا پھڑکتا ہوا ہوتا ہے۔ کہ دل کو تڑپا دیتا ہے۔ جیسے۔

اے مصحفی میں رو و قتل کیا گلی صحبتوں کے خط بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

٭ حضرت مصحفی کو جو شاعر گر شاعر لکھا ہے۔ [illegible] یا بلا واسطہ شاگرد ہیں جیسے آتش۔ [illegible] اسیر [illegible] بلا واسطہ یا بالواسطہ (شاعر) شاگرد ہیں۔ [illegible]

مگر بعض شعر آپ ایسے سُست فرماتے ہیں۔ کہ شاید مجھ جیسا مبتدی بھی کہہ لے۔ میر انیسؒ کا یہ حال نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہے؟

مصحفی۔ (ذرا تیور بدل کر) سُنو بھئی۔ کوئی شاعر کنوآں ہے۔ اُس کا فائدہ اُنہی گھر والوں تک محدود ہے۔ کوئی اندارہ ہے۔ کہ محلہ بھر پانی بھرتا ہے۔ اسی طرح کوئی تالاب۔ کوئی رجبہ۔ کوئی نہر۔ کوئی دریا ہے۔ تمہارا اُستاد مصحفی سمندر ہے سمندر۔ پھر سمندر میں تو کوڑہ کرکٹ بھی جھلکیگا۔ موتی بھی۔ عنبر بھی۔ مونگا بھی۔ اور ہزاروں چیزیں مختلف قیمت کی سمندر میں ملتی ہیں۔ میرا اور ایسے شاعروں کا کیا مقابلہ۔ جو ایک کنوئیں یا تالاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ کہ جن میں ایک رنگ اور ایک ذائقہ کا پانی نکلتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلّا (خیر و صلاح) +

اس حکایت کے لکھنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ مرزا صاحب کمال کثرت سے کلام ہے۔ اس پر بھی اُن کا کلام اس قدر خوشبیت ہے۔ یہ اُن کے ممدوحین محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام کی تائید ہے۔ اور یہ بھی خدا کی قدرت یا ممدوحوں کی مدح کی برکت ہے کہ مرزا صاحب کے یہاں ہر رنگ کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔ جیسا کہ میں اُوپر ثابت کر چکا ہوں۔ اور جلد دوم (حیاتِ دبیر) [illegible] ہر قسم کے کلام کے بکثرت نمونے میں نے پیش کیے ہیں [illegible] کرنے میں سے ایک طرز کی تصنیف میں ہم [illegible] کلام [illegible] ہر رنگ میں جو خوب سے خوب ہے وہ [illegible]

ناظرین! اب میں دبیر مرحوم کے چند قدر شناس اہل کمال کا ذکر کرتا ہوں +

باب یازدہم۔ دبیر مرحوم کے قدر شناس اہل کمال

مثل مشہور ہے کہ دنیا مُردہ پرست ہے۔ اکثر مصنفوں و شاعروں کے مرنے پر زمانہ قدر کرتا ہے۔ مگر بعض کسی کمال کی قدر (زمانہ) اُن کی زندگی میں بھی کرتا ہے۔ چنانچہ

جناب مرزا صاحب کی جو عزت و توقیر اہل زمانہ نے اُن کے زمانے میں کی۔ اور اب تک قدر کر رہا ہے۔ وہ بھی شاید ہی کسی شاعر و مصنف کو نصیب ہوئی ہوگی۔ ہزاروں اُمرا اور اہل علم مرزا صاحب کے کمال کے معترف اور بعض فدائی ہو گئے تھے۔ مَیں اس باب میں اگر سب کا بیان کروں۔ تو یہ ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ لہذا یہاں صرف چند سربرآوردہ اہل کمال و اہل علم کا بیان کرتا ہوں +

(۱) مجتہد العصر علّامۂ جائسی جناب مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلّہ العالی۔ یہ بزرگوار بمصداق مثل مشہور اِنّ اھل الفضل یعرف اھلہٗ* مرزا صاحب کے فضل و کمال کے معترف ہیں۔ اور اس قدر جناب مرحوم سے محبت ہے۔ کہ اس کمال ضعیفی میں میری معروضہ کو قبول فرمایا۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے حالات اپنے شاگرد اور برادرزادہ منشی سید احمد رضا صاحب جائسی سے لکھوا کر مرحمت فرمائے۔ جو اس کتاب میں موقع موقع سے مَیں نے لکھ دئے ہیں۔ اور کچھ اس موقع پر لکھنا چاہتا ہوں۔ اور جناب کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ کہ ہمارے سر پر ان کا سایہ رہے۔ اور منشی صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں + جناب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب مرحوم کا جو اعزاز اُن کے کمال کے سبب سے خاندان بانی شان اجتہاد میں تھا۔ اُسی لحاظ سے وہ جناب حضرت زبدۃ العلما معین المومنین سید نقی صاحب مرحوم (خلف الصدق سید العلما طاب ثراہ) کی مجلس میں پڑھا کرتے تھے۔ اُس مجلس میں خاندان اجتہاد کے تمام مجتہد اور لکھنؤ کے قریباً تمام اہل کمال شریک ہوتے تھے۔ یہ عزت تمام اعزازوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

اور (۲) جب زین العلما عضد الدین سید علی ابن الحسین فرزند اکبر جناب سید العلما نے انتقال فرمایا۔ تو اُن کے سویم کی مجلس میں مرزا صاحب نے مرثیہ اور مرثیہ سے پہلے قطعہ تاریخ وفات پڑھا تھا۔ اُس کا یہ ایک شعر اب تک یاد ہے۔ ؎

* کامل کامل کو پہچانتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

مرگِ فرزند علی ۔ واقعۂ اکبر بود + رفت از مرگِ علی ۔ راحت و آرامِ حسین*

(۳) جناب علیین مکان (سید العلما میرن صاحب طاب ثراہ) کی مجلس سوئم میں جناب مرزا صاحب مرحوم کے اشارے سے جناب سلطان العلما (سید محمد صاحب) کی حضوری میں مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد شیخ گوہر علی صاحب مشیر (مرحوم) نے اپنی تصنیف ایک مرثیہ پڑھا تھا جس میں اوّل اوّل صفات حمیدہ و خرق عادات جناب علیین مکان کے نظم کئے تھے ۔ مطلع اُس کا یاد نہیں ۔ البتہ ایک شعر یاد ہے ۔ جس موقع پر میرن صاحب مبرور کے غم میں سلطان العلما کی اشکباری کی تصویر کھینچی ہے ۔ اُس موقع پہ کہتے ہیں ۔ مشیر مرحوم

آنسو رواں تھے غیرت الیاسؑ کے لئے + شبیرؑ لگو ہیں روئے تھے عباسؑ کے لئے

خاندان اجتہاد نے اس مرثیہ کی یہ قدر دانی فرمائی تھی ۔ کہ یہ مرثیہ ایک بیاض میں نقل کر کے کتب خانہ جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب قبلہ میں بحفاظت رکھا گیا تھا ۔ اور تمام علمائے کرام نے اس نظم کو پسند فرمایا تھا ۔ یہ امر بھی فضیلت جناب مرزا صاحب کی ایک روشن دلیل ہے ۔ کہ اُن کے ایک شاگرد کی بھی اہل علم میں اس قدر قدر و عزت کی جاتی تھی +

فصل ۲

(۲) شمس العلما جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنان ۔ باوصفیکہ اُن جناب سے بقول صاحب رد و واقعات انیس جناب میر انیس مرحوم اپنے مرثیہ پر اصلاح لیتے تھے (جیسا کہ خود ان جناب نے عظیم آباد میں چند صاحبوں کے رُوبرُو بیان فرمایا)

* میں کہتا ہوں کہ اس شعر میں صنعت ایہام ہے کہ جناب سید العلما میرن صاحب قبلہ کا نام (سید) حسین تھا اور اُن کے فرزند اکبر کا نام علی تھا اور جناب امام حسینؑ کے فرزند اکبر کا نام علیؑ تھا لہٰذا شعر سے علی اکبرؑ نام ہے جنکی شہادت کے بعد مظلوم کربلا نے فرمایا تھا ۔ علی الدُّنیا بعدک العفا تیرے بعد دُنیا پر خاک ہے پس دونوں واقعات میں سے جس پر چاہے یہ شعر چسپاں ہو سکتا ہے ۔ اور مقصود شاعر واقعۂ مقتل زین العلما ہے حضرت علی کو فرزند اکبر امام حسینؑ بر بنا روایت کے مطابق بعض علما سمجھتے ہیں جیسے اُنکی عمر وقت شہادت ۲۵ سال کی منقول ہے کہ جس وقت امام زین العابدینؑ ۲۳ سال کے تھے اس لئے وہ امام حسینؑ کے فرزند اکبر تھے جیسا کہ مناقب ابن شہر آشوب سے ظاہر ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

اور مجھ سے وزیر صاحب (سید محمد صاحب پیش نماز اکبر اولاد جناب مفتی صاحب) ایک مدت بسبیل تذکرہ بمقام آگرہ شاہ گنج ناقل تھے۔ کہ جناب میر صاحب نے اوّل یہ مصرع یوں فرمایا تھا۔ ع

جب حملۂ امام کریم النفس ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا۔ ع جب حملہ ور امام مسیحا نفس ہوئے۔ میر صاحب نے یوں ہی درست کر لیا۔ مگر ان جناب نے شان عدالت و انصاف کو پیش نظر رکھ کر دبیرؔ و انیسؔ کے باب میں جو فیصلہ فرمایا ہے۔ وہ ان کی کتاب عشرۂ کاملہ میں مسطور اور تمام ہندوستان میں مشہور ہے * یہ مسئلہ مولوی ابوالقاسم صاحب عرف مولوی مقرب علی خاں صاحب (ہمشیرزادہ ارسطو جاہ منشی رجب علی خاں صاحب مرحوم میر منشی چیف کمشنری پنجاب) سابق ہیڈ مولوی ضلع اسکول ریواڑی و مؤلف ذریعۃ النجات نے پوچھا ہے۔ خلاصۂ سوال یہ ہے۔ کہ بعض اہل ہند میر انیس مرحوم کو مرزا دبیر مغفور پر اور بعض میرزا صاحب کو میر صاحب پر شاعری میں ترجیح دیتے ہیں۔ آپ فیصلہ فرما دیجئے۔ کہ کون صاحب افضل و اکمل ہیں۔ اس کے جواب میں جناب ممدوح ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے۔ مرزا صاحب کا کلام دقیق و نمکین ہے۔ پس جب ہر ایک کا ذائقہ مختلف (اور ہر شخص کا مذاق مختلف) ہے۔ تو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی * یہ بات بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ کہ ایک عظیم آبادی بزرگوار نے مرزا صاحب کے اس بیت پر اعتراض فرمایا تھا ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا + شرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اور اپنے نزدیک اس قسم کے مبالغہ کو خلاف عقل و مہمل سمجھ کر جناب مفتی صاحب قبلہ سے پوچھا تھا۔ مفتی صاحب نے اُن کو مدلّل و معقول جواب دے کر اسی کتاب عشرۂ کاملہ میں یہ

مفتی صاحب کا فیصلہ دبیرؔ و انیسؔ کے باب میں

کسی عظیم آبادی کا مرزا صاحب پر اعتراض اور جناب مفتی صاحب کا جواب

* ملاحظہ ہو عشرۂ کاملہ کتاب مسائل میں (مطبوعہ مطبع اثنا عشری لکھنؤ)۔ اس میں سائل کا نام مولوی مقرب علی خاں صاحب مقیم آگرہ مگر بہ عنایت فرما منشی سید علمدار حسین صاحب دہلوی ملازم ریاست پٹیالہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ اصل میں خلیفہ سید محمد حسین صاحب اعجاز التنزیل نے پوچھا تھا۔ ممکن ہے کہ اُن جناب نے مولوی صاحب ممدوح سے خط لکھوایا ہو ۱۲ مؤلف حقیر

مسئلہ بھی چھپوا دیا ہے۔ ہرچند یہ سوال و جواب فارسی میں ہے۔ اور طالبان فن کے واسطے ایسے زمانہ میں کہ فارسی ہند میں لب بام ہے۔ شاید زیادہ مفید نہ ہو۔ مگر میں یہاں لکھے دیتا ہوں کہ ایک تو یہ مفتی صاحب کی تحقیق بمنزلہ تبرک ہے۔ دوسرے جب اس قسم کے مبالغہ کے اشعار کوئی صاحب تلاش کرنا چاہینگے۔ تو اُن کو ایک جگہ مل جائینگے ۔

(ماحصل اُردو میں اُردو خوانوں کے لئے)

عرض کیا جاتا ہے۔ کہ مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ کے ایک بند میں تعریف و توصیف تیزرفتاری اسپ مبارک (امام حسینؑ) کی بیان فرمائی ہے۔ اس طرح کہ اسپ مبارک بسبب تیزی رفتار کے صاحب سن نہیں ہوا۔ جیسا پیدا ہوا تھا۔ ابتک ویسا ہی ہے۔ اس کے بعد ٹیپ میں فرمایا ہے ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اس شعر کے نکتہ رسوں اور معنی سنجوں اور اہل علم میں سے کسی کی سمجھ میں اس بیت کے معنی نہیں آئے۔ بلکہ اکثر تو مہمل بتاتے ہیں۔ اس لئے کہ امتداد زمان (زمانہ کا گزرنا) حرکت فلک کو کہتے ہیں۔ اور سن کا تعلق امتداد زمانہ سے ہے سا گر شاعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ تیزی رفتار اسپ کے مقابلہ میں آسمان حیرت یا رشک سے

سوال

عرض می شود۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب و قبلہ دریک بند مرثیہ تعریف و توصیف تیزرفتاری اسپ مبارک بیان فرمودہ اند۔ بدیں نمط کہ اسپ مبارک حضرتؑ بسبب سرعت رفتار خود صاحب سن نگشتہ۔ چنانچہ خلق شدہ بود۔ ہنوز ہم چنانست۔ بعد ایں مضمون مصرع ٹیپ دراں بند چناں فرمودہ اند۔ ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

معنی ایں بیت دریں شہر ہیچکس از نکتہ رساں و معنی سنجاں و ذوی علماں بالفہم در نمی آید۔ بلکہ اکثرے میگویند کہ مہمل است۔ چہ امتداد زماں مقدار حرکت فلک را گویند۔ و سن تعلق با امتداد زماں دارد۔ اگر مقصود قائل ایں باشد کہ بمقابل سرعت رفتار اسپ فلک از حیرت یا از رشک ساکن گشتہ۔

ساکن ہو گیا۔ تو اس صورت میں امتداد
زماں ہی نہیں پایا جاتا۔ اور جب امتداد
زمانہ نہ پایا گیا۔ تو گھوڑے کی موجودگی
کہاں۔ بلکہ کوئی چیز بھی نہ پائی جائیگی۔
اور اس صورت میں گھوڑے کی موجودگی
کہاں سے آئی۔ اور اگر شاعر کی یہ غرض
ہے۔ کہ گھوڑے کی رفتار کی تیزی کے مقابلے
میں آسمان کی حرکت گویا بمنزلہ عدم کے ہے۔
تو اس صورت میں آسمان نے جتنی حرکت کی۔
تھوڑی یا بہت۔ امتداد زماں حاصل ہوتا
ہے۔ جب امتداد حاصل ہوا۔ تو صاحب
سن ہونا گھوڑے کا بھی ثابت ہوتا ہے۔
اور اگر شاعر کا یہ خیال ہے۔ کہ اس شعر میں
غلو ہے۔ جو حسب عقل و عادت محال ہو۔
تو اس صورت میں بھی نفی سن پر ثبوت چاہئے۔
جیسا کہ نظامی نے فرمایا ہے۔ ؎

زسم ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

چھ ہونا زمین کا اور آٹھ ہونا آسمان کا اس
شعر میں مصرع اوّل سے ثابت ہے۔ یعنی

زسم ستوراں دراں پہن دشت

دریں صورت امتداد زماں یافتہ نمی شود۔ وہر گاہ
امتداد زماں یافتہ نشد۔ وجود اسپ
چہ۔ بلکہ وجود ہیچ چیز ہم یافت نمی گردد۔
ودریں حال وجود رفتار است از کجا
آمد۔ واگر مقصود قائل ایں باشد۔ کہ
مقابل سرعت رفتار اسپ حرکت
فلک گویا بمنزلہ عدم است۔ پس
دریں صورت فلک ہر قدر کہ حرکت
کرد۔ خواہ اندک خواہ بسیار۔ امتداد
زماں حاصل می شود۔ ہر گاہ امتداد
حاصل شد۔ صاحب سن گشتن اسپ
نیز ثابت می شود۔ واگر قائل بر آں
رفتہ۔ کہ دریں شعر غلوست۔ کہ
بحسب عقل و عادت ہر دو محال باشد۔
دراں صورت ہم اثبات ادّعا یعنی ثبوت نفی
سن میباید۔ چنانچہ نظامی فرمودہ۔ ؎

زسم ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

شش شدن زمین وہشت گشتن آسمان دریں
شعر از مصرع اوّل ثابت شد۔ یعنی

زسم ستوراں دراں پہن دشت

اور مرزا صاحب کی بیت بلکہ تمام بند میں کچھ
ثبوت اپنے دعوے پر نہیں ہے ۔ ازبسکہ
آپ جامع علوم اور فن شاعری میں اُستاد
کامل ہیں ۔ لہذا عرض ہے ۔ کہ اگر یہ شعر
حقیقت میں مہمل ہو ۔ تو ویسا ہی تحریر
فرمائیے ۔ تاکہ عبث اس کے معنی کی تلاش
میں فکر نہ کی جائے ۔ اور یہ امر مرزا صاحب
ممدوح سے بہت دُور معلوم ہوتا ہے ۔
کہ وہ مہمل فرمائیں ۔ اور اگر یہ شعر با معنی ہو ۔
اور اس جگہ کوئی اُس باریکی کو نہیں پہنچا ہو ۔
تو جناب اس کے معنی مشرح و مفصل بدلائل
تحریر فرمائیں ۔ خواہ دُوسرے کاغذ پر خواہ اسی
فرد کی پُشت پر ۔ تاکہ لذت مطلب سے جناب کی
بدولت ہم بھی کامیاب ہوں ۔ اور منکروں کو
ساکت کریں ۔ اور یہ خیال مرزا صاحب کے
اس شہر (عظیم آباد) سے تشریف لے جانیکے
بعد دلوں میں آیا ہے ۔ ورنہ خود مرزا صاحب
قبلہ سے پُوچھ لیا جاتا ۔ یہ کاغذ بہت جلدی
میں لکھا گیا ہے ۔ عجب کیا بلکہ یقین ہے ۔
کہ جا بجا غلطی ہو گئی ہو ۔ ملامت نہ فرمائیےگا ۔
زیادہ حد ادب ۔ عظیم آباد سے +

و در بیت مرزا صاحب قبلہ بلکہ در تمامی بند
ہیچ ثبوت بر ادعائے مقصود نیست ۔ چوں
آں جناب جامع علوم اند و در فن شاعری اُستاد
کامل لہذا استدعا اینکہ اگر ایں شعر
در حقیقت مہمل باشد ۔ ہمچناں قلمی فرمایند ۔
تا عبث بتلاش معنی آں فکر کردہ نشود ۔ و
ایں بسیار از مرزا صاحب ممدوح بعید
می نماید ۔ کہ مہمل فرمایند ۔ و اگر ایں شعر
با معنی باشد ۔ و دریں جا کسے بداں
باریکی نمی رسد ۔ آں جناب معنی آنرا
مشرح و مفصل بدلائل قلمی فرمایند ۔
خواہ بر کاغذ دیگر خواہ بر ظہر ایں فرد ۔
تا از لذت معنی بطفیل آں جناب کامیاب
شویم ۔ و منکراں را ساکت گردانیم ۔
و ایں خیال بعد از تشریف بردن
جناب مرزا صاحب و قبلہ ازیں شہر
مردماں را بدل آمد ۔ ورنہ خود از مرزا صاحب
و قبلہ استفسار نمودہ می شد ۔ ایں کاغذ در
عجلت نوشتہ شد ۔ عجب چہ بلکہ یقین است ۔
کہ جا بجا غلطی شدہ باشد ۔ ملامت نخواہند فرمود ۔
زیادہ حد ادب ۔ از عظیم آباد * +

* کاتب معترض کا نام نہیں لکھا ۔ خدا جانے ۔ کون وقت کے رستم ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر ۔

جواب - شاعروں نے ایسے قول بہت کہے ہیں - کیا نہیں دیکھا تو نے کہ وہ ہر جنگل میں پھرتے ہیں اور امر محال کا دعوے کرنا شاعروں میں شائع ہے - **سعدی** رح کہتے ہیں آسمان کی ڈہری (جھکی ہوئی) پیٹھ خوشی سے سیدھی ہوگئی جب کہ مادر ایام نے تجھ ایسا لڑکا جنا - **عرفی** کہتے ہیں - وہ سبک سیر (گھوڑا) کہ جب تو اُس کو تیز بھگائے - ازل سے ابد کو اور ابد سے ازل کی جانب آجائے - چلنے میں پسینے کے قطرے جو اس کے ماتھے سے ٹپکیں - تو شبنم (اوس) کی طرح وقت واپسی کے بیٹھیں کفل میں - اگر وہ گھوڑا دم بھر کو اپنی تیزی سورج کو دیدے - تو برج ثور سے منزلوں کو بہ ترتیب طے کرتا ہوا (سورج) برج حمل میں آجائے - پھر **عرفی** کہتے ہیں - زمانوں کے منہ پر اگر گھوڑا اپنی آستین جھاڑ دے - تو تموج کی کوشش سے زمانۂ حال (جو حادث ہے) قدیم ہو جائے - اور یہ بھی **عرفی** کا شعر ہے - اگر ایک مرتبہ آوانہ سے یہ گھوڑا بڑھ لے - تو اُس کی جوانی کی میں تعریف کروں اور اگر ایک نقطے پر چلے - تو اُس رفتار کا نام میں طے ارض رکھوں - **ناصر علی** کہتے ہیں - ملک فنا

جواب - شعرا ازیں مقولہ بسیار گفتہ اند - **اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ** - و ادّعائے امر محال شائع وذائع است - **سعدی** گوید - ؎

پشت دوتائے فلک راست شد از خرمی
تا چو تو فرزند زاد مادر ایام را

عرفی گوید - آں سبک سیر کہ چوں گرم عنانش سازی از ازل سوئے ابد و از ابد آید بازل - قطرہائش سم رفتن چکد از پیشانی - شبنم آسا ش نشیند گہِ رجعت بکفل - گر بخورشید دہد سرعت خود در یک دم - آید از ثور بہ ترتیب منازل بحمل - **وایضاً** برد ے از منگر آستین برافشاند شود بسعیِ تموّج زمانِ حال قدیم - **ولہ** گر بجو زند بجوانی ستائمش - ور نقطہ رود کنمش نام طی ارض - و **ناصر علی** گوید در ملک فنا ہم نہ نمودیم اقامت - از بسکہ علی تیز جہاندیم فرس را - و **ناسخ** گفتہ - ؎

ہے یہ اپنے ضعف را روز جدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر

میں بھی ہم اٹھیرے سازلبسکہ ہم نے اپنا
فرس تیز بھگایا۔ ناسخ فرماتے ہیں سہ

ہے یہ اپنے ضعف کا روز جدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر

پس اگر مضامین شعر کی بنا حکمت اور دلائل فلسفہ پر رکھی جائے تو اس قسم کے اشعار کی صحت میں کلام ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ آسمان مستدیر ہے۔ اس کے سیدھے ہونے کا دعوے درست نہیں۔ اسی طرح ترک حادث یومی ازل سے چاہئے۔ اس کا الٹا ممکن نہیں۔ اور وہ بھی اس تیزی سے کہ جبین تک ماتھے کا پسینہ زمین پر ٹپکے۔ اس سے بھی کم زمانہ میں۔ اسی طرح سورج کی حرکت دم بھر میں برج ثور سے برج حمل تک۔ اور اسی طور پر انقلاب زمانہ حال کا قدیم سے یا قدیم کا حال سے محال ہے۔ اور حرکت تدریجیہ گھوڑے کے نقطہ پر کسی طرح ممکن نہیں خاص کر ایسی تیز حرکت کہ جس کو طے ارض کہا جائے۔ اور اسی طرح باقی شعروں کا حال ہے

خلاصہ یہ کہ شاعر صاحب براق صلعم کے فرزند کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ظاہرا یہ دعوے ہے۔ کہ باوصفیکہ گھوڑا زندہ ہے مگر صاحب سن نہیں ہوتا۔ اور مسن ہونے

پس اگر بنائے مضامین شعریہ بر قوانین حکمیہ و براہین فلسفیہ گذاشتہ شود۔ در صحت امثال ایں اشعار سخنے میرود۔ چہ فلک مستدیر است دعوے راست شدنش غیر مستقیم وہم چنیں ترک حادث یومے از ازل بابد۔ و بالعکس فی نفسہ ممکن نیست۔ و لنگیے باین سرعت کہ زماں از زماں وصول عرق جبیں تا زمیں اقل بودہ باشد۔ و ہمیں نہج حرکت شمس از ثور بحمل دریک دم و ہمیں سیاق انقلاب حال بقدیم۔ یا قدیم بحال۔ محال و حرکت تدریجیہ اسپ بر نقطہ اصلا ممکن نیست۔ علے الخصوص چناں سریعہ کہ طے الارض نامیدہ شود۔ والبواقی علے ہذا القیاس +

خلاصہ مقصود قائل کہ فرس خامہ فرزند صاحب براق صلعم را می ستاید۔ ظاہرا دعاے ایں معنی است کہ آں اسپ باوجود بقا صاحب سن نمی شود۔ و از عیب

کے عیب سے بری ہے۔ اور وجہ ثبوت اس
امر محال کی سرعت قرار دی ہے۔ یعنی اُس کی
تیزی اس حد کی ہے کہ کوئی چیز اُس پر سبقت
نہیں لے جاتی۔ یہاں تک کہ سن۔ اور اردو میں بڑھنے
کے دو معنی ہیں ایک زیادہ ہونا۔ اور دوسرے
کسی چیز سے حرکت میں گزرنا۔ پس اس لفظ
(بڑھ) میں ایک صنعت مثل صنعت ایہام کی رکھی
ہے۔ اس طور پر کہ واسطے سے نفی سبقت کے
بسبب شرکت لفظ کے ازدیاد کو ثابت کیا ہے۔
(یعنی ایک یہ معنی ہوئے کہ گھوڑے سے سن کبھی آگے
بڑھ نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کبھی پیچھے رہتا ہے۔ کیونکہ تیز گھوڑا
دوسرے کو آگے نہیں بڑھنے دیتا) جیسے شیخ علی حزیں
نے یہ شعر کہا ہے۔ مشکیں شدہ ست رنگ تو اے خط سبز
فام۔ از بس درآفتاب رخ یار گشتہ [یعنی مشکین
(سیاہ) پڑ گیا ہے تیرا رنگ اے خط سبز فام۔
اس لئے کہ تو رخ یار کے آفتاب یا دھوپ میں
گھوما ہے یا متحرک ہوا کیا ہے] اس لئے کہ آفتاب
کے دو معنی ہیں۔ ایک جرم خورشید جس سے رخسار
کو تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ دوسری شعاع جس کو دھوپ
کہتے ہیں۔ اسی طرح گشتن عموماً حرکت کے معنی پر بھی
آیا ہے۔ اور استدارت کے معنی بخاص کر اطلاق

مُبّین بودن مبراست۔ و وجہ ثبوت ایں
امر محال سرعت را قرار دادہ۔ یعنی سرعتش
بحدیست۔ کہ ہیچ چیز براو سبقت نمی گیرد
حتّی کہ سن۔ و لفظ بڑھنا در ہندی
بدو معنی می آید۔ یکے افزودن و دیگر
پیشی گرفتن و گذشتن از چیزے در حرکت
پس دریں لفظ صنعتے بشبیہ ایہام بکار
بُردہ۔ بایں معنی کہ بواسطہ نفی سبقت
بسبب اشتراک لفظ نفی ازدیاد را
ثابت کردہ۔ چنانچہ شیخ علی حزیں
گفتہ ۔ ؎

مشکیں شدہ ست رنگ تو اے خط سبز فام
از بس درآفتاب رخ یار گشتہ

چہ آفتاب دو معنی دارد۔ یکے جرم
خورشید کہ بآں رخسار را تشبیہ
می دہند۔ و دیگرے شعاع آں۔
کہ در ہندی دھوپ می گویند۔
و ہم چنیں گشتن بمعنی حرکت عموماً
آمدہ۔ و ہم بر استدارت خصوصاً
اطلاق می شود۔ و تحقیق و استدارت
خط درآفتاب بمعنین دیگر و انطباق

ہوتا ہے۔ اور تحقق اور استدارت خط آفتاب میں
دعا اور معنوں پہ ہے۔ اور منطبق ہونا دلیل کا دوسرے
دو معنیوں کی نظر سے ہے۔ اس پر غور کرو اور سمجھو
یا یہ دعوے ہے کہ توسن فلک (سورج) اس گھوڑے
کے ساتھ ساتھ چلنے سے تھک گیا۔ اور یہ گھوڑا
سرعت سیر کے سبب زمانہ اور زمانیات اور فلک و
فلکیات سے گزر کر عالم بالا میں پہنچ گیا۔ کہ جس عالم میں
بقا بغیر عمر بڑھنے کے حاصل ہے مجرد ہو گئی ہیں۔
عقلیں نزدیک اعلےٰ درجہ کے حکیموں کے۔ خالی زمانہ
اور امتداد زمانہ سے۔ اور اللہ اعلم ہے اپنے بندوں
کی مراد سے۔ پوشیدہ نہ رہے۔ کہ سببیت و مسببیت کا
دعوے دو قسم پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اصل چیز
موجود ہو۔ اور اسکی مسببیت ادّعائی ہو۔ دوسرے
یہ کہ معدوم چیز کو موجود فرض کر کے اُس کے واسطے
مسببیت قرار دیں شیخ حزیںؒ کا شعر قسم اوّل سے
ہے۔ اور فردوسی و سعدی و مرزا دبیر کے اشعار قسم
دوئم سے ہیں۔ اس لئے کہ سبز فامی خط محبوب کے
موجود و متحقق ہے۔ اگرچہ اُس کی علّت کہ کیونکر
سیاہ ہو گیا ادّعائی ہے۔ بخلاف آسمان کے
چھ طبق و زمین کے آٹھ طبق ہو جانے اور
آسمان کے سیدھے ہونے اور سن کے مؤخر

دلیل نظر بمعنین دیگر ست۔ فافہم۔
یا ادّعائے ایں کہ توسن فلک
از ہم عنانی آں رخش وا ماندہ۔
و رخش مذکور بسبب سرعت سیر
از زمان و زمانیات و فلک و فلکیات
گذشتہ بعالم بالا رسیدہ۔ کہ
بقا در آں عالم بغیر ازدیاد عمر
حاصل ست۔ کہ مجرد العقول
عند الحکماء الفحول مخلوۃ
عن الزمان و امتدادہ واللہ
اعلم بمراد عبادہٖ۔ پوشیدہ
نماند۔ کہ ادعائے سببیت و مسببیت
بر دو قسم ست۔ یکے آنکہ اصل شے
موجود باشد و مسببیت آں ادعائی بود
دوئم آنکہ شے معدوم را موجود فرض کردہ
مسببیت برائے آں قرار دہند۔ و شعر شیخ حزیں
از قسم اوّل و شعر فردوسی و سعدی و ما نحن فیہ
از قسم دوئم ست۔ چہ سبز فامی خط محبوب
متحقق ست۔ اگرچہ علتش ادعائی ست
بخلاف شش گشتن زمین و ہشت گشتن
آسمان و استقامت فلک و تاخر سن

ہونے کے کہ ان میں وجودِ سببیت و مسببیت دونوں بادّعائی ہیں ✦	کہ وجودِ سببیت و مسببیت ہر دو ادّعائی ست[۱] ✦

(۲۳) سیّد المتکلمین آیۃ اللہ فی العالمین شمس العلما مولینا سیّد حامد حسین صاحب بارک اللہ رمسہ وثراہ ہیں[۲]۔ جن کی وسعت نظر پر استقصاء الافحام وعبقات الانوار دو لاجواب کتابیں شاہد عادل ہیں۔ یہ بزرگوار بھی مثل جناب مفتی صاحب (اعلی اللہ مقامہ) کے میر و میرزا دونوں شاعران اہلبیتؑ کے قدرشناس و مدّاح تھے۔ چنانچہ صاحب ردّ الموازنہ نے بحوالہ مولوی حسن مرزا صاحب مرحوم کے کتاب مذکور میں لکھا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی اس ٹیپ کو جو آپ امام حسینؑ کی شان میں ہے۔ وہ جناب پڑھ کر فرماتے تھے۔ کہ یہ مضمون تو فارسی میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ (ٹیپ یہ ہے) ؎

طے ہر قدم پہ ایک مہینے کی راہ ہے ✦ رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ ہے

یہ ظاہر ہے۔ کہ ائمہ اطہارؑ اپنے شاعروں کی عزت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ اور علماء اُن حضرات کے نائب ہیں۔ اس امر میں بھی یہ بزرگوار اپنے آقاؤں (ائمہ اطہارؑ) کے قدم بقدم رہے ہیں۔ یہی حال آیۃ اللہ فی العالمین کا تھا۔ اور اب اُن کے جانشین صدر المحققین مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی ویسی ہی عزت افزائی میر و میرزا کے جانشینوں اور اولاد کی اور اور شعرائے اہلبیتؑ کی فرماتے ہیں۔

متعلق سیّد المتکلمین حامد حسین صاحب بارک اللہ

[۱] یہ رسالہ عشرہ کاملہ ۱۰ جمادی الاول ۱۲۹۶ ہجری کو مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپا ہے۔ در یہ سے کرم فرما میر علی محمد صاحب (عارف) کی اس پر تاریخ بھی ہے۔ مگر عارف صاحب اُس زمانہ میں علی تخلص کرتے تھے کہ مشق سخن کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اب ماشاء اللہ شاعر کامل الملک عارف کامل ہیں۔ اور خاندان جناب میر صاحب میں اُن سے بہتر مرثیہ گو شاعر حقیر کے نزدیک اب نظر نہیں آتا ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] حقیر نے جو قطعہ تاریخ وفات جناب آیۃ اللہ فی العالمین کہی تھی۔ وہ علاوہ اخبار ردا نبا المومنین وطوطئ ہند وغیرہ کے اخبار معل میں اسی زمانہ میں چھپی تھی مادّہ کا مصرع یہی کہا تھا ؏ بارک اللہ رمسہ وثراہ [illegible] پورے سنین وفات ۱۳۰۶ ہجری نکلتے ہیں ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور اُن بعض مجالس میں کہ جن میں جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہٗ یا میر عارف صاحب یا میر رشید صاحب یا دولہ صاحب پڑھتے ہیں تشریف لے جاکر داد نظم کا خلعت فاخرہ عطا فرماتے ہیں۔ اور ایسا ہی شعرا اور علما کا ہے۔ خدا علما کا سایہ ہمارے سر پر رکھے۔ اور ہم کو اُن کی تعمیل احکام کی توفیق عطا فرمائے +

فصل ۴ مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ شمس طاب ثراہ

(۴) مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ شمس جو لکھنؤ میں ایک مستند عالم و ادیب مانے جاتے تھے ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ مگر ایسے محتاط و متقی۔ کہ لکھنؤ میں یہ بات مشہور ہے۔ کہ کبھی نہ کسی سُودی مقدمہ میں وکیل ہوئے۔ نہ اُس فریق کے وکیل بنے۔ جس کا باطل پر ہونا اُن کو ثابت ہوگیا۔ اور وکیل کو اکثر بات چیت کرنے پر موکل سے اُس کا حق یا باطل پر ہونا معلوم ہوجاتا ہے۔ ان کے فضل و کمال پر ان کا وہ لاجواب قصیدہ عربی شاہد عدل ہے۔ جس کے اشعار کئی ہزار ہیں۔ اور ایک قصیدہ میں تمام واقعات اختصاراً عہد جناب رسالت مآب صلعم سے لیکر شہادت امام حسینؑ کے بعد تک کے نظم فرمادئے ہیں۔ یہ قصیدہ اُن کے کامل و فاضل فرزند مولوی غلام حسنین صاحب وکیل ہائی کورٹ نظام دکن نے چھپوا دیا ہے۔ مصنف کے پاس موجود ہے۔ اور اس قصیدہ کے علاوہ اور بھی بعض ان کی کتابیں میری نظر سے گذری ہیں۔ جو ان کے ادیب کامل ہونے پر برہان قاطع ہیں۔ یہ بزرگوار بھی مدۃ العمر مرزا صاحب کے فضل و کمال کے مداح رہے ہے۔ کہ جس سے اکثر اہل لکھنؤ واقف ہیں +

فصل ۵ علامہ سید غلام حسنین کنتوری مدظلہ العالی

(۵) مولانا السید غلام حسنین صاحب قبلہ کنتوری مدظلہ العالی جن کی لاجواب کتابیں

* فلائد الغرائد [illegible] قصیدہ کا نام ہے عربی [illegible] عربی ہے۔ [illegible] لسامط المحمد۔ ولادت حضور صلعم سے قصیدہ شروع کیا ہے ۴۴۳ شعر میں اور ہر مصرعہ میں یا دہ سے زیادہ [illegible] کم سے کم آٹھ دس حرف اگر دس حرف بھی سمجھے تو تین ہزار سے زیادہ اشعار ہوئے۔ ایک ہی قصیدہ دلیل کمال ہے یہ مطبع مطلع الانوار لکھنؤ میں ۱۳۱۲ ہجری میں چھپا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ ایسے ایسے اکمل بھی ہوئے ہیں + ۲ مؤلف عصر۔

مأتین و انتصار الاسلام و لائف زبان حال سے کہ رہی ہیں۔ کہ مرزا دبیر کے کلام و کمال کا سکہ ان کے دل پر بڑا ہوا ہے۔ چنانچہ مأتین میں جا بجا مرزا صاحب کی تصنیفات[1] پر اشارے فرمائے گئے ہیں۔ اور کبھی کبھی میر صاحب و مرزا صاحب کے اشعار آبدار سے اپنی لاجواب تصنیفات کو رونق بخشتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی مصنف کسی شاعر کا کلام اپنی تصنیف میں اُسی حالت میں لائیگا۔ جب اُس کو پسند کریگا۔ ۱۸۷۲ء کے قریب قریب مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ کے یہ بزرگوار منتظم اعلےٰ تھے[2] اور ازبسکہ اُس زمانے میں دبیرؔ و انیسؔ زندہ تھے۔ اور اُس زمانہ میں اُن کے کلام اور افضلیت کی بحث ہر جلسہ اور ہر طبقہ کے آدمیوں میں رہتی تھی۔ مدرسہ ایمانیہ کیوں اس سے مستثنےٰ رہتا۔ ہرچند شاعر کہا کریں۔ کہ یاران شعرا بمدرسہ کہ برد۔ اور مدرس لاکھ کوششیں کریں۔ کہ شعر و شاعری کا چرچا مدرسہ میں نہ ہو۔ کہ اس سے لڑکوں کے سبق یاد کرنے میں حرج ہوتا ہے۔ مگر لڑکے کب مانتے ہیں۔ چنانچہ اُس زمانے میں مدرسہ ایمانیہ میں بھی یہ بحثیں رہتی تھیں میں اس

---

[1] چنانچہ مأتین جلد اول مطبوعہ کے صفحہ ۲۰۸ پر جہاں آخر منزل سفر امام حسینؑ کا بیان ہے وہاں تحریر فرماتے ہیں کہ تو ثابت ہو گیا کہ جو بعض شعرا نے نظم کیا ہے وہ بھی صحیح ہے کہ ببول کے کانٹوں سے بعض اصحاب کے زخمی ہو گئے تھے۔ اور یہ مضمون مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے۔ [illegible] ملاحظہ ہو مرثیہ مرزا صاحب کا "دستِ قضا کا قوت بازوئے حسینؑ ہے"۔ اور اسی مرثیہ میں مرزا صاحب نے وہ روایت بھی نظم فرمائی ہے۔ کہ منزل کربلا پر پہنچ کر امام حسینؑ نے ایک نیزہ نیستان کے درخت کی ایک شاخ کاٹی تو اُس سے خون تازہ جاری ہو گیا۔ یہ روایت بھی بعض شعراء اہلبیتؑ کے نظم کے حوالہ سے صفحہ ۲۶۸ پر مأتین میں درج ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض روایات لکھتے وقت علامہ مد ظلہ بعض شعراء اہلبیتؑ کے لفظ سے مرزا مرحوم کی نظم کا حوالہ فرما گئے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] حقیر کو بھی اُس مدرسہ میں اُسی زمانہ میں پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ بعض روایات کی نسبت جو مأتین میں بعض شعراء اہلبیتؑ کے مرثیوں میں نظم کرنے کا حوالہ درج ہے۔ وہ علامہ مد ظلہ سے پوچھ لوں کہ ان مقامات پر مرزا دبیر مرحوم کے مرثیوں سے آپکی مراد ہے۔ کیونکہ وہ روایات بجز نظم مرزا مرحوم اور دوسرے شاعر کے مرثیوں میں میری نظر سے نہیں گذری ہیں اور میں نے لکھنؤ سے صفر ۱۳۳۰ھ میں ایک عریضہ بھی فوراً خدمت علامہ مد ظلہ میں بھیجا۔ مگر جناب قبلہ نے یہ خیال کیا کہ کثرت تصنیف وغیرہ سے فرصت نہ ہوگی پھر خاموش ہو رہا ۱۲ مؤلف حقیر

مدرسہ ایمانیہ اور دبیر و انیس

واقعہ کہ علامہ کنتوری مدظلہ کی لاالف سے انہیں کے متبرک الفاظ میں لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۷ الاالف کا "لے حبیب حسین*۔ میرے درجہ کے طلبا اور نیز دیگر درجہ کے طلبہ جو اعلیٰ طبقہ کے تھے۔ سب میں ایک لڑکا سید محمد مہدی نصیر آبادی تھا۔ (جو آج کل بڑے نامی گرامی وکیل الہ آباد کے ہیں)۔ اُس کی ذہانت اور تیزی ایسی تھی۔ کہ میں نے ایسا ذہین اور زود فہم لڑکا نہیں دیکھا۔ میں اُس کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ شاید اکثر میرے ہی قریب شب کو رہتا تھا۔ اور تمام طلبہ کو اُس سے رشک اور غبطہ ہورہا تھا۔ یہ ساری جماعت اطفال انیسیہ مشہور تھی یعنی میر انیس مرحوم کے کلام پر گرویدہ تھے۔ اور محمد مہدی سلمہ اللہ آپ کو دبیریہ کہتا تھا یعنی مرزا دبیر مرحوم کے کلام دقیق پر زیادہ راغب تھا۔ اور یہ محض لڑکپن دونوں گروہ کا (تھا)۔ اس لئے کہ اہل علم کی شان ارفع ہے اِس جھگڑے سے۔ پھر چونکہ یہ اکیلا اور سب کی نظروں میں خار تھا۔ لہٰذا اس مسئلہ میں محمد مہدی اور دیگر طلبہ سے مباحثہ زیادہ رہا کرتا تھا۔

سید محمد مہدی صاحب وکیل الہ آباد

ایک روز روتا ہوا محمد مہدی میرے پاس آیا۔ اور لوگوں کی کاوش اور پرخاش بے جا کی ازحد شکایت کی۔ میں نے کہا۔ کہ دو شعر میر انیس کے ہم تم کو بتلاتے ہیں۔ اُن کے معنی تم اپنے مخاطبین سے پوچھو۔ پہلا شعر ؎

جب قتل کی شب سبطِ نبیؐ کو خبر آئی + اے چاند یداللہ کی شب دوپہر آئی

یہ خبر کہاں سے آئی؟ خبر کا آنا اُسی جگہ بولا جاتا ہے۔ کہ دُور مقام سے وہ خبر آئی ہو۔ ایضاً دوسرا پہر شب کا ہونا محسوسات سے ہے۔ جو ہر شخص بذاتہ جان سکتا ہے۔ خبر دہی کا محتاج نہیں ہے۔ اور محسوسات کی خبر دہی اُسی مقام پر ہوتی ہے۔ جو ہماری حس سے غائب ہو۔ دُوسرا شعر ؎

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری سے + چُنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو

* قریباً ۱۸۶۸ء کا یہ تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس کے چار برس بعد میر صاحب و مرزا صاحب کا انتقال ہوتا ہے + ۱۲ مولف حقیر

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ آستین کا چُنوانا زینت کے واسطے ہوتا ہے۔ اور جھُریاں پڑنے سے آدمی کے بدن کی زینت جاتی رہتی ہے۔ پس یہ تشبیہ بطور مدح کے ہے یا بطور ذم کے۔ کیا غرض شاعر کی ہے؟ میری غرض میر انیس پر اعتراض کی نہ تھی۔ بلکہ اُن اطفال کو جو روزانہ بیہودہ بحث کر کے اپنے اوقات عزیز کو خراب کرتے تھے۔ اور علم معانی و بیان جو اُن کو پڑھنا ضرور تھا۔ اُس کی جگہ یہ بحث کرتے تھے۔ بقول مشیرؔ

جھگڑا ابکر کا ہے نہ جناب امیرؑ کا ✦ اب قصّہ رہ گیا ہے انیسؒ و دبیرؒ کا

یہ لغو بحث نہ دینی ہے نہ دنیوی۔ **خلاصہ**۔ محمد مہدی نے اُن اطفال سے یہی دو شعر پیش کر کے زور شور سے بحث کی۔ وہ جماعت چونکہ ابھی فوائد بلاغت سے واقف نہ تھی۔ جواب سے عاجز ہو کر بخدمت میر انیس مرحوم گئے۔ میر صاحب نے خلق عمیم سے اُن کو طلبہ مدرسہ سمجھ کر بُلایا۔ اور اپنے پاس بٹھایا۔ پہلے سے میر صاحب کو ان اطفال کا اپنا معتقد ہونا معلوم تھا۔ اس کے بعد پوچھا۔ آج بے وقت کیوں آئے؟ اُن اطفال نے بے سمجھے بوجھے ساری کیفیت بیان کی۔ اور محمد مہدی کا ذکر کیا۔ کہ ہماری جماعت میں وہی ایک **دبیریہ** ہے۔ اور ہم کو روزانہ دق کرتا ہے۔ اور آپ کے کلام کے اغلاط نکالا کرتا ہے۔ میر صاحب کو ان کا کلام صحیح نہ معلوم ہُوا۔ بلکہ اُلٹا سمجھے۔ کہ یہ لڑکے مجھ پر اعتراض کرنے آئے ہیں۔ نہایت برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے **دُور** ہونے کا حکم دیا۔ اور جواب سوال کچھ بھی نہ دیا۔ وہ لڑکے **محجوب** ہو کر واپس آئے۔* پھر اُس روز سے محمد مہدی کا پیچھا چھُوٹا۔ اور وہ بحث بے جا بالکل اُٹھ گئی۔ اور ہماری غرض اسی قدر تھی۔ اصل کلام کا صحیح یا غلط ہونا یہ مقصود نہ تھا۔ میں (بے بضاعت) عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت علامہ کنتوری

*خوامخواہ جو لوگ میر صاحب یا مرزا صاحب کے کمالات سے انکار کرتے ہیں اور فنا کی نہیں سمجھتے۔ اور پھر ایک کو دُوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کو ہم نے اکثر شرمندہ ہوتے دیکھا ہے۔ ۱۲ مؤلف۔

ہے نہ جناب نبی کا

میر صاحب کے کمال کے بھی قائل ہیں۔ اور یہ دونوں اعتراض اُنھوں نے محض اس غرض سے فرمائے تھے۔ کہ روزمرہ کی یہ بحث لڑکوں میں سے دُور ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ورنہ یہ دونوں شعر قابل اعتراض نہیں ہیں۔ شعر اوّل الذکر تو یُوں صحیح ہے۔ کہ جملہ کی دو قسمیں ہیں۔ یا انشائیہ یا خبریہ۔ اور ظاہر ہے۔ کہ یہ جملہ کہ "دوپہر رات آئی" خبریہ ہے۔ پس ایسی جگہ کہ جب کوئی شخص وقت کی خبر دے۔ خبر دینا یا خبر آنا ہی کہا جائیگا۔ جو چیزیں محسوسات سے متعلق ہیں۔ اُن کی بھی خبر آتی ہے۔ مثلاً کسی وقت چاند گہن ہو۔ اور کوئی شخص کسی شخص سے کہے۔ کہ چاند گہن کی نماز پڑھو۔ اس وقت چاند کو گہن لگا ہے۔ تو اس کو خبر دینا یا خبر آنا ہی کہینگے۔ خواہ وہ مقام بعید سے آئے یا قریب سے۔ دُوسرے اعتراض کا جواب میرے نزدیک یہ ہے۔ کہ ہر چیز کا حُسن اُس کے اصلی اسباب سے ہے۔ مثلاً موسم گرمی کا حُسن یہ ہے۔ کہ گرمی خُوب پڑے۔ آدمی پسینے میں شرابور ہو جائے۔ جاڑے کا لُطف یہ ہے۔ کہ سردی کی شدت سے کانپے اور تاپے۔ بڑھاپے کا لُطف اس میں ہے۔ کہ ضعیفی کے آثار ظاہر ہوں۔ کہ جن میں سے ہاتھوں پر جھرّیوں کا پڑنا بھی ہے۔ اور بیشک آستین زینت کے واسطے چُنتے ہیں۔ پس یہاں خود ضعف پیری نے جامہ اصلی یعنی جسم کی آستینوں کو چُنا ہے کہ حُسن پیری کا ظاہر ہو۔ اور یہ بڑھاپے کی مدح ہے۔ ذم نہیں ہے۔ ایک میرے بزرگ (عزیز) نے (جن کا نام آغا سید صاحب مرحوم اور تخلص محبّت* تھا) پیری کے متعلق کیا خُوب شعر کہا ہے۔ ہدیۂ ناظرین کرتا ہُوں ۔ ؎

جواب ۱ اعتراض

---

* آغا سید صاحب محبت لکھنوی مرحوم جناب آغا عشق لکھنوی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ جو میرے دُور کے رشتہ دار تھے۔ میرے پاس کوٹہ میں بھی تشریف لائے اور چند روز مہمان رہے تھے۔ اور جب میں ۱۳۱۱ھ میں کربلائے معلّےٰ سے واپس آتا تھا۔ تو یہ مشہد مقدس جانے کو بمبئی میں آئے تھے۔ وہیں آخری ملاقات ہُوئی تھی۔ (المولف ۱۲) صُورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں کیسی کیسی صحبتیں نواب پریشاں ہو گئیں + ۱۲ مؤلف حقیر

چمک کے کہتے ہیں موئے سفید پیری ہیں • کہ اپنے عہد کے اہل شباب ہم بھی ہیں

(۶) مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب محدّث جو فرقۂ اہل حدیث کے ایک عالم کامل علم دوست رئیس گذرے ہیں۔ اور جن کی تصانیف سے بہت سی کتابیں ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب حدیث غاشیہ میں مرزا صاحب کی یہ رباعی لکھی ہے۔ جس سے ان کی پسند طبعی و رجحان کا حال معلوم ہوتا ہے۔*

فصل ۶ مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب

رباعی

کس خواب میں زندگی بسر کرتا ہے؟ کس فکر میں شام کو سحر کرتا ہے؟
طالع ہوئی صبح بج گیا کوس رحیل بیدار ہو۔ قافلہ سفر کرتا ہے

(۷) مولوی عبد الحی صاحب لکھنوی فرنگی محلی۔ یہ فرقۂ احناف کے متکلمین میں فرد مانے جاتے ہیں۔ مولوی صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی کے جواب میں جو ان کی کتابیں ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے خدا کی شان اور ان کے کمال و ادب کی آن بان نظر آتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ مولوی صدیق حسن خاں صاحب ہزاروں روپیہ اہل زبان (عربوں) وغیرہ کو جا بجا بھجواتے رہتے تھے۔ اور غالباً اپنی کتابیں اُن کو دکھلا کر زبان کے متعلق بلاغت و فصاحت کی صیقل کرا لیتے تھے۔ جیسا کہ سُنا گیا ہے۔ یہ اُن کے مقابلہ میں ایک غریب (مفلس) تھے۔ مگر انہوں نے محنت کر کے خود ہی اپنی عبارتوں کو ایسا فصیح و بلیغ لکھا ہے۔ کہ دیکھنے والے کو علاوہ اور کمالات کے انکی سلاست و بلاغت و فصاحت زبان پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ ایسے ادیب کامل بھی میر و مرزا کے کمالات کے قائل تھے۔ چنانچہ میرے کرم فرما مولوی سلیم الدین صاحب

فصل ۷ مولوی عبد الحی صاحب عالم کامل حنفی

* یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کہ جب تک کسی کے کلام کو کوئی مصنف یا مؤلف دل سے پسند نہ کرے اپنی کتاب میں نہیں لکھتا۔ خصوصاً مولوی صدیق حسن خاں صاحب تو بہت کم کسی شاعر اردو کا کلام اپنی تصانیف میں لاتے ہیں۔ پس اس سے ان کی پسند کا پتہ چلتا ہے • مؤلف حقیر۔

درویش سیاح* ناقل ہیں۔ کہ ایک مرتبہ مَیں مولوی عبدالحی صاحب کی زندگی میں لکھنؤ میں گیا۔ مولوی صاحب سے حسن عقیدت تھی۔ اُن کی خدمت میں پہنچا۔ نہایت خلق و مروت سے پیش آئے۔ روزمرہ حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز مَیں نے عرض کیا۔ کہ لکھنؤ کی وہ تمام چیزیں جن کی مَیں تعریف سُنتا تھا دیکھ چکا۔ دبیرؔ و انیسؔ کی شاعری (مرثیہ گوئی) کی بہت تعریف سُنی تھی۔ افسوس وہ دونوں کامل گذر گئے۔ اب آپ مجھے کسی ایسے شخص سے ملا دیجئے۔ جو ان کا کلام صحیح مجھے سُنا دے۔ فرمایا۔ اچھا آج آپ رات کو میرے پاس آئیے۔ رات کو حاضر خدمت ہوا۔ تو بالکل تخلیہ تھا۔ مجھے یہ خیال تھا۔ کہ شاید کسی ایسے شخص کو مولوی صاحب مرحوم نے بلایا ہوگا۔ جو اُن کا کلام مجھے سُنا دے۔ مگر وہاں کسی اور کو نہ پایا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ دبیرؔ و انیسؔ کا کلام سنو گے؟ مَیں نے عرض کی۔ حضور دل تو بہت چاہتا ہے۔ فرمایا۔ اچھا۔ ایک جلد نکالی۔ اُس میں سے دونوں بزرگوں کے مختلف مرثیوں کے منتخب بند مجھے سُنائے۔ اور فرمایا۔ کہ ایسے کامل شاعر ہندوستان میں تو کیا عرب و عجم میں بھی نہیں نکلینگے۔ اور درحقیقت وہ تمام بند جو اُنہوں نے ان دونوں بزرگوں کے پڑھے لاجواب تھے +

فصل ۸ مولوی عبدالعلی صاحب آسی

(۸) مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی۔ یہ بھی فرقہ احناف میں اعلےٰ درجہ کے عالم اور ادیب کامل گذرے ہیں۔ ابھی دو تین برس ہوئے لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ان کے حاشیہ بڑی بڑی کتابوں پر زبان حال سے ان کے کمال تبحّر کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ بھی مرزا صاحب مرحوم کے کمال کے تمام عمر معترف رہے ہے۔ جب مرزا مرحوم کے مشہور مادّہ تاریخ طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس پر انیسیوں نے اعتراض کیا۔ کہ سنین مقصود نہیں نکلتے۔ تو انہوں نے مرزا صاحب کی تائید میں ایک مبسوط رسالہ لکھ کر اہل ملک کو سمجھایا اور ثابت کیا تھا۔ کہ سن مقصود کے اعداد نکلتے ہیں۔ اور اعتراض غلط ہے۔

* مولوی سلیم الدین صاحب ایک صوفی مشرب بزرگ ہیں۔ جو بصرت پور میں اکثر رہتے ہیں۔ آج کل ہی سنہ ۱۹۱۲ء میں کوٹہ راجپوتانہ میں آ گئے ہیں۔ یہیں مجھ سے یہ حکایت انہوں نے ایک دن بیان کی + ۱۲ مؤلف

مرزا صاحب کی تاریخ وفات بھی کہی تھی۔ جس کا ایک شعر میں لکھ چکا ہوں۔

(۹) مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم دہلوی۔ یہ کامل اپنے معاصر مرزا دبیر مرحوم کے کمال کے بدرجۂ کمال معترف و مدّاح تھے۔ اور میں نے لکھنؤ کے بعض مُسن آدمیوں سے سُنا ہے۔ کہ جب مرزا غالب (سنہ ۱۲۵۲ھ کے قریب قریب) لکھنؤ میں آئے تھے (اُس وقت مرزا دبیر کی شہرت کا آفتاب عروج پر تھا)۔ وہ مرزا دبیر سے ملے تھے۔ پھر اُس کے مدّتِ دراز کے بعد ان کے بھانجے مرزا عبّاس بیگ مرحوم لکھنؤ کی قسمت میں (بعد غدر سنہ ۱۸۵۷ء) اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ اور کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی رہے۔ لکھنؤ میں پھر انھوں نے پنشن بھی لے لی تھی۔ یہ مرزا صاحب کے کلام کے فدائی تھے۔[۱] ان کے پاس جوان کے ماموں مرزا غالب مرحوم کے خطوط آتے تھے۔ اُن میں ہمیشہ مرزا دبیر کو وہ سلام اور کبھی کبھی مختصر پیامِ اشتیاقِ ملاقات بھی لکھا کرتے تھے۔ ڈپٹی عبّاس بیگ مرحوم کے بیٹے مرزا فیاض بیگ منصف حاتم تخلّص میرے نانا (میر محمد ظہیر[۲]) اور جناب مرزا اوج صاحب مدظلہ العالی کے شاگرد بھی تھے۔ افسوس کہ وہ بھی انتقال فرما گئے۔ اب کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو وہ خطوط نکال دے۔ نہ اس امر میں کوئی بحث ہے۔ کہ مرزا غالب مغفور مرزا دبیر مرحوم سے ملے تھے یا نہیں مطلب تو فقط اتنا ہے۔ کہ وہ مرزا دبیر کے کمالات کے اور مرزا دبیر اُن کے دل سے مدّاح تھے۔ اس کا ثبوت تحریری حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) منشی فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر کے جلد اوّل کے

---

[۱] میں نے فروری سنہ ۱۹۱۲ء میں مسٹر عماد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ کے ہمراہ جاکر سورج بلی صاحب سے اس امر کی تحقیق کرنا چاہا کہ لکھنؤ میں کہنے ہیں مرزا غالب مرحوم مرزا دبیر مغفور سے ملے تھے یا نہیں۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ کہ تحقیق تو یاد نہیں ہے مگر مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ چچا ڈپٹی عباس بیگ صاحب کہا کرتے تھے۔ کہ مرزا غالب مرزا دبیر سے ملے تھے۔

[۲] ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے یہاں عشرۂ محرم میں رات کو مجلس ہوتی تھی میر ظہیر مرحوم پڑھتے تھے۔ تمام شاہزادے اور معززین شہر کا مجمع ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اپنے نانا مرحوم کے ہمراہ گیا۔ اور ان کی پیش خوانی میں سلام پڑھا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

صفحہ ۲۲۵ پر ۱۸۶۲ء میں بمقام دہلی مرزا غالب مرحوم کے حالات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا غالب صاحب کی صحبت میں ایک دن مرثیہ کا ذکر آگیا۔ فرمایا۔ کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا۔ تین بند لکھ کر دیکھا۔ تو واسوخت ہوگیا۔ وہ بند یہ ہیں:-

مرثیہ مصنفہ غالب مرحوم

*

(۱)

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصومؑ کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو۔ بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگۂ نُہ پایہ جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دل بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں۔ اس رو سے کہو برق نہیں ہے

یہ بند مجمع میں پڑھ کر مرزا غالب نے فرمایا۔ کہ "واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا"+

* ناظرین! اس بندۂ ناچیز کے کہنے سے ان بندوں کو بنظر غور ملاحظہ فرمایئے۔ بندش الفاظ۔ طرز بیان۔ مضمون آفرینی۔ زبان۔ یہ سب باتوں کو دبیر و انیس کے کلام کا طرز ذہن میں ملحوظ رکھ کر دیکھئے۔ مجھے آئندہ اس کی نسبت ایک بحث کرنا ہے۔ آپ کو (جج) حکم بناؤنگا فیصلہ کرنا ہوگا+ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مرزا غالب مرحوم مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کو سب مرثیہ گویان سے بہتر سمجھتے تھے۔ اب یہاں ایک وہم پیدا ہوتا ہے۔ جس کو بعض میرے دوستوں (طرفداران میر انیس صاحب) نے مجھ سے بیان فرمایا۔ اور وہ یہ کہ میر صفیر جس طرح مرزا غالب کے معتقد اور شاگرد تھے۔ اسی طرح مرزا دبیر کے۔ شاید انھوں نے اپنے ایک استاد مرزا دبیر مرحوم کی طرفداری میں یہ الفاظ لکھ دئے ہوں۔ اس لئے میں نے اس باب میں زیادہ چھان بنان کی مثل مشہور ہے۔ کہ جوئندہ یابندہ۔ مجھے ایک غیر شخص حنفی المذہب کی تحریر ملی۔ جو مرزا دبیر کے نہ شاگرد ہیں نہ طرفدار۔ وہ کون؟ مولوی محمد امجد علی صاحب ریاض۔ یہ بزرگوار محرم ۱۲۷۷ھ میں غدر ۱۸۵۷ء کے تخمیناً تین چار برس بعد دہلی کے دیکھنے کو متھرا سے گئے ہیں۔ مرزا غالب مرحوم کی خدمت میں بھی پہنچے۔ یہ شاعر بھی ہیں ۶ محرم ۱۲۷۷ھ کے واقعہ میں اپنی کتاب (سرور ریاض) مطبوعہ میں لکھتے ہیں "بعدہٗ مرزا (غالب) نے ۳ بند اپنے مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے۔ چلائے۔ وہ بند میں نے طلب کئے۔ مرزا نے اپنے دست خاص سے لکھ دئے" (یہاں وہی ۳ بند لکھے ہیں۔ جو میں جلوہ خضر سے اوپر لکھ چکا ہوں) "پھر مولوی امجد علی صاحب ریاض لکھتے ہیں۔ کہ مرزا خود فرماتے تھے۔ کہ "یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ ناتمام رہ گیا" ان روایتوں کا سننے والا منصف مزاج کم سے کم اتنا فیصلہ تو ضرور کریگا۔ کہ اس باب میں مرزا غالب غالباً تفضیلیہ تھے۔ یہاں تفضیلیہ سے میری مراد یہ ہے۔ کہ وہ مرزا دبیر کو اُن کے تمام معاصر مرثیہ گویوں پر ترجیح و تفضیل دیتے تھے۔ مگر میرے اور معاصرین نے اس باب میں جو جو صفائیاں اور موشگافیاں اور کوششیں فرمائی ہیں۔ اُن کو لکھنا بھی میں اپنا فرض مورخی سمجھتا ہوں۔ اُن میں سے ایک ہمارے مخدوم مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مدظلہ العالی

مولوی محمد امجد علی صاحب ریاض

حضرت حالی مدظلہ العالی

ہیں۔ جو غالبؔ تمام یا اکثر لکھنؤ کے شاعروں کو ناقص اور دہلی والوں کو کامل ثابت کرنیکی کوشش فرماتے ہیں۔ خواجہ صاحب موصوف کا دیباچہ دیوان حالی میرے اس خیال کی تائید کر رہا ہے۔ کہ اُس میں جتنے شاعری کے نقص اور کمزوریاں بیان فرمائی ہیں۔ اکثر میں لکھنؤ والوں کے اشعار نظیراً پیش کئے ہیں۔ اور جتنے شعر کی عمدگیاں اور لطائف بیان کی ہیں۔ سب یا اکثر میں دہلی کے شاعروں کے اشعار لائے ہیں۔ یہاں تک کہ لکھنؤ والوں کی وہ مثنوی بھی بادِ سموم عیوب شاعری سے نہیں بچی۔ جو ہم لکھنؤ والوں کے لئے مایۂ ناز ہے۔ جس کو گلزار نسیم کہتے ہیں۔ حالانکہ پروفیسر آزاد مرحوم بھی اُس مثنوی کو بے مثل آب حیات میں بتلا چکے ہیں۔ اور غالباً کسی دہلی کے منصف مزاج شاعر کو اُس کی یکتائی میں کلام نہیں ہے۔ اس امر کی شکایت تنہا مجھ کو نہیں ہے۔ بلکہ عموماً لکھنؤ والوں کا یہی خیال ہے۔ جیسا کہ وکیل ہائی کورٹ منشی چک لبست صاحب کشمیری پنڈت نے شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ بھی اس موقع پر لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ مولوی حالی صاحب بھی یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ میر انیس مرحوم جو یہ فقرہ اکثر لکھنؤ والوں سے فرمایا کرتے تھے۔ کہ صاحبو لکھنؤ والے یوں نہیں بولتے۔ یہ میری خاص زبان ہے۔ وہ گویا دہلی کی زبان پر فخر کرتے تھے۔* یہ خیال غلط غالباً پہلے پہل پروفیسر آزاد مرحوم کو پیدا ہوا تھا۔ اور اسی بنا پر اُنھوں نے (غالباً) میر صاحب کو مرزا صاحب پر تفضیل دینے کی کوشش فرمائی۔ مگر چونکہ مزاج میں انصاف تھا۔ مرزا صاحب کے کمالات کا بھی کچھ نہ کچھ اعتراف فرمایا۔ مولوی حالی صاحب کا دیباچہ دیوان آب حیات کے بعد کی تصنیف ہے۔ گویا وہ نقش اوّل تھا۔ اور یہ نقش ثانی۔ اُس سے بڑھ کر آب و تاب دکھلائی۔ اور میر صاحب کو مرزا

* پس میر صاحب کو دہلوی اور مرزا صاحب کو لکھنوی سمجھ کر مولوی حالی صاحب نے غالباً (حضرت غالب مرحوم کے خیال کے خلاف) میر کو مرزا پر تفضیل دی۔ حالانکہ واقعہ معکوس ہے۔ مرزا صاحب دہلی کی پیدائش ہیں۔ مگر بجز دو چار لفظوں کے اُن کی زبان مستند لکھنؤ کی زبان ہے جس کی سند تمام لکھنؤ اور محلات شاہی تک میں لی جاتی تھی ۱۲ مؤلف حقیر

گلزار نسیم

صاحب پر خوب خوب تفضیل دی۔ (بقول غالب مرحوم) ؎

پہلے اس دل پر بھلا لگتا تھا داغ + زخم لیکن داغ سے بڑھ کر کھلا

حالانکہ میر صاحب کے قول مذکورہ کی تشریح جو میر مہدی حسن صاحب احسن مؤلف واقعات انیس نے فرمائی ہے۔ واقفان راز جانتے ہیں۔ کہ وہ صحیح ہے۔ جس کو میں اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھ آیا ہوں۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ میر صاحب فیض آباد کی بافیض زبان پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ جہاں کی وہ پیدائش تھے۔ اور جہاں اوّل اوّل زبان اردو کی درستی شروع ہوئی۔ اور جس کی تکمیل لکھنؤ میں آخرکار ہوئی۔ بہر حال مولوی حالی صاحب یادگار غالب کے صفحہ ۲۸۳ و ۲۸۴ پر یہ لکھتے ہیں "ایک بار غفرانمآب مجتہد العصر سیّد محمد صاحب مرحوم کی خواہش سے مرزا غالب نے ۳ بند اردو مرثیہ کے لکھے چونکہ اس کوچہ میں قدم رکھا تھا۔ اور فرماتے ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ تیز گوئی سے کمال تک پہنچ چکے تھے اور قوٰے میں انحطاط شروع ہوگیا تھا مشکل سے مسدّس کے ۳ بند لکھے جس میں کا پہلا بند ہم کو یاد ہے۔ یہاں نقل کیا جاتا ہے ع ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو۔ الخ"۔ یہ وہی بند ہے۔ جو میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ پھر مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ بند مجتہد العلماء کی خدمت میں بھیج دئے۔ اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند محض امتثال امر کے لئے لکھے ہیں۔ ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ اُن لوگوں کا حصّہ ہے۔ جنہوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔ اُن کا قول تھا کہ "ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا"۔ اس عبارت کو خواجہ حالی صاحب اگر یوں لکھتے۔ تو شاید زیادہ مناسب موزوں ہوتی۔ انیس و دبیر جیسے مرثیہ گو نہ ہوئے نہ آئندہ ہونگے۔ مگر بصیغہ واحد (بجائے جمع) لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کسی ایک صاحب کو لکھا تھا پھر کچھ

سوچ کر دُوسرے صاحب کو بھی لکھ دیا کہ کسی اَنیسی یا دبیری کی دلشکنی نہ ہو (ناسخ مرحوم)

زاہد کا دل نہ خاطرِ میخوار توڑیئے + سو بار توبہ کیجئے سو بار توڑیئے

مشکل یہ آپڑی تھی۔ کہ اگر وہ اس مقام پر صرف میر صاحب کو لکھتے۔ تو یہ مقولہ حضرت غالب کا بہت مشہور ہو چکا تھا۔ کہ مرثیہ گوئی حق دبیر کا ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ صریح خلاف واقع ہوتا۔ اور اگر محض مرزا صاحب کا ہی نام لکھتے۔ تو اُن کا دل نہ مانتا۔ کیونکہ اپنے دیوان کے دیباچہ میں تو وہ ہر پہلو سے میر صاحب کو ترجیح دے چکے تھے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے۔ کہ بعض چیزوں کے میر صاحب اور بعض کے مرزا صاحب موجد ہیں۔ خیر یہاں تک بھی مرزا صاحب کے طرفدار صبر کر لیتے۔ اور یہ ممکن بھی ہے۔ کہ مرزا غالب مرزا دبیر کو عام رنگوں میں افضل سمجھتے رہے ہوں۔ اور میر انیس مرحوم کو اُن کے رنگ خاص میں اچھا سمجھا ہو۔ گو ہم رنگ ہونے کے خیال سے مرزا کے رنگ بلیغ و دقیق کو وہ زیادہ پسند کرتے ہوں۔ مگر اب یہ بھی سُنئے۔ کہ حیات انیس و واقعات انیس کے مؤلف کیا فرماتے ہیں۔ پہلے مَیں واقعات انیس (احسن صاحب) کی عبارت لکھتا ہُوں۔ (ملاحظہ ہو واقعات انیس صفحہ ۹۱) مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہُوئی۔ اور مرزا صاحب نے غزل سُننے کا شوق ظاہر کیا۔ تو میر انیس مرحوم نے صنف غزل کا ابتذال ظاہر کر کے اکثر سلاموں کے مطلع اور شعر سُنائے۔ جو تغزّل کے رنگ میں صنف غزل سے بدرجہا بلند و مضمون خیز تھے۔ اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کر دی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا۔ کہ غالب سا شاعر غالب بھی مرثیہ کی فکر کر کے دیکھ لے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار گذار ہے۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیہ کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں۔ اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کئے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ جو خط ہے۔ اُس کی عبارت یہ ہے۔ کہ امتثال امر سے مجبور تھا صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا۔ تو مرثیہ کا ہیکو ہے۔ ما سوخت معلوم ہوتا ہے۔

واقعات انیس میں غالب رحم

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے[۵۱]۔ مَیں تمام طرفداران میر انیس صاحب کی طرف سے میر احسن صاحب کو مبارکباد دینے کو طیار تھا۔ کہ اُن کی تحریر سے ایک تفضیلیہ دبیر پہ غالب سا شاعر یکتا اُن کے زورِ قلم سے انیسیہ ہی ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ بغیر شیرینی رکھے ہوئے میر صاحب کا شاگرد بھی ہو گیا۔ کہ ۳۱ بند اصلاح کو بھیجے۔ مگر افسوس کہ یہ بحث اخباروں میں چھڑ گئی[۵۲]۔ اور مولوی حالی صاحب نے یہ استدلال تاریخی کیا کہ ۱۸۳۰ء میں مرزا غالب مرحوم کا لکھنؤ و کلکتہ جانا خود مرزا غالب کے خطوط اردوئے معلّیٰ سے ثابت ہے۔ اور یہ زمانہ نصیر الدین حیدر شاہ دویم اودھ کا تھا اور خود میر احسن صاحب کی تحریر سے ثابت ہے کہ میر انیس صاحب اُس وقت تک فیض آباد میں تھے۔ اور اُن کی شہرت بھی نہ تھی۔ وہ تو مدت کے بعد (عہد امجد علی شاہ شاہ چہارم اودھ میں) لکھنؤ میں آئے ہیں۔ پھر مرزا غالب میر انیس صاحب سے لکھنؤ میں کیونکر مل سکتے تھے۔ وہ تو شعراء لکھنؤ میں سے صرف میر ضمیر صاحب اور شیخ ناسخ مرحوم سے ملے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم کی اُس زمانہ میں ضرور شہرت ہونا فسانہ عجائب سے ظاہر ہے۔ مگر اُن سے بھی مرزا غالب کا ملنا کسی روایت یا تحریر سے نہیں معلوم ہوتا۔ مگر یہ خواجہ حالی صاحب کا تحریر فرمانا شاید اُن کی ناواقفی کی بنا پر ہے۔ مَیں خواجہ صاحب سے عرض کرتا ہوں۔ کہ جب میر ضمیر صاحب سے غالب مرحوم کا ملنا آپ کو قبول ہے۔ تو پھر مرزا دبیر سے نہ ملنا آپ کیوں خیال فرماتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب کی خدمت میں مرزا صاحب ہر روز بلاناغہ صبح و شام حاضر ہوا کرتے تھے۔

---

۵۱ اس موقع پر ذرا "آپ" کے ساتھ "ہی" کو دیکھئے۔ یا تو وہ محض دبیر کا حق تھا۔ یا انہیں ہی کا کام رہ گیا۔ واہ حضرت احسن احسنت ہے۔

۵۲ میرے پاس ریاض الاخبار لکھنؤ کے ۱۴ مارچ ۱۹۰۹ء و ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کے پرچے موجود ہیں۔ مگر تمام عبارتیں اس لئے نہیں لکھتا۔ کہ کتاب مطول ہو جائیگی ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور وہ مرزا کو اپنے تاج کمال کا طرۂ طرار سمجھتے تھے۔ پس یہ ممکن ہے کہ میر ضمیر صاحب خود ملیں۔ اور ایک ایسے شاگرد کو جو قابل فخر ہو۔ ایک صاحب کمال (غالب) سے نہ ملائیں۔ ڈپٹی عباس بیگ صاحب مرحوم کی زبانی بھی سُنا گیا ہے۔ کہ مرزا دبیر سے مرزا غالب ملے تھے۔ جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں* +

اس موقع پر کہ غالب و انیس و دبیر مرحومین کا ذکر خیر ہو رہا ہے۔ اور میر احسن صاحب مرزا غالب مرحوم کو گویا شاگرد انیس مرحوم قرار دے چکے ہیں۔ (گو وہ ریاض الاخبار میں اُس قول سے عود کر آئے ہیں۔ مگر وہ ایک پرچہ اخبار تھا۔ اُن کی کتاب واقعات انیس میں تو وہی مضمون درج ہے) میں یہ بھی لکھنا فرض مؤرخی سمجھتا ہوں۔ کہ مرزا غالب مرحوم نے عود ہندی کے ایک رقعہ میں میر انیس مرحوم کے ایک مشہور شعر پر اعتراض کیا ہے۔ اگر واقعی وہ شاگرد انیس مرحوم ہوتے۔ تو غالبًا ایسا اعتراض نہ کرتے۔ ملاحظہ ہو عود ہندی میں رقعہ نمبر ۱۲۷ صفحہ ۱۳۳ جو خواجہ غلام غوث صاحب بے خبر کے نام مرزا غالب (مرحوم) نے لکھا ہے۔ اُس میں میر صاحب کی یہ بیت مشہور

جناب میر انیس کے شعر پر غالب کا اعتراض

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا + برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

لکھ کر مرزا غالب مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ "مصرع آخر حیرت آور ہے۔ کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظہ پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلام ادق جس کا حفظ دشوار ہو۔ شاید کوئی قسم اقسام کلام میں سے ہو۔ ہاں کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں۔ سو کلام مغلق اور کلام سہل ممتنع ضدیک دیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق کیونکر ہو سکیگا۔ اور حافظہ میں محفوظ نہ رہنا کلام مغلق اور ادق کی صفت کیونکر ٹھیریگی۔ ہاں مغلق عسیر الفہم ہوگا۔ پڑھا نہ جائیگا معنی سمجھ میں نہ آئینگے۔ سہل ممتنع کی

* میں بادب بخدمت عالی خواجہ حالی صاحب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ آپ نے مرزا صاحب کو ہمارے مرزا صاحب سے ملا ہوا مجھ کر ... مرزا دبیر سے ملے یا نہ ملے۔ مگر غالب مرحوم کا اول دبیر سے ملا ہوا ہے۔ اور مشہور قول ... سب سے بہتر دبیر کو سمجھتے ہیں + مؤلف حقیر۔

صفت واقعی - جو فقیر اُوپر لکھ آیا - اس شعر سے کچھ علاقہ نہیں" + اور اُوپر سہل ممتنع کی تعریف اسی رقعہ میں مرزا غالب مرحوم یہ لکھ چکے ہیں "سہل ممتنع اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں - کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے - اور اُس کا جواب نہ ہوسکے - بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے - ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے - شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں - اور رشید و طواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوہ کی رعایت منظور رکھتے ہیں - خودستائی ہوتی ہے - سخن فہم اگر غور کریگا - تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائیگا" +

اب بے بضاعت مؤلف کتاب عرض کرتا ہے - کہ جن صاحبوں نے مثل میر احسن صاحب و مولوی اشہری صاحب میر انیس مرحوم کی سوانح عمری لکھی تھی - اُن کا فرض تھا - کہ مرزا غالب مرحوم کا یہ اعتراض لکھ کر اگر اس کو غلط سمجھتے تو جواب لکھتے - مگر وہ دونوں شہسواران واقعہ نگاری اپنے اپنے اشہب قلم کی باگیں اُٹھائے ہُوئے ان مقامات سے منہ پھرائے ہُوئے گذر گئے - مَیں نے یہ اعتراض لکھا ہے - اگر جواب نہ لکھوں - تو میرے اُن احباب کو شکایت ہوگی - جو میر صاحب کے معتقد ہیں - اور یہ امر واقعہ نگاری کے بھی خلاف ہے - کہ مَیں اس مقام کو یُوہیں چھوڑ جاؤں - حالانکہ میرے خیال میں حضرت غالب مرحوم نے میر صاحب کی بیت کے جو معنی لئے ہیں - وہ خلاف مقصود شاعر ہیں - میرا یہ دعوےٰ نہیں - کہ مَیں غالب مرحوم کا جواب لکھتا ہُوں - یہ تو "چھوٹا مُنہ اور بڑی بات" کا مصداق ہے - میری سمجھ میں جو آتا ہے - وہ لکھتا ہُوں - اگر میں غلط مطلب سمجھا ہُوں - تو ناظرین معاف فرما کر رہبری فرمائیں - آئندہ (ایڈیشن) چھپنے پر درستی کر دُونگا +

میرے نزدیک میر صاحب کی مراد اس موقع پر کلام ادق سے کلام مغلق نہیں ہے - بلکہ ادق کے لغوی معنی لیجئے - بہت باریک کلام - اُن کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے - کہ میرا کلام جس میں نازک خیالیاں ہیں - بایں ہمہ سہل ممتنع ہے - دقیق کلام کی یہ صفت ہے - کہ جو

کلام غور و فکر کے بعد سمجھ میں آئے۔ علم معانی و بیان کی کتابوں کی جن صاحبوں نے سیر فرمائی ہے۔ اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ جو کلام غور و فکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ وہ زیادہ لطف دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ لکھی ہے۔ کہ جو نعمت و دولت کوشش و محنت سے آدمی کو ملتی ہے۔ اُس میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ پس جس کلام میں نازک خیالات نظم ہوں۔ اور آدمی محنت کر کے اُس کے معنی حل کرے۔ اُس سے زیادہ دل و دماغ کو راحت اور رُوح کو فرحت حاصل ہوگی +

دُوسرے مصرع **برسوں پڑھے الخ** کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شاعر میری طرز خاص میں محنت کر کے برسوں کہے۔ جب بھی تو میرا طرز تصنیف اُس کو نہیں آسکتا۔ یہ بھی شاعر کا ایک کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہ اُس کے طرز میں کہنے سے اور لوگ عاجز ہوں۔ جیسا کہ گلستان سعدی کی ایسی نثر کسی سے نہیں لکھی گئی۔ اگر کچھ تھوڑا سا اُس کا رنگ ہے۔ تو رقعات عالمگیری میں ہے۔ یہی معنی میر صاحب کے طرفدار اور شاگرد بھی اس مصرع کے لیتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر دبیریوں اور انیسیوں کی بحث میں مَیں نے سُنا ہے۔ **سہل ممتنع** کلام کی نسبت میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ سب کلام تو کسی شاعر کا بھی **سہل ممتنع** نہیں ہے۔ اور تھوڑا بہت **سہل ممتنع** کلام ہر **اُستاد** کے یہاں پایا جاتا ہے۔ بیشک حضرت غالب کا بھی کچھ کلام سہل ممتنع ہے۔ اور کچھ کلام ادق ہے۔ اور یہی حال میر انیس و مرزا دبیر کا بھی ہے۔ اس زمانے کے بعض شعراے لکھنؤ کو بھی یہی خیال ہوگیا ہے۔ کہ ہم جو کہتے ہیں۔ وہ اکثر سہل ممتنع ہے۔ لکھنؤ میں اب سے تین برس پہلے اس کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ مَیں نے ایک سلام میں (جو ایک بڑی مجلس میں راجہ کے بازار میں پڑھا تھا) یہ شعر داخل سلام کر کے بعض معاصرین کو متنبّہ و مطلع کیا تھا ۔

ہر کوئی کہتا ہے۔ سہل ممتنع کہتا ہوں مَیں + ہم تو کچھ بھی کہہ نہیں سکتے۔ یہ مشکل امر ہے

اب **میں اخیر میں** یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جو تین بند مرثیہ غالب کے اُوپر مَیں نے لکھے

ہیں۔ وہ منظرِ غور سے دیکھ کر ناظرین فیصلہ دیں۔ کہ دبیر کی بندش اور طرزِ بیان و زبان کی ہیں میں جھلک ہے یا انیس کی۔ میرے نزدیک دبیر مرحوم کے طرز سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور یہ امر بھی مرزا غالب کے تفضیلیہ دبیر یہ ہونے پر دال ہے (کہ انہوں نے مرثیہ طرزِ غالب دبیر میں کہا) صغیر۔ ریاض۔ حالی۔ احسن چار صاحبوں کے اقوال مرزا غالب مرحوم کی نسبت میں لکھ چکا۔ اب میں مولوی اشہری صاحب کی کتاب حیات انیس سے بھی حضرت غالب کا تھوڑا سا حال لکھ دوں۔ یہ بھی گویا احسن صاحب کے قدم بقدم چلے ہیں۔ حیات انیس کے صفحہ ۷۶ پر مرثیہ گوئی کیلئے غالب مرحوم کا صرف میر انیس صاحب کو ہی منتخب کرنا تحریر فرماتے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے "اسی طرح دلی کے تمام زبان آور میر انیس کے دلدادہ پائے گئے۔ مرزا غالب ایسے لاثانی قدرت کلام پر میر انیس کا دم بھرتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ میر انیس کے مقابلہ میں دوسرے کا مرثیہ کہنا میر انیس نہیں بلکہ خود مرثیہ کا منہ چڑھانا ہے*۔ اور آج تک دلی اور لکھنؤ میں میر انیس کی مرثیہ گوئی کو معجزہ کلام مانا جاتا ہے" +

افسوس کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے مولوی امجد علی صاحب اشہری نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ ورنہ میں اُن سے عرض کرتا۔ کہ بیشک دلی و لکھنؤ کیا بلکہ تمام ہندوستان میں (میر صاحب کے) مرثیہ کو معجزہ کلام ہی مانا جاتا ہے۔ اور میں بھی مانتا ہوں۔ مگر دبیر و انیس دونوں کی مرثیہ گوئی کو۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ دوسرے کا مرثیہ کہنا مرثیہ کا منہ چڑھانا ہے۔ یہ کیا مرزا غالب مرحوم نے آپ سے خواب میں آکر کہہ دیا۔ آپ مولوی حالی صاحب سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ کہ انہوں نے تو مقولہ غالب

* اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ میر انیس مرحوم کی دوسرے مرثیہ گو نقل کرتے ہیں۔ اور بگڑتے ہیں۔ جس طرح کوئی کسی کا منہ چڑھاتا ہے۔ اور خود بگڑتا ہے۔ یہ فقرہ ذرا غور سے دیکھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً اس قول کے مقابل میں کہ "مرثیہ صرف دبیر کا حق ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا" + ۱۲ مؤلف حقیر۔

میں دبیر و انیس دونوں کا نام لیا تھا۔ اور آپ نے ایک بزرگ کا نام لیا۔ اور وہ بھی ایسی طرز سے کہ گویا دوسرے صاحب منہ چڑھاتے تھے۔ واہ جناب۔ (آتش مرحوم) ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب + زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا*

تنقید حیات انیس

اس موقع پر حیات انیس کا ذکر آگیا ہے۔ اور امید ہے۔ کہ بعض ناظرین حیات انیس حیات دبیر کے ساتھ اُس کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس لئے چند مضامین حیات انیس کی مَیں یہاں تنقید بھی کردوں۔ وہ مضامین نمبر وار ذیل میں عرض کرتا ہوں:۔

(۱) حیات انیس کے صفحہ ۳ پر مولوی اشہری صاحب نے نظم میں میر صاحب کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا + بڑی شکوہ سے دکھلائی ہیئت گفتار

گر انیس کو فردوسی سخن پایا + دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار

اس مقام پر دو باتیں مولوی اشہری صاحب نے فرمائیں۔ (۱) تو یہ کہ ع دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا۔ (۲) انیس کو فردوسی اور دبیر کو نظامی قرار دیا + یہ دعوےٰ اُس وقت شاید صحیح ہوتا۔ جب مولوی صاحب کسی روایت سے ثابت کر دیتے۔ کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے مقابلہ پر کوشش کی پس جس طرح فردوسی کو بحیثیت زمانہ نظامی پر سبقت ہے میر صاحب کو مرزا صاحب پر ہوتی۔ یہاں معاملہ بالعکس ہے۔ مَیں اس کتاب میں کئی مقام پر ثابت کرچکا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی شاعری و مرثیہ گوئی و شہرت شہرت و مرثیہ گوئی میر صاحب پر قریباً تیس ۳۰ سال مقدم ہے۔ از بسکہ دبیر مرحوم انیس مغفور پر مقدم ہیں۔ جس طرح فردوسی

* مَیں نے مرزا غالب مرحوم کے بیان میں یہ مختلف تحریریں ایک ہی زمانے کے چند صاحبوں کی اس لئے لکھ دیں کہ ناظرین واقف ہو جائیں۔ کہ اِس زمانے میں دروغ کو کس قدر فروغ ہوتا جاتا ہے۔ اور مجھے یہ بھی خیال گذرا کہ جب یہی کثرت ہوتی جاری ہے۔ تو شاید کوئی صاحب آئندہ ایسے بھی دلبر پیدا ہوں۔ جو یہ لکھ دیں۔ کہ مرزا غالب مغفور میر انیس مرحوم کو مرثیہ گوئی میں کامل اور مرزا دبیر مرحوم کو ایسا ناقص سمجھتے تھے کہ گویا اُن کے نزدیک دبیر مرثیہ کہنا ہی نہ جانتے تھے۔ کیونکہ تنزل کی جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو آئندہ اونکو روکنا کیا دشوار ہے ۱۲ مؤلف حقیر

نظامی پر مقدم ہیں۔ اس لئے یہ دعوےٰ غلط قرار پایا۔ غالباً اسی وجہ سے مولوی صاحب نے اس مقابلہ پر نظم میں بھی ایک سکندری (ٹھوکر) کھائی۔ جس کو عروض داں شعرا سمجھ گئے ہونگے۔ یعنی اس مصرع میں (دبیر مثل نظامی ہوئے مرصّع نگار) مرصّع کا عین تقطیع سے گر گیا۔ یہ خدا کی قدرت سمجھئے۔ عین کا تقطیع سے گرنا تمام شعرا کے نزدیک عین خطا ہے۔ اور یہ غلطی اکثر وہی شعرا کرتے ہیں۔ جو عروض سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بعض ناواقف آدمی دو چار شعر فارسی و اردو کے سند پیش کیا کرتے ہیں۔ کہ دیکھئے ان اشعار میں بھی عین گرتا ہے۔ اُن کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ اوّل تو ممکن ہے۔ کہ کاتبوں نے کچھ کا کچھ لکھ دیا ہو*۔ دُوسرے اگر بالفرض کسی ایرانی سے بھی عین گر گیا۔ تو وہ اُس شاعر کی ضرور خطا ہے۔ اور خطا اگرچہ بار ہا است آیہ خطا است کے ذیل و مصداق میں آتا ہے۔ اور بالخصوص اردو میں تو سودا و میر کے وقت سے آج تک تمام اساتذہ دہلی و لکھنؤ کے نزدیک عین گرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے خلاف رائے رکھتے ہوں۔ تو ان تمام اساتذہ مشاہیر سودا۔ میر۔ انشا۔ مصحفی۔ ذوق۔ غالب۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش۔ وزیر۔ رشک۔ صبا۔ برق۔ دبیر۔ انیس۔ اسیر۔ منیر۔ داغ۔ امیر۔ جلال۔ تسلیم۔ ظہیر میں سے کسی ایک صاحب کا یا ان کے کسی معاصر اُستاد کا یہ قول دکھا دیں۔ کہ عین کا گرنا جائز ہے۔ تو میں مان لونگا۔ ایسے اشعار کو میں یُوں نہیں مانتا۔ کہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ (اور جن صاحبوں کو مطبعوں سے کام پڑا ہے۔ وہ میری تائید فرمائینگے) کہ کتاب چھ چھ مرتبہ دیکھ دیکھ کر ہم دیتے ہیں۔ مگر کچھ کاپی نویس صاحب غلط لکھ دیتے ہیں کچھ مصلح سنگ

تقطیع عین کا

* مثلاً بعض حضرات ملا ناظم ہروی کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں۔ بہ تیم دمش پر شکست یا قیمت را۔ کہ ساز معالج عقل فرتوت را۔ دوسرے مصرع میں عقل کا عین تقطیع سے گرتا ہے۔ مگر دراصل مصرع ثانی صحیح یوں ہے کہ ع سازم جواں عقل فرتوت را۔ دلیل یہ ہے۔ کہ جوان و فرتوت میں ایک تو صنعت تضاد ہے۔ دوسرے علاج ساختن ایرانیوں کا محاورہ نہیں ہے۔ اور جواں ساختن محاورہ ہے۔ اسی طرح اور بھی چند شعروں میں غالباً کاتبوں نے غلطی کردی ہے۔ ورنہ ایسے ایسے کامل شعرا سے ایسی سخت غلطی کی امید نہیں ہے۔ کہ انشا دونوں میں عین ظاہر است مشہور جملہ ہے ۱۲ مؤلف حقیر

اصلاح فرمادیتے ہیں۔ اور چھپنے پر ایسی سینکڑوں غلطیاں نظر آتی ہیں۔ کہ کچھ کا کچھ لکھا ہوا ہے۔ کہیں قافیہ بدل دیا ہے کہیں عین تقطیع سے گر گیا ہے مصنف یا مؤلف بیچارہ کس کس سے کہتا پھرے۔ کہ میں نے یوں لکھا تھا۔ غلط چھپا ہے۔ غلط نامہ بھی چھپواتے ہیں۔ تو بھی کسی کتاب کے ساتھ وہ ورق لگایا جاتا ہے کسی کے ساتھ نہیں۔ المختصر ایسی صریح غلطیاں جن سے مصنف و مؤلف کی شان علم و معلومات ارفع و اعلیٰ ہے ضرور کاتبوں کی بدولت ہوتی ہیں۔ اور انہیں کی طرف منسوب کرنا لازم ہے ✤

(۲) صفحہ ۲۹ میں مرزا دبیر و میر انیس کا جو ایک مجلس شاہی میں یکے بعد دیگرے پڑھنا (مثل میر احسن صاحب کے) لکھا ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔ میں نے لکھنؤ کے معتبر بڈھے آدمیوں سے تحقیق کر لیا۔ واقعی دبیر و انیس ایک مجلس میں ایک ساتھ کبھی نہیں پڑھے[1]۔ اس بحث کو میں ... ✤

(۳) صفحہ ۱۲۷ پر لکھا ہے۔ کہ رباعی ... عرب کا حاصل ہے۔ اس کے بعد فارسی میں اس کی تقلید کی گئی۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ رباعی دراصل ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ عرب کا اس میں کوئی حق (ایجاد) نہیں ہے۔ مرزا صاحب[2] اس بحث کو کوئی تعلق خاص نہیں ہے۔ مگر یہ اس لئے لکھ دیا ہے۔ کہ کوئی صاحب غلطی میں نہ پڑیں۔ شعر

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است ✤ وگر خاموش بنشینم گناہ است

(۴) صفحہ ۲۶۵ پر فرماتے ہیں۔ کہ "مرزا دبیر کا رنگ" بعض مقامات پر

---

[1] اگر میں مرزا صاحب کی طرفداری کرتا تو لکھ دیتا۔ کہ مرزا صاحب کو شہرت ہو چکی تھی جب میر صاحب فیض آباد سے لکھنؤ میں آئے تھے۔ (نیا فکر ہر جگہ پہلے پڑھتا ہے۔ لہذا) میر صاحب پہلے پڑھے مرزا صاحب بعد کو پڑھے۔ مگر ایسا لکھنا فرض مؤرخی کے خلاف ہوتا۔ نتیجہ جو امر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا۔ وہ یہ ہے۔ کہ میر و مرزا دونوں ایک دوسرے کا ادب کرتے تھے۔ اور اگر کوئی کبھی ایک کے بعد دوسرے کو پڑھوانا بھی چاہتا تھا تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ اور کبھی نہیں پڑھتے تھے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] صاحب حدائق البلاغہ نے بھی۔ رباعی کا موجد ایرانیوں کو بتایا ہے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

جہاں میر صاحب کی شوکت کلام آورد کے پنجہ میں پھنس گئی ہے۔ میر صاحب کے کلام میں بھی مرزا دبیر کا رنگ آگیا ہے" اس کی نسبت اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کا ایک رنگ نہیں ہے۔ جس کو کوئی شخص دبیر کا رنگ کر سکے۔ نہ دبیر کی ایسی آمد کسی دوسرے شاعر یا مرثیہ گو کی طبیعت میں ہے۔ پس آورد کے پنجہ میں شوکت کلام پھنس کر دبیر کا رنگ پیدا ہونا کب ممکن ہے۔ دبیر کے کلام میں زیادہ آمد ہونے کا ثبوت۔ اُن کا کثرت سے۔ اور پھر عمدہ کلام ہونا ہے۔ جس میں سے بیس جلدیں مطبوعہ دفتر ماتم کی ہیں۔ کوئی صاحب اگر دبیر سے زیادہ کسی نامور شاعر کو کثیر الکلام سمجھتے ہیں۔ تو دبیر کے کلام موجودہ کے برابر اُن کا کلام ہمیں دکھا دیں۔ اور کلام کا زیادہ ہونا اور اُس کے ساتھ اچھا ہونا یہ ضرور دلیل آمد کی ہے۔ جب آمد طبیعت میں نہ ہوگی۔ تو اس کثرت سے اور اچھا کلام شاعر کب کہہ سکتا ہے۔ اس سے یہ غرض نہیں۔ کہ مرزا کے کلام میں آورد نام کو نہیں ہے۔ آورد بھی ہے مگر کم۔ اور اور معاصرین کے مقابل میں بہت کم ہے۔ مگر اس موقع پر میں مولوی اشہری صاحب کو قابل معافی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے مرزا مرحوم کی تمام تصانیف پر بغور نظر نہیں کی ہے۔ اور اس امر کو میں اُن کے کمال کی دلیل سمجھتا ہوں۔ کہ انہوں نے صفحہ ۴۹ پر صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ جہاں مولوی شبلی صاحب کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ کہ "میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کے یہاں محاسن شاعری بہت کم ہیں" وہیں حاشیہ پر تردیداً لکھ دیا ہے۔ کہ "جب تک دونوں کے مجامع کلام پر نظر نہ ڈالی جائے۔ اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں نہ دیکھا جائے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا" اس سے ظاہر ہے۔ کہ مولوی اشہری صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے تمام کلام کو غور سے دیکھنے اور مقابلہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور وہ دل سے مرزا مرحوم کے کمالات مٹانے میں ساعی و سرگرم (مولوی شبلی صاحب کی طرح) نہ تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سی باتیں حیات انیس میں کارآمد لکھی ہیں۔ اور سخن فہمی کی داد دی ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ کوئی بات ایسی ہی اُن کو

مولوی اشہری صاحب قابل معافی ہیں

مولوی اشہری صاحب حیات انیس کی مدح

خلاف واقع معلوم ہوئی ہو۔ یا کسی خاص رنگ کو اُن کی طبیعت نے زیادہ پسند کیا۔ اور اس سے کوئی شخص کبھی خالی نہیں ہے۔ مَیں نے بھی سب حالات چشم دید نہیں لکھے۔ کوشش ضرور کی ہے۔ کہ صحیح حالات دستیاب ہوں۔ اور ممکن ہے۔ کہ کہیں کہیں کوئی صاحب میری رائے سے مخالف ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اس مخالفت میں اُن کی رائے صواب پر ہو۔ اور مَیں غلطی پر ہوں +

فصل ۱ حضرت فرقانی مرحوم

(۱۱) مولوی سید احمد حسن صاحب فرقانی مرحوم رئیس میرٹھ۔ یہ وہ بزرگوار ہیں۔ کہ جن پر ہندوستان کو اس طرح فخر کرنا چاہئے۔ کہ جیسے ایرانی آج کل قاآنی پر فخر کرتے ہیں۔ فارسی و اُردو زبانوں میں یہ جیسا لاجواب شعر کہتے تھے۔ ایسا ہی مطلب شعر (خوب) سمجھتے تھے۔ ان کے سخن شناس و قدردان ہندوستان میں دبیر و غالب تھے۔ اور اُن دونوں کے کلام کے سمجھنے اور پرکھنے والے یہ بزرگوار تھے۔ چنانچہ خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ صحیح المذاق سامع اس زمانے میں کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ مَیں نے جب کبھی ان دونوں صاحبوں کو اپنا کلام سُنایا۔ تو ایسی داد ملی۔ کہ دل نے مزہ اُٹھایا۔ جن شعروں پر مجھے ناز تھا۔ اُنہیں کو ان صاحبوں نے زیادہ پسند فرمایا* اور یہ فرما کر دل بڑھایا۔ کہ میر فرقانی آپ کا کلام لاثانی ہے +

یہ بزرگوار مرزا صاحب کی شان میں فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ایم کہ بر آسماں دبیری ہست + ندیدہ ایم بروے زمیں ترا ثانی

مَیں نے اس موقع پر ان بزرگوار کا حال بہت مختصر اِس وجہ سے لکھا ہے۔ کہ کہیں کہیں دُوسرے

* اس سے استغنا و ناز کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت فرقانی مرحوم کے شاگرد رشید اور بھانجے سید محمد مرتضےٰ صاحب بیانؔ یزدانی مرحوم بھی ثابت کے قدردان تھے۔ جن کے انتقال کو ابھی دس بارہ برس سے زیادہ نہیں گذرے ہیں۔ لسان الملک میرٹھ سے ان کا پرچہ نکلتا تھا۔ ملک کے اہل کمال جانتے ہیں کہ وہ کیسے کامل تھے۔ میرے سفرنامہ عتبات عالیات جس کا نام "قول ثابت" ہے لسان الملک میں لاجواب ریویو لکھا ہے۔ کبھی کبھی میرا کلام بھی لسان الملک میں چھپتا رہتا تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

موقعوں پر بھی ان کا کوئی قول یا کلام منظوم میں نقل کر چکا ہوں۔ علاوہ اس کے ان کا کلیات ان کے علم دوست ذی علم فرزند منشی سید کرار حسین صاحب روحانی دام مجدہٗ جنرل مرچنٹ گورکھپور نے نہایت خوشخط چھپوا کر شائع فرما دیا ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب کی مدح و ثنا نظماً و نثراً بہت کچھ مرقوم ہے۔ اور وہ نظم و نثر حضرت فرقانی کے کمالات و حالات واقعی کا بھی آئینہ یا مرقع ہے۔

(۱۱) منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم۔ یہ بزرگوار بھی دبیر و انیس دونوں کے مداح خواں اور قدرداں تھے۔ خود کامل تھے۔ اس لئے کاملوں کو پہچانتے تھے۔ چنانچہ جناب فاضل لکھنوی سلمہ اللہ نے اپنے ایک قابل قدر مضمون میں جو ماہ جولائی ۱۹۱۰ء کے پرچہ "زمانہ" کانپور میں چھپا ہے۔ حضرت اسیر کے حال میں حسب ذیل لکھا ہے "۔ اسیر کی انصاف پسندی۔ بعض لوگوں نے اسیر سے دریافت کیا۔ کہ انیس و دبیر میں کون اچھا ہے۔ اور کیا ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت ہے۔ اس کا جواب اسیر نے یہ دیا۔ کہ دونوں استاد ہیں۔ اور میں ایک کو دوسرے پر علانیہ ترجیح نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں خود مرثیہ گوئی میں مہارت نہیں رکھتا۔ لیکن اس روز سے اسیر کو مرثیہ گوئی کی طرف مخفی توجہ ہوئی۔ اور تین برس کامل انہوں نے معمولی اوقات میں مرثئے کہے۔ تین برس میں اسیر نے کئی سو مرثئے کہے۔ اور ایک روز اپنے ان احباب و اشخاص سے کہا۔ کہ تین برس کی محنت شاقہ کے بعد کچھ رنگ میر انیس و مرزا دبیر کا پیدا ہوا ہے۔ اور اس کیلئے مدتیں درکار ہیں۔ پھر اسیر نے مرثیہ نہیں کہا۔ اور جو مرثئے کہے تھے۔ ان کو نہ کہیں پڑھا۔ اور نہ چھپوایا۔ دو سو مرثئے ابتک قلمی موجود ہیں"۔ پھر فاضل صاحب لکھتے ہیں۔ کہ غالب مغفور کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے بھی مرثیہ گوئی کے لئے انیس و دبیر ہی کو منتخب کیا تھا۔ اور جب ان سے ایک مجتہد صاحب نے مرثیہ کی فرمائش کی۔ تو انہوں نے صاف صاف کہدیا۔ کہ یہ کام میر و مرزا کا ہے۔ درحقیقت کسی کامل فن کو خود پسند و مغرور نہ ہونا

چاہیئے۔ اخلاق اور انصاف پسندی خوب شے ہے۔ اسیر عمر بھر پابند وضع و تہذیب رہے ہے۔ اور کبھی بے جا ادعائے سخنوری نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کسی کامل فن اُستاد کی تحقیر کی"۔ یہاں تک فاضل صاحب کی تحقیق و عبارت تھی۔ اب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت اسیر مرحوم خلیق۔ منکسر۔ کامل۔ انصاف پسند شاعر تھے۔ مگر یہ جو فرمایا۔ کہ میں خود مرثیہ گوئی میں مہارت نہیں رکھتا۔ یہ اُن مرحوم کا محض انکسار تھا۔ کیونکہ میں نے لکھنؤ کے بڈّھے بڈّھے معتبر آدمیوں سے سُنا ہے (کہ جن میں سے ایک میرے نانا میر ظہیر مرحوم تھے) کہ اسیر مرحوم اوّل اوّل میر ضمیر مغفور کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ تخلص (اسیر) بھی اُسی رعایت سے میر ضمیر صاحب نے رکھا۔ جناب اسیر نے سلام کہا۔ میر ضمیر مرحوم نے بنا یا۔ پھر ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ میر صاحب ممدوح نے عُذر کیا۔ کہ میں غزل کہنا اور غزل پر اصلاح دینا اب چھوڑ چکا ہوں۔ چلو تمہاری غزل پر اپنے اُستاد میاں مصحفی سے اصلاح دلوا دوں۔ میر ضمیر صاحب کے ساتھ اسیر پہنچے۔ میاں مصحفی کو جب غزل سُنائی۔ تو اُن کو شک ہوا۔ کہ ایسی غزل ایک مبتدی کی نہیں ہو سکتی۔ اور پُوچھا۔ یہ غزل تم نے خود کہی ہے۔ اسیر نے اثبات میں جواب دے کر کہا۔ کہ اب پھر میں ایسی غزل کہہ سکتا ہوں۔ چنانچہ میاں مصحفی نے طرح کا مصرع پڑھا۔ اور خود بھی فکر کی۔ میاں مصحفی نے جتنی دیر میں گیارہ شعر کہے۔ اسیر نے نو شعر کہے۔ جن کو دیکھ کر مصحفی پھڑک گئے۔ یہ حکایت مشہور خود فاضل صاحب نے بھی لکھی ہے۔ مگر میر ضمیر مرحوم کی ہمراہی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید انہوں نے یونہی سُنا ہو گا۔ اُس دن سے سلام و مرثیہ پر میر ضمیر صاحب سے اور غزل پر میاں مصحفی سے اسیر اصلاح لیتے تھے۔ تین برس بعد مصحفی مر گئے۔ اسیر نے پھر غزل کسی کو نہیں [illegible] [illegible] مرثیہ جو [illegible] سوزخواں پڑھا کرتے ہیں۔ ع جب تھوڑی رات قتل کے میدان میں آگئی۔ جناب اسیر مرحوم کا ہے۔ اور جو لوگ مرثیہ خوب کہتے ہیں۔ وہ جان سکتے ہیں۔ کہ [illegible]

مہارت جناب اسیر مرثیہ میں

[illegible]

اسیر غزل میں مصحفی کے شاگرد [illegible]

تین برس میں (خصوصاً ایسے شخص سے جس کو فرائض منصبی سے بھی فرصت کم ہو) تصنیف نہیں ہو سکتے۔ واضح ہو۔ کہ میر ضمیر صاحب کی شاگردی اسیر مرحوم کے واسطے سرمایۂ افتخار ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب طرز موجودہ مرثیہ کے موجد اور دبیر و انیس اور تمام مرثیہ گویان مابعد اُن کے شاگرد یا خوشہ چین و مقلد ہیں۔ بہرحال دبیر و انیس کے باب میں جو فیصلہ حضرت اسیرؒ نے کیا۔ وہ اُن کی سخن شناسی کی دلیل ہے۔ اور تمام یا اکثر اہل کمال کا قریب قریب یہی عقیدہ تھا۔ کہ دبیر و انیس میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ میں جناب مفتی صاحب طاب ثراہ کا گویا فتوے لکھ چکا ہوں[۱]۔ اب میں فاضل صاحب کے اسی مضمون مذکورہ میں سے ایک واقعہ متعلق حضرت اسیر کو اور بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے ہمارے ممدوح (دبیر[۲]) کو تھوڑا تعلق ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے۔ اسیر اگر کبھی نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔ تو نہایت لطف اور تحقیق کے ساتھ۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ نواب مرزا آغا جعفر صاحب جو حضرت اسیر کے شاگرد بھی تھے مع چند احباب کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور حضرت اسیر بھی موجود تھے۔ کمرہ میں کچھ قطعات و رباعیات وغیرہ بطور آرائش چوکھٹے میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے اپنے اُستاد کو ایک فارسی رباعی کی طرف توجہ دلائی۔ اور کہا۔ کہ آپ نے اس رباعی کو ملاحظہ فرمایا۔ شاعر نے کیا نازک خیالی کی ہے۔ رباعی حسب ذیل ہے ؎

دُنیا خوابیست کش عدم تعبیر ست صید اجل ست گر جوان و پیر ست
ہم زیر زمیں پر ست و ہم روئے زمیں این صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر ست

[۱] افسوس کہ فاضل مفتی صاحب۔ انیس و دبیر ایسے ایسے کاملان فن کو جن کا مثل و نظیر ہندوستان کیا شائد زمین پر نہ ملے مولانا شبلی صاحب مصنف موازنہ میں بدمذاق کا خطاب دیتے ہیں۔ کہ وہ دبیر کو مقابل انیس کا کیوں سمجھتے رہے۔ اور دبیر کو کیوں ناقص و مرجوح نہیں کہا۔ ملاحظہ ہو موازنہ کی پہلی سطر کا بسم اللہ پہلا صفحہ ٭

[۲] سید کا ترجمہ مطبوعہ شائد ٹھیک ہو مگر یہ نا مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے ممدوح لکھا ہے ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اسیر نے اس رباعی کو غور سے دیکھا۔ اور چپ ہو رہے۔ نواب صاحب نے پھر کہا۔ فرمائیے۔ یہ رباعی کیسی ہے۔ یہ پھر سکوت میں رہے۔ اور بعد اصرار کہا۔ کہ اس رباعی کی داد مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب متحیر ہوئے۔ اور دریافت کیا کہ اس میں کیا غلطی ہے۔ ہمیں بھی اس سے مطلع کیجئے۔ اسیر نے کہا۔ رباعی کے عمدہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن آخری مصرع میں اگر صفحہ کی جگہ ورق ہوتا۔ تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ اس لئے کہ صفحہ سے مراد ایک رُخ سے ہے۔ اور ورق سے مراد دونوں رُخ سے ہے۔ اور جب صفحہ زمین میں دونوں طرف تصویریں (آبادی انسان) ہیں۔ تو وہ صفحہ نہیں بلکہ ورق ہوا۔ اسیر کے اس خیال کو ماہرین نے پسند کیا۔ اور داد دی۔ میں بھی حضرت اسیر مرحوم کو غائبانہ داد دے کر ناظرین کتاب سے کہتا ہوں۔ کہ اب دبیر کی رباعی کو سنئے جس کا مضمون اس سے کچھ ملتا جلتا ہوا ہے:۔

رباعی دبیر کا ورود اعتراض سے پاک ہونا

بالائے زمیں زندوں کی تعمیریں ہیں — مُردوں کی بزیرِ خاک جاگیریں ہیں
عبرت کے مرقع کا ہے اک صفحۂ زمیں — دونوں طرف اس ورق پہ تصویریں ہیں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہ حضرت اسیر کو وہ باریک اعتراض اس رباعی اردو سننے کے بعد سوجھا۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گا۔ کہ جو دقیق اعتراض اُس فارسی کی رباعی پر وارد ہوتا تھا۔ وہ اس اردو کی رباعی پر عائد نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اعتراض دقیق دبیر مرحوم کے خیال میں ضرور تھا۔ اسی لئے ورق پر دونوں طرف تصویریں ہونا فرمایا۔ دوسری خوبی اس رباعی اردو میں یہ ہے۔ کہ عبرت کے مرقع کا ایک صفحہ زمین کو فرمایا۔ کیونکہ اسی طرف کے رہنے والوں کو عبرت لینے کی ضرورت ہے۔ کہ جو لوگ زندہ ہیں۔ وہ عبرت حاصل کریں۔ مُردوں کو عبرت سے سبق لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کہ وہ مر چکے ہیں۔ ایسے ایسے نازک خیالات مرزا مرحوم کے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اور میر انیس مغفور آفتاب و ماہتاب کہلاتے تھے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ فارسی رباعی کے

چاروں مصرعوں کا ترجمہ اردو رباعی کے چاروں مصرع نہیں ہیں۔ بلکہ اردو کی رباعی کے پہلے اور دوسرے مصرع کا مضمون (فارسی رباعی کے مصرع اول و دوم سے) مختلف اور گویا مصرع چہارم کی شرح ہے۔ جس سے مضمون بخوبی سُننے والے کے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ دُوسرا کمال مرزا مرحوم کا ہے +

(۱۲) استاذی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی ؒ سُنا ہے کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں تمام شعرائے عجم پر دو ایرانی شاعروں کو ترجیح دیتا ہوں۔ (۱) فردوسی (۲) جامی۔ اور اُن کے اس شعر میں بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ؎

اُچھل پڑے گر شعر پہ فردوسی + اُٹھا یہ لطف کہ جامی بھی گر پڑے بیہوش

اور دبیر و انیس کو فردوسی و جامی پر بھی ترجیح و تفضیل دیتا ہوں +

(۱۳) منشی سیّد اسمٰعیل حسین صاحب منیر۔ یہ وہ پہلوان سخن ہیں کہ (جناب شیخ ناسخ کے شاگرد ہیں) جن کی معلومات شاعری کی دھاک ہے جن پابندیوں اور صحت کے ساتھ قصیدہ و غزل انہوں نے فرمائی۔ کم شاعروں نے کہی ہوگی۔ جس کثرت سے لوگوں کو ان سے فیض پہنچا بہت کم شاعروں سے پہنچا ہوگا۔ یہ بزرگوار ہمیشہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ دبیر سا عالی دماغ۔ بلند خیال۔ صاحب معلومات۔ ہر رنگ میں کہنے والا شاعر آج تک نہیں گذرا۔ اور مرثیوں پر انہوں نے فخریہ مرزا صاحب سے اصلاح لی تھی۔ اور اکثر اصناف نظم بالخصوص مثنوی میں مرزا صاحب کی نصیحت پر عمل فرماتے تھے۔ اور جن پابندیوں کے ساتھ وہ غزل کہتے تھے مثنوی و مرثیہ میں اُن کا خیال (بحضرت مرزا مرحوم کے اتباع سے) نہیں رکھتے تھے۔ کہ مرزا مرحوم کی نصیحت تھی۔ کہ جو شاعر نظم میں واقعات لکھنا چاہتا ہے۔ وہ کثرت سے الفاظ استعمال کرے۔ زبان اردو پہلے ہی سے وسیع نہیں ہے۔ اس میں الفاظ متروکہ کی بے بڑھا کے اس کو اور زیادہ تنگ بنانا کلام کو بے نمک کرنا ہے۔ چنانچہ مثنوی

معراج المضامین اور دُوسری مثنوی جو اُن کی کلیات میں ہے۔ میرے اس قول پر دلیل و شاہد عدل ہیں +

جناب حامد سلمہ اللہ والبقاء

(۱۴) مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام فضلہ واقبالہ۔ جو ایشیائی علوم کے ساتھ مغربی علوم میں بھی رتبہ اعلےٰ رکھتے ہیں۔ اور جن کی سخن فہمی ضرب المثل ہے۔ شعرا میں سب سے زیادہ میر۔ غالب۔ دبیر۔ انیس کے خاص طور پر قدردان اور مدح خواں ہیں۔ گویا ان بزرگواروں کو جسم شاعری کے عناصر اربع سمجھتے ہیں۔ اور اکثر فرماتے ہیں۔ کہ اگر اردو میں بلینک ورس (نظم غیر مقفیٰ) کا رواج ہوتا۔ تو سب سے زیادہ دو شاعر کامیاب ہوتے۔ (۱) غالب۔ (۲) دبیر۔ اور دبیر غالباً غالب سے زیادہ کامیاب ہوتے +

ازبسکہ ۱۴ کے عدد کو میں متبرک سمجھتا ہوں۔ اس لئے یہ ۱۴ نام آور شعراء و اہل علم کے نام میں نے لکھ دئے ہیں۔ ورنہ مرزا مرحوم کے کمالات کے قریباً تمام اہل کمال اہل علم قائل ہیں۔ جس قدر جس شخص کی معلومات بڑھی ہوئی ہے۔ اُسی قدر مرزا صاحب کے جواہرات کی وہ زیادہ قدر کرتا ہے +

باب دوازدہم۔ متنبّی عرب کے مستند مشہور شاعر کے بعض کلام سے بعض کلامِ دبیر کا مقابلہ

مختصر حالات متنبی

شعرائے عرب میں متنبّی ایک بہت بڑا بلیغ و فصیح شاعر گذرا ہے۔ اس کا نام و نشان ابوالطیّب احمد بن حسین ابن عبدالصمد الجعفی الکندی الکوفی ہے۔ یہ کوفہ کے محلہ کندہ میں تین سو تین ہجری (۳۰۳ھ) میں پیدا ہوا۔ ایسا بلیغ و فصیح شاعر تھا۔ کہ بعض آدمی کہتے ہیں۔ کہ اس نے نبوّت کا دعوےٰ کر دیا تھا۔ اور دلیل و معجزہ نبوّت

میں اپنے اشعار آبدار کو پیش کیا تھا۔ بنی کلب وغیرہ کا گروہ کثیر اس کا تابع بھی ہو گیا۔ مگر ابولولو نائب اخشیدیہ نے اس پر چڑھائی کر کے شکست دی۔ اور اس کو قید کیا۔ اور دعوئے نبوّت سے توبہ کرنے کے بعد چھوڑا۔ اسی سبب سے لوگ اس کو متنبّی (بنا ہوا نبی) کہتے ہیں۔ قاضی القضات ابن خلکان نے (وفیات الاعیان میں) اس کی بہت مدح وثنا کی ہے۔ اور اپنے اُستاد کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ اس کے دیوان کی چالیس شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ شرف کسی اور شاعر کے دیوان کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ شعر میں صاحب بخت بلند اور لغت کا امام ہے۔ آخر ماہ رمضان تین سو چون (۳۵۴) ہجری میں ۵۱ برس کی عمر پاکر فاتک ابن ابو جہل اسدی کے ہاتھ سے مع اپنے بیٹے اور غلام کے دریائے دجلہ کے کنارے پر قتل ہوا۔ گویا عرب کا مجسم علم شعر جہل کے ہاتھ سے غرق دریائے عدم ہوا۔ بجز جناب سیّد رضیؒ (جامع خطب نہج البلاغہ جو اس کے کچھ بعد پائے جاتے ہیں) عرب میں اور کوئی اس کے زمانے میں یا اس کے بعد مثل اس کے شاعر نہیں ہوا۔ میں متنبّی کے چند اشعار اور اس کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کے چند شعر ایسے پیش کرتا ہوں۔ جن کے مضامین میں کچھ مشابہت ہے۔ یا دونوں صاحب قریب قریب ہو کر گذرے ہیں۔ ہرچند ایک قدرتی فرق اختلاف زبان عرب و ہند کا اور دوسرا مرتبہ ممدوحین کا حائل ہے۔ اختلاف زبان کے ساتھ ہی رسم ورواج۔ آب وہوا مناظر قدرت کے اختلافات ہیں۔ جن کی بُنیاد پر شاعری کی خیالی عمارت بنائی جاتی ہے۔ پس ان اختلافات کے سبب سے پُورا پُورا مقابلہ تو ناممکن ہے۔ علاوہ ان کے ایک باریک فرق غور کرنے سے اور بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ متنبّی نے یہ اشعار اُس زمانے (چوتھی صدی ہجری) میں کہے ہیں۔ کہ جب زبان عربی میں تمام علوم وفنون کے ترجمے ہو کر زبان مذکورہ درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ برخلاف اس کے اُردو میں آج تک تمام علوم وفنون نہیں آئے۔ اُس

زمانے کا تو کیا ذکر کہ جب کا یہ کلام مرزا مرحوم کا ہے (جس کو کم سے کم ساٹھ ستر سال اور زیادہ سے زیادہ سو برس سمجھنا چاہئے۔ کہ سنہ ۱۲۳۰ ہجری سے مرزا صاحب کی شاعری شروع ہوتی ہے)۔ بااین ہمہ دیکھئے۔ مرزا مرحوم کی طبع رنگین وخداداد نے کیا کیا پھول کھلائے ہیں دریائے مضامین بہائے ہیں۔ مگر جس طرح یہ فرق زبان مرزا مرحوم کے حق میں مُضر ہے۔ اُس سے بڑھ کر دُوسرا فرق مرتبہ ممدوحین کا اُن کے حق میں مفید ہے۔ متنبی کے اکثر ممدوحین ایسے ہیں جن پر وہ مدح وثنا نہیں پھبتی۔ بلکہ بعض جگہ خود شارحوں نے یہ احتمال کیا ہے۔ کہ متنبی نے بظاہر مدح بباطن قدح کی ہے۔ اور کہیں کہیں اُنہیں ممدوحوں کی متنبی (دُوسرے موقع پر) خود بھی صاف صاف ہجو لکھتا ہے۔ جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ اوّل مدح کی ہوگی۔ جب انعام خاطر خواہ نہ پایا۔ تو ہجو کہدی۔ مگر مرزا مرحوم کے ممدوحین محمدؐ و آل محمدؐ اُس سے زیادہ مدح کے قابل ہیں۔ جو دل سے اُنہوں نے نظم کی ہے۔ بعض موقع پر بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب محمدؐ و آل محمدؐ یا اُن کے سچے مددگار و اصحابؓ (شہدائے کربلا) کی شان ومرتبہ پر خیال کیا جاتا ہے۔ تو وہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے مرزا مرحوم کی تمام مدح وثنا کم سے کم ہر خوش عقیدہ مسلمان کے نزدیک حق بجانب ہے۔ اور حق بات میں اہل حق کو زیادہ مزہ آتا ہے۔

ازبسکہ آج کل عربی ہندوستان میں بہت کم رہ گئی ہے (اور جو باقی ہے۔ وہ بھی سفر کرتی جاتی ہے۔ اور شاید جو ریل ہندوستان سے ایران ہوکر بعض ممالک عرب میں بننے والی ہے۔ اس کے بن جانے پر اسی میں سوار ہوکر سفر کر جائے) اس لئے ہر شعر متنبی کے ساتھ اُس کا اردو میں خلاصہ مطلب بھی مَیں نے لکھ دیا ہے۔ کہ اردو خوان ناظرین لطف اُٹھائیں۔ جہاں کہیں میری کم علمی کے سبب مجھ سے غلطی ہوگئی ہو۔ ناظرین عربی خواں وعربی داں مجھے آگاہ فرمائیں۔ مَیں انشاءاللہ دوبارہ کتاب چھپنے پر درستی کردونگا۔ ہرچند مرزا مرحوم کے بعض کلام کا مقابلہ بعض کلام شعرائے جاہلیت سے بھی مَیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر

نہ آج کل میرے پاس وہ کتاب (سبعہ معلقہ) موجود ہے نہ مجھے فرصت ہے +

شعرائے سبعہ معلقہ سے مقابلہ

مرزا صاحب کے کلام کا مقابلہ اُن شعرائے سبعہ معلقہ کے کلام سے ان وجوہ (ذیل) پر میرے خیال میں انسب ہوتا +

(۱) جس طرح شعرائے ایام جاہلیت کے زمانے میں عرب میں علوم و فنون نہ تھے۔ اُسی طرح مرزا صاحب کے زمانے میں بھی بالخصوص اردو میں قطعی علوم و فنون نہ ترجمہ ہوئے تھے +

(۲) جس طرح وہ شعرا فطرتی شاعر تھے۔ مرزا مرحوم بھی قدرتی شاعر تھے +

(۳) جس طرح وہ شعرا کھڑے کھڑے بیس تیس شعر کا قصیدہ کہدیتے تھے۔ مرزا مرحوم بھی دو چار گھنٹہ میں سو[100] ڈیڑھ سو[150] بند (۳۰۰ یا ۴۰۰ شعر) کا مرثیہ کہدیتے تھے +

(۴) خود مرزا مرحوم فرماتے ہیں:۔

موزوں ہو شانِ مصحفِ ناطق کی اِس نمط | سبحان کے عنایتِ سبحان ہے یہ نقط
مکے کے شاعروں کا مَیں دعوے کروں غلط (یعنی طرح) | حسان سے لوں غلامیِ حسنِ بیاں کا خط

میزانِ عرش میں مرے مضمون تُل گئے
اب سبعہ معلقہ کعبہ سے کھُل گئے

مگر اکثر ناظرین اگر ایسے مقابلہ کو پسند فرمائینگے۔ تو انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں سبعہ معلقہ کے بعض اشعار بھی کلام دبیر کے مقابلہ پر مَیں پیش کر دونگا۔ بشرطیکہ زندہ رہا۔ اور اگر مر گیا اور ملک نے اس روش کو پسند کیا۔ تو اور کوئی خدا کا بندہ اس کام کو انجام دے لیگا +

فصل ۲ اجتماع نقیضین

۱۔ متنبی کہتا ہے۔ مُتَفَرِّقُ الطَّعْمَیْنِ مُجْتَمِعُ الْقُوٰی فَکَاَنَّہٗ السَّرَّاءُ وَالضَّرَّاءُ۔ میرا ممدوح (ابو علی ہارون ابن عبد اللہ) دو مختلف مزے رکھنے والا تمام قوتوں کا جامع (قوی ہیکل یا اولو العزم) ہے۔ گویا وہ نرمی و سختی یا خوشحالی و بدحالی کا سبب ہے۔ یعنی دوستوں کے حق میں مفید اور دشمنوں کے واسطے بلائے جان و مضر ہے +

مرزا صاحب حضرت قاسم بن حسنؑ کی زبانی بحر میں فرماتے ہیں۔ (ٹیپ ملاحظہ ہو):۔

آہ ٹھوں پہر لگائی ہے چو رنگ بار ہا — ہم بے خطا ہیں تیر بھی اپنے ہیں بے خطا
چلہ نشیں کمان کے گوشے میں ہے قضا — نیزہ ہے اپنا زہر اُگلنے میں اژدہا

پر زہر سے عیاں اثر لطف و قہر ہے
مومن کو زہرمہرہ ہے کافر کو زہر ہے

مطلب یہ ہے ۔ کہ نیزہ سے دوست کی مدد کرکے دشمن کو فی النّار کر دیتے ہیں ۔ اس لئے دوست خدا کو یہ زہرمہرہ ہوا ۔ کہ دشمن کے زہر (ضرر) کو دفع کیا ۔ اور دشمن خدا کے واسطے زہر ہے ۔ الفاظ زہر و زہرمہرہ کی خوبی پر خیال فرمائیے ۔ کہ بظاہر ملتے جلتے ہوئے ہیں ۔ مگر ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ متنبیؔ کے شعر میں متفرق الطعین و مستجمع جمیع قوے کا ثبوت سرّاء و ضرّاء سے ہے ۔ مرزا مرحوم کے کلام میں صرف متفرق الطعین کا ثبوت ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی زہر و زہرمہرہ کا اثر متضاد ہونے کے علاوہ (زہر و زہرمہرہ میں) جو لطافت لفظی ہے ۔ وہ اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ جیسا کہ میں نے اُوپر اشارہ کیا ہے +

۲ ۔ متنبیؔ ۔ یَا اَیُّھَا الْمُجَدّٰی عَلَیْہِ رُوْحُہٗ ۔ اِذْ لَیْسَ یَاتِیْہِ لَھَا اِسْتِجْدَائٗ
تیری جان (اے ممدوح) گویا تجھے سائلوں نے دے رکھی ہے کہ کوئی تجھ سے نہیں مانگتا ۔ ورنہ تو ایسا سخی ہے کہ سائل مانگتا ۔ تو جان بھی اپنی دیدیتا +

مرزا مرحوم امام حسینؑ کی مدح سخاوت میں فرماتے ہیں ۔ (رباعی) ؎

محتاجوں کو اغنیا نے زر بخشا ہے — درماندوں کے آرام کو گھر بخشا ہے
احمدؐ کے نواسے کی سخاوت دیکھو — دشمن کو رہِ دوست میں سر بخشا ہے

ایک دوسرے مقام پر ایک مرثیہ میں اسی مضمون کو پھر نظم فرمایا ہے ؎

حق عاشقی حق کا ادا شہ نے کر دیا — دشمن کو راہِ دوست میں خوش ہو کے سر دیا

ذی علم ناظرین ! ! ملاحظہ فرمائیے متنبیؔ تو اتنا ہی کہکے چپ ہو گیا ۔ کہ سائل مانگتا تو ۔ تو جان بھی دیدیتا ۔ اور وہ اس کے سوا کہتا ہی کیا ؟ مگر مرزا مرحوم نے کیا اچھی اور اچھی تعریف

اپنے ممدوح (امام حسینؑ) کی فرمائی۔ کہ دوست کی راہ میں سر بھی دیا تو کس کو؟ دشمن کو۔ اور سپر کیونکر دیا؟ خوش ہو کر۔ اللہ اللہ بات بات میں کس قدر بلاغت کے نکات ہیں۔ جتنا غور فرمائیے لطف مضمون بڑھتا جاتا ہے۔ کلام بلیغ کی یہی صفت ہے +

۳۔ متنبی۔ لَمْ تُحْکِ نَائِلَکَ السَّحَابُ وَاِنَّمَا۔ حُمَّتْ بِہٖ فَصَبِیْبُھَا الرُّحَضَاءُ۔ تیری بخشش کے مقابل ابر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تیری عطا و بخشش دیکھ کر اُس کو تپ چڑھ گئی ہے۔ یہ پانی نہیں برستا۔ اُس کا پسینہ ٹپک رہا ہے۔ ابر و بحر کو سخا و کرم سے تشبیہ دینے کا رواج غالباً قدیم زمانے سے ہر زبان کی (لٹریچر) ادب میں پایا جاتا ہے۔ متنبی نے بھی اور شعرائے عرب کی طرح اس کو خوب خوب نظم کیا ہے۔ ایک دوسرے قصیدہ مدح سیف الدولہ میں وہ اپنی شمشیر زبان کے یوں جوہر دکھاتا ہے۔ ؎

تَجِفُّ الْاَرْضُ مِنْ ھٰذَا الرَّبَابِ وَتَخْلُقُ مَا کَسَاھَا مِنْ ثِیَابِ

بادل برسنے کے تھوڑے دنوں بعد زمین خشک ہو جائیگی۔ اور جو جامۂ نو نباتات کو اُس نے پہنایا ہے۔ وہ پُرانا ہو جائیگا۔

وَمَا یَنْفَکُّ مِنْکَ الدَّھْرُ رَطْبًا وَلَا یَنْفَکُّ غَیْثُکَ فِی انْسِکَابِ

مگر تیرا سحاب کرم ہمیشہ برستا رہیگا۔ اور اس کا سلسلۂ فیض و احسان دُنیا سے منقطع نہ ہوگا انصاف یہ ہے۔ کہ یہ مضمون متنبی نے نہایت بلیغ نظم کیا ہے۔ اب اس کے بعد مرزا دبیر مرحوم کو دیکھئے۔ کس پایہ کا مضمون ادا فرماتے ہیں۔ ؎ (رباعی)

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا۔ کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر

ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ جب ابر نیساں برستا ہے۔ تو موتی پیدا ہوتے ہیں۔ پس وہ بھی موتی دیتا ہے مگر رو رو کر۔ اور میرا ممدوح تاجدار لعل اتے ہنس ہنس کر بخشتا ہے۔ پس ابر نیساں کو اس سے کیا نسبت ہے۔ یہ مضمون

قسّامِ ازل نے مرزا مرحوم کے حصّہ میں رکھا تھا۔ میرے علم میں دُوسرے شاعر کے خیال میں نہیں آیا۔ کسی نے آج تک نظم نہیں کیا +

غبار پا

۴۔ متنبّی سیف الدولہ کے لشکر کے غبار کی نسبت کہتا ہے ؎

كَأَنَّ نُجُومَ اللَّيْلِ خَافَتْ مَغَارَهُ   فَمَدَّتْ عَلَيْهَا مِنْ عَجَاجَتِهِ حُجُبَا

لشکر کی کثرت سے رات کے ستارے ایسے ڈرے کہ اُنہوں نے غبارِ لشکر سے اپنے اُوپر گویا پردے تان لئے۔ کہ لڑائی کا [illegible] اُن کو نظارہ [illegible] یہ مضمون متنبّی نے باندھا ہے۔ اور یہ مضمون شاعروں میں اکثر پامال ہوتا رہا ہے۔ فردوسی و نظامی نے بھی غبارِ سمِ اسپاں کے مضمون کو خوب خوب باندھا ہے۔ اور دونوں بزرگوار قریب قریب یکساں فرما گئے ہیں:۔

(نظامی)	(فردوسی)
ز سُمِ ستوراں دراں پہن دشت	زبس گرد میداں کہ برشد بدشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت	زمیں شش شد و آسماں ہشت گشت

دونوں کا مفہوم یہ ہے۔ کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اتنی گرد اُڑی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک طبقہ زمین کا اُڑ کر آسمان میں جا لگا۔ اگرچہ ان شعروں میں بھی خوبی کا کوئی مضمون مثلِ شعرِ متنبّی کے نہیں ہے۔ مگر ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ اپنے رنگ میں یہ پھول بھی خوشنما ہیں +

مرزا مرحوم کے ممدوح امام عالی مقام ہیں۔ اُن کے گھوڑے کے سم سے جو گرد اُٹھی وہ بھی خاص اور اعلےٰ ہونی چاہئے۔ (کہ اُن کا گھوڑا ساقی المرسلین محمد مصطفٰے صلعم کا اسپِ خاص ہے۔ وہ فرماتے ہیں):۔

تقسیم سُرمہ گردِ سواری نے کر دیا   شیشہ فلک کا کحل الجواہر سے بھر دیا

دیکھئے شیشۂ فلک ایک مشہور استعارہ ہے۔ کہ آسمان شیشہ کی طرح نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ سُمِ اسپِ امامؑ سے جو گرد اُٹھی۔ وہ بمنزلہ کحل الجواہر (سرمہ جواہرات) تھی۔ اُس سے

شیشہ خالی آسمان کا بھر گیا +

۵۔ متنبی سے اِذَا مَا سِرْتَ فِیْ آثَارِ قَوْمٍ۔ تَخَاذَلَتِ الْجَمَاجِمُ وَالرِّقَابُ۔

سیف الدولہ کی مدح شجاعت میں کہتا ہے۔ کہ جب تو کسی قوم کے پیروں کے کھوجوں پر جاتا ہے (تعاقب کرتا ہے)۔ تو اُن کی کھوپریاں اور گردنیں ایک دوسرے کو چھوڑ دیتی ہیں۔ کہ تیری تلوار کھوپریوں کو گردنوں سے اڑا دیتی ہے۔ پس دونوں میں جدائی ہو جاتی ہے متنبی نے محض تعاقب سے دشمنوں کی کھوپریاں گردنوں سے جدا ہو جانی بیان کی ہیں جس سے ہیبت و شجاعت کا خلاف عقل مبالغہ خیال میں گذرتا ہے۔ اب دیکھئے۔ مرزا مرحوم شمشیر حسینی کی صفائی اور دشمنوں کے سر اڑانے کو کس صفائی سے بیان کرتے ہیں۔

تیغ نگہ کی طرح۔ جدھر یہ پلٹ گئی گردن سے سر آگے پھینک کے پیچھے کو ہٹ گئی

اس میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ جب تلوار سے سر کٹتا ہے۔ تو واقعی ایک ہچکولہ ایسا ہی آتا ہے۔ کہ جس سے گردن پیچھے کو سرک جاتی ہے۔ اس شعر میں تلوار سے سر اڑنے کی تصویر کھینچ دی ہے +

۶۔ متنبی۔ خواہر سیف الدولہ کے مرثئے میں کہتا ہے۔ سے

غَدَرْتَ یَا مَوْتُ کَمْ اَفْنَیْتَ مِنْ عَدَدٍ بِمَنْ اَصَبْتَ وَکَمْ اَسْکَتَّ مِنْ لَجَبٍ

اے موت! تو نے غدر و بے وفائی کی۔ کہ نام تو ایک (عورت) کے مارنے کا کیا۔ اور بہت سے آدمیوں کو جو اُس کے دم سے زندہ تھے مار ڈالا حقیقت میں ایک نیک نفس فیض رساں کے مرنے سے بہت آدمی جو اُس سے وابستہ ہوتے ہیں گویا مر جاتے ہیں + مرزا مرحوم ہمشکل محبوب خدا شاہزادہ علی اکبرؑ کے مرثئے میں اُن کی ماں کی زبانی کہتے ہیں۔ سے

کوئی نہ رہا کنبے میں میرے علی اکبرؑ سب مر گئے۔ اک مرنے سے تیرے علی اکبرؑ

یعنی تیری موت میرے حق میں تمام کنبہ کی موت ہوگئی۔ میں سمجھتی تھی۔ کہ میرا کوئی

فصل ۴ موت

شجاعت

کثرت ہجوم

رشتہ دار نہ رہا +

۷۔ متنبی سیف الدولہ کے لشکر کی کثرت یوں بیان کرتا ہے ؎

وَلَا تَعبُرُ الرِّیحُ فِی جَوِّہٖ اِذَا لَم تَخُطُّ القَنَا اَو تَثِب

لشکر میں یہ نیزوں کی کثرت تھی۔ کہ ہوا بھی میدان جنگ میں نہیں گذر سکتی تھی جبتک کہ وہ نیزوں پر ہو کر نہ کود پھاند جاتی تھی +

مرزا مرحوم نے اپنے لاجواب مرثیہ حال مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی میں دوستداران اہلبیت اطہار کی کثرت کو (جو خون ناحق امام حسینؑ کا بدلہ لینے کو ۶۴ھ کے قریب مختار کے لشکر میں جمع ہوئے تھے) یوں نظم کیا ہے* ؎

کوچوں میں یہ ہجوم خلائق کا حال تھا سائے کو ساتھ لیکے گذرنا محال تھا

ظاہر ہے۔ کہ ہجوم لشکر میں ایک شخص کا سایہ چند آدمیوں پر پڑیگا۔ اس صورت میں جس شخص کا سایہ ہے۔ اُس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ایسے سچے مضامین نکالنا کہ جن سے بظاہر مبالغہ کی شان نکلے۔ واقعی عالی دماغ شعرا کا کام ہے +

تشبیہ بعض اعضائے معشوق

۸۔ متنبی کہتا ہے ؎ مَظلُومَۃُ القَدِّ فِی تَشبِیہِہٖ غُصُنًا۔ مَظلُومَۃُ الرِّیقِ فِی تَشبِیہِہٖ ضَرَبَا۔ اگر اُس کے قد کو نزاکت میں شاخ سے اور آب دہن کو شیرینی میں شہد سفید سے تشبیہ دیں۔ تو یہ گویا ظلم ہے۔ کہ قد اور آب دہن نزاکت شیرینی میں شاخ و شہد سفید سے کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ متنبی نے قد اور آب دہن کی مدح کی

* ایک دوسرے مرثیہ غیر تقسیمی میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے۔ امام حسینؑ کی مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت روضۂ رسول خدا میں اُن حضرتؑ کا جانا اور وہاں ارواح انبیاؑ و اشراف مدینہ و ملائکہ کا ہجوم ہونا بیان فرمایا ہے اُس موقع پر فرماتے ہیں ؎ فردوسیوں کا روضہ پہ ہجوم اس قدر ہوا۔ رضواں بنا بہشت کی بوجب گذر ہوا۔ پھر اُسی مرثیہ میں کثرت کا حال بیان فرماتے ہیں ؎ کثرت یہ تھی ہواق شہ دیں پناہ میں۔ سُرمہ نگاہ ہو گئی پس پس کے راہ میں۔ یہ مضامین ہر شاعر کو نہیں سوجھتے +۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ اور خوب کی ہے* +

مرزا مرحوم کا کلام میں صفت لب حضرت عباسؑ کی تعریف میں پیش کرتا ہوں مگر دیکھئے کس قدر اچھی اور سچی تعریف ہے۔ باایں ہمہ تمام شعراء سے الگ۔

شیریں رقموں میں رقم اس لب کی جدا ہے   اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے   یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے

چوسا ہے یہ لب مثل رطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا کس روز؟ علیؑ نے

۹۔ متنبی اپنے ممدوح غیث ابن علی عجلی کی سخاوت و شجاعت کی یوں مدح سرائی کرتا ہے ۔ عُمرُ العَدُوِّ اِذَا لَاقَاہُ فِی رَھَجٍ ۔ اَقَلُّ مِن عُمرِ مَا یَحْوِی اِذَا وَھَبَا۔ غبار جنگ میں جب دشمن اس کے مقابل پر آجاتا ہے۔ تو اس کی عمر ممدوح کے مال سے بھی جبکہ وہ مال بخشنے لگے کوتاہ و کمتر ہو جاتی ہے۔ یعنی جیسے بخشش کے وقت ممدوح کے ہاتھ میں مال نہیں ٹھیرتا۔ اسی طرح میدان جنگ میں دشمن کی عمر بھی نہیں ٹھیرتی + | شجاعت سخاوت

مرزا مرحوم امام حسینؑ کی بہادری و بخشش کی یوں ساتھ ساتھ تعریف فرماتے ہیں۔ موقع یہ ہے۔ کہ امام ممدوح جہاد فرمانے کو میدان جنگ میں آرہے ہیں۔ دشمن کی فوج میں گھبراہٹ اور انتشار پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک ایسے پیاسے شیر کا مقابلہ ہے جس کا مثل و نظیر بہادری میں خدا نے اپنی خدائی میں نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بھی

* مرزا مرحوم گیسوؤں اور لب اور دہن اور دانتوں کے ساتھ ساتھ یوں مدح کرتے ہیں۔ گیسوئے رسا روئے کتابی کے قریں ہے۔ قرآن کا حافظ پر جبریل امیں ہے + لب موج دہن کوثر فردوس بریں ہے۔ دانتوں سے لطافت کا جہاں زیر نگیں ہے + دندان و دہن کے لئے تشبیہیں ملی ہیں کلیاں سمن خلد کی کوثر میں کھلی ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

غور فرمائیے۔ کہ متنبّی نے صرف سخاوت و شجاعت کو سراہا ہے۔ رعب و ہیبت ممدوح کا اُس کے شعر میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ مرزا مرحوم کا شعر اس پہلو کو بھی لئے ہوئے ہے۔ جو لازمۂ شجاعت ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔ ~

فوجیں ہیں یوں پرے کہ قرار اب محال ہے ۔۔ دِرہم کا شہ کے دستِ کرم میں جو حال ہے

یعنی جس طرح درہم (روپیہ) امام کریم کے ہاتھ میں آکر بے قرار رہتا ہے جب تک وہ جناب کسی کو بخش نہ دیں۔ اسی طرح دشمن کی فوج کے پرے پریشان اور درہم و برہم ہو رہے ہیں۔ اور ڈر رہے ہیں۔ کہ دیکھئے۔ اب لڑائی میں جان رہتی ہے یا جاتی ہے۔ ع واقعی جان کا کھٹکا بھی بُرا کھٹکا ہے +

سخاوت

۱۰۔ محض سخاوت ممدوح کے باب میں متنبّی کہتا ہے۔ ~

وَكُلَّمَا لَقِيَا الدِّيْنَارُ صَاحِبَهُ ۔۔ فِي مِلْكِهِ افْتَرَقَا مِنْ قَبْلِ يَصْطَحِبَا

جب اُس کی مِلک میں دو دینار آجاتے ہیں۔ تو وہ ملنے سے پہلے متفرق ہو جاتے ہیں۔ کہ ممدوح سائلوں کو دے ڈالتا ہے +

مرزا مرحوم جناب امیرؑ کی سخاوت میں کہتے ہیں۔ ~

مُٹھی میں یوں قرارِ زر و سیم ہے محال ۔۔ جیسے کبھی ہتھیلی پہ پیدا نہ ہوئیں بال

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح عادتاً ہتھیلی پر بالوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ اُسی طرح ان کے ہاتھ میں روپیہ اشرفی ٹھیرنا ناممکن ہے۔ یہ ایسے بخشنے والے ہیں +

فضل ممدوح دبدبۂ شجاعت اور صولت اور اس کی تلوار

۱۱۔ متنبّی اپنے ممدوح کی بہادری کو یوں سراہتا ہے۔ ~

اِنَّ الْمَنِيَّةَ لَوْ لَاقَتْهُمْ وَقَفَتْ ۔ خَرْقَاءَ تَتَّهِمُ الْإِقْدَامَ وَالْهَرَبَا

موت بھی اُس کے سامنے (میدان جنگ میں) آجائے۔ تو حیران و ششدر کھڑی رہ جائے کہ آگے بڑھونگی۔ تو ماری جاؤنگی۔ پیچھے ہٹونگی۔ تو پکڑی جاؤنگی۔ دُوسرا شعر متنبّی کا ممدوح کی تلوار کی مدح میں یہ ہے۔ ما شارکتہ منیتہ فی مھجتہ

اِلَّا وَشَفْرَتُہٗ عَلٰی یَدِھَا یَدٗ۔ موت خونریزی میں تیری تلوار کی شریک نہیں ہوتی۔ مگر تلوار کی تیزی کا ہاتھ موت کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تیری تلوار موت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور واقعی جب تلوار کاٹیگی۔ جب ہی موت آئیگی۔ پس تلوار کا ہاتھ موت کے ہاتھ پر رہا۔ یہ عجب بلیغ مضمون ہے۔ تیسرا شعر متنبی کا میں اور لکھنا چاہتا ہوں۔ جس میں وہ خود اپنی تلوار کی مدح کرتا ہے۔ یا اپنی شیخی بگھارتا ہے۔ ؎

یُسَابِقُ سَیْفِیْ مُنَایَا الْعِبَادِ　　اِلَیْھِمْ کَاَنَّھُمَا فِیْ رِھَانِ

میری تلوار اور مقتولوں کی موت شرط باندھ کر ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں۔ مگر میری تلوار موت سے پہلے اُن تک پہنچ جاتی ہے +

ناظرین باتمکین !! اب جہاد امام حسین کے موقع پر شمشیر حسینی کی مدح میں مرزا مرحوم کے چند شعر سن لیجئے :-

(۱) میان سے تلوار نکل رہی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔ ؎

کل اُس کو نہ رن میں نہ بیابان میں آئی　　یہ میان سے نکلی اور اجل میان میں آئی

(۲) پھر اسی مضمون کے قریب قریب دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں۔ ؎

پھل دونوں دیکھ دیکھ کے چلائے رمز داں　　لو یہ تو ہیں عیاں ملک الموت ہیں کہاں
بولی اجل وہ گوشہ نشین نیام ہیں　　اس وقت ذوالفقار کے قائم مقام ہیں

(۳) اور سنئے۔ ؎

طاؤس ذوالفقار تڑپ کر عیاں ہوا　　اُڑ اُڑ کے ہر زمیں کا طبق آسماں ہوا
چلائی عافیت میں رہوں کس مکان میں　　مڑ کر یہ تیغ بولی۔ کہ چھپ جا میان میں

(۴) ہلنے کو مڑ کے حکم دوبارہ نہ جائیو　　اُنگلی اجل کی پکڑے ہوئے لیتا آئیو

(۵) دم تن سے نہ نکلا کہ وہ چھپنے کی گھڑی تھی　　ڈر سے نہ اجل آئی۔ کہ تلوار کھڑی تھی

واقعی مرزا مرحوم جس طرف جاتے ہیں۔ دریا مضامین کے بہا جاتے ہیں۔ کیا دماغ پایا ہے۔

مسافرت میں سواری نہ ملنا

۱۲۔ متنبی کہتا ہے۔ ؎ وَلَمَّا قَلَّتِ الْاِبِلُ امْتَطَيْنَا۔ اِلٰی اِبْنِ سُلَیْمَانَ الْخُطُوبَا۔ جب مفلسی کی بدولت اونٹ ہمارے پاس کم ہوگئے۔ تو ہم زمانے کی مصیبتوں کو شتر بنا کر سپر ابو سلیمان کی طرف چلے۔ واہ کیا عمدہ استعارہ ہے ٭

مرزا مرحوم ایک بے سروسامان عاشق امام حسینؑ کی کیفیت نظم فرماتے ہیں جس نے بعد شہادت امام مظلوم یہ خبر سُنی ہے۔ کہ سر امام حسینؑ یزید نے اپنی جہالت و شقاوت سے ایک کنوئیں میں قید کر رکھا ہے۔ یہ شخص اپنے وطن مالوفہ کوفہ سے اکیلا شام کو اس ارادے سے جا رہا ہے۔ کہ کسی تدبیر سے اپنے آقائے مظلوم کا سر اُس کنوئیں سے نکال کر لاؤنگا۔ اور یہیں کوفہ (نجف) میں جناب امیرؑ کے جسم اقدس کے قریب دفن کرونگا۔ (کہتے ہیں): ۔

گھر سے پیادہ عشق کو وہ مردِ با وفا ۔۔۔ توفیق زاد راہ ہوئی شوق رہ نما
رزقِ لطیف گلشن فردوس کی ہوا ۔۔۔ اور آبلے کے پردے میں کوثر بزیر پا

زانو و سر کو پیٹتا تھا ہر مقام میں
یعنی برہنہ پا گئے سجّاد شام میں

باغ اور خوشبو کی وجہ نعش انسان

۱۳۔ نکہت باغ کا یہ مضمون جو میں ذیل میں لکھتا ہوں۔ شاید پہلے پہل متنبی کو سُوجھا ہے۔ مجھے یہ مضمون بہت ہی پسند ہے۔ ؎

وَمَا رِيحُ الرِّيَاضِ لَهَا وَلٰكِنْ ۔۔۔ كَسَاهَا دَفْنُهُمْ فِي التُّرْبِ طِيبَا

یہ جو باغوں میں خوشبو (پھیلی ہوئی) ہے۔ وہ باغوں (کے پھولوں) کی نہیں ہے۔ بلکہ اُن (مُردوں) کے مٹی میں دفن ہونے نے باغوں کو خوشبوؤں کا لباس پہنا دیا ہے۔ ناظرین عالی دماغ کی خدمت میں میں اس موقع پر ایک نظم کا گلدستہ پیش کش کرتا ہوں۔ جس میں کچھ پھول جناب مرزا غالب مرحوم کے حدیقۂ نظم کے اور بعض گل شگفتہ مرزا دبیر مغفور کے گلزار طبع کے اور بعض استاذی حضرت اوج مدظلہ کے بوستان طبع کے ہیں۔ خدا کی

شان ہے۔ کہ مضمون کا ماحصل ایک ہی ہے۔ مگر الفاظ کے رنگ اور خوشبوے بیان کے اثر نے نئے نئے لطف پیدا کر دئے ہیں[۱] ٭

۱۔ مرزا غالب مرحوم: سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ٭ خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں ٭

۲۔ مرزا دبیر مغفور: تھا سرو قد خزاں نے کئے جبکہ پائمال ٭ تب خاک سے نمود ہوا۔ ایک نونہال ٭ ریحاں کسی حسین کی فہرست خط و خال ٭ نرگس کسی کی چشم تو سنبل کسی کے بال ٭ جب کھل گیا لالہ کا رسالہ نہاں ہوا ٭ اک لالہ۔ داغدار زمیں سے عیاں ہوا ٭

۳۔ حضرت اوج مغفور: کیسی رنگا رنگ شکلیں ہونگی اے جوشِ بہار ٭ (چمن) مٹ کے جو گلگونۂ رخسارِ گلشن ہوگئیں[۲] ٭

سلہ ایک شعر حضرت میر تقی میر مرحوم کا بھی اسی مضمون کا نکل آیا۔ یہ غالبؔ و دبیرؔ و اوجؔ مغفور سب سے اوپر ہونا چاہئے تھا۔ مگر مجبوری ہے۔ کہ بعد کو دستیاب ہوا۔ اس لئے حاشیہ پر لکھ دیتا ہوں ۔ کو گل و لالہ کہاں سنبل و سمن ہم نسترن ٭ خاک سے یکساں ہوئے ہیں ما کیا ایشنا اب کے چار تند تیں استادوں کے اشعار اکٹھے ہوگئے جو اپنے اپنے رنگ میں یکتا اور اپنے عہد میں بے مثل ہیں ٭ ۱۲ مؤلف بے بضاعت۔

سلہ ۲ متنبی نے صرف خوشبو کی نسبت خیال کیا تھا۔ کہ جو باغوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ نیک نہاد مُردوں کی ہے۔ کہ جو زمین میں دفن ہیں۔ ان شعراے ہند نے پھولوں کی نسبت یہی خیال ادا فرمایا ہے۔ مگر سبحان اللہ کس خوبصورتی سے کیس لطافت اور سلاست و فصاحت سے مضمون کو ترقی دی ہے۔ مجھ بے بضاعت کو جہاں تک ایرانی شاعروں کے کلام دیکھنے کا موقع ملا (وہ بہت کم ملا) اُن کے یہاں ایسا مضمون خوشبوؤں یا پھولوں کی نسبت نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ ہر عمارت اور زمین کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ اگر غور کرو۔ تو کیسے کیسے صاحبان ملک و مال و یوسف جمال خاک کا پیوند ہوگئے ہر جگہ انہیں کی خاک مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے چنانچہ عمر خیام کی لاجواب رباعی حسب ذیل ہے۔ خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانی ست ٭ زلف صنمی و عارض جانانی ست ٭ ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی ست ٭ انگشت وزیری و سر سلطانی ست ٭ سعدی شیرازی فرماتے ہیں۔ زدم تیشہ یک روز بر تل خاک ٭ بگوش آمدم نالۂ دردناک ٭ کہ زنہار اگر مردی۔ آہستہ تر ٭ کہ چشم و بناگوش و روے است و سر٭ ٭

٭ بے بضاعت ثابت نے بھی ان سب اُستادوں کی تقلید میں کچھ خاک چھانی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ۔ جن کی خاک پاتھی عطر گل عرق جن کا گلاب ٭ کیسی خلک صورتیں مٹی میں پنہاں ہوگئیں ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

۱۴ متنبی اپنے ممدوح کافور حبشی والیٔ مصر کی مدح میں کہتا ہے۔ ؎

اِذَا اتتھا الرِّیَاحُ النُّکْبُ مِنْ بَلَدٍ فَمَا تَھُبُّ بِھَا اِلَّا بِتَرْتِیْبٖ

جب اُس کے شہر میں جوبانی ہوا کسی شہر سے آتی ہے۔ تو اُس کی ہیبت کے سبب سے سیدھی (باقاعدہ) چلنے لگتی ہے +

مرزا مرحوم جناب حسنین علیہم السلام کی مدح میں کہتے ہیں۔ ؎

اک ذرہ خلاف ان کے زمیں کر نہیں سکتی دم بھر بھی ہوا غیر کا دم بھر نہیں سکتی

اس میں "دم بھر" اور "دم بھر نہیں سکتی" (ان الفاظ) میں جو لطافت و دلچسپی ہے۔ اُس کی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ دل ہی لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر کس کا؟ اُن لوگوں کا جن کو لطف زبان حاصل ہے۔ جب تک زبان پر شاعر کو اعلےٰ درجہ کی قدرت نہ حاصل ہو۔ ایسے الفاظ خیال ہی میں نہیں آتے۔ سچ کہتے ہیں۔ کہ شاعر کے دیوان بھر میں ایک غزل یا قصیدہ اور اُس میں ایک شعر اور شعر میں ایک لفظ ہوا کرتا ہے +

۱۵ متنبی اُسی کافور کی مدح میں کہتا ہے۔ ؎

وَلَا تُجَاوِزُھَا شَمْسٌ اِذَا شَرَقَتْ اِلَّا وَمِنْہُ لَھَا اِذْنٌ بِتَغْرِیْبٖ

طلوع ہونے کے بعد مصر سے آفتاب نہیں گذرتا۔ جب تک ممدوح (کافور) سے اذن غروب نہ حاصل کرلے۔ اس شعر میں ممدوح کی کمال عظمت (فرضی) بیان کی ہے +

مرزا مرحوم جناب عباسؑ ابن جناب امیرؑ کی زبانی (رجز میں) کہتے ہیں (پہلوان مدمقابل کا نام مرحب بن عبد القمر ہے۔ جب وہ رجز پڑھ چکا۔ تو جناب عباسؑ اُس کے جواب میں رجز خواں اور گہرفشاں ہیں)۔ ؎

عبد القمر نحس کا تو داغ جگر ہے میں چاند علیؑ کا ہوں آ یہ بھی خبر ہے
خورشید پرستی سے تری کیا مجھے ڈر ہے قبضے میں طناب فلک شمس و قمر ہے
جب قبلے کو ہم نے رُخ امید پھرایا

بمالغہ فی مدح ممدوح

نکتہ مدح ممدوح

مشرق کی طرف شام کو خورشید پھر آیا

مطلب فلک قبضہ اقتدار میں ہونے کے دعوے کو کس خوبصورتی سے دلیل معجزہ رجعت شمس سے ثابت فرمایا ہے۔ اور یہ (بات) کہ رجعت شمس جناب امیرؑ کے واسطے ہوئی۔ مسلمانوں میں ایک اظہر من الشمس بات ہے۔ رُخ امید قبلے کی طرف پھرانے کے بھی دو معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ (۱) نماز کے واسطے متوجہ ہوئے۔ (۲) خدا سے دعائے رجعت شمس کی۔ یہ ٹیپ ذوقافتین بھی ہے۔ (۱) خورشید و امید باہم قافیہ ہیں (۲) پھرایا اور پھر آیا۔ اور پھرایا اور پھر آیا میں تجنیس خطی کی صنعت بھی ہے ان صنعتوں پر اس قدر بے تکلف و بے ساختہ کلام یہ خدا کی قدرت و بخشش اور دبیرؒ کا حصہ ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۶۔ ابو ایوب احمد بن عمران کی مدح میں متنبی کا شعر ہے ؎

یرعد الفوارس منک فی ابدانہا اجری من العسلان فی قنواتہا

سواروں کے نیزے اتنے نہیں ہلتے۔ جتنے تیرے رعب و خوف سے اُن کے بدن لرزتے ہیں +

مرزا دبیر فرماتے ہیں ؎

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند تھا نیزہ دل کو رعشہ قدم پیر کی مانند

اس شعر کی لطافت و بلاغت میں اعتراض مولوی شبلی صاحب کے جواب میں ایک جگہ اسی کتاب میں بیان کر چکا ہوں۔ ناظرین اُس موقع پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں +

۱۷۔ مساور بن محمد رومی کی مدح میں متنبی کا شعر ہے ؎

یخطو القتیل الی القتیل امامہ رب الجواد و خلفہ المبطوح

کُشتوں کی کثرت سے میدان جنگ میں ممدوح کا گھوڑا ایک کشتہ کے بعد دُوسرے

فصل ۵ رعب و دہشت

میدان جنگ سرِ مقتولین

پر قدم رکھتا ہے۔ اور اُس کے سوار کے پیچھے بھی ایک گُشتہ پڑا ہے +

مرزا مرحوم ذوالفقار آبدار اور راہوار فرزند احمدؐ مختار (امام حسینؑ) کی کیفیت میدان کارزار میں بیان فرماتے ہیں۔ ؎

برسا رہی تھی خون کا مینہ تیغ آبدار
صف روندتا تھا کوندکے رہوار برق وار

پر دشت تھا یہ گِل کہ نہ تھی گشت کی بہار
کیلیں نہ تھیں وہ نعل ہلالی میں آشکار

رن میں جھڑی لگائی تھی تیغ بلند نے
باندھے تھے مینہ کے کھُلنے کو تارے سمند نے

۱۸۔ سیف الدولہ کو عید قربان کی تہنیت (متنبّی) دیتا ہے۔ ؎

هَنِيئًا لَكَ الْعِيدُ الَّذِي أَنْتَ عِيدُهُ
وَعِيدٌ لِمَنْ سَمَّى وَضَحَّى وَعَيَّدَا

تجھ کو وہ عید مبارک ہو جس کی تو خود عید ہے۔ اور لوگوں کی عید ہے جس نے عید منائی۔ اور خدا کا نام لیا اور قربانی کی +

مرزا مرحوم نے ایک مرثیہ میں ایک روایت نظم فرمائی ہے۔ کہ عہد جناب رسالت مآب صلعم (روحی له الفدا) میں ایک ایسی عید آئی۔ کہ حسنین (علیہما السّلام) کے پاس نئے لباس نہ تھے۔ اور محلّے کے بچّوں کو نئے نئے کپڑے سلواتے اور رنگواتے ہوئے دیکھ کر یہ دونوں شاہزادے اپنی والدہ ماجدہ جناب فاطمہؑ کے پاس آئے۔ اُس وقت کی (ماں بیٹوں کے لاڈ پیار کی) تصویر مرزا صاحب یوں کھینچتے ہیں:۔

گِل۔ کیچڑ۔ گیلی مٹّی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کہ ذوالفقار نے دشمنوں کے قتل کرنے میں اتنا خون بہایا تھا۔ کہ برسات معلوم ہوتی تھی۔ رہوار بجلی کی طرح (صفیں) کوندکوندکر روندرہا تھا۔ مگر کیچڑ کے سبب سے اُس کے پھرنے کی بہار نہ تھی۔ کیلیں جو نعلوں میں تھیں۔ وہ ستارے معلوم ہوتے تھے۔ گویا مینہ کھُلنے کے لئے گھوڑے نے تارے باندھے تھے۔ ہندوستان میں یہ ٹوٹکا مشہور ہے۔ کہ مینہ کے کھُلنے کو تارے باندھے جاتے ہیں + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

ن پر خون جو دشت تھا تو نہ تھی گشت کی بہار

تہنیت عید

القصّہ شن کے چار طرف عید کی خبر آئے حضورِ فاطمۂ سبطینِ نامور
باہیں گلے میں ایک نے ڈالیں ادھر اُدھر اک سینے سے لپٹ گیا جلدی جھکا کے سر

بولا بڑا ہمیں پہ بہت مہربان ہیں
چھوٹا پکارا۔ واہ مری اماں جان ہیں

اب ماں کا جواب سُنئے۔جواب کی شان دیکھئے۔ایسا جواب ہو۔جس سے ماں کی محبت لفظ لفظ سے ٹپکتی ہو۔اور دونوں بچوں کے ساتھ یکساں محبت ثابت ہو۔ کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو:۔

ماں بولی ہم تو دونوں کے قربان جاتے ہیں اتنا نہ چاہو تم۔مجھے دسواس آتے ہیں
حاسد کے چشم زخم سے ہم ہول کھاتے ہیں سب سے چھپا کے تم کو گلے سے لگاتے ہیں

خاصانِ حق کے خاص ہو۔نیکوں کے نیک ہو
مثلِ نگاہ۔تم مری آنکھوں میں ایک ہو

اولاد کو عام طور پر نورِ چشم کہتے ہیں۔دونوں فرزندوں کا اپنی آنکھوں میں ہم مرتبہ ہونا کس لطافت سے بیان فرمایا ہے۔کہ آدمی کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔مگر نگاہ ایک ہی ہوتی ہے۔مطلب یہ نکلا۔کہ تم دونوں نورِ چشم میری دو آنکھیں ہو۔مگر نگاہ کی طرح میں (دونوں کو) ایک سمجھتی ہوں۔تم میں سے کسی کے ساتھ محبت کم یا زیادہ نہیں ہے۔

اب یہ شاہزادے اپنے نئے لباس طلب کرتے ہیں۔اس کی تصویر دیکھئے:۔

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ خوش بیاں ارشاد اب یہ کیجئے اے فخرِ دو جہاں
کل عید ہے؟ جواب دیا فاطمۂ نے ہاں یہ بولے پھر لباس۔غلاموں کا ہے کہاں

سامان اب تلک نہیں عیش و سرور کے
کیا کل نہ عید ہوئیگی گھر میں حضور کے

یہ واضح رہے۔کہ جناب فاطمۂ کی والدہ ماجدہ (جناب امّ المومنین خدیجۂ) کی دولت

(باتفاق فریقین) لاکھوں روپیہ کی تھی۔ جو اُن معظمہ کے بعد (بجز حصۂ شوہری کہ حق جناب رسول خدا کا تھا) جناب فاطمہ زہراؑ کے قبضہ میں آئی ہوگی۔ مگر اشاعت اسلام میں جناب فاطمہؑ نے حسب منشاے جناب رسالت مآب صلعم سب صرف فرما دی۔ بہت سے نئے مسلمان (اہل صفہ وغیرہ) ایسے تھے۔ جن کے پاس نہ کھانے کو کھانا نہ اوڑھنے بچھانے پہننے کو کپڑہ تھا۔ اُن میں جو لاکھوں روپیہ صرف ہؤا۔ وہ اکثر اسی مال سے خرچ ہؤا۔ خود محمدؐ و آل محمدؐ اپنے واسطے نہ بچاتے تھے۔ سب محتاجوں کو دیدیتے تھے۔ اس سبب سے اکثر فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے تھے۔ اسی سبب سے حضور صلعم فرماتے ہیں۔ الفقر فخری۔ یہ فقر و فاقہ میرا فخر ہے۔ میری عزت بڑھاتا ہے۔ پس جناب فاطمہؑ جن کے پاس اُس عید کو حسنؑ و حسینؑ کے واسطے نئے کپڑے نہیں ہیں۔ کس طرح اپنے پیاروں کو جواب دیتی ہیں۔ آخر ماں کا دل ہے۔ بچوں کی عسرت کا کہاں تک اثر نہ ہوگا۔ رنج میں تسلی دینے کی شان دیکھئے:۔

عسرت پہ اپنی۔ رو کے یہ معصومہؑ نے کہا ۔۔۔ قربان جاؤں عید سے فاقہ کشوں کو کیا

اہل دول کے واسطے ہے عید کا مزا ۔۔۔ آل نبیؐ کی عید ہے خوشنودئ خدا

زہرا و چاند عید کا پیاروں کی دید ہے

جب تم گلے سے لپٹے میں سمجھی کہ عید ہے

صرف یہ آخر اللہ کا بیت متنبی کے شعر کے جواب میں پیش کرنا منظور تھا۔ مگر سلسلہ کلام کے واسطے اوپر کے بند اور واقعہ لکھنا پڑا۔ آگے چل کر جب نئی پوشاک جناب فاطمہؑ نے اپنے فرزندوں کو پہنائی ہے۔ اُس موقع پر (مرزا مرحوم) فرماتے ہیں:۔

پوشاک سے خوزادوں کی یہ شان ہوگئی ۔۔۔ اک عید صدقے دوسری قربان ہوگئی

اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ ایک عید عید الفطر کہلاتی ہے۔ اور فطرہ ایک خاص قسم کا صدقہ ہے۔ پس عید الفطر کو صدقہ کے لفظ سے مناسبت قدرتی ہے۔ اور

دُوسری عید (عید اضحیٰ) کا تو نام ہی عید قرباں ہے۔ کہ اُس روز جا للہ قربانی کیا جاتا ہے
رعایت لفظی ایسی چسپاں ہو۔ تو لطف صنعت ہے۔ اب اس مصرع کی شان دیکھئے "تک
عید صد تے دُوسری قربان ہو گئی"۔

۱۹۔ علی ابن ابراہیم تنوخی کی مدح میں متنبی کا شعر ہے۔ ؎

كَأَنَّ الهَامَ فِي الهَيجَا عُيُونٌ ۔۔۔ وَقَد طُبِعَت سُيُوفُكَ مِن رُقَادِ

گویا دشمنوں کے سر رزم گاہ میں آنکھوں کی طرح ہیں۔ اُن میں تیری تلواریں نیند
کی مانند داخل ہوتی ہیں۔ دُوسرے مقام پر متنبی کہتا ہے۔ ؎

كَأَنَّ عَلَى الجَمَاجِمِ مِنهُ نَارًا ۔۔۔ وَأَيدِي القَومِ أَجنِحَةُ الفَرَاشِ

دشمنوں کے سروں پر اُس کی تلوار گویا آگ ہے۔ اور دشمنوں کے ہاتھ پر پروانہ کی طرح
کٹ کٹ کر اُس پر گر رہے ہیں۔

مرزا مرحوم شمشیر حسینی کی مدح میں سیف زبانی فرماتے ہیں:- (۱)

پلّے کو دو کیا تو کماں سے لپٹ گئی ۔۔۔ کیا جانے دل میں جا کے کماں سے لپٹ گئی
چسپیدگی تیغ سے۔ دل عذر کیا کرے
ناخن سے کوئی گوشت کو کیونکر جدا کرے

(۲) ایک پہلوان کی لڑائی میں جب امام حسینؑ نے ضرب لگائی کہتے ہیں۔

ماتھے پہ لگی تیغ جناب شہِ عادل ۔۔۔ مضمون کی طرح خط جبیں میں ہوئی داخل

(۳) تیسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ ؎

جو تیغ کی آتش پہ گرا پھر وہ کماں تھا ۔۔۔ گرنے میں تو اسپند تھا اُٹھنے میں دُھواں تھا

۲۰۔ محمد بن بشار تمیمی کے رفیقوں کی مدح میں متنبی کا شعر ہے۔ ؎

ثِقَالٌ إِذَا لَاقَوا خِفَافٌ إِذَا دُعُوا ۔۔۔ كَثِيرٌ إِذَا شَدُّوا قَلِيلٌ إِذَا عُدُّوا

جب وہ دشمنوں سے مقابلہ آرا ہوتے ہیں۔ تو ثقیل ہیں (کہ سخت حملہ کرتے ہیں) جب لڑائی

کے لئے بُلائے جاتے ہیں۔ تو ایک ہیں۔ کہ فوراً آجاتے ہیں۔ جب وہ بشدّت دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں۔ تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔ اور گنتی کرو۔ تو تھوڑے سے ہیں +

مرزا مرحوم امام حسینؑ کے جاں نثار شیر دل ہمراہیوں کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

ہمت میں ایک۔ لاکھ جواں سے زیاد تھا　　　　کم اُن کے آگے لشکر ابن زیاد تھا

۲۱ متنبّی اپنے ممدوح کی آمد کی ہیبت و جلال کو یوں سراہتا ہے ؎

وَتَلْقِی وَمَا تَدْرِی الْبَنَانُ سِلَاحَهَا　　　　لِکَثْرَةِ اِیْمَاءٍ اِلَیْهِ اِذَا یَبْدُو

جب وہ برآمد ہوتا ہے۔ تو لوگ اُس کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے (اُنگلیوں) ہاتھوں سے ہتیار گر پڑتے ہیں۔ اور محویت میں اُن کو خبر نہیں ہوتی +

۱۔ مرزا مرحوم شاہزادہ علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی برآمدگی و آمد میدان جنگ کے موقع پر کہتے ہیں ؎

نورِ نظرِ شاہ جو گھر سے نکل آیا　　　　حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

۲۔ جب جناب حُرؑ دلاور میدان رزم میں جہاد کو آئے ہیں۔ اُس وقت کہتے ہیں۔ کہ لشکریان یزید کی یہ کیفیت ہوئی ؎

میداں سے پاؤں اُٹھ گئے اور خود گر گئے　　　　مارے طمانچہ خوف نے مُنہ سب کے پھر گئے

۳۔ تیسرے موقع پر فوج مخالف کی گھبراہٹ یوں بیان کرتے ہیں ؎

گھبرا کے تیغ جو عدو کرتے تھے رن میں　　　　انگشت کی جا تیغ کو رکھتے تھے دہن میں

۲۲ متنبّی کافور والئے مصر کی مدح میں مضمون خیالی کا دریا بہاتا ہے ؎

کَیْفَ لَا تُتْرَكُ الطَّرِیقُ لِسَیْلٍ　　　　ضَیِّقٍ عَنْ اَتِیِّهِ كُلُّ وَادِ

اُس سیل کے واسطے کیونکر راہ نہ چھوڑی جائے جس کی کثرت آمد آب سے ہر نالہ اور ڈھال تنگ ہو۔ کہ وہ سیل نالوں میں نہ سما سکے +

مرزا مرحوم اُس موقع پر کہ جب حضرت عباسؑ نے دشمنوں کو للکار کر گھوڑے کی باگ اُٹھائی ہے۔ اور حملہ کر کے دریا پر جانا چاہا ہے۔ کہتے ہیں (حضرت عباسؑ کی زبانی) ؎

دریا کی طرح اپنی طبیعت نہیں رُکتی — جاری ہوئی جب حق کی مشیت نہیں رُکتی

۲۳۔ سیف الدولہ کے مدحیہ قصیدے میں متنبی شاعرانہ خود ستائی کرتا ہے ؎

وَلِیْ فِیْكَ مَا لَمْ یَقُلْ قَائِلٌ — وَمَا لَمْ یَسِرْ قَمَرٌ حَیْثُ سَارَا

جیسے قصیدے میں نے تیری مدح میں کہے۔ کسی نے نہیں کہے۔ اور خوبی میں جہاں وہ پہنچ گئے۔ وہاں چاند بھی نہیں پہنچا +

مرزا مرحوم تفاخر شاعرانہ فرماتے ہیں ؎

ہم فن مرے ثنا کی جو نہ ہوں رُوئے زمیں پر — پہنچا دوں سخن کو میں ابھی عرش بریں پر

۲۴۔ متنبی سیف الدولہ کی مدح میں کہتا ہے ؎

اَلصَّوْمُ وَالْفِطْرُ وَالْاَعْیَادُ وَالْعُصُرُ — مُنِیْرَۃٌ بِكَ حَتَّی الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

روزہ۔ فطر۔ عیدین اور زمانے یہاں تک کہ چاند سورج بھی تجھ سے روشن ہیں +

مرزا مرحوم ہمشکل پیغمبر شاہزادہ علی اکبرؑ کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

ایمن میں طور۔ طور میں یہ برق طور ہیں — گردن میں سر ہیں۔ سر میں یہ عقل و شعور ہیں
سینے میں دل ہیں۔ دل میں نشاط و سرور ہیں — چہرے میں آنکھ۔ آنکھ میں تل۔ تل میں نور ہیں
گلشن میں یہ پھول۔ پھول میں بو۔ بو میں عطر ہیں
روزوں میں عید۔ عیدوں میں یہ عید فطر ہیں

اللہ اللہ کس قدر مضامین کی بہتات ہے۔ جدھر آتے ہیں۔ دریا بہا جاتے ہیں۔ کیا بحر زخار طبیعت پائی ہے۔ ناظرین!! اخیر ایک بند اور بھی سُن لیجئے۔ جس مرثیے کے یہ بند ہیں۔ وہ نہ ابتک عام طور پر تقسیم ہوا ہے نہ چھپا ہے۔ جس کا مطلع مشہور یہ ہے
ع کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے ؎

سینہ کو دل۔ دلوں کو سرور ان کا چاہیئے — ایمن کو طور۔ طور کو نور ان کا چاہیئے
جلوہ کلیم کو سر طور ان کا چاہیئے — سب کو خدا۔ خدا کو ظہور ان کا چاہیئے

برحق نمونۂ جبروتِ خدا یہ ہیں
بندے ہیں۔ پر دلیلِ ثبوتِ خدا یہیں

۲۵۔ متنبی کا یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ چہرہ کی زردی اور اُس کے ساتھ اُس پر قطرہائے اشک کا تقاطر اور ان دونوں باتوں کی تشبیہ تامہ ملاحظہ ہو ؎

فَکَاَنَّہَا وَالدَّمعُ یَقطُرُ فَوقَہَا ذَھَبٌ بِسِمطَی لُؤلُؤٍ قَد رُصِّعَا

اُس کے چہرۂ زرد (سنہری) پر جو متواتر آنسو ٹپکتے تھے وہ موتی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ موتیوں کی لڑی سونے میں جڑی ہوئی ہے +

سبحان اللہ کس قدر دلچسپ و خوشنما تشبیہ ہے +

مرزا مرحوم جناب عباسؑ کے اُس رُخِ انور کی مدح فرماتے ہیں۔ جس پر پسینہ (گرمی سے) آرہا ہے۔ برابر پسینہ کے قطرے گر رہے ہیں۔ یہ مضمون تشبیہ بھی کس قدر بلیغ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

منہ عرقِ عرق دیکھ کے خورشید ہوا تر | ابرو سے ٹپکتا ہے نرا تیغ کا جوہر
آنکھوں کا عرق روغنِ بادام سے بہتر | عارض کا پسینہ ہے گلابِ گلِ احمر

قطرے رُخِ گل رنگ پہ ڈھلتے ہوئے دیکھو
عطرِ گلِ خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

اس بند میں فرماتے ہیں۔ کہ چہرہ ممدوح پر جو پسینہ آرہا ہے۔ تو اُس سے خورشید تر یعنی شرمندہ و عرق عرق ہے۔ اور ابرو (جو مشکل شمشیر ہے) سے گویا تیغ کا جوہر ٹپک رہا ہے۔ آنکھوں سے جو پسینہ بہ کر آتا ہے۔ وہ روغن بادام سے بہتر ہے۔ شعرا آنکھ کو بادام سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ یہاں روغن بادام عرق چشم کو فرمایا۔ بات میں سے بات نکالی۔ پھر فرماتے ہیں۔ عارض کا پسینہ گویا گلاب ہے۔ اور گلاب گل سرخ کا کھنچا ہوا ہے۔ قطرے روے گل رنگ (سرخ) پر ڈھل رہے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

گل خورشید سے عطر نکل رہا ہے۔ متنبی کے یہاں زرد چہرے پر سفید آنسوؤں کے تقاطر کا مذکور تھا۔ یہاں چہرہ گل رنگ پر پسینہ کا بیان ہے +

عبرت عالم

۲۶۔ متنبی عبرت عالم کے باب میں کہتا ہے ؎

اَیْنَ الْاَکَاسِرَۃُ الْجَبَابِرَۃُ الْاُوْلٰی　　کَنَزُوا الْکُنُوْزَ فَمَا بَقِیْنَ وَلَا بَقُوْا

کہاں ہیں وہ زبردست بادشاہ جنہوں نے خزانے گاڑے تھے۔ نہ وہ خزانے رہے نہ وہ خود رہے۔ ؎ وَتَوَلَّوْا بِغُصَّۃٍ مِنْہُ وَاِنْ سَرَّ بَعْضَہُمْ اَحْیَانًا۔ سب نے زمانے سے ناراضی کی حالت میں پشت پھیری۔ اگرچہ کبھی کبھی کسی کو زمانے نے خوش بھی کر دیا (مگر وہ خوشی ناقابل اعتبار ہے۔ زمانے کا مآل و انجام ملال ہے) +

مرزا مرحوم عبرت عالم میں فرماتے ہیں:۔

غور کر

عبرت سے روز و شب کی دورنگی پہ کر نظر　　اس دوش پر جنازہ ہے اُس دوش پر پسر
دُولھا جوان پسر کو بناتا ہے اک پدر　　مرنے پہ نوجواں کے کوئی پیٹتا ہے سر
دُنیا کی جو ہوس ہے وہ فانی ہے خاک ہے
عقبےٰ کی فکر کر کہ وہ باقی ہے پاک ہے

جز حیف کیا جہان سے سلیمانؑ لیگئے　　یوسفؑ بھی زیر خاک سب ارماں لیگئے
شاہانِ دہر کون سا ساماں لے گئے　　سب کچھ وہ لیگئے کہ جو ایماں لیگئے
کن غافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا
کن یوسفوں کو غرق نہ اس چاہ نے کیا

بہادروں کا رعب

۲۷۔ متنبی کہتا ہے ؎ بَعَثُوا الرُّعْبَ فِیْ قُلُوْبِ الْاَعَادِیْ۔ فَکَاَنَّ الْقِتَالَ قَبْلَ التَّلَاقِیْ۔ اُن بہادروں نے لڑائی لڑنے سے پہلے ہی اپنا رعب دشمنوں کے دلوں میں ڈال دیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ مقابلہ ہوا نہیں۔ اور لڑائی ہوگئی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ وہ رعب و دہشت سے ایسے مبہوت ہو گئے کہ

لڑ بھی نہ سکے +

مرزا مرحوم شجاعِ ازلی حسینؑ ابن علیؑ کی رعب و ہیبت کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے پہلوان امام دلیر و شجاعِ ازلی کو دیکھ کر اپنے مقام سے کچھ بڑھے تو۔ مگر رعب و ہیبت حضور کے سبب سے پاس آنے کا یارا نہ تھا۔ سه

رطب اللساں رجز میں ابھی تھے امامِ پاک — جو رستمانِ شام بڑھے ہو کے خشمناک
مشتاقِ کشتیوں میں ملے بازوؤں پہ خاک — مُردِ دلوں میں جن کی ساکھ دلیروں میں جن کی دھاک
پر قربِ ذوالجناح نہ جرأت کا جوش تھا
پہلے سُموں سے اس نے جو روندا وہ ہوش تھا

اللہ اللہ کیا بات فرمائی۔ کہ گھوڑے نے سب سے پہلے دشمنوں کے ہوش کو روند ڈالا۔ اب کیا کسی کو جرأت و ہمت آگے بڑھنے کی ہو سکتی تھی؟

۲۸۔ متنبیؔ نے گھوڑوں کی تعریف میں کہا ہے۔ سه خَافِیَاتُ الاَلْوَانِ قَدْ نَسَجَ النَّقْعُ عَلَیْھَا بَرَاقِعاً وَجِلاَلاَ۔ وہ گھوڑے دشمنوں کو ایسے حال میں آ کر مار لیتے ہیں۔ کہ کثرتِ غبار کے سبب سے اُن کے رنگ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ خبر نہیں پڑتی کہ نقرہ ہیں یا مشکی یا سبزہ وغیرہ وغیرہ +

متنبیؔ نے تو غبار کی وجہ سے گھوڑے کے رنگ نہ ظاہر ہونے کا خیال باندھا ہے۔ مگر اب مرزا مرحوم کی نازک خیالی (مضمون) کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

اسپ امام حسینؑ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

طے کرتا ہے اک دم میں یہ دُنیا کی حدیں سب — کیسی وہ حدیں آپ سے باہر ہے یہ مرکب
خالی ہے رکابوں کی طرح چلنے میں قالب — نقرہ ہے نہ سبزہ ہے نہ ابلق ہے نہ اشہب
نام اس کا تصوّر میں گذرتا نہیں کوئی
شوخی کے سبب رنگ ٹھہرتا نہیں کوئی

شوخی گھوڑے میں اس قدر ہے۔ کہ رنگ بھی نہیں ٹھیرتا۔ اللہ اللہ کیسی نازک خیالی ہے اور کس قدر مضمون عالی ہے۔ ذرا لفظ شوخی کو دیکھئے۔ رنگ کے لئے کس قدر مناسب ہے۔ اس رنگ میں ایک بند اور بھی لکھ دوں :-

پروازمیں شہباز تجلّی جو ہے بے باک ‏ ‏ بمال آنکھوں کے مردم نے بچھائی ہیں تہِ خاک
توسن ہے وہ چالاک کہ سکتے میں ہیں افلاک ‏ ‏ مہندی سے ابھی لال بھبوکا تھے سُمِ پاک
جولاں جو ہوا ایک صبا رہ گیا پیچھے
بڑھتے ہی قدم رنگ حنا رہ گیا پیچھے

گھوڑے کے سموں میں مہندی لگانے کا ایشیائی ملکوں میں دستور ہے۔ مصنف فرماتے ہیں۔ کہ ابھی تو سم لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ ابھی رنگ ناپید ہو گیا۔ وجہ اسکی سرعت اسپ ہے۔ کہ اس تیزی سے جاتا ہے۔ کہ رنگ حنا بھی نظر نہیں آتا۔ وہ بھی سرعت فرس کے سبب سے پیچھے رہ گیا۔ واقعی جب بہت تیز گھوڑا دوڑیگا۔ تو رنگ کب نظر آئیگا۔ معمولی بات ہے۔ مگر ہر ایک شاعر کو نہیں سُوجھتی۔ اگر اردو شعرا کے الفاظ مستعملہ جدیدہ کی فرہنگ (مغربی ملکوں کی طرح) طیار کی جائے۔ تو غالباً الفاظ "لال بھبوکا" بھی مرثیوں میں پہلے پہل مرزا مرحوم کا نظم کرنا ثابت ہوگا +

۲۹ - متنبی نیزہ کی صفائی اور نیزہ دستی ممدوح کو سراہتا ہے۔ ؎ نیزہ دستی

وَكَمْ عَيْنِ قِرْنٍ حَدَّقَتْ لِنِزَالِهِ ‏ ‏ فَلَمْ تُغْضِ اِلَّا السِّنَانُ لَهَا كُحْلُ

اُس کے ہمسروں کی آنکھوں نے لڑائی میں اُس کی طرف گھور کر دیکھا۔ مگر پلک جھپکنے سے پہلے ہی نیزۂ ممدوح کی آتی سرمہ کی سلائی بن کر اُن کی آنکھوں میں در آئی +

مرزا مرحوم شاہزادہ علی اکبرؑ کے نیزے کی صفائی و تیز دستی بیان کرتے ہیں :-

گر برچھیوں والوں نے ذرا آنکھ نکالی ‏ ‏ پہنچا وہیں نیزہ لئے ابن شہ عالی
بالکل ورق چشم عدو کر دیا خالی ‏ ‏ پُتلی صفت نقطۂ شک صاف اٹھالی

چمک

اللہ رے صفا آنکھ نے دیکھی نہ جھلک بھی
پُتلی تو سناں لے گئی۔ جھپکی نہ۔ پلک بھی

سبحان اللہ۔ بندش کی صفائی گویا زبان حال سے گواہی دے رہی ہے۔ کہ اسی عجلت و صفائی سے شاہزادہ ممدوح نے نیزہ بازی فرمائی ہوگی۔ دبیر کے الفاظ خود مضمون کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ جو ان کے کلام میں بتانے کی احتیاج کم پڑتی ہے +

مدح عرفان / مدح اہل عرفان

۳۰۔ متنبی بعض اہل عرفان کی شان میں رطب اللسان ہے۔ ؎

ھَانَ عَلٰے قَلْبِہِ الزَّمَانُ فَمَا یَبِیْنُ فِیْہِ غَمٌّ وَّلَا جَذَلٌ

زمانہ اُس کے دل کے سامنے خوار ہے۔ شادی اور غم اُس کی نظر میں بے اعتبار و ناپائدار ہیں۔ وہ نہ غم سے غمگین ہوتا ہے۔ نہ شادی و خوشی سے مسرور +

مرزا مرحوم اہل عرفان کے سرتاج یعنی اصحاب باوفائے امام حسینؑ کی مدح میں عذب البیان ہیں۔ ؎

سمجھے ہیں نامرادیٔ دُنیا کو یہ مُراد غم ان کے دل میں شاد ہے۔ دل ان کا غم میں شاد

ناظرین!! ذرا غور سے اس مضمون کی پاکیزگی پر خیال فرمائیے۔ عجب بات کہہ گئے ہیں۔ کہ دُنیا کی نامرادی ہی کو انہوں نے مُراد سمجھ لیا ہے۔ ان کا دل تو غم میں شاد رہتا ہے نہ۔ اور غم ان کے دل میں آکر شاد ہوتا ہے متنبی کے مضمون سے یہ مضمون اُسی قدر اعلےٰ ہے۔ جس قدر مرزا مرحوم کے ممدوح متنبی کے ممدوح سے بہتر ہیں +

فصل ۹
مقابلہ شرک و توحید و ایمان و کفر

۳۱۔ متنبی سیف الدولہ کی مدح میں کہتا ہے۔ ؎

وَلَسْتَ مَلِیْکًا ھَازِمًا لِنَظِیْرِہٖ وَلٰکِنَّکَ التَّوْحِیْدُ لِلشِّرْکِ ھَازِمٌ

تو نے جو دمستق عیسائی بادشاہ روم کو شکست دی۔ یہ ایک بادشاہ کا دُوسرے ہمسر بادشاہ کو شکست دینا نہیں ہے۔ بلکہ تو بمنزلہ توحید ہے۔ جس سے خود بخود شرک بھاگ جاتا ہے + انصاف یہ ہے۔ کہ یہ مضمون متنبی نے اعلےٰ درجہ کا

کہا ہے ۔ مرزا مرحوم نے سیف خدا جناب عباسؑ کی طولانی لڑائی اور مدِ مقابل پہلوان کی مقابلہ آرائی نظم فرما کر جب اس کو جناب ممدوح نے فی النار کیا ہے ۔ اُس موقع پر نظم فرمایا ہے :-

ایماں نے اُچھل کر کہا وہ کفر کو مارا قدرت نے پکارا کہ یہ ہے زور ہمارا
حیدرؑ سے نبیؐ بولے یہ ہے فخر تمہارا حیدرؑ نے کہا یہ مری آنکھوں کا ہے تارا
پروانۂ شمع رُخ تاباں ہوئیں زہراؑ
محسنؑ کو لئے گود میں قرباں ہوئیں زہراؑ

نکاتِ بلاغت

ناظرین !! ذرا اس بند کی بلاغت کے نکتوں پر غور فرمائیے ۔ (۱) خود ایمان کا یہ کہنا کہ کفر کو مارا ۔ (۲) اُچھل کر کہنا ۔ کہ خوشی میں قدرتاً آدمی اُچھل پڑتا ہے ۔ (۳) "وہ کفر کو مارا" ایسی خوشی کے موقع پر "وہ" بھی ضرور کہتے ہیں ۔ یعنی عموماً "وہ مارا" کہتے ہیں ۔ (۴) قدرت (نیچر) کا یہ ارشاد کہ یہ سب ہمارا زور ہے ۔ حقیقت میں جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے ۔ خدا کی قدرت سے ہو رہا ہے ۔ (۵) اب زبان قدرت کے بعد زبان جناب رسالتؐ سے مدح کی ۔ کہ اُن جناب نے جناب امیرؑ سے مدح و ثنا ان الفاظ میں فرمائی ۔ کہ یہ فرزند تمہارا فخر ہے ۔ جیسے تم شجاع تھے ویسا ہی یہ ہے ۔ لڑائی میں تم میری مدد کرتے تھے ۔ اس نے میرے فرزند حسینؑ کی مدد کی ۔ (۶) رسالتؐ کے بعد امامت کی باری آئی ۔ جناب امیرؑ نے تعریف کی ۔ کہ میری آنکھوں کا تارا ہے ۔ (۷) پھر صدیقۂ کبریٰ جناب فاطمہؑ نے اُس محبت کا برتاؤ کیا ۔ جو مائیں اپنے بچوں سے کرتی ہیں ۔ جناب عباسؑ ہرچند اُن کے حقیقی فرزند نہیں ہیں ۔ مگر اُن کے فرزند حسینؑ مظلوم پر جاں نثار کر رہے ہیں ۔ اس لئے جناب فاطمہؑ قربان ہوئیں ۔ جس طرح عورتیں اپنے بچوں پر قربان ہوتی ہیں ۔ (۸) پھر محسنؑ (فرزند حقیقی جناب فاطمہؑ) کو گود میں لئے ہوئے قربان ہوئیں گویا جناب عباسؑ کو اس جاں نثاری و کارگذاری کے سبب سے اپنے فرزند (محسنؑ) سے

محبت

بھی کچھ بڑھ کر سمجھ رہے ہیں۔ دیکھئے کیا کیا پہلو بلاغت کے نکالے ہیں +

۴۲ متنبی محبت محبوب کی مدح میں گہرافشاں ہے۔ ؎

اِذَا قَدِمتُ عَلَی الاَھوَالِ شَیَّعَنِی ۔۔۔ قَلبٌ اِذَا شِئتُ اَن یَسلَاکُم خَانَا

جب مَیں خوف (جنگ وغیرہ) کے مقامات کی طرف بڑھتا ہوں۔ اُس وقت تو میرا دل میرے ساتھ رہتا ہے (ٹھکانے رہتا ہے۔ کچھ ہراس نہیں ہوتا)۔ مگر جب مَیں اُس سے یہ چاہتا ہوں۔ کہ وہ تم سے جدا ہو جائے۔ تو (خیانت کرتا ہے) میرا کہنا نہیں مانتا +

مرزا مرحوم امام حسینؑ کے سچے عاشق جاں نثار جناب حبیبؓ ابن مظاہر اسدی (صحابی رسول خدا صلعم) کی زبانی سچی مدح کی یوں تصویر کھینچتے ہیں (حبیبؓ بڑھاپے میں کوفہ سے بمشکل نکل کر اپنے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے آقا کی خدمت میں لڑنے اور مرنے کو آئے ہیں۔ امام مظلومؑ اُن کی ضعیفی پر خیال فرما کر فرماتے ہیں۔ کہ تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ حبیبؓ اصرار کر رہے ہیں۔ کہ کبھی نہ جاؤنگا۔ اگر جاؤنگا۔ تو پھر رسولؐ خدا کو قیامت میں کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ اُس موقع پر حبیبؓ اپنی محبت اور جوش عقیدت کو گویا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں):-

گر اہل جفا قطع کریں ہات ہمارے ۔۔۔ پروانہ صفت لاش پھرے گرد تمہارے
سر کٹ کے نہ ہو پائے مبارک سے کنارے ۔۔۔ دل شوق ہو تو شبیرؑ ہی شبیرؑ پکارے
گر ہات جدا۔ تن سے ہوں کٹنے پہ سر کے
دامن سے خداوند کے۔ پیوند ہوں گر کے

ناظرین! اگرچہ متنبی کے مصرع اوّل کا ہم مضمون کوئی مصرع بند مرزا مرحوم میں نہیں ہے۔ مگر یہ دیکھئے۔ کہ متنبی کے دوسرے مصرع کا ہم خیال جو مضمون مرزا صاحب نے باندھا ہے۔ اُس میں کس قدر لطافت و بلاغت ہے۔ اور کیسی وسعت دی ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ مرزا مرحوم نے بالارادہ متنبی کا جواب نہیں لکھا۔ جو سب مضمون ملتا۔ جس قدر

مضمون قریب قریب ہے۔ اُسی پر غور فرمائیے۔ اور لطف اُٹھائیے۔ یہ پھول سخت محنت سے ایک گلدستہ میں بندھے ہیں +

۴۳۔ متنبی نے اپنے ممدوح کی ثابت قدمی کی مدح میں کہا ہے۔ ؎

وَاَنْتَ الْفَارِسُ الْقَوَّالُ صَبْرًا وَقَدْ فَنِیَ التَّکَلُّمُ وَالصَّهِیْلُ

جب کہ شدت جنگ کے سبب سے لوگوں کا بولنا اور گھوڑوں کا ہنہنانا بند ہو جائے۔ اور میدان میں بالکل سناٹا چھا جائے۔ اُس وقت سخت میں بھی تو ایک ثابت قدم شہسوار ہے اور دُوسروں کو بھی صبر (ثبات قدم) سکھانیوالا +

مرزا مرحوم جناب حبیبؓ بن مظاہر صحابی رسول اللہ صلعم کی ضعیفی اور ثابت قدمی یوں (میدان جنگ میں) بیان کرتے ہیں:۔

ثابت قدم ایسا کوئی پیروں میں کہاں ہے ثابت قدمی پاؤں سے رعشے میں عیاں ہے
سر ہلتا ہے پر ہر کف یارن میں جمی ہے
جنبش میں ہے لَو شمع کو ثابت قدمی ہے

۴۴۔ متنبی میدان جنگ میں اپنے ممدوح کی عظمت بیان کرتا ہے۔ ؎

یَحِیْدُ الرُّمْحُ عَنْکَ وَفِیْهِ قَصْدٌ وَیَقْصُرُ اَنْ یَّنَالَ وَفِیْهِ طُوْلُ

نیزہ باوصفیکہ مستقیم ہے۔ مگر تیری عظمت وہیبت و شرف کی وجہ سے تیری طرف لوٹ پڑتا ہے۔ اور اتنا طویل ہونے پر بھی تجھ تک پہنچنے میں کوتاہی کرتا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ بہادر تو بہادر۔ اُن کے ہتیار بھی تیرا ادب کرتے ہیں یا ڈرتے ہیں +

مرزا مرحوم شمشیر حسینی کی تعریف میں فرماتے ہیں۔ (اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کہ امامؑ کو خدا کی طرف سے الہام ہوا۔ کہ جہاد کرو) ۔ ؎

واں تو یہ وحی جنگ بڑھی آسماں سے یاں تیغ پیشوائی کو نکلی میاں سے
نعمت ہو جیسے شکرِ الٰہی زباں سے حضرت کے دست بوس کو شوقی لاکھ شاں سے

ثابت قدمی میں مضمون قریب قریب

میدان جنگ میں عظمت ممدوح

سایہ بڑھا ہوا۔ یہ ادب سے رُکی ہوئی
سب سے کھچی ہوئی، سُوئے مولا جھکی ہوئی

ناظرین باتمکین!! ذرا اس بند (مذکورہ) پر خیال فرمائیے۔ اُدھر دل میں جہاد کا الہام ہوا۔ اِدھر اُس کی پیشوائی کو تلوار میان سے نکلی۔ اس کی بالکل نئی تشبیہ دیکھئے۔ یہ تلوار کوئی معمولی آدمی کی تلوار نہیں ہے۔ امام عصرؑ (نائب رسولؐ) کی تلوار ہے۔ اُس کے لئے معمولی تشبیہ بھی خلاف شان ہوگی۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ یُوں بے ساختہ فوراً نکلی۔ جیسے خاصان خدا کی زبان سے نعمت ملنے پر شکر کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ (۲) تلوار کے ہاتھ میں آنے کو دست بوسِ امام ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ کہ مذہبی پیشوا (امام عصرؑ) کے ہاتھ چومنے کا دستور ہے۔ (۳) پھر فرماتے ہیں۔ سایہ بڑھا ہوا۔ (ظاہر ہے۔ کہ قریب عصر امام حسینؑ کے جہاد کی نوبت پہنچی تھی۔ تیسرے پہر کو سایہ آپ سے آپ بڑھ جاتا ہے) اور خود تلوار ادب سے رُکی ہوئی تھی۔ (۴) سب سے کھچی ہوئی۔ اس میں خوبی زبان ہے۔ تلوار جب میان سے کھچی تو کھچی ہوئی تو اُس کو کہینگے۔ مگر یہاں کھچی ہوئی کے دُوسرے معنی ہیں کشیدہ کے جس طرح فارسی میں دو معنی ہیں۔ اسی طرح کھچی ہوئی بھی (اردو میں) ذومعنین ہے۔ ایک تو وہی جو میں اُوپر بیان کر چکا (میان سے کھچی ہوئی یا سر میان کھچی ہوئی)۔ دُوسرے سب سے آزردہ اور خفا۔ کیونکہ اُمتی اپنے نبیؐ کے نواسے کو قتل کر رہے ہیں۔ اس لئے سبھوں سے یہ تلوار ناراض ہے۔ (۵) (پھر کہتے ہیں) مگر حضرت امام حسینؑ کی طرف غرط ادب سے جھکی ہوئی تھی۔ تلوار جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اُس کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے ◆

۳۵ متنبی اپنے ممدوح کی ہیبت و رعب کی مدح و ثنا کرتا ہے۔ ؎ ہیبت و دبدبہ

اتاكَ يكادُ الرأسُ يجحدُ عنقَهُ ۔ وتنقدُّ تحتَ الذعرِ منهُ المفاصِلُ

تیرے پاس (دُوسرے بادشاہ کا) ایلچی ایسے حال میں آیا۔ کہ قریب تھا کہ اُس کا سر اُس کی

گردن سے انکار کرے۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ تیری ہیبت اور رعب سے سفیر ایسا سہما جاتا تھا۔ کہ گویا وہ دل میں سمجھتا تھا۔ کہ اب سر گردن سے جُدا ہوتا ہے)۔ اور ڈر کے مارے تمام جوڑ بند اُس کے چکنا چور ہوئے جاتے تھے +

مرزا مرحوم ایک پہلوان کی لڑائی میں جو اشجع عالم امام حسینؑ سے لڑنے کو میدان جنگ میں آیا ہے۔ یوُں بیان فرماتے ہیں۔ (اُس پر جو ہیبت امام حسینؑ نے لڑائی میں اثر کیا ہے۔ اُس اضطراب کی مختصر تصویر ہے) :۔

سہما یہ ترکش اُس کا کہ سب تیر گر پڑے　　کانپا یہ پھل کہ جوہر شمشیر گر پڑے

حقیقت میں جب مدمقابل کی ہیبت دل پر چھا گئی۔ تو اُدھر ترکش سے تیر گر پڑے اِدھر تلوار بیکار ہو گئی۔ گویا تلوار کے جوہر گر پڑے۔ اب وہ کیا حملہ کر سکے +

۳۶۔ متنبّی کا شعر ہے۔ ؎ مَا لِمَن یَنْصِبُ الحَبَائِلَ فِی الْاَرْضِ وَ مَرْجَاهُ اَنْ یَصِیْدَ الْهِلَالَا۔ اُس شخص کو کیا فائدہ ہوگا۔ جو زمین پر اس امید سے جال بچھائے۔ کہ چاند کو پھانس لے۔ بھلا چاند جال میں کب پھنس سکتا ہے۔ یہ شعر سیف الدّولہ کی شان میں (متنبّی نے) اُس زمانے میں کہا تھا۔ کہ جب سیف الدّولہ اور رُوم کے عیسائی بادشاہ میں لڑائی ہو رہی تھی ممکن ہے۔ کہ اُس بادشاہ نے سیف الدّولہ کی گرفتاری کی تدبیر کی ہو۔ اور ناکام رہا ہو۔ اُسی کی طرف متنبّی اشارہ کرتا ہے۔ کہ تُو بمنزلہ ہلال کے ہے۔ تجھے دشمن کب اسیر کر سکتا ہے + دبیر اُس موقع پر کہ "جب آمد امام حسینؑ سے فوج مخالف میں ہل چل پڑی ہوئی ہے" کہتے ہیں :۔

ناگاہ یہ بولا پسر سعد کہ یارو　　جاں باز ہو تو بازی ہمت کو نہ ہارو
ہاں شمر کو آواز دو۔ خولی کو پکارو　　سب مل کے کسی حیلے کا اب جال سنوارو
وہ بولے کہ خود پھندے میں پڑ جائیگا ظالم
یہ نورِ خدا۔ جال میں کب آئے گا ظالم

کب جال میں ٹھہریگا یہ دریائے سخا ہے   یہ طائرِ رنگِ چمنِ آلِ عبا ہے
یہ نکہتِ عطرِ گلِ تسلیم و رضا ہے   یہ ظلِّ خدا۔ ظلِّ خدا ظلِّ خدا ہے
کیونکر یہ فریبِ سپہِ شام میں آئے
اندام نہیں سائے کے جو دام میں آئے

دنیا و دین

۲۷۔ متنبّی اپنے ممدوح کی شان میں کہتا ہے۔ ؎ قَابِضًا کَفُّهُ الْيَمِيْنَ وَلَوْ شَاءَ حَازَهَا بِالشِّمَالِ۔ وہ دُنیا کو اپنی داہنی مُٹھی میں لئے ہُوئے ہے۔ اور اگر چاہے۔ تو بائیں میں لے لے۔ (دُنیا بالکل اُس کے قبضہ میں ہے)۔ دُوسرے مقام پر کہتا ہے ؎ يَا رَاحِلًا كُلُّ مَنْ يُوَدِّعُهُ مُوَدِّعٌ دِيْنَهُ وَدُنْيَاهُ۔ اے سفر کرنے والے جو کوئی تجھ کو رخصت کرتا ہے۔ وہ گویا اپنی تمام دین و دُنیا کو رخصت کرتا ہے۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ تو گویا تمام دین و دُنیا ہے) متنبّی کا ممدوح ایک معمولی دُنیادار دولت مند ہے۔ اس لئے یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ جو ممدوح کی دولت و عظمت کے مٹنے کے ساتھ گویا مٹ گیا۔ اب ایسا بدنما (بعض طبیعتوں کو) معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے تانبے کے برتن پر سے خوش نما قلعی اُڑ جانے کے بعد وہ برتن رہ جاتا ہے۔ دبیر کے ممدوح ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بزرگانِ دین میں سے ایک معزز امام زادے بھی ہیں اور شہید راہِ خدا بھی ہیں۔ اس لئے وہ بھی زندہ ہیں۔ اُن کا ذکرِ مدح و ثنا بھی زندہ ہے۔ چنانچہ مرزا مرحوم جنابِ ابوالفضل افضل الشہداء

* ناظرین!! دیکھئے۔ کن کن چیزوں سے استعارہ فرمایا ہے۔ دریا۔ طائرِ رنگ نکہتِ عطر رضا ظلِ خدا۔ ان میں سے کوئی چیز جال میں نہیں پھنس سکتی۔ ظلّ اللہ اگرچہ دنیا کے بادشاہوں کو بھی دنیا دار کہتے ہیں مگر حقیقی ظلّ اللہ پیشوایانِ دین ہیں پس امام حسینؑ کو ظلّ اللہ کہنا ایک پاکیزہ اور سچا استعارہ ہے مضمون کے ساتھ لفظوں کی لطافت فصاحت کو دیکھئے کہ اندام اور دام میں جو تناسب ہے لفظ آخر الذکر اول الذکر کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ یہ صنعت شبہِ اشتقاق ہے جو دل کو پیاری معلوم ہوتی ہے جو بزرگوار ایک سرے سے تمام صنعتوں کو تکلف یا تکلیف سمجھتے ہیں ان سے پوچھئے کہ اندام و دام کی جگہ کوئی دُوسرا لفظ لا نے سے کیا یہ لطفِ زبان حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کہتا ہُوں ہرگز نہیں ہو سکتا ۱۲ مؤلف بے بضاعت ثابت۔

عباسؑ علمدار کی شان میں کہتے ہیں۔ (یہ ملحوظ خاطر رہے۔ کہ جناب عباسؑ کے دونو شانے جہاد میں جدا ہوئے ہیں٭۔ اُس کے بعد بھی وہ جناب برابر جہاد فرمایا کئے۔ اور دونوں رکابوں سے برابر دشمنوں کو ٹھکراتے رہے۔ اور مشک پانی کی بھری ہوئی گود میں تھی۔ یعنی تسمہ مشک کو دانتوں سے مضبوط تھام رکھا تھا۔ ایسے شجاع خدا کی خدائی میں بہت کم گذرے ہیں) ؎

گردوں ہے بلا گرد قدم بوس زمیں ہے
اک ہات میں دُنیا ہے اور اک ہات میں دیں ہے

دُوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

دُنیائے دنی ان کا نشاں کفِ پا ہے
لیکن وہ نشاں ہے جو کفِ پا سے جُدا ہے

عقبےٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو کیا ہے
وہ اک رہِ باریک ہے یہ راہ نُما ہے

لو سُن لو۔ خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے
بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

۳۸ ۔ متنبی اپنے ایک شعر میں لباس و حسن کی یوں مدح کرتا ہے ؎

لَبِسْنَ الْوَشْیَ لَا مُتَجَمِّلَاتٍ
وَلٰکِنْ کَیْ یَصُنَّ بِہِ الْجَمَالَا

اُن حسین عورتوں نے ابریشمی منقش جامے زینت کے واسطے نہیں پہنے۔ بلکہ حسن و جمال چھپانے کو پہنے ہیں + دُوسرے موقع پر کہا ہے ؎

اَمَّا الثِّیَابُ فَتَعْرِیْ مِنْ مَحَاسِنِہٖ
اِذَا نَضَاہَا وَیُکْسٰی الْحُسْنَ عُرْیَانَا

جب وہ اپنے جسم سے لباس اُتار دیتا ہے۔ تو لباس کی خوبیاں جاتی رہتی ہیں۔ کیونکہ اُس کے بدن سے لباس کو شرف و حسن تھا۔ اور جب وہ برہنہ ہوتا ہے۔ تو (قدرتی) حسن کے لباس میں ہوتا ہے +

مرزا مرحوم اُس موقع پر کہتے ہیں۔ جب جناب زینبؑ خاتون نے اپنے بیٹوں کو لباس

٭۔ ان ہاتھوں کا کیا کہنا جو راہ خدا میں شہید ہوئے ہیں۔ جو کچھ ان کی مدح میں مبالغہ کیا جائے۔ کم ہے ۱۲ بے بضاعت ثابت۔

آخری پہنایا ہے۔ کہ اب وہ لڑنے اور مرنے کو جاتے ہیں۔ ؎

پہنایا جامہ زیبوں کو اپنے لباس جنگ — پوشاک یوں بدن پہ کھلے جیسے گل پہ رنگ

۳۹ متنبی کا شعر ہے ؎ وَلَمَّا الْتَقَيْنَا وَالنَّوَىٰ وَرَقِيبُنَا۔ غَفُولَانِ عَنَّا ظَلْتُ اَبْكِي وَتَبْسِمُ۔ فَلَمْ اَرَ بَدْرًا ضَاحِكًا قَبْلَ وَجْهِهَا وَلَمْ تَرَ قَبْلِي مَيِّتًا يَتَكَلَّمُ۔ جب میں اور میری معشوقہ ملی۔ تو فراق و رقیب دونوں بے خبر ہو رہے تھے۔ میں تو رو رہا تھا۔ اور وہ ہنس رہی تھی۔ میں نے تو ماہ تمام کو چہرہ معشوقہ سے پہلے ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اور اس نے مجھ سے پہلے کسی مردے کو باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا +

دبیر مرحوم اس موقع پر کہتے ہیں۔ جب مادر علی اکبرؑ لاشہ علی اکبرؑ کو دیکھ کر بین کر رہی ہیں:۔

یوں مردے کے ماتھے کو چمکتے نہیں دیکھا — پھولوں کو خزاں ہو کے مہکتے نہیں دیکھا

باقی مصرع حسب ذیل ہیں

اس حسن سے منکے کو ڈھلکتے نہیں دیکھا — یوں زلفوں کو بل کھا کے لٹکتے نہیں دیکھا

تنہا زلیست میں کیا حسن جو اس آن نہیں ہے

رو کر کہا زینبؑ نے فقط جان نہیں ہے

۴۰ متنبی کا شعر ہے ؎ فَهَوِّنْ عَلَىٰ بَصَرٍ مَا شَقَّ مَنْظَرُهُ۔ فَاِنَّمَا يَقْظَاتُ الْعَيْنِ كَالْحُلُمِ۔ تو اپنی بصارت پر آسان کرلے جو دیکھنا اس کو ناگوار ہو۔ کیونکہ آنکھ کی بیداریاں خواب کی طرح ہیں +

مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ (رباعی):۔

آج آئے ہیں۔ کل کوچ کی طیاری ہے — غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے

دنیا ہے عجب مقام حیرت۔ نہ کھلا — یہ عالم خواب ہے۔ کہ بیداری ہے

اسم متنبی کا شعر ہے۔ ؎ مازلت تضرِبُھُم دِراکاً فی الذُّریٰ
ضرباً کاَنّ السَّیفَ فیہٖ اثنَانَ۔ تُو اُن کے اُوپر کے حصۂ جسم میں پے درپے تلواریں
مارتا رہا۔ گویا ہر بار اُن پر دو تلواریں پڑتی تھیں۔ سیف الدّولہ کی مدح میں یہ قصیدہ ہے
مطلب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک تو تیری تلوار سیف تھی۔ دُوسرے تو خود (اسم بامسمّٰے) سیف
تھا۔ پس ہر ضرب پر گویا دوسری تلوار پڑتی تھی۔

مرزا مرحوم ضعیف العمر بہادر صحابی حبیبؓ ابن مظاہر اسدی کی جنگ میں کہتے ہیں۔ ؎

تھا ضرب کے عالم میں عجب حسن کا عالم — اک سمت خم تیغ کا وہ بل وہ خم و چم
اور ایک طرف آپ کا وہ پیکر پرخم — ہر مُوئے بدن جوہر شمشیر کا ہمدم
جس صف پہ جُھکے ساتھ چلی تیغ ولی کی
غُل تھا کہ یہ شمشیر دو پیکر ہے علیؑ کی

ناظرین!! اس موقع کا ایک بند اور بھی سُن لیجیے:۔

ظاہر کس آہن سے یہ شمشیر ہُوئی تھی — اعجاز نما۔ الفت شبیرؑ ہُوئی تھی
کیا جنگ میں سیدھی کمر پیر ہُوئی تھی — اللہ کی قدرت سے کماں تیر ہُوئی تھی
اس طنطنے سے پیروں کو تنتے نہیں دیکھا
نیزہ کسی تلوار کو بنتے نہیں دیکھا

باب سیزدہم کلام بعض شعرائے ایران و کلام مرزا دبیر مرحوم

فصل ۱ فردوسی

فردوسی طوسی کے بعض مقامات سے بعض مقامات مرزا مرحوم کا مقابلہ کر کے میں دکھانا
چاہتا ہُوں۔ کہ یہ اُردُو کا فردوسی کس پایہ کا شاعر ہے۔

(۱) فردوسی کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ واقعہ کو اس طرز سے بیان کرتے ہیں۔ کہ
اکثر آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اور جزئیات کو خوب ادا فرماتے ہیں۔

مثلاً جب سہراب نے کیکاؤس کے خیمے کی میخیں اپنے نیزے سے اُکھاڑ کر پھینکی ہیں
فردوسی نے اُس کی تصویر (شاہنامہ میں) یوں کھینچی ہے۔

وزاں پس بجنبید از جائے خویش | بہ نزدیک پردہ سرا رفت پیش
خم آورد پشت و سنان (طول) ستیغ | بزد و تند و برکند ہفتاد میخ
سراپردہ یک بہرہ آمد زپائے | زہر سو برآمد دم کرّہ نائے

اس واقعہ میں حسب ذیل جزئیات بیان کئے ہیں۔ (۱) سہراب (جوش میں) اپنی جگہ سے کود کر پردہ سرا کے پاس آیا۔ (۲) اپنی پیٹھ جھکائی۔ اور پیٹھ کے ساتھ ہی لانبا برچھا خم کیا۔ (۳) اور زور سے مارا۔ (۴) ستّر میخیں اُکھاڑ لیں۔ (۵) وہ خیمہ یکایک ایک طرف سے گرا۔ (۶) باجے بجنے لگے ۔ فردوسی نے کمال یہ کیا ہے۔ کہ ایسے مختصر لفظوں میں (نظم میں) تصویر کھینچ دی۔ جو دوسرا شخص شاید نثر میں بھی اس خوبی و اختصار سے نہ بیان کر سکے۔ اب مرزا مرحوم کو دیکھئے۔ وہ کس قدر مختصر لفظوں میں جزئیات واقعہ بیان کر کے تصویر کھینچتے ہیں:-

(**الف**) دو پہلوان شاہزادہ علی اکبرؑ کے مقابلہ کو میدان جنگ میں آئے ہیں۔
اور جب وہ اپنے وار کر چکے۔ تو اب جناب علی اکبرؑ کی باری آئی۔

گھوڑے کی عناں باندھ لی اکبرؑ نے کمر سے | زانو کے تلے تیغ و سپر رکھ لی ہنر سے
اور دونوں کی گردن لی اِدھر اور اُدھر سے | سر ایک کا ٹکرانے لگے ایک کے سر سے
اکبرؑ کے تصرف میں خدائی نظر آئی
جنگل میں پہاڑوں کی لڑائی نظر آئی

اس میں (۱) یہ بیان کیا۔ کہ گھوڑے کی لگام کمر سے باندھ لی۔ کہ لڑائی میں ہاتھ نہ رُکے (۲) پھر تلوار اور ڈھال زانو کے نیچے ہنر سے رکھ لی۔ (۳) پھر دونوں کی گردنیں اِدھر اُدھر سے پکڑ (۴) ٹکرا دیا۔ اُن کے تن و توش کو۔ اس تشبیہ میں بیان فرمایا۔ کہ (۵) گویا

جنگل میں پہاڑ لڑ رہے تھے ۔

(ب) مرزا مرحوم نے ایک مرثیہ میں شاہزادہ علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی پیدائش کا حال لکھ کر لکھا ہے ۔ کہ اُس زمانے کے اکثر مسلمان اشتیاق میں تھے ۔ کہ امام حسینؑ انکو باہر لائیں ۔ تاکہ ہم محبوب خدا صلعم کی زیارت سے سرافراز ہوں ۔ اور اکثر جناب فضہؓ سے آ کر پوچھ جاتے تھے ۔ کہ کس روز گھر سے وہ شاہزادے باہر برآمد ہونگے ۔ ایک روز اہلبیت کی طرف سے مشتاقوں کو اعلان دیا گیا ۔ ؎

کل رب خدا کے گھر سے مراد اپنی پائینگے مسجد میں شاہِ دین علی اکبرؑ کو لائینگے

جو شخص مشتاق ہو ۔ زیارت کرے ۔ نماز صبح کے وقت حاضر ہو ۔ اس واقعہ کو آئندہ مرزا صاحب یوں خلعت نظم پہناتے ہیں :-

ناگاہ خواب شب سے کھلی چشمِ آفتاب مسجد میں پہلے صبح سے ۔ در آئے شیخ و شاب

مجمع تھا آستانِ حرم پر بھی بے حساب محراب در سے نکلے امامؑ فلک جناب

آقا کے بر میں اکبرؑ یوسف جمال تھا

آغوشِ آفتاب میں روشن ہلال تھا

پہلوئے راست کو حسنؑ مجتبےٰ رواں پہلوئے چپ میں ماہ بنی ہاشمی عباسؑ

آگے دعائیں پڑھتے مدینے کے نوجواں بندے نگاہبان اور اللہ مہرباں

شہزادہ جس طرف رُخ روشن سے پھر پڑا

رستے میں ایک ۔ ایک پہ غش کھلکے گر پڑا

شہر مدینہ مصر کا بازار ہو گیا یوسفؑ ہزار جان سے خریدار ہو گیا

(۱) اوّل تو صبح ہونے کو ایک نئے طرز سے بیان کیا ہے ۔ کہ آفتاب کی آنکھ رات کی نیند سے کھلی (۲) صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے مشتاق مسلمانوں کا مسجد میں ہجوم ہو گیا ۔ (۳) مسجد کا تو یہ حال تھا بہت سے آدمی اہلبیتؑ کے در دولت پر جمع تھے ۔ کہ ہم یہیں سے زیارت کرلینگے ۔ یہ

مشتاقوں کے اشتیاق کی صورت تھی۔ (۴) امام حسینؑ گھر سے برآمد ہوئے۔ ازبسکہ مسجد کو جا رہے ہیں۔ اس لئے استعارہ بھی اُسی قسم کا کیا۔ کہ محراب در سے امام نکلے۔ (۵) مگر کس شان سے کہ علی اکبرؑ کو اپنی گود میں لئے ہوئے۔ لطف تشبیہ کو ذرا دیکھئے۔ کہ سورج کی گود میں (ہلال) پہلی یا دُوسری تاریخ کا چاند تھا۔ (۶) اب جانے کی شان و شکوہ ملاحظہ فرمائیے۔ کہ دہنی طرف بڑے چچا امام حسنؑ۔ بائیں طرف چھوٹے چچا جناب عباسؑ۔ آگے آگے مدینہ کے خوش عقیدہ نوجوان مسلمان جا رہے ہیں۔ (۷) اب اس موقع پر یہ کمال دیکھئے۔ کہ حسن و جمال کی تجلّی کو یُوں بیان کرتے ہیں۔ کہ جس طرف شاہزادے کا رُوئے روشن پھرا۔ گویا نُور کی بجلی گری۔ کہ ایک دُوسرے پر غش کھا کر گر پڑا۔ (۸) شہر مدینہ منورہ اُس وقت گویا مصر کا بازار تھا۔ مگر بازار مصر میں تو لوگ حضرت یوسفؑ کے خریدار تھے یہاں خود حضرت یوسفؑ ہزار جان سے ہمشکل محبوب خداؐ کے گاہک ہو گئے۔

(ج) ایک مشہور و لاجواب مرثیے میں مرزا مرحوم نے یہ مضمون نظم فرمایا ہے۔ کہ جب اپنے برادر جری حضرت عباسؑ کو روز عاشور جناب امام حسینؑ نے اپنی فوج کا علم بخشا ہے تو عون و محمد پسران جناب زینبؑ کو (جو جعفر طیارؑ کے پوتے اور حیدر کرارؑ کے نواسے تھے۔ اور اپنے دادا اور نانا کے مقدس رشتہ کے خیال سے دل میں یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ وہ دونوں بزرگوار علمدار رسول خداصلعم تھے۔ ہم اُن کے ورثہ دار ہیں۔ یہ علم ہمیں دونوں میں سے کسی ایک کو ملیگا۔ اور) جو کم عمر تھے۔ ایک قسم کا خیال و ملال ہوا۔ دیکھئے مرزا صاحب اس مضمون کو بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہتے۔ کہ افسوس ہم کو علم نہ ملا۔ بلکہ ایک نئی مگر سچی بات یہ کہتے ہیں کہ علمدار سب فوج سے آگے ہوتا ہے۔ اکثر جنگ میں اوّل وہی کام آتا ہے۔ اگر آج علمدار ہوتے تو سب سے پہلے شربت شہادت پیتے۔ اب اس شرف سے محروم رہ گئے۔ محض علم نہ ملنے کا خیال ایک خود غرضی کا (بظاہر) خیال تھا۔ اس کو کس عمدگی سے شربت شہادت بدل کر عمدہ بنا دیا ہے۔ تخئیل کا لطف و کمال یہی ہے (کہتے ہیں) :-

اک گوشے میں کھڑے تھے سرکٹے گردنوں کو خم
پہ تذر دے کے عون و محمد ملک حشم

تھی فکر یہ کہ فدیۂ اوّل ہوئے نہ ہم ۔ ہوتے ہیں آگے فوج کے سب حاملِ علم
سبقت نصیبِ حضرت عباسؑ ہوگئی
تھی آس پہلے مرنے کی ۔ اب یاس ہوگئی

جاسوس نے عمر کے جو دیکھا یہ ماجرا ۔ جا کر کہا عمر سے ۔ خداوند کچھ سنا ؟
بولا وہ کیا ؟ کہا کہ مبارک کرے خدا ۔ واں لشکرِ شاہِ حسینی میں [illegible] پڑ گیا
منصب جو اپنے جد کا نہ پایا ۔ خفا ہوئے
جعفر کے پوتے فوجِ خدا سے جدا ہوئے

کچھ کم نہیں نسب میں یہ سیفِ خدا سے ہیں ۔ عباسؑ ہیں علیؑ کے خلف یہ نواسے ہیں
لبریز دل حمیّت و مہر و وفا سے ہیں ۔ ہفتم سے سب کے ساتھ یہ بچے بھی پیاسے ہیں
اب ہوگیا یقین کہ ظفریاب ہم ہوئے
شیرِ خدا کے بیٹے سے دو شیر کم ہوئے

گردن اٹھا کے کہنے لگا شمرِ بدشعور ۔ ہاں سچ تو ہے بگڑے ہیں لڑکے سب وہ غیور
اُس نے کہا کہ ان کا ملا لینا ہے ضرور ۔ تجھ کو ہے جوڑ توڑ کا اپنے بڑا غرور
ہاں [illegible] نصیحت سے لال لا
دو لخت دل [illegible]

پر شیر کے بھی دلیروں کی [illegible] ۔ مرنے کی بات پر نہ ابھی سے ڈرائیو
منّت سے عاجزی سے خوشامد سے لائیو ۔ غصے کے وقت آنکھ نہ اُن سے ملائیو
صحبت رہی ہے فاطمہؑ کے نورِ عین کی
دیکھی ہیں اُن بچوں نے آنکھیں حسینؑ کی

لے کشتیاں بھی میووں کی اور سرِ جام بھی ۔ آداب عرض کیجیو اور یہ پیام بھی
ہوتا ہے پیشوائی کو حاضر غلام بھی ۔ کوفہ تمہارا ملک ہے اور ملکِ شام بھی

نقارے بج رہے ہیں سلامی کے واسطے
سردار مستعد ہیں غلامی کے واسطے

اُٹھے ہیں اک علم پہ یہ شاہِ امامؑ سے — سنتے تھے آج پانچ علم فوجِ شام سے
سمجھا بجھا کے اِن کو جدا کر امامؑ سے — بھیجا کہ چراغ نور کے حُسنِ کلام سے
آئے تھے بھانجے جو شہِ دیں سے چھوٹ کر
ہم سے بنے گے اور بھی پھول ان کے لوٹ کر

سینے پہ ہات رکھ کے پکارا وہ بدشیم — یہ بھی ہے کوئی کام ۔ ابھی لائے اُن کو ہم
اچھے سے اچھے اُس نے چنے جلد دو علم — پٹکوں میں جن کے لفظ جواہر تھے یک قلم
دو کشتیاں لیں ایک میں تو سرد جام تھے
اور ایک میں چنے ہوئے میوے تمام تھے

آگے گمان بد ہوا اتنے میں بدگماں — تدبیر کے الٹنے کو تقدیر درمیاں
رستے کی ہر قدم تھی نہ جنبش [illegible] — آثار پہاڑ سے تھے یہ دونوں خضرِ جہاں
[illegible] آنا تھا شمر پہ جو ہیبت سی پڑ پڑی
نحوست [illegible] سینہ [illegible] میں سے [illegible] پڑی

خم ہو کے نیم قد ۔ یہ کیا شمرؔ نے کلام — اے وارثانِ حیدرؔ و جعفرؑ سلام
یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام — واللہ ۔ واہ ۔ تم پہ ہے جرأت کا اختتام
یہ بانکپن نظر میں کھبا ۔ جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

حیراں ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا — تم کو نہ حاملِ علمِ مصطفےٰ کیا
منصب تمہارا بھائی کو اپنے عطا کیا — لشکر سے اُن کے آپ اُٹھ آئے بجا کیا
سمجھے نہ جب بزرگ ۔ تو خُردوں کو چارا کیا

اُلفت خدا کی دین ہے ۔ اِس میں اجارا کیا

ناظرین!! دیکھئے (۱) تو مرزا مرحوم نے یہ بیان فرمایا۔ کہ حضرت عباسؑ کو علم ملنے کی مسرت میں عون و محمدؑ (بھانجوں) نے نذر دی۔ (۲) پھر ایک گوشہ میں اس فکر و افسوس میں کھڑے ہو گئے کہ ہم کو علم نہ ملا۔ جو سب سے پہلے شہید ہوتے۔ (۳) وہاں فوج مخالف کے جاسوس نے یہ حال دیکھ کر خیال کیا۔ کہ یہ بچے امام حسینؑ سے (علم نہ ملنے کے سبب سے) روٹھ گئے۔ (۴) سردار لشکر عمر ابن سعد سے جا کر کہا۔ کہ مبارک ہو۔ امام حسینؑ کی فوج میں تفرقہ پڑ گیا۔ اب ہم کو ضرور فتح ہوگی۔ (۵) جاسوس کا طرز بیان اُسی طریق کا ہے۔ جیسے خبر دار خوشامدانہ لہجہ میں سردار لشکر سے عرض کیا کرتے ہیں۔ (۶) شمر جو ایک بڑا چالاک دھکار آدمی ہے۔ اُس نے یہ سُن کر گردن اُٹھا کر دیکھا (اس طرز کو دیکھئے) اور خبر دار کے کلام کی تائید کی۔ کہ ہاں واقعی وہ غیرتمند (دونوں) صاحبزادے سب سے الگ کھڑے ہوئے ہیں۔ (۷) ابن سعد بولا۔ کہ ان کو ملا لینا ضرور ہے۔ اور یہ جوڑ توڑ تیرا ہی کام ہے۔ تو ہی جا۔ اس موقع پر یہ مصرع کتنا پاکیزہ و مؤثر ہے۔ کہ ع دو لختِ دلِ حسینؑ کے دل سے نکال لا۔ مگر نہایت مؤدب (سر کے بھل) اُن کی خدمت میں جانا۔ یہ بچے بڑے دلبر ہیں۔ ان کو موت سے نہ ڈرانا۔ کہ یہ بات پر مرتے ہیں۔ موت کو کیا سمجھتے ہیں۔ بہت چاپلوسی۔ خوشامد۔ عاجزی کرنا۔ یہ بچے معمولی بچے نہیں ہیں۔ بلکہ امام حسینؑ کی صحبت میں پلے ہیں۔ اس مصرع کی شان کو دیکھئے ع دیکھی ہیں آنکھیں کھول کے آنکھیں حسینؑ کی۔ (۸) میووں کی کشتیاں اور ٹھنڈا پانی لے جا۔ اور میری طرف سے کہنا۔ کہ غلام بھی پیشوائی کو ابھی حاضر ہوتا ہے۔ ہم سے ملو گے۔ تو بس تمام مُلکِ عرب تمہاری مِلک ہو جائیگی۔ اس موقع پر یہ مصرع ع سردار مستعد ہیں غلامی کے واسطے کیسا شاندار ہو گیا ہے۔ شاعر جانتا ہے۔ کہ اس کے اُوپر مصرع لگانا کتنا مشکل تھا۔ مگر مرزا مرحوم کی مضمون آفریں طبیعت نے کہاں سے مصرع پیدا کیا ع نقارے تک رہے ہیں سلامی کے واسطے۔ (۹) چار پانچ علم بھی سنے جا۔ اور جس طرح ہو سمجھا بُجھا کر ان کو

امام حسینؑ سے جُدا کر۔ سمجھانا۔ بُجھانا روزمرّہ ہے۔ اُس کے ساتھ چراغ نُور بھڑکا نا لائے ہیں۔ بُجھانا چراغ کے واسطے بھی بولا جاتا ہے۔ صنعت ایہام اس بے تکلفی سے ہو جب لطف ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ امام حسینؑ کے یہ بھانجے ہم سے مل جائینگے۔ تو پھر اور بھی اُن کے عزیز و رفیق غالباً مل جائیں۔ اس مضمون کو مرزا مرحوم کس رنگین پیرایہ میں ادا فرماتے ہیں کہ ع ہم سے ملینگے اور بھی پھول ان کے لوٹ کر۔ (۱۰) اب شمرؔ کے جواب کے ادا کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ ع سینے پہ ہات رکھ کے پکارا وہ بد شیم۔ ایشیائی ملکوں خصوصاً عرب و عجم میں تعمیل حکم کرنیوالا ضرور سینے پر ہاتھ رکھکر افسر کو جواب تعمیلی دیتا ہے۔ ویسا ہی شمرؔ نے بھی کیا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ کہ ع یہ بھی ہے کوئی کام ابھی لائے اُن کو ہم۔ گویا اپنے ذہن میں یہ مکّار سمجھا ہُوا تھا۔ کہ یہ صاحبزادے ہم سے مل جائینگے کیشتیاں اور پانی اور علم لیکر یہ روانہ ہُوا۔ (۱۱) ع آگے گمان بد ہُوا پیچھے یہ بدگماں۔ گمان بد اور بدگمان کے الفاظ کی تاثیر کو دیکھئے۔ گویا شمرؔ یہ امر اپنے دل میں طے کر چکا ہے۔ کہ ضرور میں ان صاحبزادوں کو پھانس لاؤنگا۔ مگر یہ خبر نہ تھی۔ کہ تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیان میں ہے۔ شمرؔ اور امکّار ہے (اور اُن شیروں کے پاس جاتا ہے۔ جو اپنی جان پر کھیلے ہُوئے ہیں)۔ اور مکّار آدمی ضرور بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ تمام بدن میں رعشہ پڑ رہا ہے۔ (۱۲) وہاں پہنچا۔ جہاں یہ دونوں خضرؑ کھڑے تھے۔ دیکھئے۔ اس موقع پر قمر نہیں کہا خضر کہا۔ اس میں رعایت یہ ہے۔ کہ خضر کا کام ہدایت کرنا ہے۔ وہ دُوسرے کے بہکانے میں کب آسکتے ہیں۔ اُن دونوں شیروں نے جو تیز نظر سے دشمن کو دیکھا۔ تو ع نحوست جبیں سے بن کے پسینہ ٹپک پڑی۔ بہادروں کے سامنے سب مصنوعی غرور مکّار آدمی کا جاتا رہتا ہے۔ (۱۳) اب شمرؔ کے خوشامدانہ ملنے کی تصویر دیکھئے۔ نَم قدنم ہو کر کہا۔ اے حیدرؑ و جعفرؑ کے وارثو میرا سلام۔ میں اُوپر لکھ چکا ہُوں۔ کہ حیدرؑ و جعفرؑ دونوں بزرگوار لشکر اسلام کے جرار علمدار تھے۔ گویا سلام ہی سے تمہید مطلب شروع کر دی۔ کہ علم کے مستحق تم ہو۔ ماں کی جانب سے

بھی تمہارا حق ہے باپ کی جانب سے بھی۔ سلام کے بعد کہتا ہے۔ ؎

یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام　　واللہ۔ واہ۔ تم پہ ہے جرأت کا اختتام

الفاظ کی نشست کو ملاحظہ فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سونے کی انگوٹھی پر کسی کامل حاذق کار نے فیروزہ کا نگ جڑ دیا ہے۔ اب یہاں خاص بانکوں۔ جوان مردوں۔ وضعداروں کے الفاظ نظم کر دئے ہیں۔ ؎

یہ بانکپن نظر میں کھبا۔ جی میں گڑ گیا　　سکہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا بڑ گیا

اب تعریف و خوشامد کے بعد تعجب کے لہجہ میں کہتا ہے۔ کہ ہم سب حیران ہیں۔ یہ آپ کے ماموں (امام حسینؑ) نے کیا کیا۔ کہ آپ کا منصب اپنے بھائی کو دیدیا۔ (۱۴۰) آپ ان کے لشکر سے چلے آئے۔ یہ بہت مناسب۔ بجا کیا۔ محبت تو خدا کی دین ہے۔ خاص بزرگ رمزہ ہے) اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ اور جب بزرگ ہی حق نہ سمجھیں تو خورد ان کا کیا چارہ ہے۔ دیکھئے ایسی ذرا ذرا سی باتیں نظم کی ہیں۔ جو گویا رات دن بولی جاتی ہیں۔ مگر ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ کہ ان کو نظم کرے۔ دریا تو موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر غوطہ لگا کر عمدہ موتی نکالنا ہر غواص و شناور کا نہ کام ہے نہ ممکن ہے۔ ؎

رشک بے جا ہے گر رقیب کرے　　یہ تو جس کو خدا نصیب کرے*

(۲) منوچہری جو متقدمین ایرانیوں میں بہت کامل شاعر ہے۔ ایک باغ کی مدح میں کہتا ہے:۔ (مقابلۂ منوچہری بیان ۶۰)

آں قطرۂ باراں بیں از ابر چکیدہ　　گشتہ سرِ ہر برگ ازاں قطرہ بآنار

آویختہ چوں ریشۂ دستارچۂ سبز　　سیمیں گرہے بر سرِ ہر ریشۂ دستار

* اس موقع کی پوری گفتگو جو شعرا اور صاحب زادہ دل میں ہوئی ہے۔ حقیر نے شرح و بسط کے ساتھ جلد دوم (حیات دبیر) میں لکھی ہے۔ انشاء اللہ ناظرین کتاب دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔ یہاں زیادہ بخیال طوالت نہیں لکھ سکتا۔ ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

مرزا مرحوم ایک مرثیہ میں ایک مردِ مومن کا خواب بیان کرتے ہیں[۵۱] کہ جس نے ایک باغ (عالمِ رویا میں) دیکھا ہے:۔

شبنم کا عجب لطف ہے ہر برگِ چمن پر
سجادے پہ۔ ہے ٹوٹ گیا سبحۂ گوہر
ہر شاخ ہے معراج بہارِ گلِ احمر
جس طرح سناں پر ہے پسرِ فاطمہؑ کا سر
ہر غنچہ ہے۔ دفترِ غمِ شاہِ دوسراؐ کا
ہر۔ لالہ ہے۔ محضرِ گلِ زخمِ شہداؑ کا

(۳) حکیم سنائیؒ جو فرقۂ صوفیہ میں صاحبِ احترام بزرگ سمجھے جاتے ہیں اور جن کی نظم تاثیر کے لحاظ سے اکثر شعرائے کاملین سے بڑھ ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔

حکیم سنائی
شعر مع معانی

قطعہ

با ہمہ خلقِ جہاں گرچہ ازاں
بیشتر گمرہ و کمتر برہ اند
آں چناں زی کہ چو میری برہی
نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یہ سب مخلوق بہت ہے۔ اگرچہ دنیا میں گمراہ زیادہ اور راہ راست پر بہت کم لوگ ہیں۔ مگر تو سب کے ساتھ ایسی بسر کر کہ جب مر جائے۔ تو اُن کے عذاب سے تجھ کو [illegible] ملے۔ نہ کہ تیرے مرنے سے اُن کو (تیرے پنجۂ ظلم سے) نجات ملے۔

مرزا مرحوم کہتے ہیں:۔

رباعی

جو چاہیں بزرگوار ارشاد کریں
ہم کاہے کو گھر حیا کا برباد کریں
اس واسطے بھولوں تجھے بد کی سب کی دبیرؔ
مر جاؤں تو نیکی سے مجھے یاد کریں[۵۲]

۵۱ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے "جب ماں نے ذبح فرقہ [illegible]"۔ دفترِ ماتم [illegible] جلد میں یہ مرثیہ [illegible] ہے۔

۵۲ مرزا مرحوم نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا [illegible] کو [illegible] سے دبیر کی خوش اخلاقی ہے۔ دوسرے سے بدی ترک کا تو یہاں ذکر ہی کیا ہے یہ بلاغت کے [illegible] ہیں۔ [illegible] قیصر۔

اس موقع پر یہ لکھنا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ کہ سب سے پہلے جناب امیرؑ نے یہ مضمون ادا فرمایا ہے۔ اگر حکیم سنائیؒ اور مرزا دبیر کے پیش نظر نہج البلاغہ کا یہ مضمون تھا۔ تو یہ کہا جائیگا۔ کہ اُن دونوں بزرگوں نے تبرکاً یہ مضمون (باب مدینۂ علم سے) لیا ہے۔ اور ایک صاحب نے اس مضمون کے ذریعہ سے فارسی کی اور دُوسرے نے اُردو کی عزت بڑھائی ہے۔ ورنہ توارد سمجھا جائیگا۔ مگر یہ توارد اس مصرع جناب نفیس مرحوم کا مصداق ہے ع مصرع بھی جو لڑ جائے تو موتی کی لڑی سے۔ بہرحال وہ فقرہ یہ ہے* خَالِطُوا النَّاسَ مُخَالَطَةً اِنْ مُتُّمْ مَعَهَا بَكَوْا عَلَيْكُمْ وَاِنْ عِشْتُمْ حَنُّوا اِلَيْكُمْ۔ یعنی تم اس طرح آدمیوں میں مِل جُل کر بسر کرو۔ کہ اگر تم مرجاؤ۔ تو وہ تمکو یاد کرکے روئیں۔ اور زندہ رہو۔ تو تم سے ملنے کی خواہش رکھیں +

مضمون نہج البلاغہ

(۴) حکیم سنائیؒ فرماتے ہیں:۔

اہل دنیا کا رد و قبول

از پے ردّ و قبول عامہ خود را خر مکن
زاں کہ نبود کار عامہ خر خری یا فرفری
گاو را دارند باور در خدائے عامیاں
نوحؑ را باور ندارند از پئے پیغمبری

فرماتے ہیں۔ کہ عام لوگوں کے رد و قبول کا کیا اعتبار ہے۔ ان میں نیک و بد۔ اچھے بُرے کے پہچاننے کی تمیز ہی نہیں۔ یہ جاہل گاے کی تو پُوجا کرتے ہیں (جیسے گوسالہ پرستی حضرت موسےٰؑ کی اُمت نے کی تھی) مگر جلیل القدر اولوالعزم جناب نوحؑ کو پیغمبر خدا ہی نہیں مانا۔ جب اہل دُنیا کی بدتمیزی کا یہ حال ہے تو ان کے رد و قبول عوام [illegible] +

مرزا دبیر [illegible] ہیں۔ (رباعی)

بُلبل بہ زمانہ ایک گُل کا نہ ہُوا
محکوم ائمہؑ و رُسلؑ کا نہ ہُوا
بندوں کو نہیں خیال یکتائی ہے
اللہ پہ اتفاق کُل کا نہ ہُوا

---

* ملاحظہ ہو نہج البلاغہ کتاب [illegible] جناب امیرؑ صفحہ ۱۴۵ جس کو علامہ جناب مفتی محمد عبدہ (مفتی مصر) نے مع شرح چھپوایا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اہل دُنیا نے رسولوں اور ائمۂ اطہار کی تو پیروی کی ہی نہیں۔ اور یہ جو نفوس قدسیہ اپنے اپنے عہد میں بے مثل و نظیر (معصوم) تھے۔ اُن کو تو یکتا مانا ہی نہیں۔ پھر سدے کس بنا پر اپنے آپ کو یکتا سمجھتے ہیں۔ آگے ترقی یہ کی کہ پیغمبر و امام تو درکنار خدا سے یکتا کو سب اہل عالم نے نہیں مانا۔ نہ آج مانتے ہیں۔ بہت سے زبان و دل سے منکر ہیں۔ بہت سے زبان سے کہتے ہیں مگر دل سے منکر خدا ہیں۔ یہ اہل دنیا کا رنگ ہے +

فصل ۲ عمر خیام بشکایت فلک

(۵) عمر خیام (رباعی)

اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم آزادم کن کہ لائق بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نا اہل است [illegible] اہل و خردمند نیم

کہتا ہے کہ اے آسمان میں تیری گردش سے [illegible] مَیں تیری سبزی کے [illegible] رہتا ہے۔ تو مَیں بھی کچھ ایسا عقلمند و [illegible] اہل [illegible] سورتے

مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ (رباعی)

زردار نہیں اور طلب زر بھی نہیں [illegible] سر پہ [illegible] ہمسر بھی نہیں
پھر خاک میں مجھ کو کیوں ملاتا ہے فلک میں کون ہوں [illegible] کے برابر بھی نہیں

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں نہ تو خود مالدار ہوں نہ طالب مال۔ نہ میرے سر میں کسی کی ہمسری کا سودا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت قناعت کو پسند کرتی تھی۔ پھر مجھے آسمان خاک میں کیوں ملاتا ہے۔ مَیں تو خاک کے برابر بھی نہیں ہوں۔ مرزا مرحوم کی خاکساری اُن کے بوترابی ہونے کو ثابت کرتی ہے۔ اور استعارہ ہے کہ خاک میں اُس کو آسمان ملائے جو خاک کے برابر ہو کہ ہر جنس اپنی جنس میں ملتی ہے۔ جیسے کہ مثل ہے [illegible] مشہور ہے۔ سبحان اللہ ایک رباعی میں اور اتنا بڑا بلیغ مضمون نظم فرمایا ہے +

(۶) خیام (رباعی)

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند   درکشفِ دقیقہ شمعِ اصحاب شدند
رہ زیں شبِ تاریک نہ بردند بروں   گفتند فسانۂ و در خواب شدند

مرزا مرحوم   (رباعی)

آج آئے ہیں۔ کل کوچ کی طیّاری ہے   غفلت میں کٹی عمر۔ یہ ہشیاری ہے
دُنیا ہے عجب مقامِ حیرت۔ نہ کھُلا   یہ عالمِ خواب ہے کہ بیداری ہے

بند مسدس

یاں روز اک طلسم بنا اور بگڑ گیا   یاں کل نہال تازہ جما۔ آج اُکھڑ گیا
یاں شب کی شب بسا جو مسافر اُتر گیا   نامِ خزاں کا رستۂ زرگل پہ پڑ گیا
[illegible] دان [illegible] حساب کا کچھ [illegible] ہے
[illegible] کی [illegible] ہے

(۱) [illegible] منطقی رازی

تو گفتی خنگِ صبا [illegible] تا [illegible] کرد   فگند ابر بنعل زریں در بیاباں
(۲) انوری۔ دیدم اندر سوادِ طرّۂ شب   گوشوارِ فلک زگوشۂ بام
گفتم آں نعلِ خنگِ دستورست   قرۃ العین و فخر آلِ نظام
(۳) ظہیر فاریابی۔ نعلِ سمندِ شاہِ جہاں نیست کا سماں   ہر ماہ بر سرش نہد از بہرِ افتخار
مرزا دبیر مرحوم۔ سن لو نسب یہ رخش بڑا قوم دار ہے   تخمِ مرادِ ابلقِ لیل و نہار ہے
کھیت اس کا صحنِ قدرتِ پروردگار ہے   یہ شیر خوار دایۂ ابرِ بہار ہے
مالک ہے بادِ نو سے یہ چرخِ بلند کا   پہلے فلک پہ نال گرا ہے سمند کا*

مرزا مرحوم کی طباعی اد [illegible] بات میں [illegible] بات نکالنے کو دیکھئے نعل جو عین [illegible] ہے۔ وہ تو گھوڑے کا

* یہ بند جس مرثیہ کا ہے وہ کبھی نکسہ طبع نہیں ہوا صرف چند ملا [illegible] مرزا [illegible] جس کے پاس محفوظ ہے۔ حقیر کے پاس بھی ہے جو نانا مرحوم سے مجھے پہنچا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

عبرت و شبابی

مخمس

نعل اسپ کی تشبیہ ماہِ سنہ منطقی رازی و انوری و ظہیر فاریابی

نعل مراد ہے۔ مگر یہاں نال الف سے چاہے مراد لیجے چاہے (نعل) عین سے۔ جب بچہ پیدا ہوتا
ہے۔ تو اُس کا نال کاٹ کر زمین میں گاڑا جاتا ہے۔ روزمرہ میں بولتے ہیں۔ ہمارا وہاں کیا نال گڑا
ہے مطلب یہ ہے۔ کہ جس جگہ آدمی کا نال گڑتا ہے۔ اُس مقام سے اُس کو محبت ہوتی ہے۔ اور
اکثر آدمی کا نال اُس کے مملوکہ مکان میں گاڑا جاتا ہے۔ اور مولد کا تعلق ہمیشہ آدمی سے رہتا ہے۔
پس اس موقع پر مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مقام۔ اسپ جناب علیؑ کو آسمان سے یہ تعلق ہے۔
کہ ماہ نو جس کو لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ اس گھوڑے کے نال گڑنے کا نشان ہے [illegible] میں [illegible] ایہام
ہے۔ دوسری صورت میں [illegible] سے وہی نعل آہنی مراد ہے۔ جس کو اکثر شعرا کہتے آئے ہیں:

(۸) [illegible]

فصل ۴ فائدہ نمبر ۱۱ [illegible] انوری ۱۱

انوری۔ [illegible]
واقعی آدمی کی [illegible]
قیمت نہیں۔ [illegible]

دبیر [illegible] (رباعی)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

ناظرین۔ دیکھئے کس قدر مضمون کو ترقی دی ہے۔ یہ رباعی مرزا صاحب نے عظیم آباد دیکھنے پہنچ
کر کہی تھی۔ جیسا کہ میں مفصل اپنے مقام پر لکھ آیا ہوں*+

خاتمہ انوری ۱

(۹) انوری (پیغمبر سخن) در جہانی و از جہاں بیشی + ہمچو معنی کہ در بیاں باشد ۱۱
(الف) دبیرؔ۔ قاتل کو جام دینے میں تعذبر کے عوض۔ یہ کہتے ہیں یہ خدا کی عبادت میں غرض
جوہر ہے لعل حضرت شبیرؑ کا سبب عرض + پیاس سبب عوام۔ یہ دریا میں ہیں سب عرض

* فارسی کی الفضایل جو ناصرالدین شاہ قاجار [illegible] اس میں ملک الکلام سرورش کے یہ دو شعر لکھے ہیں جو اسی مضمون کے
ہیں [illegible]

سب سایہ ہیں یہ جان نبیؐ بے گماں ہے
سایہ نہ جان میں ہے نہ سایہ میں جان ہے

انوری اپنے ممدوح کو کہتا ہے کہ (تو جہان میں ہے۔ مگر تمام جہان سے فضیلت میں زیادہ ہے۔ جیسے معنی الفاظ میں ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بیان میں معنی نہ ہوں۔ تو وہ مہمل ہوگا) انوری نے عجب بلیغ مضمون ادا کیا ہے۔ کہ ممدوح باوصفیکہ جہان میں شامل ہے۔ مگر پھر سب سے الگ اور افضل و اعلیٰ ہے۔ ایسے ایسے اعلیٰ مضامین کی بدولت انوری پیغمبرِ سخن مانا گیا ہے +

مرزا مرحوم فرماتے ہیں۔ کہ میرے ممدوح (امام حسین علیہ السلام) بمنزلہ جوہر ہیں۔ جوہر اُس کو کہتے ہیں۔ جو بالذات قائم ہو۔ اور سب بنی آدم بمنزلہ عرض ہیں۔ کہ عرض جوہر کے دم سے قائم رہتا ہے۔ شیعوں کے اعتقاد میں امام عصر اور صوفیوں کے عقیدے میں غوث نبی اور [illegible] سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور تمام دنیا انہی کے دم سے قائم ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ کہ تمام سایہ کی طرح ہیں۔ اور امامؑ بمنزلہ جان ہیں۔ اور جان بھی کس کی؟ نبی آخر الزمان (روحی لہ الفداء) کی۔ پھر اس پر ترقی دی۔ کہ نہ سایہ میں جان ہوتی ہے نہ جان میں سایہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نہ عام لوگ امامؑ کے درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ نہ امامؑ عوام میں شامل و داخل ہیں +

(ب) دوسرے مرثیہ میں مرزا صاحب جناب عباسؑ کی مدح میں فرماتے ہیں:-

دُنیائے دنی ان کا نشاں کفِ پا ہے — لیکن وہ نشاں ہے جو کفِ پا سے جدا ہے

دُنیا انہیں کے دم سے قائم ہوئی۔ انہیں کے نور سے پیدا ہوئی۔ جیسے نشانِ قدم قدم سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ دُنیا سے ایسے الگ تھلگ رہتے ہیں جیسے نشان قدم قدم سے جدا ہے۔ انوری مضمون آفریں شاعر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں اس کا نام اسی طرح آتا ہے۔ جیسے ایک شاعر شاعرانہ تفاخر سے اپنے متقدم شاعر کو یاد کرتا ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں:-

(رباعی)

اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے
آ۔ دیکھ کہ یہ در معانی کیا ہے
یاں گُل ہے چراغ انوری کا بالکل
اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے

اس میں اشارہ ہے۔ کہ شعرائے ایران تو مضمون آفرینی میں میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ ہندوستانی کیا مقابل ہو نگے۔ انوریؔ کی نسبت ایک مقام پر اُنھوں نے یہ بھی افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ بادشاہوں کی تو اُس نے کثرت سے مدح کی۔ کہ اُس کا کلیات (مدح سے) بھرا پڑا ہے۔ مگر خاصان خدا کی شان میں قصائد وغیرہ نہ کہے۔ چنانچہ ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

اندھیر ہے جو تجھ سے مقابل ہو انوری
شاہوں کی آس نے کی ہے فقط مدح گستری
حیدرؔ کی منقبت۔ نہ ہے نعت پیمبریؐ
کس بات پر حسینؑ کے ذاکر سے ہمسری؟

(۱۰) سعدی شیرازی سے۔ ممدوح کا نام ہے: ز تو خود بینی از خویشتن بیں مجو +
مرزا مرحوم سے نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا ملا + بندہ جدا ہوا جو خودی سے خدا ملا +

مرزا مستفاد از سعدی

(۱۱) سلمان ساوجی سے

در دُرج دُر عقیق لبت نقد جاں نہاد
جنس نفیس بود بجائے نہاں نہاد
قُفلے ز لعل بر درِ آں درج زد لبت
خالت ز عنبر آمد و مہرے برآں نہاد
باریک تر ز مو کمرت را دقیقہ
ناگاہ در دل آمد و اسمش میاں نہاد

جھلک سے رکھنے سلمان ساوجی

دبیرؔ گیسوئے رسا روئے کتابی کے قریں ہے
قرآن کا حافظ پر جبریل امیں ہے
لب موج۔ دہن کوثر فردوس بریں ہے
دانتوں سے لطافت کا جہاں زیر نگیں ہے

دندان و دہن کے لئے تشبیہیں ملی ہیں
کلیاں سمن خلد کی۔ کوثر میں کھلی ہیں

مدح خال و رخ

لو قدرت داور کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو خال رخ انور کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو
اک نقطہ میں دفتر کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو خورشید میں اختر کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو

ہے قرب۔ نیا روئے ضیا بار کے آگے
قنبر تو نہیں حیدر کرار کے آگے

قنبر حبشی تھے۔ اور خال سیاہ ہوتا ہے۔ روئے ممدوح انور و روشن ہے ان وجوہ سے یہ تشبیہ اعلےٰ درجہ کی ہے +

ایک مرثیہ میں دختر فخر فوریین کی کمر کی نسبت یہ بند ہے :-

تعریف کمر میں شعرا کے تھے یہ اقوال یہ بال کی ہے کھال و یا کھال یہ اک بال
میزان نزاکت میں جو تولو۔ تو کھلے حال موئے مژہ سے بھی کم تھی کمی مثقال

اس موئے کمر کی رگ جاں سے یہ کھلا پیچ
عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

(سنہ ۱۲) خواجہ [illegible] + با شیر در دل آمد و با جان بدر شود۔
حافظ شیرازی کے مشہور [illegible] + [illegible] با شیر در بدن شد و با جان بدر شود۔

مرزا مرحوم مدح ہند بنت عبداللہ عامر صحابی میں (یہ دوستدار اہلبیت زوجہ یزید تھی) کہتے ہیں :-

حق کی نگہ مہر سے سرمہ جو یہ پایا مادر نے وضو کر کے سدا دودھ پلایا
تقدیر نے گہوارۂ عفت میں جھلایا ڈوپٹے کی جگہ سر پہ ید اللہ کا سایا

افزود او نانی بھی ایک ایک گھڑی تھی
حیدر کی دعا ہند کی گھٹی میں پڑی تھی

ناظرین۔ دیکھئے۔ گھٹی میں پڑنے کے روزمرہ کو کیسے موقع پر صرف فرمایا ہے +

تعریف محبت حافظ رح

(۱۳) حافظ شیراز۔ ساز حدیث سخن عشق ندیدم خوشتر + یادگاری کہ دریں گنبد دوّار بماند۔
دبیر۔ جس دن تلک آباد یہ ویرانہ رہیگا + عباس کی الفت کا بھی افسانہ رہیگا۔

عبودیت خالص

(۱۴) حافظ۔ تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن + کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔
دبیر۔ مصرع کے عوض آپ سے طوبےٰ نہیں لیتا　　لو جنت لعلےٰ بھی یہ ادنےٰ نہیں لیتا
اب تو پوچھئے کیا مانگتا ہے کیوں نہیں لیتا　　میں نام زباں سے کسی شئے کا نہیں لیتا
جز نقد رضا کچھ مجھے منظور نہیں ہے
خادم ہوں مداح ہوں مزدور نہیں ہے

حافظ کے شعر میں تو خفیف سا شائبہ بھی ہے۔ کہ خواجہ خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے وہ پرورش کریگا۔ مگر مرزا مرحوم کہتے ہیں میں صرف رضا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ کہ دل سے مداح ہوں۔ کوئی مزدور نہیں ہوں +

سفر آخرت ابن یمین

(۱۵) ابن یمین۔ منگر کہ دل ابن یمین پر خوں شد + بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد۔
مصحف بکف و چشم براہ و دل بدوست + با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد۔

سبحان اللہ مومن کی موت کا کیا نقشہ کھینچا ہے +

مرزا مرحوم　　(رباعی)

رحمت کا نزول امیدوار [illegible] سے تشریف لایا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل　　تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

ناظرین!! اس مضمون کی رباعی سوائے اسکے کوئی رباعی میری سماعت میں ابتک نہیں آئی۔ اب چاہے اس کو سرقہ [illegible] کہئے۔ چاہے مرزا صاحب کے حسن عقیدت خیال فرمائیے۔ مگر میں اسے اچھا سمجھتا ہوں +

(۱۶) امیر خسرو کا لاجواب شعر ہے ۔

بوئے خوشم ایداز تو در جیب [illegible]　　گل [illegible]

اے محبوب خوشبو آ رہی ہے ۔ یہ تیری جیب میں کوئی پھول ہے ۔ یا تیری ہی (جسم کی) خوشبو ہے + کیسا عمدہ مضمون تعجب کے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے ۔ تعریف نہیں ہو سکتی ۔

دوسرے موقع پر یہی بزرگوار فرماتے ہیں ۔ ؎

کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ برزمیں آمد چہ گرد ست ایں کہ می خیزد کہ با جاں ہم نشیں آمد

(الف) مرزا مرحوم زہیر ابن قین کے مرثیہ میں اُس موقع پر فرماتے ہیں جب جناب علی اکبرؑ حضرت امام حسینؑ کے حکم سے اُن کے خیمے پر اُن کے بلانے کو گئے ہیں ۔ اور زہیر مع مصاحبین کے بیٹھے ہوئے ہیں :۔

محفل شمیم عطر عرق سے مہک گئی خیمے میں ایک نور کی بجلی چمک گئی
اٹھ اٹھ کے سب نے صلِّ علیٰ کی یہ گفتگو آتی ہے کس طرف سے رسولِ خدا کی بو
کہنے لگا غلام زُہیرؔ آ کے رُو برو چل جلد پیشوائی کو اب اے زہیر تو
گیسو ہیں دونوں کاندھوں کے اُوپر پڑے ہوئے
دروازے پر حبیبِ خدا ہیں کھڑے ہوئے

یہ امام زادۂ عالی وقار سر سے پاؤں تک حبیب خدا اشرف انبیا محمد مصطفےٰ کی گویا تصویر ہے ۔ اُس مشابہت کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے ۔ اللّٰھم صل علی محمدؐ و آل محمدؐ +

(ب) ایک عورت (خورشید بانو) نے ایک راہرو شخص کے پاس سے امام حسینؑ کو مقتل میں لیٹا ہوا دیکھا ہے ۔ اُس موقع پر کہتے ہیں ۔ ؎

آنکھیں فلک پہ اور یہ سخن تھا زبان پر ہے چاند اس کے ہات میں یا آسمان پر!!

(ج) جناب شاہزادہ علی اکبرؑ گھر سے باہر نکلے ہیں ۔ میدان شہادت کو جاتے ہیں ۔ اُس موقع پر مرزا مرحوم فرماتے ہیں ۔ ؎

نورِ نظر شاہ جو گھر سے نکل آیا
حیراں ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

فصل ۶ آفتاب کا طلوع ملا محتشم

(۱۷) ایران کے مشہور مرثیہ گو شاعر ملا محتشم کا مشہور و مقبول شعر ہے:۔

روزے کہ شد بہ نیزہ سر آں بزرگوار خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

اس میں شاعر نے آفتاب کا سر برہنہ نکلنا بیان کیا ہے۔ اور اس کی وجہ بیان کی ہے۔ اب مرزا صاحب کی حسن تعلیل اور لطف تخئیل کو دیکھئے:۔

تھی بسکہ صبح قتل حسینؑ شاہ نامدار اہل حرم تھے جیب دریدہ اور اشکبار

تار شعاع سے بھی ہویدا تھا آشکار خورشید نے کیا ہے گریباں کو تار تار

پوتے نے بھی رسولؐ کا داماں پھٹ گیا

رنڈ کے سمجھے کفن کا گریباں پھٹ گیا

(۱۸) ملا طغرائی مشہدی ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

مروت کردہ شب ہا بر لب بسر بام و در لازم نمی باشد چراغے خانۂ بے دستگاہاں را

مطلب یہ ہے۔ کہ تو جو کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اور لوگوں کے دروازہ پر جاتا ہے۔ یہ تیری مروت کی دلیل ہے۔ کہ مفلسوں کے جھونپڑوں میں چراغ نہیں ہوتا تیرے چہرہ کی روشنی اُن کے لئے چراغ بن جاتی ہے +

مرزا دبیر مرحوم کے ممدوح بادشاہانِ دُنیا سے اعلےٰ ہیں۔ اس لئے انکی تخئیل بھی دُنیا کے چراغ سے روشنی نہیں لیتی۔ بلکہ وہ چاند سورج سے کام لیتے ہیں اور چاند سورج بھی دُنیا کے نہیں بلکہ جنت کے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

سورج ہے نہ دن خلد میں چاند نہ شب ہے شمس و قمر عدن یہ فرخندہ لقب ہے*

صائب تواضع دشمن

(۱۹) صائب فرماتے ہیں۔ سے

بر تواضعہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

مطلب یہ ہے۔ کہ دشمن گو بظاہر تواضع کرے۔ مگر اُس پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ اس

* یہ شعر حضرت عباسؑ ماہ بنی ہاشم کی مدح میں ہے + ۱۲ منہ حقیر

صورت میں نقصان پہنچیگا جیسے سیل (بہیا) دیوار کی پابوس ہوتی ہے۔ اور اُس کو جڑ تک سے گرا دیتی ہے +

مرزا دبیر مرحوم کا مضمون دُوسرا ہے۔ مگر اس سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ میں دشمن سے بھی خلاف مروّت برتاؤ نہیں کرتا ہُوں۔ اُن کا شعر یہ ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو ۔۔۔ مانند غُبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو*

دیکھئے ہوا غبار کی دشمن ہے۔ کہ اُس کو اُڑا کر پریشان کر دیتی ہے۔ مگر غبار اُس کی تعظیم کو اُٹھتا ہے۔ یعنی جب ہوا تیز چلتی ہے۔ تو غبار زمین سے اُٹھتا ہے +

(۲۰) مرزا صائب کا مشہور لاجواب شعر ہے ؎

دوست دشمن میشود صائب بوقت بیکسی ۔۔۔ خون زخم آہوان ہے می برد صیّاد را

بیکسی کا وقت بُرا ہوتا ہے۔ دوست بھی دشمن بن جاتا ہے۔ چنانچہ صیّاد جب ہرن کو زخمی کرتا ہے۔ اور اُس کا خون زمین پر ٹپکتا ہے۔ تو اُسی نشان خون پر صیاد چلا جاتا ہے۔ اور آخر کار جہاں ہرن ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اُس کو گرفتار و ذبح کر دیتا ہے +

مرزا مرحوم زبانی جناب زینبؑ ذیل کی بیت فرماتے ہیں۔ وہ معظمہ جب جناب امام حسینؑ کی لاش پر پہنچی ہیں اور سرِ اقدس کو بدن پر نہ پایا۔ تو بین کرتی ہیں ؎

خواہر تری غربت پہ فدا ہو گئی بھیّا ۔۔۔ تنہائی میں گردن بھی جدا ہو گئی بھیّا

---

* نہج البلاغہ مطبوعہ مصر شرح مفتی محمد عبدہ کے صفحہ ۲۰۹ پر یہ روایت جناب امیرؑ کی ہے۔ اَحْبِبْ حَبِیْبَکَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ بَغِیْضَکَ یَوْمًا مَّا وَ اَبْغِضْ بَغِیْضَکَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ حَبِیْبَکَ یَوْمًا مَّا۔ اپنے دوست سے خلق و مدارات کے ساتھ دوستی کر۔ شاید کسی دن تیرا دشمن ہو جائے۔ تو تیری مدارات کو یاد رکھے۔ اور اپنے دشمن سے خلق و مدارات کا پہلو لئے ہوئے دشمنی کر۔ شاید کسی دن وہ تیرا دوست ہو جائے۔ یہ مضمون ادھر سے مرزا صاحب کا مضمون مستنبط معلوم ہوتا ہے عجب مروت و معاندانہ روشنی کا خیال ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ سبحان اللہ کیونکر مضمون کے قلم سے لوح دل پر یہ مضمون لکھا کہ اس پر عامل ہونا چاہئے تاکہ دین و دُنیا کی بھلائی حاصل ہو +۔ ۱۲ مؤلف عفی عنہ۔

گردن سی شئے تنہائی میں جسم سے جدا ہو گئی۔ اور سب دوست تو علیحدہ ہوئے ہی تھے گردن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ بلاغت کی شان سے اختصار بھی ہے۔ جس مضمون کو مرزا صائب نے ایک شعر میں کہا تھا۔ اُس کو مرزا صاحب نے ایک مصرع میں ادا کر دیا۔ یہ مرزا مرحوم کا کمال بھی قابل داد ہے +

ناظرین!! میں اس مضمون کو اس لئے طول دینا نہیں چاہتا۔ کہ میرے بعض احباب مانع ہیں۔ اور اُن کی یہ رائے ہے۔ کہ زمانہ ایسے مضامین کی قدر کرنے پر طیّار نہیں ہے۔ ورنہ بہت سامصالح ایسے مضامین متقابلہ کا فراہم کر چکا ہوں۔ اگر ان مضامین کی ملک میں قدر ہوئی۔ اور ناظرین نے نظر پسند سے دیکھا۔ اور فرمائش کی۔ تو انشاء اللہ آئندہ کتاب کے دوبارہ چھپنے پر اس سے زیادہ ایسے اشعار پیش کر دونگا۔ ورنہ خیر +

باب چہاردہم کلام بعض شعراء ہند و کلام مرزا مرحوم

فصل ۱ کلام شعراء ہند و کلام دبیر

اس باب میں چند ایسے شعر لکھتا ہوں۔ کہ جن کا مضمون قریب قریب سا ہے تا کہ ناظرین کو معلوم ہو سکے۔ کہ مرزا صاحب اگر کسی معمولی مضمون کو بھی لیتے ہیں۔ تو ایک نہ ایک لفظ یا بات ایسی کہتے ہیں۔ کہ وہ مضمون گویا نیا ہو جاتا ہے۔ ازبسکہ گروہ شعرا میں میر تقی میر مرحوم بہت بڑے قابل تعظیم اُستاد مانے جاتے ہیں۔ اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔ کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ اس لئے میں تبرّکاً میر صاحب سے اس باب کو شروع کرتا ہوں +

(۱) میر مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

میرے تغیّر رنگ پر مت جا ۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

نسیم لکھنوی گلزار نسیم میں کہتے ہیں۔ ؎

میر تقی میر نسیم لکھنوی

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

مرزا مرحوم شیریں کنیز امام حسینؑ کی پریشانی کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ ؎

اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا پوشاک بدلنا بھی۔ غرض۔ چھوڑ دیا تھا

تغیر

تغیرِ رنگ کے مضمون کو مرزا صاحب ایک اور مرثیۂ حالِ جناب سکینہ میں بالکل نئے طرز پر فرماتے ہیں۔ ناظرین! دیکھئے لفظوں میں سے مضمون یوں پیدا کرتے ہیں۔

وہ رُخ کہ رُوحِ فاطمہؑ جس پر پڑھے درُود رنگ اُس کا حادثہ سے بدلتا تھا زُود زُود

زردی کبھی عیاں تھی سفیدی کبھی نمُود تھا سرخ اشک سرخ سے سیلی سے تھا کبود

نیرنگ بے پدر کو زمانہ دکھاتا تھا

اک رنگ منہ پہ آتا تھا اک رنگ جاتا تھا

چھٹا مصرع اس لئے لاجواب ہے۔ کہ اس میں پوری مثل نظم فرمادی ہے۔ ع اک رنگ منہ پہ آتا تھا اک رنگ جاتا تھا۔ انتہائی تشویش و اضطراب و مصیبت میں دل کی یہی حالت ہوتی ہے اور اُس حالت کو یُوں ہیں بولتے ہیں۔ کثرت سے بولنے کے سبب اب یہ مثل ہوگئی ہے مثل کو چاروں مصرعوں میں چار رنگوں {زرد۔ سفید۔ سرخ۔ کبود (نیلا)} کو بیان کرکے اصل کر دکھایا ہے۔ شاعری کی معراج کمال یہ ہے۔ کہ ایسے مثل میں سے مضمون پیدا ہو +

نسیم لکھنوی

پانچ انگلیاں اور پنجتن پاک

(۲) نسیم لکھنوی کی گلزار نسیم لاجواب مثنوی میں یہ مشہور شعر قلم کی نسبت نعت و منقبت میں ہے۔ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ؎

پانچ اُنگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنجتنؑ ہے

مرزا صاحب کے بیت مندرجہ تحت میں قلم کا مضمون نہیں ہے۔ پانچ انگلیوں اور پنجتنؑ پاک کا مضمون ہے۔ مگر بالکل نیا اُس سے بالکل علیحدہ۔ یہ علم نہیں کہ مرزا مرحوم کا شعر مقدم ہے یا نسیم آنجہانی کا۔ ؎

پانچ اُنگلیوں سے ہم نے چُنا ایک بات کو بس پنجتنؑ کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

ہاتھ پھیلانا سوال کرنے کے معنی پر اردو کا روزمرہ ہے یعنی پانچ انگلیاں خدا نے اس لئے بنائی ہیں۔ کہ ہم پنجتن سے سائل ہوں۔ اور کسی دروازہ پر نہ جائیں کسی سے نہ مانگیں۔ اللہ اللہ کیا زور تخئیل ہے۔ کتنا معقول شاعرانہ استدلال ہے جس کو شعراحسن تعلیل کہتے ہیں ✦

(۳) جناب میر تقی میر مرحوم فرماتے ہیں:۔ (قطعہ)

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو جاہ و ثروت کا میسر سروساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

مرزا صاحب کہتے ہیں:۔ (رباعی)

سر کو سر گشتہ بہر ساماں نہ کیا دل کو پئے جمع زر۔ پریشاں نہ کیا۔
ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں احساں کیا جو ہم پر احساں نہ کیا

ناظرین! دیکھئے مضمون کو الفاظ کی خوبی۔ بندش کی چستی و صفائی۔ زبان کی لطافت بیان کی متانت نے کس اوج پر پہنچا دیا ہے۔ سر کے ساتھ سرگشتہ اور پھر اُس کے برابر ساماں کا لفظ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سروساماں بولتے ہیں یہ اُسی کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ پھر دل کو روپیہ جمع کرنے کے واسطے پریشان کرنا کیا عمدہ بات ہے۔ جمع و پریشان باہم ضدین ہیں صنعت تضاد اور اس بے تکلفی کے ساتھ ہے۔ کہ یہاں جمع و پریشان کے سوا دوسرے لفظ ہی نہیں لا سکتے۔ پھر چرخ کا شکریہ بھی ہے۔ تو نئے انداز کا۔ کہ ہم پر تو نے یہی احسان کیا۔ کہ کوئی احسان نہ کیا۔ تو احسان کرتا۔ تو سروسامان اور مال فراہم ہوتا۔ اُس سے سر کو سرگشتگی اور دل کو پریشانی ہوتی۔ بے زری اور مفلسی کی بدولت ان تمام مصیبتوں سے بچے کیسی بے تکلف نظم ہے۔ طبیعت کی روانی اور شاعر کے قدرتی شاعر ہونے کا انہیں باتوں سے پتہ چلتا ہے ✦

(۴) جناب میر تقی میر مغفور کے مشہور بہتر[۷۲] نشتروں میں سے شعر تحت

معتقد خاص تھے۔ شعر کہتے بھی تھے (غالباً اپنے ماموں کے شاگرد تھے) اور جیسا کہتے تھے اُس سے بہتر شعر کے حسن و قبح کو سمجھتے تھے۔ اکثر مرزا صاحب کے روبرو مرزا غالب مرحوم کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اور مرزا صاحب حسب مذکورہ داد دیتے تھے۔ ان کے نام جو خطوط مرزا غالب مرحوم بھیجتے تھے۔ افسوس کہ وہ نہ عود ہندی نہ اردوے معلّٰی میں چھپے۔ انھیں خطوں میں برابر مرزا دبیر کو سلام اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہُوا فقرہ بطور پیام وہ ضرور تحریر فرماتے تھے۔ ان کے فرزند مرزا فیاض بیگ مرحوم حاتم تخلّص (جو منصف بھی ہو گئے تھے) جناب استاذی حضرت اوج مدظلّہ کے شاگرد تھے۔ جن کے بعض سلام دفتر ماتم میں چھپے ہیں[۵۱]۔ فیاض بیگ حاتم مرحوم

خواجہ حالی صاحب یادگار غالب میں سید اکبر مرزا صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اس شعر غالب مغفور پر ۔ یادگار غالب سے حکایت

مُژدۂ شفاعت وصلِ صبر و خوں بہا ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

مصرع لگائے تھے۔ مگر اُن کو خود پسند نہ آئے۔ اور یہ کہا۔ کہ جس رتبہ کا یہ شعر ہے۔ ویسے مصرع نہیں لگ سکتے۔" ہرچند مَیں نے لکھنؤ میں جناب مرزا اوج قبلہ یا نانا مرحوم یا اور کسی اور بزرگ سے یہ روایت نہیں سُنی۔ مگر مرزا دبیر مرحوم کی عادات و خلاق کی رُو سے مَیں کہتا ہُوں۔ کہ یہ حکایت بالکل سچّی ہے۔ درحقیقت یہ شعر بڑے پایہ کا ہے۔ اور مرزا دبیر ایسے ہی قدرداں اور صاف گو تھے۔ اگر اس پایہ کے مصرع نہ لگ سکے ہونگے۔ تو ضرور صاف صاف کہدیا ہوگا۔ کہ یہ صاف گوئی بھی کامل کی دلیل کمال ہے۔ کہ وہ اپنے عجز طبیعت کے بیان میں کبھی نہیں شرماتا[۵۲]۔

---

[۵۱] مَیں نے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ جا کر ان خطوط حضرت غالب مرحوم کو ان کے خاندان میں تلاش کیا۔ مگر افسوس کہ کامیابی نہ ہوئی۔ ورنہ ان خطوں سے بہت سی باتیں حیات دبیر کے اندراج کے قابل معلوم ہوتیں ۱۲ مؤلف حقیر

[۵۲] دیکھئے معیار دبیر جناب [illegible] جس موقع پر [illegible] علم عروض کو بیان فرمایا ہے۔ وہاں لکھتے ہیں کہ علم عروض کے پڑھنے سے جو شخص [illegible] ہوجاتا ہے۔ [illegible] اپنے نقص و عیب کو کس طرح صاف صاف بیان فرما دیا ۱۲ مؤلف

دقیق و سلیس ہر قسم کا کلام

(۶) جس طرح مرزا غالب مغفور کا کلام متضاد دقیق و سلیس دونوں قسم کا موجود ہے اُسی طرح مرزا دبیر مبرور کا دونوں طرح کا کلام موجود ہے۔ جب وہ دقیق کلام کہتے ہیں تو بڑے بڑے عالم گھنٹوں سوچا کرتے ہیں۔ اور ایسے ویسے کج فہم تو سمجھتے ہی نہیں بلکہ اُس کو مہمل بتا دیتے ہیں۔ المرء یقیس علیٰ نفسہ (ہر شخص اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے) کی مثل کو اصل کر دکھاتے ہیں۔ اور جب وہ سلیس کلام کہتے ہیں۔ تو اُس سے بڑھ کر نظم تو نظم دوسرا نثر بھی ایسی عام فہم نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ دونوں طرح کے نمونے میں نے دونوں جلدوں (بالخصوص جلد دوم) میں بکثرت پیش کر دئے ہیں +

کلام

مصیبت میں بیکسی

(۷) مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گذرے غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

انتہا کی شوخی و بیباکی اس شعر میں ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت ہی افلاس اور تنگی و مصیبت کے وقت دل مجروح سے (یہ شعر) نکلا ہے۔ اسی کے قریب قریب فارسی میں بھی (مگر مہذب طرز میں) فرماتے ہیں ؎

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت *

اب مرزا دبیر مغفور کے شعر کو دیکھئے۔ کہ اصل مضمون تو یہی ہے۔ مگر کس قدر مہذب طرز میں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شوخی و بیباکی کا شائبہ بھی نہیں۔ جناب فاطمہ صغرے اپنی نانی ام المومنین جناب ام سلمہ سے اپنی مصیبتیں بیان کرتے کرتے فرماتے ہیں ؎

دن زیست کے باقی ہیں سو رو رو کے بھرونگی مرتے ہوئے دنیا کا میں کیا یاد کرونگی

* اس شعر کا ماخذ شاید یہ شعر امام زین العابدینؑ کا ہو جبکو وہ جناب شام کے رستے میں پڑھتے اور اونٹوں کی مہار کھینچتے جاتے تھے ؎ اقاد ذلیلاً فی دمشق کانّنی۔ عبد من الزنج غاب عنہ نصیر۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ میں اس ذلت سے مقید ہوں جیسے کوئی زنگبار کا غلام ہو۔ غلام بھی ایسا کہ جس کا آقا سر پر سے اٹھ گیا ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دونوں اُستادوں کے (اُردو کے) شعروں میں جو باریک فرق ہے۔ وہ ہونا چاہئے۔ یعنی غالب مرحوم نے غزل میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ اس لئے ویسے الفاظ ہیں۔ جو غزل کی شوخی وبیباکی کے مناسب حال ہیں۔ مرزا دبیر مرحوم نے مرثیہ میں یہ مضمون ادا کیا۔ وہ ایسے الفاظ متین لائے۔ جو مصیبت زدہ کی زبانی لانے لازم تھے۔ پھر اُس پر طرہ یہ کہ خاص عورتوں کے محاورے و روزمرہ کا خیال رکھا۔ کہ "دن زیست کے رو رو کے بھرنا" شریف عورتیں ہی زیادہ تر بولتی ہیں۔ یہ وہ نکات شاعری ہیں جن کو شاعر اہلِ زبان خوب سمجھ سکتے ہیں +

(۸) غالب مرحوم۔ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ + لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر۔

دبیر مغفور۔ گو گوہرِ سخن بکا مرے جوہری نہیں + یوسفؑ کا کیا ضرر ہے اگر مشتری نہیں۔

غالب مرحوم تو کہتے ہیں۔ کہ جب کبھی لائق خریدار ملتا ہے۔ تو کلام کے ساتھ میں خود بھی بک جاتا ہوں۔ مگر دبیر فرماتے ہیں۔ میرے گوہرِ مضمون کا کوئی مشتری ہی نہیں۔ پھر بھی کچھ پروا نہیں۔ اور عزتِ کلام میں کمی و فرق نہیں آسکتا۔ جیسے حضرت یوسفؑ کے خریدار نہ ہونے سے اُن کے حسن و عظمت کا کچھ نقصان نہیں +

(۹) مرزا غالب اپنی بے سروسامانی یوں لفظوں میں شکرِ خدا کرتے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا   رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مرزا دبیر الفاظ ذیل میں اپنا استغنا ظاہر کرتے ہیں۔

مداح ہوں میں امامِ بے سر کا دبیر   سامان کیسا۔ کہ سر بھی درکار نہیں

(۱۰) حضرت غالب اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں "میں بھی تمہارا ہمدرد ہوں۔ منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو میری وہ پھوپھی کہ میں بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ گویا نو آدمی میرے مرے۔ ۳ پھوپھیاں ۳ چچا۔ ایک باپ ایک دادی ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں یہ جانتا تھا۔ کہ ۹ آدمی زندہ ہیں۔ اُس کے مرنے سے میں نے جانا۔ کہ ۹ آدمی مر گئے +

یہی خیال جناب دبیر مرثیہ میں لاش علی اکبرؑ پر اُن کی والدہ کی زبانی ظاہر کرتے ہیں مگر صرف ایک بیت میں۔ یہ اختصار بھی قابل داد و لائق دید ہے۔ ؎

کوئی نہ رہا کنبہ میں میرے علی اکبرؑ — سب مر گئے اک مرنے سے تیرے علی اکبرؑ

(۱۱) غالب مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب — ندیدۂ کہ سوئے قبلہ پُشت محراب ست

مرزا دبیر سراپائے ممدوح کی مدح میں فرماتے ہیں: ؎

دیکھا جو مہ لقو نے اس ابرو کے شرف کو — کعبہ کی طرف پُشت کی رُخ ان کی طرف کو

اور خاص محراب کی کجی کا مضمون بھی مرزا دبیرؒ کا دیکھنے سُننے کے قابل ہے۔ ؎

شکوہ بے جا ہے کج نہادوں کا دبیر — مسجد میں بھی رُو بقبلہ محراب نہیں

مطلب یہ ہے۔ کہ جس کی بُنیاد ہی ٹیڑھی ہو۔ وہ کبھی سیدھا نہیں ہو سکتا۔ جیسے محراب مسجد۔ کہ اُسکی نیو ہی ٹیڑھی (کج) اُٹھائی گئی ہے۔ پس اُس کا مُنہ قبلہ کی طرف کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہی حال کج نہاد آدمیوں کا ہے +

(۱۲) مرزا غالب مرحوم فارسی کے ایک مخمس میں فرماتے ہیں۔ ؎

رسمیست خسروانہ کہ شاہاں بروز بار — گیرند کار خویش ز دستور و پیشکار
دستور حق نبیؐ و خداوند دستیار — میگویم و بر آئینہ گویم ہزار بار
کار خدا بعرصۂ محشر کند علیؑ

ان کا تو ادّعا ہے۔ کہ قیامت میں خدا کا کام جناب امیرؑ کرینگے۔ مگر مرزا دبیر مغفور ذیل کی رباعی میں فرماتے ہیں۔ کہ وہ جناب دُنیا میں بھی خدا کا کام کرتے ہیں۔ ؎

حل عقدوں کو شاہ ہل اتٰی کرتے ہیں — حق بندگیٔ حق کا ادا کرتے ہیں
مارا بھی۔ جلایا بھی۔ نُصیری کو دبیر — بندے ہیں مگر کارِ خدا کرتے ہیں

(۱۳) جناب غالبؒ خاصان خدا کی شان میں ایک فارسی کے قصیدہ میں فرماتے

ہیں۔ سے

رہروان (سالکان طریقت) چوں گہر آبلۂ پا بینند پاے را پایہ فراتر ز ثریّا بینند

ہرچہ در دیدہ عیانست۔ نگاہش دارند ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند

قطرۂ را کہ ہر کہ آئینہ گہر خواہد بست صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

(۱) یعنی خاصان خدا۔ سالکان طریقِ رضا جب راہ چلتے چلتے اپنے تلووں میں چھالے دیکھتے ہیں۔ تو وہ اپنے پاؤں کو ثریا سے اعلے سمجھتے ہیں۔ (۲) آنکھوں میں ظاہر بظاہر جو دیکھتے ہیں۔ اُس کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں اور محفوظ رکھتے ہیں۔ دل میں جو کچھ ارادہ ہے۔ وہ چہرہ انسان کو دیکھ کر معلوم کر لیتے ہیں۔ (۳) جو قطرہ آئندہ موتی بنیگا۔ اُس کو چہرۂ دریا پر اس طرح دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے کسی کے منہ پر آبلہ ہو۔ اور وہ صاف نظر آئے * یہ خدا کے خاص مقرب بندوں کی شان ہے سبحان اللہ کس لطافت و فصاحت سے بیان فرمایا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور کس قدر بلیغ مضامین ہیں۔ اللہ اللہ * اب مرزا دبیر مغفور کی اردو کی نظم دیکھئے۔ وہ خاصان خدا کے اختیارات کے ساتھ ساتھ اُن کی مجبوری کی شان بھی دکھاتے ہیں۔ مگر اُس مجبوری میں اُن کی عظمت نمایاں ہے۔ یہ دُوسرا کمال ہے۔ معصوم کی مدح شاید اس سے بہتر ہو سکے :-

قدرت یہ ہے کہ غیب کے اسرار دیکھ لیں اپنے محل سے خلد کا گلزار دیکھ لیں

چیونٹی کی یہ اندھیرے میں رفتار دیکھ لیں آنکھوں میں نبضِ مردمِ بیمار دیکھ لیں

قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی

لیکن نہ ہے۔ نہ ہوئیگی۔ طاقت گناہ کی

یہ بند امام حسینؑ کی مدح و منقبت میں فرمایا ہے۔ اس کے دُوسرے مصرع میں اُس واقعہ مشہور کی طرف اشارہ ہے۔ کہ امام مظلوم و معصوم نے اپنے خدا پرست صحابیوں کو روز عاشور ۶۱ھ صبح کی نماز کے بعد اُن کے جنت میں مکانات دکھائے تھے۔ جس سے اُن کا جوش ایمان زیادہ ہو گیا تھا۔ کس خوبی سے اختیارات بیان کر کے کہا ہے۔ کہ ہر چیز پر اُن کو خدا مطلق نے قدرت بخشی ہے

مگر گناہ کرنے کی اُن میں طاقت وقوت نہیں ہے۔ وہ اُن کا اختیار تھا۔ یہ (عصمت) گویا جبر ہے کیا ارد میں ایسی نظم اور جگہ آپ کو مل سکتی ہے؟

مدح کا طالب نہیں

(۱۴) مرزا غالب مرحوم کا یہ مشہور شعر مجھے بہت پسند ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب اُن کے مخالفین اُن کے بعض دقیق کلام کو سُن کر کہتے تھے۔ کہ یہ بے معنی ہے۔ اُس وقت مستغنی المزاج مرزا صاحب یہ شعر پڑھ کر اپنی جان چھڑاتے تھے۔ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اُس قدر تو نہیں۔ مگر کبھی کبھی بعض کلام مرزا دبیر مغفور کو بھی سنکر اُن کے کم علم حریف کہتے تھے۔ کہ اس کلام میں معنی پہنائے جائیں جب معنی ہوں۔ مرزا صاحب موصوف اُن کو ذیل کے بند میں جواب دیکر اپنی استغنا کی شان دکھلاتے ہیں:۔

طالب نہیں صلہ کا امیر و فقیر سے
دل ہے غنی ولائے جناب امیرؑ سے
ترجیح ہے عطارد گردوں سریر سے
معجز بیاں ہوں قدرت رب قدیر سے
سایہ میں بوتراب کے یہ خاکسار ہے
کیسا ہما۔ فلک کے بھی سایہ سے عار ہے

مطلب یہ ہے۔ کہ مجھے نہ کسی امیر سے غرض ہے کہ وہ کچھ دے۔ نہ فقیر سے مطلب کہ وہ تعریف کرے اپنے ممدوحؑ سے کام ہے۔ مشہور ہے۔ کہ ہما کا سایہ جس پر پڑجاتا ہے۔ وہ بادشاہ ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ کسی بادشاہ اور بہت بادشاہ گر کا تو کیا ذکر ہے مجھے آسمان کے سایہ سے بھی عار ہے۔ بس سایۂ حضرت ابوترابؑ درکار ہے۔ یہ اُس استغنا کی تصویر ہے۔ جو مرزا مرحوم کی طبیعت میں تھا +

عبادت خالص

(۱۵) غالب مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

مطلب یہ ہے۔ کہ بندہ جو کچھ خدا کی عبادت کرے۔ وہ اس لالچ سے نہ کرے۔ کہ اس کے صلہ

میں جنت پاؤنگا - اس سے بہتر ہے - کہ بہشت ہی کو لیکر دوزخ میں ڈال دو - تاکہ بہشت کی نعمتوں کی ہوس ہی دل میں نہ رہے - اگرچہ بظاہر مرزا غالب صاحب نے یہ مضمون طرز بے باکانہ میں ادا فرمایا ہے مگر مضمون شعر کا عارفانہ ہے - اس کا ماخذ جہاں تک میرا خیال ہے - جناب امیرؑ کا یہ ارشاد ہے - جو نہج البلاغہ مطبوعہ مصر کے صفحہ ۱۹۷ (کتاب مراسلات وکلمات حکمت حق) پر حسب ذیل درج ہے:- (۱) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَغْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ التُّجَّارِ وَ (۲) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَهْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْعَبِيْدِ وَ (۳) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ شُكْرًا فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْاَحْرَارِ - خلاصہ اس کلام بلیغ کا یہ ہے - کہ عبادت کرنیوالوں کی تین قسمیں ہیں - (۱) ایک گروہ حصول ثواب کے واسطے عبادت خدا کرتا ہے - یہ سوداگروں کی سی عبادت ہے - کہ عبادت کا بدلا (ثواب) چاہتے ہیں - (۲) دوسرا فرقہ عابدوں کا خدا کے عذاب سے ڈر کر عبادت خدا کرتا ہے یہ غلاموں کی عبادت ہے - (۳) تیسری جماعت ایسی ہے - جو خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے عبادت میں مصروف ہے - یہ آزادوں کی عبادت ہے - اس آخر الذکر عبادت کا کیا کہنا - جن کی عبادت محض خالصاً لوجہ اللہ ہے - یہ شان محمدؐ وآل محمدؐ کی عبادت کی ہے +

مضمون نہج البلاغہ

مرزا دبیر مرحوم اسی عبادت امام حسینؑ کی نسبت کہتے ہیں - ؎

خوف سقر - نہ شوق بہشت علا کا ہے
طالب وہ دو جہاں میں فقط اک خدا کا ہے

بحرین اور کلام بلیغ وفصیح کے بے بہا موتی

یعنی کلام دبیرؔ و انیسؔ کا مقابلہ

فصل ۳ کلام دبیرؔ و انیسؔ میں نوعی تفاوت

قبل اس کے کہ میں چند نمبروں میں ان دونوں کاملوں کا کلام لکھوں یہ لکھنا واجب سمجھتا ہوں کہ اکثر کلام میں ان دونوں اُستادوں کی روش بمصداق مصرع مشہور

عام انداز کلام دبیر و انیس میں فرق

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ الگ الگ نظر آتی ہے۔ میر صاحب کا زیادہ تر خیال و کمال یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلام عام فہم سلیس فصیح ہو۔ اور ہر بات کو خوب پھیلا کر بیان کیا جائے۔ مرزا صاحب کا جوہر یہ ہے۔ کہ بڑے سے بڑا مضمون تھوڑے (مختصر) لفظوں میں نظم ہو۔ کلام میں مضامین کی بارش ہو۔ تشبیہات و استعارات و صنائع سے زیور کلام مرصع ہو۔ بلاغت کے تمام اصول پر نظر رہے۔ اسی سبب سے اُن مرحوم کے اکثر کلام کو ملک کے اہل کمال نے بلیغ مانا ہے۔ مگر از بسکہ وہ مرحوم ہر رنگ میں کہتے ہیں۔ اور اُن کا دعوے بھی یہی ہے۔ کہ ؎

ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ
اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام

پس جب کبھی وہ فصیح و سلیس کلام نظم فرماتے ہیں۔ اور واقعات کو پھیلاتے ہیں۔ تو سلاست و فصاحت اُس پیمانہ پر نظر آتی ہے۔ جس کو عام لوگ میر صاحب کا خاص رنگ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جب کبھی جناب میر صاحب مضمون آفرینی پر کمر باندھتے ہیں۔ تو مضامین تازہ کے دریا بہا جاتے ہیں۔ بلاغت کی داد دیتے ہیں۔ جس کو اہل سخن دبیر کا خاص رنگ سمجھے ہوئے ہیں۔ پس جہاں کہیں بمصداق آیہ کریمہ مرج البحرین یلتقیان یہ دونوں عظیم الشان دریا ملے ہیں۔ اُسی مقام بحرین سے یہ چند بے بہا موتی میں نے چُن لئے ہیں۔ جو خدمت ناظرین میں پیش کش کرتا ہوں +

یہ بھی کہہ دوں۔ کہ بعض معاصرین کی طرح میں نے یہ نہیں کیا۔ کہ ایک کا چست۔ دوسرے کا سست کلام تلاش کر کے درج کیا ہو۔ خاص کر میر صاحب کا وہ چیدہ و چست کلام لیا ہے۔ جس کو میر احسن صاحب مؤلف واقعات انیس یا مولوی اشہری صاحب صاحب حیات انیس۔ یا مولوی شبلی صاحب یا میرے عنایت فرما لالہ سری رام صاحب دہلوی ایم۔ اے مؤلف تذکرہ لاجواب خم خانہ جاوید نے انتخاب

فرمایا ہے۔ پس اُس کلام (میر صاحب) کا چیدہ و عمدہ ہونا یقینی ہے۔ اُس کے مقابلہ پر کلام مرزا مرحوم کا انتخاب ہے۔ جو مجھ ایسے بے بضاعت و کم فرصت نے کیا ہے۔ پس اس بنا پر ممکن ہے۔ کہ کوئی مرزا صاحب کے معتقد مجھ سے کشیدہ ہو جائیں۔ تو مَیں اُن حضرات سے عذر خواہ ہُوں۔ اور میری کم فرصتی و بے لیاقتی غالباً میری سفارش کریگی۔ اور کہیگی۔ **العذر عند کرام النّاس مقبول**۔ یہ بھی عرض کردوں۔ کہ یہ کتاب مرزا صاحب کی لائف ہے۔ پس اس میں کلام انیس مرحوم بمنزلہ مہمان ہے۔ اور مہمان کی خاطر داری واجبات سے ہے۔ اس لئے ہر جگہ مَیں نے اوّل کلام میر صاحب کو لکھا۔ مرزا صاحب کو میر صاحب سے انس قلبی تھا جس کا ثبوت تاریخ وفات انیس (مصنفہ دبیر) سے بھی ملتا ہے۔ پس اس خیال سے مجھے امید ہے۔ کہ مرزا صاحب کی رُوح بھی عمدہ کلام میر صاحب اوّل لکھ دینے سے خوش ہوگی۔ اور بھی کوئی صاحب تلامذہ یا معتقدین میں سے غالباً مجھ پر اس باب میں بھی عتاب نہ فرمائینگے۔ مَیں اس سے بہت زیادہ کلام ہر قسم و ہر موقع کا دونوں صاحبوں کا لکھ سکتا تھا۔ مگر یہ کتاب بہت بڑی ہو جاتی۔ اس لئے ان اہم نمونوں پر کفایت کرتا ہُوں۔ اگر زندہ رہا۔ اور کچھ سخن سنج آئندہ مجھ سے فرمائش کرینگے۔ تو ایک مستقل کتاب اس باب میں علیحدہ انشاءاللہ شائع کردُونگا +

مناجات و استغنا

مناجات و استغنا، رباعیات

انیسؒ	دبیرؒ
(۱) عزّت رہے یار و آشنا کے آگے	قطرہ کو رہین بحر امواج نہ کر
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے	شرمندۂ اہل دولت و تاج نہ کر
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں	یا رب قسم رُوح ید اللہ تجھے
یہ ہات اُٹھیں جب تو خدا کے آگے	اُس ہات کو اس ہات کا محتاج نہ کر

آخری وقت خدا کا سامنا

آخری وقت خدا کا سامنا

انیسؒ

(۲) آخر ہے حیات کُوچ کرتا ہُوں مَیں
رخصت لے زندگی کہ مرتا ہُوں مَیں
اللہ سے لَو لگی ہُوئی ہے میری
اُوپر کے دم اِس واسطے بھرتا ہُوں مَیں

دبیرؒ

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہُوں
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پَیدل
تابُوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

لکھنؤ کی شاندار مجلسیں

لکھنؤ کی شاندار مجلسیں

حقیر کو اُن بعض مجالس عزا کی زیارت و شرکت کا فخر حاصل ہے جن میں حضرات مرزا صاحب یا میر صاحب پڑھتے تھے حقیقت میں سامعین کی وہ کثرت ہوتی تھی کہ بعض آدمیوں کو زانو بدلنا دشوار ہو جاتا تھا [illegible] لوگ سُننے کو آتے تھے۔ دونوں کاملِ اس کثرت سامعین مجلس کی تصویر [illegible] کھینچتے ہیں:-

انیسؒ

(۳) امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
ماللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
ماشاءاللہ چشم بد دُور۔ انیس
مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

دبیرؒ

بار مجھ کو سمجھ نہ تھا ضرور آنکھوں کا
[illegible] عین سر آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ
آنکھوں [illegible] بچھاؤں نور آنکھوں کا

(۴) دُنیا بے حقیقت ہے

دُنیا بے حقیقت ہے

(ایک ردیف و یکساں قافیہ)

* نورِ آنکھوں کا کلام ہے جو نورِ چشم کی طرح آدمی کو عزیز ہوتا ہے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام شاعر [illegible]

انیسؔ	دبیرؔ
راحت کا مزہ عدو جانی نکلا دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پر انیس نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا جتنی کوشش راحت اٹھانے کے لئے کی تھی اتنا ہی جد و جہد میں رنج اٹھایا۔ کبھی کسی کام میں کامیابی بھی ہوئی۔ تو ناقص طور پر ہوئی آخرکار نامراد دنیا سے چلے +	کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا باقی سامان عیش فانی نکلا چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر اتنا بھی نہ اس کوئیں میں پانی نکلا کھانے کا ذائقہ زبان تک ہے۔ پیٹ میں پہنچکر پلاؤ۔ زردہ اور جوار سب یکساں ہے۔ دوسرے معنی مصرع اول کے یہ ہوئے۔ کہ طعام لذیذ کی بس زبانی تعریف ہوتی ہے۔ اور کچھ حاصل نہیں

باقی ہر چیز فانی ہے۔ دنیا عجب مقام ہے۔ یہاں رہ کر اگر کوئی تارک دنیا بھی ہونا چاہے۔ تو نبھ نہیں سکتی۔ اور دنیا کو چھوڑ بھی نہیں سکتا +

(۵) حال خیر مآل حضرت حرؔ میں

روایف دونوں رباعیوں کی ایک ہے مگر قافئے جدا جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

انیسؔ	دبیرؔ
جب حُر کا گنہ شاہ امم نے بخشا قطرے کو شرف بحر کرم نے بخشا گردوں سے ندا آئی کہ اے سبط نبیؐ تو نے جسے بخشا اُسے ہم نے بخشا	حُر کو کیا بخت کبریا نے بخشا یہ نام اُسے بخت رسا نے بخشا جب عذر گنہ کرتا تھا کہتے تھے حسینؑ میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا

رباعیاں دونوں اپنی اپنی طرز میں اچھی ہیں۔ میر صاحب نے گویا خود زبان قدرت سے حضرت حرؑ کو معافی کی سند دلوادی ہے مرزا صاحب نے حر کے نام میں سے ایک بات نکالی۔ کہ یہ نام بخت رسا

ہے بخشا جس کے معنی ہی آزاد کے ہیں۔ چوتھے مصرع میں کمال کر دیا ہے کہ پورا محاورہ نظم فرما دیا ہے۔ جب کوئی عذر تقصیر کرتا ہے۔ تو جواب میں معافی دینے والا یہی کہتا ہے۔ میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا۔ اس کو نثر کرنا چاہو۔ تو نہیں ہو سکتی۔ یہی لفظ رہینگے۔ اس کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ کہ دیکھنے میں تو آسان ہے۔ جواب کہنا ہو۔ تو نہیں کہہ سکتے +

موت و مابعد موت

(۶) فکر موت و مابعد موت

قافیے یکساں ہیں مگر ردیف مختلف مضمون ملتا جلتا ہے۔ دونوں رباعیاں دونوں کاملوں کے آخر عمر کے تبرکات سے معلوم ہوتی ہیں

انیسؔ	دبیرؔ
درد و الم ممات کیونکر گذرے	برزخ* کی صعوبات کٹے گی کیونکر
یہ چند نفس حیات کیونکر گذرے	تنہائی میں اوقات کٹے گی کیونکر
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیسؔ	غفلت میں دبیرؔ صبح پیری ہوئی شام
اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گذرے	دن رات ہوا، رات کٹے گی کیونکر

(۷) موت سب جھگڑے فیصل کر دیتی ہے

ناظرین! میں آپ کی دعوت میں دو قسم کے طعام لذیذ پیش کرتا ہوں۔ ایک بقول ادیب لاثانی جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ (کلام انیس) شیریں اور دوسرا (کلام دبیرؔ) نمکین ہے۔ ذیل کی رباعیوں کا مطلب وہی معلوم ہوتا ہے۔ جو اوپر میں لکھ چکا ہوں۔ کہ مرنے سے سب جھگڑے جاتے رہینگے۔ مگر دونوں کاملوں نے ان دونوں رباعیوں میں ایک صنعت خاص رکھی ہے۔ جو شاعر کو ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ چوتھا شگفتہ قافیہ نہیں مل سکتا +

---

* برزخ بعد موت کے قیام تا قیامت تک کا سخت سانحہ ہے جس کا کئی تسلیم و ترود کا زمانہ ائمہ اطہار نے فرمایا ہے + مؤلف

دبیرؒ	انیسؒ
مَیں لاکھ کہوں طبع سمجھنے کی نہیں	وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
نافہم سے تُو مجھ کو اُلجھنے کی نہیں	کشتی وہ ہُوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
ہستی کوتاہ۔ قصّۂ حرص و دراز	سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس
بے موت کے گتھّی یہ سُلجھنے کی نہیں	جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

(۸) معراج حضور سرورِ کائنات صلعم روحی فداہٗ

دبیرؒ	انیسؒ
معراج نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں	دُنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں
ہے نور کا تڑکا شب تاریک نہیں	کس راز سے یہ خلق کے آگاہ نہیں
قوسین کے قرب سے ہے ثابت ہے دبیر	باریک ہے ذکرِ قُربِ معراجِ رسولؐ
اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں	خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

دونوں کاملوں نے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ میر صاحب کی رباعی میں ایک دقیق و لطیف اشارہ آیۂ فَاَوْحیٰ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَا اَوْحیٰ کی طرف ہے۔ جس کی نسبت اپنے مقام پر طے ہو چکا ہے۔ کہ معراج کے باب میں ہے۔ اور جس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی فرمائی جو وحی فرمائی۔ اُس کو گویا عام لوگوں سے بیان نہیں فرماتا۔ میر صاحب کہتے ہیں۔ کہ یہ راہ ایسی باریک ہے جس میں سخن کو بھی راہ نہیں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ کیا تکلم ہوا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں (قاب قوسین او ادنیٰ کی مشہور آیت کی طرف اشارہ کر کے) کہ اس قرب (دو کمان) سے یہ ثابت ہوا۔ کہ اور کوئی بندہ اتنا مقرب خدا نہیں ہے۔ دُوسرے ایک لطیف معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ اللہ کے نزدیک اتنا کوئی صاحب عزّت نہیں۔ یہ روزمرّہ ہے۔ کہ اُس شخص کے نزدیک جتنا زید ہے اتنا اور کوئی نہیں یعنی دُوسرے کو یہ پایہ و اعتبار و عزّت و وثوق حاصل نہیں۔

سفر آخرت

(۹) پیری و طیّاری سفرِ آخرت و بے ثباتیٔ دُنیا

انیسؔ

اب خواب سے چونک وقتِ بیداری ہے ۔۔۔ لے زادِ سفر کُوچ کی طیّاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر یاں تک ۔۔۔ یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

دبیرؔ

آج آئے ہیں کل کُوچ کی طیّاری ہے ۔۔۔ غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دُنیا ہے عجب مقامِ حیرت نہ کھُلا ۔۔۔ یہ عالمِ خواب ہے کہ بیداری ہے

ایضاً

اب نامِ خُدا زباں پہ جاری کر ۔۔۔ غافل دمِ آخری تو ہشیاری کر
بالوں کی سیاہی پہ سفیدی آئی ۔۔۔ لے صبح ہُوئی کُوچ کی طیّاری کر

عبرت

(۱۰) عبرت عالم

انیسؔ

وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ
جو اَوج پہ تھے زیرِ زمیں آج ہیں وہ
قرآں لکھ لکھ کے وقف جو کرتے تھے
اک سُورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

دبیرؔ

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا
کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زرّیں
تربت پہ نہ اُن کی شامیانہ دیکھا

مرنا ضرور ہے

(۱۱) مرنا ضرور ہے

انیسؔ

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے

دبیرؔ

گر چاہتا ہے جینے کی خاطر۔ مرنا
ہو کر شہِ مظلوم کا زائر مرنا

ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے
غافل تجھے اک روز سفر کرنا ہے

کوئی بھی رہا ہے درمیانِ دُنیا
اوّل مرنا دبیر آخر مرنا

(۱۲) بے ثباتیِ عالم

انیسؔ

دُنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس باد مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

دبیرؔ

دُنیا زنداں ہے جائے آرام نہیں
گہوارہ۔ بجز گردشِ ایام نہیں
آنکھوں میں سفیدی و سیاہی کی طرح
جھپکی جو پلک۔ صبح نہیں۔ شام نہیں

(۱۳) عصائے پیری

ہشیار کہ وقت سازو برگ آیا ہے
ہنگام تیغ و برگ و تگرگ آیا ہے
محتاجِ عصا ہُوئے تو پیری نے کہا
چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے

پیری سے جو دال قد میں خم اور ہُوا
دم تیز روِ ملک عدم اور ہُوا
سمجھو نہ عصا۔ سُوئے عدم جانے کو
دو پاؤں تو تھے۔ ایک قدم اور ہُوا

(۱۴) شاعرانہ خودستائی (قافیہ و ردیف کی مطابقت)

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعث نغمۂ سنجی بُلبل ہُوں
کھولے نہ کبھی مُنہ جو زباں بند کروں

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلّاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

عزم زیارت

(۱۵) عزم زیارت عتبات عالیات

انیسؒ

اب ہند کی ظلمت سے نکلتا ہوں میں
توفیق رفیق ہے تو چلتا ہوں میں
تقدیر نے بیڑیاں تو کاٹی ہیں انیسؔ
کیوں رک گئے پاؤں ہات ملتا ہوں میں[۱]

دبیرؒ

گل ہو نہ چراغ عمر جلتے جلتے[۲]
ہو جائے نہ چھاؤں دھوپ ڈھلتے ڈھلتے
چلنا ہے تو چل جلد زیارت کو دبیرؔ
آ جائے نہ موت راہ چلتے چلتے

خاکساری

(۱۶) خاکساری کی مدح

انیسؒ

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

دبیرؒ

بندوں پہ کرم حضرتِ باری کا ہے
مقدور کسے شکر گذاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہالِ خاکساری کا ہے

معرفت

(۱۷) معرفت

انیسؒ

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سُو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دبیرؒ

خار و گل و بوستان و صحرا دیکھے
نیرنگ شب و روز کے کیا کیا دیکھے
اب قبرِ حسینؑ چل کے تو دیکھ دبیرؔ
دنیا دیکھی اور اہل دنیا دیکھے

۱۔ پاؤں - ہات میں صنعت تضاد ہے - مگر محض بے تکلف - ایسی بے تکلف صنعت قابل داد ہے - اور اس صورت میں اس کلام کا رتبہ بڑھ جاتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

۲۔ ناظرین! دیکھئے - دوہرے دوہرے قافیے کس بے ساختہ پن سے آئے ہیں - اتنا قادر زبان ہو جب بے تکلف قافیہ (شاعر) لا سکتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۸) قبر

انیسؔ

ہر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
مَیں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

دبیرؔ

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
ڈھانپا جو کفن سے مُنہ۔ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش[1]
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

ایضاً

مر کر بھی نہ چین زیر افلاک ملا
اک تار کفن نہ گرد سے پاک ملا
اے خانہ خراب قبر! تیری خاطر
کھویا بھی جو نقد جان کو تو کیا خاک ملا[2]

(۱۹) قافیہ و ردیف یکساں مگر مضمون ایک دُوسرے کے معکوس

اب مَیں ذیل کی دو رباعیاں دونوں کاملوں کی ایسی لکھتا ہُوں۔ جن کا قافیہ و ردیف تو یکساں ہے مگر مضمون ایک دُوسرے کے خلاف ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جو اپنے کمال کا دعوٰے کرتا ہے۔ اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ خالی اور ناقص ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ جو اہل جوہر ہیں۔ وہی اپنے کمال کا اظہار اور اس پر وہ اظہار کمال میں شکر نعمت پروردگار کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ فَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کا مفہوم ہے۔ (کہ جب خدا تجھے نعمت دے۔ تو شکریہ وغیرہ کے ذریعہ سے اُس کا اظہار کر) جو ناقص ہیں۔ وہ دعوٰے ہی کیا کر سکتے ہیں +

---

[1] قبر کی تلاش سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ بعض آدمی مدینہ منوّرہ یا کربلائے معلّٰی یا نجف اشرف یا مشہد مقدس میں قبر ملنے کی آرزو دل میں سے جاتے ہیں سالہا جہاں کی مٹی ہوتی ہے۔ وہیں ملتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

[2] یہ رباعی نہ ابتک تقسیم ہوئی ہے نہ چھپی ہے۔ جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ نے کلام مخفوظ میں سے بخشی ہے + ۱۲ مؤلف

انیسؒ

رتبہ جسے دُنیا میں خدا۔ دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا۔ دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ۔ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مطلب ظاہر ہے۔ کہ خالی برتن کو بجاؤ۔ تو خوب آواز دیگا +

دبیرؒ

گنجینہ جسے رَبِّ ہدا۔ دیتا ہے
وہ دادِ عطیّہ خدا۔ دیتا ہے
خاموش حبابوں کے ہیں ظرف خالی
دریا میں ہیں موتی۔ وہ صدا دیتا ہے

مطلب یہ ہے کہ ظرف حباب خالی ہے۔ اس لئے وہ کچھ آواز نہیں دیتا۔ دریا میں موتی ہوتے ہیں وہ شور کرتا ہے +

(۲۰) قبر

دو دو رباعیاں ایک ہی مضمون و یکساں قافیہ و ردیف میں دونوں کاملوں کی بالمقابل دیکھئے اور لطفِ سخن اُٹھائیے

انیسؒ

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئیگا انیسؒ
ہم ہوئینگے اور قبر کا کونا ہوگا

فردوس ہر اک قبر کا کونا ہوگا
مخمل ہمیں خاک کا بچھونا ہوگا
راحت دُنیا میں غیر ممکن ہے انیسؒ
آرام سے ہاں لحد میں سونا ہوگا

دبیرؒ

اِک دن پیوندِ خاک ہونا ہوگا
تنہا۔ تنہا لحد میں سونا ہوگا
اِس قبر کے پردے کا کھُلا حال دبیرؒ
جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

بیدار نصیب کو جو ہونا ہوگا
تو دامنِ کربلا میں سونا ہوگا
ہم پاؤں فلک پہ بھی نہ رکھینگے دبیرؒ
گر خاکِ شفا اپنا بچھونا ہوگا

یہ پہلی رباعیاں دونوں کاملوں کی لاجواب ہیں۔ انیس تخلص نے جان ڈال دی ہے۔ کیا عمدہ تنہائی قبر کی تصویر کھینچی ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں تنہا کے مکرر آنے نے مصرع کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مضمون کیسا نفیس ہے۔ کہ "اس قبر کے پردے کا کھُلا حال دبیر جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا" واقعی قبر میں خاک ہی اوڑھنا وہی بچھونا ہے۔ طاب اللہ رمسہما + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۲۱) مدح شیریں سخنی

انیسؔ

کس منہ سے کہوں لائق تحسیں ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر
کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

دبیرؔ

شیریں سخنی پہ مُورد تحسیں ہوں
واللہ نہ عیب ہیں نہ نکتہ چیں ہوں
سکتے ہیں ہے میرے سخن شیریں سے
شکر کا ہے کیا منہ جو کہے شیریں ہوں[1]

(۲۲) اہل بیت محمد مصطفیٰ کی تباہی

انیسؔ

دشمن جو یزید ستم ایجاد ہوا
محبوب خدا کا باغ برباد ہوا
افسوس ہے۔ کربلا میں گھر زہرا کا
ایسا اُجڑا کہ پھر نہ آباد ہوا

دبیرؔ

باراں سے ہر اک خشک شجر سبز ہوا
جو نخل چھٹا زیادہ تر سبز ہوا
پر باغیوں نے گلشن شاداب بتولؑ
ایسا کاٹا کہ پھر نہ سرسبز ہوا[2]

(۲۳) زندہ درگور ہونے کو دونوں کامل طرح یکساں قافیہ و ردیف میں بیان فرماتے ہیں

انیسؔ

کس جسم پہ بل کروں کہ شہزور ہوں میں
دیکھو کہ ضعیف صورت مور ہوں میں
تن پر یہ پڑی ہے گرد بازار کساد
ثابت ہوتا ہے زندہ درگور ہوں میں

دبیرؔ

شیریں سخنی کے فن میں شہزور ہوں میں
پر بخت یہ کہتا ہے ارے شور ہوں میں
اس ہند میں طوطی قفس کی مانند
خوبی سے زباں کی زندہ درگور ہوں میں

---

[1] اس مصرع کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ شکر کو خدا نے قوت ناطقہ ہی نہیں بخشی پھر وہ دعویٰ کیونکر کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شکر کا کیا منہ یعنی کیا تاب و طاقت ہے یہ محاورہ ہے کہ کہتے ہیں اس شخص کا کیا منہ ہے جو ایسا دعوے کرے۔

[2] انیس و دبیر کی رباعیوں میں ایک باریک فرق ہے وہ یہ کہ میر صاحب تو محض واقعہ کربلا کو باعث بربادی بتلاتے ہیں مرزا صاحب تخصیص نہیں کرتے*

* بلکہ فرماتے ہیں کہ باغیوں نے ایسا کاٹا کہ پھر باغ فاطمہؑ بر خلاف کلام باغوں کے سرسبز نہ ہوا اس میں ظلم ائمہ طاہرین جتنا کئے گئے وہ سب آ گئے رباعیاں ذیل میں ہیں

(۲۴) تعریفِ اشکِ عزا

دبیرؒ	انیسؒ
اشکِ غمِ شبیرؑ دُرِ یکتا ہے	مجلس میں عجب بہارِ چشمِ تر ہے
ہر دیدۂ حق بیں سے یہ دُر پیدا ہے	ہر لختِ جگر رشکِ گُلِ احمر ہے
بے اشکِ عزا آبروئے چشم ہے خاک	اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی
پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے	بے قدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

(۲۵) غدر ۱۸۵۷ء

حال غدر ۱۸۵۷ء میں ایک ایک رباعی یکساں قافیوں اور ردیف میں دونوں کاملوں کے کلام میں ملتی ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ باغیوں کی عملداری میں [illegible] سب گھبرائے ہیں۔ مرزا صاحب تسکین دے رہے ہیں:۔

دبیرؒ	انیسؒ
کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہُوا	افسوس زمانے کا عجب طَور ہُوا
گہ عدل گئے ظلم گئے جَور ہُوا	کیوں چرخِ کہن۔ نیا یہ کیا دَور ہُوا
اللہ وہی ہے تُو نہ مُضطر ہو دبیرؔ	گردش کب تک نکل چلو جلد انیسؔ
کیا غم جو زمیں اَور فلک اَور ہُوا	اب یاں کی زمیں اَور فلک اَور ہُوا

(۲۶) مرثیوں میں سے قریب المضمون بند

پہلے اِس سے کہ ذیل کے بند لکھوں یہ عرض کر دوں۔ کہ مضمونِ ذیل کے مُوجد مُلا محتشم علیہ الرحمہ ہیں۔ اُن کا یہ مشہور و مقبول شعر ہے۔ ؎

روزے کہ شد بہ نیزہ سرِ آں بزرگوار　　خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

انیسؒ

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب　　نکلا تھا خُوں ملے ہُوئے چہرے پہ آفتاب

(۳۰) گھوڑے کے نعلوں اور کیلوں کی تشبیہات

انیسؔ

دیکھی ہے سموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی
اک جا ہیں ستارے بھی۔ قمر بھی۔ مہِ نو بھی

دبیرؔ

نعلوں کو دبائے ہوئے کیلوں کی ضیا ہے
پامال ستاروں نے ہلالوں کو کیا ہے

(۳۱) رجز کا ایک ایک بند جو دونوں کاملوں نے ایک ہی قافیہ و ردیف میں فرمائے ہیں:-

انیسؔ

یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
کیا ڈر انہیں بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں
کوفہ تو ہے کیا شام کو اور رُوم کو لیلیں
اُلٹیں صفتِ کاہ اگر کوہ کو ریلیں
چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق اُلٹیں
یوں اُلٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق اُلٹیں

دبیرؔ

رِل جائیں پہاڑوں کو ہتیلی سے جو ریلیں
اس فاقے میں حد انگلیوں پر عرش کو لیلیں
چوگان سرگردوں سے زمیں پر ابھی کھیلیں
پر حکمِ خدا یہ ہے کہ اندوہ بھی جھیلیں
لڑنے میں بھی اپنی ہی فقط نفس کُشی ہے
بخشی گئی اُمت یہ قیامت کی خوشی* ہے

(۳۲) شاہزادی سکینہ (چار سالہ) سے امام حسینؑ چلتے وقت گویا وصیت فرماتے ہیں:-

انیسؔ

دُنیا ہے یہ۔ شادی ہے کبھی اور کبھی آرام
راحت کی کبھی صبح۔ مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس سینے پہ آرام
ضد کرکے نہ اب باپ کو رو رو کے رُلانا بی بی
جب ہم نہ ہوں۔ تم خاک پہ سو یا کرو بی بی

دبیرؔ

سینے پہ مرے سوچکیں۔ اب خاک پہ سونا
آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا
گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا
لاشہ مرا ترپیگا۔ بہت مجھ کو نہ رونا
گر چاہو۔ مری رُوح ہو۔ ناشاد۔ سکینہ
تو غم میں مرے کیجیو۔ فریاد۔ سکینہ

* قیامت کی خوشی کے ایک تو یہ معنی ہیں کہ انتہا درجے کی یہ خوشی ہے۔ دوسرے یہ کہ قیامت کو اُمت بخشی جائیگی کہ ہمارے صبر و شہادت و جہاد کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ لوگ بہ [illegible] بخشے [illegible] بہشت پاتے رہینگے۔ اس کے صدے میں جنت پائینگے ۱۲ مؤلف غفرلہ

(۳۳) شہادتِ امام حسینؑ کے قریب جناب زینبؑ گھر سے نکلی ہیں:-

انیسؒ

پردہ اُلٹ کے بنتِ علیؑ نکلیں ننگے سر
لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھیں سر کو پیٹ کر
اے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
اَمّاں قدم اب اُٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہنچا دو لاش تک مرے ہاتھوں کو تھام کے

دبیرؒ

چلتی ہیں جلد اور زمیں سوجھتی نہیں
دھڑکا یہ ہے کہ ذبح نہ ہو جائیں شاہِ دیں
آنکھیں کہیں خیال کہیں اور دل کہیں
یاں لڑکھڑائیں اور وہاں مُنہ کے بل گریں
بُو سُونگھتی ہیں خون کے تھالے جو ملتے ہیں
دل کی طرح سے کانوں کے بُندے بھی ہلتے ہیں

(۳۴) ممدُوح سے گزارش

جب حکم ہو۔ کہ مانگ لے۔ کیا مانگتا ہے تُو؟
رگڑ کر کہوں قدم پہ۔ کہ دُنیا میں آبرُو
ارشاد ہو۔ کہ اور بھی ہے کوئی آرزُو
اُس دم کروں یہ عرض۔ کہ یا شاہِ نیک خُو
سب کچھ ہے افتخارِ شہِ مشرقین میں
مسکن ملے بس قبر جوارِ حسینؑ میں

مصرع کے عوض آپ سے طوبےٰ نہیں لیتا
لو جنّتِ اعلیٰ بھی یہ ادنےٰ نہیں لیتا
اب پُوچھئے کیا مانگتا ہے؟ کیا نہیں لیتا
مَیں نام زباں سے کسی شے کا نہیں لیتا
جُز نقدِ رضا کچھ مجھے منظور نہیں ہے
خادم ترا مدّاح ہے مزدُور نہیں ہے

عرفان ہرچند میر صاحب کا خیال بھی اچھا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا خلوص دیکھئے۔ کس پایۂ عرفان پر پہنچا ہُوا ہے۔ یہ وہ نکتے ہیں جن کے سبب دبیر مانے جاتے ہیں:-

ایضاً

سب کچھ۔
مسکن جُڑا ہے افتخارِ شہِ مشرقین میں
مِلال میں قبر جوارِ حسینؑ میں

ایضاً

آنکھیں رضاؑ کے روضے میں دل کاظمینؑ میں
قالب نجف میں رُوح رواقِ حسینؑ میں*

* اس موقع پر بھی مرزا مرحوم نے دُعا تعیین کی ہے بلکہ دل کی تمنا بیان کر دی ہے چنانچہ اوپر کے چاروں مصرعے یہی ہیں۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ اے کریم دنیا کو شوق منصبِ اعلیٰ ہے اے کریم۔ پر تیری بارگاہ میں کیا ہے اے کریم بندے کو آرزوے سلاسل ہے اے کریم۔ آنکھیں رضا کے الخ + ۲۴ شوق حقیر۔

زلف و رُخ

(۳۵) زلف و رُوئے اقدس کی مدح میں دو دو بند دونوں مدّاحوں کے سُنئے :۔

انیسؒ

پیدا ہے زلف و رُو سے منوّر سے شانِ رب
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف عید اور شبِ قدر میں ہے کب
ہے دو طرف دو چین و ختا بیچ میں حلب
رستہ نہ بھُول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

پہلو میں دن کے رات رہے شانِ کارساز
یوسفؑ جو دیکھے تو جھکائے سرِ نیاز
افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز
زیبا ہیں گورے رُخ پہ غضب گیسوے دراز
اب تو نظر پہ یہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت ہے دن تو کم نہ ہُوا۔ رات بڑھ گئی

دبیرؒ

لاریب جرم ہے جو کہیں چاند رُخ کو ہم
ہے چاند میں تو جرم یہ بے جرم لَاجَرَم
رُخ ہے وہ صبحِ شمس ہیں جس کے شہِ امم
گیسو وہ شب کہ قدرِ شبِ قدر جس سے کم
گیسو و رُخ تو قدرتِ داور دکھاتے ہیں
ہر وقت شام صبح۔ برابر دکھاتے ہیں

شرحِ بزرگیٔ رُخ و کاکل دراز ہے
نسبت سے صبح و شام کو یہ امتیاز ہے
قصر نماز گو کہ سفر میں جواز ہے
پر واں بھی صبح و شام کی پوری نماز ہے*
عقدے فضائل رُخ و کاکل کے وا کئے
دونوں فریضے وقتِ فضیلت ادا کئے

گرمی

(۳۶) گرمی روزِ عاشور کا بیان

انیسؒ

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا
وہ دو پہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا

دبیرؒ

وہ دھوپ کہ مرغانِ ہوا کرتے ہیں نالا
بس ہاتھ دھرا قبضے پہ اور پڑ گیا چھالا

* رُخ کو صبح سے اور گیسو کو شام سے تو عام شعرا تشبیہ دیتے ہیں۔ ہاں دونو کاملوں نے بھی دی۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے۔ بات میں سے بات کیا نکالی ہے۔ کہ صبح کی دو رکعتیں ہیں اور شام (مغرب) کی تین رکعتیں ہیں۔ جو سفر میں بھی قصر (کم) نہیں ہوتیں۔ اور نمازیں (یعنی ظہرین کی) سفر میں قصر (کم) ہو کر ۴ چار چار رکعت سے دو ہی دو رہ جاتی ہیں۔ اسکی حسن تعلیل کتنی معقول ہے۔ کہ صبح و شام کو زلف و رُخ امام سے نسبت ہے۔ اس لئے یہ بندگی حاصل ہے۔ اللھم صل علی محمد و آل محمد ۰ ۲ شوال حقیر۔

ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا
اور تن پہ حرارت سے وہ ہتیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہِ مظلومؑ کھڑے ہیں
وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے
اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دد و دام ہیں منہ آب میں ڈالے
ریتی پہ دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی بھی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

بریاں ہوا۔ دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا
اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھاڑ ہے جسمِ شہِ دیں پر
نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا
بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا
پر اوجِ امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس بڑی ہے

گرمی اور شاعرانہ تخیلات

(۳۷) دوسرے بحر کے دونوں صاحبوں کے مرثیوں سے تین تین بند گرمی کے بیان میں شاعرانہ تخیلات

انیسؔ

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتا تھا دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں
گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

دبیرؔ

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب
گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب
خطِ غبار سے ہے لبی۔ ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ ستونوں کی چھاؤں میں
مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی
رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی

منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی
وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی
آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوز جگر سے مردم آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

(۳۸) اعلیٰ و ادنےٰ یا حق و باطل کا مقابلہ

اعلیٰ و ادنےٰ یا حق و باطل کا مقابلہ

کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو۔ اُسے موسیٰؑ نہیں کہتے
ہر ہات کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

ساماں سے کوئی صاحب ایماں نہیں ہوتا
ہر اہل عصا۔ موسیٰؑ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماںؑ نہیں ہوتا
آئینہ گر اسکندر دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشّہ کا ہُما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

(۳۹) امام حسینؑ کی مظلومی و بیکسی کا سماں (سین)

فصل بیکسی کا سماں

انیسؒ

آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے

دبیرؒ

مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ

ظلم کی چاند پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہے
اُس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجہ نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ۔ ہے شور ستمگاروں میں

خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے
ہے جبیں چاند سی پُر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بکمر زخمی ہے
تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آ کر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آ جاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سرِ پاک جھکا جاتا ہے
گردِ زہراؑ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امامؑ دو جہاں گرتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلومؑ ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور اک سر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسینؑ
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسینؑ
دل شکستہ و جگر افگار ہے مظلوم حسینؑ
نیزے کاری ہیں لگے زخم ہیں شمشیروں کے
نیزوں کے زخموں میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

سینہ زخمی ہے بدن زخمی کلیجا زخمی
اُنگلیاں زخمی ہیں اور ساعدِ زیبا زخمی
ہونٹ زخمی ہیں گلا زخمی ہے ماتھا زخمی
نام کس عضو کا لوں میں ۔ ہے سراپا زخمی
ایسے زخمی کو تو کافر بھی پلائیں پانی
حیف سیّد سے مسلمان چھپائیں پانی

دل کا یہ حال ہے پژمُردہ ہوا جاتا ہے
ایک دریا ہے کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کئی بار غش آ جاتا ہے
کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے
تیر ایک ایک جگر میں جو قریبِ دل ہے
سانس کی آمد و شد سینے میں کیا مشکل ہے

تن سے گر کھینچتے ہیں ایک بھی پیکاں شبیرؑ
اتنے عرصے میں لگاتے ہیں عدو سینکڑوں تیر
کھا کے تیروں کو اگر کرتے ہیں قصدِ تکبیر
پاس سے نیزے لگاتے ہیں دہن پر بے پیر

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اُٹھا سکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں
کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلاکر
بہرِ حق پانی کا اِک جام پلا دو لاکر
اہلِ کیں کہتے ہیں یہ تیغ ستم چمکا کر
آبِ شمشیر پیو۔ برچھیوں کے پھل کھاکر
یہ سخن سُن کے بھی غُصّہ نہیں فرماتے ہیں
یاس سے سُوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے ہیں

ایک پیکاں جو سینے سے گذر جاتا ہے
خُون کے روکنے کو دُوسرا تیر آتا ہے
کیا رحیمی ہے کہ غُصّہ نہیں آتا ہے ذرا
کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں اُمّت پہ فدا
کیا تحمّل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکرِ خُدا
کیا شجاعت ہے کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا
تیر بھی نیزے بھی سینے پہ لئے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی اُمّت کو دئے جاتے ہیں

(۴۰) مناجات اور عاشق و معشوق میں راز و نیاز کی باتیں

عاشق و معشوق کے راز و نیاز

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِّ غفور	انیس	تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بے جرم و خطا تیغوں سے چُور	//	بات اُمّت پہ اُٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں مَیں	//	پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہوں مَیں
روزِ عاشور تھا جب کہ گلستانِ حسینؑ	دبیر	غم سے بھائی کے ہوا چاک گریبانِ حسینؑ
قتلِ اکبرؑ سے ملے خاک میں ارمانِ حسینؑ	//	جز اجل کوئی نہ تھا رن میں نگہبانِ حسینؑ
حق سے کہتے تھے نہیں رنج تباہی مجھ کو	//	صبر دے پیاروں کی فرقت میں الٰہی مجھ کو
اب نہ قاسمؑ مرا جیتا ہے نہ اکبرؑ باقی	//	نہ علمدار سلامت ہے نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی	//	اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی
قتل اصغرؑ ہو مرا سر بھی جُدا ہو جائے	//	اس امانت سے بھی شبیرؑ ادا ہو جائے

* ناظرین باتوقیر! مضامین کی خوبی کے ساتھ ساتھ دونوں بزرگواروں کے یہاں سلاست و صفائی بندش کو بھی دیکھتے جائیے۔ دونوں باکمالوں نے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ مضامین کے دریا بہا دئیے ہیں۔ ۱۲ مؤلف۔

یاخدا تجھ پہ میں صدقے مرا لشکر بھی نثار	بیت	دل فدا۔ جاں فدا۔ رُوح فدا۔ سر بھی نثار
علی اکبرؑ بھی نثار اور علی اصغرؑ بھی نثار	〃	تجھ پہ باقرؑ بھی فدا۔ عابدؑ مضطر بھی نثار
مَیں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا	〃	سب تری راہ میں خوش ہو کے لُٹایا مولا
وہ کلیجے پہ دھرے ہات پڑے ہیں اکبرؑ	〃	ہے وہ عباسؑ دلاور۔ وہ حسنؑ کا دلبر
ایک اک پیارے کو قرباں کیا گن گن کر	〃	کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور
تو نے دولت تھی جو مجھ خاک نشیں کو سونپی	〃	وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی
قتل عباسؑ ہوئے مَیں نے کیا شکر ترا	〃	پر کمر ہو گئی خم اس میں گنہ میرا کیا
نکلا اکبرؑ کا بھی دم آنسو نہ میرا نکلا	〃	کی بدی نانا کی اُمت نے نہ بد مَیں نے کہا
یہ بھی بندے ہیں ترے مَیں بھی ترا بندہ ہوں	〃	دشتِ غربت میں پریشاں ہوں پراگندہ ہوں
تو نے بچپن میں مرے ناز اُٹھائے یارب	بیت	وہ عنایت کیا جو مَیں نے کیا تجھ سے طلب
تیرا محبوبؐ بنا عید کو میرا مرکب	〃	روزہ رکھا تو چھپا مہر۔ نمایاں ہوئی شب
بھوک میں خلد کے میووں سے مجھے شاد کیا	〃	خواہش بچہ آہو سے بھی آزاد کیا
تو نے بچپن میں کھلائے ثمرِ خلد بریں	بیت	اب اگر تیسرا فاقہ ہے نہیں کچھ مَیں حزیں
چوسی چھٹپن میں زبان نبی عرش نشیں	'	آج اگر پینے کو پانی نہیں۔ تو خیر۔ نہیں
ایک دن حلق تھا اور فاطمہؑ کے شیر کی دھار	〃	آج راضی ہوں گلے پر چلے شمشیر کی دھار
اب اگر یہ بھی تری مصلحت اے رب قدیر	بیت	ہو رواں پیاس میں اب حلق پہ پیرے شمشیر
میرے مولا بسر و چشم ہے حاضر شبیرؑ	/	حکم حاکم میں یہ طاقت ہے کہ ہو مَیں تاخیر
جلد گردن پہ رواں خنجر بُرّاں ہوئے	〃	اے خوشا وہ جو تری راہ میں قرباں ہوئے
تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بار خدا	بیت	ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطر عاشق جاں باز ہے البتہ جدا	〃	اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پہ تیغ رہے سینے پہ جلّاد رہے	〃	لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

غم نہیں کچھ بھی مجھے بیکس و بے یار ہوں میں	دبیرؒ	تو مددگار ہے مختار ہے ناچار ہوں میں
زیرِ شمشیرِ گلا رکھنے کو طیار ہوں میں	〃	وقتِ مشکل بھی عنایت کا طلبگار ہوں میں
تیرے سجدے میں یہ سر تن سے جدا ہو جائے	〃	عہدِ طفلی کا جو وعدہ ہے وفا ہو جائے
دُرِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا	دبیرؒ	لے گئیں نذر کو داغِ غمِ احمدؐ زہراؑ
سرخرو ہے ترے دربار میں بابا میرا	〃	دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے کئے تجھ پہ فدا
آج شبیرؑ بھی ان سب کے مقابل ہو جائے	〃	سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے
سختیاں مرگ کی کر اپنے کرم سے آساں	انیسؒ	لب پہ تکبیر ہو جب حلق پہ خنجر ہو رواں
دل میں ہو یاد تری بند ہو جس وقت زباں	〃	دم بھروں تیرا اسی وقت نکلنے لگے جاں
بعد چہلم جو مجھے قبر میسر ہوئے	〃	زخمی تن کو نہ فشار اے مرے داور ہوئے
سر مرا کٹ کے یقیں ہے سوئے کوفہ جائے	دبیرؒ	پھر یہ محتاج بھلا نذر تری کیا لائے
تیر اصغر کو گلا لوں پہ اب کھلوائے	〃	درجۂ صبر جو باقی ہے وہ سب ہات آئے
پیش کس شے کو لاشۂ اصغر ہی بھلا لائے حسینؑ	〃	ہات خالی ترے دربار میں کیا آئے حسینؑ
رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے دل اے بار خدا	انیسؒ	بندگی کا تری حق تھا وہ ادا ہو نہ سکا
خوف محشر سے بدن کانپتا ہے سر تا پا	〃	ہوگی اعمال میں پرسش تو کہونگا میں کیا
کوئی تحفہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ	〃	ہات خالی ترے دربار میں آتا ہے حسینؑ
سب مرے نور نظر قتل ہوئے پیش نگاہ	دبیرؒ	بندے نے شکر کیا یا کہا اِنّا لِلّٰہ
جب کہ ہو مرضیٔ معبود سے بندہ آگاہ	〃	پھر ستم پر جو ستم ہو نہ کرے منہ سے آہ *
آگے کنبا تھا نہ عریاں سر خواہر دیکھوں	〃	پر جو تو خوش ہو تو زینبؑ کو کھلے سر دیکھوں
تقویت دل کو کرم سے ہو ترے رب جہاں	انیسؒ	نہیں مایوس کہ رحمت ہے تری بے پایاں

* مشہور آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ مطلب یہ کہ خاص جنس کی شان میں فرماتا ہے کہ تم نہیں چاہتے مگر جو خدا چاہتا ہے ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

مشکلیں بندوں کی کر دیتا ہے دم میں آساں — انیسؔ — شکر الطاف و عنایات میں قاصر ہے زباں
عاصیوں سے بھی محبت نہیں کم کرتا ہے — ″ — جرم وہ کرتے ہیں تو لطف و کرم کرتا ہے[1]

اِک طرف قید رسن میں ہوں حرم زینب سے — دبیرؔ — اِک طرف آگ سے جلتے ہوں یہ خیمے سارے
اِک طرف شمر سکینہ کو طمانچے مارے — ″ — ظلم اُمّت پہ یہ ہوں اور میں کروں نظارے
جب کہیں آلِ نبیؐ مجھ سے کہ امداد کرو — ″ — میں کہوں اُن سے کہ اللہ کو تم یاد کرو

میں تری راہ میں مظلومی سے ہوتا ہوں فدا — انیسؔ — ہے تو آگاہ کہ دو دن کا ہوں بھوکا پیاسا
چاہتا ہوں میں یہی اپنی شہادت کا صلہ — ″ — مغفرت اُمّت عاصی کی ہو۔ یا بارِ خدا
ہے گوارا مجھے جو مجھ پہ اذیت ہوئے — ″ — ان کو دُنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی راحت ہوئے

قتلِ اکبرؑ تو مرا ہو چکا اے ربِّ غفور — دبیرؔ — اب اگر تجھ کو نہ ہو نسلِ امامت منظور
ذبح عابدؑ کو کروں آپ میں بانوؑ کے حضور — ″ — مثلِ اسمٰعیلؑ اور وہ ذبیح آج سے ہوئے مشہور
ہات رک جائے گلے پر تو قلم ہات کروں — ″ — ہات سے ذبح کروں لب سے مناجات کروں

بندہ پرور! میں ہوں اک عبد غریب و احقر — ″ — بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ ملکِ عدم میں تو مرا ہو رہبر — ″ — نہ تو اس راہ سے آگاہ۔ نہ منزل کی خبر
شوق بھی رعب بھی مجھ کو تری درگاہ کا ہے[2] — ″ — سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

تین دن تڑپا ہے یاں پیاس کی شدت سے حسینؑ — ″ — اب ہو سیراب ترے قلزمِ رحمت سے حسینؑ
ڈر نہ جائے ملک الموت کی ہیبت سے حسینؑ — ″ — یا خدا کانپتا ہے قبر کی وحشت سے حسینؑ
آج تک ساتھ رہا بیٹے کا اور بھائی کا — ″ — سخت اندیشہ ہے اب قبر کی تنہائی کا
وحشتِ قبر۔ نکیرین کا ڈر یا اللہ — ″ — گھر نیا۔ لوگ نئے۔ اور میں ناواقف۔ آہ

---

[1] سبحان اللہ کیسی پاکیزہ زبان ہے اور کیا بندش کی صفائی ہے + مؤلف حقیر۔

[2] دیکھیے عبدیت کے ساتھ عشقِ الٰہی کی شان کس خوبصورتی سے دکھائی ہے۔ اِدھر تو شوقِ لقائے پروردگار ہے۔ اُدھر اُس کا رعب غالب ہے۔ بس یہی تو ہر شاعر کو نہیں سوجھتی +

سہل ہو راہ صراط اور ہو امت ہمراہ	دبیرؒ	دنیا خورشید قیامت سے قیامت میں پناہ
آگ سے خیمے جلیں دھوپ سے دلدار جلیں	″	پر دمِ حشر نہ دوزخ میں گنہگار جلیں
اب یہ حسرت ہے کہ قاتل جو چڑھے سینے پر	″	کیو نانا سے کہ اس وقت وہ لیں میری خبر
جب مرا شوکھا گلا ہوئے بزیر خنجر	″	بھیجو فاطمہؑ کو آکے رکھیں گود میں سر
مشکل آساں مری حیدرؑ کرار کریں	″	شمر تو ذبح کرے اور علیؑ پیار کریں
ناگہاں آئی یہ آواز خدائے کونین	″	بس مرے بندۂ بیکس مرے مظلوم حسینؑ
شکر وہ کرتا ہے تو آج بصد شیون وشین	″	مجھ کو شرم آتی ہے اے فاطمہؑ کے نور العین
تشنہ کامی میں نہیں کام لب دریا سے	″	آفریں اے مرے چوبیس[۲۴] پہر کے پیاسے*
عرض کرتے تھے یہ خالق سے شہ بندہ نواز	انیسؒ	یک بیک عالم بالا سے یہ آئی آواز
اے مرے شبیرؑ کے فرزند نبیؐ کے دمساز	″	تجھ سے ہم خوش ہیں پذیرا ہے ترا عجز و نیاز
مرد ہے عاشقِ کامل ہے وفادار ہے تو	″	جو کہا وہ ہی کیا۔ صادق الاقرار ہے تو
اے حسینؑ اپنی ہی قدرت کی میں کھاتا ہوں قسم	دبیرؒ	تیرے غمخواروں کو محشر میں نہ کچھ ہوئیگا غم
سختی موت غلاموں پہ ترے ہوئیگی کم	″	قبر ہے تعزیہ داروں کو ترے باغ ارم
تو عبث موت کی سختی سے ہراساں ہے حسینؑ	″	ملک الموت ترا تابع فرماں ہے حسینؑ
تو بھی مقبول ہے اور تیری عبادت بھی قبول	انیسؒ	یہ اطاعت بھی ہے مقبول یہ طاعت بھی قبول
عاجزی بھی تری مقبول شہادت بھی قبول	″	تری خاطر سے ہمیں بخشش امت بھی قبول
ہم نے خیل شہدا کا تجھے سردار کیا	″	امتِ احمدؐ مختار کا مختار کیا
بس یہی ہے ملک الموت کے آنیکا مآل	دبیرؒ	کہ تری روح کا واجب ہے اُسے استقبال
بے ترے حکم ہلانے کا نہیں وہ پر و بال	″	سب خدائی تری محکوم ہے زہراؑ کے لال
راہ حق میں تجھے ثابت قدمی ہے شبیرؑ	″	میرے دربار میں کس شے کی کمی ہے شبیرؑ

* کیسی بے تکلف سلیس نظم ہے۔ جس سے نثر بھی شرمندہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دوستداروں کا ترے گلشنِ جنّت ہے مقام	انیس رح	تا ابد سایۂ طوبےٰ میں کریں گے آرام
ہونگے محشور ترے ساتھ محب تیرے تمام	〃	تجھ پہ جو روئینگے۔آنچ اُن پہ ہے دوزخ کی حرام
غم نہ کھا اہلِ جناں تیرے محب سارے ہیں	〃	تو بھی پیارا ترے پیارے بھی ہمیں پیارے ہیں
واہ کس مرتبہ۔خوش۔خالقِ اکبر کو کیا	دبیر رح	وعدہ اپنا ہی تھا پر صدقے بہتّر کو کیا
مرحبا۔ہم سے نہ پیارا علی اکبرؑ کو کیا	〃	پیشکش کے لئے تجویز اب اصغرؑ کو کیا
نذر مقبول ہے آؤ ہمیں دے جاؤ حسینؑ	〃	میرے دربار سے جو چاہو سو لے جاؤ حسینؑ
ہیں ہر اک رنج سے محفوظ ترے تعزیہ دار	انیس رح	سختیٔ مرگ نہ اُن پر ہے نہ ایذائے فشار
دمِ مردن نظر آئیگا علیؑ کا دیدار	〃	قبر میں گلشنِ فردوس کی دیکھیں گے بہار
دارِ دُنیا ہی میں جو کچھ ہے انہیں ایذا ہے	〃	آنکھ جب بند ہوئی۔پھر درِ جنّت وا ہے *
حُلّے فردوس کے بانٹیگا تو ہی روزِ جزا	دبیر رح	پر کفن تیرے ہی مُردے کو نہیں ملنے کا
بلکہ پامال ترا لاشۂ بے سر ہوگا	〃	وحشتِ قبر سے اے سبطِ نبیؐ تجھکو کیا
خاک سے لاشۂ مجروح اُٹھائیگا خدا	〃	پہلوئے عرش میں پاس اپنے جگہ دیگا خدا
تجھ سا عابد ہے کوئی اور نہ کوئی ہوگا	انیس رح	نیزہ کھا کر نہ کسی نے کبھی یوں شکر کیا
طاعتِ خلق سے اک سجدہ ہے افضل تیرا	〃	عرشِ اعظم پہ ملائک تری کرتے ہیں ثنا
سالہا گھر میں بھی بخشت نہیں خدا تو نے کیا	〃	بندگی کا تھا جو کچھ حق وہ ادا تو نے کیا
عرش کو تھامے ہوئے پہیہ۔تو ننا روزِ شمار	دبیر رح	کیجیو اپنے محبّوں کے لئے استغفار
اپنے نانا کی بھی اُمت کے تمہیں ہو مختار	〃	چاہو جنّت دو اُنہیں چاہو کرو داخلِ نار
جز خدا۔اور کوئی کیا تری عزّت جانے	〃	ہم نے مالک کیا۔تم جانو اور اُمّت جانے
حشر تک روئیگا مظلومی پہ تیری عالم	انیس رح	تیرا ماتم نہیں ہونے کا جہاں سے کبھی کم
روضۂ پاک کو تیرے یہ شرف بخشیں گے ہم	〃	جمع سب تیری زیارت کو ملک ہونگے بہم

* اے سبحان اللہ۔آنکھ بند ہونا اور درِ جنت کھلنا کیا ساتھ ساتھ کس سلاست و فصاحت سے ادا فرمایا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بہ بریں عرش سے رتبے میں سوا ہوئیگی	انیسؒ	خاک تربت کی تری خاک شفا ہوئیگی
بولے شہ سن کے یہ فرمان خدا کا مضموں	دبیرؒ	سب تری بندہ نوازی ہے یہ کس لائق ہوں
خوں بہا کیسا۔ مجھے تو نہیں کچھ دعوے خوں	"	کیا مرا رتبہ جو مختاری محشر میں لوں
بس یہ کافی ہے کہ مقبول شہادت ہوئے	"	تو رضا مند ہوا اور بخشش امت ہوئے

(۴۱) حال شیریں کنیز آزاد کردہ جناب امام حسین علیہ السلام

مشہور ہے۔ کہ یہ شیریں جناب شہربانو کی کنیز تھیں۔ کہ ان کو جناب شہربانو اور جناب امام حسینؑ نے آزاد کر دیا تھا۔ (ہر چند روایت ضعیف ہے۔ مگر سب نامی مرثیہ گویوں نے نظم کی ہے)۔ دبیرؒ و انیسؒ کے دو مرثیوں سے جو ایک بحر کے ہیں۔ چند بند لکھتا ہوں۔ جس سے دونوں اُستادوں کے واقعہ نگاری۔ کے جوہر ناظرین کو نظر آئیں۔ موقع یہ ہے کہ شیریں راہ شام میں رہتی ہے۔ اُس کو کسی نے خبر دی ہے۔ کہ امام حسینؑ مع اہل و عیال و رفقا آتے ہیں۔ وہ دعوت کی طیاریاں کر رہی ہے اور خوش ہو رہی ہے۔ کہ میرے آقا فرزند رسول صلعم میرے مہمان ہونگے:۔

انیسؒ

یہ کہکے اُس نے فرش کیا۔ گھر میں سر بسر
مؤمن کے دل کی طرح مصفّا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر
تکیوں کو صاف کرکے لگایا اِدھر اُدھر
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نُور ہے
یہ آمد امام زمن کا ظہور ہے

دبیرؒ

مصروف اہتمام ہوئی پھر وہ باوفا
جھاڑا۔ بہارا۔ گھر کو۔ کیا فرش جا بجا
مانند سنگ فرش فلک ہمکے جبہ سا
آ بیٹھے دُور دُور ادب سے جُدا جُدا
کیا فرش تھا کہ عرش کو جائے سخن نہ تھی
پیشانی سخی کی طرح اک شکن نہ تھی

انیسؔ

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبرؑ کے واسطے
جھولے کی جا۔ یہ ہے علی اصغرؑ کے واسطے
یہ گھر ہے شاہ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشیں پہ امام زمن رہیں
حجرہ یہ اس لئے ہے کہ دُولھا دُلھن رہیں

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی
تحفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزند فاطمہؑ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امامؑ
بھر بھر کے آب سرد کے رکھدو سبھی جام
لبریز آب گرم کے کردو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤنگی
ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دُھلاؤنگی

دبیرؔ

مکان

بیت الحرم وہ گھر تھا کہ تھی آمد حرم
ہر سنگ فرش تھا حجر الاسود حرم[۵۱]
آئینوں سے حلب تھا تو گلدستوں سے ارم
ہر شے قرینے سے نہ زیادہ کہیں نہ کم
نظارۂ حسینؑ کے ارماں دکھا دے
پلکوں کی چلمن آنکھوں کے پردے لگا دے

ساز و سامان

مسند بچھائی بہر شہنشاہ مشرقین
تکیہ پر ہما کے لگائے بزیب و زین
کیا جانتی تھی یہ ہوگا یہاں ماتم حسینؑ
سُن پایا تھا صغیرہ ہے بانو کا نور عین
دالان میں درست کیا گاہوارے کو
بولی میں خود جھلاؤنگی بی بی کے پیارے کو

گھر کو بنا سنوار چکی جب وہ نیک نام
حجرے میں پھر سلیقے سے کھانے چُنے تمام
شربت صراحیوں میں بھرا دھو سائے جام
ہے ہے نہ یہ خبر تھی کہ پیاسے موئے امامؑ
میوے چُنے طبقچوں میں اکبرؑ کے واسطے
کوزوں میں دودھ بھر دیا اصغرؑ کیواسطے

۵۱ بیت الحرم خانہ کعبہ اور حجر الاسود اُس قابل تعظیم پتھر سے مراد ہے جسکو خانہ کعبہ میں بوسہ دیتے ہیں۔ حرم سے مصرع اول میں اہل و عیال امام حسینؑ مراد ہیں۔ اور مصرع ثانی میں حرم کعبہ کے معنی پر ہے۔ اختلاف علمیت سے ایطا نہیں رہا +

۵۲ مرزا صاحب کے بند میر صاحب کے قریب المضمون بندوں کے مقابلہ میں لکھنے کی ضرورت سے مَیں نے آگے پیچھے کر دئے ہیں۔ اصلی ترتیب نہیں رہی ہے۔ مرزا صاحب کے مرثیہ کے موافق شیر میں سن چکی ہے کہ امام حسینؑ منزل پر آ چکے ہیں۔ اور طبل مقامی کی آواز بھی آ چکی ہے۔ اس لئے اُس [illegible] +

ہمسائیاں

انیسؔ

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار
اب کیجیو زیارت سلطان نامدار
ہے باغ فاطمہؑ پہ عجب حسن کی بہار
رشک ریاض خلد ہے ایک ایک گل عذار
سب نونہال گلشن دیں لاجواب ہیں
قد سرو باغ خلد ہیں رخ آفتاب ہیں

ہمسائیوں سے شیریں کہہ رہی ہے
شمشاد بوستان پیمبر کو دیکھیو
سرور ریاض حضرت شبرؑ کو دیکھیو
کیا نوجواں ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو
سب ایک سمت تم علی اکبرؑ کو دیکھیو
ہوگا کبھی یہ حسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اس جری میں محمدؐ کے نور کا

دعا ہے رکھے اسے صمد اسی سال برقرار
نام خدا ہے شادی کے قابل وہ گل عذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہیں ماں نثار
سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیر تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیرے کا چاند ہے

دبیرؔ

ہمسائیاں کھڑی ہوئیں ہر سو کہ ہم بھی آئیں
دن رات مانگتے تھے اسی روز کی دعائیں
پلکوں سے گھر کو جھاڑیں تو فرش آنکھوں سے بچھائیں
صدقے کیا تھا جو سر و سامان کہو وہ لائیں
پوچھو تو اغنیا سے یہ دولت بھی پائی ہے
اے حسینؑ اب ترے گھر میں خدائی ہے

ہمسائیاں شیریں سے کہہ رہی ہیں
آیا ہے جن کی شان میں قرآں وہ آتے ہیں
کعبہ کے ہیں جو قبلۂ ایماں وہ آتے ہیں
جن کے گدا ہیں قیصر و خاقاں وہ آتے ہیں
فطرس ہے جن کا بندۂ احساں وہ آتے ہیں
شیریں خدا کے پیارے کے پیارے حسینؑ ہیں
مالک ہمارے اور تمہارے حسینؑ ہیں

تم سے سفارشوں کے ہیں امیدوار ہم
پائیں سلام حضرت زینبؑ کی بار ہم
دیکھیں تمہاری بی بی کا عز و وقار ہم
ایران کی شاہزادی ہے کیسی نثار ہم
ہمسائے کے حقوق ادا آج کیجیو
ہم کو بلا کے رتبۂ معراج دیجیو*

* ہمسائیوں سے باتیں کرنے میں دونوں کاملوں نے کمال کیا ہے۔ میر صاحب نے کس عمدگی سے باتیں نظم فرمائی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں باتیں کر رہی ہیں مرزا مرحوم نے ایک مبالغہ کا حق ادا کیا ہے۔ مع یہ کہ شیریں سے عورتوں نے جو باتیں کی ہیں۔ وہ صرف زنان اہل بیت کی نسبت ہیں یا عورتوں کی عام عادت یہی ہے۔ کہ زیادہ تر وہ دلہنوں ہی کی باتیں پوچھتی ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

انیسؒ

شیریں ہمسائیوں سے کہہ رہی ہے
اب خیریت سے گذریگا اٹھارھواں جو سال
شادی کرینگی بیٹے کی بانوئے خوش خصال
زینبؑ کو اُس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال
ہر دم یہی دُعا ہے کہ دُولھا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و رُوم سے
شادی "خدا جو چاہے" تو ہوگی دھوم سے

پر ہاتھ جوڑتی ہُوں کہ تنہا ہی آئیو
پردہ نہ دخترانِ علیؑ کا بھلائیو
یا رب ہنسی خوشی مرے سب میہماں رہیں

دبیرؒ

شیریں ہمسائیوں کو جواب دیتی ہے
اُس نے کہا "مَیں سعی کو حاضر ہوں عذر کیا"
پر بیبیوں کا چلن سب سے ہے جُدا
ارماں امیر زادیوں کو گو ہُوا رہا
مہمان کسی کے گھر نہ گئیں بنتِ مرتضٰی
تم سب کا اشتیاقِ زیارت سُناؤنگی
زینبؑ کا حکم ہوگا۔ تو بیشک بُلاؤنگی

لڑکوں کو اپنے ساتھ خدا را نہ لائیو
مجھ کو عتابِ آلِ نبیؐ سے بچائیو
مَیں دم بدم فدا رہُوں وُہ مہرباں رہیں

انیسؒ شیریں کی شوہر سے باتیں دبیرؒ

انیسؒ

جب ڈھل گئی اُسے انہیں باتوں میں دوپہر
شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکو سیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر
اُترنے کہاں کسی سے مفصّل سُنی خبر
بستی سے ساتھ لیکے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو*

وہ بولی تعابل اُن کے نہ کھانا ہے نہ مکاں
ہر طرح سرفراز کرینگے شہِ زماں
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو*

دبیرؒ

ان کی جناب ہے۔ اے اللہ کی جناب
ذرّہ ذرا سی مہر سے بنتا ہے آفتاب
جن کو وہ چاہیں مُہرِ سلیماںؑ ہو دستیاب
خاصہ حضور کے لئے تیار کر شتاب
دیدار سے اب آنکھ کی تدبیر لڑتی ہے
لے سُن۔ وہ چوبِ طبل مقامی پہ پڑتی ہے

فرش اُن کا عرش ہے اور غذا میوۂ جناں
سامان تھوڑا تھوڑا میں کرتی ہوں سب یہاں
لونڈی کے گھر میں آتے ہیں عدہ وفائی کو

*یہ مصرع "جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو" دونوں بزرگوں کے یہاں توارد ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں پہلے کس نے فرمایا۔ نہ یہ خبر کہ ایک کے مصرع کی دوسرے کو خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ مرزا صاحب کے بند کا پہلا مطلع کلام میر صاحب میں مقدم مؤخر دیا ہے میر صاحب نے تو خیال نظم فرمایا ہے کہ جب دوپہر ڈھل گئی اور امام حسینؑ نہ آئے جب شیریں نے شوہر کو بھیجا۔ مرزا صاحب نے اس طرح نظم فرمایا ہے کہ شیریں کو عبا کر سینے خبر دی کہ امام ... اور اہلبیت کے آگئے ہیں۔ اور جب شیریں نے آ کر بیت کہا کہ ع زینبؑ کا حکم ہوگا۔ تو انہوں نے جواب با دست ...

باسمہٖ سبحانہٗ ونحمدہٗ ونصلی ونسلّم

باب پانزدہم طرزِ کلام دبیرؔ کا مقابلہ کلام ملٹن شاعر سے

مضمون عطیۂ مخدومی ومحسنی نواب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ۔ المتخلص بہ حامدؔ

جناب سیّد صاحب مخدوم ومکرم بندہ جناب سیّد افضل حسین صاحب ثابتؔ زاد لطفہ ومحبّتہ تسلیم +

حسب الحکم حضرت دبیرؔ کے کلام کا موازنہ کرتا ہوں۔ لیکن صرف ایک مشہور انگریزی شاعر کے کلام سے +

جناب میر صاحب میری رائے میں ایک عمر چاہئے۔ جس نے برسوں کلام کو پڑھا ہو۔ اور وہ بھی ایک شاعر کے کلام کو وہ اُس شاعر کے کلام پر لکھ سکتا ہے*۔ مثلاً جن صاحبوں نے یورپ میں شکسپیر کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور اُس کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اُنہوں نے اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔ اور عمریں بھی وہ عمریں جو کروڑوں نیم کی عمروں سے بڑی تھیں۔ ایسی ہی مثالیں میرے پیش نظر ہیں۔ کہ جب کسی نے حضرت انیسؔ رح (سے زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے) کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ تو میں نے یہ جواب دیا ہے۔ کہ یوں تو حضرت انیسؔ رح کی نسبت کچھ لندن میں لکھا تھا۔ اور وہ چھپا بھی تھا۔ لیکن جو لکھنے کا حق ہے۔ اُس کے لئے کم سے کم دس برس درکار ہیں۔ اور پھر کوئی کام اور نہ ہو۔ میر انیسؔ کا کلام ہو۔ اور میں ہوں۔

*۔ واقعی یہ مضمون جس بر بخت جانکاہ محنت سے عدالت میں جناب حامدؔ دام قبالہٗ نے قریباً دو مہینے تک اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر دو دمس کے مقام پر لکھا ہے اُس کی قدر وہی بزرگوار فرماسکتے ہیں جنکو تصنیف وتالیف کا موقع ملا ہے۔ خدا جناب ممدوح کو جزائے خیر دے۔ کہ اُن کا بہت بڑا احسان مجھ پر خصوصاً اور تمام ملک پر عموماً ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل خط جناب نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ مقابلہ کس وقت ممکن ہے کہا ہونا کیا شکسپیر کی سوانح عمری حضرت انیس کی

تو کچھ لکھوں۔ فرصت معلوم۔ اور بالفرض محال فرصت ملی بھی۔ تو ہائے تندرستی تجھ کو کہاں سے لاؤں۔ میرے لئے فرصت اور تندرستی دونوں موہوم چیزیں ہیں۔ جو نہ کبھی نصیب ہوئیں اور نہ ہوں۔ گویا یہ نعمتیں میرے لئے پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ لیکن بفضلہ طبیعت بے چین پائی ہے معمولی بیماری میں بھی بیکار نہیں بیٹھا جاتا۔ ع ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے۔ میری تمام عمر علالت میں بسر ہوئی ہے۔ بچپن سے دائم المرض ہوں۔ کئی طولانی بیماریوں سے شفا پاکر آخر کار ذیابیطس کا شکار ہوگیا ہوں۔ ۱۳ برس سے اس مرض میں مبتلا ہوں بقول خود ے

ہوئی مدت کہ حال۔ ناک میں دم ہے علالت سے + نہ اچھا ہی میں ہوتا ہوں نکلتا ہے نہ دم میرا

یہ تندرستی کی حالت ہے۔ اور اس حالت میں کسب معاش کی فکر۔ احباب کا خیال۔ قوم کی غمخواری جیسا کہ اس شعر میں کہہ چکا ہوں۔ شعر

کسب معاش و فکر احباب و ملک و قوم + بیماریوں میں ہم پہ یہ صدمے جہان کے ہیں

عزیزوں اور دوستوں کا داغ۔ بقول ہمدم دل افگار ے

یاد کس کس یار رفتہ کو کریں + گنتی گنوانے کو باقی ہم رہے

ملک کا حال زار

خاندان کا خیال۔ ملک کا رونا۔ نفاق۔ حسد۔ بغض۔ کینہ۔ غیبت۔ تہمت۔ مکاری۔ دغابازی۔ جھوٹ۔ فریب۔ بے ایمانی وغیرہ وغیرہ عیبوں کا بازار گرم ہے۔ ظاہر کچھ۔ باطن کچھ۔ منہ پر تعریف۔ پیٹھ پیچھے برائی*۔ بقول خود ے

سچ ہے کہ جن کے ظاہر و باطن میں فرق ہو + ایسوں کے قول و فعل کا پھر اعتبار کیا

[illegible]

آپس میں وہ پھوٹ کہ خدا کی پناہ۔ ہندو مسلمانوں کے آئے دن وہ جھگڑے۔ جو کبھی اس سے قبل نہ آنکھوں نے دیکھے نہ کانوں نے سنے۔ مسلمانوں کی تباہی پر دل خون ہوا جاتا ہے۔ ملک کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہاں تک سمع خراشی کروں۔ المختصر میرا یہ حال ہے۔ جو اس شعر میں نظم کیا ہے ے

---

*بقول دبیر مرحوم ے صحبت میں کہیں کچھ وقت نہ دکشت پہ کچھ ہیں + آئینہ صفت منہ پہ ہیں کچھ پشت پہ کچھ ہیں — ثابت حقیر۔

کچھ نشاں صدموں کے ہیں کچھ حسرتوں کے داغ ہیں + ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں ہائے اب وہ دل کہاں

یا بقول جناب استاذی مولانا (سیّد علی نقی صاحب) صفی لکھنوی یوں کہو ؎

نو رہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے + آشیاں اُجڑا کیا۔ ہم ناتواں دیکھا کئے

میری عمر کا بہت بڑا اور بہترین حصّہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے اور قانون پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ ہندوستان میں تھوڑی سی عربی۔ فارسی۔ انگریزی پڑھ کر اپریل ۱۸۸۱ء میں جب میری عمر تخمیناً ۱۸ سال کی ہوگی انگلستان روانہ ہوا۔ اور وہاں ساڑھے پانچ برس قیام کیا۔ اس عرصہ میں علاوہ بیرسٹری پاس کرنے اور تھوڑی سی لاطینی و فرنچ پڑھنے کے ایک آدھ رسالہ اور متعدد مضامین لکھے۔ انگریزی میں پوپ (Pope) اور گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے چند اشعار کی تضمین کی۔ اور ایک مضمون انگریزی نظم میں لکھا۔ جس کا نام الوداع لندن رکھا۔ اس وقت تک زبان انگریزی میں کئی سو مضامین قلم سے نکلے ہیں۔ انگریزی نثر و نظم میں جو کچھ لکھا ہے۔ اُس میں سے بہت کچھ مختلف اوقات میں شائع ہو چکا ہے۔ باقی چھپے یا نہ چھپے ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ لنڈن کے زمانہ قیام میں ملٹن اور شکسپیر کا کلام پروفیسر مل سے پڑھا ہے۔ اور شعر پڑھنے کے اصول اور طریقے جس کو انگریزی میں ریسیٹیشن (Recitation) کہتے ہیں۔ پروفیسر ہارٹلی (Hartley) سے سیکھے ہیں۔ کوئی فن خواہ وہ کتنا ہی آسان اور ادنےٰ کیوں نہ ہو۔ نہیں آتا جب تک کہ طبیعت کو اُس سے خاص مناسبت نہ ہو اور عمر بھر اُس کے حاصل کرنے میں صرف نہ کی جائے۔ پروفیسر مل نے عمر بھر کلام ملٹن اور شکسپیر پڑھا اور پڑھایا۔ ملٹن اور شکسپیر پر وہ ایسے فدا تھے کہ کسی اور شاعر کا کلام پسند ہی نہ آتا تھا۔ سچ ہے جب کوئی شخص ایک مدت تک کسی شاعر یا نثار کا کلام بار بار پڑھتا اور غور کرتا رہتا ہے۔ تو اُس کو پھر اور کسی شاعر و نثار کا کلام پسند نہیں آتا۔ یہ مثال بعینہٖ ایسی ہے۔ کہ جب کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ تو اُس کو سوا اپنے معشوق کے

قیام لندن و شکسپیر و ملٹن شعر خوانی کے اصول

اور کوئی اچھا نہیں معلوم ہوتا مثل مشہور ہے۔ کہ لیلی را بچشم مجنوں باید دید۔ رند نے اِس مضمون کو خوب نظم کیا ہے۔ ؎

دید لیلی کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور + میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

عربی کی مثل مشہور ہے۔ حُبُّ الشَّئِ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ۔ محبّت کسی چیز کی اندھا اور بہرا کردیتی ہے

پروفیسر ہارٹلی کا حال

جب مَیں پروفیسر سے ملٹن اور شکسپیر پڑھتا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر قریب ستّر برس کے ہوگی پڑھانے میں وجد کی حالت طاری ہوتی تھی۔ کُرسی سے اُچھل اُچھل پڑتے تھے۔ کھڑے ہوجاتے تھے۔ رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا۔ چہرہ سُرخ ہوجاتا تھا۔ گالوں کی جُھرّیاں کافور ہوجاتی تھیں۔ بُڈھا چہرہ جوان نظر آتا تھا۔ سر کے سفید بال (ڈاڑھی نہیں تھی) چہرے کی سُرخی کے ساتھ عجب سماں دکھاتی تھی۔ مَیں اُن کی حالت پر متحیّر رہ جاتا تھا + پروفیسر ہارٹلی صاحب ہر مقام کو خوب ہی ادا کرتے تھے۔ اور آواز سے اور صورت سے گویا بولتی ہوئی تصویریں جانتے تھے۔ ہاتھ سے زیادہ بتانے کو منع کرتے تھے* وہ شعر کے پڑھنے میں نیچر (قدرت) کی پیروی کرتے تھے۔ یعنی ہر حالت۔ غُصّہ۔ محبّت۔ رنج۔ غم۔ حزن واندوہ۔ خوشی۔ شجاعت۔ تہور۔ تعجب۔ حیرت۔ فکر وغیرہ وغیرہ کو کماحقہ ادا کرتے تھے۔ اور اس طرح پر کہ تصنّع بالکل نہ معلوم ہوتا تھا +

ہاتھ سے زیادہ بتانا

پروفیسر ہارٹلی کی عمر اُس وقت ۷۲ برس کی ہوگی۔ تمام عمر سوا شعر پڑھنے اور شعر پڑھنا سکھانے کے کوئی کام نہیں کیا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہم اکھنٹے روز صرف ہوتے ہیں۔ یہ بات برسوں کی مشق کے بغیر نہیں حاصل ہوتی۔ کہ جو مضامین نظم میں پڑھے جائیں۔ اُن کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو۔ کہ جو کیفیتیں منظوم ہیں۔ وہ پڑھنے والے

شعر پڑھنے کی خوبی

*یہی خیال مرزا دبیر مرحوم کا تھا۔ وہ ہاتھ سے زیادہ بتانے کے بالکل مخالف تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ بس جتنا ہاتھ باتیں کرنے میں اُٹھتا ہے اُتنا ہی اُٹھانا چاہئے۔ اور جتنا تم باتوں میں اشارے چشم و ابرو وغیرہ کے کرتے ہو اتنے ہی مرثیہ پڑھنے میں کیا کرو۔ فی زمانہ مرثیہ پڑھنے میں تاننگی اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کہ بعض آدمی اسکو رقص منبری کہتے ہیں۔ ذاکرین کو اس کی احتیاط ضرور رہنا چاہئے + ۱۲ ثابت مؤلف۔

پرگندر رہی ہیں۔ اور اُن کے اظہار میں کسی قسم کی بناوٹ معلوم نہ ہو۔* جیسے ایک مہذب آدمی اپنی تقریر میں بہت کم ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح شعر کے پڑھنے میں بھی اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ یہ لکھتے لکھتے مجھ کو ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں پروفیسر ہارٹلی سے لیڈی کلیرا ویر ڈے ویر (Lady Clara Vere de Vere) کا پڑھنا سیکھتا تھا۔ جو لارڈ ٹینیسن (Lord Tennyson) مشہور شاعر انگلستان کی مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں ایک مصرع ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "وہ شیر جو تمہارے پرانے پتھر کے پھاٹک پر ہے"۔ اُستاد نے فرمایا کہ اگر پھاٹک کی طرف اُنگلی سے اشارہ کریں۔ تو بہتر ہے۔ اور یہ فرما کر مصرع کا اعادہ کیا۔ اور اُنگلی کو ذرا گشت دے کر (جب مصرع کا اعادہ کیا تھا) پھاٹک کو بتلایا۔ اُسی وقت اُنگلی پھاٹک پر پہنچی جس وقت لفظ پھاٹک مُنہ سے نکلا۔ اور اس طرح کہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا بالکل قصد ہی نہ تھا۔ جب میں نے بتایا۔ تو کبھی اُنگلی پہلے پہنچی۔ اور کبھی لفظ پھاٹک پہلے زبان سے نکلا۔ تھوڑے دنوں کی مشق کے بعد اُنگلی اُس وقت پہنچتی تھی جب لفظ پھاٹک مُنہ سے نکلتا تھا۔ لیکن بناوٹ ظاہر ہوتی تھی۔ الغرض قریب ایک ماہ کی مشق کے بعد یہ بات میسّر ہوئی۔ کہ اُنگلی اُسی وقت پھاٹک کو بتاتی تھی۔ (اور بلا قصد و تصنّع بتاتی تھی) کہ جب لفظ پھاٹک مُنہ سے نکلتا تھا ✦ بیان میں بناوٹ

بڑی مشکل اُس وقت پڑتی ہے۔ کہ جب ایک مصرع میں متناقض الفاظ قریب قریب

*اس موقع پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آگیا۔ ایک مجلس عزا میں ایک صاحب مرثیہ منبر پر پڑھ رہے تھے۔ وہ اچھے پڑھنے والے ذاکر تھے مگر حد سے زیادہ بتاتے تھے پہلوان کی لڑائی کا موقع تھا۔ اتفاقاً یہ مصرع آگیا آیا تھا بھیکتا ہو دیکھتا ہو بھالا۔ وہ ذرا پہلے تو جھکے اور پھر منبر پر اس طرح دیکے کہ تمام جسم اپنا سمیٹ کر پیچھے کو ہٹے گویا بالکل پُتلے بن گئے۔ تمام مجلس بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ جیسے پڑھ رہے تھے مجلس والوں کی ہنسی رکتی تھی لوگ مُنہ پر رومال رکھ رکھ کر ہنستے تھے۔ یہاں تک کہ وہ حال شہادت پڑھے مگر رقت نہ ہوئی۔ لوگوں کو وہی خیال ذہن نشین رہا۔ مطلب اس حکایت لکھنے سے یہ ہے۔ کہ ذاکر اتنا نہ بتائے کہ مجلس کی رقت اُڑ جائے ✦ ثابت۔

ہوں۔ جیسے رنج و خوشی تکلیف و آرام محبت و عداوت۔ نفرت و رغبت وغیرہ وغیرہ اُس وقت لفظ رنج کو حُزن کی آواز سے پڑھنا اور پھر فوراً آواز و صورت بدلنا جس سے خوشی ظاہر ہو۔ اور اس طرح بدلنا کہ گویا بلاقصد خود بخود آواز و صورت بدل گئی۔ محبت و رغبت اُس آواز سے ادا ہو۔ جس سے محبت ٹپکے۔ اور پھر فوراً آواز میں وہ تغیّر پیدا ہو۔ کہ جس سے عداوت و نفرت برسے۔ کسی* اُستاد کامل کے پڑھنے میں ان مقامات کا وہ لطف ملتا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ حق مغفرت کرے حضرت نفیسؒ یاد آگئے۔ دو تین واقعات سُنئے۔ خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔ لیکن قبل اس کے ایک دو باتیں اور عرض کرنے کی اجازت مانگتا ہوں +

نفیس مرحوم

انیس مرحوم کا پڑھنا

جب حضرت انیسؒ نے انتقال فرمایا۔ اُس وقت میری عمر بہت کم تھی میں نے کبھی حضرت انیسؒ کو پڑھتے نہیں سُنا۔ لیکن یہ سُنا ہے۔ کہ بے مثل پڑھتے تھے۔ ویسا پڑھنے والا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ میں نے جناب مونسؒ کو بھی نہیں سُنا۔ لیکن جناب انسؒ و نفیسؒ کو سُنا۔ اور انگلستان سے واپس آنے کے بعد سُنا۔ انسؒ خوب ہی پڑھتے تھے۔ خصوصاً بَین +

(۱) حکایت اوّل میر نفیس

ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ جناب میر نفیس مرحوم ۲۵ رجب کی مجلس دلآرام کی بارہ دری (واقعہ محلہ چوپٹیاں لکھنؤ) میں پڑھ رہے ہیں۔ ہزار ہا آدمی جمع ہیں۔ میں بھی شریک ہوں۔ تعریف کے نعرے بلند ہیں۔ ایک مقام آیا۔ میر نفیسؒ نے مرثیہ کو نیچا کر لیا۔ اس طرح کہ گویا خود ہی نیچا ہو گیا۔ بیت پڑھی اور خوب کھینچ کر پڑھی۔ بیت نے خوب رنگ

* جو صاحب ذاکر ہوں یا اسٹیج دینے والے یا شاعر یا واعظ وغیرہ۔ وہ ان مقامات کو بغور دیکھیں عجب نکات بیان فرما رہے ہیں۔ حقیر نے بھی کم سنی میں کئی برس تک مرثیہ پڑھنا اور مختلف مقامات کو مختلف آوازوں اور لہجوں اور اشارات سے ادا کرنا باقاعدہ اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی) سے سیکھا ہے۔ جو اس فن خاص میں یکتا تھے۔ انیسؒ و دبیرؒ و انسؒ و مونسؒ و سلیسؒ و نفیسؒ و عشقؒ علیہم الرحمہ سب اساتذہ اُن کے پڑھنے کے مدّاح تھے۔ اس لئے اس تحریر کی جرأت کرتا ہوں۔ مؤلف حقیر۔

دیا۔ دُوسرے بند کے شروع میں تلوار کھینچنے کا ذکر تھا۔ جناب نفیس داہنے ہاتھ کو بائیں طرف لیگئے۔ اس طرح کہ گویا ہاتھ بلا ارادہ اُدھر چلا گیا پھر تلوار کھینچی۔ اور اس خوبصورتی سے کھینچی۔ کہ دل پھڑک گئے۔ اگر مرثیہ نیچا نہ ہوتا۔ تو یہ بانکپن اور صفائی ممکن نہ تھی +

حکایت دوم۔ ایک اور مجلس اسی دلآرام کی بارہ دری میں پڑھ رہے ہیں۔ مرثیہ خوب رنگ دے رہا ہے۔ سامعین پر عجب حالت طاری ہے۔ وہ بند گھوڑے کی تعریف میں ہیں۔ ایک مقام پر میر صاحب کچھ رُکے (میں منبر کے قریب تھا۔ میں نے دُور سے قریب سے۔ وسط مجلس سے جناب میر صاحب کو سُنا ہے۔ تا کہ پڑھنے کا کما حقہٗ اندازہ کر سکوں) ٹھیرے۔ دم لیا۔ خوب گہری سانس بھری۔ پوری سانس کھینچ کر ہونٹوں پر لائے یہ تمام باتیں اس حُسن و خوبی سے ادا ہوئیں۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح کہ معلوم نہ ہوں۔ پھر جناب میر صاحب نے نہایت زور اور تیزی سے پڑھا "وہ اُڑ گیا"۔ گھوڑے کا اُڑنا آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اگر وہ "وہ اُڑ گیا" کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے۔ تو خاک لُطف نہ آتا +

ایک واقعہ اور سُن لیجئے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جناب نفیس صاحب کی آواز بعد گھنٹوں کے پڑھنے کے جب خستہ ہو جاتی تھی۔ اور وہ مرثیہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ایسی آواز نکالتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ آواز الگ کسی خزانہ میں محفوظ تھی۔ اور اس سے ابتک کام نہیں لیا گیا۔ لندن کے بعض کاملین میں بھی میں نے یہ صفت دیکھی ہے +

حکایت سوم۔ ایک مرتبہ ۲۵ رجب ۱۳۱۰ھ کو دلآرام کی بارہ دری میں میر صاحب کو میں نے سُنا۔ پڑھے اور خوب پڑھے۔ جب مجلس ختم ہوئی۔ جناب میر صاحب کے پاس میں گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ اُن کے کلام اور پڑھنے کی تعریف کرتا

رہا جب رخصت ہوا۔ جناب میر صاحب کو عجب حسرت بھری نگاہوں سے میں نے دیکھا۔ میرے ساتھ چند میرے عنایت فرما تھے۔ اُن سے میں نے راہ میں آہ سرد بھر کر کہا۔ کہ افسوس آج میر صاحب کو آخر مرتبہ سنا۔ اب سننا میسّر نہ ہوگا۔ اس حالت ضعف و پیرانہ سالی میں پڑھے۔ اور لاجواب پڑھے۔ لیکن جب مرثیہ ختم کرنے کو تھے۔ اُس وقت کوشش کی۔ اور زور لگایا۔ کہ وہ آواز جس سے معلوم ہو۔ کہ ابتک کام نہیں لیا گیا ہے۔ اور بالکل تازہ آواز ہے۔ نکلے۔ لیکن ضعف و نقاہت کی وجہ سے وہ آواز صرف ایک دو منٹ کیلئے نکلی۔ گویا نہ نکلی ✤

تاریخ انتقال میر نفیس مرحوم ۱۳۱۸ھ

افسوس ہزار افسوس ایسا ہی ہوا۔ پھر جناب میر صاحب نے کوئی مجلس نہیں پڑھی۔ چند ماہ بعد ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ[1] مطابق ۵ مارچ ۱۹۰۱ء کو انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ✤

ہائے۔ نفیس کہاں۔ وحید کہاں۔ اُنس کہاں۔ مونس کہاں۔ انیس کہاں۔ دبیر کہاں۔ وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا جس میں یہ لوگ ڈھلتے تھے۔ جناب میر صاحب! یہ سرگذشت تو سُن چکے۔ سمع خراشی کی لیکن ابھی اور سمع خراشی کرونگا۔ میں اُن لوگوں میں ہوں۔ جو تعداد کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ خوبیوں کو دیکھتے ہیں۔ جو یہ نہیں دیکھتے۔ کہ عمر بھر میں شاعر نے کے دیوان کہے۔ بلکہ یہ کہ کس قدر اچھے شعر کہے۔ ایک عربی شاعر کا قول ہے۔ کہ جس نے عمر بھر میں تین شعر کہدئے وہ شاعر ہے۔

مختصر مگر اچھا کلام

[1] حقیقتاً بہت سے چند تاریخیں کہی تھیں جو اُس زمانے کے اکثر اخباروں نے چھاپی تھیں۔ ایک باطنی تاریخ تھی جس میں ثناخوان علیؑ سے پورے ۱۳۱۸ھ نکلتے تھے۔ شاید پورا مصرع یہ ہے۔ رضواں بجاں گفت ثناخوان علیؑ ✤

[2] مسٹر واجد علی خاں صاحب عاصی تحریر فرماتے ہیں کہ جناب میر خورشید علی صاحب نفیس اُن کی نسبت فرماتے تھے۔ کہ تم کو اپنا کلام سنا کر مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔ اور مجلس میں آپ کا تشریف رکھنا برابر دو ہزار سامعین کے ہے جو سخن فہم ہوں سمجھتا ہوں ✤ ۱۲ ثابت

میری رائے میں اگر ایک شعر بھی کہدیا۔ تو میں اس کو شاعر کہونگا*۔ اور مجھ کو اس سے بھی بحث نہیں ہے کہ کتنی دیر میں کہا۔ میں نتیجۂ فکر کو دیکھتا ہوں۔ خواہ وہ کتنی ہی دیر میں ہو۔ یا جلد ہو۔ اور اگر جلد بھی ہو۔ تو وہ قابل تعریف ہے۔ لارڈ بائرن (Lord Byron) کی اکثر نظمیں ایسی ہیں کہ نظر ثانی کی نوبت نہیں پہنچی۔ لیکن ان کی عمدگی میں کلام نہیں۔ گرے (Gray) کی ایلیجی (Elegy) جس میں کل چونسٹھ اشعار ہیں۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے۔ (میں اس جگہ سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ جہاں کوئی کتاب میرے پاس نہیں ہے) مدت مدید غالباً بارہ برس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہر مصرع جو زبان انگریزی ہو گیا ہے۔ جب تک انگریزی زبان روئے زمین پر رہیگی۔ اس کے ساتھ وابستہ رہیگا۔ گرے کا اگر اور کلام نہ ہوتا۔ اور صرف یہی ایلیجی (Elegy) ہوتی۔ تو انگریزی مبصرین کی یہ رائے ہے۔ کہ ہم گرے (Gray) کو بہترین شعرا میں شمار کرتے۔ جیسا اب شمار کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بالاتر۔

بیریل آف سر جان مور (Burial of sir John moore) میں کل سولہ شعر ہیں۔ چارلس ولف (Charles Wolfe) نے جس نے ۱۸۲۳ء میں ۳۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ نظم کہی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ سوا اس نظم کے اور کوئی نظم اس شاعر کی دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ نظم بہت مشہور ہے۔ اور محض اسی نظم کی وجہ سے ولف (Wolfe) شاعر سمجھا جاتا ہے۔

اچھا شعر کس کو کہتے ہیں۔ اس بحث میں پڑنا میرا مقصود نہیں۔ مجھ کو اس قدر

---

* عالیجناب علامۂ نادیب نادری نہبل مسٹر جسٹس سید کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد جو عربی لٹریچر میں بےنظیر تسلیم کئے جاتے ہیں اور نیز علم منطق و ادب عربیہ بلکہ جامعیت فضل و کمالات میں کہ عالیجناب شمس العلما جناب الفاضل نواب مولوی سید امداد امام صاحب قبلہ بھی جن کے مضامین اور مضافات بغیر اپنا ہمسر نہیں رکھتے جنکی دوستی پر حکیم مسٹر حامد علی خاں صاحب کو فخر ہے۔ مسٹر موصوف کا یہ شعر جس کو اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ ایک شاعر سمجھتا ہوں جو وہ شعر یہ ہے۔ جہاں خدا کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ وہاں پہ جا کے ٹھہرتا ہے سلسلہ دل کا۔ واثابت۔

بیان کر دینا کافی ہے۔ کہ مضمون شعر کو مَیں خوبصورت زندہ جسم سمجھتا ہوں۔ اور الفاظ کو اچھا لباس۔ اگر مضمون نہیں تو محض الفاظ سے لطف پیدا نہیں ہوتا حسن ذاتی نہیں تو لباس حسن پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر مضمون اچھا نہیں۔ تو الفاظ کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ مضمون کو اچھا نہیں بنا سکتے +

مقولہ جناب حالی

شعر کے متعلق مَیں اپنے خیالات اپنے الفاظ میں نہیں بیان کرتا۔ بلکہ حضرت حالی مدظلہ العالی کے بے مثل الفاظ میں مقدمہ شعر و شاعری میں (جو دیوان حالی کے شروع میں ہے) فرماتے ہیں "کھانے کی اصل خوبی یہ ہے۔ کہ لذیذ ہو۔ مفید ہو۔ جزو بدن بننے کے لائق ہو۔ لباس اور رنگ رُوپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے۔ تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے شعر کی اصل خوبی یہ ہے۔ کہ سحر کی ہو۔ مؤثر ہو۔ لفظاً اور معناً سانچے میں ڈھلا ہو۔ اور اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اُس میں پائی جائے۔ تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اُس کی کچھ ضرورت نہیں" (ملاحظہ ہو مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۷۲) جیسے مرزا دبیر صاحب (اُس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے سہرا ہے ہیں صف بستہ شہیداں کی یہ ہے آمد) فرماتے ہیں ؎

تلوار کا پھل پھول گیا شہ کے سخن سے + قبضہ نے ملی آنکھ کف نور فگن سے
یوں نکلا نیام کمر شاہ زمن سے + جیسے سخن حق کسی عارف کے دہن سے

پہلے مصرع میں پھل۔ پھول۔ دُوسرے میں آنکھ۔ کف۔ یہ لفظی رعایتیں ہیں۔ لیکن سبحان اللہ۔ کس حُسن سے "پھول گیا" بمعنی خوش ہوا قبضے کی شکل آنکھ سے مشابہ ہے۔ اور پھر کف نور فگن سے آنکھ ملنا۔ سبحان اللہ۔ تیسرے اور چوتھے مصرع میں تمثیل کا لطف بیان نہیں ہو سکتا۔ سخن فہموں کے دلوں سے پوچھئے *+

* امام مظلوم ناصر رسول کی تلوار جہاد میں نکلی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ جیسے کلمہ حق کسی عارف کے دہن سے نکلے۔ یہ تشبیہ تمام اہل سعنی کیا بسط ہو سکتی ہے۔ تلوار کے لئے نیام سے رسالت کیونکہ سطر مہ مقام اس کا خیال رکھنا اور ایسی طرح کرنا جو دوسروں کیلئے ممکن نہ ہو سکے یہ مرزا صاحب کے خاص کمالات میں سے ہے + ۱۲ مؤلف حقیر ثالث۔

بقول ملٹن شعر کی خوبی یہ ہے۔ کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہوا ہو۔ اور اصلیت پہ مبنی ہو۔ اس مضمون کو کیا کیا اچھی طرح انگریزی شاعروں نے بیان کیا ہے۔ چند اقوال یاد آ گئے۔ عرض کرتا ہوں۔ حتی الامکان ترجمہ میں خیالات و الفاظ کی پابندی کرونگا +

فریڈرک ڈبلیو رابرٹسن صاحب (Fredrick W. Robertson) لکھتے ہیں "جذبات کی زبان کا نام شاعری ہے۔ وہ امجنیشن یعنی تخئیل کی تصنیف ہے جس کو صنعت جامۂ ہستی سے آراستہ کرتی ہے" +

کیمبل (Campbell) کا قول ہے "اصلیت کی فصاحت کو شاعری کہتے ہیں" +

ریچیٹر (Richter) کی رائے ہے "بہت سے نازک اور پاکیزہ جذبات جو مثل فرشتوں کے وجود کے ہماری باطنی دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو جسمانی لباس میں نمایاں نہیں ہوتے۔ اور بہت سے خوب صورت اور خوش رنگ پھول ایسے ہیں۔ جن کے بیج نہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ نظم ایجاد ہوئی جس کی بدولت وہ وجود جامۂ ہستی میں نظر آتے ہیں۔ اور اُن پھولوں کی بُو سے ہمارے دماغ ترو تازہ ہوتے ہیں" +

اسٹرلنگ (Sterling) کا قول ہے "شاعری فی نفسہٖ ایک قوّت اور مسرّت ہے۔ اس کی حالت یکساں ہے۔ خواہ بنی نوع انسان اس کو اپنے سر کا تاج بنائیں۔ یا اس کو تن تنہا کسی جادو کے بنے ہوئے مکان میں چھوڑ دیں" +

کولیرج (Coleridge) کہتا ہے۔ کہ "سرکار شاعری سے مجھ کو بڑے بڑے انعام ملے ہیں۔ شاعری نے میرے زخموں پر مرہم لگایا ہے۔ میری خوشیوں کو زیادہ کیا ہے۔ اور اُن پر صیقل کی ہے۔ گوشۂ تنہائی کو عزیز کیا ہے۔ اور یہ صفت مجھ میں شاعری ہی کی بدولت ہے۔ کہ جو کچھ اپنے قریب یا دُور دیکھتا ہوں

اُس میں اچھائی۔ بہتری اور خوبصورتی نظر آتی ہے"۔

قولِ شیلی

شیلی (Shelley) کہتا ہے۔ کہ "شاعری دُنیا کے پوشیدہ حسن کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیتی ہے۔ اور ہم اُن خط و خال اور نقش و نگار کو دیکھتے ہیں۔ جو آنکھ سے اوجھل تھے"۔

حضرت شکسپیر (Shakespear) فرماتے ہیں "دیوانہ۔ عاشق۔ شاعر قوتِ متخیلہ سے مرکب ہیں۔ ایک کو اُس قدر شیطان نظر آتے ہیں۔ جن کی وسیع دوزخ میں گنجائش نہیں۔ اس کو مجنون کہتے ہیں۔ عاشق ایسا ہی دیوانہ ہے جس کو لیلیٰ کا حسن ابروئے مصر میں نظر آتا ہے۔

شاعر کی آنکھ ایک دیوانی گردش میں عرش سے زمین اور زمین* سے عرش تک دیکھتی ہے۔ اور جو ہیں اجنبی یعنی تخیل اُن اشیا کو پیدا کرتا ہے۔ جن کی شکلیں معلوم نہ تھیں۔ شاعر کا قلم اُن کو لباسِ ہستی پہناتا ہے۔ اور عدم کو وجود کر دکھاتا ہے"۔

قولِ ڈاکٹر جانسن

ڈاکٹر جانسن (Johnson) فرماتے ہیں "شاعر کے لئے کوئی شے فضول نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ خوبصورت تحیر خیز یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیزیں ہیں قوتِ متخیلہ اُن سب سے واقف ہے۔ باغوں میں درخت اور پودے۔ جنگلوں میں حیوانات۔ زمین میں معدنیات۔ آسمان کے شہاب۔ شاعر کے دماغ میں لامتناہی قسم کے خیالات جمع کرتے ہیں۔ ہر خیال اخلاقی یا مذہبی صداقت کی تصریح یا زینت ہے۔ اور جس کی معلومات وسیع ہیں وہ مختلف سین کو مختلف طرح سے بیان کر سکیگا۔ اور اُس کے ناظرین دُور کے

* حضرت دبیرؔ فرماتے ہیں ؎ پستی سے مراد ذہن سوئے اوج ہے سیّاح ۔ ہمراہ کواکب ہیں لئے ہاتھ میں مصباح۔
قلم ہے مرا قفلِ درِ عرش کی مفتاح۔ جبریلؑ جو بتلاتے ہیں سو لکھتا ہے مدّاح ۔ ثابت۔

کتابوں اور غیر مترقبہ تعلیم مضامین سے محظوظ اور مستفیض ہونگے +

بیلی

بیلی (Bailey) شاعر نے شاعری پر ایک مبسوط نظم لکھی ہے جس میں وہ بیان کرتا ہے۔ کہ شاعر خیالات پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خیالات شاعروں میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں*۔ جیسے جنگلوں میں قدرت خدا سے خودرو پھول یا درخت۔ شاعر کا جسم اور اُس کی رُوح نیچر سے وابستہ ہے۔ اور اُس کے دل پر کائنات کی صُورتیں جلی حرفوں سے مُنقّش ہیں۔ شاعر عشق کی سی گراں بہا شئے اور بڑے بڑے اُصولوں کا خزانہ دل میں رکھتے ہیں۔ اور اُن کو نہایت خوبی اور حُسن سے بیان کرتے ہیں۔ اور سب کی جڑ عشق ہے۔ شاعری کتابوں میں مقیّد نہیں ہے۔ وہ قوت وہ رُوح جس کی تجھ کو تلاش ہے۔ تیرے ہی آس پاس ہے۔ تجھی میں تو ہے۔ اور پھر ہر جگہ موجود ہے +

جو صفتیں شاعر و شاعری کی اُوپر نہایت مختصر طور سے بیان کی گئی ہیں۔ وہ بقول رچرڈسن (Richardson) ملٹن اور ملٹن کے کلام اور خصوصاً پیری ڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں پائی جاتی ہیں۔ رچرڈسن کہتا ہے۔ نظم جس کا نام ہے۔ وہ تو ملٹن کی پیری ڈائز لاسٹ میں ہے +

واقعات نہایت ہی کم ہیں۔ اور وسعت بیان نے اُن کو اللہ اللہ کہا کر دکھایا ہے۔ نئے نئے عالم ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا کر دیتے ہیں۔ اور نیچر کے کیسے کیسے مشاہدات۔ جن سے قدرت خدا نظر آتی ہے۔ نیچر کی تصویر اس سے بہتر پہلے کسی

---

* حقیر ثابت کا یہ خیال ہے۔ کہ جو خیالات خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن کو آمد۔ اور جو شاعر فکر و غور کے بعد پیدا کرتا ہے۔ اُن کو آورد کہتے ہیں۔ یہی مضامین آمد و آورد میں فرق ہے۔ مضامین آمد کا مرتبہ مضامین آورد سے بہت اعلےٰ ہے۔ ہاں بعض اُستادوں کے مضامین آورد میں بھی آمد کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو کثرت مشق کا نتیجہ یا خداداد طبیعت کا جوش یا جو چاہئے کہئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شاعر نے نہیں کھینچی۔ نیچر کے سانچے میں خیالات ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انسان کی ہر دل عزیزی کی تصویر اُس سے بہتر کھینچی گئی ہے۔ جو بہترین مصوروں نے اپنی تصویروں اور مورتوں میں کھینچی ہے۔ اور یہ تمام اعلےٰ خیالات نہایت مؤثر اور دل فریب طرز میں ادا کئے گئے ہیں۔ ناظرین کے دل خوشی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ پگھلتے ہیں۔ متاثر ہوتے ہیں۔ نرم ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ نقوش جو شاعر دل پر جمانا چاہتا ہے۔ بخوبی جم جائیں۔ اس نظم سے فوارۂ علم و پارسائی و نیکی جاری ہے۔ اور دریائے اطمینان قلب۔ جمیعت خاطر۔ شادمانی و مسرّت موج زن ہے۔ یہ منظر اُنہیں ناظرین کو نظر آتے ہیں۔ جو بمفہوم شاعر پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ اور اُس کی نظم کے راگ کو بغور سُنتے ہیں*۔

ملٹن اور ڈرائڈن

میرا قصد یہ ہے۔ کہ میں تعمیل ارشاد اس طرح کروں۔ کہ میں ملٹن کے کلام سے کچھ مقابلہ کروں۔ میرے نزدیک دو اور بھی شاعر انگریزی زبان میں ہیں۔ جن سے موازنہ ہو سکتا ہے۔ ایک ڈرائڈن (Dryden) جو ۹ دسمبر ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوُا۔ اور ۸ نومبر ۱۶۷۴ء کو انتقال کر گیا۔ اور متاخرین میں رابرٹ براوننگ

رابرٹ براوننگ

(Robert Browning) جو ۷ مئی ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوُا۔ اور جس نے ۱۲ دسمبر ۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ اتنی فرصت نہیں۔ کہ میں ڈرائیڈن اور رابرٹ براوننگ سے مقابلہ کر سکوں۔ لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ڈرائیڈن کا نمبر متقدمین میں ملٹن کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ اور زندگی میں تو ملٹن سے زیادہ سمجھا

---

* شعر گوئی کی موج حقیر نے اس رباعی میں نظم کی ہے۔ (رباعی) مضمون سے فکر جب ہم آغوش ہوئی ۔ یاد دنیائے دوں فراموش ہوئی ۔ ساکت جو ہوئی زباں۔ مٹا سوز و گداز ۔ جلنے سے بچی شمع جو خاموش ہوئی ۔ ہر چند اساتذہ کے اقوال کے ساتھ اس کو بیان کرنا ضروری نہیں ہے مگر جو فائدہ مزید شعر گوئی کا میرے خیال میں تھا۔ ہم کو بھی ناظرین کی خدمت میں موقع پر پیش کر دیا ۔ ۱۲ ثابت۔

جاتا تھا۔ اور رابرٹ براؤننگ انیسویں صدی کے شعرا میں نہایت ممتاز ہے۔ اور اپنے ہم عصر الفریڈ ٹینیسن (Alfred Tennyson) جیسے فصیح اور شیریں بیان شاعر کے ہم عنان (جس کی پیدائش ۶ / اگست ۱۸۰۹ء اور وفات ۶ / اکتوبر ۱۸۹۲ء میں ہوئی) انیسویں صدی کے آخری دور شاعری کے میدان کو باہم تقسیم کرتا ہے۔ ملٹن اور ڈرائیڈن نثار بھی تھے۔ خصوصاً ملٹن بہت زبردست نثار سمجھا جاتا ہے۔ جناب مرزا دبیر کی نثر نہ میں نے دیکھی۔ اور نہ کبھی سُنا۔ کہ جناب مرزا صاحب نے نثر میں کچھ فرمایا ہے[1]۔ البتہ یہ معتبر ذریعہ سے سُنا ہے۔ کہ دو دیوان اُردو جناب مرزا صاحب کے ہیں۔ لیکن اُن کے شائع ہونے کی جناب مرزا صاحب نے ممانعت فرما دی ہے۔ ملٹن ۹ دسمبر ۱۶۰۸ء کو پیدا ہوا۔ اور ۸ نومبر ۱۶۷۴ء کو مرگیا۔ تمام عمر افلاس و پریشانی میں بسر ہوئی[2]۔ خصوصاً اُس وقت کی تکلیفوں کی انتہا نہیں۔ کہ جب پیریڈائز لاسٹ (Paradise Lost) کہا ہے۔ جس سے ملٹن کا نام صفحۂ روزگار پر ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ڈرائیڈن سے باکمال شاعر نے ملٹن کی تعریف

مختصر حالات ملٹن

---

[1] جہاں تک مجھکو علم ہے مرزا صاحب جس کسی کو خط لکھتے تھے فارسی میں لکھتے تھے۔ اردو میں انکا صرف ایک رقعہ میں نے دیکھا ہے جو نامِ مرحوم کے نام اُنہوں نے تحریر فرمایا تھا۔ وہ معمولی نثر ایسی تھی جیسے باتیں کرتے ہیں۔ ایک کتاب بھی مرزا صاحب کی تصنیف مطبع یوسفی دہلی میں چھپی ہے جس کا نام ابواب المصائب ہے۔ اور جو ۱۲۷۵ھ سنہ ہجری عہد شاہ اودھ واجد علی شاہ میں نصیر الدین حیدر مرحوم کی تصنیف ہے۔ اسکی عبارت فسانۂ عجائب کے رنگ پر مقفّٰی مسجع تو نہیں ہے مگر پھر بھی مطابق ہے جو مرزا غالب مرحوم کے رقعات عود ہندی و اردوئے معلی میں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے۔ کہ عہد نصیر الدین حیدر تک مرزا غالب مرحوم بھی فارسی میں خط لکھتے تھے۔ اُس زمانے میں مرزا دبیر غفور نے اتنی سلیس اردو لکھدی ہے اس لئے قابل ملاحظہ ہے۔ سادہ معمولی اردو ہے۔ آخر کتاب میں مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ صرف ایک ہفتہ میں یہ کتاب تصنیف کی ہے + ثابت

[2] شاعر کی پریشانی و افلاس کے ذکر میں مجھے جناب مشیر مرحوم یاد آگئے۔ فرماتے ہیں سہ رزاقی جناب الٰہی کے میں فدا + کھانا تو غیر ملتا ہے۔ پینا مگر کہاں + عُسرت میں ولولوں کی چڑھائی اُتر گئی + افسوس نامراد جوانی گذر گئی + ثابت۔

میں چند اشعار کہے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے - ایک مصرع کا ترجمہ ایک ہی مصرع میں کیا ہے -

مدح ملٹن زبانی ڈرائیڈن

تین شاعر تین دوروں میں مگر پیدا ہوئے — جو گریس اٹلی کا حسن اور انگلستان کا ہوئے
قوت تخئیل میں اوّل ہی سبقت لے گیا — دوسرا شوکت میں فائق تیسرا دونوں میں تھا
قوت نیچر کہیں آگے چلے ممکن نہ تھا — پہلے دو شاعر ملا کر تیسرا پیدا کیا

اوّل سے مراد ہومر[1] یونان کا - دوسرے سے ورجل[2] اٹلی کا - تیسرے سے ملٹن[3] انگلستان کا شاعر ہے +

ملٹن کا کلام بہت ہے - لیکن جس نظم پر اس کے کمال اور شہرت کا دارومدار ہے - وہ پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) ہے - یہ تمام عمر کی فکر کا نتیجہ ہے - افلاس - کسب معاش - عدم فرصت نے اس خیال کو عرصہ تک پورا نہ ہونے دیا - لیکن یہ خیال دل سے کبھی محو نہ ہوا - آخر کار ۱۶۵۸ء میں یہ نظم شروع ہوئی - اور ۱۶۶۵ء میں ختم - دوسری نظم پیراڈائز ریگینڈ (Paradise Regained) اسی سلسلہ میں لکھی ہے - ملٹن کے سامنے جب ان دونوں نظموں کا ذکر آتا تھا - اور کوئی پیراڈائز ریگینڈ کو کمتر بیان کرتا تھا - تو ملٹن اس کے سننے کی تاب نہ لا سکتا تھا حالانکہ حق بات تو یہ ہے - کہ پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) کہیں پیراڈائز ریگینڈ (Paradise Regained) پر فوقیت رکھتا ہے - یہ دونوں نظمیں بلینک ورس میں لکھی گئی ہیں - اور ملٹن انگریزی شعرا میں سب سے اوّل شاعر ہے - جس نے بلینک ورس کو ایپک (Epic) نظم میں صرف کیا ہے - ایپک نظم اس نظم کو کہتے ہیں - جس میں کسی واقعہ کو مسلسل بیان کریں - اور واقعہ بلندی خیالات پر مبنی ہو - اور جس میں کارنامے کسی ہیرو (ممدوح) کے منظوم ہوں +

بلینک ورس و ایپک

پیراڈائز لاسٹ ۱۲ باب میں منقسم ہے - خدا کے حکم کی نافرمانی اور حضرت آدمؑ کے خلد سے نکالے جانے کا حال ہے - یہ نظم اس حالت میں کہی ہے - کہ جب

ملٹن اندھا ہو گیا ہے۔ افلاس اور دیگر پریشانیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ جان کے خطرے سے رہائی پا کر اور خطروں میں مقید ہے۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ نظمیں لکھوا رہا ہے۔ کہ جن کی وجہ سے روئے زمین کے شاعروں میں (جو ہوئے یا آئندہ ہونگے) ہمیشہ ممتاز اور سرفراز سمجھا جائیگا۔ نظم کا لکھنے والا نہیں ملتا۔ کوئی لڑکا نہ تھا تین لڑکیاں ہیں۔ لیکن وہ اس نظم کی قدر کیا جانیں۔ لکھوانے میں لڑکیوں کی گھرکیاں کھانا پڑتی ہیں +

نظیر یعنی مصیبت و عسرت و علالت افلاس ملٹن

یہ واقعہ میں نے محض اس غرض سے لکھا ہے۔ کہ ہمارے ملک کے کاملین پریشانیوں اور افلاس سے دل تنگ نہ ہوں۔ کاملین کی کچھ یونہیں گذری ہے۔ ہومر (Homer) کو دیکھئے۔ کہ جس پر یونان بلکہ روئے زمین ناز کرتا ہے۔ وہ نابینا ہو گیا ہے۔ اور افلاس کا یہ حال ہے۔ کہ دربدر بھیک مانگ کر بسر اوقات کرتا ہے۔ لیکن فکرِ شعر سے غافل نہیں*۔ سچ ہے۔ وہ آگ ہے۔ جس کو نہ افلاس نہ جاڑا کا فلک بجھا کر سکتی ہیں۔ اس مضمون میں خاص خاص مثالیں پیش کرنا جن سے موازنہ ملٹن و دبیر ہو میرا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ کل کلام پر موافق اپنی سیر کے اجمالاً لیکن گہری نظر ڈالونگا +

ہومر کا افلاس

فصل ۳

ملٹن کی نسبت کہا گیا ہے۔ کہ اُس کی نظم کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ عالموں اور فاضلوں کے لئے ہے۔ وہ ناظرین جو انجیل اور دیگر پُرانی کتابوں سے واقف ہیں۔ اُس سے پُورا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ جن کو اس قسم کی تعلیم نہیں ہوئی ہے۔ اُن کو نصف سے زیادہ ملٹن کی تصنیف کے حُسن نظر نہیں آتے۔ ایسے خیالات ادا کئے ہیں اور ایسے الفاظ میں بھی ادا کئے ہیں۔ جو عام فہم نہیں ہیں۔ اور جن کے

خصوصیت ملٹن

* حقیر نے ایک مرثیہ میں (مع تغیر) کہا ہے۔ عجیب مست عروسِ سخن میں خوشبو ہے۔ نہ یاسمن میں نہ نسترن میں خوشبو ہے۔ سروں کا کوئی پوچھے حال طولوں سے۔ دماغ جن کے بسے ہیں سخن کے پھولوں سے ۱۲ ثابت حقیر

لئے خاص قابلیت اور علم درکار ہے۔ اُس کے کلام میں سلاست و دشواری دونوں موجود ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے خواہ الفاظ کے لحاظ سے کبھی سادہ اور عام فہم مضامین سادہ سادہ الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ اور کبھی نہایت دقیق اور مشکل مضامین مغلق اور غیر مانوس الفاظ میں ہیں۔ ملٹن پیراڈائز لاسٹ میں موقع پاکر اپنی علمی لیاقت و فضیلت کو "جس کی کوئی انتہا نہیں" ظاہر کرتا ہے۔ قوت متخیلہ۔ بلندی خیالات۔ کمال علم کو تاریخ اور واقعات کے ساتھ عجیب لطف سے آمیزش دیتا ہے۔ ملٹن آدم و حوا کی تصویر میں اس طرح رنگ بھرتا ہے۔ کہ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ بہشت کے رہنے والے ہیں اور اُس کے قابل ہیں۔ باوصف اس کے اُن میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ کہ جن کو ہم بحیثیت انسان کے سمجھ سکیں اور اُن کی خوشی و غم میں حصہ لے سکیں۔ ملٹن نے ان تصویروں کے کھینچنے اور رنگ بھرنے میں کمال دکھایا ہے۔ کہیں اختصار مزہ دیتا ہے کہیں وسعت بیان۔ جس کی سرحد وہم و خیال کی دوربین سے نظر نہیں آتی۔ ملٹن کے یہاں وہ اختصار قابل مدح و ثنا ہے۔ جہاں اُن واقعات کی جو انجیل میں درج ہیں پابندی کرتا ہے۔ اور اُس نے جہاں قوت متخیلہ سے کام لیا ہے۔ وہاں دوزخ و بہشت کے وہ منظر دکھائے ہیں اور معانی و بیان کے دریا بہائے ہیں۔ کہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ سب سے مشکل حصہ ملٹن کی نظم کا وہ ہے۔ کہ جہاں ملٹن ایسے دو شخصوں کی تصویریں کھینچتا ہے۔ کہ جن کی حالت سب بنی انسان سے جدا ہے۔ اور جن میں وہ جذبات اور محسوسات پائے جاتے ہیں۔ جن کو خود وہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس تصویر کا اس طرح کھینچنا ملٹن ہی کا کام تھا۔

یہ چند خصوصیتیں جو نہایت مختصر طور سے میں نے بیان کی ہیں۔ ملٹن کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور میری رائے کی تائید و سند میں ہزارہا کاملین کی رائیں

انگریزی میں موجود ہیں ۔

وہی خصوصیتیں حضرت دبیرؔ کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ (۱) بعض کلام ادق ہے[۱] چنانچہ جناب مرحوم اس مرثیہ میں (قرآن مبین سورۂ یک آیہ ہے کس کا) فرماتے ہیں۔

یعنی کہ ہے اللہ احد ارحم و رحماں — دانندہ و بینندہ و ہر مخفی و پنہاں
جبار ہے قہار ہے قادر ہے قوی ہے — تواب ہے وہاب ہے عادل ہے سخی ہے
اُس کے یم قدرت کے گہر حد سے فزوں ہیں — ہم سب گہر یک صدف کن فیکوں ہیں
قدوس ہے سبوح ہے خالق ہے صمد ہے — خلاق تن و روح ہے رازق ہے احد ہے
حیران ہدایت سے نہایت ہے خرد ہے[۲] — واقف نہ ازل اُس سے نہ آگاہ ابد ہے

اقلیم ابد کشور پائندہ ہے اُس کا
جو اُس کے سوا ہے بخدا بندہ ہے اُس کا

(۲) کلام سلیس بھی ہے سلاست کے دلدادہ اس منظر کو ملاحظہ فرمائیں ۔ زبان کی صفائی سراپا۔ حزن و اندوہ و رنج کی تصویریں کن کن دلخراش لفظوں میں کھینچی ہیں۔ کہ پتھر کا دل بھی موم سے زیادہ نرم ہو جائے۔ جب میں اس مرثیہ کے بندوں کو پڑھتا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں۔ کہ لکھتے وقت جناب مرزا صاحب کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خون کے آنسو بے اختیار جاری ہیں۔ دل بیتاب ہے۔ دل کو سنبھالتا جاتا ہوں۔

[۱] مرزا صاحب کا ادق کلام بہت مشہور ہے چنانچہ جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ سے ادیب الملک ثانی نے اُن کے ایک بیت کی شرح ایک سائل علیم آبادی کے جواب میں کئی صفحوں پر تحریر فرمائی ہے جسکو میں اس کتاب میں ایک جگہ مع حل اردو لکھ چکا ہوں بعض اصحاب یہی سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب کا اکثر کلام دقیق ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دقیق و سلیس اُنکا ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ اور سلیس کلام دقیق سے بمراتب زیادہ ہے یہ ثابت۔

[۲] بہ ہدایت کے معنی ابتدا اور نہایت سے مراد انتہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خلق کی ابتدا و انتہا سے عقل عاجز و حیران ہے ۔ ۱۲ ثابت حقیر

آنکھوں سے آنسو پونچھتا جاتا ہوں۔ اور اس مرثیہ کے بند منتخب کرتا جاتا ہوں۔ رائے زنی نہیں کرتا۔ انتخابات خود میری رائے کو ظاہر کر دینگے۔

حالِ علی اصغرؑ شیر خوار

حالِ علی اصغرؑ کلامِ انیس

بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے — بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دُودھ ہے۔ نہ پانی کے ملنے کی آس ہے — پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دوہائی حسینؑ کی
پُتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

فریاد یا علیؑ۔ میں کدھر جاؤں یا علیؑ — ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علیؑ
کس طرح ان کی سانس کو ٹھہراؤں یا علیؑ — پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علیؑ
پچھلے کو آنکھ کھولی تھی۔ اب کھولتے نہیں
روتے نہیں۔ ہُمکتے نہیں۔ بولتے نہیں

اک دم بھی ہائے غم سے نہیں انفراغ ہے — تازہ ابھی جوانیٔ اکبرؑ کا داغ ہے
لَو پھر گئی ہے کان کی۔ گُل یہ چراغ ہے — کیا لوٹنے کو موت کے میرا ہی باغ ہے
کیا خاک میں ملانے کو میرے ہی پیارے ہیں؟
کہہ دو اجل سے یہ تو علیؑ کے ستارے ہیں

ماں کے ارمان

(ماں کے ارمان)

میں کہتی تھی نجف میں انہیں لیکے جاؤنگی — شاہِ نجف کا ان کو مُجاور بناؤنگی
انگلی پکڑ کے گردِ لحد کے پھراؤنگی — ہے ہے انہیں کو قبر میں اب میں سُلاؤنگی

ماں کی مرادیں بیان فرما کر بیت لکھی ہے۔

مِنّت کے طوق بڑھ چکے۔ پروان چڑھ چکے — لیسیں کا وقت آگیا* قرآن پڑھ چکے

*عام اہلِ اسلام میں جب جان نکلنے کو ہوتی ہے۔ تو آسانی جاں کندنی کے خیال سے سورۂ یٰسین پڑھا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے آخری وقت کو یاسین کا وقت کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے عموماً بچے ابتداءً قرآن شریف پڑھتے ہیں ۱۲ ثابت حقیر۔

اب کس کی بامراد بڑھاؤ نگی ہنسلیاں ۔ ہے ہے کرخت ہو گئیں یہ نرم انگلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پتلیاں ۔ لے لے کے اُلٹی سانس گراتے ہیں بجلیاں
باقی عوارض پیاس سے معصوم کے نہیں
مُنہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

اچھی عادتیں

رونا نہ جانتے تھے سدا مُسکراتے تھے ۔ پھیلا کے ہاتھ گود میں سب کی یہ آتے تھے
خاطر سے میری جھولے میں یہ لیٹ جاتے تھے ۔ جاتی تھی میں جدھر یہ اُدھر مُنہ پھراتے تھے
کس کی نظر لگی؟ کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاؤ پیار اب نہ رہا۔ آنکھ پھر گئی

کم سن بہن اپنے چھوٹے بھائی کو یوں بہلاتی ہے:۔

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے ۔ ہاتھوں میں لیکے اُنکے کھلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سُناتی ہے ۔ من جاؤ بھائی جان سکینہ مناتی ہے
کڑھتی ہیں اماں ۔ آنکھ کو تم کھولتے نہیں
اللہ ۔ ہم پُکارتے ہیں ۔ بولتے نہیں

(واقعات کا مرقع)

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم ۔ سہلاتے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دم بدم ۔ چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا۔ کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو۔ کو دیکھتے ہیں۔ تو مُنہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بُلاؤ ۔ امام کو ۔ لاؤ خدا کے واسطے لاؤ ۔ امام کو
اس بے زباں کا حال سُناؤ ۔ امام کو ۔ نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ ۔ امام کو

اچھی عادتیں

کم سن بہن کا بہلانا

واقعات کا مرقع

اکبرؑ کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو۔ وہ ابھی ہونگے راہ میں

حضرتؑ کے گوش حق نیوش میں بیبیوں کی آواز اُس وقت پہنچی ہے۔ کہ علی اکبرؑ کی لاش مقتل میں لٹا رہے تھے۔ حضرتؑ نوجوان بیٹے کی لاش سے یہ فرما کر رخصت ہوئے "اکبرؑ! تمہاری لاش کا خالق نگاہبان"۔

حضرتؑ لٹا رہے تھے وہاں لاشۂ جواں　　خیمے سے جو بلند ہوئی بیبیوں کی فغاں
بولے کہ چھین بھائی کو بن بھائی کے کہاں　　اکبرؑ تمہاری لاش کا خالق نگاہباں
ہم خیمہ گہ میں جاتے ہیں۔ اصغرؑ بلاتے ہیں
اُن کو بھی لا کے پاس تمہارے سُلاتے ہیں

خیمے میں امام حسینؑ کا آنا

خیمے میں حضرتؑ تشریف لائے۔ کس طرح؟

مُنہ پر جوان بیٹے کا تازہ لہو لگائے　　ماتم سرا میں گنج شہیداں سے شاہ آئے
جھولے پہ ہاتھ پکڑے ہوئے اہلِ بیت لائے　　بچے کے ہاتھ پاؤں ملا کر انہیں دکھائے
رو کر کہا۔ کہ سانس فقط آشکار ہے
سو اس کا کیا حساب کہ دم کا شمار ہے

(تصویر)

بیٹھے سرہانے جھولے کے شبیرؑ سر جھکائے　　اصغرؑ کے کان سے لب اعجاز نما ملائے
چپکے سے کچھ کہا کہ وہ سنتے ہی مسکرائے　　سوئے حسینؑ ہاتھ بھی بیساختہ بڑھائے
بولی سکینہؑ بابا نے مشکل کشائی کی
اماں۔ مبارک۔ آنکھ کھلی میرے بھائی کی

بچوں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ حضرت سکینہ (۴ سال کی دختر) سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھیں۔ "اماں۔ مبارک۔ آنکھ کھلی میرے بھائی کی"۔

ہاتھوں پہ لے چلے جو اُسے شاہِ اتقیا
بانو پکاریں۔ لونڈی کو صاحب اجلالیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا
بولیں خدا نے سب کی دُعا سے کرم کیا
لب پر تبسّم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں
ہم تم۔ کوئی نہیں۔ اِنہیں بابا ہی پیارے ہیں

ٹیپ کا یہ مصرع کیا قیامت ہے "لب پر تبسّم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں"*

زینبؑ نے پوچھا شاہ سے اے فخرِ کائنات
کیا آپ نے کہا؟ کہ جو چونکا یہ نیک ذات
شہ بولے ان کے دادا ہیں حلّالِ مشکلات
اس بے زباں کے کان میں میں نے کہی یہ بات
چلتے ہو؟ پہلوئے علی اکبرؑ میں سونے کو
آتے ہو؟ میرے شیعوں پہ قربان ہونے کو

جھولے سے اُٹھ کے قتل کے میداں کو دیکھئے
کیا لعل و دُر ہیں گنجِ شہیداں کو دیکھئے
لوٹے ہوئے علیؑ کے گلستاں کو دیکھئے
خنجر کے پھل کو، غنچۂ پیکاں کو دیکھئے
یہ سُن کے میری گود میں جھولے سے آئے ہیں
مقتل کو شوقِ تیر میں مُنہ کو پھرائے ہیں

یہ حضرت بانو (مادرِ علی اصغرؑ) نے سُن لیا۔

بانو پکاریں ان پہ تو سب رحم کھائینگے
بچّہ سمجھ کے پانی بھی دشمن پلائینگے
شہ بولے جو نصیب میں ہوگا وہ پائینگے
پہلے اُنہیں کے آگے اِنہیں لیکے جائینگے

رہائی صغیر خیالات

*لب پر تبسم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں۔ واقعہ کی ایسی تصویر مختصر و دلچسپ مانی و بہزاد بھی تو نہیں کھینچ سکتے دیکھئے جس موقع پہ واقعات کو مرزا مرحوم طول دینا چاہتے ہیں کس قدر پھیلاتے ہیں اصل واقعہ صرف اسقدر تھا کہ علی اصغرؑ پیاس سے جھولے میں بیتاب ہو گئے امام مظلوم بیبیوں کے شور کی آواز سُنکر خیمہ میں آئے کچھ پڑھا کان میں کچھ کہا اور علی اصغرؑ کو ہاتھوں پر اٹھا کر میدان کو لیکر گئے اتنے سے مضمون کو مصنف خیالات کے ذریعہ سے کس قدر پھیلاتے ہیں اور کیسے کیسے پہلو اور بات میں سے بات نکالتے جاتے ہیں جن خیالات کی طرف عام آدمی تو کیا عام شاعر کے بھی ذہن نہیں جاتے ۱۲ ثابت حقیر۔

خاطر سے اِن کی - پانی کے سائل بھی ہوئینگے
انجام کار یہ ہے - کہ ہم ان کو روئیں گے

جب حضرت بانوؑ نے یہ سُنا بیتاب ہو گئیں۔

بانوؑ نے دی قسم - کہ یہ فرمائیے نہیں گذری مَیں ایسے پانی سے لیجائیے نہیں
اب دل مرا نہ مانیگا - سمجھائیے نہیں اصغر کو دیجئے - مجھے - رُلوائیے نہیں
شہ بولے - جھولے میں جو یہ مرجائیں کیا کرو
بہتر یہی ہے - راہ خدا میں فدا کرو

حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں: -

اب تو ضرور جائینگے یہ رن میں جائینگے پانی اگر ملیگا تو ان کو پلائینگے
جیتا خدا جو لائیگا ہم لے کے آئینگے پر عمر ہی جو کم ہے تو کیونکر بڑھائینگے
بندے کا کچھ نہ زور - نہ کچھ اختیار ہے
مختار موت و زیست کا پروردگار ہے

امام حسینؑ کا سمجھانا

حضرت بانو ماں ہیں - ماں کی محبت اللہ اللہ - لیکن امام صابر سمجھاتے ہیں سمجھانے کے اثر کی تصویر دبیرؒ یوں کھینچتے ہیں: -

رخصت ... کرتے

سمجھانے پر حسینؑ کے - بانوؑ نے رو دیا دیکھا فلک کو یاس سے اور سر جھکا لیا
لیکر بلائیں بیٹے کی پھر یہ بیاں کیا واری سدھارو - خیر - جو مرضیٔ کبریا
دیکھوں - پھر آج گود میں کب تمکو لیتی ہوں
اللہ و پنجتنؑ کی ضمانت میں دیتی ہوں

المختصر

اصغر کو لے چلے جو شہنشاہ بحر و بر مُڑ مُڑ کے اُس نے کُنبے پہ حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہاتھ ماتھے پہ رکھا جھکا کے سر بانوؑ پکاریں پھیر کے مُنہ کو ادھر اُدھر

لوگو مرا کلیجا نکلتا ہے تھام لو
اصغر سدھارتے ہیں جہاں سے سلام لو

تصویر

ہاتھوں پہ لے کے اُس کو چلے شاہ کربلا — اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھتا ہے۔ دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا — اصغر پہ ماں نے ڈال دی اُجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرۂ پُر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا ماہتاب پر

حضرت علی اصغرؑ کو لے تو چلے۔ مگر غیرت اس خاندان پر ختم ہے۔ سوال کی عادت نہیں۔ پانی کا سوال ننھے سے بچے کے لئے کیونکر منہ سے نکلیگا۔ یہ سوچتے جاتے ہیں دبیرؔ اس حالت کو یوں نظم کرتے ہیں:۔

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفٰا — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہونگا کیا؟
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت بھی گر کرونگا۔ تو وہ دینگے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

ایسے خیالات دل میں آتے جاتے ہیں۔ کہ

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

سوال نہ ہوسکا۔ آخرش آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں۔ اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں۔ اور پھر صراحت فرماتے ہیں ع پانی کے تم سبھوں سے یہ امیدوار ہیں بلحاظ

ہوں یہ امیدوار ہیں"۔ لیکن یہ تو بعد کو فرمایا ہے۔ پہلے اس سے بچے کی بے قراری کی تصویر بوجہ پیاس کے یوں کھینچی ہے:۔

بچے کی بیقراری

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چپ ہوئے ۔۔۔ گہوارے میں پھوپھی نے جھلایا نہ چپ ہوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھلایا نہ چپ ہوئے ۔۔۔ رو رو کے سارے گھر کو رُلایا نہ چپ ہوئے

واں اشکبار تھے۔ تو یہاں بے قرار ہیں
پانی کے تم سبھوں سے یہ امّیدوار ہیں

دبیرؔ کا قلم رفتہ رفتہ اصل مدّعا کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرتؑ کی زبان پہ یہ الفاظ آ ہی گئے:۔

ابن شیر خوار

گر مَیں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہ گار ۔۔۔ یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
ششماہا۔ بے زباں۔ نبی زادہ۔ شیر خوار ۔۔۔ ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار

سن ہے جو کم۔ تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے۔ اور یہ مظلوم زادہ ہے

اس کی ماں کا دودھ بوجہ پیاس کے خشک ہو گیا ہے۔ اس کو کنایۃً یوں بیان کیا ہے:۔
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار۔ اور علی اصغرؑ کے سن اور ان کے بے خطا ہونے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

علی اصغر کا سن اور بے خطا ہونا

جز شیر اور کچھ نہیں ان کی غذا ابھی ۔۔۔ نے گھٹنیوں چلے ہیں نہ مکتب ہوا ابھی
بابا کا نام بھی نہیں منہ سے لیا ابھی ۔۔۔ یہ تو ہر ایک دین میں ہیں بے خطا ابھی

کیا کام ان سے بغض ہے تم کو اگر مرا
جانو خدا کا بندہ نہ سمجھو پسر مرا

معصوم بچہ سمجھ کر اس پر رحم کھاؤ۔ یہ پیاسا معصوم بچہ کون ہے:۔
یہ کون بے زباں ہے؟ تمہیں کچھ خیال ہے ۔۔۔ دُرِّ نجف ہے۔ بانوئے بیکس کا لال ہے

لومان لو۔ تمھیں قسم ذوالجلال ہے یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؑ کا تم سے طلبگار آب ہے
دیدو۔ کہ اِس میں ناموری ہے ثواب ہے

یہ فرماکر۔ حضرتؑ نے :۔

بین کا نشتر

پھر ہونٹ بے زباں کے چُومے جھکا کے سر رو کر کہا جو کہنا تھا۔ وہ کہ چُکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی۔ اے مرے پسر سوکھی زبان تم بھی دکھا دو۔ نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت امام حسینؑ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ (یہ گوشہ ملاحظہ ہو) :۔

حسرت بینیت

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں لی حرملہ نے شانے سے دوٹانگ کی کماں
ترکش سے چُن کے کھینچ لیا تیرِ جاں ستاں جوڑا کمان تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

تصویر شہادت (بےمثل)

کیا بن ننھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا سوکھے گلے میں خوں بھرا۔ دم اٹک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا ٹوپی گری زمیں پہ۔ منکا ڈھلک گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی۔ منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

منہ آسماں سے شہ نے پھرایا کہ کیا ہوا دیکھا نشانہ تیر کا وہ بےخطا ہوا
یعنی دوپھل حلق سے تیر جفا ہوا بچہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دودھ اُگلتے تھے اب خوں اُگلتے ہیں

پھر حضرتؑ فوج کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے :-

اس نے کہا تھا کیا؟ جو بھلا تم نے مارا تیر تم سے کلام کرتا تھا میں۔ یا کہ یہ صغیر

اور فرمایا - ع "تم نے ہمارے لال کی بھی کچھ حیا نہ کی"۔

اس کا جواب ہی کیا تھا - وہ شقی -

ہنس ہنس کے سب حسینؑ کے رونے پہ ہٹ گئے شہ نے وہ آہ کی۔ کہ دو عالم اُلٹ گئے

بچے کے دم نکلنے کی حالت دبیرؒ یوں تحریر کرتے ہیں :-

اصغر ہُمک ہُمک کے پدر سے لپٹ گئے ننھے سے ہاتھ پاؤں لرز کر سمٹ گئے

ہونٹوں پہ شہ کے ہونٹ ملے اور گذر گئے

اک بوسہ مُسکرا کے لیا اور مر گئے

باپ کی اُس وقت کی حالت نہایت مختصر الفاظ میں بیان کی ہے۔ یہ خیال پیش نظر رہے۔ کہ امام حسینؑ امام ہیں۔ شانِ امامت کو ملحوظ رکھ کر باپ کی بے قراری کی تصویر کھینچتے ہیں :-

شانِ امامت کا لحاظ اور مصیبت کی تصویر

لاشے کے مُنہ کو دیکھ کے کہنے لگے یہ شاہ بیچارگی کا وقت ہے اصغرا! خدا گواہ

ماں۔ بہنیں گھر میں۔ باپ پہ یاں نرغۂ سپاہ یہ ریگ گرم۔ اور یہ بدن نرم۔ آہ آہ

دل ساتھ نکلا پڑتا ہے کیونکر جُدا کروں

سونپوں کسے؟ لٹاؤں کہاں؟ آہ کیا کروں؟

تمام اعزّہ واقارب و اصحاب حضرتؑ کے کام آچکے ہیں۔ سوائے امام حسینؑ کے کوئی باقی نہیں۔ حضرتؑ خود بنفس نفیس ارادۂ جنگ فرماتے ہیں۔ عنانِ توسنِ قلم میدان کی طرف پھیرتے ہی دبیرؒ کی زبان وخیالات کا کچھ اور عالم ہوگیا۔ ملاحظہ ہو :-

جہاد کا سامان

اتنے میں بہرِ جنگ بڑھی فوج اشقیا شہزادیوں نے خیمۂ عصمت کا رُخ کیا٭

٭ اس موقع پر چھانٹنے میں فاضل مضمون نویس نے چند بند اس مضمون کے چھوڑ دئیے ہیں کہ خیمہ سے سیدانیاں مع مادر علی اصغر نکل پڑی ہیں اور تعبیر علی اصغر پر جو امام حسینؑ نے اس وقت بنائی تھی نالہ وزاری کی ہے۔ وہ بین قیامت کے بین ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شہ سے ہلال زین کو ملی بدر کی ضیا — پہنچا زبان تیغ سے بھی حکم کبریا
قربان ذوالجناح شہِ دیں پناہ پر
غصّہ تو پیچھے آیا۔ یہ پہلے سپاہ پر

اس بند کی ٹیپ پر نظر رہے:۔

محشر کے زلزلے نے عناں آکے تھام لی — نصرت کے ولولے نے رکاب امامؑ لی
چابک زنِ فلک نے کرن کی لگام لی — شامی تو کیا ہیں روز نے بھی راہِ شام لی
حیرت کی شکل خوف سے جنّ و ملک بنے
دو پاؤں۔ بھاگنے کو۔ زمین و فلک بنے

ضربِ شمشیر حسینی

بُو کی طرح دماغوں میں آئی۔ چلی گئی — مثلِ ہوا سروں میں سمائی۔ چلی گئی
مانند شعلہ باگ اٹھائی۔ چلی گئی — آندھی کی طرح آگ لگائی۔ چلی گئی
سینے میں صاف آتی تھی۔ اور صاف جاتی تھی
انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

ظلمت میں آنے جانے کو آبِ حیات تھی — اور روشنی میں نیّرِ اعظم کی ذات تھی
اندھیر کرنے کو یہ قیامت کی رات تھی — مُنہ سے نکلنا اس کیلئے ایک بات تھی
رن میں تو کافروں کے فقط حلق پر پھری
پر شہروں میں زبانوں پہ مثل خبر پھری

اس رنگ کے بعد مرزا صاحب دُوسرا (سین) رنگ دکھاتے ہیں۔ زبان اور خیالات کا رُخ اب بدل گیا:۔

ناگاہ شوق خلد کے گلزار کا ہُوا — اور حوصلہ بزرگوں کے دیدار کا ہُوا
ارمان ذوالجلال کے دربار کا ہُوا — سر کو خیال ہدیۂ غفّار کا ہُوا

حضرتؑ نے جب تلوار کو نیام میں رکھ لیا۔ ع سبط نبیؐ پہ نرغۂ اہل جفا ہُوا۔ اور ع زہراؑ کا چاند فوج کے بادل میں گھر گیا۔ حضرت امامؑ نرغے میں گھر گئے ہیں۔ ع ناگہ بلا کی طرح گرا لشکرِ جفا۔ اور ستمگر چاروں طرف سے حملہ کر رہے ہیں :۔

گھوڑے سے گرنے کی تصویر

نیزے لگے جو سینے میں تھرا کے رہ گئے بیٹھا جو تیر ماتھے پہ تیورا کے رہ گئے
شکرِ خدا زباں سے فرما کے رہ گئے گرنے لگے تو ہاتھوں کو لٹکا کے رہ گئے

اکبرؑ نہ تھے جلو میں نہ عباسؑ پاس تھے
مظلومؑ بیچ میں تھا۔ عدو آس پاس تھے

حضرتؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے ہیں۔ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں۔ ع
سجدے میں سر جھکا دیا ہاتھوں کو ٹیک کر

بوجہ خوف طوالت بند چھوڑتا جاتا ہُوں شمر (قاتل امام حسینؑ) آیا ہے :۔

آیا سرہانے تیغ بکف شمر رُوسیاہ بولا گلا کہ میں ہُوں پیمبرؐ کی بوسہ گاہ
دل نے کہا یہ سینہ ہے گنجینۂ اِلٰہ بیٹھا وہ اُس جگہ کہ نہیں جائے شرحِ آہ

اس ظلمِ نو سے چرخ کہن کانپنے لگا
ایسا حسینؑ تڑپے کہ رن کانپنے لگا

بعدہٗ حضرت زینبؑ کی بے تابی و بے قراری چند بند میں بیان کی ہے۔ سہ

اے آسماں کہاں ہے حسینؑ فلک جناب اے آفتاب کیا ہُوا زہراؑ کا ماہ تاب
کہہ اے فرات! پیاسوں کا سُلطاں کدھر گیا اے کربلا بتا ترا مہماں کدھر گیا
بھیجوں کسے تلاش کو، سب میرے مر گئے آنکھیں بہن کی ڈھونڈھتی ہیں تم کدھر گئے

حضرت زینبؑ کا یہ حال تھا :۔

حضرت زینبؑ کی کیفیت

چھریاں سی پھر رہی تھیں دل پاش پاش پر اک آہ آسماں پہ تھی ایک لاش پر

نہیں معلوم یہ مرثیہ کس سنہ میں کہا ہے۔ حالت کا بند مقطع سے چلتا ہے۔ سہ

زمانۂ لکھنؤ میں مصنف کی حالت

ہر چند طبع پر ہے ہجوم غم و ملال
شکوہ مگر کسی کا نہیں شکر ذوالجلال
برعکس ہے کوئی۔ تو کوئی برخلاف ہے
آئینۂ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے*

ملٹن اور دبیرؔ میں ایک اور خصوصیّت ہے۔ اور وہ خصوصیّت بلندی مضامین کی ہے۔ جس کی چند مثالیں دبیرؔ کے کلام سے حسب ذیل ہیں:-

ملٹن و دبیر کی خصوصیت مضامین عالی

(۱) اُگتا ہے تخم عفو جہاں وہ زمیں دکھا۔ (اس مرثیہ میں جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع یارب مجھے مرقّع خلد بریں دکھا) +

(۲) بے پردہ رُخ قہر الٰہی نظر آیا۔ (اس مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) +

(۳) نعل سم توسن سے شرارے ہوئے روشن + رن برج فلک بن گیا۔ تارے ہوئے روشن۔ (اُسی مرثیہ میں برہم ہیں صفیں الخ میں) +

(۴) روکا شہ دیں نے فرس حور لقا کو + ٹھہرالیا سرتاج سلیماںؑ نے ہوا کو (اُسی مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں الخ) +

(۵) اس حسن کا شعلہ نہ کبھی طور سے نکلا + ظلمت سے سکندر بھی نہ اس نور سے نکلا۔ (ایضاً) +

(۶) جانے میں رسولوں کی دُعا آنے میں تاثیر۔ (اُس مرثیہ میں جس کا مشہور مطلع یہ ہے ع مُفتنل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد) +

(۷) اس رخش کے مُنہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا + چلنے میں یہ سُرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا۔ (مرثیہ "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے" میں ہے) +

زمانۂ تصنیف

* جہاں تک مَیں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب مرحوم نے اُس زمانے میں کہا تھا۔ کہ جب لوگوں نے ان سے اور میر ضمیر صاحب ان کے اُستاد سے بگڑوا دی تھی میر ضمیر صاحب کے تمام شاگرد طرفدار مرزا صاحب کے شاگرد ہو گئے ہوئے تھے۔ غالباً یہ محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کا عہد تھا چنانچہ مقطع میں اُس کا اشارہ فرمایا ہے ع برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے۔ اس زمانہ تک میر انیس صاحب (مرحوم) لکھنؤ میں فیض آباد سے تشریف لائے تھے نہ اُنکی شہرت ہُوئی تھی۔ لہٰذا ان برعکس کو انیس سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اُس وقت تک انیس سے پیدا ہی نہ ہُوئے تھے + ۱۲ ثابت حقیر۔

(۸) طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ ہے + رویت ہلالِ نعل کی اس پر گواہ ہے۔ (اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع مشہور یہ ہے ع جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہوا) +

(۹) ذیل کا بند اس مرثیہ میں ہے ع برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد :۔

چہرہ چمنِ قدرتِ خلاقِ دو عالم ۔۔۔ خورشید ہے اس باغ کا اک قطرۂ شبنم
عیسٰیؑ ہے سخن ۔ ہونٹ طہارت میں ہیں مریمؑ ۔۔۔ اور روحِ مسیحا لبِ جاں بخش کا اک دم

ہر صنعتِ حق اک رخِ روشن سے عیاں ہے
جاں قالبِ آئینہ میں اس رُو سے رواں ہے

(۱۰) اور دور ہے قمر کو اُلٹ کر رمق کیا۔ (اس مرثیہ "گلگونہ شفق جو ملا حورِ صبح نے" میں ہے) +

(۱۱) اس مرثیہ میں "سرسبز ہو یا رب سخن اس ہیچ مداں کا" جناب پیغمبر آخر الزماںؐ کی نعت میں فرماتے ہیں "خود آیۂ رحمت ہے سخن وحیِ خدا ہے"۔ اور دوسرے مقام پر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۲) شیرازہ نہ خُلد فلک ۔ قالب قرآں + اُستادِ دبستانِ ازل نائبِ یزداں ۔ پھر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۳) ہے ترجمہ قرآنِ مبیں کا دہن ان کا + انوارِ الٰہی کا ہے مشرق بدن ان کا + کل دفترِ الہام ہے اک جزوِ تن ان کا +

(۱۴) مرثیہ مذکورہ میں فرماتے ہیں :۔

امید زباں قطع ہے خوبیِ بیاں سے ۔۔۔ دندانے ہیں دانتوں کے جدا تیغِ زباں* سے

(۱۵) اس مرثیہ میں "گلگونہ رخسارِ فلک گردِ سمِ رن کی" فرماتے ہیں ع سہمی سیہ الیسی کہ ہتھیلی کا بنی تل ہو +

* عبداللہ عامر نے صحابی اپنے بڑھاپے کی حالت یوں بیان کرتے ہیں ۔ع یوں کو اپنی قد باحسرت ربین برالسانانز [illegible] تمام دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے عبداللہ کو بڑھاپے کے سبب سے جو زبان بیان کو نقصان پہنچا ہے اسکو حضور صلعم (روحی لہ الفدا) سے عرض کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے ۔ کہ دانت گر گئے ۔ خوبیِ بیاں جاتی رہی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۶) اک سونے کا نگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر۔ اس مرثیہ میں ع "برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد" ہے ۔

علم ، وسعت نظر ، حکومت الفاظ پر

علم۔ وسعت نظر۔ بلندی خیالات۔ قدرت۔ حکومت الفاظ بیان پر یہ صفتیں جو ملٹن کے کلام میں ہیں۔ جناب مرزا صاحب کے کلام میں بھی ہیں علاوہ ان خصوصیتوں کے جو ملٹن اور مرزا کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور جن کا بیان مختصر طور پر ابھی کیا گیا ہے۔ ایک دو باتیں جو مرزا صاحب سے مخصوص ہیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

[illegible]

(۱) چہرہ یا رزم یا بزم یا سراپا وغیرہ میں مبکی مضامین پیدا کرتے ہیں۔ لڑائی ہو رہی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے گرد اڑ رہی ہے۔ اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎ یہ گرد اڑی رن میں کہ پانی نکل آیا۔ رن میں پانی نکل آنا آہ کیسا دلخراش مضمون ہے۔ فوج حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لئے بڑھی۔ علی اصغر اس وقت شہید ہو چکے ہیں۔ حضرتؑ مقابلۂ فوج کو تن تنہا بڑھتے ہیں۔ قبل اس کے کہ تیغ کھینچیں ؎ اصغر کو شہ نے پہلوئے اکبر میں رکھ دیا۔ ہائے دو جان گسل واقعہ نظم کر دئے۔ اور یاد دلائے۔ ایک حضرت علی اکبرؑ کی شہادت۔ ایک علی اصغرؑ کی شہادت۔ اور پھر ننھے بھائی کو نوجوان بھائی کے پاس سُلا دینا۔

اس مرثیہ میں (برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) حضرت امام حسینؑ کے سراپا کی تعریف لکھتے لکھتے ایک بند میں فرماتے ہیں ؎

سر عرش کا دستار گلابی کے تصدق — خون شہدا ریش خضابی کے تصدق
ہر جزو بدن پُرزے ہے ہر عضو جدا ہے — دفتر میں شہادت کے مگر چہرہ لکھا ہے

پروفیسر آزاد مرحوم کی زبانی دبیر مغفور

ذرا سی تلاش سے ایسے مضامین بکثرت ملینگے۔ مصنف آب حیات حضرت آزاد مرحوم لکھتے ہیں "مرزا دبیر صاحب شوکت الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اس میں جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنایے۔ الم ناک و دل گداز انداز جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں میں بادشاہ تھے"۔

روایات

(۳) روایتیں اکثر نظم فرماتے ہیں[۱]۔ مثلاً اس مرثیہ میں "قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا" واقعۂ خُمِ غدیر نظم کیا ہے۔ سینکڑوں اشعار نظم کر ڈالے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔ ع اک ضرب نہ اُس کی نہ دو عالم کی عبادت[۲] حضرت جبریلؑ آئے ہیں۔ اور پیغام خداوند متعال پہنچایا۔ حضرت پیغمبرؐ نے تمام ہمراہیوں کو جمع فرمایا۔ کُل بیابان بھر گیا۔ حضرت نے خطبۂ فصیح و بلیغ ارشاد فرمایا۔ اور مَن کُنتُ مَولاہُ فَھٰذا علیٌ مَولاہُ فرمایا ان واقعات کو اس مرثیہ (ع قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں بیان کیا ہے۔ حمدِ خداوند متعال۔ نعتِ پیغمبرؐ۔ مدحِ حیدرِ کرّارؑ کے گوشے اس مرثیے میں نکالے ہیں۔ موقع پر ترجمہ کا حسن دکھایا ہے۔ سہ ہم دونوں کو اک نور سے حق نے کیا خلقت[۳]۔ سہ میں جس کا ہوں مولا تو علیؑ اُس کا ہے مولا[۴]

اس مرثیۂ سے "سرسبز ہو بارِ سخنِ اس ہیچمداں کا" میں بھی ایک روایت نظم کی ہے۔ **عبداللہ بن عامر** (صحابی) کا خدمت حضرت پیغمبرؐ میں حاضر ہونا اور اولاد کی التجا کرنا۔ آنحضرتؐ کا دعا فرمانا۔ اور **ہند** کا پیدا ہونا۔ **یزید** سے شادی ہونا۔ حضرت امام حسینؑ کا

---

[۱] اس سے فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اہلِ مجلس کی (حالات تاریخی وغیرہ کی) معلومات بڑھتی ہے۔ اور دن بھر ہی واقعۂ کربلا کے چند حالات بار بار سُننے سے جو بعض شاعروں کے مرثیہ میں آدمی اُکتا جاتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں وہ حال سامع و ناظر کا نہیں ہوتا۔ زیادہ دلچسپی ہوتی ہے + ثابت۔

[۲] ضَربۃُ عَلیٍّ یَومَ الخَندقِ اَفضَلُ مِن عِبادَۃِ الثَّقَلَین کی طرف اشارہ ہے۔ حامد اس حدیث کو دوسرے موقع پر نظم فرمایا ہے۔ سہ حق نے کہا کہ ضربِ علیؑ میری ضرب ہے۔ افضل عبادتِ دو جہاں سے یہ ضرب ہے + ثابت۔

[۳] حدیثِ متواتر اَنَا وَ عَلِیٌّ مِن نُورٍ وَاحِد کا گویا ترجمہ ہے۔ اس حدیث کا تواتر دیکھنا ہو۔ تو عبقات الانوار کی جلد حدیث نور دیکھو + ثابت۔

[۴] حدیثِ متواتر مَن کُنتُ مَولاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَولاہُ الخ کی بابت۔ جلد اوّل و دوم عبقات الانوار دیکھنے کے قابل ہے۔ خدا کی قدرت۔ اسلام کی عظمت۔ علماء اسلام کی تصنیفات کی کثرت۔ ایمان کی حقیقت نظر آتی ہے + ثابت حقیر۔

مع بہتر اعزہ و اصحاب کے شہید ہونا۔ اہلبیت طاہرینؑ کا کربلا سے شام کو قید ہو کر جانا۔ ہندٌ کو خبر پہنچنا اُس کا رنج و الم وغیرہ وغیرہ بیان کئے ہیں۔ اس مرثیہ میں بھی ایک گوشہ پیدا کر کے ہند کی گفتگو لکھتے ہیں۔ اور جو مُوازنہ وہ درمیان حاکم شام (یزید) اور امام حسینؑ کے کرتی ہے۔ اُس کی تصویر یوں کھینچی ہے بہت سے بند ہیں۔ میں چند بند پر اکتفا کرتا ہوں:۔

وہ تخت نشیں دوزخ اسفل کا مکیں ہے
یہ گوشہ نشیں مہر نبوت کا نگیں ہے
وہ غول ہے یہ خضر ہے وہ شک یہ یقیں ہے
وہ سنگ زمیں یہ گہر عرش نشیں ہے
زنّار ہے وہ گردن ارباب خطا کا
اور نام خدا سبحہ ہے یہ دست خدا کا

وہ عار ہے یہ فخر ہے وہ ننگ ہے یہ نام
شیطاں کا وہ وسواس یہ رحمان کا الہام
وہ درد یہ تسکیں وہ ابذا ہے یہ آرام
وہ دیر ہے یہ کعبہ ہے وہ کفر یہ اسلام
وہ جہل میں بوجہل یہ دانش میں نبیؐ ہے
وہ بخل میں قارون یہ بخشش میں علیؑ ہے

یہ بندۂ معبود ہے وہ بندۂ زر ہے
یہ طور کا شعلہ وہ جہنم کا شرر ہے
وہ نحس ہے یہ نیک وہ عقرب یہ قمر ہے
وہ ناخن پا کفر کا یہ دین کا سر ہے
یہ خیر ہے وہ شر۔ یہ نکوئی وہ بدی ہے
وہ بُت ہے بلاشک یہ خلیل احدی ہے

وہ نار یہ فردوس۔ وہ زقوم۔ یہ طوبا
وہ زخم۔ یہ مرہم۔ وہ مرض اور یہ مسیحا
وہ سحر۔ یہ اعجاز۔ وہ فرعون۔ یہ موسیٰ
وہ قہر۔ یہ رحمت۔ وہ نجاست ہے یہ تقویٰ

---

* اُنہیں محترم صحابی عبداللہ ابن عامر کی بیٹی یہ ہند ہے۔ جس نے اہل بیتؑ میں پرورش پائی ہے۔ اُن کے قدر و مرتبہ سے خوب واقف ہے۔ اس لئے امام حسین علیہ السلام و یزید کا وہ مقابلہ الفاظ مندرجہ متن میں کرتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

برین

خاک شفا

ہر مصحف معبود کی صحت یہ فقط ہے[۵۵]

وہ حرف غلط، لفظ غلط، فرد غلط ہے

وہ زہر ہلاہل، یہ مجھے آب بقا ہے — وہ ہے مرض الموت، یہ تعویذ شفا ہے

وہ رہزن اسلام ہے، یہ راہ نما ہے — وہ سایۂ آسیب ہے، یہ ظل خدا ہے

نخوت ہے اگر ملک پہ اُس اہل جفا کو

مل جاتے ہیں یاں دونو جہاں ایک گدا کو[۵۶]

ان بندوں سے ... نفس کی قوت بھی ظاہر ہوتی ہے +

فصل ۵ مرثیہ کا چہرہ

(۴۷) ایک صفت مرزا کے کلام میں اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مرثیہ کا چہرہ نہایت زبردست ... ہوتا ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں ... ہو:-

گلگونۂ رخسار ... کی — ہر خار یہی ... کے چمن کی

خورشید نقیبانہ ... کی — ... شہنشاہ زمن کی

باندھے ہوئے ... نبوت کی ...

روح القدس آتے ہیں ... کی جلو میں

رخشندہ ہے ... کی ہے آمد — ... عمراں کی ہے آمد

جن پڑھتے ہیں کلمہ کہ سلیماں کی ہے آمد — سجدے میں ہیں سب قبلۂ ایماں کی ہے آمد

۵۵ اس بند کا چوتھا مصرع ... وہ خوف ... کہتے ہیں کتاب اللہ (قرآن) اور عترت (ائمہ اطہار) کو جناب رسول خدا نے اپنا یادگار چھوڑا ہے۔ حدیث ثقلین مشہور ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ... کی صحت صرف امام زمان کے دم سے ہے کیونکہ وہ اور کتاب اللہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے + ثابت۔

۵۶ ... قلمی پرانے مرثیہ ... برس پہلے کا ناں ہے + ثابت۔

پریوں کے پرے قاف میں بیہوش پڑے ہیں
پر خوف سے بالائے بدن بال کھڑے ہیں

دبدبۂ ظہور

رن میں خلفِ ضیغمِ داور کی ہے آمد　　رخشندہ ہیں ذرّے شہِ خاور کی ہے آمد
اعدا ہیں ہرن شیرِ دلاور کی ہے آمد　　دریائے تہوّر کے شناور کی ہے آمد
بالائے زمیں گرد سواری کی نہیں ہے
پردے میں بلا گردِ زمیں چرخِ بریں ہے

رن نور، زمیں نور، جہاں نور ہوا ہے　　ظلمت کا طبق نور سے معمور ہوا ہے
دریا صفتِ تختۂ بلّور ہوا ہے　　اب سوکھ کے کانٹا شجرِ طور ہوا ہے
عالم ہے ستاروں کا جو کانٹوں کی چمک پر
ہنستی ہے زمیں ذرّوں کے دانتوں سے فلک پر

کیا یُمنِ تجلّیٔ ورودِ شہِ دیں ہے　　روشن ہے فلک پر کہ زمیں عرشِ بریں ہے
جو ذرّہ ہے خورشید کی مسند پہ مکیں ہے　　نکہت وہ ہے جو صحنِ جناں رن کی زمیں ہے
اس جہد سے ذرّوں کی جو تقدیر لڑی ہے
دن کو گلِ خورشید پر آج اوس پڑی ہے

محشر ہے عیاں ہیبتِ سلطانِ زمن سے　　یک لخت رواں روح ہے اعدا کے بدن سے
شیروں کو تعرّض نہیں صحرا میں ہرن سے　　شاہیں کے پر جلتے ہیں اب کبکِ چمن سے
یہ مصحفِ رخ بلبلوں کے پیشِ نظر ہے
ہر باغ میں سیپارۂ گل زیر و زبر ہے

باراں ہے نہ رعد ہے نے برق فلک پر　　یہ اشک ہے وہ نالہ یہ آہِ دلِ مضطر
نے ماہ نہ خورشید نہ گردوں ہے نہ اختر　　وہ داغ وہ رعشہ وہ دھواں اور وہ جگر
الیاس و خضر کو ہوسِ سیر نہیں ہے

ستاروں پہ ثابت ہے کہ اب خیر نہیں ہے

اطلس کے بچھونے پہ فلک کو نہیں آرام — اس مرحلہ پہ ٹوٹا ہے کہ نیلا ہے سب اندام
ستاروں پہ ثابت ہوئی اب گردش ایام — خورشید سحر کیلئے اب حشر کی ہے شام
اک دم قدم گاوِ زمیں جم نہیں سکتے
گردش میں ہیں قطبین، فلک تھم نہیں سکتے

عدلِ شہِ والا کا چراغ اب ہوا روشن — فانوس پئے شمع بگولے کا ہے دامن
ہے ایک جگہ باز و کبوتر کا نشیمن — بجلی ابھی جل جائے جو دیکھے سوئے خرمن
اللہ رے اثر معدلت شاہ زماں کا
دل سوز شرر پنبہ کا ہے، ماہ کتاں کا

قدموں کی نگاہوں میں سماتا نہیں گردوں — کیا دب گیا ہے سر کو اٹھاتا نہیں گردوں
کس سمت بھٹکتا ہوا جاتا نہیں گردوں — پر امن کا گوشہ کہیں پاتا نہیں گردوں
گردش مہ و خورشید کو گردوں پہ نہیں ہے
یہ پتلیاں پھرتی ہیں دم باز پسیں ہے

شیروں کا نہ بیشہ ہے نہ آہو کا ختن آج — مچھلی کا نہ دریا ہے نہ بلبل کا چمن آج
لعلوں کا بدخشاں ہے نہ موتی کا عدن آج — مصر و حلب و زنگ ہے نے روم و یمن آج
رہ جائینگے خود برق کے پرکالے بھی جل کر
بہ جائینگے تلواروں کے جوہر بھی پگھل کر

کہتی ہے زمیں گنبد گردوں سے ٹھہر جا — ہستی سے ہے پیغام اجل رن سے گذر جا
شہرہ جو سنا رخش فلک سیر کا ہر جا — دل پھٹ گیا، بادل کا نہ پھر رعد بھی گرجا
بجلی کی تڑپ اور کڑک آج کہاں ہے
بن بن کے شرر نعل تگاور میں نہاں ہے

عفت پکارتی ہے مقامِ حجاب ہے شیعو! جناب فاطمہؑ کی یہ جناب ہے
حوّا[*] و آسیہؑ کا یہ ہاہم خطاب ہے زہراؑ کے رعب و دبدبے سے زہرہ آب ہے
جاری ہے منہ سے جاریۂ فاطمہؑ ہیں ہم
مخدومۂ کائنات کی یہ خادمہ ہیں ہم

ہر خشت روضہ دفتر حکمت کی فرد ہے موقوف یاں زمانے کا ہر گرم و سرد ہے
گرمی کا نے بخارنہ کلفت کی گرد ہے پر صاحبِ رواق کے پہلو میں درد ہے مزار
ہم تم یہ جانتے ہیں کہ سوتی ہیں فاطمہؑ
اس کی خبر نہیں ہے کہ روتی ہیں فاطمہؑ

شانِ خدا ہے صلِ علیٰ شانِ فاطمہؑ حیدرؑ کی جانماز ہے دامانِ فاطمہؑ
روزہ ہر ایک روز ہے مہمانِ فاطمہؑ کہتی ہے عیدِ فطر میں قربانِ فاطمہؑ
بہرِ نماز قوت کی تقلیل کرتی ہیں
تسبیح حق میں آپ کو تہلیل کرتی ہیں

بیہوش ہیں فضائلِ زہراؑ سے عقل و ہوش خود بے لباس اور خلائق کی پردہ پوش
عسرت سے بے حواس مگر یادِ حق کا ہوش فاقے سے چہرہ خشک ہے دریادلی کا جوش
مستغنی المزاج ہیں عالم نواز ہیں
زیور بے مثل ذات خدا بے نیاز ہیں

دیکھو مرثیہ ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ یا یہ مرثیہ:

بر ہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد ہر مورچہ لرزاں ہے سلیماں کی ہے آمد ۵
فرعونیوں پہ موسیٔ عمراں کی ہے آمد تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد قید بند

[*] حوّا زوجہ جناب آدمؑ اور آسیہ فرعون کی زوجہ تھیں جنہوں نے جناب موسیٰ کو گویا پرورش فرمایا تھا۔ جاریہ کنیز۔ خادمہ کے معنی پر ہے

جاری جاریہ کی رعایت و تجنیس لفظی ظاہر ہے ۱۲ ثابت۔

جن سیر کو نکلے تھے پرستے سے مُڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیمانؑ کے اُڑے ہیں

رن میں پسر فاتح خیبر کی ہے آمد — صف گرتی ہے صفدر شہ صفدر کی ہے آمد
تاج شرف و فخر سکندر کی ہے آمد — شاہ شہدا سبط پیمبرؐ کی ہے آمد
پیشانیٔ جن و ملک اب فرش زمیں ہے
چتر سر اقدس پر جبریل امیں ہے

خورشید ہے دن کو مہ نو شرم سے گھٹ کر — اغلب ہے کہ سیدھا فلک کج ہو الٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی پھٹ کر — اک سونے کا تنگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے
سیارے ہیں کیا رشک بدر چاند ہوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیر دو سر۔ ایک — قہر واجل و رعب بنہ جن و البشر۔ ایک
مولا کی سپر اور فلک ہفت سپر۔ ایک — افضال خدا۔ اور نظر فیض اثر۔ ایک
ہیبت ہے یہ بندہ کی و یا خوف خدا ہے
سر خود سے دل سینے سے۔ جاں تن سے جدا ہے

ہے چرخ ہے نے پشت نہ کہسار نہ قلزم — دہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم — جس طرح سے آندھی میں صدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اُڑتے ہیں مہر دل کے نگوں سے

نسخہ دفتر ماتم میں یہ بند نہیں ہے مگر ایک اور قلمی مرثیہ میں ہے۔ جو میرے پاس پُرانا لکھا ہوا ہے۔ اور جلد مراثی لو لکھنؤ کی میں ہے مگر اس میں ٹیپ غلط ہے۔ میں نے قلمی مرثیہ سے صحیح لکھ دی ہے + ثابت۔

نسخہ ۲ لف و نشر مرتب ہے + ثابت۔

یاں شور وہاں غل اِدھر آمد اُدھر آمد دیتی ہے فقط بے خبری کی خبر آمد
اب سینے میں دم کی نہ در آمد نہ بر آمد بالائے سر آفت ہے تو پیش نظر آمد
ہر تن کو ہے دشوار بچانا دل و جاں کا
آنا شہِ والا کا ہے جانا دل و جاں کا

آوازِ آنا العرش کی پیدا ہے زمیں سے ہے بسکہ دماغ اوج پہ نورِ شہ دیں سے
الفت ہے قدم گاہ شہِ عرش نشیں سے ہر جا ہے نیا فرش فرشتوں کی جبیں سے
سائے کے اگر پاؤں پھسل جائیں بجا ہے
پانی کے عوض نور کا چھڑکاؤ ہوا ہے

گدازِ دل

مرزا کے کلام میں گداز ہے۔ مرثیت ہے۔ مرثیہ خواں چند بند پڑھ کر مجلس کا مآل نکال لیتے ہیں۔ مجلس کو رُلانے میں محرّم الحرام میں ایسے مرثئے بہت کام دیتے ہیں۔ مصنف آبِ حیات لکھتے ہیں "حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ اور یہی اس کام کی علّت غائی ہے"+

صنعتیں

مرزا کے کلام میں صنعتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً طباق۔ تقابل۔ تضاد۔ مطابقت۔ تطبیق (جس کی شاخ مقابلہ ہے)۔ ایہام تضاد۔ ایہام تناسب۔ مراعات النظیر۔ توفیق۔ تناسب۔ ایتلاف۔ مشاکلہ۔ مزاوجہ۔ ارصاد۔ عکس۔ رجوع۔ لف ونشر۔ جمع۔ تفریق۔ تقسیم۔ تجرید۔ مبالغہ۔ مذہب کلامی۔ حسن تعلیل۔ تاکید المدح بما یشبہ الذم۔ تاکید الذم بما یشبہ المدح۔ اشباع۔ توجیہ۔ الہزل الذی یراد بہ الجد۔ تجاہل عارفانہ۔ قول بالموجب۔ تعجب۔ اعتراض۔ تجنیس مقلوب۔ ردّ العجز۔ لزوم مالا یلزم (جس کی شاخیں) بے نقط۔

بانقط۔ تحت النقط۔ فوق النقط (ہیں)۔ اور سجع ترصیع۔ ذوالقافتین۔ متلوّن۔ سیاق الاعداد وغیرہ وغیرہ ہیں +

مرزا صاحب بہت پُرگو تھے۔ مرثیوں کی تعداد صحیح تو کہیں دیکھی نہیں۔ لیکن سیکڑوں بلا مبالغہ ہیں۔ اس بات کا تو (افسوس) کسی کو خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ تحقیق کرے۔ کہ مرزا صاحب نے یا ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ انیس۔ مونس۔ انس۔ نفیس۔ اوج (مدظلہ)۔ وحید۔ رشید۔ عارف (مدظلہما) وغیرہ نے کس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انگریزی کے ہر کامل کی نسبت معلوم ہے۔ مثلاً (۱) ملٹن نے قریب آٹھ ہزار کے (۲) برگ و گلیڈاسٹن نے بھی اسی قدر (۳) شکسپیر نے سولہ ہزار۔ (میں حافظہ سے کام لے رہا ہوں)۔ اسی طرح اور نثار اور شاعروں کی نسبت لکھا ہے۔ جملہ معترضہ ذرا طولانی ہو گیا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب نہایت مستند اور پُرگو مرثیہ گو تھے۔ ایک کربلا کے واقعہ کو ہزار طرح سے باندھا ہے۔ جو شاعر دُنیا میں مشہور ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم یا کتاب سے مشہور ہیں۔ ایک کتاب یا نظم میں ایک مضمون بیان ہوا۔ اور پھر خاتمہ ہے۔ اور یہاں دیکھئے۔ کہ وہی ایک مضمون ہے۔ اور سیکڑوں مرثیوں میں نئی نئی طرح سے بندھتا چلا آتا ہے۔ اور ختم ہی نہیں ہوتا۔ بیابان کربلا کی دھوپ کی شدت لو اور گرمی کے ساتھ دشمنوں کی فوج کی کثرت اُن کی شقاوت۔ بیرحمی۔ سنگ دلی۔ بیوفائی۔ حرص۔ طمع زر۔ وعدہ خلافی ظلم و تعدّی۔ بُزدلی۔ بیحیائی۔ احسان فراموشی۔ کفران نعمت۔ ہتک اسلام۔ ناخدا ترسی۔ بخل۔ جہل۔ کج فہمی۔ الغرض جہان بھر کی بُرائیاں ایک طرف۔ دُوسری طرف صبر و شکر و تسلیم و رضا تحمل و حلم۔ استقلال و ثابت قدمی شجاعت

زہد و عبادت۔ تقوٰے و ورع۔ حسن خلق۔ مروّت۔ مراعات۔ عدالت۔ عفو۔ حیا۔ احسان۔ جود و سخا۔ دینداری۔ خدا ترسی۔ خدا پرستی۔ عزّت اسلام۔ اعلائے کلمۃ الحق۔ غرضیکہ جملہ صفات حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے ساتھ تین روز کی بھوک پیاس کے صدمے۔ اعزّہ و احباب کو میدان جنگ میں بھیجنا۔ اُن کی لاشیں اُٹھانا۔ اہل حرم کو سمجھانا۔ اپنی قلیل فوج کو جس کی تعداد بہتر (مشہور) ہے آراستہ کرنا۔ عرب کے آداب جنگ کے موافق ایک ایک کو قتال کے واسطے بھیجنا۔ وہ شجاعت و بہادری دکھلانا کہ جس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ غنیم کی کثرت فوج کے لحاظ سے کہ عقب خیمہ گاہ سے حملہ نہ ہو خندق کھودنا۔ رسالت پناہ کے کُنبہ کی حُرمت کا ہر مصیبت میں سب سے زیادہ خیال ہونا۔ اُس سے بالاتر رضائے خالق کا لحاظ کہ استقلال و صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ سربات ایسی تھی۔ جو رسول خدا کے نواسہ اور خدا کے برگزیدہ بندہ ہونے کو کما حقّہ ثابت کرتی تھی۔ حُرؒ کا عفو تقصیر۔ اُن کا شہید ہونا۔ اہلبیتؑ کے خیموں کی تاراجی۔ اُن کی اسیری اور شام کو جانا۔ امام زین العابدینؑ کا تپ میں مبتلا ہونا۔ نہ دوا ہے نہ غذا۔ پانی تک میسّر نہیں۔ پھر اُن کی اسیری اور دمشق کے قیدخانے کے مصائب۔ ہتک حرمت۔ یہ بڑے بیٹے پر گذری۔ اِن سے چھوٹے جناب علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی پیاس۔ نوجوان بیٹا جہاد کر کے واپس آتا ہے۔ کیسا جہاد؟ کہ اس پیاس اور دھوپ میں تن تنہا ہزار ہا لاکھوں سے مقابلہ و مقاتلہ کر کے اپنے اس قول کو ثابت کر دیا۔ "اَنَا تَلَکُمْ بِالسَّیْفِ اَحْمِیْ عَنْ اَبِیْ۔ ضَرْبُ غُلَامٍ ھَاشِمِیْ عَرَبِیْ تَاللہِ لَا یَحْکُمُ فِیْنَا بْنُ الدَّعِیْ۔ اَطْعَنُکُمْ بِالرُّمْحِ حَتّٰی یَنْثَنِیْ۔" اپنے والد ماجد کی حمایت و نصرت میں اِس طرح تم کو قتل کروں گا اور ایسی شمشیر زنی

اور نیزہ بازی کے جوہر دکھاؤنگا۔ کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔ کہ کسی ہاشمی قبیلہ کے لڑکے (نوجوان) سے مقابلہ ہُوا تھا۔ واللہ ہم اہلِ بیت رسولِ خداؐ پر حرام زادہ حاکم نہیں ہوسکتا۔" اب واپس آکر باپ سے پانی مانگتے ہیں۔ حسینؑ نے کس بے بسی کے عالم میں فرمایا ہے۔ کہ اپنی زبان میرے مُنہ میں دو۔ شاید تسکین ہو۔ بیٹے نے تعمیل حکم کی۔ مگر فوراً زبان نکال لی۔ عرض کرتے ہیں۔ بابا!! آپ کی زبان تو میری زبان سے زیادہ خشک ہے۔ الغرض روزِ عاشورا (سنہ ۶۱ھ) کی وہ دوپہر تھی۔ کہ دُنیا کے تمام رذائل و فضائل کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ حضرت حالی مدظلہ العالی نے ایسے دلکش اور پُراثر الفاظ میں حالات روزِ عاشور کی تصویر اپنے دیوان کے مقدمہ شعر و سخن میں کھینچی ہے۔ جس کو نقل کئے بغیر دل نہیں مانتا:۔

حضرت حالی و معرکۂ کربلا

"فضائلِ اخلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور اشرف اور کیا ہوسکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسا جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جُھکنا چاہئے تھا۔ اور جس کو اُن سے بے انتہا امیدیں ہونی چاہئیں تھیں۔ وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستانِ عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں۔ صغیر سن بچے اور سارا کُنبہ ہمراہ ہے۔ مدینے سے کُوفے تک مہینوں کی راہ طے کرنی ہے۔ جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے۔ اُن میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ کر چل دئے ہیں*۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا و رسولؐ کو درمیان دے کر نصرت و یاری کے وعدوں

*ان الفاظ سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ مدینہ سے جو لوگ ہمراہ چلے تھے۔ وہ جُدا ہو گئے۔ حالانکہ دراصل ایسا نہیں ہُوا۔ مدینہ سے جو وفادار چلے تھے۔ اُن میں سے بجز ایک شتربان کے، ور سب کے سب کربلا میں امام حسینؑ پر صدقے ہُوئے۔ بہادری سے لڑے۔ نام نمود سے شہید ہُوئے۔ جو لوگ رستے میں جابجا سے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ ضرور امام حسینؑ کو چھوڑ کر چلتے پھرتے نظر آئے۔ غالباً مولوی حالی مدظلہ العالی کا بھی یہی مطلب ہے + "مؤلف حقیر۔"

گھر ڈھانے یعنی خاندان نبوّت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر طیار اور کمر بستہ ہیں۔ نہ وہ اُن کو بددُعا دیتا ہے۔ نہ اُن کی شکایت کرتا ہے۔ نہ اُن پر غصّے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوےٰ کرتے ہیں اُن کو جتاتا ہے۔ اور اُن کے فرائض جو خاندان نبوّت کے ساتھ اُن کو بجالانے چاہئیں اُنہیں یاد دلاتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ اُمنگ ہے۔ کہ سب سے پہلے مَیں اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے۔ کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی۔ بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دُوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو طیار اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں[۵۱] کی یہ تمنّا ہے۔ کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے۔ کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے مَیں بنوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے۔ کہ اپنے بچّوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کرے۔ بھائی اِس فکر میں گھُلا جاتا ہے۔ کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے۔ تو بہن کو کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ چچا[۵۲] گو خود بھی تین دن کی پیاس سے بے قرار ہے۔ مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لیکن پیاسی بھتیجی کی بیقراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے۔ دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔

[۵۱] بھانجوں سے مراد عونؓ و محمدؓ پسران عبداللہ بن جعفر طیارؓ ہیں۔ جو حضرت زینبؓ ہمشیرۂ امام حسینؑ کے باوفا۔ بہادر مشہور عالم فرزند ہیں۔ اور بھتیجے سے یہاں قاسمؑ بن حسنؑ مراد ہیں۔ حالانکہ حضرت قاسمؑ کے اور بھائی بھی شہید ہوئے ہیں۔ وہ بھی بھتیجے امام حسینؑ کے ہیں۔ اسی طرح دو بھانجے اور بھی امام حسینؑ کے معرکۂ کربلا میں شہید ہوئے۔ جو حضرت مسلم بن عقیلؑ کے دو فرزند تھے۔ یہ دو فرزند غالباً اُن کے علاوہ تھے جو کوفہ میں شہید ہوئے حضرت مسلم کو امام حسین کی بہن بھی منسوب تھیں۔ اُنہیں کے یہ دو فرزند تھے۔ اس رشتہ سے بھانجے ہونے ثابت۔

[۵۲] حضرت عباسؑ بن علیؑ سے مراد ہے۔ جو امام حسینؑ کے بھائی اور وفادار۔ علمدار فوج اور ایک لاثانی شجاع تھے۔ ثابت۔

دو چُلّو پانی میں پیاس بُجھتی ہے۔ مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی۔ کہ ننّھے ننّھے بچّوں کی پیاس بُجھنے سے پہلے اپنی پیاس بُجھالے۔ وہ مشکیزہ بھر کر اُسی طرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے۔ تاکہ جلدی جاکر بچّوں کے خشک حلق میں پانی چُوائے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ اس پر بھی اُس کو اپنے بازوؤں کا کچھ خیال نہیں اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے۔ کہ مُبادا پانی ضائع ہو جائے۔ اور بچّے پیاسے رہ جائیں وہ سب حربے اپنے اُوپر لیتا ہے۔ مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا جب تک کہ زخموں سے چُور ہو کر گھوڑے سے نہیں گر تا +

بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی۔ اور مُنہ سے سانس تک نہیں نکالتی※۔ صرف اس خیال سے کہ جس مربّی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں۔ اُس کے دل پر میل نہ آئے۔ اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اُس کی اور اُس کی اولاد کی خیر مناتی ہیں۔ اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی +

※ بعض ناواقفوں کو ایسے مضامین مرثیوں میں دیکھ کر یا سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ ماں نے کس دل سے کہا ہوگا۔ کہ میرا بیٹا قتل ہو جائے۔ مگر امام حسینؑ کی جان کسی طرح بچ جائے۔ مگر جو لوگ امام حسینؑ کے عزیزوں اور رفیقوں کی وفاداری کو جانتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی ہُوا ہے۔ رہر بی بی اپنے فرزند کو امام حسینؑ پر گویا نثار کرتی تھی۔ اور شکر خدا بجا لاتی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علی اکبرؑ ہم شکل پیغمبرؐ کی والدہ ماجدہ نے اُن کو امام حسینؑ پر نثار کر دیا۔ اسی بنا پر جناب مرزا صاحب مرحوم نے اُن معظمہ کی زبانی ایک مرثیہ میں یہ خیال نظم فرمایا ہے۔ کہ ع اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو سے آؤ۔ ازبسکہ مولوی شبلی صاحب اس نکتہ سے ناواقف تھے (جس سے مولوی حالی صاحب واقف ہیں)۔ اُنہوں نے مرزا صاحب پر اعتراض جڑ دیا۔ مَیں نے اس کا مفصّل و مدلّل جواب مولوی شبلی صاحب کو دیا ہے۔ جو اپنے موقع پر اس کتاب میں درج ہے۔ وہ مقام ناظرین کے ملاحظہ کے قابل ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دو صغیر سن بھائی[1] جو صرف اس قصور پر کہ نبیؐ کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم کے حکم سے واجب القتل ٹھیرے ہیں۔ جلاد دونوں کے سر پر تلوار تولے کھڑا ہے۔ بڑا بھائی منتیں کرتا ہے۔ کہ پہلے میرا سر اُتار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے۔ کہ پہلے مجھ پر وار کر۔ ایک خدا کا بندہ[2] جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبیؐ کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے۔ باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُس کو ہر طرح دولت وجاہ ومنصب کی توقع ہے۔ اور اُن کا ساتھ چھوڑنے میں جان اور مال اور خاندان کی تباہی کا یقین واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے۔ وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں۔ جو اُس کا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حب جاہ و ثروت سے ہٹا کر رحم و ہمدردی و دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اُس کو ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے۔ کہ جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اُتار لیجئے۔ عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے لے چلئے۔ اور حاکم سے چل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا۔ جس کے لالچ میں وہ اِن تمام فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے۔ بلکہ بخلاف اس کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ باایں ہمہ وہ اِن تمام دُنیوی منفعتوں اور اُمیدوں پر خاک ڈال کر اُن ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نُصرت میں اپنی جان دینے کو فوز عظیم جانتا ہے۔ اور سب سے پہلے خاندان نبوت

---

[1] جناب مسلم بن عقیلؑ کے دو خورد سال یتیم بچوں سے مراد ہے۔ جو مسلم امام حسینؑ کے نائب اور چچا زاد بھائی تھے۔ اور جو کوفے میں امام حسینؑ کے حکم سے آئے اور کوفیوں سے بیعت امام حسینؑ لے کر چند روز ٹھیرے تھے کہ کوفی ان سے پھر گئے اور وہ شہید ہوئے۔ یہ دونوں یتیم قتل قید ہوئے۔ داروغہ محبس نے جو نیک نہاد مسلمان تھا ان بچوں کو چھوڑ دیا کہ مدینہ چلے جائیں۔ یہ بچے پھر گرفتار ہو کر قتل ہوئے + ۱۲ ثابت۔

[2] یہ خدا کا بندہ حُر ریاحی ہے۔ جو ایک ہزار یا اس سے زیادہ سواروں کا سردار اور نہایت بہادر اور صاف اور سچا شخص تھا۔ فوج یزید سے دلیرانہ نکل کر امام حسینؑ سے ملا۔ اور سب سے پہلے شہید ہوا + ۱۲ ثابت۔

پراپنی جان فدا کرتا ہے*۔ چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبیؐ کے ہمراہ ہیں۔ اور جو ایک ٹڈی دَل کے مقابلے میں اِس قدر قلیل ہیں۔ کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اُس کے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اُس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لئے اُس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دُنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی۔ بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُس کی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے۔ جو اُس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق اُن کی گردن میں اور دوستی اور اخلاص کی زنجیر اُن کے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع اُن کے اس تعلق کو قطع نہیں کر سکتی۔ ہر وقت یہ آرزو ہے۔ کہ کب اذنِ جنگ ملے۔ اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں۔ اور کب اس فرض سے سُبک دوش ہوں"۔

مرزا صاحب نے یہ مضامین سیکڑوں طرح سے سیکڑوں مرثیوں میں باندھے ہیں۔ اور نئی نئی طرح سے باندھے ہیں۔ بقول آتش مرحوم ؎

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی + جب سُنائی نئی سُنائی بات

یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مضامین کی آمد کا چشمہ برابر جاری ہے۔ اور اس طرح کہ اُسکو

*حر کے لفظی معنی آزاد کے ہیں۔ اس زمانے کے لوگ آزادی آزادی پکارتے ہیں۔ مگر اکثر آزاد کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی پابندی سے آزاد ہوں۔ حالانکہ آزاد کے یہ معنی ہیں کہ بداخلاقیوں سے الگ تھلگ رہے۔ حق کا حامی باطل کا دشمن ہو۔ میں نے ایک رباعی کہی ہے۔ جو مناسب موقع سمجھ کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ (رباعی) دل میں تھا اثر بہت ہادی کا + غم قتل کا نقصانہ خانہ بربادی کا + نکلا دوزخ سے رسیدھا جنّت میں گیا + کیا لطف اُٹھایا حُر نے آزادی کا + خدا ہر شخص کو حضرتؐ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے + ۱۲ شاہجہت رضوی۔

نہ ضعیفی۔ نہ نقاہت۔ نہ انقلابات زمانہ کوئی شئے خشک نہیں کرسکتی۔ (اس آگ کو موت ہی ٹھنڈا کرتی ہے۔بس) بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت کی آمد کے ساتھ میدان واقعات وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ طبع کی روانی بند ہی نہیں ہوتی۔ قیود نظم اور کمی واقعات سے زور بڑھتا ہی جاتا ہے +

بحور مستعملہ دبیر اور ان کی اکثریت

جناب مرزا صاحب کی طبع نے اکثر حسب ذیل بحروں میں غوّاصی کی ہے:۔

۱۔ بحر ہزج۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن۔ اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے +

۲۔ بحر مضارع۔ مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن۔ یا رب مجھے مرقع خلد بریں دکھا +

۳۔ بحر رمل۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیرؑ +

۴۔ بحر مجتث۔ مفاعلن۔ فعلاتن مفاعلن فعلن۔ روانہ نہر لبن کو جو شبیر خوار ہوا +

ایسے ہی بحروں میں مرثئے زیادہ* رنگ دیتے ہیں۔ جب ہم ایک مختصر سی نظم ایک بحر میں کہتے ہیں۔ تو دوسری نظم کے لئے اُس بحر میں مضامین درکنار الفاظ بھی نہیں ملتے۔ اور یہاں سیکڑوں مرثئے موجود ہیں۔ اللہ اللہ +

زیب شہادت امام حسینؑ و اصحاب امام مرحوم

حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ہمراہیوں سے وہ سبق حاصل ہوتے ہیں۔ کہ جو دین و دُنیا میں صراط مستقیم دکھاتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (جن کا مزار شریف اجمیر میں ہے) کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

*خصوصاً تحت لفظ مرثیہ پڑھنے میں یہ بحریں زیادہ سامعین پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور سوز میں بھی دوسری بحروں کا ان کا اثر کچھ کم نہیں ہے۔ مگر سوز میں بعض اور بحریں بھی زیادہ مؤثر ہیں۔ جن میں اکثر افسردہ دلگداز مرثئے پوربی و پنجابی زبان میں ہیں اور مرثیت کے لحاظ سے وہ مرثئے دبیر و انیس سے بہتر ہیں + ۱۲ ثابت حقیر۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

تحمل و صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور اُن کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکۂ کربلا میں ظاہر ہوئے۔ وہ مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے نہیں تھے[1]۔ امامؑ نے امامت سے (جو بیشک مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے ہے) کام نہیں لیا اور پھر امامؑ تو ایک ہی تھے۔ امامؑ کے عزیز و اصحاب گو اعلیٰ درجہ کے ظاہری و باطنی فضائل سے آراستہ و پیراستہ تھے لیکن معصوم تو نہ تھے یہ تمام سبق ہماری ہدایت کیلئے ہیں اور بہترین نمونے پیروی کے ہیں[2]۔ حضرت امام حسین علیہ السلام مذہب حقہ کیلئے لڑتے تھے۔ اور لڑائی بھی ایسی حالت میں جس میں شکست اور اپنی اور اپنے تمام اعزا کی شہادت اور گھر بار کا تاراج ہونا یقینی تھا +

مرزا صاحب کے آفتاب نظم سے روشن ترین شعاعیں اُس وقت نکلتی ہیں۔ اور مرزا کی طبیعت کا بحر ذخار اُس وقت جوش پر آتا ہے۔ اور جوار بھاٹہ کی انتہا کا پتہ اُس وقت ملتا ہے۔ جب وہ مدح اہل بیتؑ فرماتے ہیں۔ اس مرثیہ (ع قرآن مبین سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں فرماتے ہیں (شان جناب امیر علیہ السلام میں):-

یہ قبلۂ دیں۔ خوند ملک جبّۂ تسلیم یہ صدر نشین ہفت فلک یک قد تعظیم
یہ فرق میں شوکت حق افسر و دیہیم یہ جسم یقیں۔ علم خدا جامۂ تکریم

[1] انسانیت وہ چیز ہے۔ کہ اگر اُس کے اعلیٰ درجہ پر آدمی فائز ہو۔ تو فرشتوں سے بہتر ہے۔ پس یہ تمام امام حسینؑ کے ساتھی اعلےٰ درجۂ انسانی پر فائز تھے۔ اس لئے اِن سے ایسے کام ظاہر ہوئے جو ایک ادنیٰ درجے کے انسان کو بظاہر مافوق طاقت بشری معلوم ہوتے ہیں + ۱۲ بے بضاعت مؤلف۔

[2] پس دبیر و انیس اور ان کے ہم عصروں کے مرثیوں سے جو خوش اخلاقی کا سبق انسان حاصل کر سکتا ہے شائد مصری (اردو کی) کسی کتاب اخلاق سے حاصل کر سکے۔ اور انسان کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ ان کربلا والوں کے مصائب پڑھ کر اُس کو اپنی مصیبت ہیچ و پوچ نظر آتی ہے۔ اور اس طرح اپنی مصیبت پر صابر و مستقل ہو جاتا ہے + ثابت۔

مناقب میں جوشِ عقیدت

پیمائشِ پوشاکِ شرف ہاتھ سے کب ہو — نہ ذرعۂ افلاک جہاں ایک وجب ہو[۱]
آتا نہ اگر رُوئے زمیں پر قدمِ پاک — جائز نہ کبھی ہوتی تیمّم کے لئے خاک
گر بیچ میں ہوتا نہ سرِ سیّدِ لولاک — بے پاؤں کبھی گرد زمیں پھرتے نہ افلاک

پر ضعف سے ہلتا نہ فرشتوں میں کسی کا — ہوتا نہ رقم نام، پروں پر، جو علیؑ کا

اس طرز کے بہت سے بند ہیں۔ یہ امر کہ مدحِ اہلِ بیت میں جناب مرزا صاحب کا کلام بہت پُرزور اور جوش سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اُس مرثیہ (سرسبز ہو یا رب سخنِ اس ہیچمداں کا) کے چند بندوں سے بھی پورا پورا (جو جناب امام حسینؑ کی مدح میں اوپر نقل ہو چکے) ثابت ہوتا ہے۔ کلام میں ظرافت

مرثیے میں ظرافت

نہیں ہے۔ بیشک مرثیہ میں ظرافت کا موقع نہیں ہے۔ لیکن تاہم گوشے پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً جب کوئی پہلوان مقابلہ پر آتا ہے۔ اور اُس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اُس وقت ظرافت کے پہلو نکل سکتے ہیں[۲] +

---

۱ یہ بند مرزا صاحب کے دقیق کلام میں ہے۔ چاروں مصرع ذو قافتین ہیں۔ ایک قافیہ دو نشتین میں یقین کا ہے۔ دوسرا تسلیم و تعظیم و دیہیم تکریم کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جناب امیرؑ قبلۂ دین ہیں اور حمد ملک بمنزلہ پیشانی تسلیم ہیں۔ پیشانی تسلیم کا قبلہ کی طرف سجدہ میں جھکنا لازمی مقتدی ہے۔ جنابِ ممدوح صدر نشین ہیں۔ ساتوں فلک گویا قدِ تعظیم ہیں۔ صدر نشین کی تعظیم وہ ضرور کریں گے جو تعظیم کیلئے بنے ہیں۔ یہ جناب سرِ دوش نبی ہیں۔ خسرو کشورِ خدا بمنزلہ افسر و دیہیم ہیں اور یقین کے جسم میں اُن کا علم گویا جامۂ تکریم ہے۔ ان کے شرف کی پوشاک کی پیمائش کیونکر ہو سکے۔ کہ آسمانوں کے نو گز ان کے شرف کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک بالشت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فضائلِ علیؑ بیشمار ہیں۔ ۱۲ ثابت

۲ ظرافت میر کلام مرزا مرحوم سے الگ تھی۔ اور اسی طرح سے کبھی مرزا مرحوم نے فرمائی۔ مگر کسی طرف تھا کہ ملال اہلبیت کی ناکام (میر محمد رضا ظہیر کے کتب خانہ میں کچھ مرثیے میری نظر سے اب سے ۲۰ برس پہلے گذرے تھے جن میں ظرافت کے نمک کے ساتھ میر صاحب نے غضب کی تھیں مگر پھر وہ طباق کا طباق مرزا صاحب کے شاگرد شیخ محمد علی صاحب مشیر مرحوم نے اس طرح لے لیا جیسے کسی شخص سے کوئی بات چھین لے۔ پہلوان کے سراپا میں ظرافت کا پہلو نہایت ہی ذرا غور طلب ہے کیونکہ ایک مجلس میں ایک صاحب کے ایک مصرع پڑھنے پر (بھیرہ سامنے) تمام مجلس سن ہو گئی تھی اُس کا خیال سامعین کے دل سے آخر مجلس تک نہ جا سکا۔ جس وقت نہ ہوئی اور ذاکر مجلس عزا بجا دیکھا کیا ہو جاتا ہے۔ وہ مصرع یہ ہے "آیا تھا جب کتا، نہ بکتا"۔ بھاگا کہاں ان کو صاحب نے ہلکو بہت بتایا تھا پہلے وہ مجر بز بھی کچھ نہ دیکھے لوگ ہنس پڑے ممکن ہے زیادہ تر ملتا کا سبب یہ ہو کہ مستمعین دوسرے مقام پر بھی اکثر آیا مثل یہیں کھینچے تو مکرر کلمہ دیگا ۱۲ مولف

مرثیہ و تسلسل

تمام مرثیہ از مطلع تا مقطع دست و گریباں ہو۔ یہ بات اُن مرثیوں میں جو مَیں نے دیکھے ہیں نہیں پائی گئی[سلہ] +

مصرع سے مصرع۔ بند سے بند۔ بات سے بات مرثیہ میں از ابتدا تا انتہا پیدا ہوتی چلی جائے۔ اِس امر کا لحاظ اُن مرثیوں میں نہیں پایا گیا[سلہ] +

سلاست یعنی سلیس اور عام فہم الفاظ سے عالی و نازک خیالات ادا کرنا۔ اسکی بھی کمی پائی گئی[سلہ۳] +

سلہ۱ و سلہ۲ و سلہ۳ یہ بات کہ مرثیہ میں ایشیائی قصّوں یا مثنوی کی طرح سلسلہ ہو۔ بحث طلب ہے۔ مَیں اسی کتاب میں ایک دُوسرے موقع پر عرض کر چکا ہُوں۔ کہ عربی۔ فارسی۔ اردو کے عام اساتذہ کے مرثیوں میں ایسا تسلسل نہیں ہے۔ بلکہ کسی میں غزل کی شان ہے کسی میں قصیدہ کی آن بان ہے۔ مثال کے طور پر ایک عرب دُوسرے عجم تیسرے اُردُو کے سب سے اعلےٰ شاعر کا مرثیہ لے لیجیے۔ عربوں میں دعبل خزاعی کا وہ مقبول و مشہور مرثیہ پڑھئے۔ جو دعبل نے امام رضا علیہ السلام کی مجلس حضوری میں پڑھا جس کے چند شعر اوّل کے ملاحظہ ہوں۔ یہ مرثیہ دعبل بہت مقبول و مشہور ہے۔ بحار الانوار کی دسویں جلد میں بھی یہ مرثیہ ہے مگر میرے پاس وہ اصل کتاب مستطاب موجود نہیں ہے۔ اُس کا ترجمہ اردو مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ ہے۔ اُس کے صفحہ ۴۰۳ سے یہ مرثیہ لکھتا ہُوں:۔

مرثیۂ دعبل

(۱) أَفَاطِمُ لَوْ خِلْتِ الْحُسَيْنَ مُجَدَّلًا وَقَدْ مَاتَ عَطْشَانًا بِشَطِّ فُرَاتِ

اے (جناب) فاطمہؑ اگر تم دیکھتیں (امام) حسینؑ کو خاک پر پڑا ہُوا جس وقت کہ کنار فرات پر پیاسے قتل ہُوئے تھے۔

(۲) إِذًا لَلَطَمْتِ الْخَدَّ فَاطِمُ عِنْدَهُ وَأَجْرَيْتِ دَمْعَ الْعَيْنِ فِي الْوَجَنَاتِ

اُس وقت تم اپنا مُنہ پیٹتیں اور آنسو چشم ہائے مبارک کے رخسار اقدس پر بہاتیں۔

(۳) أَفَاطِمُ قُومِي يَا ابْنَةَ الْخَيْرِ وَانْدُبِي نُجُومُ سَمٰوَاتٍ بِأَرْضِ فَلَاةِ

اے فاطمہؑ! اے خیر البشرؐ کی بیٹی!!! اُٹھو اور نوحہ کرو۔ کہ آسمان کے تارے جنگل کی خاک پر پڑے ہُوئے ہیں۔

یہ تینوں شعر ہُوئے۔ اور یہ تینوں اشعار کس قدر مسلسل ہیں۔ کہ شاعر نے اوّل امام حسینؑ کے (بعد قتل) بے گور و کفن زمین پر

فارسی زبان کے مرثیہ گویوں کے تخلص

جب مرزا دبیرؒ نے مرثیہ کے میدان میں قدم رکھا اُسوقت حسب ذیل مرثیہ گو تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب میں لکھتے ہیں:-

(بقیہ ملاحظہ صفحہ ۴۸۳) پڑے رہنے کو بیان کیا۔ پھر اُن کے عزیزوں اور رفیقوں کا اُسی طرح بےگور و کفن جنگل میں پڑا ہونا (اشارۃً) بیان فرمایا۔ اب چوتھا شعر سنئے:-

قُبُورٌ بِکُوفَانٍ وَاُخْرٰے بِطِیْبَۃٍ وَاُخْرٰے بِفَخٍّ نَالَہَا صَلَوَاتٍ

اہلبیتؑ کی قبریں متفرق ہیں۔ کچھ کوفے میں ہیں۔ کچھ مدینہ منوّرہ میں بعض مقام فخ میں ہیں۔ اُن پر درود نازل ہو۔

اب اس شعر میں دعبل نے وہ سلسلہ شہدائے کربلا کا قائم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ فرمایا۔ کہ اہلبیتؑ ایسے پریشان ہوئے۔ کہ اُن کی قبریں بھی ایک جگہ نہ ہوئیں بعض کوفے میں مدفون ہیں۔ کوفہ میں جناب میثمؒ اور مسلمؑ ابن عقیلؑ اور اُن کے دو فرزندوں کی قبروں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور مدینہ منوّرہ میں جناب رسالت مآب صلعم کی لخت جگر جناب سیّدہؑ و جناب امام حسنؑ و امام زین العابدینؑ و امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ مدفون ہیں۔ اُن کی قبور مقدسہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور مقام فخ میں حسینؑ بن علیؑ بن حسنؑ کی قبر ہے +

ناظرین! دیکھئے وہ تسلسل کہاں قائم رہا۔ کربلا کے شہدا کا ذکر کرتے کرتے دعبل رحمہ اللہ کوفہ۔ مدینہ منوّرہ و مقام فخ کی قبروں کا بیان فرمانے لگے۔ زیادہ اشعار اس مرثیہ کے طول کے خیال سے میں نہیں لکھتا +

بیان محتشم

اچھا اب میں ملا محتشم کاشی رحؒ کے چہاردہ بند مقبول میں سے دو بند لکھتا ہوں یہ بات کہ ملا محتشم تمام ایرانیوں میں بے مثل مرثیہ گو ہیں۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ جس پایہ کے عربوں میں دعبلؒ ہیں اُسی مرتبہ کے محتشمؒ عجموں میں ہیں۔ اور یہ چودہ بند ایسے لاجواب ہیں۔ جن کی نسبت مشہور ہے۔ کہ آج تک کسی سے اس نظم کا جواب نہ ہوسکا۔ ملا محتشم کا کلیات (جس میں سے یہ دو بند لکھتا ہوں) مجھے مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی سلمہ اللہ والبقاء سے ملا۔ جو صاحب نجوم السماء کے فرزند ارجمند اور ایک کامل ادیب شاعر باخبر ہیں۔ اُن کی میں اس عنایت و محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں:-

کشتی شکست خوردۂ طوفانِ کربلا در خاک و خوں طپیدۂ میدانِ کربلا
گر چشم روزگار برو زار میگریست خوں میگذشت از سر ایوانِ کربلا
نگرفت دست دہر گلابے بغیر اشک زاں گل کہ شد شگفتہ بہ بستانِ کربلا

مرثیہ گوِ بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق فصیح۔ مردِ مسکین بصورتِ گدا۔ بطالعِ سکندر۔ مکروہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا سنا ظم خوب دبیرِ مرغوب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۴) اُوپر کے تینوں شعروں پر غور کرنے سے پایا جاتا ہے کہ شاعر بعد شہادت کے واقعہ کو لکھ رہے ہیں۔ یہ اچھا اب چوتھا شعر سُنئیے۔ جس میں شہادت کے ماقبل واقعہ کو لکھا ہے:۔

(۴) در آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں	خوش داشتند حرمتِ مہمانِ کربلا

اب اِس شعر میں کوفیوں کی بیوفائی کا بیان فرمادیا۔ کہ جنہوں نے مہمانِ کربلا کو پانی بھی نہ دیا۔ پھر فرماتے ہیں:۔

(۵) بودند دیو و دد ہمہ سیراب و می مکید	خاتم۔ ز قحطِ آب سلیمانِ کربلا

یہ شعر ضرور شعر ۴ سے دست و گریباں ہے۔ اور نیچے کا شعر گو اس سے متعلق ہے۔ مگر واقعہ مابعد شہادت کا منظوم فرمایا ہے:۔

(۶) زاں تشنگان ہنوز بعیّوق می رسد	فریاد العطش ز بیابانِ کربلا

(۷) آہ از دمیکہ لشکرِ اعدا نہ کرد شرم	کردند رو۔ خیمۂ سلطانِ کربلا

اب پھر اس ساتویں شعر میں خیامِ اہلبیتؑ کے غارت ہونے کا بیان فرمادیا۔ اسی طرح بیت ہے جو حسبِ ذیل ہے:۔

آں دم فلک بر آتشِ غیرت سپند شد	کز خوفِ خصم در حرم افغاں بلند شد

یہ دُوسرے نمبر کا بند تھا۔ اب ایک بند بارھویں نمبر کا بھی لکھے دیتا ہوں:۔

(۱) اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردۂ	وز کیں چہا دریں ستم آباد کردۂ

(۲) بر طعنت ایں بس ست کہ با عترتِ رسولؐ	بیداد کردہ خصم و تو امداد کردۂ

یہاں تک آسمان کا شکوہ ظلم و بیداد تھا۔ اب مصنف علام نے ایک عبیداللہ بن زیاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں:۔

(۳) اے زادۂ زیاد نکردست ہیچ گہ	نمرود ایں عمل کہ تو شدّاد کردۂ

(۴) کامِ یزید دادۂ از کشتنِ حسینؑ	بنگر۔ کرا بقتل کہ۔ دل شاد کردۂ

(۵) بہر خسے کہ بار درختِ شقاوت ست	در باغِ دیں چہ باگل و شمشاد کردۂ

(۶) با دشمنانِ دیں نتواں کرد آنچہ تو	با مصطفٰےؐ و حیدرؑ و اولاد کردۂ

"بار احسان اہلِ دول کا نہ اُٹھایا"۔ ایسے بڑے بڑے صاحب کمال تھے۔ مگر دبیرؒ نے
ثابت کر دکھایا۔ کہ اُن کے لئے گنجائش ہی نہ تھی۔ بلکہ خاص جگہ خالی تھی۔ یا یوں کہو۔

(بقیہ کا نوٹ صفحہ ۴۸۳ کا)

بیداد (۷) علطے کہ سودہ لعل لب خود نبیؐ بر آں | آزردہ اش بہ خنجر فولاد کردہٗ

ترسم ترا دمیکہ بہ محشر درآورند | از آتش تو دود بہ محشر برآورند

یہ تو عرب و عجم کے اعلے سے اعلے درجہ کے مرثیہ گویوں کی نقلیں حقیر نے پیش کیں۔ اب ہندوستان میں آئیے۔
اردو کے شاعروں میں میرؔ و سوداؔ لاجواب مانے جاتے ہیں۔ یہ مصرع جناب شیخ ناسخ کا مثل کی طرح زبانوں پر ہے ع آپ
بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں۔ اور سوداؔ کی اُستادی کے لئے یہ لکھ دینا کافی ہے۔ کہ میرؔ ایسے عالی دماغ شاعر نے اُنہیں کو
پورا شاعر مانا۔ اور شعرائے مابعد بھی اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جناب ناسخ مرحوم فرماتے ہیں: ۔ ؎

کب ہماری طبع سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب | ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

اور جناب مرزا دبیرؔ مرحوم فرماتے ہیں۔ ع سوداؔ کے مرثئے کا تو ممکن نہیں جواب۔ اب ان میرؔ و سوداؔ کے مرثیوں
کو دیکھئے۔ کہ یہ کس قدر تسلسل کا مرثئے میں خیال رکھتے ہیں +

حضرت میرؔ کا تو صرف ایک مربع مرثیہ آج ملتا ہے۔ وہ بھی جناب سوداؔ کی بدولت۔ کہ اُنہوں نے اعتراضات کرکے
اُس کو لکھا ہے۔ اور وہ کلیات سوداؔ میں صفحہ ۸۸ تا ۸۹ پر (دیوان مرثیہ میں) چھپا ہے۔ اور وہ مرثیہ مربع یہ ہے :۔

مثلث مرثیہ (میرؔ)

(۱) دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے | مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے | حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے

(۲) محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے | ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی واے ویلا مچی ہے | کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

(۳) کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا | وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا | قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

(۴) ہے چاروں طرف ہو رہا شور محشر | زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر

کہ مرزا صاحب نے جگہ پیدا کر لی +

جناب مرزا دبیر صاحب الشان کے جامہ میں فرشتہ تھے۔ زہد و ورع۔

مرزا فرشتہ صفات تھے

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

حسینؑ ابن علیؑ پر چلایا ہے خنجر ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

اُوپر کے دو بندوں میں تو شہادت کی رات کا ذکر فرما رہے تھے۔ یکایک روز عاشور بعد عصر شہادت کا حال تیسرے اور اور چوتھے بند میں نظم کر گئے۔ اب فرمائیے۔ وہ سلسلہ بندی مثنوی کی ایسی کہاں ہے +

اب خود حضرت سودا کے مرثئے کو لیجئے۔ اور مرثیہ بھی وہ مرثیہ جو چوٹی کا ہے۔ سوز میں بھی پڑھا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ کلیات سودا میں صفحہ ۵۲۵ پر درج ہے:۔

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے انصاف سے جواب دو حیدرؑ کے واسطے

وہ بوسہ گہ نبی تھے پیمبرؐ کے واسطے یا ظالموں کی برِش خنجر کے واسطے

چار بند انہیں اسلحہ (تیر۔ تلوار۔ نیزہ۔ تبر۔ کارد) کی نسبت لکھ کر فرماتے ہیں:۔

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی بَیر ان کی سی پر قساوت قلبی نکی مَیں سیر*

پینے دیں آب انس سے لے تا بوحش و طیر مانع ہوں ابن ساقی کوثر کے واسطے

بند مذکورہ میں اس بات کو بیان فرمایا تھا کہ اہلبیت اطہار کو کلمہ گویوں نے پانی بھی نہ پینے دیا۔ اب ذیل کے بند میں مصنف علام ایک دوسرے واقعہ جانسوز آتش زنی خیام کو بیان فرماتے ہیں:۔

اُمت ہو وہ کہ خانہ دیں کی ہو پاسباں یا لُوٹ لیوے اپنے پیمبرؐ کا خانماں

آتش برائے سوخت و بیز آئی تھی درِ جاں یا دینے کو وہ فاطمہؑ کے گھر کے واسطے

اب پھر مصنف مرحوم تمام شہدائے کربلا کی شہادت ذیل کے دو بندوں میں لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ پہلے کا ہے۔ اور واقعہ اول الذکر (آتش زنی خیام) مابعد کا واقعہ ہے:۔

راوی لکھے ہے خرد و کلاں ان میں جب مُوا نیزے سے اور تیر سے سب کا لہو چُوا

ششماہہ طفل اصغرؑ معصوم تک ہُوا طعمہ عقاب تیر ستمگر کے واسطے

* دوسرے مصرع میں "مَیں" "مَیں نے" کی جگہ پر آیا ہے۔ اُس زمانے میں ایسی صورت "نے" کا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ بول کر حذف کر دیا کرتے تھے۔ اور [illegible]

تقوے و پرہیزگاری - جود و سخا - ایثار و ہمدردی وغیرہ کا اُن پر خاتمہ تھا - ایسے پاکیزہ نفس کی سوانح عمری لکھنا ایک واجب کفائی تھا - جس کو بحمد اللہ آپ نے ادا کیا - اور نہایت محنت سے ۔

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

تنہا پھر اُس زمیں پہ رہا شاہِ کربلا — اُس کا بھی تیغ ظلم سے آخر کٹا گلا
بعد اِس ستم کے خیمہ ہوا موردِ بلا — غارتگروں کے ہاتھ سے زینب کے واسطے

اب پھر تاراجی خیام اہلبیت کا حال بیان فرماتے ہیں - مگر اس بند میں کمال کیا ہے - واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے:-

خیموں میں جب دھنسے وہ لعیں چھاتیاں تنے — بیٹی چھپی تھی ماں کنے - ماں بیٹی کے کنے
کیا ہووے اُن غریبوں پہ جن پر یہ آبنے — جز یہ کہ دیں خدا و پیمبر کے واسطے

مرثیہ میں مثنوی نظم کا ایسا تسلسل لازمی نہیں

المختصر عرب و عجم کے جتنے شاعر کامل مرزا صاحب کے قبل گذرے ہیں - اُن میں سے مرثیہ میں تسلسل کا ہونا کسی ایک نے بھی لازم نہیں سمجھا - بنی نوع انسان کی طبیعتوں کا مذاق بھی مختلف ہے - کوئی تو مسلسل واقعات و حکایات منضبطہ کو پسند کرتا ہے - کسی کو ایک حال سلسلہ وار سننا اجیرن ہو جاتا ہے ۔

بہرحال مرزا صاحب کے مرثیوں میں بھی مثنوی اور انشائی قصوں کی ایسی سلسلہ بندی عام طور پر نہیں ہے - بلکہ اکثر قصائد کی شان غالب ہے - اور جب وہ ایک واقعہ بیان کرتے کرتے دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں - تو تشبیب و گریز کا لطف آتا ہے - اور نہایت خوبی سے ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ سے پیوند لگاتے ہیں - مگر اب مشکل یہ آپڑی ہے - کہ اُن کی اصلی ترتیب بھی موجودہ مطبوعہ مرثیوں میں قائم نہیں رہی ہے - نساخ کے جواب میں مرزا محمد رضا معجز مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب (تطہیر الاوساخ) میں کیا اچھی بات فرمائی ہے - کہ اکثر مرثیہ پڑھنے والے ایک مرثیہ کے بند دوسرے میں شامل کر لیتے تھے - اکثر بند اختصار کی ضرورت سے کم کر دیتے تھے - انہیں لوگوں کے بستوں کے مرثئے چھپنے کو پہنچے اور چھپے - خصوصاً اُن مرثیوں میں (علاوہ زیادہ غلط ہونے کے) یہ عیب زیادہ دیکھا گیا - جو مطبع منشی نول کشور آنجہانی میں چھپے ہیں - اور مرزا صاحب پر کچھ منحصر نہیں - یہ بے ربطی جناب میر انیس مرحوم کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے - حالانکہ زمانہ جانتا ہے - کہ میر صاحب مغفور تسلسل کا بہت

اس مضمون کو پڑھ کر کوئی صاحب شاید یہ فرمائیں یا دل میں خیال کریں۔ کہ موازنہ دبیرؒ و انیسؒ نہ کیا۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ اس مضمون کا یہ مقصد نہ تھا۔ کہ موازنہ کیا جائے لیکن مجھ کو حضرت انیس مرحوم سے بھی اس قدر عقیدت ہے۔ کہ میں یہ کہے بغیر اس مضمون کو ختم نہیں کر سکتا۔ کہ میری رائے میں جتنے قلم کے بہترین مصوّر روئے زمین پر گذرے ہیں

حضرت انیسؒ کے کمال کا اعتراف

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) خیال فرماتے ہیں۔ اور یہ بات اُن کے مشہور کمالات میں سے قابلِ مدح ہے۔ مگر کاتبوں سے سب مجبور ہیں۔ ہمارے مخدوم و مکرم جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب نے یہ خط مجھے مقام ڈومس (نزد سورت) سے لکھ کر ارسال فرمایا تھا۔ ڈومس میں جناب ممدوح اپنے علاج و تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مقیم تھے۔ وہیں چند کتابیں ساتھ لے گئے تھے۔ اُن میں ہی مطبع نولکشور کی اُن چھاپی کی مطبوعہ ایک یا دو جلد (مراثی دبیرؒ) بھی تھی۔ اُن مرثیوں کی نسبت یہ کہنا (کہ از مطلع تا مقطع دست و گریباں نہیں ہیں) بالکل صحیح ہے۔ دفتر ماتم کی جلدوں میں اس قدر بے ربطی نہیں ہے۔ مگر (بقول مجتہد مرحوم) ذاکروں کے تصرف سے اُس کے مطبوعہ مرثیے بھی بہت کم بچے ہیں۔ پھر بھی بعض مرثیے مطلع سے مقطع تک دست و گریباں ہیں۔ اور مصرع سے مصرع اور بند سے بند چسپاں ہے۔ اور بات میں سے بات نکلتی چلی گئی ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ سلاست کم ہے۔ اور عموماً عام فہم الفاظ نہیں ہیں۔ یہ بات بھی ذرا غور طلب ہے۔ اور مولوی شبلی صاحب کے جوابات میں میں اس کو مفصل لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا کہوں گا۔ کہ مرزا صاحب نے جس زمانہ (قبل غدر ۱۸۵۷ء) میں وہ اکثر مرثیے کہے ہیں۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ میں عربی و فارسی کے الفاظ بہت بولے جاتے تھے۔ اور جب عام طور پر بولے جاتے تھے۔ تو وہ عام فہم بھی تھے۔ آج نہیں بولے جاتے۔ تو عام فہم بھی نہ رہے۔ پس سچ یہ ہے۔ کہ وہ الفاظ آج تو واقعی عام فہم نہیں ہیں۔ مگر اُس زمانے میں لکھنؤ میں عام فہم و سلیس تھے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے۔ کہ بلاغت کے لئے کلام کا مقتضائے حال کے موافق ہونا ضروری ہے۔ پس جس جس موقع پر مرزا صاحب امام حسینؑ یا اُن کے اہلبیتؑ یا اصحاب کی زبانی کوئی کلام لکھتے ہیں۔ وہاں عربی الفاظ لاتے ہیں۔ جو اہلِ عجم کی زبانوں پر جاری ہیں۔ اور یہی شان بلاغت کی ہے۔ اُس موقع پر اگر عام لوگوں کے عام فہم الفاظ بولیں تو وہ نظم پایۂ بلاغت سے گر جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ کچھ کلام مرزا مرحوم ضرور دقیق ہے + ۲، ثابت ہے لطافت۔

عبارت ... معانی ... الفاظ

مثل ہومر۔ ورجل۔ ڈینٹی۔ فردوسی۔ کالی داس۔ شیکسپیر۔ حضرت انیسؔ کے پہلو بہ پہلو کرسی نظم پر جلوہ افروز ہیں +

خاکسار دارین

حامد علی

از سمر لاج ڈومس۔ نزد سورت ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۱۲ء

باب شانزدہم۔ آفتاب میں بڑے بڑے داغ

فصل ۱ آفتاب میں داغ

اِس زمانے کی تحقیقات میں آفتاب میں بڑے بڑے داغ دُوربینوں سے نظر آئے ہیں۔ اور حال کے نجومیوں نے مان لیا ہے۔ کہ آفتاب میں دھبے ہیں۔ مولوی شبلی صاحب کو شمس العلماء کا روشن خطاب ملا۔ اس سبب سے وہ آفتاب ہوئے۔ تو اُن میں بھی داغوں کا ہونا لازمی ہوگیا۔ پس پس جو جو داغ اُن میں یعنی اُن کی کتاب موازنہ انیسؔ و دبیرؔ میں نظر آتے ہیں۔ میں نے اُن کو سات قسم پر منقسم کیا ہے۔ نمبر وار الگ الگ ہر قسم کو بیان کرونگا:۔

(۱) ناواقفی یا نافہمی کا داغ

نافہمی کی ... نافہمی کے ... و ... سے

ناظرین! مجھ کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ دُوسری قوموں کا یہ حال و کمال ہے۔ کہ جب وہ ہمارے حالات وخیالات کو بیان کرتے ہیں۔ تو اکثر جزئیات تک نہایت صحیح بیان فرماتے ہیں۔ مَیں اگر اس موقع پر علماء حکماء یُورپ کا (تمثیلاً) بیان کروں۔ تو شاید آپ یہ فرمائینگے۔ کہ ابھی یُورپ کے علم وفضل کا مقابلہ ہندوستان نہیں کرسکتا۔ لہٰذا میں ایک شریف عالم بنگالی کا نام لیتا ہُوں۔ وہ کون؟ مسٹر (بابو) شیاما چرن سرکار۔ دیکھئے! شرع محمدی کے کیسے کیسے باریک ومشکل مسائل پر

نوٹ لکھ کر پانی کر دیا ہے۔ کیسے کیسے ہمارے عقائد و رواج بیان فرماتے ہیں۔ خدا کی شان نظر آتی ہے۔ ہندو صاحبوں میں ایسے ایسے اہل علم بہت سے ہیں۔ مَیں نے تمثیلاً صرف ایک صاحب کا نام لیا ہے + اب ہمارے مولوی **شبلی** صاحب کی معلومات کو ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) جن کے بزرگ نہ معلوم کے سو برس سے نسلاً بعد نسلٍ مسلمان چلے آتے ہیں۔ (۲) اور ایک بڑے دار العلوم (ندوۃ العلما) کے ممبر ہیں۔ (۳) برسوں سے لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔ (۴) تمام [illegible] شام و حجاز وغیرہ (گو یا) دیکھے ہوئے۔ (۵) بڑی بڑی مشہور کتابوں کے مصنف و مؤلف۔ بااین ہمہ اُن کی معلومات کی یہ کیفیت ہے۔ کہ

میر انیسؒ و ایطا

(۱) موازنہ کے صفحہ ۲۲۷ میں (میر انیس مرحوم پر اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہوئے) فرماتے ہیں۔ کہ "اکثر جگہ (میر صاحب کے کلام میں) شائگاں قافئے ہیں۔ چنانچہ نساخ نے بہت سے اِس قسم کے شعر نقل کئے ہیں۔ مجیب {مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم جنہوں نے تمام اعتراضات (متعلقہ دبیر و انیس) کے نقد کو معقول جواب دئے ہیں} نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ وہ یوں نہیں۔ یوں ہیں۔ مثلاً اِس بند میں

شہ مرداں

ناگاہ بڑھی فوج ہُوا جنگ کا ساماں　　اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہ مرداں
شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیروں کا باراں　　تلوار علم کر کے کہا یا شہ مرداں

شہ مرداں مکرر آیا ہے۔ مجیب صاحب کہتے ہیں۔ کہ دوسرے مصرع میں شہ مرداں کی بجائے شہ ذی شاں تھا۔ غلط نویسوں نے ذیشاں کا "شہ مرداں" بنا دیا۔ لیکن اِس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اور اگر اس کو وسعت دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوے کیا جاسکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا۔ اِس شعر میں دوسرے اعتراض ہی غلط ہے۔ کیونکہ

شہ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں۔ اِس لئے قافیہ مکرر نہیں"۔ یہاں میں نے مولوی صاحب کا ارشاد اُنہیں کے الفاظ میں لکھ دیا۔ ہر چند ذرا طول ہُوا۔ اب میں ادب سے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہُوں۔ کہ (غدر ہو جانے کے بعد جو آج کل ایران میں ہو رہا ہے) ایران کے ایک سرے سے چلئے۔ بلوچستان و پنجاب ہوتے ہُوئے تمام ممالک متحدہ و متوسط و بنگال و بمبئی و راجپوتانہ و مدراس وغیرہ کی سیر فرمائیے شیعوں اور صوفیوں کے بچے بچے سے پُوچھئے۔ اگر ایک بچہ بھی کہدے۔ کہ شہ مرداں امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ تو میں مان لُونگا کہ آپنے درست فرمایا۔ افسوس ہزار افسوس ایسے مشہور لفظ کی تحقیق میں ایسی ٹھوکر کھائی۔ جناب امیرؑ۔ شاہِ مرداںؑ۔ شیرِ خداؑ۔ شاہِ نجفؑ۔ یہ تو ایسے مشہور القاب ہیں۔ کہ بجز امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے کسی دُوسرے امام یا بزرگ کو کہتے ہی نہیں۔ کسی ایرانی کا مشہور شعر ہے۔ ؎

شاہِ مرداں۔ شیرِ یزداں۔ قوتِ پروردگار لا فتیٰ اِلّا علیؑ لا سیف اِلّا ذوالفقار

ناظرین! جو بزرگوار شاہ مرداں کے مفہوم کو نہ سمجھیں۔ وہ زبان اُردو بھلا کیا جانیں۔ اور دبیرؔ و انیسؔ کے کلام میں کیونکر انصاف فرما سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی افسوس ہے۔ کہ ایسے کامل میر انیسؔ مرحوم کی شان میں اسی موازنہ میں صفحہ ۲۲۸ پر بحث ایطا میں فرماتے ہیں۔ کہ "جہاں واقعی قافیہ شائگاں ہے۔ وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں۔ جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں۔ اور جن کو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے"۔ اس عبارت اور نیز عبارت مندرجہ بالا کا یہ صاف مفہوم ہے۔ کہ میر صاحب بے دھڑک ایطا قافیہ لاتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ ایطا اور جناب میر انیس مرحوم۔ واللہ اُن کے ادنےٰ شاگردوں کے شاگرد بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ لاکھ کثیر الکلام شاعر ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ شائگاں

شہ مرداں کوئی شیعہ یا صوفی امام حسینؑ کو نہیں کہتا

نسبت ... کلام ... انیس

قافیہ بے دھڑک سے آئے۔ حضرت یہ بڑا عیب ہے۔ اور کمال عجز شاعر کا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ روزمرہ ہے۔ کہ اُس شخص کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ یعنی عاجز ہوگیا۔ اور یہ محاورہ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں اسی موقع پر آتا ہے۔ جناب مفتی میر عباس صاحب طاب ثراہ کی مشہور و مطبوع مثنوی خطاب فاصل کا ایک مصرع یاد آگیا (جو مولوی امام بخش صاحب صہبائی کی مثنوی دمغ الباطل کے جواب میں ہے) ع چہ کند قافیہ بر او شدہ تنگ۔ اور یہ کیا فرمایا۔ کہ ایسی تاویلات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جہاں اعتراض ہو۔ آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا۔ جب کہ یہ ظاہر ہے۔ کہ مطبعوں میں عموماً کتابیں غلط چھپتی ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن شریف جو مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اُس میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ صحت کے برابر انتظام والتزام کئے جاتے ہیں۔ تو دبیرؔ و انیسؔ کے یا اور کسی شاعر یا مصنف کے کلام کا غلط چھپنا کیوں نہیں مانا جائیگا۔ اس کو تاویل نہیں کہہ سکتے۔ یہ حقیقت حال ہے۔ دیکھئے مرزا دبیر مرحوم کے جو چند مرثئے دو جلدوں میں منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں چھپے ہیں۔ اور بار بار چھپتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک ایسا مرثیہ لیجے۔ جو دفتر ماتم میں بھی چھپا ہے۔ اور دونوں کو ملائیے۔ تو (دونوں میں) زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ ہزاروں لفظ بدلے ہُوئے ملینگے۔ بیسیوں بندوں کی کمی بیشی پائیگا۔ پھر کیا کوئی بے درد یہ کہدیگا۔ کہ دبیر کے معتقدوں نے دفتر ماتم میں وہ الفاظ بدل دئے۔ وہ بند بڑھا دئے ہیں۔ حالانکہ دفتر ماتم کی جلدوں میں بھی غلطی چھاپہ کی ہے۔ مگر اتنی نہیں ہے +

مطبعوں کی غلطیاں

بہرحال جب ان دبیر و انیس کے مرثیوں کا غلط چھپنا پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے۔ تو جو لفظ صحیح قلمی مرثیوں میں ہے۔ اور واقف راز بتائیں۔ تو اُس کو ماننا پڑیگا۔ اس موقع پر واقعی میر صاحب نے ایک جگہ شہ ذی شاں اور دوسری جگہ شہ مرداں فرمایا ہے۔ اور مجیب اوّل نے صحیح جواب دیا ہے۔ مولوی شبلی صاحب کا خیال (کہ ایک جگہ شہ مرداں سے

المامون اور امام رضا کو امام ہفتم لکھنا

امام حسینؑ مراد ہیں) بے حقیقت و غلط ہے۔ اور یہ غلطی مولوی صاحب موصوف کی پہلی غلطی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اِس سے پہلے المامون میں جناب امام رضاؑ کو امام ہفتم لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ شیعہ و صوفی تو درکنار وہ تمام سُنّی مسلمان بھی جو تھوڑا بہت معلومات کا چسکہ رکھتے ہیں۔ امام رضاعؑ کو امام ہشتم جانتے ہیں۔ اور ان جناب کا لقب امام ضامن و ثامن[1] مشہور ہے۔ یہ فاش غلطی (آخر الذکر) وقت پر مرزا عابد علی بیگ صاحب قزلباش مرحوم نے گرفت فرما کر اپنے ریویو میں درج فرما دی ہے۔ جو میرے پاس مطبوعہ انہیں کا عطیہ خاص موجود ہے +

اعتراض نمبر ۲

(۲) موازنہ کے صفحہ ۳۰۰ پر بذیل اعتراضات میر انیس مرحوم مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں "سند ... ست ... میں الالعد ہوا + قتل اس کے ہاتھ سے پسر عبدود ہوا + عبدوَد۔ لاتعُدُ کا قافیہ نہیں ہوسکتا" میں کہتا ہوں۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟ مولوی شبلی صاحب شاید یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ عبدوُد ہی صحیح ہے۔ واؤ کو پیش ہے۔ اور لاتعدُ میں حرف آخر کے ماقبل (عین) کو زبر ہے۔ یہ خیال مولوی صاحب کا غلط ہے۔

جواب لاتعدو ود قافیہ صحیح ہے

لغۃً تو وُدّ بالضم اور وَدّ بالفتح دونوں صحیح ہیں۔ وَدّ ایک بُت کا نام ہے۔ جیسا کہ جوہری نے لکھا ہے۔ مگر اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ جب دونوں طرح صحیح ہے۔ تو فصیح کون ہے۔ اس کے واسطے وہ کتاب فیصلہ کریگی۔ جس کو کتاب اللہ کہتے ہیں۔ وہ فصیح ہو۔ کہ قرآن شریف کے ۲۹ ویں پارے سورہ نوح میں قریب نصف یہ آیت موجود ہے

نسبت بہ قرآن

ہے وَلَاتَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَاسُوَاعًا وَّلَا یَغُوثَ وَیَعُوقَ وَنَسْرًا پس وَدّ کو بالفتح نظم کرنا شاعر کے کمال معلومات کی اور معترض کا اعتراض کرنا کمال ناواقفی کی دلیل[2] ہے۔

[1] ثامن کے معنی آٹھویں کے ہیں۔ یہ آٹھویں امام ہیں۔ اس لئے امام ضامن و ثامن مشہور ہیں +

[2] میرے کرم فرما یادگار حضرت انیس جناب نفیس مرحوم سید علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ دام اقبالہ نے اس موقع کو سن کر فرمایا کہ یہ بیت میر انیس مغفور کی نہیں بلکہ الحاقی ہے۔ اس لئے میں نے لکھ دیا ہے کہ شاعر کے کمال معلومات کی دلیل ہے جس کسی نے یہ بیت کہی ہو وہ واقف تھا اور معترض ناواقف ہیں +

اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کا اس [illegible] ہونا اُن کے دامن علم و تحقیق پر ایک ایسا بدنما دھبہ ہے۔ جو اُن کے یا اُن کے کسی معتقد کے مٹائے نہیں مٹ سکتا +

(مولوی شبلی صاحب [illegible] کا قول [illegible])

(۳) [illegible] کے بعد [illegible] مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ (۱) اگر یہ پتہ لگ سکتا۔ کہ [illegible] میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا۔ اور خاص خاص مرثیے اور خاص خاص [illegible] جو دونوں کے یہاں قریب المعنی ہیں۔ اول کس نے کہے۔ تو شاعری کی [illegible] بہت سے [illegible] نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس کہ مجھ کو باوجود بہت جدوجہد کے اس بات میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ (۲) پھر آگے بڑھ کر لکھتے ہیں۔ کہ زمانے کی تقدیم و [illegible] معلوم ہوئے بے بھی [illegible] کا [illegible] کو حاصل ہے۔ [illegible] (۳) یہ انیس [illegible] اس بات کا اشارہ کرتے [illegible] کے [illegible] اُن کے کلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً

لگا رہا ہوا [illegible] تھا۔ + جو گرد و مری [illegible] خوشہ مضمون کو

نواسنج [illegible] + ہر اک [illegible] خوشہ [illegible] ملتی نہیں

(دبیر برابر کا جواب نہیں دیتے)

ذرہ دان معانی [illegible] جو لوں کو سن کر مرزا دبیر صاحب [illegible] نہیں [illegible] کہتے۔ کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ [illegible] ہے۔ بلکہ [illegible] کرتے ہیں۔ کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

[illegible] سرقہ کی حد سے بعید ہوں + ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

[illegible] استفادہ کو احادیث [illegible] + لعنی بری ہوں سرقۂ مضمون غیر سے + اس سے (۴) [illegible] کہ مرزا دبیر صاحب کے مقابلہ کا قصد [illegible] تھے [illegible] تھے۔ ورنہ مرزا صاحب [illegible] اشارہ کرتے [illegible] بعض

مرثیوں سے صاف ثابت ہے۔ کہ وہ ایک دُوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے ہیں۔ تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ مقابلہ و ہم طرحی و مسابقت کی کوشش مرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میرانیس نے اسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎ بھلا تردّد بے جا سے اُس میں کیا حاصل+ اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو۔ اور پھر صفحہ ۲۶۶ پر مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر نے میرانیس پر کہیں سرقہ کی تعریض نہیں کی ہے اب میں کہتا ہُوں۔ کہ جناب مولوی صاحب آپ جدّ و جہد کے ساتھ اگر لکھنؤ وغیرہ میں بڈھے بڈھے ذی علم آدمیوں سے دریافت فرماتے۔ تو ضرور آپ کو معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا صاحب کو میر صاحب سے بہت عرصہ پہلے لکھنؤ میں شہرت ہو چکی تھی۔ اور وہ اُستاد مان لئے گئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا صاحب کے مقابلے پر بڑے بڑے کامل شاعر برسوں کوشش کرتے رہے۔ مگر ملک نے اُن کو مرزا صاحب کا مدّ مقابل نہیں مانا۔ جیسے جناب امانت مرحوم۔ جناب عشق مغفور۔ اختر[1] مرحوم۔ جناب منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مبرور۔ شہرت مرحوم[2]۔ یہ سب شاعر بجز شہرت مرحوم کے جن کا حال مجھے معلوم نہیں ہے اپنی اپنی طرز میں کامل تھے۔ معلومات بھی سب کی اعلےٰ درجہ کی تھی۔ زمانہ بھی موافق تھا۔ مگر دبیرؔ کے مقابلے پر مرثیہ گو نہیں مانے گئے۔ میر انیس صاحب کا یہ بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہ اُنہوں نے مقابلہ فرمایا۔ اور کامیاب ہُوئے۔ ملک نے مان لیا۔ کہ دبیرؔ و انیسؔ آسمان مرثیت کے دو آفتاب ہیں+ مرزا صاحب کو

---

[1] آغا محمد تقی خاں مرحوم مرزا صاحب کے ایک شاگرد تھے۔ بعد کو اُنہوں نے برسرِ منبر کہا تھا۔ کہ میں مرزا صاحب کا شاگرد نہیں ہُوں انہیں کا یہ بے نقط مرثیہ ہے۔ ؎ ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہُو+

[2] شہرت میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد تھے جنہوں نے برسوں کوشش کی۔ کہ مجھے ملک مرزا دبیر کا ہمسر مان لے۔ میر ضمیر صاحب نے بھی ان کیلئے کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ کہ آج کوئی نام بھی شہرت مرحوم کا کوئی نہیں بتاتا۔ شہرت ہونا تو در کنار+

عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر میں شہرت ہو جانے اور میر صاحب کے مشہور نہ ہونے کی بڑی دلیل فسانۂ عجائب کی وہ عبارت ہے۔ جو میں (اپنی) اس کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھ چکا ہوں۔ اور یہاں پھر لکھوں گا۔ کہ ناظرین کو ورق گردانی کی تکلیف نہ ہو۔ (کیونکہ فسانۂ عجائب غازی الدین حیدر کے عہد میں شروع اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تمام ہوا) وہ عبارت یہ ہے "مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیرؔ۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیقؔ۔ فصیحؔ۔ مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیرؔ مرغوب سکندر طالع۔ بصورت گدا۔ بار احسان۔ اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ اور سلام کا دیوان کثیر فرمایا" دیکھئے۔ اس عبارت میں گویا میر خلیق صاحب کا نام نامی اور مرزا دبیر کا اسم سامی ہے۔ مگر میر انیس صاحب کا تخلص نہیں ہے۔ اور ہوتا کہاں سے۔ وہ تو بقول مشہور جس کو مصنف واقعات انیس نے بھی لکھا ہے۔ اُس وقت فیض آباد میں تھے۔ اور فسانۂ عجائب کی تصنیف کے زمانے کے قریباً ۳۰ یا ۲۵ سال بعد عہد سلطنت امجد علی شاہ مرحوم میں (جو سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے شروع ہوتا ہے) لکھنؤ آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے ہیں۔ صاحب واقعات انیس لکھتے ہیں۔ کہ خود میر انیس مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اُس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے۔ دوسرے مرزا سلامت علی دبیر (مرحوم)۔ میر مداری صاحب اگر وہی بزرگ ہیں۔ جن کا شہرت تخلص تھا۔ جب تو اُن کا حال اس کتاب میں آچکا ہے۔ ورنہ آج لکھنؤ میں کوئی نہیں بتاتا۔ کہ ان کا کیا تخلص تھا۔ عہد امجد علی شاہ مرحوم میں میر صاحب لکھنؤ میں آئے۔ اور مرثیے کہے۔ اور پڑھے۔ اُس کے بعد شہرت ہوئی۔ اور عہد مذکور میں مرزا صاحب کی

اس قدر شہرت ہو چکی تھی کہ اُن کے شاگردوں تک کے شاگرد اُس زمانے کے تذکرہ سراپا سخن میں نظر آتے ہیں٭۔ چنانچہ شاہزادہ دہلی خورشید قدر کو مصنف نے صفحہ ۲۴ پر لکھا ہے کہ "شاہزادہ خورشید قدر قیصر تخلص بن آسمان قدر ابن محمد خرم بخت ابن مرزا جاندار شاہ کو مشورۂ سخن گوہر علی مشیر مرثیہ گو سے اتفاقاً ہوتا ہے۔ کہ بسبب سیر و تصنیف کتاب تاریخ فکر شعر کمتر کرتے ہیں"۔ اور مشیر مرحوم ایسے مشہور مرثیہ گو ہر سے گو شاگرد مرزا صاحب ہیں۔ جو آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ الحاصل جب یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ مرزا صاحب کو میر صاحب سے پچیس تیس برس پہلے اس قدر شہرت ہو چکی تھی۔ تو مولوی شبلی صاحب کا (جو بڑے محقق و مؤرخ سمجھے جاتے ہیں) یہ لکھنا کہ اُن کو باوجود بہت سی جدّ وجہد کے پتہ نہ لگا۔ کہ دبیر و انیس میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ مولوی صاحب اگر پتہ لگاتے۔ تو اُن کو ضرور معلوم ہو جاتا۔ اور خاص کر مرزا صاحب کے باب میں تو دو کتابیں شمس الضحیٰ و تنقید آبِ حیات بھی اب سے تیس چالیس برس پہلے کی چھپی ہوئی جا بجا ملتی ہیں۔ وہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر اُنہوں نے تو پہلے ہی سے مرزا صاحب کے گھٹانے پر کمرِ ہمت چُست باندھ لی تھی (جیسا کہ اُن کی اور میری کتاب پڑھنے سے مُنصف مزاج آدمی کو معلوم ہوگا)۔ پھر وہ ایسی کتابوں کو کیوں دیکھتے۔ اور جب مرزا صاحب کی شہرت مقدم قابل یقین ثابت ہو چکی۔ تو ہر شخص منصف مزاج یہی فیصلہ کریگا۔ کہ مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی۔ کیونکہ مشہور شخص کے مقابلہ کی ہر شخص فطرۃً کوشش کرتا ہے۔ غیر مشہور کے مقابلہ کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ میرا کام محض مولوی صاحب کی غلطیوں کا دکھانا نہیں ہے۔ بلکہ امر واقعی جو مجھے معلوم ہوا ہے۔

شاگرد دبیر

اوّل مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی

٭ سراپا سخن عہد امجد علی شاہ میں شروع ہوا۔ عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ختم و مکمل ہوا۔ اس تذکرہ میں جناب میر انیس مرحوم کا ذکر بھی نہیں ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُس کا چھپانا میں شانِ مؤرخی کے خلاف اور گناہِ اخلاقی سمجھتا ہُوں۔ مجھے معتمر اور معتبر لکھنؤ کے بزرگوں سے یہ معلوم ہُوا ہے۔ کہ اوّل اوّل میر صاحب نے مرزا صاحب کے مشہور مشہور مرثیوں کے جواب کہے[1] پھر مرزا صاحب نے (جبکہ میر صاحب کی شہرت عہدِ واجد علی شاہ مرحوم میں ہوگئی۔ تو) میر صاحب کے بعض مرثیوں کے جواب لکھے۔ جن میں سے شائد دو تین مرثئے نکلے ہیں۔ باقی ایسے مرثئے حسب وصیّت جناب مرحوم اُستاذی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلّہ کے پاس محفوظ ہیں +

اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مرزا صاحب کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا یہ ارشاد (کہ وہ صرف تبرّے کرتے ہیں) بھی غلط ہے[2]۔ مرزا صاحب صرف دشمنانِ اہلِ بیت پر تبرّے کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) کسی مدّاحِ اہلِ بیت یا اُس کے کلام پر وہ تبرّا نہیں کرتے[3]۔ ہاں ڈنکے کی چوٹ یہ ضرور کہتے ہیں۔ کہ مَیں مُوجد ہُوں میرے مضامین دُوسرے شعرا لیتے

[1] چنانچہ بعض مرثیوں کے مطلع بھی ملتے جُلتے ہیں۔ مثلاً مرثیہ دبیر ؎ جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہُوا۔ (انیس) جب قیدیوں کو قید ... میں شب ہُوئی۔ (دبیر) جب کہ لسان ہُئی مولا کی جماعت ان میں۔ (انیس) جبکہ ناموش ہُوئی شمع امامت ان میں۔ (دبیر) زنجیر جہنم ... آزاد ہُوا۔ (انیس) دوزخ سے جب آزاد کیا حُر کو خدا نے۔ سنا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ مرثیہ ؎ دستِ خدا کا قوتِ بازو حسین ہے۔ بہت مشہور و مقبول تھا۔ جب میر انیس صاحب لکھنؤ میں آئے۔ یہ حال داخل کربلا میں انھوں نے یہ مرثیہ فرمایا ؎ جب کربلا میں داخلِ شاہِ دیں ہُوا + ۱۲ مؤلف۔

[2] یہاں تبرّا کے لفظ پر حضرت ذوق دہلوی کی ایک اصلاح یاد آئی۔ جو لکھنؤ میں مخدومی یعقوب مرزا محمد ہادی صاحب بی اے کی زبانی (حکایت) سُنی تھی۔ وہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک عزادار نے عشرۂ محرم میں سبیل رکھی اُس پہ مصرع لکھا تھا ؎ تبرّا کر اسے پی لو یہ نذرِ حضرتؑ ہے۔ اتفاقاً جناب ذوق بھی اُدھر سے گذرے۔ وہ صاحب جناب ذوق کے بھی ملنے والے تھے۔ ان سے کہا دیکھئے یہ مصرع مَیں نے کہا ہے۔ کچھ عیبِ شاعری ہو تو فرما دیجئے گا۔ جناب ذوق نے کہا عیب تو کچھ بھی نہیں مگر میری رائے مانو۔ تو یوں مصرع لکھ دو ؎ تبرّک کا ہے پی لو یہ نذرِ حضرتؑ ہے۔ پھر خود ہی یہ بھی کہا کہ تم یہ دیکھنا کہ ذوق سُنّی ہے لفظ تبرّا سے بُرا معلوم ہوتا ہے نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یہ نذر و نیاز کی چیز ہے یہاں تبرّک کا ہی لفظ ہونا چاہئے۔ سچ ہے ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ خوب اصلاح دی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] مولوی شبلی صاحب نے تبرّا کو بجائے برأت استعمال فرمایا گو لغتہً صحیح ہو۔ مگر اردو کی زبان پر تبرّے اکثر مخصوص معنی پر بولا جاتا ہے یعنی کسی شخص سے بیزار ہونا۔ اور عام لوگوں نے تو اس کے مفہوم کو اور بھی وسیع کر دیا ہے جیسکی تشریح کا یہ محل و موقع نہیں۔ مولوی صاحب نے لفظ تبرّا بجائے ... استعمال اس لئے مَیں نے لکھ دیا کہ مرزا صاحب کسی مدّاحِ اہلبیت پر تبرّا نہیں کرتے۔ ورنہ مولوی صاحب کے کلام کا یہ مفہوم نہ تھا کہ مرزا صاحب کسی ... پر تبرّا کرتے

ہیں۔ افسوس مولوی شبلی صاحب کو دفتر ماتم کی مطبوعہ بیس[۲] جلدوں میں بھی ایسے اشعار نہ ملے۔ صرف دو ہی شعر ملے۔ اُن میں سے بھی شعر ثانی غلط لکھ دیا۔ صحیح مجھ سے سُنئے۔ اور یوں ہیں (صحیح) چھپا بھی ہے۔

ہے مجھ کو استفادہ حدیثوں کی سیر سے ✦ واللہ ننگ و عار ہے مضمون غیر سے

احادیث و سیر کے کیا معنی؟ کیونکہ سیرت کی جمع سیَر بکسر اوّل و فتح ثانی ہے۔ بفتح اوّل و سکون ثانی نہیں ہے۔ جو غیر کا قافیہ ہو سکے۔ اب ایسے اشعار سُنئے۔ جن میں اُنہوں نے صاف صاف دعوے فرمایا ہے۔ کہ میرے کلام سے دُوسرے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور دُوسروں کا بازار سرد ہے۔ اور میں مُوجد اور دُوسرے خوشہ چیں و مقلد ہیں:۔

(۱) مضمون نئے کرتا ہُوں ایجاد ہمیشہ   کہتا ہے سخن حضرت اُستاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیر خداداد ہمیشہ   بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ
بے لُطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں[*] آتی   پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

(۲) اور لیجئے:۔

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی   ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے بحر طبیعت کی روانی   ہے زورِ سخن شور یہ موجوں کی زبانی
قطرے سے مگر بحث میں مَیں صرف نہیں ہُوں   دریا ہُوں سخن کا مَیں تنک ظرف نہیں ہُوں

پہلے مصرع میں صاف صاف دعوے کرتے ہیں۔ کہ میرے الفاظ اور میرے مضمون وقف ہیں۔ جن کو سب لیتے ہیں۔ جو شاعر کے الفاظ و مضامین لیگا۔ وہ سرقہ نہیں کریگا

* تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے صوبت ۲۲ پر موازنہ میں خود یہ بند لکھا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب بار بار کا جواب نہیں دیتے۔ اور کس طرح بار بار کا جواب دیتے۔ صاف کہہ رہے ہیں ع کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ۔ جب سخن کے اُستاد ہیں تو اہلِ سخن کبھی اُستاد ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اعتراض فرمایا ہے کہ جو خداداد ہے اس کے لئے ہمیشہ کی قید حشو محض ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کا مطلب ہے۔ کہ تاثیر خداداد میرے کلام سے کبھی الگ نہیں ہوتی۔ مولوی صاحب خیال فرمائیں کہ اس کا اعتراض حشو محض ہے یا نہیں۔ ۱۲ مولف حقیر۔

تو اور کون سارق ہوگا۔ پھر اُس کے ساتھ تشبیہ و تمثیل کی شان شرافت کا پہلو لئے ہُوئے دیکھئے کہ میٹھے پانی کو (دریا کے) سب ہی پیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دُوسرے مجھ سے مضامین والفاظ لینے پر مجبور ہیں۔ اُن کا وہاں تک ذہن ہی نہیں پہنچتا۔ پھر وہ میرے کلام سے سرقہ نہ کریں۔ تو کیا کریں۔ تیسرے مصرع میں کہتے ہیں۔ کہ عروض وغیرہ باقاعدہ پڑھا ہُوا ہُوں اس لئے ہر بحر میں نظم کرتا ہُوں۔ اُن شاعروں کی طرح نہیں ہُوں۔ جو چند مشہور بحروں کے سوا اور بحروں میں کہنے سے (ناواقفیت عروض کے سبب سے) مجبور ہیں۔ کہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ (بعض حروف) عین یا ہ وغیرہ گر جاتے ہیں۔ اور اُن کو خبر نہیں ہوتی۔ مصرع تقطیع سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ آگاہ نہیں ہوتے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ بند بھی موازنہ میں لکھا ہے + مگر مطلب شائد نہیں سمجھے ہیں۔ جو (چوتھے مصرع کی نسبت) فرماتے ہیں۔ کہ مقصد یہ ہے۔ کہ زورِ سخن شور پر ہے۔ لیکن اس بات کو مَیں نہیں کہتا۔ بلکہ موج کی زبان کہتی ہے۔ یہ قطرۂ ناچیز عرض کرتا ہے۔ کہ زورِ سخن موجوں کی زبانی شور پر ہونے سے مرزا صاحب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجیں۔ یعنی مصرع خود پکارتے ہیں۔ کہ ہم حیثیت دُرِ درداریں۔ مضمون زبانِ حال سے آواز دے رہے ہیں۔ کہ ہم نئے ہیں۔ الفاظ اپنی شان دکھا رہے ہیں۔ کہ ہم کو اب تک کسی اور شاعر اردو نے نہیں باندھا۔

چنانچہ وہ اسی مضمون کو دُوسرے مرثیہ مابعد میں بھی فرماتے ہیں۔ ؎

اب فخر کے بیان سے چپ ہو گئے ہیں ہم — مصرع پکارتے ہیں کہ سُن لو نئے ہیں ہم*

مولوی صاحب کا یہ بھی ارشاد و ایراد ہے۔ کہ بحث میں صرف ہونا کون سا محاورہ ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ یہ ہم لکھنؤ والوں کا محاورہ ہے۔ اعظم گڈھ کا اگر محاورہ نہ ہو تو نہیں کیا۔ اور ہو تو نہیں کیا۔ (بقول میر مرحوم) ؎

* ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں۔ جتنے ہیں دل ہیں وہ میرے مرتبہ دان ہیں۔ یہ نظم وہ دیکھیں۔ جو فصیحان جہاں ہیں۔ مصرع نہیں۔ سیہیں یہ فصاحت کی زمیں ہیں۔ یہیں موجوں سے ہم تاو مصرعوں سے ہے۔ مؤلف حقیر

گفتگو ہم سے ریختہ میں نہ کر — یہ ہماری زبان ہے شبلی*

صرف ہونا بجائے مصروف ہونے کے پہلے بھی بولتے تھے۔ اور آج بھی بولتے ہیں جس طرح "رنگ فق سے ہوگیا" اور "رنگ فق ہوگیا" دونوں طرح بولتے تھے۔ اور ناسخ نے جناب میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض جڑ دیا ع رنگ رخ کفار عرب ہوگیا فق سے۔ اور مولوی شبلی صاحب نے بھی انہیں کے حوالے سے لکھ دیا۔ کہ محاورہ نہیں۔ حالانکہ ناسخ نے اُس کو محاورہ عوام بتایا ہے۔ پس مولوی صاحب نے یہ دوسری ٹھوکر کھائی۔ اور اس کے ساتھ ہی صرف ہونے کو بھی محاورہ نہ ہونا وہ سمجھے۔ حالانکہ ناسخ نے بھی ایسا ہی اعتراض کیا تھا۔ جناب مہجور مرحوم نے اُن کو جواب دے دیا تھا۔ کہ محاورہ ہے۔ جیسے کہتے ہیں:۔ کہ آپ کے پندرہ روپے ہمارے پاس سے صرف ہوگئے۔ پس جس طرح یہاں "صرف ہوگئے" "مصروف ہوگئے" کی جگہ پر بولتے ہیں۔ اُسی طرح "صرف ہوگئے" کسی کام میں "مصروف ہونے" کے معنی پر بھی بولتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب کے ماننے والے خصوصاً نئے تعلیم یافتہ اُس وقت تک شاید نہ مانینگے۔ جب تک میں یہ محاورہ کسی اور شاعر کے کلام میں نہ دکھاؤں۔ ہر چند دبیرؔ کے کلام سے اور شعرا سند لیتے ہیں۔ پھر دبیرؔ کے واسطے دوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ مگر خیر نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ ہم سے دوسرے مستند شاعر کا شعر بھی سن لیجئے۔ اور وہ دوسرا شاعر بھی مرزا صاحب کے پہلے کا نہیں (جس کو سُن کر آپ یہ کہدیں۔ کہ مرزا صاحب کے پہلے محاورہ ہوگا۔ مرزا صاحب کے وقت میں ترک ہوگیا تھا) بلکہ مرزا صاحب کا معاصر و مستند شاعر لیجئے۔ جس کو تمام ملک مستند مانتا ہے۔ وہ کون؟ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم۔ وہ اپنی مستند و معتبر مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں۔

صرف ہونا محاورہ ہے۔ اس کی سند

* میر صاحب کا اصل مصرع یہ ہے "یہ ہماری زبان ہے پیارے"۔ مگر مولوی صاحب شاید عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اس لئے میں نے یہاں اُن کا تخلص و نام لکھ دیا۔ اور اُن کی بزرگی کا خیال رکھا۔ پیارے کا لفظ نہیں لکھا ۱۲ مولف حقیر۔

مگر تھے صرف فیضان و عنایت کیا کرتے تھے عالم کی ہدایت

کیوں مولوی صاحب سچ فرمائیگا۔ کیسی ہندی کی چندی میں سمجھائی ہے +

(۳) اور لیجئے :۔

خلاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

دعوئے مضمون آفرینی

اس سے بڑھ کر کوئی تعریف ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ میں نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہوں لیکن اُنہیں کو میرے معاصر و مد مقابل شعرا اُڑا لیتے ہیں۔ میں شعر کہنا چھوڑ دوں۔ تو اُن کی قلعی کھل جائے۔ اُن کے کلام میں پھر ایک بھی مضمون نظر نہ آئے۔ فرمائیے۔ یہ سرقہ کی تعریف صاف صاف ہے یا نہیں۔ اگر اب بھی آپ کی تسکین نہیں ہوئی۔ تو

یہ اور سہی

(۴) یہ اور سہی

بڑھتا ہوں صف نظم میں ہٹتا نہیں لکھا سب آتا ہے مضمون اُلٹنا نہیں آتا

اس کا یہی مطلب ہے یا اور کچھ۔ کہ میرے معاصر میرا مضمون اُلٹ لیتے ہیں اپنی سرقہ کرتے ہیں۔ اور مال مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر (ذرا تغیر و تبدل کر کے) لوگوں کے سامنے (بازار سخن میں) لاتے ہیں۔ میرا یہ شیوہ نہیں ہے۔ کیونکہ میری طبیعت خلاق عالم نے ایسی نہیں بنائی ہے۔ میں خود مضمون پیدا کرتا ہوں +

اور سنئے

اگر اب بھی آپ کو کچھ کلام ہے۔ کہ مرزا برابر کا جواب نہیں دیتے۔ تو اور بھی سُن لیجئے :۔

(۵) منصف ہو تو دعوے نہ کرے لاف زنی کا سکہ ہے مرے نام پہ شیریں سخنی کا

یہ صاف صاف ادّعائے شاعرانہ ہے۔ کہ میرے سامنے دُوسرا شاعر شیریں سخنی کا دم نہیں مار سکتا +

اس کے ساتھ یہ دعوے اور بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

(۶) کس طرز کو رونق ہو اس انداز کے آگے جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

یہ دعوے بھی

شاعر اپنے کلام کو اعجاز اور دوسرے کے کلام کو افسون و جادو بتا رہا ہے +

اور بھی کھلم کھلا چوٹ دیکھئے۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں :۔

کھلم کھلا چوٹ

(۷) سرقہ ہے کہ تالیف ہے مضمون کہن کے — یہ سبب ہے زکوٰۃ اپنے زرِ نقدِ سخن کی

کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ میرے مضامین جو معاصرین چُراتے ہیں۔ وہ گویا میری خیرات کھاتے ہیں +

اب بھی اگر جناب کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ تو اور سُنئے :۔

اور سنئے

(۸) جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں — اُن مرثیوں گویوں کو سلام اپنا ہے

اس سے بڑھ کر کون سا دعوےٰ ہو سکتا ہے (کہ صاف صاف کر رہے ہیں) کہ ہمارے معاصرین بند کے بند ہمارے اُڑا لیتے ہیں۔ ہم بجائے اس کے کہ سرقہ کا استغاثہ کریں۔ ان کو سلام الزامی کر لیتے ہیں +

سب سے بڑھ کر صاف صاف یہ فرماتے ہیں :۔

صاف صاف تعریف

(۹) دُزدانِ مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید — تو مجتہدِ نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

کہتے ہیں۔ کہ میں مجتہد ہوں۔ اجتہاد کوشش و دماغ سوزی سے بات میں سے بات نکالتا ہوں۔ معاصرین میری تقلید کرتے ہیں۔ وہ مضمون چُراتے ہیں۔ تو (اے نفس) چُرانے دے۔ منع نہ کر۔ کہ مقلّد کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کہ اُس میں مادّہ اجتہاد ہی نہیں ہے۔ اب تقلید نہ کرے۔ تو اُس کا کام کیونکر چلے +

یہ نو نمبر میں نے لکھ دئے ہیں۔ کہ ۹ کے عدد میں ایک خاص صفت یکرنگی کی ہے۔ کہ ہر عدد سے ضرب کھا کر حاصل ضرب میں سے گویا نو ہی حاصل ہوتے ہیں۔ ورنہ مرزا مرحوم نے ایسی شاعرانہ چوٹیں بہت کی ہیں۔ اور سُنئے۔ **اُنہوں نے اپنے منکران کمال کی بھی جا بجا خبر لی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎**

منکرین پر جا بجا چوٹ

منکر کو مرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے — انصاف کو کہتا ہے خداوند یہیں ہے

اور یہ بھی کہا ہے ؎

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے　　میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے

لطیفہ میر محب علی سلیس مرحوم

ایک لطیفہ جو میں نے ایک صاحب سے سُنا تھا یاد آگیا۔ میر و مرزا کے زمانے میں کچھ اور بھی مرثیہ گو شاعر ایسے تھے۔ کہ ان کے مقابلہ میں مرثئے کہتے تھے اور چوٹیں کرتے تھے۔ اور میر و مرزا کی چوٹوں کی شان نزول اپنی ذات ستودہ صفات کو سمجھتے تھے سُنا ہے۔ کہ اُنہیں بزرگواروں میں سے ایک صاحب میر محب علی صاحب مرحوم سلیس تخلص اکبرآباد میں مدرس تھے۔ جو علم کے ساتھ زبان و طبیعت بھی سلیس و سلیم رکھتے تھے*۔ اُن کو یہ خیال تھا۔ کہ میر انیس کا میں مد مقابل ہوں۔ جب یہ سلام اُن تک پہنچا۔ تو یہ مقطع پڑھ کر "نواسنجیوں نے تری الخ" خیال کیا۔ کہ میں اکثر چوٹیں کرتا رہتا ہوں۔ یہ صاحب نے یہ چوٹ مجھی پر کی ہے۔ فوراً وہ سلام میر صاحب کا (جس کا مقطع یہ ہے ؎ نواسنجیوں نے تری اے انیس۔ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا) تضمین کر کے ڈاک میں میر صاحب کے پاس لکھ کر بھیج دیا۔ مقطع پر یوں مصرع لگائے تھے۔

نہ مونسؒ کی باتیں تھیں ایسی نفیسؒ　　نہ تھی انسؒ کی نظم اتنی سلیس
یہ سچ ہے بقول انیسؒ اے سلیس　　نواسنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

جب میر صاحب کو یہ خمسہ پہنچا۔ ایک نظر دیکھ کر چپ ہو گئے۔ وہ کوہ حلم و وقار ایسی ایسی باتوں کی کب پروا کرتے تھے ✦

---

* جناب سلیس مرحوم کا میں نے ایک مطبوعہ مرثیہ دیکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ زندہ ہیں ابد تک شہدا راہ خدا کے۔ جس میں اس مضمون مشہور کو نظم کیا ہے جو ان کے زمانے میں ہوا تھا۔ کہ ایک آدمی افسر حالت نجاست میں شراب پی کر روضۂ امام حسینؑ میں جاتا تھا۔ کہ ایک طمانچہ لگا منہ سیاہ ہو گیا۔ ان کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا کہتے تھے۔ مگر دبیر و انیس کی بات اُن کے مرثیہ کے ساتھ تھی۔ مولوی مرزا غلام حسین قدر حسب ارشاد انیس کے شاگرد آگرہ میں سمجھے جاتے ہیں۔ اور تذکرہ حمزہ شہنا و نیز جلد اول صفحہ ۲۰۶ پر سلیس مرحوم کے فرزند میر محمد جعفر صاحب آسمان تخلص سلمہ کا ذکر خیر ہے ۔ ۱۲ مؤلف

(۴) صفحہ ۲۶ میں بلاغت کی بحث میں مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ "یہ وہ چیز ہیں ہیں۔ کہ جہاں دبیر و انیس کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں۔ مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں۔ لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔" یہ فقرہ کہ "گو تمام اوصاف پائے جاتے ہوں" اس دُور اندیشی سے غالباً لکھا ہے۔ کہ اس ناپرسی اردو کے زمانے میں اوّل تو کون اتنی محنت گوارا کریگا۔ کہ ہر قسم کی مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے نکال کر پیش کرے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے (جیسا کہ حقیر نے ہر قسم کا کلام محنت کر کے اکٹھا کیا* اور ناظرین کے سامنے پیش کر دیا)۔ تو اُس وقت کہنے کو ہو گا۔ کہ ہم نے تو ایسا فقرہ پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ فرمایا۔ کہ تمام اوصاف شاعری ہی کا تو دُوسرا نام گویا بلاغت ہے۔ اب مَیں اس کو خدا کی شان کہوں۔ یا توفیق جبری۔ کہ خود صفحہ ۲۷۹ پر پہنچکر مولوی صاحب نے رنگ ہی بدل دیا۔ شہادت علی اصغر شیر خوار کے واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں۔ کہ اس واقعہ کو میر ضمیر صاحب سے لیکر آج تک نئے نئے پیرایوں میں لوگوں نے ادا کیا۔ میر انیس صاحب نے مختلف مرثیوں میں یہ واقعہ لکھا۔ اور یہ واقعہ (تمام واقعات کربلا میں) نہایت دردانگیز ہے۔ مگر مرزا دبیر نے جس بلاغت سے یہ مضمون ادا کیا ہے۔ اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے۔ وہ میر انیس صاحب یا اور کسی سے آج تک ادا نہ ہو سکا۔ ناظرین! خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ یا تو مرزا دبیر ایسے تھے۔ کہ اُن کے کلام میں کہیں بلاغت کا شائبہ نہ تھا۔ بلاغت چھو نہ گئی تھی۔ یا ایک ایسے واقعہ کے بیان میں وہ ایسی بلاغت اور دردانگیز سماں دکھلاتے ہیں۔ کہ جو نہ اور کسی شاعر ماقبل و مابعد سے ہو سکا نہ میر انیس صاحب سے۔ پھر وہ مرثیہ بھی دیکھئے۔ کوئی آخری زمانہ کا مرثیہ نہیں ہے۔ بلکہ درمیانی حصہ عمر کی تصنیف ہے اور اُس عہد محمد علی شاہ مرحوم کی تصنیف ہے۔ کہ جس زمانہ تک میر انیس صاحب لکھنؤ میں

بلاغت کی بحث

شہادت علی اصغر دبیر مرحوم و اعتراف مولوی شبلی صاحب بہ بلاغت دبیر

* ملاحظہ ہو جلد ثانی اس کتاب کی جس میں ہر قسم کا کلام مرتب کر کے جمع کیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

تشریف ہی نہ لائے تھے۔ اُن کی شہرت ہونا تو کیسا۔ جو کوئی شخص یہ کہہ سکے۔ کہ میر صاحب کا طرز مرزا مرحوم نے اُڑا لیا۔ اور پھر یہ بھی مولوی صاحب خیال نہیں فرماتے۔ کہ جو شخص تمام واقعات میں سے زیادہ اہم اور نازک واقعہ کو سب سے بہتر نظم کر دیگا۔ اُس کو دُوسرے مرثیوں میں اور حالات (جو اہمیت و نزاکت میں اُس سے کم ہیں) نظم کرنے میں کون امر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ وہی مرثیہ ہے۔ جس کے چند بند میں بطور نمونہ ایک جگہ اس کتاب میں پیش کر چکا ہُوں۔ اور جس کا مطلع یہ ہے۔* ؎ بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ ملک کے اس عام مقولہ کو مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی و دلیل سے باطل کرنا چاہا ہے۔ کہ **کلام میر صاحب میں فصاحت اور کلام مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے**۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ یہ مقولہ غلط ہے۔ کیونکہ فصاحت کو بلاغت کا حریف قرار دینا اجتماع نقیضین ہے۔ کہ بلاغت کا جزو فصاحت ہے۔ ایسا کرنا گویا مرزا صاحب کو مولوی کلام میں فصاحت نام کو نہیں۔ میں کہتا ہُوں۔ کہ مقولہ اہل ملک کا مطلب یا تو مولوی صاحب خود غلط سمجھے ہُوئے ہیں۔ یا دُوسروں کو غلط سمجھاتے ہیں یہ تو کوئی بھی (بجز مولوی شبلی صاحب کے) نہیں کہتا۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں فصاحت چھو نہیں گئی۔ فصاحت نام کو نہیں ضرور فصاحت بھی ہے۔ اور اُس کے ساتھ بلاغت بھی۔ کہ مرزا مرحوم کا اکثر کلام بلیغ اور بعض کلام محض فصیح ہے۔ اور بیشک فصاحت بلاغت کی تابع اور جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ **مؤرّخ اودھ** صاحب بوستان اودھ بھی (شعرائے اودھ کے حال میں جہاں دبیر و انیس کا حال لکھا ہے) یہی لکھتے ہیں۔ (اس کتاب فارسی کا ترجمہ اردو بہارستان اودھ کے نام سے چھپا ہے۔ اصل کتاب فارسی ایک ہندو صاحب ذیعلم تعلقہ دار سندیلہ کی تصنیف ہے۔ جو لکھنؤ میں معزز عہدے پر

کلام دبیر میں بلاغت زیادہ ہے

مصنف تاریخ اودھ معترف بلاغت دبیر

---

* مخدومی جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد (بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ) نے جو مضمون مقابلہ ملٹن و دبیر کا لکھا ہے۔ اُس میں بھی اس مرثیہ کے کچھ بند لکھے ہیں۔ جو قابل دید ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

زمانہ شاہی میں ممتاز تھے ۔ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت دبیرؒ نے میدان بلاغت میں علم یکتائی بلند کیا تھا۔ حضرت انیسؒ نے ساحت فصاحت میں انا ولا غیری کا ڈنکہ بجایا تھا۔

اب طرفداران مولوی شبلی صاحب! ذرا آپ یہ بھی سُن لیجئے ۔ کہ خود (مولوی شبلی صاحب کی) کتاب موازنہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب بلاغت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ثبوت بیّن اس کا یہ ہے ۔ کہ صفحہ ۶ پر وہ لکھتے ہیں کہ ”ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے“۔ تمام اہل بلاغت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے ۔ کہ بلیغ کا اطلاق جملہ پر ہوتا ہے ۔ لفظ پر نہیں ہوتا ۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہہ سکتے۔ مختصر المعانی کے شروع ہی میں صاحب تلخیص کی عبارت اور یہ بحث درج ہے٭ اور بھی تمام کتابوں میں (معانی و بیان کے) یہ مسئلہ اسی طرح ہے ۔ ناظرین انصاف گزین! اب تو آپ کے خیال شریف میں آگیا ۔ کہ مولوی شبلی صاحب گو اور علوم میں علامہ زمان ہی ثابت ہیں۔ مگر علم ادب (اردو) و معانی و بیان تو وہ بالکل نہیں جانتے۔ یہ وجہ ہے ۔ جو دبیرؒ کے کلام میں بلاغت کے وہ قائل نہیں ہیں +

مولوی شبلی صاحب کی بلاغت سے ناواقفی ذرا دیکھئے

مجھے مولوی شبلی صاحب سے کوئی پرخاش نہیں ہے! اور ایک حد تک اُنکی انشا پردازی کی میں داد دیتا ہوں۔ اور اس کا بھی معترف ہوں ۔ کہ موازنہ میں بھی بہت سی کارآمد مفید باتیں

٭ صاحب تلخیص المفتاح جس کی شرح (مختصر المعانی ہے) لکھتے ہیں ”اَلْفَصَاحَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْمُفْرَدُ وَالْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ وَالْبَلَاغَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْاٰخِرَانِ فَقَطْ“ اس فقرہ آخر کی شرح میں صاحب مختصر المعانی ملا سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں۔ ”اَیِ الْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ دُوْنَ الْمُفْرَدِ اِذْ لَمْ یُسْمَعْ کَلِمَۃٌ بَلِیْغَۃٌ“۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ فصاحت کا اطلاق کلمہ، کلام، متکلم تینوں پر ہوتا ہے کہتے ہیں یہ کلمہ فصیح ہے۔ یہ کلام فصیح ہے یہ متکلم فصیح ہے۔ مگر بلاغت کا تعلق صرف کلام و متکلم سے ہے۔ کلمہ سے نہیں ہے کیونکہ کبھی نہیں سُنا کہ یہ کلمہ (لفظ) بلیغ ہے۔ افسوس ملا تفتازانی آج زندہ نہ ہوئے ورنہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں انکو بھیجا کر سنوا دیتا ”ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے“۔ اسی طرح صاحب شجرۃ الامانی لکھتے ہیں ”لفظ فصیح اطلاق میکنند بر کلمہ و کلام و متکلم ہر سہ و اطلاق بلیغ بر کلام و متکلم صحیح بود نہ بر کلمہ غیر...“ ثابت ہے بضاعت ۔

سلیس عبارت میں اُنہوں نے بیان کی ہیں۔ بااین ہمہ جو مرزا مرحوم کی حق تلفی اُنہوں نے کی ہے۔ اس کا ایک زمانے کو اور مجھ کو بھی ایک زمانے میں بہت افسوس تھا۔ مگر سوانح مولانا رُوم کے صفحہ ۵ کی عبارت دیکھ کر تسکین ہوگئی۔ اور معلوم ہوگیا۔ کہ وہ میر صاحب کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ سب جتن کئے۔ کیونکہ اُنہوں نے میر صاحب کو اپنا ہیرو سمجھا ہے۔ وہ صفحہ ۵ کی عبارت مولوی شبلی صاحب کی یہ ہے۔ "مولانا رُوم کے دیوان پر ریویو کرتے ہُوئے ہمارا فرض تھا۔ کہ ان کے معاصرین سعدی و عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا۔ تینوں بزرگوں کی غزلوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں۔ اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی اُن کو ترجیح دی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے"۔ اب رہی یہ بات کہ میر انیس صاحب کو مولوی صاحب اپنا ہیرو سمجھے ہے ہیں۔ یہ تمام کتاب موازنہ سے اور بالخصوص اس فقرہ سے جو ٹائٹل پیج پر درج ہے "میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و دبیر* کا موازنہ" ثابت ہے۔ پس اُنہوں نے کچھ تو معانی و بیان کی ناواقفی کے سبب سے دھوکہ کھایا۔ کچھ اپنی طبیعت کے سبب سے میر صاحب کو اپنا ہیرو (موضوع یا ممدوح) سمجھ کر مرزا صاحب پر ترجیح دی۔ اور مرزا صاحب کو ناقص بتانے کی کوشش کی۔ ورنہ جو شخص موازنہ لکھنے۔ اُس کا یہ فرض یہ ہے۔ کہ دونوں مُصنّفوں کا ہر قسم کا کلام دکھائے۔ اگر مولوی صاحب ایسا کرنا چاہتے۔ تو اُن کو ہر موقع پر مرزا صاحب کا کلام مطبوعہ (جو کلام میر صاحب سے کئی گونہ زیادہ ہے) مل جاتا۔ اور جس طرح میر صاحب کی کمزوریاں اور غلطیاں (عام اس سے کہ وہ غلط ہوں یا صحیح) قبول کر کے کثیر الکلامی کا عذر کیا ہے۔ مرزائے مظلوم کیواسطے

*اس قسم کا نام میر انیس صاحب کے قریب قریب بلغیر لفظ مرزا کے صرف دبیر کا لفظ لانا بھی مرزا صاحب کے معتقدوں کو نہت ناگوار ہُوا ہے۔ اور ٹائٹل پیج سے ہی مولوی صاحب کے دلی منشا کو ظاہر کر دیا ع می تراود وچہ کنم آنچہ درآوند من ست + ۱۲ مؤلف سفیر۔

بھی عذر کرتے۔ مگر افسوس کہ اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور بجائے اس کے مرزا صاحب کے حق میں سخت زبانی سے کام لیا۔ اور سفیہانہ وعامیانہ وغیرہ وغیرہ الفاظ مرزا صاحب کی شان میں استعمال کئے۔ جو مرزا صاحب کی شان سے تو کیا خود مولوی صاحب کی شان سے بھی بہت بعید ہیں۔ جن کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔ اس کا طول ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب مَیں مولوی صاحب کی عبارت اعتراض کو ذرا مختصر کر کے لکھونگا۔ اور جواب میں بھی اختصار کا خیال رکھونگا +

سخت زبانی

(۵) دبیر ؎ یُوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار۔ رشتہ میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار +

فصل ۵ تشبیہ کلام

انیس۔ گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن۔ جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن + صفحہ ۲۸۵ پر دونوں شعروں کو (بالمقابل) لکھ کر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "تسبیح کے دانے رشتے میں بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے یہاں آبدار کا لفظ محض فضول وبیکار ہے" + میں کہتا ہُوں۔ کہ جس طرح اہلبیتؑ اطہار ایک کے بعد دُوسرے رسّی میں بندھے ہُوئے تھے۔ اس کی تشبیہ تامہ تسبیح سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تشبیہ بھی مرزا صاحب کے یہاں موجود ہے۔ وہ (فرماتے ہیں) جناب رسول خدا صلعم سے خطاب کر کے عرض کرتے ہیں۔ ؎

اعتراض

جواب

فریاد کہ پیاسے ہُوئے مقتول تمہارے گلدستہ کی مانند بندھے پھول تمہارے

تشبیہ تسبیح

تشبیہ گلدستہ

مگر تشبیہ گلدستہ کی تسبیح کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ گلدستہ میں ایک ہی جگہ پھولوں کا گُچھا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ سے (یکے بعد دیگرے) وہ نہیں بندھے ہوتے۔ اب یہ بھی سُننے کہ تشبیہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ جزئیات میں بھی مطابقت ہو۔ بہادر کو جو شیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُس کے لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ بہادر گوشت کے

سا اور کچھ کھاتا ہی نہ ہو۔ یا اُس کے پنجے اور ناخن بھی ایسے ہوں جیسے شیر کے۔ پس گلدستہ کی تشبیہ بھی صحیح ہے۔ اور تسبیح کے دانوں کا ڈورے میں پرو یا ہونا عین بندھنا ہے۔ کہ وہ سب ڈورے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ڈورہ ٹوٹ جائے تو دانے بکھر جائیں۔ **مولوی صاحب** یہ کیا آپ نے فرمایا۔ کہ آبدار کا لفظ محض فضول و بیکار ہے۔ کیا آپ کے فرمانے سے بیکار و فضول ہو جائیگا۔ تسبیح عقیق البحر کی ہو یا خاک شفا یا زیتون یا لکڑی کی۔ عام طور پر دانوں پر آب اور جلا ہوتی ہے۔ اس کے قطع نظر آبدار کی یہاں یُوں ضرورت ہے۔ کہ اہلبیت اطہار کو مصنف نے ایسی تسبیح سے تشبیہ دی ہے۔ جو آبدار ہو۔ آب کے معنی عزت کے بھی ہیں۔ یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ راہ خدا میں اسیر ہونے سے اہلبیت کی خداداد عزت میں فرق نہیں آیا۔ وہ ویسے ہی صاحب عزت اب بھی ہیں۔ تسبیح کے دانوں پر بھی آپ نے اعتراض جما دیا۔ اور آبدار ہونا آپ کو ناگوار گذرا۔ سُنئیے جناب! یہ تسبیح کسی زاہد ریائی کی نہیں ہے۔ جس کی شان میں ایک ایرانی شاعر کہتا ہے ؎

زاہد چہ بلائی تو کہ ہر دانۂ تسبیح
از خوف تو سوراخ بسوراخ گریزد

یہاں دانہ ہائے تسبیح میں ایک تلمیح لطیف اہل بیت کے گریہ و زاری سے بھی ہے۔ جب آپ کو ہمارے ساتویں اور آٹھویں امام کا حال معلوم نہیں۔ تو آپ ہمارے خصوصیات کو کیا سمجھینگے۔ وہ تلمیح یہ ہے۔ کہ جس طرح تسبیح کے دانوں کے دل فگار ہوتے ہیں۔ اہلبیت اطہار کے مقدس قلوب بھی محض خدا کے واسطے فگار تھے۔ مولوی صاحب نے اس موقع پر پُورا بند مرزا صاحب کا نہیں لکھا۔ جس سے اُن کی قوت دماغی کا زور اور تخئیل کا کمال معلوم ہوتا۔ خیر۔ ناظرین! پُورا بند مجھ سے سُنئیے:۔

یُوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار
رشتہ میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار
اور سب کے پیش پیش امام فلک وقار
عابدؑ کی یہ دلیل امامت تھی آشکار
سُبحے کا اُس رسن کو شرف لاکلام ہے
جس کا امام دو توں جہاں کا امام ہے

لفظ آبدار

خاطریکے دوکس ازاز تو شود شاد بس ست
زندگانی بہواے ہمہ کس نتواں کرد

(۷) صفحہ ۲۸۳ پر بالمقابل میر و مرزا کے یہ دو شعر لکھے ہیں :-

مرزا صاحب	میر صاحب
یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں	یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

اور تحکم فرمایا ہے۔ کہ "بندش کی صفائی و برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ صاحب مکان کی تخصیص بیکار ہے۔ زلزلہ آتا ہے۔ تو ہر شخص مکان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ جسم رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہے۔ اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ صرف اُن لوگوں کی روحیں نکلیں۔ جن کے جسم رعشہ دار تھے۔"

اب مرزا صاحب کے بعد میر صاحب پر مولوی صاحب ڈھلے اور جھکے ہیں۔ فرماتے ہیں "میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہیں۔ سر کا لفظ بالکل حشو بلکہ موقع کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ روح سر میں نہیں رہتی۔ نہ سر سے اسکو کوئی خصوصیت ہے"۔

مَیں مختصر لفظوں میں عرض کرتا ہوں۔ کہ ناظرین! اوّل مرزا صاحب کا پورا بند سُنئے۔ جس کو کتر بیونت کر کے مولوی صاحب نے غارت کرنا چاہا ہے۔

ابرو کی شکل تھی خم شمشیر سے عیاں
چلتے ہی رن میں بندھ گیا بھونچال کا سماں
یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں
حیرت سے لعض خاک کا پیوند ہو گئے
واں تو نصیب سو گئے یاں پاؤں سو گئے

ابرو بھون کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ تلوار میں بھون کی شکل تھی۔ تلوار کے چلنے میں رن میں بھونچال کا سماں بندھ گیا۔ بھونچال میں ہر چیز کانپتی ہے۔ دشمنوں کے جسم بھی بھونچال اور خوف سے کانپ رہے تھے۔ جانیں اس طرح بھاگیں۔ کہ جیسے زلزلے میں مکان کو چھوڑ کر

قول شبلی صاحب

میر صاحب پر اعتراض

تشریح بھون و بھونچال

صاحب مکان یعنی اُس کے موجودہ آدمی بھاگ جاتے ہیں۔ صاحب مکان سے وہی لوگ مراد ہیں۔ جو اُس مکان میں ہوں۔ پھر خدا جانے صاحب مکان کی تخصیص میں کیا حرج ہے۔ جو مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تخصیص بیکار ہے۔ جو شخص مکان کو چھوڑ کر زلزلے میں بھاگتا ہے۔ اُسی کو مرزا صاحب صاحب مکان کہتے ہیں۔ اور بندش کی صفائی اور برجستگی کی داد وہ اردو کے شعراء دے سکتے ہیں۔ جو اہل زبان یا زبان دان ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جسم رعشہ دار سے جان نکلنے کی تشبیہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہلتے ہوئے مکان سے ساکنان مکان کا بھاگ کر مکان کو سونا کر جانا بالعینہ ایسا ہے۔ کہ جیسے جان اپنے مکان یعنی جسم کو چھوڑ کر روانہ ہو جائے۔ روان کا لفظ بھی نہایت لطیف ہے۔ کہ روان کے معنی جان کے بھی ہیں۔ اور ماہران علم طب واقف ہیں۔ کہ مرنے کے وقت ہر شخص کو رعشہ لاحق ہوتا ہے۔ کہ رعشہ موت کی علامت ہے۔ ایک شعر میں کتنی خوبیاں ہیں۔ اور بھونچال سے شدّت جدال وقتال اور میدان جنگ کا تہ وبالا ہونا نکلتا ہے + جسم رعشہ دار کی ترکیب بھی ہرگز نامانوس نہیں ہے۔ رات دن لوگ بولتے ہیں۔ اور بعینہ ... لوگوں کی زد میں فوراً نکل کر بھاگیں۔ جو (بزدلی) بھونچال اور خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ ایک جماعت تو یہ کانپنے والوں کی ہوئی۔ دوسری اُن حیرت زدہ آدمیوں ... جو حیرت سے خاک کا پیوند و زمین گیر ہو گئے۔ اُن ... نصیب سو گئے۔ اِدھر پاؤں سو گئے۔ پاؤں سو جانا روزمرہ ہے۔ سُن ہو جانے کے معنی پر بولتے ہیں۔ دیکھئے ایک بند میں کتنا بڑا مضمون باندھ دیا ہے۔ یہ کمال بلاغت نہیں تو کیا ہے؟ اب میر صاحب پر جو آپ نے عنایت فرمائی ہے۔ اُس کا جواب سُن لیجئے۔ سر کا لفظ نہ حشو ہے نہ غلط۔ بلکہ موقع کے لحاظ سے بہت ضروری و صحیح ہے۔ میر صاحب کی مراد یہ ہے۔ کہ جب تلوار نے تمام پرے سے سر (دشمن کا) اُڑا دیا۔ تو روحوں کے طائر جو سر اور بدن میں پھڑک رہے تھے۔ وہ اس طرح فوراً سر اور بدن کو چھوڑ کر بھاگ نکلے

جوابِ اعتراض برمصرعہ

کہ جیسے ہر انسان بھونچال میں اپنا مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگتا ہے۔ رُوح کا گھر آدمی کا تمام جسم ہے یعے سر میں بھی رُوح رہتی ہے دھڑ میں بھی رہتی ہے۔ خدا جانے کس فلسفی کی بنا پر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ نہ مضامین شاعرانہ کی بنا کسی فلسفۂ خاص پر قائم ہے۔ نہ شاعر اس بات پر مجبور ہے۔ کہ جو فلسفی کہے۔ اُس کے خلاف نہ کہہ سکے * اگر فلسفی کے اقوال کی بنا پر شاعروں کے کلام کی تنقید کی جائے۔ تو کوئی شاعر نقص سے خالی نہ رہیگا۔ اس بحث کو اگر آپ مجھ سے نہیں سُننا چاہتے۔ تو جناب مفتی میر عباس صاحب شوستری اعلے اللہ مقامہ سے سُنئے۔ کہ اُن جناب کا یہی ارشاد میں اس کتاب میں ایک جگہ نقل کر چکا ہوں۔ مولوی صاحب! یہ بھی آپ نے اُلٹی کہی۔ کہ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ سر تمام جسم میں سردار ہے۔ پس فیصلہ تو ہر امر کا وہی کرتا ہے۔ اور خیر سلا (خیر و صلاح) سے حکماء میں آج تک رُوح کی بابت اتفاق ہی نہیں ہوا ہے۔ کہ وہ در اصل کیا چیز ہے۔ اور کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ شاعر تو مشاہدہ کا قائل ہے۔ جب سر کٹنے کے بعد وہ سر اور دھڑ کو الگ الگ پھڑکتا ہوا دیکھتا ہے۔ تو یہی سمجھتا ہے۔ کہ رُوح دونوں مقاموں میں تھی۔ اب بھاگ رہی ہے۔ سبحان اللہ کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ جس کو مولوی شبلی صاحب نہیں سمجھتے۔ اور زبردستی لفظ سر کو حشو اور غلط بتاتے ہیں۔ اور اس فہم عالی پر دبیر و انیس میں موازنہ فرماتے ہیں۔ اُن کے کلام کو تو سمجھتے ہی نہیں۔ اُن کے کلام میں موازنہ ممکن کیا کر سکتے ہیں +

رُوح

(۸) صفحہ ۲۸۴ پر ایک ایک مصرع حسب ذیل دونوں بزرگواروں کا لکھا ہے:۔

میر صاحب	مرزا صاحب
سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں	کس نے دی انگوٹھی رکوع و سجود میں

بغیر ترتیب

* بجز تحقیقاتِ جدیدۂ فلسفہ کے کبھی کبھی پُرانی تحقیق رد ہو جاتی ہے جیسے کہ آجکل فلسفۂ جدیدہ نے بعض مضامین فلسفۂ قدیم کو غلط ثابت کیا اگر شعرا کا کلام فلسفیوں کے کلام کے تابع ہوں تو ان کے بعض غلط ثابت ہو سکیں شعرا کا کلام اکثر علم مطالعے کے مرتب ہوتے ہیں شاعر کسی بحث نہیں کرتا کہ خیال غلط ہے یا صحیح ۱۲ مؤلف حقیر

اصل مطلب مضامین نو

میر صاحب کا مصرع توڑ مروڑ کے (یعنی الفاظ بدل کر) دکھایا ہے۔ جس کو میں آئندہ سلسلہ کلام میں بیان کرونگا۔ اوّل یہ سُنئے۔ کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں مصرعوں کی شُستگی و برجستگی و صفائی میں جو فرق ہے۔ وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔" میں افسوس سے عرض کرتا ہُوں۔ کہ بچہ تو کیا آپ ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر آپ کو موازنہ و مقابلہ ہی منظور تھا۔ تو کم سے کم ایک ایک شعر تو لکھتے۔ مصرع کا کیا موازنہ۔ ایک مصرع جب تک دُوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر نہ پڑھا جائے۔ اُس کا حسن و قبح نہیں معلوم ہو سکتا۔ بلکہ عربی میں (کہ جس شاعری کے تابع فارسی و اُردو کی شاعری ہے) تو یہاں تک جائز ہے۔ کہ شاعر ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر کے ایک جزو مصرع اوّل میں دُوسرا مصرع ثانی میں لے آئے۔ جیسا کہ جناب امیرؑ کے اس شعر میں ہے ؎

جواب

ورد الیوم ناصحا ینذر النا
س جیوش کالبحر ذی الامواج

اس شعر میں لفظ "النّاس" کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ "النّا" مصرع اوّل میں اور حرف "س" مصرع ثانی میں آیا ہے۔ فارسی و اردو میں اتنی آزادی تو نہیں ہے۔ مگر ہاں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دُوسرے میں لانا یہاں بھی جائز و رائج ہے۔ گو ہمیشہ اور ہر شاعر ایسا نہیں کرتا۔* بہرحال دونوں مصرعوں کے پڑھنے سے مطلب بھی صاف سمجھ میں آتا ہے۔ اور حسن و قبح بھی کھلتا ہے۔ اس لئے اوّل میں دونوں صاحبوں کے پورے پورے صحیح شعر لکھتا ہُوں۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ کہ میر صاحب کے شعر کو مولوی صاحب توڑ مروڑ کر مقابلہ و موازنہ کو لائے ہیں:۔

* بالخصوص خاندان جناب شیخ ناسخ مرحوم میں اس کی بہت احتیاط رکھی جاتی ہے۔ اور اب بھی بعض شعرائے اردو اس کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر ذوق و مومن و غالب و دبیر و انیس کے یہاں کہیں کہیں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دوسرے میں ملتی ہے۔ سب اساتذہ اس کے جواز کے شاید حامی تھے۔ اب جتنی پابندیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اُتنی ہی اردو کی شاعری گھٹتی جاتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

تشریح

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں
آیہ نہ آیا مثل علیؑ مدح جود میں	سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں

میر صاحب کی بیت کا تو یہ مطلب ہے۔ کہ جناب امیرؑ نے وہ بے بہا انگوٹھی نماز پڑھتے میں سائل کو دے دی۔ جس کی قیمت تمام ملک حجاز میں کوئی شخص نہیں دے سکا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جب جناب امیرؑ حالت رکوع میں سائل کو انگوٹھی عطا فرما چکے۔ تو ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی انگوٹھیاں (کسی نے رکوع میں کسی نے سجدے میں) دینا شروع کیں۔ مگر جس طرح آیۂ (اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ) آیا تھا۔ اور خدا نے سخاوت جناب امیرؑ کو سراہا تھا۔ اُن منافقوں کی شان میں کوئی حرف مدح قرآن میں نہ آیا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دیکھو ریاکاری بُری چیز ہے۔ دکھاوے کا دینا کچھ کام نہیں آتا۔ اعمال ریائی بیکار جانتے ہیں✻۔ دونوں بزرگوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔ میر صاحب نے نہایت سلاست و فصاحت سے اپنا مطلب ادا فرمایا ہے۔ مرزا صاحب نے شان بلاغت دکھائی ہے۔ آیہ ایک جگہ آیت کے معنی پر لائے۔ دوسری جگہ آیا صیغہ ماضی ہے۔ تجنیس لفظی کی یہ صنعت ہے۔ دوسری صنعت شبہ اشتقاق کی یہ ہے۔ کہ جود و سجود ایک دوسرے

حاشیہ

✻ حکایت لطیفہ۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں آغا احمد علی خاں مرحوم کے مکان پر زمانۂ چہلم کی ایک مجلس میں میر محمد شاہ صاحب مرحوم مصنف مشہور و مقبول یہی روایت برسر منبر بیان فرما رہے تھے کہ اوروں نے بھی انگوٹھیاں دیں۔ مگر بجز جناب امیرؑ کے اور کسی کی مدح خدا نے قرآن میں نہ کی۔ ایک کشمیری (نقال) بول اٹھا کہ حضت (حضرت) وہ اوروں کی انگوٹھیاں ملمع کی ہونگی۔ سب مجلس ہنس پڑی۔ ملمع کے لفظ پر اور اس کے معنئ تلمیح پر خیال فرمائیے۔ لکھنؤ کے معمولی آدمیوں کی یہ ذہانت تھی یہ سب علم کی برکت تھی۔ جو شاہی زمانے کا اثر چلا آتا تھا۔ ریاکاری کی تصویر روشن گویا لفظ ملمع دکھا رہا ہے۔ کہ وہ دیکھنے کو اوپر سے کچھ ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے یہی ریا کا نقشہ ہے + مؤلف حقیر۔

سے بظاہر مشتق معلوم ہوتے ہیں۔ (سجو دکا سین اُڑا دو۔ تو جود رہ جائے)۔ حالانکہ دراصل یہ دو لفظ جدا جدا ہیں۔ جود سخاوت کے معنی پر ہے۔ اور سجود سجدہ کے معنی پر ہے۔ الحاصل دونوں صاحبوں کی ٹیپیں اچھی ہیں (خدا جزائے خیر دے)۔ اور ایک کو دُوسرے پر ترجیح نہیں۔

؎ ہر گلے را رنگ و بُوئے دیگر ست ۔

(۹) صفحہ ۲۸۴ پر مولوی صاحب نے دونوں صاحبوں کی حسب ذیل ایک ایک بیت لکھی ہے :۔

اعتراض مولوی شبلی صاحب

دبیرؔ	انیسؔ
کس آب و تاب سے یہ سر فوج پر گئی	سب نشۂ غرور جوانی اُتر گیا
پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اُتر گئی	تلوار تھی۔ کہ حلق سے پانی اُتر گیا

رائے مؤلف

اس کے بعد مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "دونوں شعروں کا فرق بھی ظاہر ہے" مَیں کہتا ہُوں۔ دونوں شعر اچھے ہیں۔ کچھ بھی ایسا فرق نہیں۔ جس کی بنا پر ایک شعر کو دُوسرے پر ترجیح دی جائے۔ میر صاحب کے یہاں صاف صاف لفظوں میں مضمون بیان ہُوا ہے۔ مرزا صاحب کی بیت میں آب و تاب میں رعایت لفظی ہے۔ کہ آب پانی کے معنی پر بھی آتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں پانی کے ساتھ گھونٹ کی لفظ بھی ہے۔ اور یہ بھی روزمرّہ ہے۔ کہ پانی کا گھونٹ گلے سے اُتر گیا۔ زبان بھی دونوں کی فصیح۔ حسن بیان بھی قابل تعریف ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۸۵ پر جو اشعار بالمقابل دونوں بزرگواروں کے لکھے ہیں۔ وہ یہاں بخوف طوالت مَیں نہیں لکھتا۔ کہ دونوں کے اشعار اچھے ہیں۔ البتّہ یہ لکھنا میرا فرض ہے۔ کہ مولوی صاحب نے ایک شعر مرزا صاحب کا اپنی خوش فہمی یا اور کسی سبب سے غلط لکھ دیا ہے۔ وہ شعر یُوں لکھا ہے۔ ؎ روشن پدر کا زور ہے دُنیا و دین پر ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر۔ صحیح یُوں ہے ؎

روشن پدر کا زور ہے دُنیا پہ دین پر ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر

صحت

ہر اعتبار رہ ہر صورت سے مشابہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اب آپ کے فہم عالی میں آیا۔ کہ مرزا مرحوم کا کلام کس قدر بلاغت کے پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جس بلاغت کو آپ کہتے ہیں کلام دبیر میں نام کو نہیں ہے۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس +

(۱۱) اسی صفحہ ۲۸۲ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کا ایک مصرع اور مرزا صاحب کا شعر لکھ کر دکھایا ہے :-

فیصلہ بیرونی ہیپ رعشہ

دبیر رہ	انیس رہ
دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند	چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

ایراد مولوی شبلی صاحب

پھر فرماتے ہیں کہ "میر صاحب کا مصرع فصیح و صاف ہے۔ ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے۔ وہ "رعشہ" کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزے دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزے چلانے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا۔ نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزے کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا" +

جواب لفظ نیزہ

اب میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب! یہ عذر بھی آپ کا نہیں چل سکتا۔ مرزا صاحب کے مصرع اوّل میں بھاگنے کی لفظ موجود ہے۔ یعنی ع دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند۔ اور اُن جوانوں کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے اُن کو

قدم پیر کی مانند رعشہ تھا۔ اوّل تو تیر کی مانند بھاگنا خاص روزمرہ ہے۔ دُوسرے جب بھاگتے تھے۔ تو جنبش و حرکت وغیرہ جتنے لوازم بھاگنے کے ہیں۔ وہ سب سامع سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ کودن نہ ہو۔ پھر یہ کیا اعتراض فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے نیزے کی جنبش و حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اور کس طرح ذکر کرتے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ تو مرزا صاحب کا کیا قصور ہے۔ ؎

فہم سخن تا نکند مستمع — قوت طبع از متکلم مجوئے

اور یہ جو ارشاد ہوا ہے۔ کہ بُوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اوّل تو یہ ادّعا بھی غلط ہے۔ کیونکہ رعشہ ہوگا۔ تو بغیر چلنے کے بھی کانپینگے۔ دوم جب بھاگنے کا ذکر کر دیا۔ تو چلنا تو خود بخود آگیا۔ اور جب آدمی بھاگینگے۔ تو اُن کے ہاتھ میں نیزے ضرور ہلتے ہوئے جائینگے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ کہ نیزوں کو قدم پیر کی مانند رعشہ تھا۔ جب چلنے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ تو بھاگنے میں زیادہ ہوگی۔ بہرحال میر صاحب کا مصرع بھی اچھا ہے۔ مرزا صاحب کی بیت بھی اچھی ہے۔ میری سمجھ میں کسی کلام کو اس موقع پر (دُوسرے کلام پر) ترجیح نہیں ہے۔
ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ اور دونوں فصیح ہیں۔ بندش بھی دونوں کی اچھی ہے۔ اور جو تصویر "کانپتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ وہ ہی "رعشہ" سے اور "بھاگتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ پھر کیونکر ایک کو دُوسرے پر ترجیح ہو سکتی ہے +

(۱۲) پھر اسی صفحہ ۲۸۲ پر اپنی عادت کے موافق دونوں صاحبوں کے (ایک ایک مصرع) حسب ذیل دو مصرع مولوی صاحب مقابلۃً لکھتے ہیں:۔

انیس رح	دبیر رح
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش	چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں

اور لکھتے ہیں "جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں۔ اس کی تعبیر دونوں

بزرگوں نے دو طرح پڑھی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جلاجل چلاّ کر الامان کہتا تھا۔
اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلاّنے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح
ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں۔ کہ حضرت امام
حسینؑ کا رُعب اس قدر غالب ہوا۔ کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہو گیا۔ رُعب اور خوف
کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے جب مل جاتے
ہیں۔ تو پھر جب تک جدا نہ ہوں۔ آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔
کہ وہ ہاتھ جوڑ کر بالکل چُپ ہو گیا"+

میں کہتا ہوں۔ کہ میر صاحب کے مصرع کی جو تعریف مولوی صاحب نے فرمائی۔
وہ صحیح بلکہ کچھ کم ہے۔ مجھے اس میں کلام نہیں ہے۔ مگر مرزا صاحب کے مصرع کی [illegible]
یہ ارشاد کہ چلاّنے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں۔
میرے نزدیک مولوی صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ جلاجل [illegible]
دونوں حصّے دونوں ہاتھوں سے مشابہ ہیں۔ اور جب وہ [illegible]
تو بالکل ہاتھ ملنے کی صورت پیدا ہوتی۔ عمل کے بعد آواز بھی [illegible] مرزا صاحب [illegible] فرمانا
کہ ع چلاّئے ہاتھ مل کے جلاجل الاماں بہت درست ہے۔ جو شخص [illegible]
وہ اپنے فعل پر ضرور نادم ہوتا ہے۔ اور ندامت کے وقت آدمی [illegible] افسوس ملتا ہے۔
اسی طرح جلاجل گویا افسوس مل مل کر الامان پکارتے تھے۔ دیکھئے کیسی عمدہ [illegible]
کتنا بڑا مضمون کتنے مختصر مصرع میں نظم ہے۔ جس کو خود بھی مولوی صاحب فرماتے ہیں۔
کہ تشبیہ صحیح ہے۔ مگر پھر بھی خواہ مخواہ اپنی خوش فہمی یا نہ جانے کس سبب سے اعتراض فرماتے
ہیں [illegible] فراست اسے کیا کہتے ہیں۔ ایسے ایسے فضول اعتراض فرما کر مرزا صاحب
کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے۔ کہ فہمیدہ و سنجیدہ شخص جب [illegible] فضول کو دیکھ
کر مولوی صاحب کو ناقص و نافہم کا خطاب دیتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کی [illegible]

گردانتے ہیں۔ بقول متنبی ؎

وَاِذَا اَتَتْکَ مَذَمَّتِی مِنْ نَاقِصٍ … فَھِیَ الشَّھَادَۃُ لِیْ بِاَنِّیْ کَامِلٌ[1]

واضح ہو کہ یہ دونوں مصرع دونوں بزرگواروں کے دو مختلف حالات کے (اور دو مختلف بحروں کے) ہیں۔ اس لئے [illegible] ناقص ہے [illegible] موقع پر میں دونوں بزرگوں کے پورے پورے بند لکھتا ہوں۔ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ دونوں کامل دو جداگانہ موقعوں کی تصویریں کھینچ رہے ہیں۔

میر صاحب کا مسدس جو مولوی صاحب نے صفحہ ۲۳ پر [illegible] لکھا ہے کہ [illegible] جگہ لفظی عبارت [illegible] کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت امام حسنؑ کا [illegible] جب [illegible] گیا ہے۔ تو اس موقع پر لکھتے ہیں:۔

یہ صدا [illegible] جوش … [illegible]

ہو گیا جوش [illegible] … [illegible] ہوش

چھیڑنا ان کو [illegible] … [illegible] ہوا

مولوی صاحب [illegible] مرزا صاحب کی شان میں انہوں نے [illegible] فرماتے ہیں۔ مگر میں [illegible] صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اگر [illegible] اور [illegible] سے

رعایت لفظی و میر صاحب

[1] [illegible] کمال کی شہادت ہے۔ [illegible]

[2] [illegible] کو دیکھئے [illegible]
مگر مولوی [illegible]

رعایت لفظی سے حسن کلام

ٹھونس دی جاتیں۔ تو اوچھا اور بے اثر کلام ہو جاتا۔ اب رعایت لفظی سے ماشاء اللہ حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ کلام سے اثر ہرگز زائل نہیں ہُوا ہے۔ ایسے ہی ایسے غلط اعتراضوں کی وجہ سے کوئی طرفدار میر انیس مرحوم بھی مولوی صاحب کا شکرگذار نہیں۔ اور وہ لوگ بھی موازنہ کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ۵

شنیدم کہ مردان راہ خُدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے مُیسّر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست جنگ

خیر اب مرزا صاحب کا پُورا بند بھی سُنئے۔ میر صاحب نے تو اُس موقع کی تصویر کھینچی تھی۔ کہ جب رجز امام حسینؑ کے وقت لشکر شام نے باجوں کا بجانا موقوف کیا تھا۔ برخلاف اس کے مرزا مرحوم اُس موقع کا نظارہ (سین) دکھاتے ہیں۔ کہ جب قاتلان امام حسینؑ لڑائی پر آمادہ ہُوئے۔ جنگ کی طیاری شروع کی۔ علم کھولے۔ باجے بجائے۔ (وہ بند یہ ہے):۔

ناگہ عمرؔ کے قصد پہ قرنا نے کی فغاں ۔۔۔ بیداد کی گواہی کو ہر سُو اُٹھے نشاں
چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں ۔۔۔ نقّارے سینے پیٹتے آگے ہُوئے رواں
دی بوق نے ندا کہ دم شور و شین ہے ۔۔۔ زہراؑ سے کہدو۔ نوبت قتل حسینؑ ہے

دیکھئے۔ اِس بلیغ و لطیف پیرایہ میں طیّاری جنگ کو نظم فرمایا ہے۔ کہ قرنا جو بجی۔ تو اُس نے سردار لشکر (عمر ابن سعد) کے اس ارادہ پر کہ فرزند رسولؐ کو قتل کریگا گویا فغاں کی۔ اس گواہی دینے کو کہ آل رسولؐ پر بیداد و ظلم ہو رہا ہے۔ نشان اُٹھے۔ جلاجل جو بجے۔ تو یہ ثابت ہُوا کہ

۵ چنانچہ مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔اے (اڈیٹر اخبار زمیندار پنجاب) اپنے پرچہ دکن ریویو بابت اگست سنہ ۔۔۔ میں شائع کی ہیں۔ کہ جو تعلی انیس کی طرف سے مولوی شبلی صاحب کو داد نہ ملی۔ اور بیجا سکوت سخن شناس ہو کر موازنہ کی قدر شکنی کا باعث ہو گئی۔ اور اسکو وہ شیعی دنیا کے ایک فرقہ کی صد سالہ بڑھی ہوئی عصبیت لکھتے ہیں۔ انکا مقصد ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر ذرا موازنہ کی نسبت خیال رہے۔ اعتدال پسند اور ناحق کوشیاں ہم تو دیکھیں۔ یہ کو تو متعصب بتاتے ہیں اور خود منصف بنتے ہیں۔ مگر کیا یہی انصاف ہے۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ جب اُن کا پیسہ کھوٹا ہے۔ تو پرکھنے والے کو وہ کوئی الزام دینے کے مستحق نہیں ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

یہ ظالم لشکر پر دست ندامت و تاسف مل مل کر الامان پکار رہے ہیں۔ نقارے پر جو چوب پڑ رہی تھی اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ سینے پیٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بوق میں سے یہ آواز نکلتی تھی۔ کہ شور و شین کا وقت ہے۔ کہ نبی کا نواسا امت کے ہاتھ سے پیاسا قتل ہوتا ہے۔ اور بوق گویا زبان حال و زبان اشارہ سے کہہ رہا تھا۔ کہ اب جناب فاطمہ زہرؑ سے کہہ دو۔ کہ گویا یہ نوبت قتل حسینؑ کی بج رہی ہے۔ کہ قتل بادشاہ مخالف پر نوبت فتح بجانے کا دستور ہے۔ اس مصرع کے ایک تو یہ معنی ہوئے۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اور سب انصار اور عزیز تو شہید ہو چکے۔ اب امام حسینؑ کے قتل ہونے کی باری ہے۔ نوبت کا لفظ اس معنی پر بھی اردوئے معلےٰ میں بولا جاتا ہے۔ کہ اس کام کی اب نوبت آگئی یا اب نوبت ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے۔ کہ اس میں اثر اور مرثیت کس قدر زیادہ ہے۔ ایسے بلیغ و مؤثر کلام کو (کاٹ چھانٹ کر) مولوی صاحب بدنما کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ یا خود ان بلاغت کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ یا جان بوجھ کر تجاہل عارفانہ فرماتے ہیں۔ مگر سخن شناس کب ان کی باتوں میں آتے ہیں۔ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش — من انداز قدت را مے شناسم

(۱۳۲) صفحہ ۳۶۳ پر مولوی صاحب مرزا صاحب پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے یہ (ناصفہ عن عجیب) خلاف بلاغت کی ایک مثال تحریر کرتے ہیں:-

"متن ؟ ہے حضرت سکینہؑ کو قید خانہ میں غش آگیا ہے۔ اُن کی ماں حضرت شہربانوؑ کو خیال ہُوا۔ کہ مر گئیں۔ انہوں نے نوحہ شروع کیا۔ حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں:-

زینبؑ نے رو کے بانوؑئے مغموم سے کہا — بے آس ہو نہ بھابھی ہے غش میں یہ مہ لقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا — اب اس کے رفع غش کی یہاں وقت ہے دوا
ہے عاشق حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی — سب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی"

پھر مولوی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ "تسکین اور تسلّی دینے میں یہ کہنا کہ خیر مرگئی تو کیا کر و گی" جو اللہ کی رضا" کس قدر ناموزوں اور خلاف آدمیت ہے"*

خلاف آدمیت

مَیں بادب مولوی شبلی صاحب کی خدمت میمون و مبارک میں گزارش کرتا ہوں کہ شاید آپ نے اب تک وہ کتابیں نہیں دیکھیں جن میں حقیقی انسانوں یعنی محمدؐ و آل محمدؐ اور اور ان کے سچے پیرووں کے اخلاق و عادات درج ہیں۔ کہ جن (محمدؐ و آل محمدؐ) کی شان میں خدا نے قرآن میں سورۂ ہل اتےٰ نازل فرمایا ہے۔ کہ جس کو سورۂ دہر اور سورۂ انسان بھی کہتے ہیں۔ ورنہ اللہ کی رضا کے بیان کو آپ کبھی خلاف آدمیت نہ فرماتے۔ اگر اور ایسی عربی و فارسی کی کتابیں جو ہزاروں کی تعداد میں علماء اہل اسلام (سُنّی و شیعہ) نے اُن کے اخلاق میں لکھی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھی تھیں۔ تو کم سے کم وہ اُردو ہی کی کتابیں دیکھ لیتے جو زمانۂ حال میں ائمہ اطہار کے حال میں بطور سوانح عمری لکھی گئی ہیں۔ مَیں ایک کم قیمت اُردو کی کتاب کا نام لیتا ہوں۔ یہ کتاب مولوی سید ظہور حسین صاحب قبلہ سہارن پوری مدرس اول علوم مشرقی ایم۔ بی سلطان المدارس نے تصنیف فرمائی ہے۔ اور لاہور کے مطبع مفید عام میں مولوی محمد عباس علی صاحب ... لوہاری منڈی سے چھپوا کر مشتہر کی ہے۔ کشف الحقائق فی احوال جعفر الصادق اس کا نام ہے شاید حضرت ... کتاب مذکور کے صفحہ ۶۵ و ۶۶ پر عبارت ذیل ملاحظہ ... آل محمدؐ کا پتہ چلتا ہے:-

جواب

اخلاق محمدؐ و آل محمدؐ

کشف الحقائق فی احوال جعفر الصادق

"اسمٰعیل (فرزند) امام جعفر صادق ... بیمار ہوئے ... آپ کی عیادت منظور تھی۔ دیکھا ... حضرت ... کھڑے ہیں۔ پس اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر وہاں ... جب باہر تشریف لائے۔ تو حالت بدل گئی

اخلاق اہل بیت اطہار

* ... ۱۴ تا ...

تھی۔ (یعنی) آثار حزن و ملال اب چہرۂ مبارک پر نہ رہے تھے۔ ہم کو گمان ہوا۔ کہ اب لڑکے کو آرام ہے۔ عرض کی۔ صاحب زادے کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا۔ اُس نے قضا کی۔ عرض کی زندگی میں پریشانی تھی۔ انتقال پر رنج و ملال نہیں۔ فرمایا۔ ہم اہلبیت کا یہی قاعدہ ہے۔ کہ نزول بلا سے پہلے مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ بلا جب نازل ہوگئی۔ تو قضائے خدا پر راضی ہوجاتے ہیں۔ اور اُس کو تسلیم کر لیتے ہیں ۵۱"+

اس ارشاد فیض بنیاد سے آپ کو ثابت ہو گیا ہوگا۔ کہ اہل بیت محمد مصطفٰے صلعم کا یہ عام طریقہ تھا۔ کہ نزول بلا سے پہلے تو مضطرب ہوتے تھے۔ مگر بلا نازل ہونے کے ساتھ ہی قضائے خدا پر راضی ہوجاتے تھے۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے۔ اسی عادت کو اس موقع پر مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی دکھایا ہے۔ کہ (گویا) وہ معظمہ فرما رہی ہیں۔ کہ بھابھی بے آس نہ ہو۔ سکینہ غش میں ہے۔ اچھی ہو جائیگی۔ اور اگر واقعی مر گئی ہے۔ تو ہم اہلبیت کے شیوۂ حق کے موافق تمکو صبر کرنا چاہئیے۔ جو اللہ کی رضا وہی مصلحت ہے۔ اُسی پر ہم راضی ہیں۔ پھر یہ اضطراب کیوں ۵۲؟ یہی باتیں تو مرزا صاحب کی کثرت معلومات پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اُن کے تاج کمال کی طرۂ طرار ہیں۔ کہ وہ جناب حالات اہلبیت اطہار میں اکثر وہی خیالات ظاہر فرماتے ہیں۔ جو اُن کی شان کے شایاں ہیں۔ اور جن پر اُن حضرات کے صحیح تاریخی حالات شاہد

(حاشیہ: تسلیم و رضا)
(حاشیہ: بسلسلۂ ...)

۵۱ ناظرین دیکھئے ہر فقرہ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے اور دلیں ترجمہ ہونے پر جس کلام میں یہ اثر ہے کہ دل ہی میں (ہر فقرہ) گھر کرتا ہے۔ تو اصل کلام باعث نظام کیا اثر رکھتا ہوگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۲ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کا ایک شعر یاد آگیا۔ لکھنا چاہتا ہوں۔ ہم سے عادت تو امیر اچھی ہے فریاد نہ کرنے کی۔ پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے۔ دیکھئے تسلیم و رضا کی کیا شان دکھاتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر

(حاشیہ: جناب منشی امیر مینائی)

عادل ہیں۔ عام آدمیوں کی عام عادات سے الگ کر کے خاصان خدا کی شان دکھلانا یہی تو مقتضائے بلاغت ہے۔ اور یہی درحقیقت (نیچرل) فطرتی رنگ ہے۔ اور جب خاصان خدا کے اخلاق و عادات ہمہ شما کی طرح دکھائے جائینگے۔ تو وہ رنگ دراصل خلاف فطرت و خلاف واقع ہوگا۔ ہر چند ہم میں اور گروہ صوفیہ میں مسائل توحید وغیرہ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مگر یہ تسلیم و رضا کا مسئلہ علمائے صوفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے جن لوگوں نے صوفیوں کے اخلاق کی کتابیں۔ اُن کے ملفوظات وغیرہ دیکھے ہیں مجھے امید ہے۔ کہ وہ میرے کلام کی تائید فرمائینگے۔ اگر طول کتاب کا خوف نہ ہوتا تو میں اس موقع پر بعض کتب تصوّف سے بہت کچھ لکھتا۔ مجھے اس موقع پر سخت تعجب اُس سے بڑھ کر افسوس ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے مولانا رومؒ کی سوانح عمری لکھی جس کی تالیف کے وقت اور اُس سے پہلے صوفیوں کی غالباً بہت سی کتابیں دیکھی ہونگی۔ مگر یہ مسئلہ رضا و تسلیم کا اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور اِس (رضا و تسلیم) کو خلاف آدمیت سمجھے۔ آدمیت
حالانکہ یہی آدمیت ہے۔ مگر ہر آدمی میں نہیں ہوتی۔ مرزا غالبؔ نے سچ فرمایا ہے؎

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور میر تقی میرؔ ان سے پہلے اور ان سے بہتر فرما گئے ہیں؎

شیخ جی صاحب بنے ہوں تو ہوں ×
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں

مولوی صاحب! آپ ایمان سے فرمائیگا۔ کہ آپ مرزا صاحب کے ایسے عارفانہ کلام پر الیسا بیجا اعتراض فرماتے ہیں۔ اور "خلاف آدمیت" کا ثقیل و ناموزوں لفظ

× اگرچہ دونوں طرح محاورہ تھا کہ ... یوں بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی آدمی ہونا بہت دشوار ہے۔ مگر میں نے میر صاحب کا شعر سمجھ کر (جوں کا توں) لکھ دیا ہے۔ میر صاحب کے قریب قریب حافظ شیرازی بھی فرما گئے ہیں؎ واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند قول ما این است کہ او آدم نیست۔ اگر اس بات کا ثبوت ہوتا۔ کہ میر صاحب کو حافظ شیراز کے شعر کا علم تھا۔ تو یوں کہنا مناسب ہوتا کہ ... فارسی سے اردو میں ترجمہ فرما دیا۔ اب یہ کہنا مناسب ہے۔ کہ مضمون توارد ہو گیا ۱۲ مؤلف حقیر۔

لکھتے ہیں۔کیا یہ آپ کی شان کے شایاں ہے؟ فرمائیے۔یہ مقام دیکھ کر اُن کے معتقدوں کے دل کیسے پاش پاش ہوگئے ہونگے۔مرزا صاحب کے کریمانہ اخلاق تمام ہندوستان میں مشہور اور زبان زد خاص و عام ہیں۔کچھ دبیریوں پر منحصر نہیں۔انیسیئے بھی اُن کو ایک فرشتہ خصال آدمی سمجھتے ہیں۔آپ اُن کی شان میں ایسے گستاخانہ بے باکانہ الفاظ فرماتے ہیں۔اور جب اُن کے شاگرد (مثل میر افضل علی صاحب ضو مصنف ردّ الموازنہ) جواب ترکی بہ ترکی دیتے ہیں۔تو آپکے طرفدار (مثل سابق اڈیٹر پرچہ دکن ریویو) ایسے بگڑتے ہیں۔کہ ردّ الموازنہ کو بازاری آدمیوں کی گالیاں کہتے ہیں۔اپنے گریبان میں منہ ڈال نہیں دیکھتے۔خیر آپ ندوۃ العلما کے ممبر اور معمر اور اہل علم میں سے سمجھے جاتے ہیں۔مَیں جواب میں بھی کوئی لفظ خلافِ آدمیت کہنا نامناسب سمجھتا ہوں۔بقول میر انیس مرحوم

جو لو چھٹے تو بڑا آج کام میں نے کیا ‏ ‏ جب اُس نے گالی دی جھک کر سلام میں نے کیا*

اعتراضوں کا طوفان

(۱۴۳) صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳ پر مولوی صاحب نے مرزا صاحب کا یہ بند لکھ کر

حامی جو سلیماں کے عالم نظر آئے ‏ ‏ مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤس تصوّر کی طرح دل میں در آئے ‏ ‏ شیشے میں پریزاد معانی اُتر آئے
یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے ‏ ‏ لعل اُگلو نگا میں طوطی سدرہ کے دہن سے

بے جا اعتراضوں کا طوفان مچا دیا ہے۔کاش وہ کوئی معقول اعتراض فرماتے جسکو دیکھ کر کسی اہل فن کو فائدہ ہوتا۔یا جواب اُس کا سُن کر کچھ معلومات بڑھتی۔بالکل اُٹکل پچو اعتراض ہیں۔اور وہ بھی سوالات کے پیرایہ میں۔جس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ فہم عالی میں (مضمون دقیق) نہیں آیا۔اور دُوسرے سے پُوچھنا اپنی کسرِ شان سمجھا۔اعتراض کے پردے میں سوال یا سوال کی آڑ میں اعتراض فرماتے ہیں۔یہ سوالات یا اعتراضات

اعتراض تفصیلی یعنی سوال ہے

* [illegible] الموازنہ یا المعجم [illegible] کے [illegible] میں دوش [illegible] شنم و دشنام [illegible] کردم و پند [illegible] ۱۲ [illegible]

حسب ذیل ہیں:۔

"(۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے۔ (۲) تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے۔ (۳) پھر اس کے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤس تصور دل میں اُترتا ہے۔ (۴) طاؤس دل میں نہیں اُترتا۔ (۵) اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے۔ تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے۔ طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے۔ (۶) ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے۔ شاعر لعل اُگلیگا۔ لیکن طائر سدرہ کے دہن سے اُگلیگا۔ اس کے کیا معنی؟ شاید اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے۔ یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے" +

اب ہر فقرہ کا جواب باصواب سُنئے:۔ (۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا ۱۶۔ اب باصواب
تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اوّل تو یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ الفاظ میں گہرا تعلق ہو۔ اور جب الفاظ میں تعلق خاص ہوتا ہے۔ تو اُس کو شعرا صنعت مراعات النظیر یا رعایت لفظی کہتے ہیں۔ میر صاحب مرحوم کے یہاں جابجا یہ گہرا رنگ دیکھ کر مولوی صاحب جابجا اعتراض جما چکے اور کلام کو بے اثر بتا چکے۔ اب مرزا صاحب کے یہاں وہی تعلق ڈھونڈتے ہیں۔ مولوی صاحب کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ اگر واقعی وہ ایسے تعلق کلام یا اُبھری ہوئی رعایت لفظی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انصاف سے موازنہ کرنے کو بیٹھے تھے۔ تو کہیں کم سے کم اتنا ہی لکھتے۔ کہ مرزا مرحوم کے یہاں یہ گہرا رنگ کم ہے یا نہیں ہے۔ اب مجھ سے سُنئے مرزا صاحب نے صنعت رعایت لفظی کو کم برتا ہے۔ یا یُوں کہئے۔ کہ جب تک بے تکلفی سے کوئی مناسب لفظ نہیں آیا ہے۔ انہوں نے نہیں باندھا ہے۔ اس کی وجوہ مفصّل مَیں اسی کتاب میں دُوسرے موقع پر لکھ چکا ہُوں۔ اُن کو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا۔ کہ الفاظ میں رعایت و تعلق ایسا باریک ہو۔ کہ غور کرنے

جنابِ سلیمان عنقا

سے وہ سمجھ میں آئے۔ یہاں بھی وہ باریک تعلق موجود ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ جن و انس و وحش و طیر کے بادشاہ تھے۔ عنقا کل طائروں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ حضرت سلیمانؑ کا مطیع ہے۔ اب ایک باریک نکتہ زبان دانی کا عرض کرتا ہوں۔ یہی وہ باتیں ہیں۔ جن سے لغت کی کتابیں خالی ہیں۔ اور جب تک اہلِ زبان نہ بتائیں۔ یہ باتیں نہیں آ سکتیں[۱]۔ عنقا کے معنی اس موقع پر اس طائر کے نہیں ہیں بلکہ یہاں عنقا کے معنی نایاب کے ہیں۔ یہ روزمرہ ہے۔ کہ وہ چیز آج کل عنقا ہے۔ یعنی نایاب ہے۔ پس اسی معنی پر مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ کہ جب سلیمان دو عالم (امام حسینؑ) میرے حامی ہو گئے۔ تو جو مضمون نایاب تھے۔ وہ پر جوڑ کر آئے۔ پر جوڑ کر آنے کے مضمون میں بھی ایک اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ طائر ہمیشہ اپنے اعلیٰ مقام و مسکن پر پر جوڑ کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ پر جوڑ کر اترنے سے مطلب شدتِ سرعت سے ہے۔ مولوی صاحب! میرے معروضہ کی تصدیق منظور ہو۔ تو کسی ایسے مقام پر تھوڑی دیر کے لئے تشریف [illegible] جہاں کبوتر اڑتے ہوں۔ اور اپنی آنکھ سے کبوتروں کو ان کے مقام پر پر جوڑ کر آتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ مرزا مرحوم اس مضمون کو ادا کر رہے ہیں۔ کہ مضامین میرے گھر کو اپنا [illegible] مسکن سمجھ کر آتے ہیں[۲]۔ اب دوسری بات سنئے:۔ (۲) (طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے)۔ طاؤس تصور ایک استعارہ لطیف ہے۔ یعنی مضامین دل میں اسی طرح بے تکلف در آ گئے۔ جیسے تصور آتا ہے۔ طاؤس ایک خوش رنگ خوش وضع طائر ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے استعارے

طاؤس تصور

---

[۱] میر تقی میر [illegible] کی نسبت [illegible] مسجد کی سیڑھیوں [illegible] ہے مطلب یہ [illegible]

[۲] پر جوڑ کر آنے کے ایک معنی یاد آ گئے [illegible] سے بڑھ کر بلیغ مضمون کسی اور شاعر [illegible] کے یہاں نہیں ہے۔ ایسے نادر مضامین [illegible] مرزا مرحوم کا حصہ ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

شعرا نظم کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ حمد میں حکیم **فیضی** کا مشہور شعر ہے ؎

اے در رنگ و بوئے تو ز آغاز　　　طاؤس نظر بلند پرواز

طاؤس بھی رنگین ہوتا ہے مضمون بھی رنگین ہوتا ہے۔ اس لئے طاؤس تصور سے اُس کو استعارہ کرکے تشبیہ دی۔ جو کمال بلاغت کی دلیل ہے۔ طاؤس جس وقت باغ میں یا کسی اور مقام پر دیوار سے اُترتا ہے۔ تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ چوتھا مصرع بھی مولوی صاحب کی شمشیر اعتراض سے کیوں نہ چورنگ ہوگیا۔ اس پر بھی لگے ہاتھ کوئی اعتراض جما دیتے۔ اور وہ پریزاد حسین وفصیح مصرع یہ ہے۔ ع شیشے میں پریزاد معانی اُتر آئے۔ شعرا شیشہ کو دل سے (بوجہ نزاکت) تشبیہ دیتے ہیں۔ اور شیشے میں پری وجن کا اُترنا بھی ایک مشہور بات ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ دل کے شیشے میں پریزاد مضامین اُتر آئے۔ اب سوالات (۵) تک کے جوابات ہو چکے۔ (۶) ٹیپ کو لیجئے۔ جس کو مولوی صاحب اپنی خوش فہمی سے بے ربط بتاتے ہیں۔ ٹیپ واقعی دقیق اور قصد طلب ہے مگر واضح ہو کہ یہ مرثیے اُس زمانہ کی تصنیف ہیں۔ جب کہ لکھنؤ دارالسلطنت ہونے کے [illegible] علم و منبع کمال ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلسوں میں اکثر اہل علم نظر آتے تھے۔ جو عموماً علوم عقلیہ و نقلیہ مشرقیہ کے لباس و سلاح سے آراستہ ہوتے تھے۔ اِدھر **خاندان اجتہاد** کی نکہت علم و فضل و تقدس سے لکھنؤ مہک رہا تھا۔ اُدھر علمائے **فرنگی محل** نے اشاعت علوم و فنون سے اس کو **دارالعلم والعمل** کا معزز خطاب دے رکھا تھا۔ لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے گرد و نواح کے بعض قصبات اور گاؤں کا کوئی جرول۔ کنتور۔ موہان۔ بلگرام۔ بدایوں۔ سندیلہ وغیرہ وغیرہ میں اہل علم و اہل فہم کثرت سے تھے۔ کہ جن کا مذاق گویا سخن تھا۔ ایسے **دقیق** شعاری لوگ تو فقیر کرتے تھے۔ اُن علم دوست حضرات کا تو یہ باب سخن بکھیہ تھا۔ [illegible] دی ہے۔

تشریح ٹیپ

علم لکھنؤ کی شان

خاندان اجتہاد

نظم کو تشبیہ و استعارہ کے لباس و زیور سے آراستہ کرو۔ بلیغ مضمون مختصر الفاظ میں لاؤ۔ اُس میں صنائع و بدائع بے تکلفی سے جا بجا اپنا جلوہ دکھاتے ہوں عجب لطف شاعری ہے۔ نہیں تو سیدھی سادی بات نثر ہی میں نہ کہدو۔ خیر اب میں مطلب سمجھنے کے واسطے آپ ایک مختصر و معتبر حدیث بیان کرنے کی اجازت مانگتا ہوں یہ حدیث شیخ صدوق علیہ الرحمہ* نے اپنی کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں لکھی ہے۔ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

شیخ صدوق و عیون اخبار الرضاؑ

حدثنا احمد بن زیاد بن جعفر الهمدانی۔ قال حدثنا علی بن ابراهیم [illegible] عبد السلام بن صالح الهروی۔ قال سمعت
۵ دعبل بن علی الخزاعی۔ یقول انشدتُ مولای الرّضاؑ قصیدتی۔ اولها مدارس ایاتٍ خلت من تلاوةٍ۔ ومَنزِلُ وحیٍ مقفر العرصات۔ فلمّا انتهیتُ الی قولی خروج امام لامحالة خارجٍ۔ یقوم علی اسم الله والبرکات۔ یمیّز فینا کلَّ حقٍّ وباطلٍ۔ ویُجزی علی النعماء والنقمات۔ بکی الرضا علیه السّلام بُکاءً شدیدًا ثمّ رفع رأسهٗ الیّ۔ فقال یا خزاعی نطقَ روحُ القدس علی لسانکَ بهذین البیتین۔ فهل تدری من هذا الامام ومتی یقومُ۔ فقلتُ لا۔ یا مولای الّا انّی سمعتُ بخروجِ امامٍ منکم یطهّرُ الارض من الفسادِ ویملأها عدلاً۔ فقال یا دعبل الخ +

یہ بزرگوار چار راویوں کے ذریعے یہ روایت دعبل خزاعی سے بیان فرماتے ہیں۔ جو (دعبل) امام رضاؑ کے مدّاح شاعر و معاصر ہیں۔ دعبل کہتے ہیں۔ میں نے اپنا یہ قصیدہ جس کا مطلع مدارس ایات الخ ہے۔ امام رضاؑ کی خدمت اقدس میں پڑھا۔

*شیخ صدوق شیعوں کے ایک معتبر عالم ہیں جنکا انتقال ۳۸۱ھ میں ہوا ہے تخمیناً تین سو کتابیں انکی تصنیف بتائی جاتی ہیں شیخ مفیدؔ ان کے شاگرد تھے اور شیخ مفید کے شاگرد سید مرتضےٰ علم الہدےٰ اور سید رضی جامع نہج البلاغہ ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہاں تک کہ مَیں قصیدہ پڑھتے پڑھتے اِن دو شعروں پر پہنچا۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ضرور ہے۔ کہ ایک امامؑ ظاہر ہوں۔ جو خدا کے نام اور برکتوں پر کلام فرمائینگے۔ اور ہم میں ہر حق و باطل کو چھانٹ دینگے۔ اور (نعمات) نیکیوں کی جزا اور (نقمات) بُرائیوں کی سزا دینگے۔ یہ سُن کر حضرت (امام رضاؑ) بہت روئے۔ پھر میری طرف سر اُٹھاکر فرمایا۔ اے دعبل خزاعی اِن دونوں شعروں کے کہنے میں رُوح القدس (جبریلؑ) تیری زبان پر ناطق ہوا ہے۔ تجھے معلوم ہے؟ یہ امام کون ہے۔ (دعبل) مَیں نے عرض کی۔ آقا مجھے خبر نہیں۔ مَیں نے تو بس اتنا سُنا تھا۔ کہ آپ اہلبیتؑ میں سے ایک امام ظاہر ہونگے۔ جو زمین کو فساد سے پاک کردینگے۔ اور عدل و داد سے بھر دینگے۔ پھر حضرت (امام رضاؑ) نے پُوری کیفیت ظہور امام اثنا عشرؑ کی بیان فرمائی۔ جو باقی حدیث میں ہے۔ اور جس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہید تمام ہُوئی۔ اسی قصہ کی طرف (جو اُس زمانہ کے اہل علم میں مشہور تھا) مرزا صاحب نے اس مصرع میں اشارہ فرمایا ہے۔ (ع نعل آ گلونگا مَیں طوطی سدرہ کے دہن سے) سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے حضرت جبریلؑ کا مقام مشہور ہے۔ اس لئے حضرت جبرئیلؑ کو (جن کا نام رُوح القدس و رُوح الامین بھی ہے) طوطی سدرہ کہتے ہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہ ہے۔ کہ جبریلؑ مدح محمدؐ و آلِ محمدؐ میں میری زبان پر ناطق و گویا ہونگے۔ ناظرین آپ کو اس موقع پر مولوی شبلی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کہ نہ وہ ایسے اُلٹے پُلٹے استفہامیہ اعتراض فرماتے۔ نہ مَیں اس طرح ہندی کی چندی کرکے سمجھاتا۔ ضرور مرزا صاحب کے کلام میں سے کچھ کلام ایسا دقیق و قصہ طلب بھی ہے۔ اور مَیں اس کی بحث ایک مقام پر اسی کتاب میں کرچکا ہُوں۔ اور کہ چکا ہُوں۔ کہ ہر ذی علم متکلم ناظم و ناثر کے کلام میں ضرور کچھ حصہ دقیق کلام کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نہج البلاغہ ایسی لاجواب کتاب میں بھی ہے۔ اِس سے مرزا

روح القدس و شاعر اہلبیتؑ

صاحب کے علم و فضل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بھی ایک دلیل اُن کے کمال کی ہے۔ اِس بنا پر کوئی شخص مرزا صاحب کے کمالات کو مٹانا چاہے۔ تو نہیں مٹ سکتے۔ ایسے ایسے اعتراضات مولوی شبلی صاحب نے اور بھی چند بندوں پر فرمائے ہیں۔ مگر میں ہندی کی چندی کہاں تک سمجھاؤں۔ کتاب زیادہ طولانی ہوئی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض بند دُوسرے مقام پر میں نے سمجھا دئے ہیں۔ اور یُوں بھی اب ضرورت نہیں ہے۔ کہ میرے کرم فرما اُستاد بھائی منشی چودھری سید نظیر احسن صاحب رئیس مہابن ضلع متھرا نے موازنہ مولوی شبلی صاحب کے جواب میں ایک مستقل کتاب (المیزان) لکھی ہے۔ جو غالباً میری کتاب کے ساتھ ساتھ شائع ہوگی۔ کہ آج کل چھپ رہی ہے۔ جو صاحب چاہیں۔ اُس کتاب میں ان تمام بندوں کی شرح ملاحظہ فرمائیں۔ کتاب المیزان ایک محققانہ لاجواب کتاب ہے +

دُوسرا داغ۔ زبان دانی کی غلطیاں

رباعی مؤلف حقیر

(۱) جو لوگ اہلِ زباں پہ مُنہ آتے ہیں
آجاتا ہے جو مُنہ میں وہ کہہ جاتے ہیں
ثابت ان کو سزا بھی ملتی ہے ضرور
مُنہ آتے ہیں جب تو مُنہ کی بھی کھاتے ہیں

ایضاً

(۲) اہلِ جوہر کا مرتبہ عالی ہے
ہر بزم میں صدر ان کے لئے خالی ہے
ہیں سکّۂ نظم دبیرؔ اور انیسؔ
ان کی اردو زبان ٹکسالی ہے

میرے خیال میں مولوی شبلی صاحب نے سب سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ جا بجا موازنہ میں دبیرؔ و انیسؔ کی زبان پر بھی اعتراض فرمائے۔ یہ امر ہرگز اُن کو سزاوار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مولوی شبلی صاحب گو یا سہ حدِ برنگال کے قریب کے (ایک قصبہ کے رہنے والے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ کی زبان مستند سے اُن کو اتنا ہی بُعد ہے۔ جتنا اُن کے وطن کو۔ تھوڑے دن رہ

فصل دوسرا داغ زبان دانی کی غلطیاں

علی گڑھ میں ضرور ہے۔ مگر ہنوز دلّی دور ہے۔ مرزا دبیر مرحوم کی پیدائش دہلی کی۔ پانچ سات برس کی عمر میں وہ دہلی سے اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ پھر تمام عمر (گویا) لکھنؤ میں رہے۔ لکھنؤ سے راہیٔ جنّت ہُوئے۔ اسی طرح میر انیس مغفور فیض آباد میں پیدا اور جوان ہُوئے۔ آخر عہد شباب میں لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ سے فردوس بریں کو تشریف لیگئے۔ ان کے بزرگ بھی اردو کے مستند شعرا تھے۔ دہلی فیض آباد۔ لکھنؤ۔ یہ شہر اُس زمانے میں مرکز فیض و مرجع اہل کمال تھے۔ وہاں کے رہنے والوں کی زبان سند سمجھی جاتی ہے۔ پھر ایک بیرونی کو کب یہ حق ہے۔ کہ اُن کی زبان پر مُنہ آئے + جو پنجابی وغیرہ آج کل اہل زبان یا زباندان ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ وہ بھی تو ساتھ ساتھ یہی کہتے جاتے ہیں۔ کہ تمام مستند گزشتہ شعرائے دہلی و لکھنؤ کو ہم اپنا سرتاج اور قابل تقلید اُستاد مانتے ہیں۔ اگر کلام ہے تو اس میں ہے۔ کہ اب بھی دہلی و لکھنؤ میں ویسے شعرا باقی ہیں یا نہیں۔ کہ جن کی تقلید مثل سابق واجب ہو۔ میں کہتا ہُوں اور میری دلی آرزو بھی یہی کہتی ہے۔ کہ اب بھی ہیں۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی امید ہے۔

خیبر ~~ کجا بودم اکنوں کجا آمدم ۔ زجا رفتم اما بجا آمدم +

اب وہ زبان کے متعلق غلطیاں مولوی شبلی صاحب کی غور و انصاف سے سُنئے:۔

(۱) صفحہ ۲۳ موازنہ میں میر انیس مرحوم کے اس مصرع پر ~~ اس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہوگئی شبیر ہیں۔ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ "خوش" چاہئے۔ (مطلب یہ ہے کہ خوشی غلط ہے)۔ ناظرین! اب ذرا میری سُنئے۔ دو گھڑی غم غلط کیجئے:۔

بات یہ ہے۔ کہ خوشی ہونا اور خوش ہونا دونوں صحیح محاورے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ میں پہلے خوشی ہونا زیادہ بولا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی نظیر لیجئے۔ حضرت آتش فرماتے ہیں ~~

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد ۔ خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اعتراض بیجا ہے صاحب کی نظیر ... (handwritten margin note)

اور دہلی کی نظیر درکار ہو۔ تو اصغر علی خاں صاحب نسیم دہلوی کا یہ پھڑکتا ہوا شعر سنئے ؎

جس طرف دیکھئے دو تین پھڑکتے ہیں اسیر — کیوں نہ صیّاد خوشی ہو چمن آباد ہیں سب [۵۱]

اب بھی کوئی صاحب نہ مانینگے۔ تو اُن کو نسیم کا یہ شعر سُننا پڑیگا ؎

نسیم دہلوی۔ ہم موجد باب فصاحت ہیں — کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

یہ دو شعر اتفاقیہ اس وقت مجھے یاد آگئے۔ لکھدئے۔ ورنہ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ دبیر و انیس نے جس کثرت سے محاورے اور الفاظ نظم فرمائے ہیں۔ وہ غزل گو قصیدہ گو شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ اور یہ دونوں بزرگوار خود مستند ہیں۔ ان کے واسطے دُوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا بھی ضرور نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کلام سے سند و نظیری بنتی ہے۔ بقول شیخ امان علی صاحب سحر لکھنوی ؎

پیرو نیوں کو چاہئے تقلید لکھنؤ — ہم خود سند ہیں ہم کو سند کیا ضرور ہے

(۲) صفحہ ۲۰۷ پر یہ مصرع مرزا صاحب کا ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں" کا [illegible] صاحب فرماتے ہیں "چھوٹا مسافر مرزا صاحب کا ایجاد ہے" میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کا ایجاد نہیں ہے۔ ٹکسالی زبان اردو کا سکہ پڑا ہوا لفظ ہے۔ اور چھوٹا مسافر۔ ننھا مسافر۔ ننھا سا مسافر۔ چھوٹا سا مسافر یہ سب الفاظ تمام ہندوستان میں بولے جاتے ہیں۔ آزاد مرحوم نے آب حیات کے صفحہ ۲۳ پر

اعتراض مرزا صاحب پر

۵۱ آزاد مرحوم نے آب حیات میں صفحہ ۴۰ پر کسی شخص نا معلوم الاسم کے اعتراض کی ذیل میں نسیم مرحوم کا یہ شعر لکھکر لکھا ہے کہ خوش چاہئے۔ اس اعتراض کا [illegible] نے جلوہ خضر جلد دوم میں صفحہ ۱۱۲ پر جواب دیا ہے کہ خوشی پھرنا برا ہی ورنہ نہیں جیسے کہتے ہیں خوشی خوشی جاؤ۔ [illegible] نسیم دہلوی کہتے ہیں ؎ نہ زندگی سے خوشی ہوں نہ موت سے راضی۔ خفا بار دل ہے نہ اختیار میں روح۔ حقیر ثابت کرتا ہے کہ خوشی بجائے خوش اردو میں اس طرح مستعمل ہے۔ جیسے عربی میں زیدٌ عدلٌ بجائے زیدٌ عادلٌ کے۔ اور خوشی بجائے خوش کے آج تک اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ دہلی میں کبھی غالب بولا جاتا ہے۔ جس کی نسبت [illegible] دہلوی کے دو شعر لکھے ہیں + ۱۲ بے بضاعت ثابت۔

۵۲ جناب [illegible] واقف تھے۔ چنانچہ امیر اللغات کے ریویو میں لکھتے ہیں کہ فی الحقیقت صاحب خود سند ہیں انکو دوسروں کے کلام سے سند لانے کی ضرورت نہ تھی [illegible] پیرو نیوں کا سمجھنا + ۱۲ ثابت۔

ننھا کو (خورد کے معنی پر) گجراتی لکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ چھوٹا (بھاشا) تمام ہندوستان کا لفظ ہے۔ اور ننھا صرف (ایک حصّہ ملک) گجرات کا۔ مگر اب یہ بھی ہندوستان میں رائج ہے۔ اس لئے یہ بھی اردو ہے۔ اور اگر ایجاد مرزا صاحب سے آپ کی یہ مراد ہے۔ کہ شاعروں میں پہلے پہل مرزا مرحوم نے اس کو باندھا۔ تو ہر لفظ و محاورہ کو اول اول جس شاعر نے جس زبان میں نظم کیا ہوگا۔ وہ اس کا موجد قرار پائیگا۔ اور ہر لفظ و محاورہ ضرور ہے کہ کسی شاعر نے پہلے پہل باندھا ہوگا۔ اس صورت میں یہ بات اس شاعر کے کمال پر دال ہے۔ افسوس کہ آپ اس پر طعن فرماتے ہیں۔ میر مونس مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

ہنر کو عیب سمجھتے ہیں اس زمانے میں　　ہزار شکر کہ ہم کچھ ہنر نہیں رکھتے

یورپ میں اب تک الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر شاعر و مصنف کے بیان میں لکھے جاتے ہیں۔ جو اس نے اول اول نظم یا استعمال کئے ہوں۔ اور اس کے تاج کمال کے طرّہ کے تار (گویا) سمجھے جاتے ہیں۔ مگر مولوی شبلی صاحب طعن فرماتے ہیں ع [illegible] افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے +

اعتراض میر صاحب پر

(۳) صفحہ ۲۲۹ پر میر صاحب پر اعتراض کی [illegible] مولوی صاحب لکھتے ہیں ؎ [illegible] نہیں یہ لی کی سلامت [illegible] زبان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مولوی صاحب کی زبان [illegible] لکھنؤ کے محلات شاہی [illegible] زبان کا لفظ ہے [illegible] مگر محلات شاہی میں بولے جانے کی وجہ سے خصوصیت [illegible] فصیح سمجھا جائیگا۔ میر صاحب [illegible] شیخ علی حزینؒ نے کیا خوب [illegible] ؎

کس زبان [illegible]　　[illegible] النماس [illegible]

جواب [illegible]

اب میں [illegible] مولوی شبلی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ [illegible] "نفار" کہاں کی

زبان ہے +

اعتراض حب مرزا صاحب پر (مبتذل الفاظ) جواب

(۴۲) صفحہ ۲۳۳ پر موازنہ میں (مولوی صاحب) لکھتے ہیں کہ "مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر ان کے کلام میں **مبتذل** الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں حضرت شہر بانوؑ نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎ ہے ہے مرے **دیور** مرے **دیور** مرے **دیور**۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎ **ناڑد** نوان کی سالگرہ کا نکال لا"۔ اب میں کہتا ہوں کہ مولوی صاحب **دیور** اور **ناڑد** کو مبتذل سمجھتے ہیں۔ ہائے ناواقفی!

مبتذل کیا چیز ہے

بندہ پرور! **مبتذل** وہ لفظ ہوتی ہے جس کو بازاری آدمی بولتے ہیں۔ اور ثقہ و شریف آدمی اس کے بدل دوسری لفظ بولیں۔ اور جب کسی زبان میں ایک معنی پر ایک ہی لفظ ہو۔ کہ اس کو سب شریف و وضیع بولتے ہوں تو اس لفظ کو کوئی اہل زبان مبتذل نہیں کہہ سکتا۔

جواب

اب سنئے **دیور** اور **جیٹھ** یہ دو لفظ عورتوں کی زبان کے ہیں۔ جو تمام ہندوستان میں (تمام قوموں میں) بولے جاتے ہیں۔ دیور وہ ہے جو عورت کے خاوند سے عمر میں چھوٹا بھائی ہو۔ جیٹھ وہ ہے جو بڑا ہو۔ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مرنے پر زوجہ امام حسینؑ جناب بانو فرماتی ہیں ؎ ہے ہے مرے **دیور** مرے **دیور** [illegible] **دیور** سے مرزا مرحوم نے کمال بلاغت سے [illegible] کام لیا ہے کہ حضرت بانو کی [illegible] (شوہر) [illegible] جو عورتیں [illegible] ہوتی ہیں۔ **مجھے سخت تعجب** ہے کہ ایسے الفاظ پر بھی مولوی صاحب [illegible] لکھنؤ کے علاوہ اور بھی تمام ہندوستان [illegible] مقام

٭ [illegible]

[illegible]

اب دیکھئے [illegible]

(بالخصوص عورتوں کی زبان میں) نہیں ہے[۵۱] ہاں خوب یاد آیا۔ ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا۔ کہ بنگالہ میں اور اُس کی سرحد کے قریب عورتیں دیور کو دیورا کہتی ہیں۔ شاید مولوی صاحب نے اسی خیال سے اعتراض فرمایا ہوگا۔ کہ دیورا کیوں نہ باندھا۔ (واللہ اعلم) + اب دُوسری لفظ ناڑہ لیجئے۔ تمام محلات شاہی لکھنؤ کی مستورات اور تمام لکھنؤ کی شریف و وضیع کی عورتیں سالگرہ کا ناڑہ ہی پہلے بھی بولتی تھیں۔ اور آج بھی بولتی ہیں۔ اور لکھنؤ کے مرد بھی ناڑہ سالگرہ کا کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی نظم فرما کر فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ اس کے عوض بھی فصحائے لکھنؤ بالخصوص عورتوں کی زبان میں دُوسری لفظ ہی نہیں ہے[۵۲] واضح ہو۔ کہ لکھنؤ والے سالگرہ کا ناڑہ اور محرم کا ناڑہ بولتے ہیں۔ جناب شیخ ناسخ مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎ ناڑہ

جلد رنگ لے دیدۂ خوں بار اب تار نگاہ ہے محرم اُس پری پیکر کو ناڑا چاہئے[۵۳]

اس سے یہ بھی ثابت ہوا۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے ناڑے کو کیوں مبتذل لفظ سمجھا۔

---

۵۱ اس موقع پر یہ بھی لکھ دوں۔ کہ یہ جواب میں نے لفظ دیور کی نسبت دیا ہے۔ اور میری غرض یہ ہے۔ کہ دیور مبتذل لفظ نہیں ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مصرع اس مرثیہ میں نہیں ہے جو حضرت دبیرؔ کے پڑھنے کا جناب مرزا اوج مدظلہ کے پاس ہے۔ وہ [illegible] مرحوم کے کاتب مرحوم کا لکھا ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے یہ حال مجھے معلوم ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بند کسی [illegible] مگر میری غرض صرف اتنی ہے کہ دیور کا لفظ مبتذل نہیں ہے۔ یہ حاشیہ ناظرین کی اطلاع کیلئے لکھا گیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۲ واضح ہو کہ لفظ ناڑہ دہلی میں بالعموم مذکر بولا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے اکثر خاندان مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں۔ خاندان جناب مرزا دبیرؔ مرحوم میں [illegible] بولتے ہیں [illegible] اس سے ہم نے اس کتاب میں کہیں مؤنث کہیں مذکر لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۳ مولوی [illegible] صاحب فرہنگ آصفیہ کے مؤلف نے کتاب مذکور کی جلد چہارم کے صفحہ ۵۲۳ پر ناڑہ کو کلاوہ کے معنی پر [illegible] جناب شیخ مرحوم کا سند میں [illegible] یہ اُن کی کمال معلومات زبان کی دلیل ہے۔ ورنہ ان کی کوشش قابل داد ہے۔ [illegible] سالگرہ کا ناڑہ آج بھی لکھنؤ کے شاہی خاندانوں اور شرفا میں بولا جاتا ہے۔ مولوی شبلی صاحب باوجو[د] [illegible] صاحب [illegible] میں [illegible] خاندانوں میں تحقیق [illegible] + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

غالباً اُن کا خیال اس طرف گیا کہ اکثر بیرونی ناڑہ آزاربند کو کہتے ہیں۔ سو واضح رہے۔
کہ لکھنؤ کے شرفا (جن کی زبان فصیح اردو سمجھی جاتی ہے) ہرگز آزاربند کے معنی پر ناڑہ نہیں
بولتے۔ اور جو اہل دیہات وقصبات پڑھے لکھے ہیں۔ وہ بھی ناڑہ آزاربند کے معنی پر نہیں
بولتے۔ **ہائے اردو** آج یہ روز بد تجھ کو دیکھنا نصیب ہوا۔ کہ جاہل دیہاتیوں کی زبان
کی بنا و خیال پر **تجھے** نشانہ تیر ملامت بنایا جاتا ہے۔ تیرے فصیح الفاظ کو مبتذل اِخطاب
دیا جاتا ہے۔ دیکھئے کل کیا تیری قسمت کا لکھا پیش آئیگا۔ **اب ایک بات اور**
مجھے کہنا ہے۔ وہ یہ کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ "مرزا صاحب واقعہ نگاری و عامہ بندی
میں میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں" دروغ بے فروغ ہے۔ میں روایت سے۔ درایت
سے۔ تاریخ سے یہاں تک کہ خود میر انیس صاحب مرحوم کے قول (مندرجہ رقعات
انیس) سے ثابت کر چکا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت میر صاحب سے مقدم ہے۔
اور برس چھ مہینہ مقدم نہیں۔ بلکہ پچیس(۲۵) تیس(۳۰) برس مقدم ہے۔ کہ اُس زمانے تک
میر صاحب لکھنؤ آئے ہی نہ تھے۔ پھر مرزا صاحب کیا خواب و خیال میں اُن کی تقلید
کر لیتے۔ خصوصاً اُن سیکڑوں (یا ہزاروں) مرثیوں میں جو اوّل اوّل [illegible] اندر)
اُنہوں نے کہے ہیں۔ اور میر صاحب کے لکھنؤ میں آنے پر بھی نہ کوئی منصف [illegible] مرزا
کو میر کا مقلد کہہ سکتا ہے۔ نہ میر کو مرزا کا۔ ایک معاصر دوسرے کا مقلد نہیں سمجھا جاتا
خدا جانے مولوی صاحب کس ملک کی اصطلاح بولتے ہیں۔ جو مدِمقابل کو مقلد کہتے ہیں۔
مقلد کے لئے ضرور ہے۔ کہ یا تو اُس کا شاگرد یا متبع ہو۔ یا زمانہ مابعد میں ہو۔ جیسے
ہمارے مولوی صاحب بے سر و پا بے سوچے سمجھے اعتراض فرماتے ہیں نساخ بنگالی
کے **مقلد ہیں**۔ جیسا کہ اس زمانہ میں اُن کے اعتراضوں کو دیکھ دیکھ کر منصف مزاج
لوگ کہتے ہیں۔ یہ بالکل نئی اُپج ہے۔ جو مولوی صاحب مرزا مرحوم کو میر صاحب کا مقلد
بتلاتے ہیں۔ آج تک کسی انیسیئے نے بھی مرزا صاحب کو میر صاحب کا مقلد نہ کہا تھا۔

میر صاحب کی تقلید کا الزام مرزا صاحب پر

دبیر اور مبتذل الفاظ

علم دوست منصف مزاج ناظرین! میں پچاس برس سے برابر مرزا صاحب کا کلام دیکھتا رہتا ہوں۔ اور اب پانچ سال میں (جب سے حیات دبیر لکھنے کا عزم بالجزم کیا) اُن کا تمام کلام جس قدر مجھے ملا۔ بہت نظر غور و انصاف سے میں نے دیکھا۔ مرزا صاحب بھی آخر بشر تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ اُن کے کلام میں بھی قبیح و عیب نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے ابتک اُن کے کلام میں ایک لفظ بھی ایسی نظر نہ آئی جس کو مبتذل کہا جاسکے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب ایسے متین و مہذب و ذیعلم شاعر پر ایسا (مبتذل الفاظ لانے کا) الزام لگاتے ہیں جس سے اُن کے کلام کو کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ ع اے عدالت اسے کیا کہتے ہیں +

اعتراض نمبر ۵

(۵) صفحہ ۲۰۲ پر مرزا صاحب کا یہ شعر لکھا ہے

تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ … اکبر سے میں لگڑی مروالی کو لے آؤ

جواب

مولوی صاحب (غیر مہذب الفاظ میں) اعتراض کرتے ہیں کہ "تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" اس محاورے سے ابتذال ٹپکتا ہے اور کس قدر خلاف مقتضائے حال ہے۔ کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں نے بیٹے سے درخواست کی میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو۔ آپ مولوی صاحب سے کہتا ہوں۔ کہ "تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" یہ ہرگز مبتذل روزمرہ نہیں ہے۔ مگر آپ نے جو اُس کا خلاصہ بیان کیا ہے "کہ میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو" یہ الفاظ غیر مہذب ہیں اور جب کہ ان کی نسبت ایک امام کی زوجہ کی طرف ہے (جو ایک امام کی والدہ ماجدہ بھی ہیں۔ جن کو ہم گروہ شیعہ بنا دین و ایمان سمجھتے ہیں)۔ تو آپ کا ان کریہہ الفاظ میں مطلب ادا کرنا بیشک ہمارے گروہ کی دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر میں قانونی شکنجہ کا خیال اپنے ہم خیالوں کو نہیں دلانا چاہتا۔ الحمد للہ علی السراء والضراء کہکر صبر کرتا ہوں

* خدا کا شکر ہے ہر حالت میں ۱۲ مؤلف حقیر۔

آدمی یہ کہتا ہوں۔ کہ "روٹی کھاؤ" "کھانا کھاؤ" "آیئے کھانا نوش فرمایئے" "زہر مار کیجئے" سب کا مآل گو ایک ہو۔ مگر لفظوں کے اختلاف سے ان کے اثر میں تریاق و زہر کا ایسا فرق ہے۔ میرے بادشاہ (شوہر) کو ڈھونڈکر لاؤ۔ دوسرا جملہ ہے "شوہر کو پیدا کرو" دوسرا لغو جملہ ہے۔ اب دوسری بات کا جواب باصواب سُنئے۔ مَیں قبل جواب دینے کے آپ کی توجہ ایک حدیث صحیح بخاری کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایک مشہور صحابی نے حضور صلعم سے عرض کیا تھا۔ کہ "۔ دوست دارم ترا زاین و زآن۔ نیک محبوب ترنئے از جان*"۔ جس کا جواب درگاہ حضور صلعم سے جو ملا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نہیں مجھے اپنے نفس سے بھی بڑھ کر دوست رکھیگا جب تو مومن ہو سکتا ہے۔ یہ سُن کر اُن بزرگوار نے بھی یہی کہا۔ کہ ہاں تمام چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اور اپنے نفس سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اب سمجھئے۔ کہ ہم لوگ امام حسینؑ کو کیسا اور کیا سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بعد رسول اللہ صلعم امام زمانہ بالکل جانشین و قائم مقام رسولؐ ہے۔ بس ایک وحی اُس کے پاس نہیں آتی۔ اور جو خصائص رسولؐ ہیں۔ وہ میسر کہ حاصل نہیں ہیں۔ باقی اُس بزرگوار کی وہی عزت وہی عصمت وہی عظمت ہے۔ جو رسولؐ کی ہے۔ یہ تو مذہب شیعہ کی بنا پر گفتگو تھی۔ مذہب سنت و جماعت کی رُو سے امام حسینؑ نبیؐ کے

حدیث صحیح بخاری

رہبر

* یہ مثنوی مطبوعہ خطاب فاصل (جناب مفتی صاحب طاب ثراہ) کا شعر ہے۔ جو سو سال پہلے دیکھی تھی۔ الفاظ یہ یاد رہ گئے۔ پوری

حدیث صحیح بخاری چھاپہ دہلی جزو سوم صفحہ ۹۸۱ پر دیکھئے یہ ہے۔ حدثنا یحیی بن سلیمان۔ قال حدثنی ابن وہب قال اخبرنی حیوۃ قال حدثنی ابو عقیل زہرہ بن معبد انہ سمع جدہ عبد اللہ بن ہشام قال کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو اخذ بید عمر بن خطاب فقال لہ عمر یا رسول اللہ لانت احب الی من کل شئی الا نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا والذی نفسی بیدہ حتی اکون احب الیک من نفسک فقال لہ عمر فانہ الان واللہ لانت احب الی من نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الان یا عمر۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں مختلف لفظوں اور بہت سے طریقوں سے آئی ہے۔ مآل سب کا یہی ہے کہ مومن وہی ہے جو حضور صلعم کو اپنی دولت۔ اولاد۔ آبرو۔ جان سب سے بڑھ کر دوست رکھے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

واجب التعظیم نواسے ہیں۔ جن کی شان میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ "دمک دمی لحمک لحمی"۔ اے حسینؑ تیرا خون میرا خون ہے تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ مذہب حضرات صوفیہ کے مطابق سنہ ہجری کے غوث[۱] امام حسینؑ تھے۔ مختصر یہ کہ قریب قریب ہر عقیدہ کے مسلمان کی بنا پر حضرت امام حسینؑ سے جناب شہر بانوؑ کے دو رشتے ہوئے۔ (۱) رشتۂ زوجیت۔ (۲) رشتہ و تعلق آقائی۔ پس رشتہ آقائی کی بنا پر ضرور ہے۔ کہ وہ امام حسینؑ کو اپنی اولاد۔ مال۔ آبرو۔ جان سب چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھیں۔ جب تو مومنہ ہیں۔ ورنہ معاذ اللہ مومنہ نہیں۔ مرزا صاحب جناب شہر بانو (مادر امام زین العابدینؑ) کو اعلےٰ درجہ کی مومنہ کاملہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان سے کہتے ہیں۔ ؎

تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ
اکبرؑ سے مَیں گذری مرے والی کو لے آؤ

واقعہ کا خلاصہ بھی سُن لیجئے۔ حضرت علی اکبرؑ شہید ہو چکے ہیں۔ اُن کے ڈھونڈھنے کو لشکر مخالف میں ایک طرف خود جناب امام حسینؑ گئے تھے۔ دوسری جانب ماہ بنی ہاشم جناب عباسؑ گئے تھے۔ امام حسینؑ ابھی واپس نہیں تشریف لائے۔ حضرت عباسؑ لاش کو ڈھونڈھ کر جب لاش نہ ملی تو گھر چلے آئے۔ اور اہلبیت کرام سے پوچھا ع کیا لاشۂ اکبرؑ نہیں لائے شہ والا۔ اب بی بی زادیوں میں بڑی تشویش پھیلی۔ اور یہ اندیشہ و خیال ہوا۔ کہ دشمنوں نے امام حسینؑ کو شاید قید کر لیا۔ جناب شہر بانوؑ نے اصرار کر کے (تلاش لاشۂ علی اکبرؑ کے واسطے) امام حسینؑ کو بھیجا تھا۔ اس لئے اُن کو زیادہ صدمہ ہوا۔ اس بنا پر وہ شاہزادی حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں۔ کہ "اکبرؑ سے مَیں گذری مرے والی کو لے آؤ"۔ اگر لاشۂ علی اکبرؑ

---

[۱] حضرات صوفیہ غوث کو ویسا ہی قائم مقام پیغمبرؐ کا سمجھتے ہیں جیسا شیعہ امام عصرؑ کو۔ غوث و امام میں صرف لفظی فرق ہے معنی میں دونوں ایک ہیں۔ ہمارے امام عصرؑ کا ایک لقب غوث بھی ہے۔ حسن اتفاق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] جس مرثیہ کا میں یہ خلاصہ اور یہ مصرع لکھ رہا ہوں۔ وہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔ اور اُس کا مطلع یہ ہے ؎ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے ۱۲ مؤلف حقیر۔

نہیں ملتا۔ تو خیر۔ امام حسینؑ تو زندہ آجائیں۔ آپ کو معلوم نہیں۔ کہ ان سب مخدرات عصمت نے اپنے اپنے بچوں کو اپنی سعادت اور اپنا فرض ایمانی سمجھ کر امام حسینؑ پر نثار کر دیا تھا۔ آپ مرزا دبیر مرحوم سے ہرگز یہ توقع نہ رکھیں۔ کہ وہ مادر امامؑ کی نسبت عوام کے خیال باندھینگے۔ جو عام عورتوں کے خیال کے موافق ہو۔ ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

یہی خصوصیات اور مستلزمات خاندان رسالت کے خیالات ہیں۔ جن کی بدولت مرزا دبیر تمام مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں۔ آپ انہیں اچھی چیزوں کو برا سمجھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ موازنہ میں جو میزان آپ نے قائم کی ہے۔ اسی میں اس قدر جھونک ہے۔ کہ ٹھیک وزن معلوم ہونا دشوار ہے۔ بلکہ نافہم کم علم آدمیوں کو تو دھوکا ہوتا ہے +

اعتراض میر صاحب پر
(۶) صفحہ ۲۲۹ پر موازنہ میں مولوی صاحب میر صاحب پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور اس پردہ میں ناسخ کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔ (یعنی یہ لکھا ہے۔ کہ جو اعتراضات میر ناسخ نے چھوڑ دئے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ انہیں میں سے یہ اعتراض بھی ہے)۔ ؎ بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے۔ لفظ صفا پر ایراد ہے۔ کہ "صاف" کر دیا چاہئے۔ میں کہتا ہوں۔ کیوں صاف کر دیا چاہئے۔ ضرور "صفا کر دیا" چاہئے۔

جواب
آپ پوچھئے کیوں؟ میں عرض کرتا ہوں۔ صفا پاک کے معنی پر ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بتوں کو توڑ کر کعبہ کو نجاست شرک سے پاک کر دیا۔ صفا کی رعایت لفظی کعبہ سے ہے۔ کہ صفا و مروہ دو مقام مشہور کعبہ کے متعلق ہیں۔ "صاف کر دیا" کہتے۔ تو یہ بات کب نصیب ہوتی۔

جغرافیہ انٹرنس کورس مطبوعہ مطبع صوفی ۱۸۹۶ء مرتبہ مولوی شبلی صاحب میں (سفرنامہ ناصر خسرو میں) صفحہ ۱۶۷ پر مکہ معظمہ کے بیان میں یہ فقرہ ہے "از مسجد حرام بجانب مشرق بازارے بزرگ کشیدہ است۔ از جنوب سوئے شمال۔ و در سر بازار از جانب جنوب کوہ ابو قبیس است و دامن کوہ ابو قبیس صفا است"۔ اس سے میں کہہ سکتا ہوں کہ صفا سے اسکول کے بچے تک واقف ہیں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس مجموعہ کے ترتیب دینے والے مولوی شبلی صاحب ناواقف ہو گئے ۱۲ مولف حقیر۔

صفا و مولانا روم

اب رہی یہ بات کہ صفا پاک کے معنی پر صحیح و مستعمل بھی ہے یا نہیں۔ اس کی سند ہم آپ کو آپ ہی کی کتاب سوانح مولانا روم کے صفحہ ۱۴۷ سے دیتے ہیں ۔ ؎

کیا فائدہ غیر پردہ کھولے   جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

صفحہ مذکور پر آپ یہ شعر مثنوی شریف کا پڑھئے ۔ ؎

روزن دل گر کشا دست و صفا   میرسد بے واسطہ نور خدا

یہاں بھی صفا پاک کے معنی پر استعمال فرمایا ہے۔ میر صاحب مرحوم نے بھی اسی معنی پر نظم کیا ہے۔ اسی معنی پر فارسی و اردو میں بولا جاتا ہے۔ آپ کی ناواقفیت کی تو کوئی حد ہی نہیں +

اعتراض پروانگی و جواب و حکایت شیخ علی حزین و سودا

(۷) پھر اسی صفحہ ۲۲۹ میں یہ دوسرا اعتراض میر صاحب پر جڑا ہے ؎ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ پروانگی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں اعتراض غلط ہے۔ پروانگی اردو کا محاورہ ہے۔ اجازت و حکم کے معنی پر دن رات بولتے ہیں۔ اور قریباً تمام ہندوستان میں بولتے ہیں۔ مشہور ہے۔ کہ جب مرزا سودا جناب شیخ علی حزین کی خدمت میں پہنچے۔ تو شیخ نے مصرع پڑھا ؎ درین بزم رہ نیست بیگانہ را۔ مرزا سمجھے۔ کہ شیخ چاہتے ہیں مصرع لگا دُ۔ یہ (حاضر جواب) بولے ع کہ پروانگی داد پروانہ را۔ شیخ نے پوچھا "پروانگی چیست" مرزا بولے۔ "پروانگی بجائے اجازت و رخصت اہل ہند میگویند"۔ شیخ بولے "بلے۔ خوش گفتی"۔ شیخ حزین بیچارے تو ایرانی تھے۔ اگر اس محاورہ ہندی سے نابلد تھے۔ تو حق بجانب تھا۔ مگر تعجب ہے۔ کہ مولوی صاحب ہندی نژاد ہو کر ایسے نا واقف ہو کر اعتراض کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی زبان دانی پر دبیر و انیس کے کلام میں تکلم رنج اٹھتے ہیں۔ ع العجب ثم العجب ثم العجب +

میر صاحب پر اعتراض حصول و جواب

(۸) اسی طرح صفحہ ۲۲۹ میں میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے ع جو خوبیاں کہ چاہیں وہ سب حصول ہیں۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ "حاصل" کہنا چاہئے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ حاصل اور حصول دونوں اردو کے اصطلاح کہ لکھنؤ کے محاورے

ہیں۔ جیسے عربی میں زید عدلٌ میں بجائے عادل کے عدل بولا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں حصول حاصل کی جگہ بولا جاتا ہے۔ اگر آپ ناواقف ہیں۔ تو میرے ساتھ کسی لکھنؤ کی محفل یا مجلس میں چلئے۔ اور اپنے کانوں سے کان کھول کر سن لیجئے۔ غالباً کوئی نہ کوئی یہ کہتا ہؤا مل جائیگا۔ کہ مولوی شبلی صاحب کوئی بیر دتی شخص ہیں۔ سُنا ہے۔ کہ اُنھوں نے دبیر و انیس کے محاوروں پر بھی اعتراض کئے ہیں۔ کوئی اُن سے یہ تو کہے۔ کہ فضول اعتراض کرنے سے کیا حصول۔ بقول آتش مرحوم ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

یا بقول کسی ایرانی شاعر کے (جس کا نام و تخلص مجھے معلوم نہیں) ؎

درخانہ شو از بروں خبر دار　　تا چیست فسانہ ات بہ بازار

فصل ۵ اتہام کا داغ

تیسرا داغ۔ اتہام کا

جسے انگریزی خواں اصحاب سفید جھوٹ بولتے ہیں۔ ناظرین! دیکھئے۔ مولوی شبلی صاحب نے یہاں تک انصاف سے کام لیا ہے۔ کہ جو مرثیہ غلط سلط مطبع نولکشور صاحب آنجہانی میں چھپ چکے ہیں۔ اُنہیں کے غلط الفاظ اور غلط مصرعوں تک اپنے اعتراضوں کو وسیع نہیں رکھا۔ بلکہ سُنے سُنائے مصرعوں کو بھی مرزا مرحوم کے سر منڈھ دیا٭ چنانچہ

(۱) صفحہ ۲۴۳ پر موازنہ میں فرماتے ہیں "مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرع ہے۔ زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔ اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ زیر۔ قدم۔ والدہ۔ فردوس۔ بریں سب

تصنیف صاحب نے زیر قدم والدہ فردوس... الخ

٭ حالانکہ انکو لازم یہ تھا کہ جس کلام مرزا صاحب پر اعتراض کرتے۔ کم سے کم اُسکو دفتر ماتم میں تو دیکھ لیتے کہ ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم تطہیر الاوساخ میں لکھ چکے ہیں اور زمانہ جانتا ہے کہ نولکشوری مطبوعہ جلدوں میں دبیر کے مرثیوں میں بہت کلام غیر شامل ہے۔ اعنی مولوی رضا صاحب کی کتاب کا مولوی شبلی صاحب نے موازنہ میں حوالہ دیا ہے اور نقل قول فرمایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ کتاب مولوی صاحب دیکھ چکے ہیں۔ مگر وہ کلام مرزا مرحوم کی طرف عائد کر کے اعتراض کئے۔ جو نولکشوری جلدوں میں بھی نہیں ملتا۔ دفتر ماتم میں تو قطعی نہیں ہے + مؤلف حقیر۔

بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہُوا ہے۔ وہ اس قدر بھدّا اور گراں ہے۔ کہ زبان اُس کا تحمّل نہیں کر سکتی*۔ شاید تم کو خیال ہو کہ مصرع کی ترکیب چونکہ فارسی ہوگئی ہے۔ اس لئے ثقل پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں۔ ؎

میں ہُوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں
میں ہُوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں

پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالیِ اضافات بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بھدّاپن اور ثقل نہیں ہے" + میں عرض کرتا ہُوں۔ کہ اس کا جواب تو وقت پر ہی مولوی شبلی صاحب کو مل گیا۔ اور منصف مزاج سخن شناسوں نے لکھ دیا۔ کہ "ع زیرِ قدم والدہ فردوسِ بریں" میں کسی قسم کا ثقل یا بھدّاپن بالکل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو اصلاحِ سخن لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۷ء جس میں منشی دولت حسین صاحب وجاہت (قابل اڈیٹر) نے مولوی صاحب کو معقول و دنداں شکن جواب دیا۔ اور صاف لکھا۔ کہ "مصرع مذکورہ میں کوئی ثقل کوئی سبب تنافر نہیں ہے۔ اور میر صاحب کے مصرع پیش کردہ (ع میں ہُوں سردارِ شباب چمنِ خلدِ بریں) میں علاوہ چار اضافتوں کے یہ غرابت بھی ہے۔ کہ شباب کے مشہور معنی جوانی کے ہیں۔ سنتے ہی سامع کا ذہن اُس طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور جوانی کے معنی لینے سے مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مصرع میں شباب کے معنی جوانوں کے ہیں۔ یہ شاب کی جمع ہے۔ مگر اس معنی پر شباب اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ اس لئے غریب ہے" اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ "کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو مصرع اوّل الذکر (دبیر) پر اس مصرع (انیس) کو ترجیح

* ناظرین آپ کو ایمان کی جان اور انصاف کے سر کی قسم ہے۔ دو چار مرتبہ اس مصرع کو پڑھئے۔ بالکل ثقالت اور بھدّاپن نہیں ہے۔ مولوی صاحب ایسا بھدّا بتاتے ہیں۔ کہ اُن کی زبان تحمّل نہیں کر سکتی۔ خدا جانے اُن کی زبان کیسی ثقیل ہے مصرع ہرگز ثقیل نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دی جائے۔ بلکہ عام فہم ہونے کے لحاظ سے دبیر کا مصرع قابل ترجیح ہے۔" خیر میری غرض میر صاحب کے مصرع پر اعتراض کرنے سے نہیں ہے (یہ خلاصہ منشی صاحب موصوف کی نوائے کا ہے۔ جو ایک منصف مزاج بے تعلق آدمی ہیں۔) اور میں میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کو قابل تعظیم و تقلید سمجھتا ہوں۔ بلکہ میر صاحب کی تائید میں یہاں تک کہتا ہوں۔ کہ گو شباب جوانوں کے معنی پر اردو میں مستعمل نہ ہو۔ مگر جب کہ شباب اہل اصل حدیث کی بجنسہ لفظ ہے (الحسن والحسین سیدا شباب اہل الجنۃ الحدیث) تو میر صاحب کا خاص اس موقع پر نظم فرمانا قابل گرفت نہیں ہے۔ میری غرض اس موقع پر اس ذکر سے یہ ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ مصرع مرزا صاحب کی طرف منسوب کر کے اُن مرحوم پر اتہام کیا ہے۔ بیسیوں جلدیں دفتر ماتم کی اور دونوں جلدیں مطبع نولکشوری کی (جو با وصفیکہ سر سے پاؤں تک غلط چھپی ہیں۔ کلام غیر بہت سا شامل ہے) دیکھ جائیے۔ آپ کو ہرگز یہ مصرع نہ ملیگا۔ اور ملے کیونکر مرزا صاحب کا مصرع ہی نہیں ہے حکیم قدیر الدولہ قدیر شاگرد رشید مرزا صاحب کا یہ مصرع ہے۔ جس مرثیہ میں یہ مصرع ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎ استاد مجھے آج یہ ہے لوح و قلم سے۔ یہ پُورا مرثیہ میرے پاس موجود ہے۔ اس کا پُورا بند یہ ہے (جس میں یہ مصرع بتغیر قافیہ ہے) :-

قدیر الدولہ قدیر

مادر کی اطاعت نہ کروں میں تو خطا ہے
زیر قدم والدہ فردوس علا ہے
زینبؑ کا ادب والدہ صاحب سے سوا ہے
بیٹا مجھے اپنا پھوپھی اماں نے کیا ہے
تو جانتا ہے مجھ پہ جو احسان کئے ہیں
پالا بھی ہے اور بیٹے بھی قربان کئے ہیں

* میں دیکھ رہا ہوں کہ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ کے مرثیے لوگ اپنی طرف منسوب کر کے پڑھتے ہیں کوئی ہمنا کرتے ہیں سر جاکر ان کے اسلاف کا نام لے دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ حیات دبیر کی تالیف سے فارغ ہو کر دو تین جلدیں تلامذہ مرزا صاحب کے مرثیوں کی چھپوا دوں بشرطیکہ حیات مستعار نے وفا کی۔ صد خیر عمر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ممکن ہے کہ بعد انتقال کوئی صاحب یہ کام کریں۔ ہدم سوانح حقیر

یہ مصرع انیسیوں اور دبیریوں کی باہمی چوٹوں میں اکثر انیسئے میرصاحب کے اس مصرع کے مقابلہ
میں "ع کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" پڑھا کرتے ہیں۔ اور دو اقفِ راز
دبیریوں کے یہ جتانے پر کہ یہ مصرع ہی دبیر کا نہیں۔ شاگرد دبیر (قدیر) کا ہے۔ کیا آپ
قدیر کے مقابلہ پر میر صاحب کو قائم کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے۔ تو مقابلہ کیجئے ع چشم ما
روشن الخ } انیسئے چُپ ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے بلا تحقیق اوّل تو اس مصرع کو
مرزا صاحب کا بتایا۔ نہ دفتر ماتم میں نہ ہر دو جلد مطبع نولکشوری میں ڈھونڈھا۔ دوسرے
ثقیل بتایا۔ جو ثقیل نہیں۔ تیسرے فردوس علا کی جگہ فردوس بریں لکھ دیا۔ یک
نہ شد دو شد سُنتے تھے یہ سہ شد ہوئی۔ خدا جانے۔ مولوی صاحب کے دل میں مرزا صاحب
کی طرف سے کیا بھرا ہُوا ہے۔ جو فصیح و سلیس کلام بھی اُن کو ثقیل نظر آتا ہے۔ اپنی
سلیم المذاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور اتہام کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے +

(۲) صفحہ ۵۵ و ۵۶ پر (موازنہ میں) میر صاحب کی یہ مشہور و منتخب بیت ؎

نکلا نہ مُنہ سے یہ کہ شہ مشرقین ہُوں | مولا نے سر جُھکا کے کہا میں حسینؑ ہُوں

یوں بتغیر الفاظ لکھی ہے۔ ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہُوں | مولا نے سر جُھکا کے کہا میں حسینؑ ہُوں

خیر اس میں تو ایک باریک فرق ہے۔ جس کو باریک بیں اردو کے اہل زبان سمجھ سکتے
ہیں* اور ممکن ہے۔ کہ مولوی صاحب کو چھاپہ میں یہ ٹیپ یونہی ملی ہو۔ مگر اس کے
بعد جو مولوی صاحب کے مُنہ سے مرزا مرحوم کے حق میں پھول جھڑے ہیں۔ وہ دیکھنے
کے قابل ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔
کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہُوں"

*وہ باریک فرق یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں کہا۔ کہا ایک معنی پر مولوی شبلی صاحب نے لکھ دیا ہے۔ یہ ذرا مخل فصاحت ہے۔
ایسی پاس پاس ایک ہی لفظ ایک ہی معنی پر لانا بعض فصحا مخل فصاحت سمجھتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

اعتراض ۲ اتہام مرزا فرمایا میں حسین الخ

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے۔ اُس کے فیصلے کے لئے دونوں کے صرف یہ دو مصرع کافی ہیں"۔

جواب باصواب

انصاف پسند اور انصاف پرست ناظرین! اس موقع پر تو میں مجبور ہو کر اتنا کہتا ہوں۔ اور میرے نزدیک یہ کہے بغیر رہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی بیجا طرفداری اور تحکم جتانے کے واسطے (آپ صاحبوں کو بھی ایک موقع دکھا دینا کافی ہے۔ ذرا دیکھئے تو مولوی صاحب مرزا صاحب کی تنقیص کے واسطے کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں۔ شطرنج کی سی چالیں چلتے ہیں۔ اتہام سے بھی نہیں چوکتے۔ پھر فرمائیے۔ ایسے بزرگوار کیا انصافانہ فیصلہ فرما سکتے ہیں؟ خدا جانے کس شاعر لامعلوم الاسم کا مصرع مرزا صاحب کے سر تھوپتے ہیں۔ اگر مقابلہ منظور ہے۔ تو اس بیت سے کریں (جو دفتر ماتم کی پانچویں جلد کے سب سے اوّل مرثیہ میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا)۔ وہ بیت یہ ہے ؎

مجروح تیر و خنجر و تیغ و سنین میں — اے عاشق حسین ہمیں تو حسین ہیں*

کہ اس بیت میں علاوہ سلاست بندش کے مظلومیت و مجروحیت کی دلکش تصویر لفظوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ مجلس میں۔ ایک ٹیپ ایک مرثیہ کا کام کر جاتی ہے۔ سامعین سُن کر تڑپ جاتے ہیں۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے (وہ مصرع فرضی تو لکھ دیا۔ جس کا دفتر ماتم میں کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ مگر) یہ بیت مقابلہ پر نہ لکھی۔ جو یقیناً مرزا صاحب کی ہے۔ مگر بقول بعض دلیروں کے مولوی صاحب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ منظور تو اُن کو یہ تھا۔ کہ ہر پہلو سے مرزا صاحب

* مرزا صاحب نے اس مضمون کو بہت سے مرثیوں میں متعدد اسلوب سے نظم فرمایا ہے۔ چند اشعار ذیل میں لکھتا ہوں۔ (۱) اک پہلوان نے جو اجل تھا میدان جنگ میں پوچھا ہے ؎ تم کون ہو؟ فرمایا غریب الوطن ہوں۔ سبطِ نبی کا تشنہ دہن حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ (۲) واللہ ابن فاتح بدر و حنین ہوں۔ میں بیکس و غریب مسافر حسین ہوں۔ (۳) مظلوم ہوں ناچار ہوں لب تشنہ جگر ہوں۔ نور نظر حیدرِ صفدر کا پسر ہوں۔ (۴) ارشاد کی شاہ نے با دیدۂ پرنم عباس نہیں ہم۔ تو حسین ابن علی ہم ہیں (۵) حضرت نے کہا تیر ہو یا تیغ ہے بیکس تنہا مظلوم حسن بن علی وہ ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

کے کمالات کو مٹائیں - اور اُن کو مرجوح و مفضول بنائیں - پھر وہ واقعی اور اچھا کلام دبیر مقابلہ پر لکھ کر کیا اپنے تمام دعووں پر پانی پھیر دیتے - اس جرأت اور اس تحکم پر ہزار آفرین +

اعتراض تلوار کی معشوقانہ وضع پر مدح ۱۸

(۳) صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱ پر میر صاحب کے تین شعر تلوار کی معشوقانہ وضع کی تعریف میں لکھے ہیں - جن میں سے اخیر کا اور سب سے بہتر شعر یہ ہے ؎

کج اس کی ہے پسند جہاں گو بھی نہ ہو　　معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

اور پھر لکھا ہے - کہ بقول علامہ ثعلبی تلوار کی معشوقانہ (ایسی) مدح محاسن شاعری میں داخل ہے - پھر مرزا صاحب پر مولوی صاحب نے عنایت و توجہ مبذول فرمائی ہے - اور فرمائے ہیں - کہ "لیکن یہ بہت نازک موقع ہے - رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے - جہاں تک کلام کا نشہ جانے پائے - اور کلام میں ابتذال نہ آ جائے - مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی - لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا - (تلوار کی تعریف) - ؎

جب خون میں بھری فوج کے ابروئے نکلی　　غُل یہ تھا - کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

جواب دینے سے پہلے میں کہتا ہوں - کہ ع آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو - واہ مولوی صاحب - نہ جانے کس بھدے مبتذل شاعر کی ٹیپ ہے - یا آپ نے خود ہی فکر فرمائی - اور مرزا صاحب کے سر تھوپ دی ہے - نہ یہ دفتر ماتم میں کہیں ہے - نہ کسی کی زبانی آج تک سُنی - نہ مرزا صاحب کی متانت نظم کی شان کے شایاں ہے - مرزا صاحب کے نام پر یہ ٹیپ منسوب کر کے آپ نے طرفداران و تلامذہ مرزا صاحب کے خون میں ایسا جوش پیدا کر دیا - کہ صاحب ردّ الموازنہ کو جواب میں یہ لکھنا پڑا - کہ استغفر اللہ یہ ٹیپ نہ جانے کس مسخرے کی ہے - ہرگز مرزا صاحب کی نہیں - نہ مطبوعہ ہے - نہ ملحقات سے ہے - جب کلام مطبوعہ مرزا صاحب میں بھی یہ ٹیپ نہیں ہے - تو آپکو ہرگز نہ لکھنا چاہئے تھی - میں نے

بعض اصحاب کو یہ کہتے ہوئے سُنا تھا۔ کہ مولوی صاحب نے کتاب موازنہ دبیر و انیس اُس زمانے میں لکھی۔ کہ جب شیعہ اور سُنی گروہوں میں جا بجا لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے یہ خیال فرمایا تھا۔ کہ شیعوں میں دبیریوں اور انیسیوں کا مباحثہ پہلے جوش پیدا کیا کرتا تھا۔ مناسب ہوگا۔ کہ ایک ایسی کتاب لکھ دو۔ کہ شیعوں میں پھر وہ جوش تازہ ہو جائے۔ اور سُنیوں و شیعوں کی لڑائی اس طرح مٹ جائے۔ مگر اب اس تیس چالیس برس میں شیعوں کے خیالات ہی بدل گئے تھے۔ انیسیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اوّل نمبر پر میر صاحب ہیں دُوسرے نمبر پر مرزا صاحب۔ اسی طرح دبیریوں نے مرزا صاحب کو اوّل نمبر پر اور دُوسرے نمبر پر میر صاحب کو مان لیا تھا۔ اور یہ دونوں گروہوں نے تسلیم کر لیا۔ کہ کامل دونوں بزرگوار ہیں۔ کوئی رنگ اُن کے کلام میں کھُلتا ہُوا ہے۔ کوئی اِن کے کلام میں زیادہ دل کو لُبھاتا اور رِجھاتا ہے۔ اور بغیر دونوں کے کلام پڑھے ہُوئے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ممکن نہیں۔ کہ شیعوں کی کوئی ایسی بستی ہندوستان میں ہو۔ جہاں مجلس ہوتی ہو اور ان دونوں صاحبوں کا کلام (تحت لفظ یا سوز میں) نہ پڑھا جاتا ہو۔ اگر واقعی مولوی صاحب نے اُسی نیّت سے یہ کتاب لکھی تھی۔ (گو اب تک اصل نیّت کا قابل اطمینان پتہ نہیں چلا ہے) تو میں اس باب میں مولوی صاحب کو قابل مدح سمجھتا ہُوں۔ کہ واقعی اُن کی نیّت مستحبر تھی۔ وہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں (سُنّی و شیعہ) کی لڑائیوں کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور ایک صاحب کو دُوسرے صاحب سے بہتر سمجھنا بھی کوئی ایسا امر نہیں۔ جو قابل الزام ہو۔ کیونکہ ایسی طبیعتیں بہت کم ہیں۔ جو ہر کامل کے اجزائے کمال کا اندازہ کرکے جس جس رنگ میں جو بڑھا ہُوا ہے۔ اُس کو صاف بتائے۔ دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی فیصلہ کر دے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھا ہُوا بتایا جاتا ہے۔ اگر مولوی صاحب نے بھی ایسا کیا۔ تو کیا بُرائی ہے۔ البتہ یہ افسوس ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا مرحوم پر اتہام بھی لگائے۔ اور مرزا صاحب کی طرف اُس کلام کو

منسوب کیا ہے۔ جو کسی صورت سے اُن کا نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب کو اگر ایسا کلام مرزا صاحب کا (کہ جس میں تلوار کی معشوقانہ مدح ہو) مقابلۃً دکھانا تھا۔ تو یہ بند لکھتے۔ جو دفتر ماتم کی جلد دوم مرثیہ (آدم کا دادرس بنی آدم میں کون ہے) میں ہے ؎

جس مورچے میں لیلیٰ تیغ دوسر گئی چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی

ہرن نے خاک اُڑائی اُدھر سے اُدھر گئی پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

مگر افسوس مولوی صاحب نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور بجائے ایسے کسی بند کے پیش کرنے کے مرزا صاحب کی طرف اُس مبتذل شعر کو منسوب کر دیا۔ جو اُن کا نہیں ہے۔ نہ اُن کی متانت کلام کے شایاں ہے۔ ناظرین! آپ فرمائینگے۔ کہ مرزا صاحب کا کلام بہت ہے۔ مطبوعہ بیس جلدوں میں کہاں تک مولوی صاحب ڈھونڈتے۔ اس لئے انہوں نے یہ بند مقابلۃً نہ لکھا۔ مگر نہیں۔ یہ عذر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ایک دوسرے موقع پر مولوی صاحب نے (رد و قدح میں اور کلام کے ساتھ) صفحہ ۲۵۸ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھا ہے۔ پھر کیونکر مانا جا سکتا ہے۔ کہ یہ بند اُن کے خیال و یاد میں نہیں تھا۔ یہ جو بار بار مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا کہاں تک میں جواب دوں۔ اور کیونکر مولوی صاحب کے ذہن نشین کروں۔ کہ جناب میر صاحب سے مرزا صاحب کی تصنیف و شہرت مقدم ہے۔ اور نہ وہ میر صاحب کے نہ میر صاحب اُن کے مقلد ثابت ہوتے ہیں۔ دونو صاحب مجتہد نظم ہیں۔ اور مرزا صاحب کے ذکر میں مولوی صاحب کا لفظ ابتذال لانا مولوی

٭ اس موقع پر بضیافت ناظرین کتاب میں ایک بند مرزا مرحوم کا لکھ کر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو تلوار کی معشوقانہ وضع کی مدح میں اس مرثیہ میں ہے جو اب تک چھپا نہیں اور خفیر کے پاس ہے۔ مطلع اس مرثیہ کا یہ ہے ؎ اے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج ؎ جوہر کی برق آہ تھی جن میں چمک گئی فرہاد کا وہ تیشہ بنی کوہ تک گئی۔ شیریں کی تھی کلائی کھچی اور مڑ گئی۔ لیلیٰ کی تھی کمر کہ چلی اور لچک گئی۔ گاہے دلوں کے پردہ سے منہ ڈھانکنے لگی۔ زخموں کے روزنوں سے کبھی جھانکنے لگی ۔ ۱۲ مولف حقیر۔

صاحب کی سخن فہمی کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب ایسے تمام جید شاعر کو ابتذال سے کیا کام۔ ابتذال کا کہیں نام اُن کے کلام میں نہیں ہے+

اعتراض مسلسل ۱۱ و اہتمام

(۴) صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۷ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کے دو بند اور مرزا صاحب کے دو بند پردہ کے اہتمام کے باب میں لکھے ہیں۔ میں اس موقع پر صرف میر صاحب کے بند لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کے بند میں آئندہ قلمبند کرونگا۔ (میر صاحب):۔

بیت الشرف خاص سے نکلے شہِ ابرار ۔۔۔ رونق ہوئی ڈیوڑھی پہ گئی عترتِ اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار ۔۔۔ پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے ۔۔۔ شقہ کوئی جھکنے نہ پائے جھونکوں سے ہوا کے
لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے ۔۔۔ آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے ۔۔۔ دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دئے ہیں ۔۔۔ افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

یہ خیال رہے۔ کہ میر صاحب نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت کا یہ حال لکھا ہے۔ دونوں بزرگواروں کے بند لکھنے کے بعد مولوی صاحب گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں بزرگوں نے عورتوں کے پردے کے اہتمام کا سماں باندھا ہے۔ لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہے۔ کہ اس کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے۔ روانی۔ شستگی۔ خوبی محاورہ۔ چستی بندش کے علاوہ بلاغت کے نکتوں پر لحاظ کرو۔ میر صاحب نے پردے کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔ جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے اظہار کے علاوہ اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں۔

نقیبوں اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں۔ یا تھا تو اُس کو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی۔ پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے۔ لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی"+

نواب

اب مجھ کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب پر اتہام لگایا۔ مرزا صاحب مرحوم نے یہ کام بالکل نقیبوں اور دربانوں اور لونڈیوں کے سپرد ہرگز نہیں فرمایا۔ مولوی صاحب کی ہوشیاری داد دینے کے قابل ہے۔ بلکہ یوں کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس عالم پیری میں ماشاء اللہ چشم بد دور ہاضمہ ایسا قوی ہے۔ کہ مرزا صاحب کا اوپر کا ایک بند کا بند اُڑا گئے۔ اس لئے کہ اگر تینوں بند لکھ دیتے۔ تو اُن کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ پہلے تو مجھ کو خیال ہوا۔ کہ شاید اوپر کا ایک بند چھاپہ میں اُڑ گیا ہو۔ اور نہ چھپا ہو۔ مگر جب میں نے دفترِ ماتم کی چھٹی جلد میں یہ مرثیہ دیکھا ؎ دست خدا کا قوتِ بازو حسینؑ ہے۔ اور صفحہ ۲۰۵ پر اوپر کا بند بھی موجود پایا۔ تو مجھے سخت رنج ہوا۔ کہ افسوس ہمارے ملک کے ایک مشہور مصنف ایسی غلط بیانی سے کام لیں۔ اب تینوں بند مجھ سے سُنئے۔ اور ناظرین انصاف و ایمان سے فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب نے بالکل اہتمام پردہ کا کس کے سپرد کیا ہے۔ اور اوپر آپ میر صاحب کی نظم کی زیارت فرما چکے ہیں۔ یہ بھی غور فرمائیے۔ کہ ان بندوں میں آمد۔ صفائی بندش۔ روانی۔ آدابِ شاہی کی رعایت کس قدر ہے۔ یہ واضح رہے۔ کہ مرزا صاحب نے کربلا میں پہنچ کر اہلِ حرم کا سواریوں سے اُترنا النظم فرمایا ہے:۔

... کے بند زائد لگے

آوازِ دور باش کا ناگاہ غل اُٹھا — اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفیٰ
ڈیوڑھی سے پر کھجا وہ زینب جو ہیں ملا — خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

رو کی قنات۔ اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر
عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

دربان عصا اُٹھا کے بڑھے جانب یسار
دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار
آئے ادھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار
آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو۔ دخترِ زہراؑ اُترتی ہیں

عظمت جنابِ زینبؑ میں تاکید :-

عفت کے جتنے مرتبے خیر النساءؑ نے پائے
وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشاؑ نے پائے
ہاں ہاں مسافروانہ کوئی غل مچانے پائے
ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے
حسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

اب غور فرمائیے۔ اوّل تو اہتمام پردہ جناب زینبؑ کو مرزا صاحب نے خود بنفس نفیس جناب امام حسینؑ سے متعلق فرمایا۔ کہ جو جناب ابوالفضل العباسؑ سے بدرجہا افضل ہیں۔ اور پھر مزید اہتمام یہ کہ قنات شاہزادہ علی اکبرؑ و شاہزادہ قاسمؑ نے روکی۔ اور حضرت عباسؑ نیزہ تان کر بہادرانہ شان سے پھرنے لگے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ دربان و نقیب عصا اُٹھا کر شاہی قاعدہ سے دہنی اور بائیں طرف ہٹ گئے۔ اب جب غیر مرد دور چلے گئے۔ تو اہلبیت اطہار کی لونڈیوں نے خیمہ کے دروازے پر آ کر آواز دی۔ کہ مصرعہ آئے ادھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار۔ ہوشیار کی لفظ کو دیکھئے۔ کہ خاص ایسے موقع پر شاہی کنیزیں یہی لفظ بولتی ہیں۔ اور آواز تو لونڈیاں ہی دیتی ہیں حضرت عباسؑ یا اور کسی بزرگ خاندان کا یہ کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر صاحب نے بھی آواز دینے کو جناب عباسؑ سے منسوب نہیں فرمایا۔ بلکہ وہاں حضرت عباسؑ خادموں کو حکم فرماتے ہیں۔ کہ ع دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے ٭ اور ظاہر ہے۔ کہ آواز مرد کی بہت

آداب شاہانہ

٭ میر صاحب نے آواز دینے کو فراشوں سے متعلق فرمایا ہے۔ اور مرزا صاحب نے کنیزوں سے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اہلبیت اطہار کی لونڈیاں مرتبہ میں فراشوں سے کہ جو غیر ہیں بدرجہا بہتر ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(دبیرؔ) سامان سے کوئی صاحب یہاں نہیں ہوتا۔ دونوں بندوں کو مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اس کی تو بحث مجھ کو نہیں ہے۔ کہ کس کا بند بہتر ہے۔ مَیں مرزا کا بند بہتر بتاؤنگا۔ ممکن ہے کوئی صاحب میر صاحب کے بند کو افضل کہیں۔ مگر یہ کہنا مولوی صاحب کا کہ جواب میں مرزا صاحب نے کوشش کی اور کہا محض اتہام ہے۔ مَیں ثابت کرتا ہوں کہ مرزا صاحب کا بند پہلے زمانے کا ہے۔ اور اگر میر صاحب نے بھی اُس زمانے میں فرمایا ہوگا۔ تو وہ مرزا صاحب تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ بند مرزا صاحب نے اُس مرثیہ مشہور میں کہا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل۔ اور یہ مرثیہ میر ضمیر مرحوم کے اس مرثیہ کے بعد ہی (عہد محمد علی شاہ میں سنہ ۱۲۵۰ھ کے قریب قریب) کہا تھا ؎ کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب کے مطلع سے مرزا مرحوم کا مطلع بھی ملتا جُلتا ہُوا ہے۔ اور میر ضمیر صاحب نے اس مرثیہ آخر الذکر میں سنہ تصنیف مقطع میں کہدیا ہے ؎

جس سال لکھے وصف ہمشکل نبیؐ کے
سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجر نبویؐ کے

پس مرزا مرحوم کا مرثیہ بھی سنہ ۱۲۴۹ھ یا سنہ ۱۲۵۰ھ کا ہے۔ اور میر انیس صاحب (سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے عہد امجد علی شاہ شروع ہوتا ہے) سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں یا اُس کے بعد لکھنؤ میں آئے۔ بعد اُس کے اُن کے جا بجا لکھنؤ میں پڑھنے پر اُن کی شہرت ہُوئی۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ مرزا صاحب اُس نظم کا جواب لکھیں۔ جو یا تصنیف نہیں ہُوئی۔ یا اُن تک نہیں پہنچی۔ افسوس۔ مولوی صاحب کس یقین کے ساتھ لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بہت کوشش کی۔ مَیں نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب نے غلط بیانی میں بہت جرأت کی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہُوئے ✤

یاست دبیر

فصل ۴ چوتھا داغ ہوشیاری

چوتھا داغ ہوشیاری کا

ناظرین! دیکھئے۔ مرزا صاحب کے کلام میں جو اصول مقررہ شاعری کے موافق حسن ہے۔ اُس کو کس کس اینچ پینچ سے مولوی صاحب قبیح و عیب ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں +

مبالغہ

(۱) مبالغہ جو ایشیائی ادب و شاعری کا ایک خداداد مسلّمہ حسن ہے۔ اُس کی نسبت صفحہ ۷۷ و ۷۸ میں ابونواس شاعر کا یہ مصرع لکھ کر ؎ یا امین اللہ عش ابدا (اے خدا کے امین تو ہمیشہ زندہ رہ) ابن قدامہ کا قول نقد الشعرا سے نقل کیا ہے۔ کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے یہ مبالغہ معیوب ہے۔ آگے بڑھ کر فرماتے ہیں۔ کہ میر صاحب نے بھی یہی روش اختیار کی۔ لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی و اعتدال تھا۔ اس لئے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور یہی بات ہے۔ جس کی بنا پر اُن کے حریف کہتے ہیں۔ کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مَیں عرض کرتا ہوں۔ کہ ایک ابن قدامہ کے قول کو لے کر ہم کیا چاٹیں۔ تمام عرب و عجم کی شاعری مبالغہ سے بھری پڑی ہے۔ کم سے کم لاکھوں شاعروں میں سے کوئی دو چار ہی شاعر ہم کو ایسے بتا دیں۔ جو مبالغہ کو استعمال نہ کرتے ہوں۔ بعض صاحب بھاشا کی شاعری کو اس بنا پر سراہتے ہیں۔ کہ اُس میں تشبیہات و استعارات و مبالغہ نہیں ہوتا۔ بیشک بھاشا کی شاعری کو میں بھی ایک حد تک پسند کرتا ہوں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں۔ کہ جس طرح واقعہ کو سادہ سادہ صاف صاف بیان کر دینا ایک ہنر ہے۔ اُسی طرح بلکہ اُس سے بڑھ کر تشبیہات و استعارات و مبالغہ معقول و مقبول کے ساتھ بیان کرنا مستحسن ہے۔ جو لوگ بھاشا کی شاعری پر

بھاشا و سنسکرت

ملے ہوئے ہیں۔ اُن کی یہ مثال سمجھئے۔ کہ ایک خوبصورت لونڈی پر جان دیتے ہیں۔ اور
ایک حسین نازک اندام خوش لباس بی بی کو گویا چھوڑتے ہیں۔ وہ حسین بی بی کون ہے؟
بھاشا کے مقابلہ پر سنسکرت علمی زبان کی شاعری ہے۔ جس میں تشبیہ و استعارہ
کے ساتھ ساتھ مبالغہ کی اسی طرح بہتات ہے۔ جس طرح عربی و فارسی میں افراط ہے۔
اور مبالغہ اس لئے خوش نما ہوتا ہے۔ کہ کلام میں زور آ جاتا ہے۔ اور سامع کا ذہن
اُس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو زیادہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ
مبالغہ وغیرہ کی جس قدر چاہیں مذمت کریں۔ کہ ہر شخص کی زبان اُس کے اختیار میں ہے۔
مگر یہ یاد رہے۔ کہ ایشیائی شاعری کا دار و مدار تخئیل و مبالغہ و استعارہ و تشبیہ پر ہے۔ و
نظم پر کچھ منحصر نہیں۔ نثر کا بھی یہی حال ہے۔ اور اس سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جن
کو کروڑوں آدمی خدا کی مقدس کتابیں سمجھ رہے ہیں۔ میں اس موقع پر انجیل کی ایک
مشہور آیت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ خود مولوی شبلی صاحب
کی زبان سے کہلواؤں (جو مبالغہ کو سلامت روی و اعتدال کے خلاف سمجھ رہے ہیں) تا
اس مصرعۂ مشہور کا مصداق ہو جائے ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ وہ آیت
مولوی صاحب نے سوانح مولانا روم کے صفحہ ۹ پر ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے "یہ مضمون
کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے۔ اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں۔
اخلاق کا مسلّم اور مشہور مسئلہ ہے۔ انجیل میں اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ "اے آدم
تو اوروں کی آنکھ کی تنکی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر نہیں دیکھتا" یہ
ظاہر ہے۔ کہ آدمی کی آنکھ میں شہتیر ہرگز نہیں سما سکتا۔ مگر غرض اس مبالغہ سے
یہ ہے۔ کہ سامع یا ناظر کے دل پر اثر ہو۔ اور وہ سمجھے۔ کہ ہمارا بڑا عیب جو بمنزلہ
شہتیر کے ہے۔ ہم کو نہیں دکھائی دیتا۔ دوسروں کا ذرا سا عیب بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔
اب لیجئے۔ قرآن شریف کو جو ہم مسلمانوں کا دین و ایمان ہے۔ اُس میں ایک

سنسکرت

مبالغہ سے خوش نمائی

مبالغہ متضمن انجیل شریف

قرآن شریف

آیت ہے ۔ موتوا بغیظکم جس کے ظاہری معنی یہ ہوئے کہ تم اپنے غیظ و غصہ میں مر جاؤ۔ ظاہر ہے کہ غصہ سے کوئی مر نہیں جاتا مقصود صرف اثر پیدا کرنا ہے کہ کیسا ہی سخت غصہ کرو۔ جو تم کو ہلاکت کے قریب پہنچا دے ۔ پس مبالغہ کو خلاف واقع و کذب سمجھنا یا کہنا خود خلاف واقع و کذب کہنا ہے ۔ اور جو لوگ کہ الٰہی کتاب آسمانی کے قائل ہو کر ہر مبالغہ کو خلاف واقع و کذب وغیرہ کہتے ہیں ۔ اُن کو یاد رہے کہ اُن کا اعتراض کہاں دور تک پہنچتا ہے ۔ البتہ شاعر کا سلیقہ اس میں ہے ۔ کہ وہ مبالغہ کو عمدہ طریقہ سے استعمال کرے ۔ ازبسکہ ہمارے مرزا مرحوم کے کلام میں یہ صنعت مبالغہ اور قوت تخییل بہت بڑھی ہوئی ہے ۔ اس لئے مولوی صاحب مبالغہ و خیال بندی کو اس کثرت سے پیرایہ میں کتاب موازنہ میں بیان فرمایا ہے تخییل سے بھی خدا کی کتاب خالی نہیں ہے ۔ اس آیت کو لیجئے ۔ طلعہا کانہ رؤس الشیاطین جس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ پھل اُس (زقوم) کے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر یہ تخییل نہیں تو اور کیا ہے ۔ ورنہ شجر زقوم میں شیطانوں کے سر لٹکتے ہوئے کس نے دیکھے ہیں ۔ اس کی مفصل و مدلل بحث جناب مفتی میر عباس صاحب قبلہ نے اپنی کتاب بناء الاسلام میں لکھی ہے ۔

کلام دبیر و مبالغہ و تخییل

میں نے اس موقع پر اس کا خلاصہ لکھ دیا ۔ کہ یہ کتاب طولانی ہوتی جاتی ہے ۔ ورنہ بہت کچھ لکھ سکتا تھا ۔ تخییل کی تعریف خود ہی سے تنقیح مولوی شبلی صاحب نے بھی فرمائی ہے ۔ مگر موازنہ میں وہ ایسی تعریف کرتے ۔ تو منصف ہو جاتا ۔ کہ مرزا دبیر اس صنعت خاص میں جو شاعری کی جان ہے میر صاحب سے بمنزلہا بہتر ہو سکتے ۔ تخییل کی تعریف مولوی صاحب نے سوانح مولانا روم کے صفحہ ۱۴ پر ان الفاظ میں فرمائی ہے "عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ (قیاس تمثیلی) ہے ۔ استدلال تمثیلی کے لئے تخییل کی بڑی ضرورت ہے ۔ جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے ۔ مولانا روم کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے ۔ وہ یہی قوت تخییل ہے" یہاں آکر تا

ہُوں۔ کہ کم سے کم (آنچہ برخود بپسندی بر دیگرے بپسند کی بنا پر) اگر اسی قوت تخیل کو کلام مرزا مرحوم سے موازنہ میں مولوی صاحب دکھا دیتے۔ تو بھی اُن کا موازنہ (شاید) میزان الصاف (عام لوگوں میں) سمجھا جاتا۔ آخر کیا وجہ کہ جو بات مولانا روم کے لئے طرہ تاج ہو۔ وہ مرزا مرحوم کے واسطے باعث فخر و دلیل کمال نہ ہو۔ اور سلامت روی و اعتدال کے برعکس قرار دی جائے ع اے عدالت اسے کیا کہتے ہیں؟

(۲) صفحہ ۳۸۲ پر میر صاحب کے دو مصرع (۱) گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا (۲) گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔ لکھ کر یہ لکھا ہے۔ کہ دیکھئے ہر موقع پر گھوڑے اور سوار کی تشبیہ کیسی اچھی نظم کی ہے۔ پھر عنان عنایت مرزا صاحب کی جانب (مولوی صاحب نے) معطوف فرمائی ہے۔ یہ بیت لکھ کر سہ

وہ رخش یہ یا دیو تھا اسوار پری پر غل۔ ان میں اُٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

فرماتے ہیں۔ کہ کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔ دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضائقہ نہیں۔ لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہے +

میں کہتا ہُوں۔ مولوی صاحب! آپ نے بھی ملک عرب کی سیر کی ہے۔ کچھ حصّہ عراق عرب کا میں نے بھی دیکھا ہے (جہاں کے عراقی گھوڑے مشہور ہیں)۔ فرمائیے کیسے دُبلے۔ پتلے۔ خوبصورت گھوڑے ہوتے ہیں۔ اُن کو کبک دری اور پری سے اور قوی ہیکل پہلوان سوار کو دیو، اور پہاڑ سے تشبیہ دینا کیسی معقول تشبیہ (مع مبالغہ) ہے۔ اور جب گھوڑا کبک دری اور سوار کوہ ہُوا۔ تو ضرور یہ کہا جائیگا کہ کبک دری پر کوہ چڑھا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ کوہ پر کبک دری ہُوا کرتا ہے مگر اُس موقع پر اُلٹی بات نظر آتی تھی۔ آپ کے سر کی قسم تشبیہ نہ بیہودہ ہے نہ مہمل۔ بلکہ صنعت تضاد ہے۔ جہاں تک جناب کا ذہن نہیں پہنچا۔ یہ ایشیائی ادب و شاعری کی جان ہے۔ آپ بیہودہ فرماتے ہیں۔ خدا سمجھے۔ میں نہ آپ کو بیہودہ نہ آپ کے ارشاد کو مہمل کہونگا۔

اعتراض ۲ پہلوان سوار کو گھوڑا کبک دری بنا

جواب

عرب و عجم و ہندی و اردو کے شاعروں کے کلام ایسی تشبیہات اور ایسے الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اگر یہی جرم ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے بھی ایسی تشبیہ مع مبالغہ نظم فرمائی۔ تو اس کا جواب نہیں +

عکس، تبدیل

(۳) لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایک مضمون نکال لینا ایشیائی ادب میں (ایک) کمال کی دلیل اور صنعت مقبول ہے۔ عکس اس صنعت کا نام ہے۔ جیسا کہ صنائع و بدائع کے بیان میں مَیں بیان کر چکا ہوں۔ اس صنعت میں (۱) یہ آیت قرآن شریف کی پائی جاتی ہے۔ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی × اس میں حیّ و میّت کے اُلٹ پلٹ سے دُوسرا جملہ پیدا فرمایا ہے۔ (۲) ایک فقرہ امام حسنؑ کا مشہور اور کتب احادیث و تواریخ میں مسطور ہے۔ کہ جب اُن جناب کی سخاوت و بخشش کا شہرہ سُن کر معاویہ ابن ابوسفیان نے اُن کو ایک شعر میں لکھا تھا۔ کہ لاخیر فی الاسراف (فضول خرچی میں بہتری نہیں ہے)۔ تو آپ نے بلاغت و فصاحت کا کمال دکھایا۔ کہ انہیں الفاظ کو معکوس فرما کر اس جملہ کے برعکس مضمون جواب میں ادا فرمایا۔ وہ جملہ معکوسہ یہ ہے۔ لا اسراف فی الخیر (خیرات میں فضول خرچی نہیں ہے)۔ ایران و ہندوستان کی شاعری بھی ہمیشہ اس صنعت کی متمتع رہی ہے۔ اس پیاری صنعت سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ہم نے صرف ہندوستان کے تین مشہور شاعروں کے تین شعر پیش کئے ہیں۔ جو اپنے اپنے رنگ و بندش و مضمون میں لاجواب ہیں۔ جن میں الفاظ کے الٹ پلٹ کے مضمون نکالا ہے۔ (۱) دبیر الملک حضرت غالب (۲) شاعر ہند ذوق (۳) شاعر آل محمدؐ دبیر۔ مرزا غالب مرحوم کا (فارسی شعر) اسی صنعت میں مشہور ہے۔ جو نہایت بہت

ترک، تبدیل، تجنیس

× زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے [illegible]

کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے [illegible]

جناب غالب

پسند ہے۔ وہ یہ ہے ؎

یارِ دشتنبو بدستم داد و دستم بو گرفت ✲ وہ چہ دشتنبو کہ دستم بوئے دشتنبو گرفت

ازبسکہ ن ب کے پاس پاس آنے سے مبہم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ انبیا۔ عنبر۔ منبر۔ انبار کو امبیا۔ عمبر۔ ممبر۔ امبار لوگ پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر دو جگہ پر دستمبو پڑھنے سے الفاظ کے (عکس و تبدیل سے) لطف پیدا ہوگیا جس کی خوبی صحیح المذاق سامع سمجھ سکتا ہے۔ دوسرا شعر جناب ذوق کا (اردو کا) سُنئے ؎

جناب ذوق

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے ✲ بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

یہ شعر بھی اس صنعت میں اعلےٰ درجہ کا ہے۔ لفظوں کے اُلٹ پھیر نے لفظوں کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور حقیقت میں شکایت دوست کی کی جاتی ہے۔ دشمن سے کیا شکایت۔ جسے کہ میں جناب [illegible] علم مولوی شبلی صاحب سے دوستانہ شکایت کر رہا ہوں۔ کہ انہوں نے جناب مرزا مرحوم کے شعرِ تحت کو جو اسی صنعت

حضرت دبیر مرحوم

میں ان دو شعروں کی طرح [illegible] گورکھ دھندہ بتا دیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

انصاف [illegible] کہاں ہے جو دل صاف نہیں ہے ✲ دل صاف کہاں ہے جو انصاف نہیں ہے

دیکھئے [illegible] الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر کے نکالا ہے [illegible] (بلحاظ قدر دانی) [illegible] قابلِ تحسین ہے۔

مرزا مرحوم [illegible] کوشش کرتے ہیں۔ صفحہ ۲۶۴ پر فرماتے ہیں [illegible] شعر کے ؎

[illegible] سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

[illegible] گورکھ دھندہ دکھایا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ واہ مولوی صاحب کی جرأت اور اس دعوے پر آفرین

✲ [illegible]

ہزار آفرین ہے۔ آپ ایسی صنعت کو ایک تو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں۔ دوسرے میر صاحب کے اُلٹے ہوئے لفظ۔ کیا آپ کو وحی ہوئی ہے۔ کہ میر صاحب نے یہ شعر پہلے کہا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی الہام ہوگیا۔ کہ وہ مرزا صاحب نے سنا بھی تھا۔ اگر واقعات کی بنا پر قیاس کو قائم فرمائیے۔ تو بالکل آپ کے دعوے کے خلاف ثابت ہوتا ہے یعنی مرزا مرحوم کی شاعری و شہرت میر صاحب پر مقدّم ہے غالباً یہ شعر بھی اُنہوں نے پہلے کہا ہوگا۔ اگر یہ قیاس صحیح نہ مانا جائے۔ تو یہ مانا جائیگا۔ کہ نہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا شعر سُنا نہ برعکس۔ آپ کس کس تدبیر و ترکیب سے مرزا صاحب کے حسن کلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ وہ کمال ہے۔ جو کسی کے مٹائے سے نہیں مٹ سکتا۔ بعد اُس شاعر آل محمدؐ (دبیر) کی زبان فال (اور سچی پیشینگوئی) آج زمانے پر ثابت ہو رہی ہے (وہ فال زبان یہ شعر اُن کا ہے)۔ ؎

میں ہوں نہ ہوں جہاں میں رتبہ بڑھے مرا
انصاف سب نظم میں کلمہ پڑھے مرا

واقعی آج ملک نظم میں جو انصاف کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ (دبیر) ؎

منکر نہ کرے تو کہ کا بیت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یہی ہے

(٧) موازنہ صاحب موازنہ کے صفحہ ٢٢ پر یہ دعوے کرتے ہوئے (کہ میر انیس مرحوم مرزا دبیر مغفور سے زیادہ فصیح الفاظ لاتے ہیں۔ اور مرزا صاحب غریب و ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں) لکھتے ہیں۔ کہ ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ وعدہ تو یہ کیا تھا۔ کہ بالمقابل دونوں کاملوں کے شعر لکھینگے۔ مگر اس ہوشیاری اور وعدہ خلافی کی شان کو دیکھئے۔ کہ ایک ایک مصرع لکھ کر رہ گئے۔ ناظرین! آپ کو معلوم ہے۔ کہ مصرع کو کوئی شخص شعر نہیں کہتا۔ ہوشیاری یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایسا نہ ہو۔ دوسرا مصرع مرزا صاحب کا زیادہ فصیح ہو۔ تو دعوے خاک میں مل جائے۔ مگر خدا کی شان دیکھئے۔ کہ جو مصرع پیش کئے ہیں۔ اُن میں بھی اتفاق سے کوئی مصرع ایسا نہیں ہے۔ کہ جو ایسا

غلط بیانی
تصحیح غلط دبیر
وعدہ خلافی

بزرگوار (کے مصرع) کو دُوسرے (کے مصرع) پر ترجیح دی جائے ۔ نہ مرزا مرحوم کے مصرعوں میں کوئی لفظ غریب ثقیل ہے ۔ میں وہ مصرع ذیل میں مع رائے لکھتا ہوں :-

[illegible]	مصرع	مختصر رائے
۱	میر صاحب سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں مرزا صاحب کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	میر صاحب کا مصرع غلط لکھا ہے ۔ اصلی مصرع یہ ہے ع سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں مطلب جُدا جُدا ہے ۔ اس لئے یہ موازنہ صحیح ہو سکتا ہے ۔ نہ کسی کے یہاں کوئی لفظ ثقیل و غیر فصیح ہے ۔ مفصل بحث دُوسرے موقع پر میں لکھ چکا ہوں ۔
۲	میر صاحب آنکھوں میں یوں پھیرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو مرزا صاحب آنکھوں میں یوں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو	الفاظ ہمیشہ وزن بحر کے تابع ہوتے ہیں ۔ دونوں مصرعوں کی بحریں مختلف ہیں ۔ جو الفاظ جس بحر کے لئے مناسب تھے ۔ وہی ہر ایک کامل ملا ہے ۔ الفاظ دونوں کے فصیح ہیں ۔ مرزا کے مصرع میں مردم کے دو معنی ہیں ۔ (۱) گروہ انسان ۔ (۲) پتلی کے ۔ یہ مزید خوبی ہے ۔
۳	میر صاحب حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے مرزا صاحب رؤیا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں	اس میں بھی اختلاف بحر ہے ۔ میر صاحب کے یہاں خواب اور رویا کے الفاظ میں رعایت ہے ۔ مرزا صاحب کے یہاں ایک ہی لفظ رویا دو معنی پر آیا ہے ۔ یہ صنعت ہے ۔ ایک رؤیا یعنی خواب دوسرے گریہ کرنے کے معنی پر ۔ الفاظ دونوں کے فصیح و سلیس ہیں ۔
۴	میر صاحب جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے مرزا صاحب جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں	دونوں مختلف البحر ہیں ۔ اور ایک حرف بھی ثقیل نہیں ۔ اس کی بحث مفصل میں نے دُوسرے موقع پر کی ہے ۔ اور تمام بند لکھ کر کلام مرزا کی خوبیاں سمجھائی ہیں ۔ میر صاحب کے مصرع کو بھی مولوی شبلی صاحب بُرا بتاتے ۔ تو میں اس کی خوبیاں بھی یوں ہی سمجھا دیتا ۔

عنوان ۵ اعتراض استعارہ وصنائع وغیرہ

(۵) مولوی شبلی صاحب نے صفحہ ۵۶ و ۵۷ و ۵۸ پر اور اس کے علاوہ موازنہ میں جابجا بلاغت وصنائع وبدائع اور واقعات کو تصویر کھینچ کر تقریر میں دکھانے کا بیان کیا ہے۔ جس کی تمام عبارت کے نقل کرنے میں طول ہوگا۔ اس لئے سب کا خلاصہ لکھتا ہوں (۱) استعارہ وتشبیہ اصل شاعری سے خارج ہیں۔ اگر بے تکلفی سے نیچرل (قدرتی) حالت میں آجائیں۔ تو زیور کا کام دیتے ہیں۔ (۲) صنائع وبدائع بھی اگر بے تکلفی سے آجائیں۔ تو حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ ورنہ شاعری ونثاری کا دیباچہ زوال ہیں۔ (۳) تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بلاغت سے تو متعلق ہیں۔ مگر شاعری سے نہیں۔ (۴) شاعری انسانی جذبات یا احساسات کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی یہ رائے کہ "تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بے تکلفی سے آئیں۔ ورنہ دیباچہ زوال نظم ونثر ہیں"۔ میرے نزدیک درست اور قابل قدر ہے۔ بیشک اگر بے تکلفی و متانت سے یہ چیزیں نہ آئینگی۔ تو دیباچہ زوال شعر وسخن ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ استعارے اور تشبیہوں وغیرہ کے لئے نیچرل رہنا ضرور ہے (فوق عادت بشری نہ ہوں)۔ اس کو میں نہیں مانتا۔ ورنہ تمام ایشیائی شاعری ونثاری بلکہ بات چیت کرنے سے بھی دست بردار ہونا پڑیگا۔ اور ایسی باتوں سے وہ کلام بھی بھرے پڑے ہیں۔ جن کو کروڑوں آدمی کلام خدا کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں اسی کتاب میں ایک جگہ بحث کرچکا ہوں۔ اور بائبل کی مشہور آیت خود مولوی شبلی صاحب کی کتاب سوانح مولانا روم سے لکھ چکا ہوں۔ "اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کی پھلی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا"۔ اگر فوق عادت بشری نہ ہونے کا نام ہی شاعری ہے۔ تو یا تو ایسے تمام کلام کو خلاف بلاغت ماننا پڑیگا۔ یا کوئی صاحب (جو اس کے مدعی ہوں) کسی بڑی آنکھ والے کی آنکھ میں شہتیر داخل کرکے مجھے آنکھوں سے دکھادیں۔ تو میں گویا ایمان لے آؤنگا۔ ایسے استعارات وتشبیہات زیور سخن نہیں۔ بلکہ حسن خداداد عروس سخن

تشبیہات و بر نیچرل

ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جو چیزیں (صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات) بلاغت سے متعلق ہیں۔ وہ شعر سے کیوں متعلق نہیں ہیں۔ اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے۔ تو شعر خود ہی ایک صنعت ہے۔ اگر شعر بے بلاغت ہے۔ تو وہ **محض تک بندی** ہے۔ **بلاغت اصل شئے ہے**۔ اُسی کا ایک جزو اعظم **تخیل** (وجدان) ہے جس کو مولوی صاحب نے **انسانی جذبات یا احساسات** کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ خیر اب یہ سمجھئے۔ کہ صنائع و بدائع وغیرہ عروس سخن کے لئے حسن خداداد ہے۔ اگر اس سے تنزل کیا جائے۔ تو اس کو **عروس سخن کا نفیس لباس** کہنا چاہئے۔ یہ تو ممکن ہے۔ کہ کوئی غریب اپنی دختر حسین کو اپنی مفلسی کی بدولت جہیز میں زیور نہ دے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ بغیر لباس کے وہ لڑکی کو نکاح پڑھا کر بیاہ دے تو ایسے کپڑے یعنی مثال صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات کی سمجھئے۔ اگر کسی شاعر نے واقعات کی تصویر سادے الفاظ میں کھینچ دی ہے۔ تو اُس کی یہی مثال ہے کہ ایک حسین عورت ہے مگر برہنہ جس سے اُس کا رنگ و حسن سب خاک میں مل گیا ہے۔ وہ آنکھ اٹھا کر تو دیکھو کہ زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ بے پردی [illegible] ذہن پہنچا اتنی دور نظر کر دو۔ اس موقع پر ایک نکتہ بار دیگر عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ نظیر مرحوم (اکبر آبادی) کو نئی روشنی کے بعض اہل علم بے مثل شاعر مانتے ہیں۔ مگر ایشیائی شعرا اُن کو شعرائے کاملین کے زُمرے سے خارج جانتے ہیں۔ اس کی وجہ وجیہ یہی ہے۔ کہ اُن کے کلام میں صنائع و بدائع و حسن تشبیہات و استعارات نہیں ہے۔ صرف نیچرل (قدرتی) رنگ کی تک بندی ہے۔ اور کہیں کہیں ابتذال بھی پایا جاتا ہے۔ ازبسکہ انگریز غیر ملک کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے ابتذال (زبان اردو) کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔ اُنہیں کی تقلید سے ہمارے ملک کے بعض اہل علم ہاں میں ہاں ملاتے

وجدان و تخیل

صنائع و بدائع [illegible]

نظیر اکبر آبادی

سید انشاء

ہیں*۔ دیکھئے سید انشا بھی نظیر مرحوم کی طرح جابجا ایسے گُل کھلاتے ہیں۔ اُن کی نسبت یہ تو بعض شعرا نے کہدیا۔ کہ طریقہ راسخہ شعرا کے موافق اُن کا کلام نہیں ہوتا۔ مگر شعرائے کاملین کے زُمرے سے اُن کو کسی نے خارج نہیں کیا۔ وجہ یہی ہے۔ کہ اُن کے یہاں یہ سب یا اکثر صنائع و بدائع و تشبیہات وغیرہ موجود ہیں۔ اور ابتذال سے پرہیز کرتے ہیں بہرحال مولوی شبلی صاحب نے یہ تمام کوششیں اس غرض سے کی تھیں۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں جو صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات اعلےٰ درجہ پر ہیں۔ وہ اصل شاعری ہی سے خارج ہو جائیں۔ مگر الحمد للہ کہ اُن کی سعی مشکور نہیں ہوئی۔ اور سخن شناسوں کے نزدیک یہ چیزیں شاعری سے خارج نہ ہوئیں۔ اور نہ انشاء اللہ اُس وقت تک خارج ہونگے۔ کہ جب تک یہ تمام کتابیں معانی و بیان کی دریا برد کر دی جائیں۔ اور اگر یہ (معانی و بیان کی) کتابیں بھی بالفرض محال نیست و نابود ہو جائیں۔ جب بھی وہ کتابیں نہ مٹینگی۔ جو الہامی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور اُن میں یہ صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات موجود ہیں۔ پس کلام دبیر مرحوم گویا زبان حال سے یہ مصرع (دبیر مرحوم کا) پڑھ رہا ہے ع قرآں مٹے کسی کے مٹائے تو ہم مٹیں +

*۔ تقریباً شعرائے اردو کے مذاق کے موافق ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ابتذال میں بھی نظیر مرحوم ایک حد تک قابل معافی بلکہ لائق مدح ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ جب وہ ایک بازاری واقعہ یا بات لکھ رہے ہیں تو پھر بازاری روزمرے لانا مقتضائے حال کے موافق ہے۔ اور یہ سوائے ایک جز و بلاغت ہے۔ مثلاً ع پھر ہم بھی چلے اور چلا ریچھ کا بچہ۔ اسمیں ریچھ کے بچہ کے رکھنیوالوں اور بازاری دہیوں کے محاورے کے موافق قول لانا ایک خوشنما ادا ہے۔ بعض شعرا اعتراض فرماتے ہیں کہ نظیر نے باغ کو چھوڑ کر گویا گھورے کی (جہاں کوڑا پڑتا ہے) تصویر اتاری ہے یہ بے سلیقہ بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح معشوق کو بناؤ سنگار کے ساتھ لو اور چیل کی بھی تصویر اتارنا ہے سادہ قابل مدح سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شاعر نے نفیس و مقدس مقامات و شخصوں کے واقعات کو چھوڑ کر خرابات و خرابہ دہیوں کے حالات بھی آئینہ کر کے دکھا دئے۔ تو کیا برائی ہے۔ بیتل کے بچہ کا تو تمام شعرا نے نام لیے ہیں کوئی بیچارے ریچھ کے بچہ کا بھی ذکر کرے۔ اور بازاری غریب دہیوں کا مذاق بھی نظم کرے یا نہیں۔ گھورے کی تصویر اتارنیوالا شاعر بھی شاعر ہی رہتا ہے جس طرح مصور باغ بھی مصور ہے۔ اور مصور مزبلہ (گھورے) کا بھی مصور ہی کہلائیگا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۱۰ سخت کلامی اور بنانے اور چند رائے اور بندلہ کا داغ

پانچواں داغ

یہ کیچڑ کا دھبہ نہیں ہے۔ بلکہ **سخت کلامی** اور بنانے اور چند رائے کا داغ ہے۔

بقول حضرت آتش مرحوم ؎

نہ چھوٹیگا چھڑا کر اس کو اے قاتل نہ بن لڑکا ۔۔۔ وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبہ ہے کیچڑ کا

(۱) صفحہ ۲۴۴ پر بند ذیل مرزا صاحب کا (موازنہ میں) مولوی شبلی صاحب تحریر فرماکر

رفعت مضمون بیچ سے بجا

قابل میں سخن کے نہوں سخن ہے مرے قابل ۔۔۔ لیکن سخن شہرہ فلکن ہے مرے قابل

رضواں کو جنت۔ یہ چمن ہے مرے قابل ۔۔۔ موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے ۔۔۔ مضمون مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے

فرماتے ہیں۔ (۱) سخن شہرہ فلکن نئی ترکیب ہے۔ (۲) رضواں کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل۔ ناموزون ترکیب ہے۔ یا یوں ہونا چاہئے تھا۔ کہ رضواں کو جنت چاہئے اور مجھ کو یہ چمن۔ یا یوں کہ رضواں کے قابل جنت میرے قابل یہ چمن ہے۔ (۳) چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے۔ (۴) بیت کے دونوں مصرع قریباً باہم تناقض ہیں۔ شہرہ بھی انتہا کا ہے۔ اور مضمون کو گھر تک پہنچنے کی بھی ضرورت ہے۔ (۵) شاید یہ مراد ہو۔ کہ صرف نام مشہور ہوچکا ہے۔ لیکن چونکہ مضامین کو مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی۔ اور آستانہ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا +

جواب

مولوی صاحب کی عبارت پر میں نے ۵ نمبر لگا دئے ہیں۔ کہ میں جواب نمبروار عرض کروں۔ اور ناظرین کو جواب دیکھنے کے وقت آسانی ہو +

تضمین

(۱) "سخن شہرہ فلکن"۔ اول تو یہ مرکب الفاظ ممکن ہے کہ مرزا مرحوم سے پہلے کسی کے کلام میں ڈھونڈنے سے مل جائیں (جس کی مجھے فرصت نہیں)۔ بالفرض مرزا صاحب ہی نے پہلے پہل ان کو مرکب فرمایا۔ تو کون سا جرم کیا ہے جتنے مرکب الفاظ آج کتابوں میں نظر آتے

ہیں۔ پہلے پہل کسی نہ کسی نے ترکیب دئے ہونگے۔ اگر جدّت ہے تو یہ قابل مدح ہے۔ علم معانی و بیان یا صرف و نحو کے اُصول کی رُو سے کوئی اعتراض ہوتا ہو۔ تو فرمائیے*+

حذف

(۲) رضواں کو جنت الخ۔ اس میں "چاہیئے" کی لفظ محذوف ہے۔ ہر شاعر (ذی علم) کبھی کبھی بعض الفاظ شعر میں محذوف کر دیتا ہے۔ جس کو صحیح المذاق سامع قرینہ و عقل سے سمجھ لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو پھر نظم و نثر میں فرق ہی کیا ہے۔ مَیں اس موقع پر زیادہ نہیں دو شعر مثالاً جناب **غالب** مرحوم کے لکھتا ہُوں۔ (۱) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی" کے بعد یہ الفاظ "**دل میں تھیں**" محذوف ماننا پڑینگے۔ ورنہ دُوسرا مصرع سمجھ میں نہ آئیگا +

صنعت بیان سبب

جناب حالی

دُوسری مثال حذف الفاظ کی مَیں مناسب سمجھتا ہُوں۔ کہ مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب **حالی** کی کتاب یادگار غالب صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳ سے لکھ دُوں۔ کہ اس زمانے میں **من قال** کے قدرشناس بہت کچھ ہیں۔ **ما قال** کے بہت کم۔ اور حق یہ ہے۔ کہ **خواجہ حالی** صاحب مولوی شبلی صاحب کی نسبت شعر کا مطلب اچھا سمجھتے ہیں +

عبارت خواجہ حالی صاحب "مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دو۔ جام۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو۔ اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں۔ وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں۔ محسّنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے" +

ناظرین انصاف پسند! انصاف سے فرمائیگا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مصرع میں

---

* جو عمدہ شعرائے یورپ کے مذاق کے موافق خوش سلیقگی سے پہلے پہل کوئی لفظ مفرد یا مرکب استعمال کرنا بھی شاعر کے کمال کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہاں اور اُلٹا اعتراض کیا جاتا ہے ع اے کمال افسوس ہے۔ تجھ پر کمال افسوس ہوتا ہے + ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

جو لفظ "چاہیئے" محذوف ہے۔ ملا سخن فہم سامع کی سمجھ میں آتا ہے؟ یا نہیں؟ ضرور سمجھ میں آتا ہے۔ لہذا یہ حذف بھی حسن شعر سمجھا جاتا ہے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب شعر کی خوبی کو زشتی سمجھ رہے ہیں +

حقیقت حال (۳) چوتھے مصرع کی ترکیب پر بھی مولوی شبلی صاحب کا یہی اعتراض ہے۔ اور اُس کا بھی یہی جواب باصواب ہے۔ حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اوّل تو مرزا مرحوم نے یہی چاروں مصرع کہے تھے۔ مگر ازبسکہ وہ بڑے انجام بیں شاعر تھے۔ ہر پہلو سے اپنے کلام کو دیکھا کرتے تھے۔ اُن کو بھی یہ خیال پیدا ہُوا تھا۔ کہ صحیح المذاق سخن فہم تو اس حذف کو محسنات شعر سے سمجھیں گے۔ مگر بلید الذہن یا کم فہم شاید نہ سمجھیں۔ اس لئے پھر اُنہوں نے اوّل کے چاروں مصرعوں کو یُوں بدلا:-

جبریلؑ کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک	مدّاحی سلطان زمن ہم کو مبارک
موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک	رضوان کو بہشت اور یہ چمن ہم کو مبارک
مضمون مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے	شہرہ ہے یہ تا سید شہ جنّ و ملک سے

چنانچہ یہ مرثیہ شاید ۱۸۹۵ء کے قریب قریب جب میر عابد علی صاحب کے مطبع (حسینی اثنا عشری لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ تو اُس میں یہ بند آخر الذکر یوں ہی طبع ہُوا تھا۔ مجھے یہ واقعہ یُوں یاد ہے۔ کہ وہ مرثیہ میر صاحب ممدوح کو چھاپنے کو مَیں نے ہی دیا تھا۔ اور میرے قلمی مرثیہ میں بھی آخر الذکر چاروں مصرع موجود ہیں۔ بعد کو دفتر ماتم میں جب چھپا۔ تو وہ پہلے کے مصرع چھپ گئے (جن میں دو جگہ ایک لفظ "چاہیئے" محذوف ہے) + یہ واقعی حال تھا جو مَیں نے لکھ دیا +

شہرہ اور گھر پوچھنا (۴) بیت کے دونوں مصرع باہم ہرگز متناقص نہیں ہیں۔ بیشک شہرہ انتہا درجہ کا ہے۔ جو کسی حاسد یا منکر کمال کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتا۔ اور پھر مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ جس کا شہرہ ہو۔ اُس کا گھر بھی

ہر شخص جانتا ہو مشہور شخص کا گھر پوچھتے ہوئے ہی نئے لوگ (شہروں اور ملکوں سے) آتے ہیں یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور روزمرّہ میں بولتے ہیں۔ کہ اُس شخص کا ایسا شہرہ ہے۔ کہ دُور دُور سے لوگ گھر پوچھتے ہوئے آتے ہیں۔ مثلاً مولوی شبلی صاحب ہی کو لیجئے۔ کہ اُن کا شہرہ ہے۔ اب جو کوئی اُن سے ملنے آئیگا۔ وہ اوّل یہ لوگوں سے پوچھیگا۔ کہ مولوی صاحب لکھنؤ میں ہیں یا حیدرآباد یا بھوپال میں یا اور کسی مقام مناسب گاؤں وغیرہ میں۔ پھر لکھنؤ وغیرہ میں پہنچ کر محلہ کا پتہ پوچھیگا۔ پھر محلہ میں جاکر گھر پوچھیگا۔ ایمان سے فرمائے باوصف شہرت کے گھر پوچھنے کی اُس کو ضرورت ہوئی یا نہیں۔ اور شہرت اور گھر پوچھنے میں کونسا تناقض ہوگیا۔ پھر مولوی صاحب ہمارے مرزا مرحوم کی گویا رُوح سے مزاح کرتے ہیں۔ جو فرماتے ہیں۔ کہ "شاید مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے رُوشناسی نہیں ہوئی۔ اور آستانہ مبارک پر پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر پوچھنا پڑا۔"

ناظرین! اب تو مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں ایک شعر آتشی پڑھ دوں ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب! زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

حضرت آتشؔ

مولوی صاحب یہ تو فرمائیے۔ کہ اگر آستانہ مبارک تک مضمون کی رسائی پہلے ہو چکی ہوتی۔ تو پھر اُس کو نیا مضمون کون کہتا۔ ہائے متنبّی ہزار برس پہلے کیا سچّی بات کہ گیا ہے ؎

وَکَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِیْحاً وَآفَتُہٗ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِیْمِ ص۲

اور دلگیر مرحوم نے قریباً سو برس پہلے فرمایا ہے ؎

ص۱ مرزا صاحب کے معاصرین میں اُن سے بڑھ کر کوئی شاعر مضمون آفرین نظر نہیں آتا ہے۔ خلاق معانی کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا مزاح سے بھی یہ کہنا کہ مضامین کو مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی " میرے نزدیک بڑی ناانصافی و گستاخی ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر میں نے آتشی شعر لکھا ہے۔ ۔۔۔ ۔۔۔

ص۲ یعنی کلام صحیح کے کس قدر عیب گیر ہیں۔ اور کل ساری آفت اور خرابی اُن کے ناقص فہم کی بدولت ہے ۲+ مؤلف۔

قبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر — پر یہاں حسن شناسانِ سخن تھوڑے ہیں

ہمارے مولوی شبلی صاحب خاص کر مرزا مرحوم کے حسنِ سخن کو اکثر عیبِ کلام سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے۔ خدا معلوم سمجھ ہی ایسی ہے یا کوئی خاص سبب ہے۔

(۲) صفحہ ۲۳۷ تا ۲۴۲ موازنہ میں مولوی شبلی صاحب نے مرزا مرحوم کے کلام میں ثقیل و غریب الفاظ ہونے کا دعوے کرکے ثبوت دعوے میں حسب ذیل مصرع پیش کئے ہیں*۔

ناظرین! میں پہلے اس سے کہ جواب دوں تین باتیں کہدوں۔ جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ (۱) مرزا دبیر مرحوم آج کل کے شاعر نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری کی ابتدا کو آج ۱۳۲۳ھ میں پورے سو برس گذر گئے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ بالاتفاق بھاشا

* مولوی صاحب ان مصرعوں کو جو آئندہ متن میں ہیں نقل کرکے لکھتے ہیں "یہ سب الفاظ صحیح و عربی و فارسی میں مستعمل بھی ہیں لیکن اردو نظم کی سلاست و روانی انکی متحمل نہیں ہو سکتی۔" آپ کچھ سے سمجھے۔ پروفیسر آزاد مرحوم اور بعض تذکرہ نویسوں نے بعض شعرا کی غزلوں پر لوگوں کا یہ اعتراض بیان کیا ہے کہ اکثر شعر [illegible] ردیف و قافیہ لاتے ہیں جنکا تحمل غزل نہیں کر سکتی۔ غزل میں وہ شان ہونا چاہیئے جو عشق و حسن کی باتوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے مولوی شبلی صاحب اس نکتہ [illegible] جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں ثابت کر دیا ہے انہوں نے یہی اعتراض مرزا مرحوم کے مرثیوں پر کر دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ ایسا اعتراض صرف غزل پر ہو سکتا ہے قصیدہ پر نہیں ہو سکتا۔ اور جب قصیدہ پر نہیں ہو سکتا تو مرثیہ پر کیونکر ہو سکیگا کیونکہ فی زمانہ مرثیہ تمام اصنافِ سخن غزل قصیدہ مثنوی ترجیع بند [illegible] وغیرہ کا جامع ہے۔ مجھے اس موقع پر ایک نقل یاد آگئی۔ ایک صاحب معمولی پڑھے لکھے تھے مگر [illegible] دو چار لفظیں [illegible] فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص کے (جس کا بیٹا مر چکا تھا) گھر پرسا دینے کو پہنچے۔ وہاں [illegible] اس طرح پرسا دیتے دیکھا کہ خدا آپ کو جوان بیٹے کے ماتم میں صبر دے۔ "اور نعم البدل عنایت فرمائے" [illegible] چند روز کے بعد ایک ایسے شخص کے پاس تعزیت کو گئے جس کا باپ مر گیا تھا۔ انہوں نے یہی جملہ وہاں جھونک دیا کہ "خدا آپ کو صبر دے اور نعم البدل عنایت فرمائے۔" وہ شخص برا بھلا کہنے لگا۔ اور ان کے علم کی قلعی کھل گئی۔ ہمارے مولوی صاحب خدا نخواستہ کم علم نہیں ہیں۔ عالم بلکہ شمس العلما ہیں۔ ان کے کمالات پر علم کلام وغیرہ کی بعض اُن کی کتابیں شاہد عدل ہیں۔ مگر اردو کے علم ادب سے عموماً اور فن مرثیہ گوئی سے خصوصاً وہ ایسے نابلد ہیں جیسے [illegible] [illegible] شاعر [illegible] ہے کہ "یاران شعر ما بمدرسہ کہ برد" ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہندی کے الفاظ نکال رہے تھے۔ فارسی وعربی کے الفاظ لا رہے تھے۔ کہ اس کو علمی زبان بنانا چاہتے تھے۔ پس مرزا صاحب کے یہاں بھی اُن کے تمام معاصرین ذوق۔ غالب۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش وغیرہ وغیرہ کی طرح فارسی وعربی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ اور یہ الفاظ اُس زمانے میں زبان زد ہونے کے سبب سے غریب وثقیل نہیں ہیں۔ (۲) ہر واقعہ نویس شاعر اور ہر مترجم کو فکر ہوتی ہے۔ اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر ایسے الفاظ لاتا ہے۔ جو قلیل ہوں۔ اور معنی کثیر پر دلالت کریں۔ (۳) زیادہ تر مرزا مرحوم ایسے الفاظ اُن مرثیوں میں لاتے ہیں۔ کہ جن میں اُنھوں نے روایتیں نظم کی ہیں۔ نظم روایات میں اُن کے مرثیوں کی شان تُوزخانہ ہے۔ دیکھئے تاریخوں میں ایسے پھڑکتے ہوئے الفاظ لانا معیوب ہے۔ جیسے قصہ اور ناول میں آتے ہیں۔ البتہ جو مرثئے مرزا مرحوم کے قصہ وناول کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کہ یا واقعۂ خیالی ہے۔ یا بہت تھوڑی سی بات اصل میں ہے۔ اور اُس کو خیالات کے زور سے بڑھایا ہے۔ اُن میں وہ بھی پھڑکتے ہوئے لفظ لاتے ہیں۔ مثلاً یہ مرثیہ دیکھئے۔ ع **پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی**۔ اُس تمام مقام میں جہاں علم کی بابت حضرات عون ومحمدؑ سے شمر کی گفتگو نظم کی ہے۔ پھڑکتے ہوئے سلیس عام فہم لفظ لائے ہیں۔ اسی طرح ہند وزندان شام کے حال میں اُن کے جتنے مرثئے ہیں (جو پچاس مرثئے سے زیادہ ہوگئے) اور جناب فاطمہ صغریٰ وشیریں کنیز جناب شہر بانو کے احوال کے مرثیوں میں اور تمام مرثیوں میں رخصت وشہادت کے مقامات پر وہ زیادہ عربی وفارسی کے الفاظ نہیں لاتے ہیں۔ واقعات تاریخی یا علمی باتیں جو شخص لاتا ہے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھتا ہے۔ کہ آج بھی عربی وفارسی کے الفاظ لائے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ دیکھئے جناب سرسید اور اُن کے رفیق جناب محسن الملک وغیرہ وغیرہ **تہذیب الاخلاق** کے پرچوں میں کثرت سے فارسی وعربی الفاظ لاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب مضامین **مرزا مرحوم** کے بعد

لکھے گئے ہیں۔ کہ جس زمانے میں عربی و فارسی کے الفاظ اردو میں کم لانے کا خیال عام طور پر ملک میں پھیل چکا تھا۔ مگر مجبوری تھی کہ بغیر عربی و فارسی کے لفظوں کے مطلب ہی ادا نہیں ہو سکتا تھا +

اِس تمہید کے بعد مرزا مرحوم کے وہ الفاظ جن کو مولوی شبلی صاحب ثقیل و غریب بتاتے ہیں سُنئے :۔

الفاظ عربی و فارسی

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱	مستدعی شق القمر اکر ہوئی گمراہ	مستدعی شق القمر۔ دونوں لفظ معمولی ہیں۔ ایک بھی ثقیل و غریب نہیں +
۲	ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور	نہ انا غریب ہے نہ الطور ثقیل ہے۔ یہ تو سب پہاڑوں سے چھوٹا پہاڑ ہے۔ پھر ثقیل کیوں سمجھا جاتا ہے +
۳	النشر کا ہنگامہ ہے ہر وقت حشر میں	حشر و نشر دونوں معمولی غیر ثقیل لفظ ہیں۔ حشر تو عام طور پر بولتے ہیں۔ نشر بھی نہیں کے معنی پر صحیح ہے۔ وہی مصنف نے باندھا ہے +
۴	لبیک و سعدیک تھا وردِ ملک و حور	لبیک و سعدیک عربی الفاظ زبان ملک و حور سے ادا کئے ہیں۔ یہ کمال بلاغت ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے۔ وہی عربی الفاظ ملک و حور کی زبان لائے ہیں۔ فردوسیؒ کے اس مصرع پر اعتراض ہوا تھا۔ کہ ع فلک گفت احسن ملک گفت زہ۔ کہ یہ عربی ہے۔ فردوسی نے جواب دیا تھا۔ کہ احسن میں نے نہیں کہا آسمان نے کہا۔ اُس کی زبان عربی ہے میں عربی لفظ لایا۔ فردوسیؒ نے عربی الفاظ نہ لانے کی شرط کی تھی پھر بھی وہ لائے۔ پھر فردوسی ہند (دبیرؒ) عربی الفاظ کیوں نہ لائیں +
۵	المنتہیٰ یہ ربط یہ ضبط اس زمانہ میں تھے	الحاصل۔ المختصر۔ المنتہیٰ۔ القصہ یہ سب الفاظ اس زمانے میں عام تھے۔ اس لئے المنتہیٰ نہ ثقیل ہے نہ غریب ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۶	خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال ہیں	منتخبِ آدمیوں میں سے منتخب کے معنی پر یہ لفظ (خاص الخلاصہ) ہے کوئی سبب ثقالت وغرابت نہیں۔ ثقہ لوگ بولتے ہیں۔ بازاری نہیں ہے۔ اگر شرفا کے الفاظ بولنا جرم ہے۔ تو بے چارے مرزا بھی مجرم ہیں۔ یہ لفظ مرزا مرحوم کے علم و فضل کو ظاہر کر رہا ہے +
۷	یارو سنا مدائح نوشاہ کا بیان	مدائح۔ مناقب۔ اوصاف۔ فضائل یہ سب فصیح لفظ ہیں۔ نہ ثقل ہے نہ غرابت ہے۔ پھر فصیح کیوں نہیں ہیں +
۸	رُخ بیّنۂ صدق کرامات پیمبرؐ	لفظ تو لفظ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۹	مستجمع جمیع فضائل ملک سیر	دیکھئے کتنا بڑا مضمون ان الفاظ کی بدولت ایک مصرع میں آگیا ہے۔ معمولی الفاظ اہل علم کی زبان کے ہیں۔ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۱۰	مستغرقِ روحِ اُس کے کیا نہ علی و شبیر	اُس زمانے میں ایسے الفاظ عام تھے۔ کوئی ثقیل نہیں ہے +
۱۱	لیکر رطبِ لو دو دم کہنے لگے شاہ	" " " " " " " "
۱۲	میدانی و نقیبِ عصادار و چوبدار	شاہی چوبداروں کے جتنے اقسام تھے وہ سب ایک مصرع میں جمع کر دئے ہیں۔ اس کمال کی داد دینا تو درکنار اور اعتراض کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی لفظ ثقیل ہے۔ نہ غریب ہے +
۱۳	عرش فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے	نہایت سلاست ہے حضرت سلامت +
۱۴	اک شخص کمر کسی کی لگا باندھنے خورسند	یہ ناموزونی کی تحت میں مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ میں حیران ہوں۔ کہ اس میں کیا ناموزونی ہے۔ خوش۔ خورم۔ خورسند۔ خوشنود۔ شاد۔ شادماں۔ شاداں۔ یہ سب الفاظ اردو میں مستند و فصیح ہیں۔ بازاری نہیں ہیں +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱۵	اک ڈول کو بھر پانی سے اور ایک رطب لو	"ڈول" ڈول کے معنی پر ہے۔ اُس زمانے میں ہندی الفاظ لانا غیر فصیح سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اسی وزن پر ڈول بھی ہے۔ وہ عمداً مصنف نہیں لائے۔ رطب ایسا لفظ ہے جس کا بدل دوسرا لفظ فصیح نہیں ہے۔ اگر دلو پانی سے بھرا ہو ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو ضعف کا علاج کرنا چاہیئے +
۱۶	نوبت زنِ شہ بامِ عروجِ فلکِ پیر	سب الفاظ سلیس وفصیح ہیں چار اضافتیں ایک مصرع میں لانا اُس زمانہ میں بالاتفاق جائز تھا۔ اب بعض شعرا نہیں لاتے بعض اب بھی اسکو جائز سمجھتے ہیں بہرحال مرزا مرحوم پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا +
۱۷	ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پُرانا	یہ مصرع فہم عالی میں نہ آیا غلط لکھ دیا صحیح یہ ہے ع ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پُرانا۔ قلمکار لباس جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اُس کا حُسن بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی لفظ غیر مانوس نہیں ہے۔ سمجھ میں مصرع نہ آیا۔ اعتراض جڑ دیا +
۱۸	سر کو عوض پا رہِ مدحت میں دھرونگا شرعِ کہنِ ناطقہ منسوخ کرونگا	یہ مصرع بھی مولوی صاحب نہیں سمجھے۔ غلط لکھ دیا اور اعتراض جڑ دیا۔ صحیح یوں ہے۔ تل کے اوٹ پہاڑ دیکھئے سے سر کو عوضِ پا رہِ مدحت میں دھرونگا۔ پے الف زبر پا (پاؤں کے معنے پر)۔ رے زبر رَ۔ ہ زیر ہِ۔ رَہِ۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس راہ مدحت کو میں ادباً بجائے پاؤں کے سر سے طے کرونگا۔ واہ مولوی صاحب آپ بے سر و پا اعتراض فرماتے ہیں۔ خود ٹھوکر کھاتے ہیں۔ دوسرے پر غصّہ کرتے ہیں ع آپ ہی ظلم کریں۔ آپ ہی شکوہ الٹا کوئی لفظ نامانوس نہیں ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱۹	یہ صورت پیغمبر قوسین مکاں ہے	صورت - پیغمبر - قوسین - مکان - کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس نہیں ہے +
۲۰	ہے طلعت جلد و نفس سینہ پہ محسوس وہ برق شفق میں تو یہ پروانہ بفانوس	اس شعر میں لف ونشر مرتب ہے - طلعت جلد کو برق شفق سے اور نفس سینہ کو پروانہ بفانوس سے تشبیہ دی ہے - مرزا غالب مرحوم زندہ ہوتے - تو داد دیتے - دقیق کلام کو جس میں اعلٰے درجہ کی صنعت بھی ہے - مولوی صاحب ناموزوں بتلاتے ہیں - جو اُن کی موزونی طبع کی دلیل ہے - یہ ترکیبیں اُس زمانہ میں عام تھیں - غالب - مومن کے دیوان ان ترکیبوں سے بھرے پڑے ہیں +
۲۱	ناگاہ ملا دشت میں بازار زد و کشت تیغیں کھچیں یکدست - تلے گرز بھی یکمشت	زد و کشت - یک دست - یک مُشت - یہ سب الفاظ اردو کے خراد پر اُترے ہوئے ہیں - تیغ ہاتھ میں ہوتی ہے - گرز مُٹھی میں پکڑا جاتا ہے - یہ الفاظ عین موقع پر لائے ہیں - بلاغت کی جان ہیں - مگر میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے - ایسے الفاظ و ترکیبیں تمام معاصرین دبیر کے یہاں بکثرت ہیں - میر انیس مرحوم بھی فرماتے ہیں - ؎ داغِ گلِ ریاضِ تمنا بدل قبول مگر مولوی صاحب سب غصہ مرزا صاحب پہ اُتارتے ہیں - نجانے کیوں اس قدر بھرے ہوئے ہیں +
۲۲	ہے چشم جراحت نہ رہ فوت کو دیکھا	چشم - جراحت - فوت - سب الفاظ بولتے ہیں - ترکیب بھی مانوس ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۳	کہتے ہیں جسے عاشق شیدا ملک و ناس	یہ مصرع غلط لکھا ہے۔ عاشق و شیدا صحیح ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب واو حرف علت آپ کھا گئے۔ کہیں سہو ثقل معدہ کی شکایت نہ فرمائیےگا۔ پورا بند پڑھئے۔ تو حسن کلام معلوم ہو۔ کہتے ہیں جسے عاشق و شیدا ملک و ناس ٭ اللہ کے شیدا ہیں شبیرؑ کے عباسؑ اس حسن ارادت سے پھر حضرتؑ کے رہے پاس ٭ جیسا تھا پیمبرؐ کا علیؑ کو ادب و پاس ایمان کو یہ جانتے تھے جان سے پیارا ٭ اور حضرت شبیرؑ کو ایمان سے پیارا دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے۔ ایک محمدؐ و علیؑ۔ دوسرے حسینؑ و عباسؑ۔ اس رعایت سے عاشق و شیدا۔ ملک و ناس۔ جان و ایمان کے دوہرے دوہرے الفاظ لائے۔ اس کا نام شان بلاغت ہے۔ آپ کو یہ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو مجبوری ہے +
۲۴	خیاط عہد طفلی شاہ انام تھے	چار اضافتیں ہیں۔ جو اس زمانے میں عام طور پر جائز تھیں کوئی لفظ ثقیل یا ترکیب نامانوس نہیں ہے +
۲۵	اس کی ثنا مشقت مالا یطاق ہے	مشقت مالا یطاق اہل علم کی زبان کے لفظ ہیں۔ علم خود آج کل غریب ہے۔ اس راہ سے غریب اس لفظ کو بھی کہئے۔ تو بجا ہے۔ بازاری لفظ نہیں ہے۔ یہ مجبوری ہے +
۲۶	نانا نے تو قلم کئے جبریل کے شہپر	اوپر کے مصرع سے ملا کر پڑھئے۔ جناب عونؑ اپنے بھائی جناب محمدؑ سے جنگ میں کہتے ہیں۔ بھائی یہ ضرب کیا ہے کہ جس سے کٹی سپر ٭ نانا نے تو قلم کئے جبریلؑ کے شہپر سپر اور شہپر میں تجنیس لفظی ہے۔ آپ صنعت کو عیب سمجھتے ہیں۔ خدا کی شان ہے +

الفاظ عربی و فارسی

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۷	کفار بڑے طیش میں ہونٹوں کو دبا کے دانتوں کے تلے بال محاسن کو دبا کے	دیکھئے۔ آپ نے غلط شعر لکھ دیا۔ قافیہ کھا گئے صحیح یہ ہے ۔ کفار بڑے طیش میں ہونٹوں کو چبا کے۔ ہونٹوں کو غصہ میں چبانے کا محاورہ ہے۔ پھر کہیئے گا کہ غلطی طبع کا عذر نہیں چل سکتا۔ کفار۔ بڑے۔ طیش۔ ہونٹوں۔ چبا۔ دانتوں۔ تلے۔ بال۔ محاسن۔ دبا۔ کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس یا ثقیل و غریب نہیں ہے۔ بھلا مولوی صاحب کو کیوں طیش آگیا۔ جو ایسے عمدہ شعر کو بھی عیب کے نظائر میں پیش کر دیا ہے محاسن کو معائب جانتے ہیں + پھر اپنی رائے صائب جانتے ہیں
۲۸	آمد ہے امام سوم ہر دوسرا کی	یا اللہ اس مصرع میں کونسا حرف یا لفظ یا ترکیب ثقیل یا نامانوس ہے +
۲۹	اس سرپہ دھرے ہات بہ قسمیہ اجل ہے بس حبیہ اللہ کے قابل یہی پھل ہے	بہ قسمیہ بلائے موحدہ سے غلط لکھا ہے۔ یہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے چاہئے۔ اس میں کوئی سبب ثقالت و غرابت نہیں ہے +

مولوی صاحب عجب ظرافت فرماتے ہیں۔ عربی و فارسی اہل علم کی زبان کے الفاظ دیکھتے ہیں۔ تو اُن کو غریب و ثقیل بتاتے ہیں۔ اگر عوام کی زبانی اردو و ہندی کے الفاظ میر صاحب یا مرزا صاحب کے کلام میں پاتے ہیں۔ تو اُن کو بازاری زبان مبتذل محاورے کہتے ہیں۔ حالانکہ اُن مقامات خاص کی مناسبت سے وہی الفاظ مناسب ہیں۔ اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ بعض جگہ غور کرنے اور مضمون سمجھنے کی تکلیف نہیں گوارا فرماتے۔ اور جھٹ سے غلط مصرع لکھ کر اعتراض جما دیتے ہیں۔ مگر وہ خود اردو کے شاعر نہیں ہیں۔ ورنہ میں اُن کے کلام میں سے کچھ الفاظ دکھاتا۔ خیر اب اُن کی نثر سے پانچ سات الفاظ ضیافت ناظرین میں پیش کرتا ہوں۔ نظم میں تو وزن و قافیہ و ردیف وغیرہ کی مجبوری سے بعض وقت شاعر خاص لفظ لانے پر مجبور ہوتا ہے۔ نثر میں یہ مجبوری بھی

نہیں ہے۔ پھر بھی مولوی صاحب کے الفاظ کی ثقالت و غرابت دیکھنے کے قابل ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں یہ مختصر فہرست پیش کروں۔ ایک لطیفہ ناظرین کو سناؤں۔ جو مناسب مقام ہے۔ ملک الشعرا[1] مرزا رفیع سودا اکثر لوگوں کی ہجو فرمایا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک ایرانی (سپاہی مزاج) ان سے ملنے کو ہتیاروں سے اوپچی بنا ہوا آیا۔ انہوں نے اُسکی ہجو فی البدیہہ فارسی میں نظم کرکے اُس کو سنائی۔ اور طالب داد ہوئے۔ ایرانی تحمل و وقار سے سنتا اور داد دیتا رہا۔ جب مرزا سودا ہجو پڑھ چکے۔ ایرانی بولا۔ حالا کہ نظم خویش خواندی نثر ما ہم بشنو۔ مرزا بولے۔ بسم اللہ آغا بفرمائید۔ بس اُس نے جھپٹ کر ان کا ٹینٹوہ دبا لیا۔ زمین پر پچھاڑ کر کمر سے خنجر نکال کر بولا۔ بگو ایں نثر بہتر ست یا نظم تو۔ ملک الشعرا نے ہاتھ باندھ کے عرض کی۔ نثر آغا از نظم بندہ بہتر ست بندہ را بگزارید و معاف کنید۔ غلط کردم۔ حالا توبہ میکنم۔ جب خدا خدا کرکے اُس ایرانی کے پنجہ سے رہائی بلکہ عمر دوبارہ پائی +

لطیفہ

آمدم بر سر مطلب :۔

مولوی شبلی صاحب کے بعض الفاظ پر [illegible]

اعتراض	جملہ	نمبر صفحہ و نام کتاب
"چونکہ" غیر مانوس لفظ ہے۔ گو عام لوگ نثر میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ مگر اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ شعرا فصحا اس کو مطلق استعمال نہیں کرتے۔ مولوی صاحب الفاظ میں عمر بتاتے ہیں۔ نہیں وہ سوچیں۔ اس میں کیسا مبتذل شعر نکلتا ہے۔ ایک مجمع میں ایک صاحب کو بد ہضمی کی شکایت تھی۔ چوں کی آواز نکلی۔ تو ایک ظریف بولے۔ جناب اُردو میں باتیں کرتے کرتے آپ تو شہر یانی بولنے لگے۔[2] دیکھئے دبیرؔ انیسؔ اور ان کے معاصرین اس کی جگہ پر لبسکہ لاتے ہیں۔ دبیر۔ دستی لبسکہ صبح قتل شہنشاہ نامدار	لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے۔	صفحہ ۳۱ موازنہ

[1] جس طرح ایک معمر بزرگ سے لکھنؤ میں میں نے سنا تھا۔ (یہ لطیفہ) لکھ دیا۔ حضرت سید ضمیر آزاد مرحوم نے کتاب حیات میں اس کو لکھا ہے۔ مگر کچھ الفاظ کا فرق ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ اعتراض مولوی شبلی صاحب کا بیشک صحیح ہے۔ کہ بعض الفاظ میں شعر بنتے قابل ہیں۔ اور اس میں مذموم شعر ہے۔ اور نثار جو عام طور پر چونکہ لکھتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کسی لفظ میں شعر نہیں بنتا + ۱۲ ثابت۔

نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
		انیس ؎ تھا بسکہ روز قتل شہ آسماں جناب - ان فصیح شعرا کے کلام میں دیکھ جائیے۔ یہ کہیں بھولے چوکے سے بھی "چونکہ" نہیں لاتے ہیں - لمؤلفہ ؎ فصحا بسکہ بہا اک لفظ متیں کہتے ہیں + بھولے چوکے سے بھی چونکہ وہ نہیں کہتے ہیں۔
ص ۱۰ موازنہ	واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری کمال یہ ہے +	اس موقع پر مولوی صاحب نے اصول کو واحد لکھا ہے - دراصل یہ اصل کی جمع ہے - یوں لکھنا تھا - کہ اصل اصول بلاغت یہ ہے[1] - میں مانتا ہوں - کہ عام لوگ اصول (بجائے اصل) بولتے ہیں - مگر مولوی صاحب نے انیسؔ و دبیرؔ پر اس قسم کا اعتراض کیا ہے - اس لئے مجھے بھی اس اعتراض کا حق پیدا ہوا - ملاحظہ ہو موازنہ کے صفحہ ۲۲۹ پر میر صاحب کا یہ مصرع ؎ گرتے تھے طیوران ہوا کھولے ہوئے پر - اسکو لکھکر مولوی صاحب فرماتے ہیں - طیور خود جمع ہے - اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہے نہ مستعمل - اسی طرح صفحہ ۲۴۳ پر مرزا صاحب کا یہ مصرع لکھکر "القاب سخن سنج سخنور ہے ہمارا" لکھا ہے - کہ "لقب کی بجائے القاب باندھا ہے" - حالانکہ دہلی و لکھنؤ بلکہ ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے - کہ القاب کو روزمرہ میں بجائے واحد بولتے ہیں - اور مرزا مرحوم نے تو ایک اور کمال کیا ہے - کہ دو لقب سخن سنج - سخنور لکھکر جمع کا حق بھی پیدا کر دیا ہے - اور حور خود جمع حورا کی ہے - مگر بجائے واحد مستعمل ہے - شیخ سعدی فرماتے ہیں - حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف - مولوی صاحب جس دن اصول کے واحد ہونیکی کلام شعرائے فصحا سے سند دینگے - اسی دن ہم سے

۱ اصول

[1] جناب سر سید تہذیب الاخلاق کے اپنے اس مضمون میں جس کی سرخی (ہیڈنگ) یہ ہے - "کہ کن کن چیزوں میں تہذیب چاہئے" تحریر فرماتے ہیں "تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہئے - کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے" ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق مطبوعہ لاہور ۱۳۱۳ھ جلد دوم کا صفحہ ۵۳ + ۱۲ مؤلف عفی عنہ

	نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
			طیوران کی (القاب کی طرح) سند لیں۔ القاب کی سند حاشیہ پر ملاحظہ ہو۔[1]
معذرت خواہی	ص ۲۳ موازنہ	ایسی ایک کی معذرت خواہی	معذرت کافی ہے۔ عذر خواہی تو بولتے ہیں۔ معذرت خواہی کون بولتا ہے۔ اگر دہلی و لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ تو سند دیجئے۔
	ص ۷۰ موازنہ	سیبویہ کا ہمتا ہے الے الذہن	ثقیل و غریب الفاظ کی تعریف میں یہ جملہ آتا ہے۔ کیونکہ اردو کا ٹکسالی جملہ نہیں ہے۔ ایسے ہی لفظ عربی کی نسبت کسی پہلے شاعر کا شعر ہے۔ ع حمد ذائیں نے کہا اُن سے تو ہنس کر بولے • عربی بولو کسی اہل عرب کے آگے
لفظ خدا پر لفظ بلیغ کا اطلاق	ص ۷۰ موازنہ	خدا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے۔	مولوی صاحب! لفظ پر بلیغ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ تمام علمائے معانی و بیان کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ بلیغ کا اطلاق ہمیشہ جملہ پر ہوتا ہے۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہہ سکتے جیسا کہ میں اوپر مختصر المعانی وغیرہ سے ثابت کر چکا ہوں۔ خطا معاف!! در اصل مولوی صاحب علم بلاغت کی ابتدائی باتوں سے بھی ناواقف ہیں۔ جبھی تو فرماتے ہیں کہ بلاغت کلام دبیر میں نام کو نہیں۔ اگر واقف ہوتے تو بخلاف تمام کاملین کی رائے کے نہ کلام دبیر کو بلاغت سے خالی اور لفظ کو بلیغ فرماتے۔ اور ملک کی بدمذاقی کی لے بڑھنے کا گیت شروع موازنہ ہی میں نہ گاتے۔

مولوی شبلی صاحب کی نثر میں ایسی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ میں نے مشتے نمونہ از خروارے چند الفاظ یہاں لکھ دئے۔ ناظرین حق بیں اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ۔

[1] ملاحظہ ہو امیر اللغات جلد اول (الف ممدودہ) کا صفحہ ۲۰۰ جناب رشک مرحوم سے ملکہ کے اُن تک کو خدا لکھتا تھا میں اپنی بندگی۔ اور کیا لکھتا ہیں القاب بھی آداب ہو۔ دوسری سند صفحہ ۱۰۰ پر رشک مرحوم۔ اول تحریر وصف یہ سنا ہے ترک کیا۔ ملکہ چکے کتنے القاب کو آداب سے … سمجھ کے اصل بجائے اہل (عامہ) کثرت سے بولا جاتا ہے۔ مگر … فصحا کو دیکھنا چاہیئے۔ اس کے قطع نظر جیسا مولوی شبلی صاحب نے دبیر پر بے جا اعتراض کیا تھا ویسا ہی … نے بھی کیا۔ کما تدین تدان۔ مثل مشہور ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی • [illegible]

جن کو ایسی معلومات فن شعر و ادب میں ہو۔ وہ بزرگوار کیا (دبیر و انیس کے) کلام کی خوبیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یا اُن میں (جج) حکم بن سکتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر مرحوم مشہور شاعر کامل اکبرآبادی اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ دبیر و انیس میں وہ شخص حکم ہو سکتا ہے۔ جو اِن دونوں سے بڑھ کر علم ادب و شعر کا عالم اور شاعر ہو۔ اور ایسا شخص رُوئے زمین پر کوئی نظر نہیں آتا۔ لہٰذا اس کا انصاف نہیں ہو سکتا میرے نزدیک اُن مرحوم کا یہ عقیدہ و قول سچ ہے +

چھٹا داغ

فصل ۸ چھٹا داغ سرقہ

سرقہ اور مولوی شبلی صاحب کا انیسؒ دبیرؒ کی طرف نسبت دینا +

مولوی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۲۳۳ پر سرقات کی سرخی (ہیڈنگ) لکھ کر میر انیس صاحب کے اور اُس کے ساتھ اساتذہ سلف کے چند اشعار لکھے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں یہ فرمایا ہے۔ کہ اکثر سرقے اس قسم کے ہیں۔ کہ شاعر سابق سے میر صاحب کا شعر حسن بندش وغیرہ کے اعتبار سے بڑھا ہُوا ہے۔ مگر پھر تحت میں چند اشعار لکھ کر یہ بھی زیب رقم فرمایا ہے۔ کہ اِن اشعار میں اشعار سابق سے میر صاحب نے کسی قسم کی ترقی نہیں کی۔ اور یہ کہ حسن ظن ہو۔ تو اس کو توارد ورنہ سرقہ کہنا چاہئے۔ اس مقام پر مولوی صاحب نے چند سکندریاں (ٹھوکریں) کھائی ہیں۔ وہ یہ ہیں :۔

(۱) پہلا فقرہ یہ لکھا ہے۔ کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ میر انیس (اور مرزا دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے"۔ اس فقرہ میں مولوی صاحب نے مرزا دبیر مرحوم کو بھی ملزم سرقہ بنا دیا۔ مگر پھر مرزا مرحوم کا ایک مصرع بھی ایسا نہ پیش کر سکے۔ جس پر گمان سرقہ کا ہو۔ اگر یہ کہئے۔ کہ میر انیس مرحوم کے سرقات کا دکھانا مقصود تھا۔ تو پھر مرزا مرحوم کا نام ہی کیوں لکھا۔ مگر ہمارے

(۱) مرزا دبیر کا اشارہ

مولوی صاحب اپنی مقتضائے طبیعت سے مجبور تھے مرزا مرحوم سے جو اُن کو خاص لاگ ہے۔ غالباً اُس نے اُن کو خطوط و حدائق میں (اور مرزا دبیر) کے الفاظ لکھنے پر مجبور کر دیا[1]+

ضمیر و انیس

(۲) میر ضمیر مرحوم اور میر انیس مغفور کے یہ دو بند بھی اسی بحث سرقہ کی ذیل میں لکھے ہیں:—

میر انیسؒ	میر ضمیرؒ
یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ؟ یہ کس کی دستار	پہچانتے ہو! کس کی مرے سر پہ ہے دستار
یہ زرہ کس کی ہے؟ پہنے ہوں جو میں سینہ فگار	دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
بر میں کس کا ہے؟ یہ چار آئینہ جو ہر دار	یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار
کس کا رہوار ہے یہ؟ آج میں جس پہ ہوں سوار	میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
کس کا یہ خود ہے؟ یہ تیغ دو سر کس کی ہے	باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے	کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اس کو سیا ہے

حالانکہ علم معانی و بیان کی جتنی کتابیں ہیں۔ قریباً سب میں یہ لکھا ہے۔ کہ اغراض و مطالب متحدہ کا بیان کرنا داخل سرقہ نہیں[2] ہے۔ جیسے ایک شاعر نے مدح سخاوت و شجاعت وغیرہ نظم کی۔ پھر دوسرے نے کی۔ تو دوسرے کو سارق نہیں کہینگے۔ یا ایک حکایت ایک شخص نے اور پھر وہی دوسرے نے لکھی۔ جیسے یوسف زلیخا فردوسی نے اور پھر اُس کے کئی سو برس بعد جامی نے لکھی۔ تو کوئی عقلمند جامی کو سارق یا اُن کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بھی یہی بات ہے۔ اکثر کتب سیر و مقاتل

یوسف زلیخا میں

---

[1] جبکہ مرزا مرحوم کو مولوی صاحب نے ملزم سرقہ کا لکھ دیا اور ثبوت کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولوی صاحب کے خلاف مرزا صاحب کی طرف سے دفعہ ۵۰۰ کا استغاثہ عدالت عالیہ میں دائر ہو سکتا تھا (باجازت عدالت) ہو سکتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا کمال ایسے استغاثہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ۱۲ مؤلف

[2] ملاحظہ ہو معانی البلاغۃ مصنفہ شمس العلماء تفسیر مرحوم صفحہ ۔۔۔ اور دیگر کتابیں اس علم کی۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

میں یہ روایت مرقوم ہے۔ کہ امام حسینؑ نے اپنے لباس وسلاح کو دکھا کر فوج یزید پر یہ حجت تمام کی تھی۔ کہ تم جن کا کلمہ پڑھتے ہو۔ اور جن کو اپنا پیشوا جانتے ہو۔ اُن محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ علیہم السلام کے یہ تبرکات ہیں۔ اور میں اُن کا یادگار وقائم مقام ہوں۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس کو اگر لاکھ آدمی بیان کریں۔ تو ۹۹۹۹۹ سارق نہ ہونگے۔ اسی روایت کو میر ضمیرؔ و میر انیسؔ نے نظم کیا ہے۔ یہ نہ سرقہ ہے نہ دخل توارد شعریہ ہے۔ اس موقع پر پہنچ کر یہ کہے بغیر رہنا حق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ کہ مرزا دبیرؔ نے اس بیان میں بھی ایک جدت پیدا کی ہے۔ یعنی اسی مضمون تاریخی کو نئے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ جو اُن کی قوت ایجاد پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل یہ عرض کردوں۔ کہ اُنھوں نے ایک مشہور مسئلہ قانون شہادت کی اصل اصول پر نظر رکھی ہے۔ وہ یہ کہ شہادت تین قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) زبانی۔ جو زبان سے ادا کی جائے + (۲) تحریری۔ جو کسی دست آویز وغیرہ کو اپنے قول کی سند میں دکھایا جائے + (۳) مادّی۔ جو کسی مادّی چیز کو دکھا کر دعوے پر دلیل گردانا جائے۔ مثلاً قتل یا ضرب کے مقدمہ میں کسی ایسے پتّھر یا لکڑی وغیرہ کو دکھایا جائے جس پر خون مقتول یا مضروب کا جما ہوا ہو۔ یا مضروب کا زخمی ہاتھ دکھایا جائے۔ پس یہ پتّھر یا لکڑی یا ہاتھ گویا زبان حال سے شہادت واقعہ ضرب یا قتل کی دینگے۔ اسی کو زبان حال بھی کہتے ہیں + پس مرزا مرحوم اِس واقعہ کو اِس طرز پر بیان فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ ایک ایک چیز بزرگوں کے تبرکات میں سے دکھا کر فرماتے جاتے ہیں۔ کہ دیکھو یہ چیز کس بزرگوار کی ہے۔ اور وہ چیز خود زبان حال سے شہادت دے رہی ہے۔ اب وہ بند سنئے۔ (امام حسینؑ لشکر یان یزید سے فرماتے ہیں):۔

جدت طراز یان مرزا دبیر کے حافظہ شہادت

مصحف ہدایت مرے نانا کا لقب ہے | تم میری امامت کے ہو منکر۔ یہ عجب ہے
صد چاک یہ ملبوس مرے تن میں جواب ہے | موجود گواہی کو۔ بفرمودۂ رب ہے
گویا ہوا ملبوس بھی زخم جگر کا | حقّا تو ہے پیوند پیمبرؐ کے جگر کا

پھر شہ نے کہا باپ علیؑ ہے مرا کرّار — دختر دی نبیؐ نے اُسے اللہ نے تلوار
دو تیغوں سے سو نیزوں سے جو کرتا تھا پیکار — باوعدہ ہو تو تیغ و سناں خود کرے اظہار
واں نیزۂ حیدرؑ نے زباں کھولی کہ حق ہے — یاں میاں سے تیغ دوزباں بولی کہ حق ہے

گو شمع جہاں تھی زرہ پیچ کے اندر — پر صاف گواہی کے دکھانے لگی جوہر
تھی پاس جو تیغ کمر حیدرؑ صفدر — انگشت قبول اُس نے دھری آنکھوں کے اُوپر
کھا کر سر اقدس کی قسم خود پکارا — یہ سر ہے نبیؐ کا اسے کاٹو نہ۔ خدا را

(۳۳) جن کتب معانی و بیان میں شعرا کے ہم مضمون اشعار لکھے ہیں ہر ایک مصنف نے صاف لکھ دیا ہے۔ کہ اگر شاعر مابعد کی نسبت یہ ثابت ہو جائے۔ کہ اس شعر کی تصنیف کے وقت اُس کو شاعر سابق کے شعر کا علم تھا۔ تو اُس پر حکم سرقہ کا جائز ہے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کو توارد کہینگے۔ کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی (ایک ایرانی مستند شاعر) فرماتے ہیں۔ ؎ توارد و سرقہ

مگر توارد خاطر کہ در مجارئے آں — نہ ممکن ست کہ کس معترض شود بروے
دو راہرو کہ براہے روند در یک سمت — عجب نباشد اگر او فتند پے در پے

مطلب ان بزرگوار کا یہ ہے۔ کہ "جب ایک ہی سمت میں دو مسافر آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ اور پچھلے راہگیر کو خبر نہیں۔ کہ میرے آگے بھی کوئی جا رہا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ جہاں اگلے کا قدم پڑا ہے۔ وہیں پچھلے کا بھی پاؤں پڑ جائے۔" اس بات پر اعتراض کرنے کا کیا کام ہے۔ پس مضمون کا لڑ جانا ممکن ہے۔ اگر کوئی نافہم کہے۔ کہ شاعر مابعد کو تمام سابقین شعرا کے کلام سے خبردار ہونا چاہئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص تمام شاعروں کا کلام دیکھ جائے اور پھر یاد بھی رکھے (کہ جن کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے)۔ غالب مرحوم نے بھی اس بات کو ایک شوخی کے ساتھ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ؎ مضمون کے لڑ جانے پر غالب کی شوخی

مبر گمان توارد۔ یقیں شناس کہ دُزد متاعِ من زنہاں خانۂ ازل بُرد ست

مطلب یہ ہے۔ کہ جس نے مجھ سے پہلے اس مضمون کو کہا۔ وُہی چور ہے۔ مَیں نہیں ہُوں۔ ازل کے نہاں خانہ مضامین سے میری پونجی چُرالی ہے" ادائے مطلب کی خوبی دیکھئے[1]

توارد

اب جبکہ توارد کی بحث آگئی ہے۔ تو شاید اس میں کچھ اور بھی لکھنا طالبانِ فن کے واسطے مفید ہوگا۔ واضح ہو۔ کہ ایک مضمون کو شاعرِ اوّل باندھتا ہے۔ شاعرِ ثانی بھی اُسی کو نظم کر جاتا ہے۔ اور اُس غریب کو خبر نہیں ہوتی۔ کہ مجھ سے پہلے بھی کوئی یہی مضمون کہہ گیا ہے۔ مَیں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہُوں۔ مَیں نے اپنے ایک مرثیہ میں دریائے فرات کی کیفیت ایک بند میں یوں نظم کی تھی۔

نہ تھا فرات کی موجوں کو ایک سمت قرار شُوئے یمیں کبھی جاتی تھیں گاہ شُوئے یسار
کہ جیسے کروٹیں بستر پہ لے کوئی بیمار حباب کا تھا دم آنکھوں میں نزع کے آثار
بھنور کو ہوگیا دوران سر سکتہ تھا فرات[2] خود لبِ ساحل سر پٹکتا تھا

پھر کئی برس کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ کہ جو مضمون مَیں نے اس بند کے چھٹے مصرع میں باندھا ہے۔ اُس کو جناب میر انیس مرحوم (کچھ فرق کے ساتھ) پہلے ہی نظم فرما چکے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ ع

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں بیں فرات کی

پس منصف مزاج اس کو توارد کہینگے۔ سرقہ نہیں۔ ناتجربہ کار کہہ سکتا ہے۔ جس کو شعر

---

[1] لطیفہ۔ مَیں اگر حضرت غالب مرحوم کی حضوری میں [illegible] یہ شعر پڑھ کر عرض کرتا کہ صاحب اگر یہی سرقہ مضمون ہے تو پھر یہ مثل صادق آتی ہے۔ کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۱۲ مؤلف حقیر

[2] واضح ہو۔ کہ فرات کو بعض [illegible] گنگا کہا ہے۔ [illegible] میں جو ہندو [illegible] وہ ما اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور مرزا مرحوم نے بھی نظم فرمایا ہے۔ جس سے یعنی [illegible] کی ہے ۱۲ مؤلف حقیر

ترجمہ

کہنے سے سروکار نہیں ہے۔ **علاوہ** توارد کے ایک قسم اور بھی ہے جس کو ترجمہ کہتے ہیں۔ وہ یہ صورت ہے۔ کہ شاعر کو کوئی شعر عربی فارسی سنسکرت بھاشا۔ انگریزی وغیرہ کا پسند آیا۔ اُس نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔ اس ذریعہ سے اردو کی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ وسعت زبان اردو کے واسطے اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔ پس جب کہ کسی مترجم کو کوئی چور نہیں کہتا۔ تو ایسے شاعر مترجم کو سارق اور اُس کے شعر کو سرقہ (بھی) کہنا ظلم ہے۔ چنانچہ خود مجھے ایسا بھی اتفاق ہوا ہے۔ حسان الہند مولوی سید غلام علی صاحب آزاد بلگرامی کی کسی کتاب (شاید خزانۂ عامرہ) میں ایک شعر کسی ایرانی شاعر کا میری نظر سے گذرا۔ مجھے اس کا مضمون بہت پسند آیا۔ وہ یہ ہے۔ ؎

هر قدح برخ افگنده برد ناز بباغش ۔۔۔ تا نکهت گل بیخته آید بدماغش

یہ مطلع تھا۔ میں نے اس کا ترجمہ کہہ کے مطلع ہی میں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

نقاب ڈال کے [illegible] باغ میں آئے ۔۔۔ کہ جس کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

پس اگر ہم مولوی شبلی صاحب کی خاطر سے مان بھی لیں۔ کہ میر صاحب کو اُن تمام فارسی کے اشعار کا علم تھا۔ تو بھی ہم اُن کو ترجمہ اور اچھا ترجمہ کہیں گے۔ اور مولوی صاحب موصوف سے [illegible] کہ میر صاحب یا مرزا صاحب کی طرف سرقہ کی نسبت کرنا گو وہ لکھنا [illegible] چھوٹا منہ اور بڑی بات اور گستاخی معاف عرض [illegible] گستاخی ہے۔

استنباط

علاوہ ترجمہ کے ایک اور قسم بھی ہے۔ جس کو کتابوں میں **سرقہ مستحسن** لکھا ہے مگر اس کا (مستحسن) نام جو بعض شعرائے حال کی زبان پر جاری ہے **استنباط** ہے۔ کہ دوسرے شاعر کے شعر سے تھوڑا سا مضمون لے کر یادتی کرے۔ جیسے میر تقی میر کا یہ شعر ہے۔ ؎

گرم تجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا ۔۔۔ آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

اس مضمون میں شیخ ذوق نے یہ اضافہ و تغیر کیا۔ ؎

لینے ہی دل جو عاشقِ جاں سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

جناب میر صاحب نے تو اتنا ہی کہا تھا۔ کہ گرم (غصّہ میں) ہمارے پاس سے تم چلے گئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے جناب ذوق نے اس میں یہ اضافہ کیا۔ کہ تم عاشق کا دل لینے ہی چل دئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے۔ سب کوئی جلدی جانا چاہتا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ کہ کیا آگ لینے آئے تھے۔ ایک تو قلبِ عاشق آگ تھا۔ دوسرے جاں سوز کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ آگ لینے کو آنے کا پورا طلاق ہو گیا نظرین! اچھا تو آپ نے یہاں یہ دو شعر سنے ہیں۔ پھر لگتا ہوا (قریب المضمون) ایک شعر بیدار شاہ کی ریختی کا بھی اب سن لیجئے۔ ؎

آگ لینے کو جو آئیں تو گئیں لاگ لگا
بی بی ہمسائی نے دی دل میں مرے آگ لگا

البتہ استنباط مضامین کو بعض نافہم سرقہ کہہ کر شاعر مابعد کے دامن کمال پر دھبہ لگانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہ سرقہ ہے نہ نقص۔ اگر اس کو نقص سمجھا جائے۔ تو زمانہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس باب میں مرزا دبیر مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

حاسد کا دل جلے نہ توارد کے داغ سے
روشن چراغ ہوتے ہیں اکثر چراغ سے

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح اپنے گھر سے تیل بتّی لے جا کر کوئی دوسرے کے چراغ سے چراغ جلا لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر مابعد اپنی قوتِ طبع (تیل) اور زورِ تخیل (بتّی) اور دماغ (چراغ) کے ذریعہ سے دوسرے کے مضمون سے اپنا مضمون استنباط کرتا ہے۔ اس میں حاسد کیوں اپنا دل جلاتا اور اس کو سرقہ بتاتا ہے +

خیر اب ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ بعض موقع پر شاعر مابعد شاعر ماقبل کے مضمون پر کچھ اضافہ و ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے نزدیک وہ اضافہ کرتا ہے۔ اور ازبسکہ اپنا لڑکا اور اپنا کلام سب کو اچھا اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے

کہ میرا مضمون شاعر سابق سے بڑھ گیا۔ مگر درحقیقت نہیں بڑھتا۔ وہ ایک انسان ہے اس لئے اپنے خیال میں غلطی کرتا ہے۔ دوسری طبیعتیں اُس کو ترقی نہیں قبول کرتیں۔ تو اس صورت میں بھی وہ قابل معافی و آفرین ہے۔ کہ اُس نے اپنے ملک کی شاعری میں ایک قسم کی ترقی کرنا چاہی تھی۔ مگر ناکام رہا۔ اس کی کیفیت آپ کو ذیل کے دو نامور شاعروں کے دو مطلعوں سے روشن ہو جائیگی۔ جو میر شمس الدین فقیر مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب حدائق البلاغۃ میں لکھے ہیں۔ (۱) ظہوریؔ فرماتے ہیں۔ ؎

بر آں ناتواں صید بیداد رفت ۔۔۔ کہ در دام از یادِ صیاد رفت

شیخ علی حزیںؔ جن کا ظہور ظہوریؔ کے بہت مدت کے بعد ہوا ہے ارشاد فرماتے ہیں ؎

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد ۔۔۔ در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ شیخ حزیںؔ کو ملا ظہوریؔ کے مطلع کا علم تھا۔ تو یہ کہنا چاہئے کہ اُنہوں نے ترقی کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ ظہوریؔ کے مطلع میں ناتواں کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ اور مطلع حزیںؔ سے وہ بہتر ہے۔ کہ مختصر لفظوں میں ہے۔ خیر الکلام ما قلّ و دلّ اصول بلاغت میں سے ایک مشہور اصل ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ خدا کسی کی محنت کو برباد نہیں کرتا۔ (با ایں ہمہ) حقیر کے نزدیک شیخ حزیںؔ کے مطلع میں حزن کا اثر ظہوریؔ کے سے بڑھا ہوا ہے۔ شیخ حزیں بھی قابل تحسین و آفرین ہیں ٭

اگر کتاب کے طولانی ہونے کا خیال مانع نہ ہوتا۔ تو میں اس بحث کو زیادہ طول دیکر عربی۔ فارسی۔ اردو وغیرہ کے بہت سے اشعار ہم زمانے کے قریب المضمون اس موقع پر لکھتا۔ مگر مجبور ہوں۔ اور خیال کرتا ہوں۔ کہ اب بھی بعض ناظرین فرمائینگے۔ کہ حیات دبیر میں اِدھر اُدھر کی باتیں درج کر کے فضول کتاب کا حجم بڑھایا ہے۔ حالانکہ اہل عقل جانتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں کے لکھنے سے ملک کے نو مشق شاعروں کو کس قدر

فیض پہنچتا ہے۔ اور اہلِ کمال کی سوانح عمری لکھنے سے محض یہ غرض نہیں ہوتی۔ کہ بس اُن کے حالات تاریخی سے دُنیا واقف ہو جائے۔ بلکہ اُن کے بیان میں بہت سی علمی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ دبیر مرحوم کے نام قائم رہنے ہی کی غرض سے یہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اُن کا نام تو غمِ حسینؑ کے ساتھ انشاءاللہ قیامت تک قائم رہیگا۔ اور اُن کے کلام سے جو ہر رنگ میں ہے ہر طبیعت کا شاعر جدا جدا فائدہ اُٹھاتا رہیگا۔

فصل ہ ساتواں داغ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے

اعتراض اول دختر شاہ حلب

ساتواں داغ

چھوٹے چھوٹے بہت سے حصّوں سے مل کر یہ ایک داغ بنا ہے۔ وہ حصے یہ ہیں:۔

(۱) بادشاہ حلب کی بیٹی۔ جو شاہزادہ علی اکبرؑ کی نسبت ٹھہری ہے۔ اور اس واقعہ کو میرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے۔ اس کی نسبت مولوی شبلی صاحب صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں۔ کہ "یہ قصہ بالکل بلاغت ومقتضائے حال کے خلاف ہے۔ تمام باتوں سے قطع نظر ایک کنواری لڑکی کا بَین اور نوحہ جو ابھی عقد میں بھی نہیں آئی ہے۔ اور پھر دُولھا دُولھا پکارتی جاتی ہے۔ کس قدر لغو و بے معنی ہے"۔

اس کا جواب مفصّل میں نے جلد دوئم میں (جہاں اِس مرثیہ کے تھوڑے سے بند لئے ہیں) لکھا ہے۔ یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔ کہ (اوّل تو) یہ واقعہ ملکِ عرب کا ہے۔ عرب کی عورتوں کے رواج پر خیال کرنے سے کچھ بھی خلافِ مقتضائے حال نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے۔ کہ "قضیہ زمین برسرِ زمین"۔ عرب کی ناکتخدا لڑکیاں

رواج عرب

ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کی طرح شرم نہیں کرتیں۔ اور اس کو وہ مصنوعی شرم کہتی

ہیں۔ پس خیال کیجئے۔ کہ جب ایک عرب کی ایماندار لڑکی کو یہ امید و خوشی ہو۔ کہ میں خاندان رسالت میں بیاہی جاؤنگی۔ اور اُس کی یہ برسوں کی امید یکایک اس طرح یاس سے بدل جائے۔ کہ اُس کو اُس ہمشکل رسول خداؐ امام زادہ کی لاش ریتی پر نظر آئے۔ تو وہ اسی طرح جگر خراش بین کریگی۔ جس طرح جناب مرزا صاحب نے (اُس کے بین) لکھے ہیں۔ اس موقع پر "بے معنی و لغو" الفاظ کلام مولوی صاحب میں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ایسے عالم اور [illegible] یہ الفاظ بولیں۔ جو بد اخلاقی کی جڑ ہیں۔ مگر میں مرزا مرحوم کی خوش اخلاقی کو پیش نظر رکھ کر جواب میں کبھی کوئی سخت لفظ نہیں نکالتا۔ اور مرزا صاحب مرحوم کا ایک مصرع مولوی صاحب کو [illegible] پڑھے دیتا ہوں ع

دیکھو ہمارے عیب کو [illegible] جگر کو

(دوسرے) اب ہندوستان [illegible] کوئی لڑکی [illegible] زادی کسی شریف سے منسوب ہوتی ہے۔ اور [illegible] تو وہ مر جاتا ہے۔ اور اُس کو منظور یہ ہوتا ہے۔ کہ اب میں اُسی کے نام پر بیٹھی رہوں۔ تو وہ اُس کو شوہر تسلیم کر کے بیووں کی طرح بین کرتی ہے۔ اس کی ایک دو نہیں ہزاروں نظیریں ہندوں اور پٹھانوں اور شریف مسلمانوں کی بستیوں میں ملتی ہیں۔ اور یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ وہ فعل معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کہ جس میں کسی کنواری عورت کی رغبت کسی شخص سے اُس کے [illegible] ہو۔ سو اس حکایت میں یہ صورت نہیں ہے +

(۳) مولوی صاحب کو موازنہ میں جا بجا (صفحہ ۴۸ و ۱۶۵ و ۳۰۳ پر) مرزا صاحب کی یہ شکایت ہے۔ کہ پہلوان کی لڑائی میں وہ زمین و آسمان کے قلابے

* جن لوگوں نے نکاح ثانی بیوہ کے مارنے کی کوشش کی ہے۔ [illegible] ہیں اُن سے پوچھئے اِس کی تصدیق فرمائیں گے۔ اور ایسے [illegible]

ملا دیتے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ دونوں حریفوں میں سے کسی ایک نے دوسرے پر
وار بھی کیا یا نہیں۔ اگر کیا۔ تو کیا ہنر دکھائے +

جواب

میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب خود زمین و آسمان کے گویا قلابے ملا رہے
ہیں۔ زبان سے تو اس قدر (جا بیجا) نزاکتوں کے ڈھیر لگا دئے ہیں۔ مگر کسی ایک
پہلوان کی لڑائی بھی ان کے مرثیوں میں سے موازنہ میں اپنے دعوے کے ثبوت
میں نہ دکھائی۔ ع دعوے بے دلیل قبول خرد نہیں۔ میں نے اس جلد اوّل میں کم
اور جلد ثانی میں بہت سے پہلوانوں کی لڑائیاں کلام مرزا صاحب سے لکھدی ہیں جن کو
دیکھ کر ہر منصف مزاج یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے لڑائی کی تصویریں کھینچ کر
دکھا دی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وہ کیوں نہیں نظر آتیں۔ اس کی
وجہ شاید یہ ہو۔ کہ ان کی آنکھوں میں انصاف کی عینک نہیں لگی ہے۔ اس سبب سے
وہ مرزا صاحب کے کمالات سے انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے قول و دعوے کے ثبوت
میں کچھ بھی نہیں پیش کر سکتے +

یہ بھی لکھ دوں۔ کہ میرا یہی کام نہیں ہے۔ کہ مولوی صاحب کے اعتراض کا
جواب ہی دے دوں۔ بلکہ یہ بھی میرا فرض ہے۔ کہ جو بات در اصل ہے۔ وہ لکھ کر
ناظرین پر ظاہر کر دوں۔ یہ ایک بھید کی بات ہے۔ مرزا مرحوم کا
خیال یہ تھا۔ کہ مرثیہ میں چہرہ سراپا۔ لڑائی۔ رجز سب کچھ ہو۔ مگر اس میں اس قدر
زیادتی نہ ہو۔ کہ جو اصل مرثیت کو دبا لے۔ اگرچہ انہوں نے بعض مرثیوں میں
پہلوان کی لڑائی مشرح و مفصل بھی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو اس مرثیہ مشہور سے
"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" میں مرحب بن عبد القمر کی
حضرت عباس سے لڑائی۔ یا اس مرثیہ (دست خدا کا قوت بازو حسین ہے)
میں امام حسین سے ابو ... پہلوان کی لڑائی۔ مگر یہ مشرح لڑائی پہلوان کی دو چار

(۱) ایسی تحریر میں "گلگشت گلستان" حل کرنے کو انہیں ... اس "ہمہ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل" یا اس "مرحم ہے کس علم کا
مارہ آفتاب کی" سے دل کی ... ظاہر ہوتی ہیں + ۱۲ مؤلف عفی عنہ

مرثیوں میں اس خیال سے انہوں نے لکھ دی۔ کہ کوئی اُن کو اس امر میں کبھی عاجز نہ سمجھے۔ باقی عام طور پر اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلوان کی لڑائی میں زیادہ طول نہ دیا جائے۔ ورنہ تجربہ اس بات کا شاہد ہے۔ کہ مجالس عزا میں بہ صحبت لفظ خواں کے طولانی لڑائی پڑھنے پر رقت نہیں ہوتی۔ اور مرثیہ کی جو اصلی غرض مرثیت ہے۔ وہ فوت ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ ہر پہلوان کی لڑائی میں تمام حربوں نیزہ۔ تیر۔ تلوار۔ گرز وغیرہ کی مشرح لڑائی نہیں نظم فرماتے۔ مولوی صاحب ہر جگہ تو کتاب میں نیچر نیچر پکارتے رہے مگر اس موقع پر خدا جانے نیچر سے کیوں بیچر ہو گئے۔ کیا واقعی تقاضائے عقل یہی ہے۔ کہ ہر پہلوان نے تمام فنون جنگ دکھاتے ہوں۔ اور پھر امام حسینؑ یا اُن کے چار عزیز یا رفیق نے ایک ایک حربہ سے تھوڑے تھوڑے کے کام لیا ہو۔ ہرگز ممکن نہیں۔ صبح سے چار بجے شام تک کی لڑائی اور پھر اُس میں ایک ایک شیر خاندان رسالت نے سیکڑوں یا ہزاروں دشمن مارے (جیسا کہ تاریخیں پکار رہی ہیں*)۔ ایک ایک دشمن کے مقابلہ پر فنون جنگ دکھاتے۔ تو مہینوں ہو جاتے۔ پس کسی پہلوان کی لڑائی میں مفصل تمام حربات کا نقشہ کھینچیں۔ اور کسی کی جنگ میں یہ مختصر طور پر کہہ دینا کہ "تیغ اک ضرب میں وہ منکر توحید دو ہوا" مقتضائے حال کے موافق ہے۔ اور انہیں باتوں پر خیال کر کے ہمارے ملک کے اکثر اہل عقل فیصلہ کر چکے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہے۔ مولوی صاحب کے دماغ میں اب تک ان باریک خیالوں نے جگہ نہیں پائی ہے۔ جس دن بے جا طرفداری کی دھواں دھار گھٹا ہٹیگی۔ مولوی صاحب بھی بلاغت دبیر کے قائل ہو جائینگے۔ جیسا کہ خود مرزا مرحوم پیشنگوئی فرما گئے ہیں۔ ؎

---

* صرف امام حسینؑ نے دو ہزار سے زیادہ دشمنوں کو روز عاشورا قتل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ اور دیگر تاریخیں۔ ہاں یہ قرین عقل ہے۔ کہ کسی ایک دشمن نے طاقت ور پہلوان کو ملا [illegible] کی لڑائی میں عاجز کر کے قتل کیا ہو۔ ۱۲ مؤلف عفی عنہ

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے — میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے
کیونکر دُرِ یکتا کے خریدار نہ ہونگے — کونین میں ایسے دُرِ شہوار نہ ہونگے

(۳) صفحہ ۲۸ پر تو مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ میر انیس صاحب کے یہاں بھی اس صنعت رعایت لفظی کی بہتات ہے۔ لیکن اتنی احتیاط ہے۔ کہ ابتذال نہیں آنے پاتا۔ جس سے ناظر کتاب مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ میر صاحب کے یہاں مبتذل رعایت لفظی (ضلع جگت) نہیں ہے۔ مگر آگے بڑھ کر مولوی صاحب رنگ بدلتے ہیں۔ اور صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں۔ (چند اشعار میر صاحب کے لکھ کر) کہ ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے۔ یہ تناقص کہہ رہا ہے۔ کہ میر و مرزا پر بے جا اعتراض کرتے کرتے مولوی صاحب کا حافظہ کچھ جواب دے گیا ہے۔ میرے نزدیک میر صاحب کا کلام بھی بیجا رعایت لفظی (ضلع جگت) سے پاک ہے۔ اور مولوی شبلی صاحب نے [illegible] اردو کی باریکیوں سے ناواقف ہیں +

(۴) صفحہ ۲۱۴ پر مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں [illegible] شمشیر) میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں۔ اور غور سے دیکھئے۔ تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے۔ اس کا مختصر و معقول جواب یہ ہے۔ کہ اصول موضوعہ بلاغت (ایشیائی) کے موافق مرزا مرحوم کے مضامین عالیہ ہوتے ہیں۔ جو لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ کاملوں کے نزدیک وہ سب کچھ کہتے ہیں۔ ناقصوں کی رائے ناقص میں کچھ نہیں کہتے۔ (بقول میر مونس مرحوم ہے)

ہمارا مول کیا ہے اک نظر لطف و عنایت کی — جو اٹھے ہو تو ہونگے ہم جو بنا ہو رستے ہیں

(۵) اسی صفحہ ۲۱۴ پر چند دقیق اشعار مرزا مرحوم کے لکھ کر مولوی صاحب لکھتے

٭ ان اشعار کے لکھنے سے وقت اطول ہوگا (بعض معانی کی موشگافیاں [illegible] کردی ہے [illegible]
[illegible]

ہیں۔ کہ "خود انصاف کرو۔ یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم" میں کہتا ہوں۔ مولوی شبلی صاحب کے سر کی قسم تلوار کی تعریف ہے۔ اور اصول مقررہ بلاغت کے موافق شاعری کی معراج کمال ہے۔ اور جتنے کامل ہیں (جن میں سے ایک میر انیس صاحب بھی ہیں) ان سب کے یہاں ایسی تعریف موجود ہے۔ اور سب کے نزدیک یہ اعلیٰ درجہ کی مدح ہے۔ اگر ایسے مضامین خیالی و عالی قابل ذم ہیں۔ تو ہندی اور عرب و عجم سب ملزم ہیں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں۔ ہوائی طلسم اس کو وہی شخص کہیگا۔ جس کو ہوا زدگی ہو گئی ہو۔"

(۶) مولوی صاحب صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں۔ کہ "کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے۔ جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ نہایت مختصر ہیں"۔ پھر صفحہ ۲۹ پر (اور زیادہ نمک مرچ ملا کر بات کو چٹ پٹا بناتے ہیں) لکھتے ہیں۔ "اس موقع پر تمہیں شاید یہ خیال آئے۔ کہ میر انیس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں۔ لیکن اصلیت اور واقعیت سے بمراحل دور ہے۔ ..... معرکہ آرائی کے لحاظ سے اس (واقعہ کربلا) کی صرف یہ حیثیت ہے۔ کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے۔ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا۔ جو دفعۃً ٹوٹ پڑا۔ اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ ..... لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ شاعری میں اصلیت و واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ فرض کرو۔ کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں۔ تو اس سے فردوسی کے کمال شاعری میں کیا فرق آئیگا"۔ آگے چل کر مولوی صاحب طرفداران دبیر مرحوم کے زخم دل پر یوں نمک چھڑکتے ہیں۔ کہ "وہ واقعات بیان کرنے چاہئیں۔ جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو۔ صرف موہوم خیال بندی و لفاظی نہ ہو۔ جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہے"۔ ناظرین! میں کہتا ہوں۔ کہ موہوم خیال بندی و لفاظی ہو یا نہ ہو۔ مگر مولوی شبلی صاحب کی سی غلط بیانی اور اتہام و تناقض کلام میں نہ ہو۔*

* (جیسے نقص ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں۔ اور آئندہ بھی انشاء اللہ پایۂ ثبوت کو پہنچاؤنگا) اللّٰھم احفظنا منہا۔ ہیچمدان تاج

ہمارے مولوی صاحب کی کچھ عادت ہی ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہمارے ملک کے اکثر اہل علم وکمال جس راہ راست پر جا رہے ہوں۔ اُس پر وہ چلنا نہیں چاہتے۔ خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کسی نے اپنی لیاقت سے دُوسری سڑک تیار کر لی ہے۔ اور اپنی موٹر کو اُس پر لے جانا چاہتا ہے۔ تو لے جائے۔ مگر غضب یہ ہے۔ کہ اور سب جانیوالوں کو جو صراطِ مستقیم پر جا رہے ہیں۔ گمراہ بتانا بھی اُن کا شیوہ ہے۔ دبیر و انیس کو بالمقابل سمجھنے والوں میں (مولوی صاحب کو) خوب معلوم تھا۔ کہ کیسے کیسے علما، شعرا اور اہالی ملک کے تھے۔ مگر مولوی صاحب نے سب کو بد مذاق بنا ہی تو دیا۔ وہ تو ایک نئی اُپج تھی۔

دوسرا مذاق

اب یہ دُوسرا مذاق سُنئے۔ معرکہ کربلا کی حیثیت یہ ارشاد ہوتی ہے۔ کہ "سو سوا سو پیاسے بے سروسامان لوگ تھے۔ اُن پر تین چار ہزار کا مجمع دفعۃً ٹوٹ پڑا۔ تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہوگیا۔" اور اس سادگی وصفائی سے فرماتے ہیں۔ کہ سُننے والے کو بالکل اطمینان ہو جائے۔ کہ بس اتنی سی بات ہے۔ جس کو تمام مرثیہ گویوں نے بڑھا بڑھا کر شاہنامہ کی طرح زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ مگر مرزا دبیر میں یہ لیاقت بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو محض موہوم خیال بندی ولفاظی فرماتے ہیں۔ اس مضمون مولوی شبلی صاحب پر میں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر کتب تواریخ ومقاتل یہاں کوٹہ میں نہ ملتی تھیں۔ اس لئے فکر میں تھا۔ کہ یکایک فروری ۱۹۱۲ء کے پرچہ ماہواری "شیعہ" میں جناب سید ذوالفقار حسین خاں صاحب جونپوری* کا مضمون (اسی مضمون مولوی شبلی صاحب کی تردید میں) نظر سے گذرا۔ اس مضمون کی سُرخی ذیعلم مضمون نویس نے "ایک تیر دو نشانہ" لکھی ہے۔ جو موزون ومناسب معلوم ہوتی ہے۔ میں اب اس مقام پر اسی مضمون سے کچھ اقتباس کر کے (ذی علم مضمون نویس کے شکریہ کے ساتھ) درج کئے دیتا ہوں۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ اگر اور مرثیہ گویوں یا میر انیس نے اس معرکہ کو بڑھایا ہے

پرچۂ شیعہ ... جناب سید ذوالفقار حسین خاں صاحب جونپوری

* ان سید صاحب نے بھی موالتہ مولوی شبلی صاحب کا جواب لکھا ہے۔ خدا کرے وہ بھی جلد چھپے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

تو مولوی صاحب نے اُس سے زیادہ گھٹایا ہے۔ ایک پلہ اگر زمین پر ہے تو دوسرا آسمان پر۔ چنانچہ سید صاحب ممدوح لکھتے ہیں۔ کہ ناسخ التواریخ کا مصنف (جو حال میں بہت تحقیق سے لکھی گئی ہے) تعداد فوج یزید کی نسبت لکھتا ہے۔ کہ بڑا اختلاف ہے۔ ابن طاؤس و فاضل مجلسی بیس ہزار۔ ابو مخنف پرچہ نویس فوج یزید اسی ہزار۔ ابن شہر آشوب پینتیس ہزار۔ اعصم کوفی بائیس ہزار۔ یافعی بائیس ہزار۔ شارح شافیہ پچاس ہزار صاحب مطالب السئول بیس ہزار اور دیگر مورخین اس سے بھی زیادہ آٹھ لاکھ تک تعداد فوج کی لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد مورخ موصوف نے اپنی رائے میں باون ہزار فوج لکھ کر اس کی شرح مع افسروں کے نام کے لکھی ہے۔ تین چار ہزار کی تعداد ایک نے بھی نہ لکھی۔ مورخین یورپین بھی بیس ہزار سے کم تعداد نہیں لکھتے۔ پھر نہ معلوم مولوی صاحب نے یہ تعداد نہیں کہاں سے قائم کی۔ اب ایک بات اور سنئے کہ صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق جو لوگ لشکر یزید کے کربلا میں امام حسینؑ اور اُن کے بہادر ساتھیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں۔ اُن کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

نام شہید راہ خدا	مقتولین لشکر یزید	کیفیت
علی ابن حر غازی	۰	
حر ابن یزید ریاحی	۸۲	تیسرے حملہ میں قتل کیے دو حملہ میں جو ہوئے وہ نہیں معلوم ہو سکے
ایضاً	۵	قبل حملہ ہو سکے
بُرید ہمدانی	۳۱	

نام شہید راہ خدا	مقتولین لشکر یزید	کیفیت
وہب ابن عبد اللہ کلبی	۱۰۲	حملہ دوئم میں مقتولوں کی تعداد نہ معلوم ہوئی اس سے زیادہ ہوگی
مادر وہب	۳	
مسلم بن عوسجہ	۵۰	یہ صحابی رسول خدا ایک ضعیف العمر بزرگ ہیں
پسر مسلم بن عوسجہ	۳۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
ہلال ابن نافع بجلی	۹۳	
زہیر ابن قین	۱۲۰	
حجاج ابن مسروق	۱۵۰	
یحیٰی ابن کثیر	۵۰	
غلام ترکی	۷۰	
یزید بن زیاد	۵	فقط تیر سے، تلوار و نیزے سے اور مارے ہو گئے +
سیف ابن ابی الحارث	۵	
زیاد ابن مظاہر	۹	
ابراہیم ابن الحسین	۸۴	
علی ابن مظاہر	۷۰	
المعلیٰ ابن المعلی	۶۴	
طرماح ابن عدی	۷۰	
محمد ابن مطاع	۳۰	
جابر بن عروہ	۸۰	
مالک ابن داؤد	۶۰	
انجس بن معقل	۱	
عبد اللہ بن مسلم	۹۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
جعفر بن عقیل	۱۵	
عبد الرحمن بن عقیل	۱۷	
موسےٰ بن عقیل	۷۰	
احمد بن محمد بن عقیل	۸۰	
محمد بن عبد اللہ بن جعفر طیارؑ	۱۰	
عون بن عبد اللہ	۱۲	
قاسم بن حسن	۷۰	
عبد اللہ اکبر ابن حسن	۱۴	
احمد بن حسن	۱۹۰	
عبد اللہ اصغر ابن علی	۲۱	
عباسؑ ابن علیؑ	۸۰	صرف دریا جاتے وقت واپسی کے وقت اس سے زیادہ شدید لڑائی ہوئی ہے۔ اس میں اس سے بہت زیادہ ناری مارے ہونگے +
علی اکبر ابن الحسینؑ	۲۰۰	
امام حسینؑ	۱۹۵۰	صرف حملۂ اول میں ۲۲ حملہ امام حسینؑ نے فرمائے۔ باقی دو حملوں کی تعداد بھی نہیں معلوم ہو سکی اور ہر شہید کی لاش پر جاتے وقت جو مقابلہ و جہاد جناب فرماتے تھے۔ وہ سب اس کے علاوہ ہے +
میزان	۴۱۶۲	

ملا علامہ سید ہاشم بحرانی جو چوتھی صدی ہجری کے اہل سنت جماعت کے ایک مستند عالم ہیں۔ اور جن سے جناب شیخ مفید تہی سے مناظرہ بغداد میں ہوا تھا۔ انہوں نے ایک مقتل شہدائے کربلا لکھا ہے۔ اسمیں کہا ایک ہر ایک نام سین سیکڑوں دشمنوں کو قتل کرنا لکھا ہے۔ اور انکی کتاب پر حساب و خیال کرنے سے یہ جیار ایسے ہزار کتاب دو مقاتلین ملعون نمبر کی بہت ہی کم پائی جاتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

اور ان شہدا کے سوا باقی شہدا کی جنگ کی کیفیت لکھی ہے۔ لیکن مقتولوں کی تعداد نہیں لکھی۔ اور اُن باقی شہدا میں بڑے بڑے شجاع مثل حبیب ابن مظاہر اسدی و نافع ابن ہلال و پسران جناب امیرؑ و عقیل و جعفر طیار ہیں۔ پس مولوی صاحب کا تین چار ہزار لکھنا کس قدر خلاف عقل و نقل ہے۔ چار ہزار سے زیادہ تو اسی حساب سے مر چکے یا اگر تین چار ہزار ہی تھے۔ تو پھر امام حسینؑ کو کس نے قتل کیا +

فردوسی کے شاہنامہ کے واقعات کو کربلا کے واقعات سے کیا تعلق ہے۔ ہر ایک واقعہ کربلا کا حیرت خیز ہے۔ جس کی نظیر ہر حیثیت سے تاریخ عالم میں نظر نہیں آتی۔ نہ ایسے بہادر روئے زمین پر گذرے۔ نہ ایسے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سویرے سے لڑائی شروع ہوئی۔ تین چار گھڑی دن رہے تک برابر نو دس گھنٹے* تک تلوار برستی رہی۔ تلوار کی لڑائی گھنٹے دو گھنٹے ہر جگہ ہوتی ہے۔ پھر کسی ایک گروہ کی شکست دوسرے کی فتح ہو جاتی ہے۔ مگر اُن بہادروں نے نو دس گھنٹے تک ہزاروں کا مقابلہ کیا۔ یہ شجاعت عام لوگوں کے خیال میں خود فوق طاقت بشری ہے۔ پھر اس میں میر انیس مرحوم یا اور کوئی شاعر کیا مبالغہ کر سکتا ہے +

اس کے بعد ذی علم مضمون نویس نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کی مفصل لڑائی لکھی ہے۔ اور دکھلایا ہے۔ کہ اُس شیر بیشہ ہاشم نے ہزاروں کا مقابلہ کر کے اُن سب کو بھگا دیا۔ اور خون کے دریا بہا دئے۔ ایسے ہی اور بھی امام حسینؑ کے ساتھی تھے۔ مگر اکثر راوی وہی یزید کے لشکری ہیں۔ اس لئے صحیح تعداد مقتولوں کی ہم تک نہیں پہنچی۔ اور اُحد و خیبر و حنین و یرموک وغیرہ کی لڑائیوں میں لشکر اسلام کی قلیل فوج اور لشکر مخالف کی کثیر تعداد ہونے پر بھی فتح اسلام ہوئی۔ یہ دکھا کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ یہ سو سوا سو امام حسینؑ کے ہمراہی شیر کوفیوں کی کثیر فوج سے لڑنے اور فتح حاصل کرنے کے لئے کم نہ تھی۔ لیکن

* ۱۲ گھنٹے کے قریب دن ہوگا اس لئے دیا۔ ۱۰ دس گھنٹے تک لڑائی ہوئی کہ اکتوبر کا مہینہ تھا + مؤلف۔

فتح ظاہری سے اتنا نفع اسلام کو نہیں پہنچا۔ جتنا ان خاصان خدا کی شہادت سے پہنچا۔ اس لئے فتح نہ ہوئی۔ (المولفہ) ؎

باغ و بہار کر گئے ریتی کو دین کی ⁎ سینچا ہے اپنے خون سے کھیتی کو دین کی

پس مولوی صاحب کا تین چار ہزار آدمی لکھنا اور لڑائی کی حیثیت خفیف کر کے دکھلانا اس مثل کا مصداق ہے۔ کہ وہ علاوہ اور کمالات کے علم تاریخ میں بھی ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ مرزا دبیر صاحب پر جو مولوی صاحب نے عنایت فرمائی ہے اُس کا جواب مختصر یہ ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مرثیہ پر مجلسوں میں جو اثر ہوتا ہے۔ وُہ دُوسروں کے مرثیوں پر نہیں ہوتا۔ پس اس سے اُن کی مقبولیت و اثر ثابت ہوتا ہے۔ موہوم خیال بندی اور لفاظی ہرگز مرزا صاحب کے کلام میں نہیں ہے۔ مولوی شبلی صاحب نے شاہنامہ کے واقعات سے مرثیہ کے مضامین کو تشبیہ دی ہے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ مرزا مرحوم اس کی بھی تردید فرما گئے ہیں۔ ؎

شہنامہ نہیں مرثیہ سیف خدا ہے ⁎ گر شاہ و گدا ہُوں ہمہ تن گوش بجا ہے

مولوی صاحب کو یہ بھی خبر نہیں۔ کہ تاریخ و حدیث کے مضامین جس کثرت سے مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہیں۔ کسی مرثیہ گو شاعر کے کلام میں نہیں ہیں۔ اس کو مولوی صاحب موہوم خیال بندی و لفاظی سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ۔ مولوی صاحب تاریخ و حدیث میں بھی ایسے ہی ہیں۔ جیسے اردو کی شاعری میں ؎

لفاظی و موہوم خیال بندی

(۷) صفحہ ۲۳ پر میر انیس مرحوم کی غلطیوں و کمزوریوں کا ذکر کرتے ہُوئے فرماتے ہیں۔ کہ فردوسی و قاآنی جو قادر الکلام و پُر گو شعرا ہیں۔ اُن کے یہاں بھی اس قسم کی

اعتراض قادر الکلام شعراء

⁎ بعض خفیہ علم مضمون نگاروں نے یہ مضمون لکھ کر نتیجہ نکالا ہے کہ مرزا دبیر کے الہامی مضمون و معجزات پسند کارروائی (انکار شہادت امام حسینؑ) میں مولوی شبلی صاحب بھی کچھ شریک ہیں۔ دیکھو موازنہ انیس و دبیر لکھ کر مولوی صاحب نے اِدھر دبیر پر حملہ کیا اُدھر واقعہ شہادت کو خفیف کرنا چاہا۔ اس لئے ایک تیر اور دو نشانہ کا مصداق ہوا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اس لئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا چاہئے +

جناب شبلی صاحب کی عدالت عالیہ سے فردوسی۔ قاآنی۔ انیس تو قادر الکلامی کی بدولت بری ہوئے۔ مگر افسوس وہ شاعر اہلبیت بری نہیں ہوا۔ جس کا کلام فردوسی قاآنی۔ انیس ہر ایک سے بہت زیادہ (شاید دس گنا) ہے۔ نہ معلوم اُس کا گناہ کیوں ایسا سنگین ہو گیا ہے۔ اور ایسی تجویز کا نام بے جا طرفداری۔ ناانصافی۔ یا اور کچھ ہے؟

(۸) صفحہ ۴۲ پر جو کچھ زیب رقم ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مرزا دبیر کے یہاں الفاظ کا تناسب۔ ترکیب کی دلآویزی۔ برجستگی و سلاست بہت کم ہے۔ ایک لفظ بلند دُوسرا پست و مبتذل۔ کہیں صاف و سلیس۔ کہیں تعقید و بے ربطی۔ اکثر الفاظ دُھوم دھام کے ہیں۔ مگر حاصل کچھ نہیں + میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب تو کیا خاک انصاف فرمائینگے۔ کہ اُن کا دل ہی مرزا مرحوم کی طرف سے مکدر ہے۔ مگر ناظرین باتمکین! آپ میرے معروضہ پر غور و انصاف فرمائیے۔ جن شعرا کے دیوان یا کلیات چار چار چھ چھ جزو کے ہیں۔ اُن کے کلام میں چُستی و سُستی۔ بلند و پست۔ تعقید و تعقیب۔ بے ربطی و ربط۔ دُھوم دھام اور سادگی سب کچھ موجود ہے۔ پھر ایک ایسے شاعر اہلبیت (دبیر) کے کلام میں (جس کی ۲۰ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اور غالباً اتنا ہی کلام غیر مطبوعہ اور دُوسروں کے نام سے کہا ہوا چھپنے سے باقی ہے) اگر سُست و چُست کلام ہے۔ اور کچھ کلام میں بالفرض برجستگی و دلآویزی بہت کم ہے۔ تو کیا ستم ہے۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ باوصفیکہ مرزا مرحوم اپنے تمام معاصرین سے زیادہ پُرگو ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا کلام اچھا زیادہ ہے مبتذل کلام مرزا مرحوم کا مجھے بالکل نہیں ملا۔ مولوی شبلی صاحب نازہ و دیوبہ وغیرہ کو مبتذل

بے ربطی

سمجھے ہُوئے ہیں۔ یہ اُن کی ناواقفی ہے۔ اب رہی کلام میں بے ربطی۔ یہ عام طور پر اُن کے مرثیوں میں ہرگز نہیں۔ نہ اُن کے مرثیوں میں مسلسل قصّہ یا مثنوی کی شان ہے۔ نہ آج تک عام شعرائے مرثیہ گو (عرب وعجم وہندی) کے کلام میں مَیں نے مرثیوں میں تسلسل کی شان دیکھی۔ سب سے زیادہ (رُوئے زمین کے مرثیوں میں) ملا محتشم علیہ الرحمہ کے ۱۲ بند مقبول ہیں۔ جن میں سے بعض بند مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ میں لکھ دئے ہیں۔ اُن میں بھی ایسا تسلسل نہیں ہے۔ جس تسلسل کو مولوی صاحب یا اُن کے ہم خیال مرثیہ اردو میں ڈھونڈھتے ہیں۔ مرزا صاحب کے مرثیوں میں ایک بیان واقعہ تک مسلسل قائم رہتا ہے۔ پھر وہ ایک واقعہ سے دُوسرے واقعہ کی طرف گریز فرماتے ہیں۔ اُس موقع پر تشبیب و تخلص قصیدہ کا لطف آتا ہے۔ کس عمدگی سے ایک واقعہ کا وصل دُوسرے واقعہ سے فرماتے ہیں۔ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ بعض مرثیوں میں پڑھنے والوں نے کمی بیشی کر کے کچھ بے ربط کر دیا ہے۔ اور اصل مرثئے غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا مرحوم کے گھر بس باقی نہیں رہے ہے۔ جو جا بجا سے دستیاب ہُوئے۔ وہی دفتر ماتم میں چھپے۔ سو ایسی بے ربطی جناب میر انیس مرحوم کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ باوصفیکہ وہ جناب تسلسل کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ مگر جب اصلی مرثئے نہ رہیں۔ تو کیا کیا جائے۔ ؎

چہ نواں کرد مردماں اینند با ہمیں مردماں بباید ساخت

اور ایک لفظ یا مضمون شاندار و بلند اور دُوسرا پست اگر کہیں کہیں ہے۔ تو وہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ مرزا مرحوم ایک بشر تھے۔ معصوم نہ تھے۔ تعقید و تعقیب بھی ضرور کہیں کہیں ہے۔ کہ ہر شاعر بکر و قافیہ و ردیف کی پابندی سے بھی کبھی مجبور ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی خود اردو و نثر میں بھی الفاظ مقدم مؤخر بولے جاتے ہیں۔*

* جیسے اردو میں بولتے ہیں۔ ہم نے کہا کب تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

گو عام طور پر یہ رواج نہیں ہے۔ بایں ہمہ اتنا کہونگا۔ کہ جس کثرت سے تعقیدات وغیرہ اُن کے معاصرین مضمون آفرین شعرا کے کلام میں ہیں۔ اُتنی مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہرگز نہیں ہیں۔ اگر میں تمام معاصرین دبیر کے کلام میں سے ایسے عیوب اور کمزوریاں دکھاؤں۔ تو میری کتاب تاریخ طبری سے بڑھ جائے۔ اور ہر خاندان کے شاعر ناراض ہو جائیں اِس لئے اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے۔ اس کے بعد جو مولوی صاحب نے مرثیہ "اے دبدبہ نظم دو عالم کو ہلا دے" اور دو ایک اور مرثیوں کے چند بند لکھے ہیں۔ اور اکثر مصرعوں کو فرمانے گئے ہیں۔ کہ یہ بے ربط ہے۔ اِس لفظ کو اُس لفظ سے کیا تعلق ہے۔ یہ بھدّی ترکیب ہے۔ وہ سب مولوی صاحب کی خوش فہمی ہے۔ جن میں سے بعض بندوں کو بندہ نے شرح کر کے سمجھا دیا ہے۔ اِس سے زیادہ اِس کتاب میں لکھنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ سخن فہم ناظر کتاب خود انصاف کرلیگا۔ کہ مولوی صاحب جس لفظ کو غیر مربوط بتاتے ہیں۔ وہ مربوط ہے۔ علاوہ اس کے اسی زمانہ میں ایک کتاب لفظ بلفظ موازنہ مولوی شبلی صاحب کی تردید میں میرے دوست اور اُستاد بھائی جناب چودھری سیّد نظیر الحسن صاحب رئیس دھابن نے لکھی ہے* اس لئے بھی میں نے اپنی کتاب میں بعض جزئی اعتراضات مولوی شبلی صاحب کا جواب نہیں دیا۔ اس کتاب کا نام "المیزان" ہے اور اس کا ذکر خیر میں ایک اور جگہ بھی کر چکا ہوں۔ اور یہاں بھی عمداً دوبارہ کیا۔ تاکہ ناظرین اُس کتاب کو بھی دیکھیں۔ اور ذیعلم مؤلف کی محنت و کمال کی داد دیں +

اعتراض ۹ خلاف عقل

(۹) صفحہ ۲۶۱ پر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ کہ جناب سکینہ کے کہنے سے قبل از وقت سکینہ کو بھی یتیم سمجھ کر اپنے فرزند کے ساتھ اُن کا بھی جناب عبّاسؑ نے گریبان چاک کر دیا خلاف عقل و عادت ہے۔ کیونکہ وہ اُس محبت کے سبب سے جو اُن کو

*اس کتاب کی میں نے لکھنؤ میں شروع ۱۹۱۲ء میں مصنف کے پاس زیارت کی تھی جو ہمہ وجوہ مکمل تھی۔ شاید میری کتاب سے پہلے یا اس کے بعد ہی وہ بھی چھپ جائے (انشاء اللہ) + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب امام حسینؑ سے بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بند جس پر یہ اعتراض مولوی صاحب کا ہے حسبِ ذیل ہے:۔

روئے ناداں کی تقریر پہ عباسؑ کمال
اور کہا دل سے کہ اس کا بھی کرو رد سوال
بے پدر ہو گی کوئی آن میں یہ نیک خصال
چاک اُس کا بھی گریباں کیا با حزن و ملال
پیار جو آ گیا بنتِ شہِ دیں کے اوپر
بوسے دے دے کے ملی خاک جبیں کے اوپر

ناظرین! انصاف سے فرمائیے گا۔ کیا ایسا خیال آنا بھی محبت کے خلاف ہے۔ حضرت عباسؑ اپنے والد ماجد جناب امیرؑ سے سن چکے ہیں۔ کہ روز عاشورا ۶۱ھ امام حسینؑ ضرور شہید ہونگے۔ اور قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب میرے بعد اُن جناب کی شہادت ہو گی۔ پھر ایسا خیال کب خلافِ محبت ہے۔ مولوی صاحب تو ایسی وہم و وسواس کی باتیں کرتے ہیں۔ جو ہند و ستان کے وہمی بھی شاید نہ کریں +

اعتراض ۱۰ (۱۰) صہ ۱۶ پر مولوی صاحب مرزا صاحب کی اس بیت پر (جو جناب زینبؑ حضرت بانو مادر علی اکبرؑ سے خفا ہو کر فرما رہی ہیں۔

سب جانتے ہیں بنتِ جناب امیرؑ ہوں
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس کے حقیر ہوں)

سفیہانہ عامیانہ

ان الفاظ سخت میں اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ بطریقہ اظہار مقصد کا سفیہانہ اور عامیانہ اور جناب زینبؑ کی متانت و وقار کے خلاف ہے +

میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کو سفیہانہ و عامیانہ الفاظ لکھتے وقت کچھ شرم کرنا چاہئے تھی۔ اعتراض میں ایسی سختی مرزا صاحب تو مرزا صاحب مولوی صاحب کی شان کے بھی خلاف ہے۔ بقول حضرت غالب مرحوم

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

مرزا صاحب کے کلام کا مفہوم یہ ہے۔ کہ دیکھنے والے شاید یہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں تمہارے گھر میں رہتی ہوں۔ اس لئے اُن کی نظروں میں حقیر ہوں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔

چنانچہ اس کے بعد ہی کے بند میں تردیدًا فرماتی ہیں۔ ع گھر آپ کا نہیں مرے بھائی کا گھر ہے یہ۔ اس عامیانہ وسفیہانہ خیال ہی کو تو مرزا صاحب نے جناب زینبؑ کی زبانی دفع فرمایا ہے۔ افسوس آپ نے یہی بیت لکھکر اعتراض جڑ دیا۔ آگے کا بند یا کم سے کم ایک مصرع (مذکورہ) نہیں لکھا۔ جس سے یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ مَیں آپ کے اس طریقہ کو عامیانہ وسفیہانہ تو کیا بکار خویش ہشیار بھی نہ کہونگا +

(۱۱) صفحہ ۲۶۲ پر یہ بیت لکھکر کہ ؎

محبوب ہُوں خدائے ذوی الاحترام کا ۔۔۔ نانا ہُوں مَیں حسینؑ علیہ السّلام کا

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ کیا جناب رسول خدا صلعم بھی امام حسینؑ کا نام علیہ السلام کہکر لیتے تھے؟

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ اگرچہ یہ بیت مرزا صاحب کی تصنیف نہیں ہے۔ کیونکہ جس مرثیہ میں یہ بیت ہے۔ وہ تمام مرثیہ اور کسی کا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس موقع پر علیہ السّلام کی لفظ میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جناب رسولؐ خدا بلکہ خود خدا بھی اُن پر درود بھیجتا ہے۔ اولٰئك علیھم صلوٰة من ربھم ورحمة آیۂ قرآنی شاہد ہے۔ کہ خدا اپنے مصیبت زدہ پیارے بندوں پر صلوات بھیجتا ہے۔ جس کا مرتبہ سلام سے بھی اعلےٰ ہے٭۔ اور اس آیہ کے مصداق امام حسینؑ کو سمجھنے میں غالبًا مولوی شبلی صاحب کو بھی عُذر نہ ہوگا۔ اور جناب رسولِ خدا صلعم نے اپنی اہلبیت اطہارؑ کی نسبت جن میں امام حسینؑ بھی ہیں فرمایا ہے۔ کہ صغیرنا وکبیرنا سواء ہمارے چھوٹے بڑے برابر ہیں۔ اور عام مؤرخین اسلام وغیر اسلام لکھتے ہیں۔ کہ جناب

٭ جب خدا صلوٰة بھیجتا ہے۔ تو رسولِ خدا کا سلام بھیجنا کیوں نامناسب ہو سکتا ہے۔ رسولؐ تو خدا کے تابع اور بندۂ مقبول ہیں جن کے صلاق بنا صدا کے اصلاق کا پرتو ہے۔ خدا اپنے پیارے بندوں پر سلام بھی بھیجتا ہے۔ جن میں سے امام حسینؑ بھی ہیں رسول خدا کا سلام بھیجنا عین بلاغت اور مقتضائے حال کے موافق ہے ۱۲ مؤلف۔

رسول خدا صلعم اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ کی تعظیم کو سرو قد کھڑے ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب! خاص کسی فرقہ کے مذاق سے جب تک آپ آگاہ نہ ہوں۔ ہرگز اعتراض نہ فرمائیے۔ خاندان خدا کی شان کو عوام کی شان سمجھ کر اعتراض کیجئے۔ یہ اخلاق محمدی کے بالکل مطابق ہے کوئی ... خلاف ہو۔ اور یہ مقولہ جناب رسول خدا صلعم اُن جناب کی زمانہ حیات کا ... ہے۔ بلکہ بعد شہادت امام حسینؑ وقت دفن حضور صلعم امام زین العابدینؑ سے فرما رہے ہیں۔ اور ایسا اعتراض کرنے سے پہلے آپ کو یہ ثابت کرنا لازم تھا کہ مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز ہے۔ حالانکہ ایسا فرض بھی کر لیا جائے جب بھی (بوجوہ مذکورہ) اعتراض نہیں ہو سکتا ہے +

مرثیہ اور ڈرامہ

پہلا اعتراض ...

(۱۲) صفحہ ۲۶۲ پر یہ دو بند مندرجہ ذیل لکھ کر

یہ بات سُن کے بنتِ علیؑ نے گھونگھٹ اُلٹ لیا عبّاسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا
صدقے میں تم یہاں سے سرک جاؤ اک ذرا تم سب کے آگے روتے ہوئے آئیگی حیا
ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر جی بھر کے رولے تب بنے قاسم کی لاش پر[1]
ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بعد بکا کبرےٰ نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا
ہم کچھ کہیں جو مانئے اے شاہ کربلاؑ احسان ہوگا لاش کو رکھ دیجئے ذرا
بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں[2]

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ "مرزا صاحب اور دیگر تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم کی عادات و مراسم ہندوستان کی شرفا کے مستورات کے مطابق فرض کئے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت کبرےٰ کا اپنے چچا اور باپ اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے

---

[1] ایک بند اس موقع پر اور بھی لکھا ہے۔ مگر اعتراض اُس بند سے متعلق نہیں۔ اس لئے میں نے وہ بند نہیں لکھا + ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ بند مرزا صاحب کا نہیں ہے کسی ذاکر نے آخر کے سات بند ملائے ہیں۔ جن میں پہلا یہ بند ہے۔ مگر میں نے اس سے بحث نہیں کی ہے کہ کس کی تصنیف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ ع جس نے کہا درست کہا اور بجا کہا + ۱۲ مؤلف عفی عنہ۔

شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں۔ کس قدر بے حجابی اور شرم ہے۔ طرّہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں۔ کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئیگی۔ لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی"

جواب بہ تنبیہ میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی خوش فہمی کی یہ معراج کمال ہے۔ کہ وہ اس قول کا قائل "جی بھر کے رولے یہ بنے قاسم کی لاش پر" جناب کبریٰ کو سمجھ گئے ہیں۔ حالانکہ یہی مصرع اگر اُن کی زبانی ہوتا۔ تو یوں ہوتا۔ ؎ جی بھر کے رولوں میں بنے قاسم کی لاش پر۔ مولوی صاحب خود ہی یوں لکھ رہے ہیں۔ ؎ جی بھر کے رولے یہ بنے قاسم کی لاش پر۔ اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کا قائل کوئی دوسرا ہے۔ وہ کون؟ اُوپر کے بند ملا کر پڑھنے سے ثابت ہوگا۔ کہ اس کی کہنے والی جناب بانوؑ مادر فاطمہ کبریٰ ہیں۔ اُوپر کا بند مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی یا خدا معلوم کس خیال سے نہیں لکھا۔ وہ بند یہ ہے۔ ؎

ناگاہ کی یہ فاطمہ کبریٰ نے گفتگو — لوگو کوئی ذرا مرے والی سے پُوچھ لو
گھونگھٹ میں اُلٹوں بال میں کھولوں جو تم کہو — ماں بولی اب نہ شرم کرو سر کو کھول دو
سر ننگے تم کو جانا ہے انبوہ عام میں — چھینے گا شمر اوڑھنے آکر خیام میں
یہ بات سُن کے بنتِ حسنؑ نے گھونگھٹ اُلٹ لیا — عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا

یعنی حضرت بانوؑ نے صدا دی۔ کیونکہ انہیں کا مقولہ اُوپر سے چلا آتا ہے۔ (اس موقع پر میں یہ نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب کے سامنے آتے ہوئے شاید خوش فہمی کو بھی شرم آتی ہے۔ ورنہ اُن کے ہوا خواہ بگڑ جائینگے۔ کہ اُن کو ہماری سختی گو وہ جواب میں ہی ہو۔ نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب کی سخت کلامی نہیں دکھائی دیتی)۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ یہ جو کلیہ مولوی صاحب نے قائم کیا ہے۔ کہ تمام مرثیہ گویوں نے عادات و رواسم نسوان نسر فانی ہند کے موافق عادات اہل حرم کو فرض کیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مرثیہ گویوں نے اور خصوصاً جناب مرزا صاحب نے کہیں رواسم ہند کے موافق اور کہیں رواج عرب کے

رواج عرب

مطابق تخئیل فرمائی ہے۔ اگر حسب رواسم اہل ہند کے مطابق ہر جگہ تخئیل ہوتی۔ تو ہودج کجاوہ محمل کی جگہ سب مرثیہ گو پینس۔ ڈولی۔ رتھ۔ گاڑی وغیرہ لاتے۔ کہ ہندوستان کی شریف زادیاں ان سواریوں میں سوار ہوتی ہیں۔ حالانکہ تمام مرثئے دیکھ جائیے۔ کہیں ڈولی و پینس۔ گاڑی وغیرہ کا نام نہیں ہے۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ عرب کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح شرم نہیں کرتیں۔ بلکہ اس کو وہ مصنوعی و ریائی شرم سمجھتی ہیں۔ ہر ملکے و ہر رسمے مثل مشہور ہے۔ چنانچہ میں ۱۳۱۱ھ میں بمقام (بغداد) کاظمین شیخ علی و شیخ حسین صاحبان کے مکان میں مع مستورات کے ٹھیرا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ اور بھی ہندوستان کے شرفاء کے چند خاندان مقیم تھے۔ شیخ حسین صاحب کی جوان ناکتخدا بیٹی کو ایک روز اُن کے چچازاد بھائی پسر شیخ علی نے ایک جوڑی جُوتی لاکر دی۔ وہ ہماری عورتوں کے پاس دکھانے کو لائیں۔ ہماری عورتوں نے پُوچھا۔ کس نے تم کو یہ جُوتی دی۔ اور تم اُن سے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ تو اُنھوں نے جواب دیا۔ کہ یہ میرا دُولھا ہے*۔ عورتوں نے پُوچھا۔ تمھاری شادی ہوچکی ہے۔ کہا ابھی نہیں۔ صرف نسبت ہوئی ہے۔ عورتوں نے کہا۔ تم دُولھا کہتی ہو۔ اور اُن سے باتیں کرتی ہو۔ تمکو شرم نہیں آتی۔ اُس لڑکی نے جواب دیا۔ کہ ایسی مصنوعی جھوٹی شرم تم ہندیوں میں ہے۔ ہم میں یہ مکّاری سمجھی جاتی ہے۔ مولوی صاحب ایمان سے فرمائیگا۔ کتب احادیث صحاح ستّہ وغیرہ میں جو حدیثیں ازواج رسولؐ جناب امّ المومنین عائشہؓ وغیرہ سے مجامعت۔۔ پیشاب وغیرہ کے متعلق منقول ہیں۔ کیا ایک ہندی عورت ایسی باتیں بالخصوص مَردوں سے کہہ سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ رواج عرب کے موافق وہ سب باتیں کہی گئی

حکایت واقعی

* شیخ حسین و شیخ علی حبیب ابن مظاہر اسدی کی نسل میں سے صحیح النسب عرب ہیں۔ ہندوستان کی مرد عورتیں آئے دن اُن کے یہاں اُترتی ہیں۔ اس لئے اُن کی عورتیں اردو بھی اسی طرح بولتی ہیں جیسی عربی و فارسی۔ ہندی عورتوں سے وہ سلیس اردو میں بات چیت کرتی ہیں۔ ۱۲ ثابت ہیچمدان۔۔

ہیں۔ یہ تو مرزا صاحب کی کمال بلاغت ہے۔ مثل مشہور ہے۔ کہ قضیۂ زمین برسرِ زمین
جس ملک عرب کی شاہزادیوں کا حال وہ لکھ رہے ہیں۔ وہیں کی شاہزادیوں اور شرفازادیوں
کے رواج وعادات کو پیش نظر رکھکر تمثیل فرما رہے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ اکثر بلاد عرب
مصر و شام وغیرہ کی سیر فرما چکے ہیں۔ مگر خدا معلوم وہ سب آپ کی معلومات مرزا مرحوم پر
اعتراض کرتے وقت کہاں سفر کر جاتی ہے۔ یہ بھی سن لیجئے۔ کہ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا
بالکل ابتدائی مشق زمانۂ شیخ مصحفی کا ہے۔ جس پر بنڑی کی لفظ دلالت کر رہی ہے۔
یہ لفظ بعد کے مرثیوں میں مرزا صاحب نے ترک کر دی ہے۔ ابتدائی مرثیوں کے الفاظ
جوں کے توں رہنے دئے۔ کہ زمانہ تصنیف کا پتہ ایسے ہی لفظ سے ملتا ہے۔ اور
یہی جواب اُس اعتراض کا بھی ہے۔ کہ جو موازنہ کے صفحہ ۲۶۴ پر مولوی صاحب
نے کیا ہے۔ کہ جب فاطمہ کبریٰ نے اپنے بھائی امام زین العابدینؑ سے شہدا کے
دفن کے وقت کہا ہے۔ کہ ع بھائی صاحب مرے دُولھا کو بھی اب دفن کرو۔
یہ قول بھی رواج نسوان عرب کے مطابق ہے +

(۱۳) صفحہ ۲۶۶ پر یہ اعتراض اس مصرع پر ہے ع اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار
ہے بیمار۔ "اک بات پکڑ لی" عامیانہ و سوقیانہ طرز کی گفتگو ہے۔ میں کہتا ہوں
(اور سند دے کر اس لئے کہتا ہوں۔ کہ میری زبان ہے) کہ خاص محلات شاہی اور
شرفازادیوں کی یہ زبان ہے۔ ماشاءاللہ اولاد نواب ممتاز الدولہ مرحوم و اولاد
شاہزادہ والا قدر مرحوم اور ارکان خاندان شاہان اودھ اور اور شرفا لکھنؤ میں موجود
ہیں۔ سب سے پوچھ لیجئے۔ مرزا مرحوم کے مرثیوں میں محلات شاہی و شرفائے لکھنؤ
کی زبان سب بالاتفاق کہینگے۔ اور مرزا مرحوم کی زبان کی سند محلات شاہی
میں لی جاتی تھی۔ بلکہ جناب میر انیس مرحوم تو کبھی کبھی کوئی محاورہ فیض آباد
کا بھی نظم فرماتے تھے۔ اور کبھی کبھی خود بر سر منبر کہہ بھی دیتے تھے۔ کہ یہ جو اہل لکھنؤ

اعتراض (۱۳) سوقیانہ جواب

تھی نہیں ہوئے ۔ یہ خاص میری زبان ہے ۔ جس سے اُن کی مراد وہی فیض آبادی زبان ہوتی تھی * ناظرین! میں یہ بھی نہ کہونگا کہ مولوی صاحب نے (باوصفیکہ وہ زبان سے ناواقف ہیں ۔ مگر) یہ اعتراض عامیانہ کردیا +

اعتراض ۱۴۱

(۱۴۱) ص ۲۸۱ پر ایک شعر میر صاحب کا دوسرا مرزا صاحب کا حسب ذیل لکھا ہے :-

مرزا دبیرؒ	میر انیسؒ
مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب	پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب	ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اور لکھا ہے ۔ کہ معنوی حیثیت سے بھی میر صاحب کا شعر بڑھا ہوا ہے ۔ میر صاحب کے

---

* اس موقع پر واقعات انیس مؤلفہ میر احسن صاحب کے ص ۱۲ و ۱۳ کی تھوڑی سی عبارت نقل کردینا احسن معلوم ہوتا ہے ۔

اور وہ یہ ہے " میر انیس کی شاعری نے لکھنؤ پہنچ کر شہرت حاصل کی ۔ اس میں تو کسی کو کلام نہ ہوگا ۔ مگر اُن کی تربیت کیلئے لکھنؤ جولانگاہ نہ تھا ۔ یہ محاورہ ہم سے سُننے ۔ میر انیس کے بزرگوں کا سلسلہ ملازمت خاندان بہو بیگم صاحبہ برسوں رہا ہے ۔ اور لکھنؤ میں بھی مدتوں لا رجنگ کی نسبان اردو کا معیار مانی جاتی تھی فیض آباد میں محاورہ زبان و اصطلاحات و ضرب المثل وغیرہ کا ایک دفتر تھا جس کے میر منشی میر انیس کے جد امجد اور اُن کے بعد والد ماجد رہے ہیں ۔ یعنی جب کوئی محاورہ اردو کا محلات سے نیا تراش کر نکالا جاتا تھا ۔ تو اُس نصاب میں قلمبند ہوتا تھا ۔ کہ جس کی سر دفتری کی خدمت خاندان میر انیس کے متعلق تھی ۔ اس وجہ سے اُن کی تربیت و تہذیب کا معیار فیض آباد ہی میں قائم ہوچکا تھا ۔ اہل لکھنؤ کو اُن کی زبان سے فیض پہنچا ہے ۔ ایک اور استدلال بھی قابل تحریر ہے ۔ یعنی میر انیس مرحوم کو مجمع عام میں ہر شخص نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا ۔ کہ یہ میری اپنی زبان ہے ۔ حضرات لکھنؤ یُوں نہیں تحریر فرماتے ۔ یہ فخر اُن کو اُس دفتر کی بدولت حاصل ہوا تھا ۔ اہل دہلی میر انیس کے اِس قول سے اُن کی زبان و محاورہ کا انتساب دہلی سے کرتے ہیں مگر یہ فقط دل خوش کُن باتیں ہیں ۔ واقفان راز اس کو خوب جانتے ہیں " یہ عبارت میں نے واقعات انیس کی اس لئے لکھ دی ہے ۔ کہ میرے قول کی تائید ہوتی ہے ۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ دفتر فیض آباد میں تھا یا نہیں اسکی مجھے تحقیق نہیں + بہرحال اہل لکھنؤ کی زبان سے بعض محاورے اُن کے خلاف منسوب تھے + ۱۲ مؤلف حقیر ۔

یہاں مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مچھلی سیخ موج تک جست کے ساتھ
فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ سیخ پر
مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا۔ اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔

جواب — میں کہتا ہوں۔ ماشاء اللہ چشم بد دور۔ مولوی صاحب جو بات فرماتے ہیں۔ وہ اُلٹی
ہوتی ہے۔ معنوی و لفظی دونوں حیثیتوں سے مرزا مرحوم کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ اوّل
تو ایک شعر میں اُن کے یہاں کئی باتیں ہیں۔ (۱) ہر حباب کو تنور سے تشبیہ دی۔ جو
گولائی و گرمی کے سبب سے مناسب ہے۔ (۲) موج کو سیخ سے استعارہ کیا ہے۔
میر صاحب کے یہاں صرف ایک بات آخر الذکر ہے۔ دوم مرغابیاں پانی کے اُوپر
رہتی ہیں۔ اور موج بھی سطح آب کے اُوپر آتی ہے۔ پس فوراً کباب ہونے کا خیال اس
میں ظاہر ہے۔ اور اس راہ سے مبالغہ اس میں زیادہ ہے۔ جو بقول معترض صاحب
شعر کی جان ہے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بات کہاں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ جب مچھلی
اُبھر کر سیخ موج تک آتی تھی۔ جب کہیں کباب ہوتی تھی۔ مولوی صاحب کے فہم عالی کا
پھیر ہے۔ خیال کی سیخ ٹھیری تھی۔ اس لئے کباب اعتراض کچا رہ گیا۔

اعتراض ۱۵ — (۱۵) ص ۲۱۲ و ۲۱۵ پر فرماتے ہیں۔ کہ میر انیس بھی مذاق عام کی پیروی سے
اکثر بہکے ہیں۔ اور بے راہ نکل جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ مبالغہ و حسن تعلیل
وغیرہ جو چیزیں ایشیائی شاعری کی جان ہیں۔ اور مرزا مرحوم کے یہاں جس کی بہتات
ہے۔ اور میر صاحب کے یہاں بھی کہیں کہیں ہیں۔ انہیں چیزوں کو مولوی صاحب
بُرا سمجھتے ہیں۔ اور میر و مرزا کے ساتھ تمام ملک کو بد مذاق کہتے ہیں۔ خدا اُن کو راہ راست
پر لائے۔ یہ بد مذاقی نہیں ہے۔ خوش مذاقی ہے۔

وہ خود بہکا ہوا ہے جو انہیں بہکا ہوا سمجھے کہیں خضر بیابان بلاغت بھی بہکتے ہیں

اعتراض ۱۶ — (۱۶) صفحہ ۲۵۴ پر مرزا صاحب کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ تشبیہات کہیں

پہبتیاں بن جاتی ہیں + میں کہتا ہوں ۔ یہ ادّعا بھی بالکل غلط ہے ۔ مرزا صاحب ایک ذی علم ماہر فن شاعر ہیں ۔ اُن کی تشبیہات اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں ۔ کبھی پھبتیاں نہیں بنتیں تشبیہیں ۔ اُن لوگوں کے کلام میں پھبتیاں بنتی ہیں ۔ جو کم علم شاعر ہیں ۔ معانی و بیان سے ناواقف ہیں +

(۱۷) ص ۲۶۹ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھ کر ے

پھر ہاتھوں پہ اصغر کو سکھا کر کے یہ زاری
لٹکا دئے ہاتھ اُس نے ہمک کر گئی واری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آتے ہیں واری
اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری
پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلالوں
آ ۔ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالو

لکھتے ہیں کہ صغرے کا رخصت کے وقت علی اصغر کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت درد انگیز سماں ہے ۔ لیکن مرزا صاحب ایسے درد انگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے + میں کہتا ہوں ۔ کہ مرزا صاحب کا بند مذکورہ تاثیر درد سے بھرا ہوا ہے ۔ مگر افسوس مولوی صاحب کے دل پر اثر نہیں ہوتا ۔ میں اپنا دل کیونکر مولوی صاحب کے دل میں رکھ دوں ۔ کس غضب کا قدرتی نظارہ اس مصرع میں دکھایا ہے ۔ کہ ع لٹکا دئے ہاتھ اُس نے ہمک کر گئی واری ۔ بچہ جس سے ہلا ہوتا ہے ۔ اُس کی طرف یوہیں ہمکتا ہے پھر اُس ہمک کے ساتھ ہی ماں کا یہ کہنا ۔ کہ لو یہ خود گود میں آتے ہیں ۔ پھر صغرے کا ہاتھ اُٹھا کر یہ حسرت آمیز الفاظ میں کہنا ۔ کہ دیکھئے پھر میں جیتی ملوں یا نہ ملوں ۔ اور اُس کے ساتھ ہی "بلالوں" کا لفظ جو عورتوں کا خاص محاورہ ہے ۔ کس قدر حسرت سے بھرا ہوا ہے ۔ اور اُس کے بعد یہ کہنا ۔ کہ "آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں" کس قدر سلیس نظم ہے ۔ جس کو نثر کہیے ۔ تو ایک لفظ بھی نہیں بڑھ سکتا ۔ اُس کی نسبت مولوی صاحب فرماتے ہیں ۔ کہ تاثیر کا رنگ نہیں ۔ اور کیسا رنگ ہوتا ہے ۔ اس کے مقابلہ پر میر صاحب کا یہ بند لکھ کر ے

بند بلا تقابل میر صاحب کا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری — اصغر مرا روتا ہے سدا اس کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری — آ۔ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم — اصغر مری آواز کو پہچان گئے تھے

لکھتے ہیں۔ کہ میر صاحب نے پورا درد دل کس مؤثر طریقہ سے کہا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہہ کر رہ گئے۔ ع آ۔ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں۔ اور مرزا صاحب کا یہ مصرع اصغر کی طرف ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری۔ میر صاحب کے اس مصرع کے جواب میں ہے۔ ع وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری۔ لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ میر صاحب کے یہاں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کر دی ہے۔ اور ننھے سے مسافر اور چھوٹے مسافر والے دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے +

میں کہتا ہوں۔ یہ تو خدا کو علم ہے۔ کہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا جواب لکھا ہے یا مرزا صاحب نے۔ یا دونوں نے بطور خود فکر فرمائی ہے۔ اور ہر ایک لاجواب ہے۔ مولوی صاحب کا جو دعوے ہے۔ وہ بلا دلیل غیر مثبتہ ہے مصرع دونوں کاملوں کے اچھے ہیں۔ بیشک میر صاحب کے مصرع میں ہاتھوں کے ساتھ کانپنے کی قید اچھی اور مؤثر ہے۔ مگر اس کے ساتھ مرزا صاحب کا یہ کہنا کو "لٹکا دئے ہاتھ اس نے ہمک کر کئی بار" غضب کا مؤثر و درد انگیز قدرتی کنایہ ہے۔ اور دونوں مصرعوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ مولوی صاحب کے فہم عالی کا فرق ہے +

اعتراض ۱۸ میں ہم کا لفظ

(۱۸) ص ۲۴۴ ۲۴۴ و ۲۴۵ پر مرزا صاحب کی یہ ٹیپ لکھ کر ـــ

قطرے سے مگر کمتر ہیں میں صرف نہیں ہوں — دریا ہوں سخن کا میں تنگ ظرف نہیں ہوں

مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دوسرے مصرع میں میں کا لفظ محض فضول ہے۔ پہلے مصرع میں میں کا لفظ آ چکا ہے + میں کہتا ہوں۔ ہرگز محض فضول نہیں ہے۔ روزمرہ کی خوبی یہی ہے۔ کہ انسان اگر دس فقرے بولتا ہے۔ اور ضرورت ہوتی ہے۔ تو ہر جگہ

مَیں کہتا جاتا ہے۔ پس یہ تو نظم کی خوبی ہے۔ کہ (بقول حقیر ثابت) ؎

تحریر میں تقریر کا عالم نظر آئے تقریر میں تصویر کا عالم نظر آئے

اور اِس بات کا بیّن ثبوت کہ نثر میں ایسے قریب قریب "مَیں" بولتے ہیں۔ خود مولوی صاحب کی نثر مندرجہ موازنہ صفحہ ۲ ہے۔ کہ مولوی صاحب دو متصل فقروں میں دوجگہ "مَیں" کا لفظ لائے ہیں۔ وہ دونوں فقرے یہ ہیں۔ (۱) مَیں اُن سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکا۔ (۲) شعر العجم میں مَیں اِس مضمون کو انشاءاللہ نہایت تفصیل سے لکھونگا۔ دیکھئے پہلے فقرۂ متصل میں مَیں آچکا۔ اب پھر "مَیں" کیوں لائے۔ اِس کا جواب معقول یہی ہے۔ کہ روزمرّہ میں یُونہی بار بار "مَیں" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مولوی صاحب! آنچہ بر خود بپسندی بر دیگرے بپسند۔ آپ مرزا مرحوم پر اعتراض کرتے وقت ایسے جوش میں بھر جاتے ہیں۔ کہ وہ جوش تمام تجربات کو دماغ سے نکال دیتا ہے۔ اور یہ بھی خیال نہیں رہتا۔ کہ ہم خود کیا لکھ چکے ہیں +

اعتراض ۱۹ بے تعلق

(۱۹) اسی طرح صفحہ ۲۴۶ پر اس مرثیہ ؎ "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کے چار بند لکھ کر اور لفظ انا العبد کو خلاف سلاست اور مصرع "جان غیر بدن غیر۔ مکان غیر۔ مکین غیر" کو بیگانہ بتا کر فرماتے ہیں۔ کہ "یہ بند چہارم ؎

بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار خوابیدہ ہیں سب طالع عبّاس ہے بیدار

اُوپر کے بند سے دفعۃً اس قدر بے تعلق ہوگیا ہے۔ کہ مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ "ان" کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت عباس کا ذکر صرف پہلے بندوں میں آیا تھا جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے۔ اِس لئے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہیں ہوتا" + مَیں کہتا ہُوں۔ کہ نہ انا العبد سلاست کے خلاف ہے۔ نہ جان غیر الخ والا مصرع بیگانہ ہے۔ نہ "ان" کے مشار الیہ حضرت عبّاسؑ کے سمجھنے میں کوئی ذہن کو وقت و تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ معترض صاحب کی اصول مرثیہ سے ناواقفی ہے۔

جب اُوپر کے بندوں میں صاف معلوم ہو چکا کہ حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔ تو اب جہاں کہیں اُن یا اِن کے ضمائر آئینگے (بشرطیکہ قرینہ سے اور کوئی مشار الیہ ہو) وہی حضرت عباسؑ مراد لئے جائینگے۔ اس کے علاوہ دُوسرے مصرع میں حضرت عباسؑ کا نام موجود ہے۔ اضمار قبل الذکر اردو فارسی میں سلیس و فصیح ہے برخلاف عربی کے۔ پس یہاں بھی ان سے مراد وہی حضرت عباسؑ ہیں۔ جن کے حال میں تمام مرثیہ ہے۔ اور میرے پاس کے قلمی مرثیہ میں جو والد مرحوم کے ہاتھ کا (قلمی) تبرک ہے۔ اور غالباً چالیس برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں مصرع لوں (مقدم و مؤخر) ہیں:-

خوابیدہ ہیں سب طالع عباسؑ ہے بیدار بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار

اور غالباً مرزا مرحوم کے خاص بستہ کے مرثیہ کی وہ نقل ہے۔ اِس لئے وہی زیادہ صحیح ہے۔ اس صورت میں اضمار قبل الذکر بھی نہیں آتی۔ اور اعتراض ہی نہیں ہو سکتا۔ باقی جو "خوابیدہ" و "بے ہوش" الفاظ پر مولوی صاحب نے بے ربطی کا ادّعا کیا ہے۔ اُس کا مَیں بجز اس کے کیا جواب دُوں۔ کہ فہم عالی کا قصور ہے۔ صنعت طباق و تضاد کو جو جو شخص بے ربط کہے۔ اُس کا کیا علاج؟

(۲۰) یہ بات بھی قابل تحریر ہے۔ کہ مولوی صاحب نے اپنی کتاب کا نام موازنہ انیس و دبیر رکھا ہے۔ اور ۲۸۵ صفحے کی وہ کتاب ہے۔ پندرہ سولہ صفحے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھنے میں صرف فرمائے ہیں۔ باقی قریباً دو سو صفحہ پر کلام میر انیس مرحوم مع تنقید و مدح درج ہے۔ مرزا دبیر مغفور کے کلام کے واسطے فقط پندرہ سولہ ورق صرف کئے ہیں۔ اور اکثر وہ کلام لکھا ہے۔ جو اُن کے نزدیک قابل قدح ہے کیوں انصاف پسند ناظرین!! کیا موازنہ کی یہی شان ہے۔ اور اِس کتاب کو موازنہ کہ سکتے ہیں۔ مرزا دبیرؒ (جن کی مطبوعہ بیس جلدیں اور اسی قدر غیر مطبوعہ بتائی جاتی ہیں) کا کلام تو پندرہ سولہ ورق میں

تعریف: موازنہ

لکھا جائے۔ اور میر انیس مرحوم کے واسطے دو سو صفحہ وقف کئے جائیں (جنکی تصنیف مطبوعہ پانچ چھ جلدوں سے زیادہ نہیں ہے) - کیا یہی انصاف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ **بفرضِ محال** اگر کل کلام دبیر مندرجۂ موازنہ کبھی سُست ہو۔ جب بھی تو کمالات دبیر میں فرق نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ کلام تو کل کلام کا $\frac{1}{1000}$ حصّہ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی شاعر کے ۹۹ شعر اچھے ہیں اور ایک سُست ہے۔ تو کیا وہ شاعر قابل قدح ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ مولوی صاحب کا انصاف قابل غور و انصاف ہے +

کتابت کی غلطی اور میر انیس رح

(۲۱) **ناظرین!** تمام اہل علم عموماً اور وہ لوگ جن کو اپنی تصانیف چھپوانے کا کام پڑتا ہے خصوصاً اس بات کو خوب جانتے ہیں۔ کہ کاتب عموماً کم علم ہوتے تھے اور ہوتے ہیں۔ باوصفیکہ بڑے بڑے مطبعوں میں مصحح بھی نوکر ہوتے ہیں۔ اور عموماً کاپی و پروف کی صحت و درستی کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چھاپہ میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں کبھی کبھی کاپی نویس و مصلح سنگ اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ مگر ہمارے **مولوی شبلی صاحب** (باوصفیکہ تمام عمر گویا کتابیں چھپواتے رہے) ہم کو اس کی بھی عموماً اجازت نہیں دیتے۔ کہ جو مصرع غلط چھپا ہے۔ وہ ہم صحیح بتادیں۔ اور معترض مان لے۔ صفحہ ۲۰۲ و ۲۲۷ و ۲۳۰ پر فرماتے ہیں۔ کہ گو اکثر مرثیے غلط چھپے ہیں۔ مگر جو میر صاحب کی طرف سے میرزا محمد رضا صاحب معجز نے نسّاخ کے اعتراضوں کا جواب دے دیکر لکھا ہے۔ کہ صحیح مصرع یوں ہے۔ اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ ہر جگہ غلط نویسی کا عذر نہیں کام آسکتا۔ اگر اس کو وسعت دی جائے۔ تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوے کیا جاسکتا ہے۔ کہ یوں نہیں یوں تھا +

ناظرین باتمکین! مجھے اوّل تو اس موقع کو دیکھ کر یہ حیرت ہوئی۔ کہ مولوی شبلی صاحب یہاں مرزا صاحب کو کیوں فراموش فرما گئے۔ جیسے سرقات کے ذکر میں خطوط و صداقت میں مرزا دبیر کو لکھا تھا۔ یہاں کیوں نہ لکھا۔* غور کرنے سے اس کی

* کیونکہ مولوی صاحب شعر میں تو ہمیشہ مرزا صاحب کو مستثنیٰ کرتے آئے ہیں۔ اور صاحب سرقہ کے بیان میں گو ثابت نہ کر سکے مگر نام ضرور لکھ دیا۔ مولوی صاحب کو مرزا صاحب کی عظمت و بزرگی کا [illegible] ہے۔ کہ خطوط و صداقت میں مرزا دبیر کا نام [illegible] ثابت رضوی۔

وجہ یہ معلوم ہوئی کہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں جو دو جلدوں میں چند مرثیے اوّل مرزا مرحوم کے چھپے تھے۔ اور وہی مرثیے بعد کو دفترِ ماتم کی جلدوں میں جابجا چھپے۔ تو اُن اوّل کے مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند اور مصرع کے مصرع کچھ کے کچھ اور غلط سلط نظر آئے۔ اور ان مرثیوں (دفترِ ماتم) میں اکثر صحیح ہیں۔ یہاں تک کہ کاتب نے دو دو بندوں کو (جلدہائے نولکشوری میں) مختصر کر کے ایک بند میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً بندِ اوّل میں قافیے صابر۔ شاکر وغیرہ (تھے) اور بندِ ثانی میں داور۔ لشکر وغیرہ تھے۔ تو آٹھ مصرعے کے چار کر دئیے۔ ایک ٹیپ اُڑا دی۔ دو بند کا جب ایک بند ہُوا۔ تو وہ بند بھی بے ربط نظر آیا۔ اور قافیے بھی صحیح نہ معلوم ہُوئے۔ تو اب یقین ہو گیا کہ وہ پہلے کی کتابت محض غلط تھی۔ اور ہرگز مرزا صاحب ایسے ذی علم واقفِ رموزِ شاعری شاکر کا قافیہ لشکر نہیں لا سکتے تھے۔ اور مرزا صاحب کی نسبت اب ایسے اعتراضات کی گنجایش مولوی صاحب نے نہ دیکھی۔ کیونکہ نسّاخ کے اعتراضات انہیں مطبوعہ سابق مرثیوں کی بنا پر تھے۔ میرزا محمد رضا صاحب معجز کے جوابات قلمی مرثیوں کے مطابق تھے جو (مرزا صاحب کے) بعد کو دفترِ ماتم میں چھپ بھی گئے۔ تو دیکھنے والے کو دونوں مرثیے مطبوعہ سابق و حال دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی معجز مرحوم نے جو جوابات دئے ہیں۔ اور جس طرح صحیح مصرع بتائے ہیں۔ اُسی طرح دفترِ ماتم میں طبع ہُوئے اور صحیح ہیں۔ افسوس کہ میر صاحب کے مرثیے پھر کسی نے اِس قدر صحت کے ساتھ بھی نہ چھپوائے۔ جو مولوی صاحب کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اِس سے میری یہ مراد نہیں کہ دفترِ ماتم کے تمام مرثیے بالکل صحیح ہیں۔ اب بھی جابجا غلطیاں ہیں۔ مگر بہ نسبت مطبوعہ مطبع اودھ اخبار کے بہت کم۔ اور بعض غلطیوں کو تامل و غور سے صحیح المذاق ناظر درست کر سکتا ہے۔ خیر اب میں اس کا جواب دیتا ہُوں۔ کہ ایسی تاویلات پر (کہ کاتب کی غلطی ہے۔ مصنف نے یُوں نہیں۔ یُوں کہا تھا) ہر جگہ مرثیوں

جواب باصواب

(مطبوعہ مصنفہ انیس) میں اعتبار کرنا لازم ہے۔ اور اس کا فیصلہ میر صاحب کی علمی قابلیت پر ایک نظر کرنے سے آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کہ جو لفظ چھپ گیا ہے۔ وہ کاتب یا کاپی نویس وغیرہ کی اصلاح ہے۔ اور جو اُن کے ورثا یا تلامذہ کے پاس قلمی مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ مثلاً میر صاحب کے ایک قلمی مرثیہ میں ہے ع ناگاہ بجا فوج عدو میں دُہلِ جنگ۔ دُہل کو چھاپہ کے مرثیہ میں طبل لکھ دیا ہے۔ اور طَبَل بفتحتین لغت کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئیے۔ کہ میر صاحب نے دہل جنگ اپنے مرثیوں میں کہیں اور بھی باندھا ہے یا نہیں۔ جب مرثئے دیکھے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ میر صاحب نے دہل جنگ جا بجا باندھا ہے۔ پس جب کہ اُن کی علمی قابلیت بھی مسلّم ہے۔ اور وہی لفظ دُوسری جگہ اُن کے یہاں نظم بھی ہے۔ اور ایک قلمی مرثئے میں بھی تحریر ہے۔ تو ہم کو ضرور ماننا چاہئیے۔ کہ میر صاحب نے صحیح نظم فرمایا۔ مولوی شبلی صاحب یا نسّاخ یا اُن کے ہم خیال ہرگز ہم کو مجبور نہیں کر سکتے۔ کہ میر صاحب کو جاہل کہیں۔ اور اُن کی غلطی کو ہم قبول کریں۔ اور اعتقاد رکھیں۔ کہ جو کچھ غلط سلط چھپ گیا۔ وہی نوشتہ لوحِ محفوظ کی طرح صحیح ہے۔ اور ہر جگہ غلطی کتابت وطبع کے عُذر کو نہ مانیں۔

اب مَیں اسی موازنہ میں جو مصرع مجھے غلط معلوم ہوئے۔ اُن کو ناظرینِ بالمکین کو دکھانا چاہتا ہُوں۔ اور اِس سے یہ نتیجہ نکالتا ہُوں۔ کہ جب مولوی شبلی صاحب ایسے ذی علم (شمس العلما) ہو کر اس کثرت سے غلطیاں کر رہے ہیں۔ تو آج کم مایہ کاتبوں کی غلطیوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جن میں سے اکثر دستور الصبیان تک پڑھے ہُوئے تھے یا ہیں۔ یہ بھی کہدوں۔ کہ مولوی صاحب کو اس موازنہ مطبوعہ مفیدِ عام آگرہ ۱۹۰۷ء کی صحت بھروسہ ہے۔ ورنہ وہ باصحت نامہ (غلط نامہ) اِس کے ساتھ لگاتے۔ یا معذرت فرماتے۔ کہ اِس میں جا بجا چھاپہ

کی غلطیاں ہیں - اور یہ مطبع صوفی صاحب کا خوش خطی و صحت میں مشہور تھی ہے - باایں ہمہ یہ غلطیوں کی کثرت ہے - تو دوسرے معمولی مطبعوں میں کس قدر زیادہ غلطیاں ہوتی ہونگی +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
۱۱۲	تھی جتنے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے	تھی جن سے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے مصرع مطبوعہ بے معنی ہے +
۲۴۰	کہتے ہیں جسے عاشق شیدا ملک دناس	کہتے ہیں جسے عاشق و شیدا ملک دناس عاشق و شیدا کے درمیان میں داؤ یا لفظ اڑ گئے اس کی شرح اوپر میں لکھ چکا ہوں - اور یہ بھی بتا چکا ہوں - کہ دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے - اس لئے دو ہرے لفظ لائے ہیں +
۲۴۰	کفار بڑے طیش سے ہونٹوں کو دبا کے	کفار بڑے طیش سے ہونٹوں کو چبا کے دوسرا مصرع یہ ہے - ع دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے چبا دو دبا مقید قافئے ہیں - ورنہ پھر قافیہ غلط ہوگا - اور ہونٹوں کو غصہ میں چبانا محاورہ ہے ملنا نہیں ہے +
۲۴۰	اس سر پہ دھرے ہات یہ قسمیہ ابل ہے	اس سر پہ دھرے ہات یہ قسمیہ اجل ہے یہ باسٹھ دہ سے غلط ہے - یہ جملے نہ مشتبہ مکانہ سے چاہئے +
۲۴	منکر نکرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے	منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		مُنکر کی جگہ مُن کر لکھ دیا ہے۔ یہاں مُنکر سے مراد منکر کمالات دبیر سے ہے۔ جیسے مولوی شبلی صاحب +
۲۴۲	ملبوس قلم کا رند دوں ہے نہ پُرانا۔	ملبوس قلم کار نددوں۔ ہے یہ پُرانا "یہ پرانا" کو "نہ پرانا" لکھ کر مصرع کو بے معنی کر دیا +
۲۴۴	قرے سے مگر بحث میں۔ میں صرف نہیں ہوں	قطرے سے مگر بحث میں۔ میں صرف نہیں ہوں یہ مولوی صاحب کی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ کسی کم علم کاتب کی غلطی ہے +
۲۴۵	بے مہری افلاک سے گو خاک بسر ہوں۔	بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں "کیوں" کو "گو" لکھ دیا۔ مصرع بے معنی ہو گیا۔ اور پھر اعتراض جڑ دیا +
۲۴۸	اب رایت زباں سے علم کروں۔	اب رایت زباں سر منبر علم کروں۔ "سر منبر" کی جگہ فقط "سے" لکھ دیا۔ نساخ کے بعد مولوی شبلی صاحب معترض ہوتے۔ اکثر انہیں اعتراضوں کو لباس نو میں جلوہ دیا۔ اب کل کو کوئی تیسرے صاحب پیدا ہو گئے تو کہینگے مرزا صاحب نے مصرع ناموزوں کہا تھا +
۲۵۱	جوہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جُھنکائے	جوہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جھنکائے کنوئیں جھنکانا بفتح جیم ایک روزمرہ خاص

مصرع صحیح مع کیفیت	مصرع غلط	نمبر صفحہ
ہے۔ جھکانا بالضم لکھا ہے پیش بھی لگا دیا ہے۔ جو بے معنی ہے +		
مانند میم مرگ میان کمر گئی "میم مرگ" کی جگہ "سیم مرگ" لکھ دیا۔ سیم سے اور مرگ سے کیا مناسبت ہے۔ مرگ میں میم سرے پر ہے۔ کمر میں بیچ میں ہے۔ بیان کمر جانا صحیح ہوا +	مانند سیم مرگ میانِ کمر گئی	۲۵۱
بینی جبین ولب سے حسین و جمیل ہے حسین وجمیل مشہور لفظ ہیں۔ اُن کو حسینؑ وخلیل لکھ کر حسین پر علیہ السلام کا ؑ بھی لگا دیا۔ مصرع بلکہ تمام شعر مہمل ہو گیا۔ کیا عمدہ شعر ہے۔ سادہ بینی کا حسین وجمیل ہونا کس خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ کہ جبین بسرا مام بمنزلۂ عرش اور لب گویا سلسبیل ہے +	بینی جبین ولب سے حسینؑ وخلیل ہے سر پا رہے عرش زیر قدم سلسبیل ہے	۲۵۲
ہاروت تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا اُوپر اس کے یہ مصرع ہے۔ سے پر ذوالجناح صاف دھوئیں سے نکل گیا ہاروت وماروت دو مشہور فرشتے ہیں۔ ہاروت کا کنوئیں سے نکلنا ایک مشہور بات ہے۔ افسوس مولوی صاحب بائل کے طالبین (تابعین) اس کو بھی نہ سمجھے	ہاروت تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا	۲۵۳

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		اور پھر مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب بلند پروازی میں نظر نہیں آتے میں عرض کرتا ہوں کہ آپکے اعتراضات بیجا کی بارود کا دھوآں پھیلا دیا ہے۔ یہ ہٹے تو وہ نظر آئیں +
۲۵۳	کی خود سے خود نمائی سے زیب سر جھا یا دار قد پہ کفر کا بخت سپر چڑھا	کی خودِ خود نمائی سے زیبِ سر جھلا یا دار قد پہ کفر کا بختِ سیہ چڑھا خودِ خود نمائی کیسا لطیف استعارہ ہے "نے" کا لفظ اسمیں زیادہ کرکے غلط و بیمعنی بنا دیا۔ اسی طرح بختِ سیہ کو بخت سپر لکھا۔ اِس فہم کا کیا ٹھکانہ ہے +
۲۵۵	مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی	مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی۔ سب سین غیر منقوط سے ہے جسکو شین منقوط سے لکھ دیا ہے بیمعنی ہوگیا۔ اور شب قافیہ آ بھی چکا ہے۔ یہ بھی نہ سوچا۔ دن کو گویا رات کردیا +
۲۵۶	ہر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔	پھر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔ ہر سجدہ گاہ کیا معنی۔ اگر ہر سجدہ گاہ کہتے تو بن گئی کہتے کہ سجدہ گاہ مؤنث ہے۔ مگر خدا جانے مولوی صاحب اس کو بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ سجدہ گاہ کا رواج صرف فرقۂ شیعہ میں ہے سُنیوں کی اکثر باتوں سے وہ نابلد ہیں +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
۲۵۶	لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی	لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی "حُسن کی دولت" کو "رات کو دولت" لکھ کر دن کو گویا شب تار بنا دیا +
۲۵۷	فرماں نور بدر کو پہنچا بدر بدر	فرماں نجوم و بدر کو پہنچا بدر بدر "نجوم و بدر" کی جگہ "نور بدر" لکھ دیا۔ نہ جانے نجوم نے کیا قصور کیا تھا۔ جو اُن کو نکال دیا +
۲۷۵	پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے پیوں گا مولا	پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے میں لوں گا مولا دونوں پیونگا تھے مگر "لونگا" با ہم قافیہ ہیں۔ مولوی صاحب نے دونوں کو پیونگا لکھ دیا۔ قافیہ شربت کا گھونٹ سمجھ کر بھی گلے سے نیچے کھینچینگے کیونکہ ایسا بکلا شعرا کو اس ایطا کے عیب سے معاف رکھا جائے۔ جیسا کہ میر صاحب کو کہ چکے ہیں +
۲۸۰	گر میں بقول عمر و شمر ہوں گناہگار	گر میں بقول شمر و عمر ہوں گنہگار "شمر و عمر" کو "عمر و شمر" لکھ دیا۔ نہ سمجھے کہ شمر بکسر الشین ساکن المیم ہے۔ بفتحتین یا بجر ثانی غلط ہے۔ پہلے دہلی کے ایک مشہور شاعر نے یہی غلطی کی تھی۔ اور کہا تھا ع محب حسین کا دل رکھے شمر کا سا۔ اُس پر دہلی کے ایک مشہور شاعر نے کہا تھا سہ

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		شمر کو باندھا شمرؔ اس نسخے سے تو خوش ہوا اے طرف دار غلط یاں میم ساکن چاہیئے میں کچھ کہوں۔ تو طرفداران مولوی صاحب برا مانینگے۔ اس لئے خاموش ہوں +
۲۸۵	روشن پہ رکا زور ہے دنیاؤ دین پر	روشن پہ رکا زور ہے دنیا پہ دین پر اس لئے کہ دنیا و دین میں عطف ہے۔ اور حالت عطف و اضافت میں اعلان نون اُس زمانہ میں ناجائز تھا جب مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا ہے +

واضح ہو۔ کہ موازنہ مطبوعہ میں (**کلام انیسؔ و دبیرؔ میں**) ایسی بہت سی غلطیاں ہیں۔ میں نے چند غلطیاں جو بادی النظر میں معلوم ہوئیں۔ وہ لکھ دیں۔ کہ ان سے **مولوی صاحب** کی سخن فہمی کا بھی اندازہ **ناظرین سخن سنج و سخن آفرین** فرما سکتے ہیں۔ کہ صحیح المذاق سخن سنج چھوٹی غلطی پر غور کر کے اُس کو اکثر دور کر کے صحیح لکھا کرتا ہے +

اب خاتمہ کا بند یہ بھی سن لیجئے۔ کہ میں نے جو مولوی صاحب کی خوش فہمیوں یا غلطیوں کو نہایت واضح طور پر دکھایا ہے۔ اس کے بھی محرک خود مولوی صاحب ممدوح ہیں۔ کہ وہ موازنہ کے **صفحہ ۲۶۶ پر اعتراضات میر صاحب** کی سخن فہمی (ہیڈنگ) کی تحت میں لکھتے ہیں (جس موقع پر انہوں نے میر صاحب کے کمالات کا اعتراف کر کے اعتراض صحیح کی ضرورت بتائی ہے) کہ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں۔ ان میں ہزاروں ایسے ہوتے

ہیں۔ جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اور سلسلہ وہ سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔ مَیں کہتا ہوں۔ مولوی شبلی صاحب کا شمار بھی اکابر قوم میں ہے۔ کہ وہ شمس العلماء ہیں۔ مَیں نے بھی یہی خیال کیا۔ کہ مولوی صاحب کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا اثر زہر کی طرح قوم و ملک میں پھیل جائیگا۔ اور لوگ اُن کی غلطیوں کی تقلید کرنے لگینگے۔ اِس لئے اُن کی غلطیوں کو آفتاب کی طرح واضح کر کے دکھا دیا۔ اور آفتاب کے دکھانے کو یا اُن کو سمجھا۔ اب مولوی صاحب موصوف اور اُن کے ہوا خواہ چاہے مجھے داد دیں چاہے نہ دیں۔ مَیں اپنا کام کر چکا۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست　　　　وگر خاموش بنشینم گناہ ست

جن ناظرین حق آئین کی آگاہی کے واسطے مَیں نے یہ محنت اِس عالم ناپرسی میں کی ہے۔ اُن سے امید ہے۔ کہ مجھے بخیر یاد فرمائینگے۔ اور اگر واقعی مجھ سے کہیں غلطی ہوئی ہے۔ تو مجھے مطلع فرما کر ممنون احسان فرمائینگے۔ (اگر واقعی) میری برائے غلطی پر ہوگی۔ یا واقعات میں کچھ فرق ہوگا۔ تو مَیں انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں بشرطِ حیات بہت خوشی سے شکریہ لکھ کر درست کر دُونگا۔ ورنہ جواب باصواب دُونگا۔

اچھا۔ ناظرین۔ خداحافظ

اللہ بس۔ باقی ہوس

اب اَور باتیں سُنئے۔ جو حیات دبیرؔ سے متعلق ہیں۔

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و ناثر کامل جناب منشی سید افضل علی صاحب ضوؔ بدایونی مقیم لکھنؤ مصنف رد الموازنہ (شبلی صاحب) وارشد تلامذہ حضرت اوج مد ظلہ و سابق اڈیٹر ہمدم اخبار لکھنؤ:۔

کیا بشر سے ہو وصف ذات دبیرؒ
مستحق ہے مکاشفات دبیرؒ
عرفی و انوری و خاقانی
جب کہ واقع ہوئی وفات دبیرؒ
ہیں جو باہیس جلدوں میں مطبوع
غیر مطبوعہ کلیات دبیرؒ
خلف الصدق انہیں خدا نے دیا
لکھے کیا خوب واقعات دبیرؒ

تھے صفات ملک صفات دبیرؒ
عابد و زاہد و کریم و جلیل
ہیں یہ سب شاہد نکات دبیرؒ
ان کے بعد اہل نظم کی خاطر
مرثیے اور نوحہ جات دبیرؒ
ہوئیں پوری بفضلہ جو تھیں
حضرت اوج مثل ذات دبیرؒ
سال تالیف ضو کہو ہجری

جتنے ہیں اہل حق وہ قائل ہیں
حبذا خوبیِ صفات دبیرؒ
ساتھ ان کے ہوا سخن بھی تمام
بس ہے دنیا میں کائنات دبیرؒ
ہیں ورا ان کے مرثیے اکثر
دین و دنیا میں خواہشات دبیرؒ
میرے مشفق جناب ثابت نے
۳۰ ۵ ۱۳
زینت بارگہ حیات دبیرؒ

ایضاً

حیات انیسؒ اور اقوال شبلی
ہے رد کرتی ان سب کو تصنیف ثابت
ہے تاریخ ضو بہر سال مسیحی
۱۲ ۶ ۱۹
کہی میں نے ۔ **ممتاز تالیف ثابت**

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیرؒ نتیجہ افکار شاعر ماہر و خوشنویس جناب منشی سید واجد حسین صاحب صغیر لکھنوی کاپی نویس وارشد تلامذہ جناب فصاحت لکھنوی مد ظلہ العالی:۔

مجموعۂ کرم ہی افضل حسین سے
مضموں کی طرح جسم بھی اس کا کثیر ہے
شبلی کے اعتراض کا ایسا دیا جواب
چرخ سخنوری کا وہ ماہ منیر ہے

ظاہر وقار و شان کلام دبیرؒ ہے
بے عیب ہے اسی طرح ان کا کلام مدح
دیکھے جو معترض تو کہے بے نظیر ہے
اقلیم شاعری میں کیا اس نے روشنی

حالات ہیں دبیرؒ کے اس میں لکھے ہوئے
معصوم جیسے ذات جناب امیرؑ ہے
کیا ایسے مستند پہ سخن کا اعتراض
عالم فروز ایک یہ چراغ صغیرؔ ہے

کیوں فکر سال طبع کی ہجری نہیں ہے
۳۱ ۵ ۱۳
لکھو یہ نور شمع حیات دبیرؒ ہے

نتیجہ فکر شاعر کامل صاحب دیوان مطبوعہ (مسمی بہ پیمانۂ محبت) وغیر مطبوعہ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب فدا اکبرآبادی میر منشی محکمۂ پولیٹیکل ایجنسی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ۔ ارشد تلامذہ حضرت منشی غلام محمد خاں صاحب رہا اکبرآبادی مرحوم :-

قطعہ تاریخ تالیف

عجب عشرت افزا ہے صاحب دلاں — عجب شان دوراں حیاتِ دبیر

فدا - فکر ثابت کی کیجے ثنا — ہے تالیف کیا صیقلِ بے نظیر

ایضاً تاریخ طبع

زہے اندراج درسِ پُرضیا — زہے جوئے جود و خوشا مل پذیر — زہے فرحت افزا و بزم سرور

زہے تہذیبِ قصرِ صغیر و کبیر — چھپی خوب معقول و دلکش مدا — ہے اشعارِ موزوں حیاتِ دبیر

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ عالی جناب مولوی عبد اللطیف صاحب یکتا رئیس تعلقہ بھون و ناظم نظامت کشن گنج ریاست کوٹہ راجپوتانہ :-

ماشاء اللہ ثابت رنگیں نگار — ہے گل بے خار باغ اوج کا — طرفگی ہے سرسری تالیف رقم

جس کا ہر یک لفظ ہے بینش فزا — ہستری میں جلوہ گر ہے بے حجاب — شکلِ حالات دبیرِ خوش نوا

فکر سے پایا جو سالِ اختتام — خلد سے آئی یہ رضواں کی صدا — عرض او یکتا مؤلف سے یہ کر

شور ہے مینو میں اس تالیف کا

۱؎ یہ تاریخ جناب یکتا کے مؤرخ یکتا ہونے پر دال ہے۔ فکر کی یہ معراج کمال ہے۔ کہ ہر مصرع میں عیسوی یا ہجری یا بکرمی سال ہے۔ اور پھر اس قدر بے تکلف مصرع۔ سبحان اللہ واضح رہے۔ کہ ہمزہ کا عدد لینے کا قاعدہ نہیں ہے۔ اسی خیال سے مؤرخ باخبر نے بجز ماشاء اللہ کے ہمزہ کا عدد نہیں لیا ہے۔ ملاحظہ ہو عدد تاریخ گلشن خیال وغیرہ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۲؎ مینو زبان فارسی میں بہشت کے معنی پر مستعمل ہے۔ مینو اس کا مخفف ہے۔ مینو جو اس سے متعلق ہے۔ اردو میں بھی بعض خوشنما باد کو مینو سواد کہتے ہیں۔ مثلاً ملک مینو سواد جیسا آباد بولا جاتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

قطعۂ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجۂ فکرِ عالی جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل منصرم آب پاشی ریاست کوٹہ۔ ملک راجپوتانہ:۔

ثابت ہوا کمالِ مؤلف جہان پر | جب حضرتِ دبیر کی اشعا لکھی گئی | تاریخ کی تلاش تھی دل کو کہ دفعۃً

آئی فلک سے کان میں آواز ہاتفی | اب چھوڑ انصرام کو بسمل یہ کہدے صاف | تالیف ہے یہ مولوی افضل حسین کی

۱۷۱۲-۳۸۲ باقی ۱۳۳۰ ہجری

رباعی تاریخ تالیف کتاب حیات دبیر مصنفہ شاعر نازک خیال باکمال نواب سید عسکری مرزا خاں صاحب بلیغ لکھنوی:۔

ہے مثل قلم بند ہے۔ تقریر دبیر | ثابت کی عبارت ہے کہ تحریر دبیر

کیا خوب لکھی سوانح عمری۔ واہ | دیکھو۔ اک اک ورق ہے تصویر دبیر

قطعۂ تاریخ تالیف کتاب حیات دبیر مصنفہ جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس زید پور ضلع بارہ بنکی۔ ملک اودھ۔ شاگرد رشید حضرت اوج مد ظلہ:۔

نکتہ داں۔ ثابت تخلص۔ خوش بیاں۔ افضل حسین | شاعر سرکار محبوب خدا۔ مداح آل

کرد نذر ناظریں۔ مجموعۂ حالِ دبیر | تازہ شد گویا حیاتش در زمانِ انتقال

آفریں۔ صد آفریں۔ اے مدح خوان پنجتن | داشتی یکسو حواس خمسہ را تا پنج سال

سالِ تالیفش فراست۔ از سر انصاف گفت | روشنیٔ طبع ثابت۔ نیرِ اوجِ کمال

۱۹۱۲ء = ۱۹۱۱+۱

قطعۂ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجۂ فکر عالی جناب مولوی سید یونس حسین صاحب یونس زید پوری شاگرد رشید حضرت اوج مد ظلہ:۔

ثابت کرد تالیف کرد۔ ایں کتاب فرح سا | الآ۔ ثابت ست آں۔ کز اہل تمیز ست

رقم کن۔ نپئے سال تالیف یونس | حیات دبیرم ز جانم عزیز ست

قطعۂ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و عالم کامل یادگار مغفور زند شیرصاحب نجوم استماع

جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی دام فضلہ :-

ضرورت آج زمانے کو جس کی تھی ثابت
دکھائی ہے وہی تصویر واقعات دبیر

لکھا عزیز نے یہ مصرع سنِ تدوین
۳۰ ۱۳
ہے شمعِ بزم ادب - جوہرِ حیات دبیر

قطعہ تاریخ تالیف نتیجہ طبع عالی جناب مولوی سید محمد جعفر صاحب قدسی جائسی - شاگرد رشید جناب مولانا صفی لکھنوی مظلہ :-

سید افضل حسین - مہر ضیا بار علم
ثابتِ گردون مقام - اخترِ سیّار علم

جس نے حیات دبیر - لکھ کے اک احسان کیا
خلق پہ روشن کئے - جلوہ اسرار علم

قدر شناسانِ فن - قدر کرینگے ضرور
تحفت ہے - گنجینۂ درہم و دینار علم

مُردہ دلوں کے لئے - مایۂ عیش و نشاط
کرتی ہے دل باغ باغ - نزہتِ گلزار علم

مسطر زینت طراز - سلک دُر آبدار
زیب فزائی بیاض - گوہر شہوار علم

رُوح نہ کیوں تازہ ہو - ایک نظر دیکھ کر
صفحۂ قرطاس پر - جلوۂ انہار علم

شاہد معنی ہے ایک - یہ صف ہر دلعزیز
مصرِ جہاں میں ہوئی - گرمیٔ بازار علم

جرعۂ کشمکش انبساط ہر منظر اشتیاق
ساقی ساغر بکف جلوۂ سرشار علم

قدسیٔ رنگیں بیاں - تو بھی ہے گل چیں فکر
ہو گل تازہ کوئی - طرۂ دستار علم

زیب نشاں بلند مصرع تاریخ ہو
۳۰ ۱۳
حصنِ حیات دبیر مطلع انوار علم

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر و نتیجۂ فکر جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی - مؤلف کتاب فلسفہ صرف و نحو - شاگرد رشید حضرت نفیس مرحوم :-

اوج او منشیٔ فلک داند
چہ رقم میکنم صفات دبیر
ہمہ گیر است طرز دلکش او

یادگار رند واقعات دبیر
شش جہت محرم مسدس او
جدتِ فکر کائنات دبیر

اشکار ست قوت عملش
در سخن مستتر نکات دبیر
۱۰
چوں سر یا دبرد - وشنہ گوت

۳۰ ۹۲
جام جمشید شد حیات دبیر

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ عالی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی رئیس صاحب ضلع متھرا و شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ و مصنف المیزان (جواب موازنہ شبلی صاحب) ثابت کی ہے۔

حیات دبیرؒ
ذکر ناموس آل اطہرؑ ہے
یعنی مرزا دبیرؒ نیک سیر
جس کا انداز سب سے بہتر ہے
جس کے مصرع ہیں رشک دُرّ عدن
اُس کی تیغ زباں کا جوہر ہے
ہے بیانِ مصائب شبیرؑ
جس کا ہر اک بشر ثنا گر ہے

جس کا چرچا جہاں میں گھر گھر ہے
حال اُس ذی شرف کا لکھا ہے
ذکر جس کا ہر اک زباں پر ہے
جس کی ہر ایک نظم ہے پُر درد
جس کی ہر نظم سلک گوہر ہے
سر بسر پاک ہے کلام اُس کا
حالِ ذرّیتِ پیمبرؐ ہے
انتخاب کلام ہے اس میں

کیوں نہ دل سے اُسے پسند کریں
جو سخن سنج ہے سخنور ہے
سب سے اعلیٰ ہے جس کا طرز کلام
جس کا ہر لفظ تیر و نشتر ہے
جس کو کہتے ہیں لوگ حسنِ کلام
مدح خاصانِ ربِّ اکبر ہے
کیا حیات دبیر کی ہو صفت
تحفہ ذاکران سرور ہے

سال تالیف ہے یہ مصرع فوق
۹۳ ۵ ۳۰
بے بدل۔ بے مثال دفتر ہے

قطعہ دیگر از جناب فوق رضوی موصوف:۔

خوب ہے حضرت ثابت کی یہ تصنیف لطیف
کون ثابت؟ جو ہے ذی منزلت و ذی رفعت
اُس کی شہرہ مرقع پہ ہیں لاکھوں شیدا
ذکر ملاح حسینؑ ابن علیؑ ہے اُس میں
کر دیا۔ ایک جگہ جمع یہ بے مثل کلام
طبع عالی نے بہت خوب کیا کار ثواب
جس قدر اس کی ثنا ہو۔ وہ بجا ہے۔ بیشک
اس کا ہر باب ہے خوبی و لطافت سے بھرا
نکہت افزا ہے ہر اک شعر مثالِ سنبل

جس کے پڑھنے سے ہر اک شخص کا دل شاداں ہے
صاحب فضل ہے۔ ذی قدر ہے اور ذی شاں ہے
اُس کی تصنیف پہ ہر ایک کا دل قرباں ہے
مومنوں کے لئے اس واسطے حرز جاں ہے
سچ یہ ہے شاعروں پر انکا عجب احساں ہے
یہ صحیفہ۔ سندِ مغفرتِ عصیاں ہے
اس کی جو مدحت و توصیف ہو۔ سب شایاں ہے
بہتر و دلکش و بے مثل ہر اک عنواں ہے
ضو فشانی میں ہر اک لفظ۔ مہِ تاباں ہے

جس کے ہر سطر پہ ہے تختِ گلشن کا گماں ۔۔ جس کے ہر لفظ میں بوئے گلِ تر پنہاں ہے
یاالٰہی سب سے مقبول یہ تصنیف لطیف ۔۔ جب تلک چرخ پہ خورشیدِ مبیں تاباں ہے
اسے ذوب ہے نسخۂ بے مثل ۔ ہے سالِ تصنیف ۔۔ کیوں نہ بے مثل ہو ۔ فرحت کا عجب ساماں ہے
اور تاریخ جو چاہی تو یہ ہاتف نے کہا ۔۔ لکھ دے اے فوق سخنور ۔ گُہرِ غلطاں سے ہے

قطعہ دیگر مشعرِ سالِ تالیف حیاتِ دبیرؒ از جناب فوق موصوف :-

ہذا ۔ ثابت کی تصنیف لطیف و بے بہا ۔۔ جس کی شہرۃ ہے ہر اک سو جس کی ہر جا دھاک ہے
اس میں حال اُس کا ہے جو ہے شاعرِ شبیرِ بے ہمال ۔۔ عالمِ دیں ۔ ذاکرِ سبطِ شہِ لولاک ہے
ہے بہا و طرفہ زیبا نظم ۔ لکھو اس کا سال ۔۔ اور خواہش ہو تو لکھ دو ۔ ارمغانِ پاک ہے

ایضاً

خوب لکھی حضرت ثابت نے یہ نادر کتاب ۔۔ جس سے نکھتے ہو گئے شعر و سخن کے منجلی
جس کے نظارے سے ہوتا ہے معطر سر دماغ ۔۔ جس سے جی ہوتا ہے خوش ۔ اور کھلتی ہے دل کی کلی
ہے سنِ تصنیف کی خواہش تو لکھ اے طبعِ فوق ۔۔ بے بہا ہے ذکرِ مداحِ حسینؑ ابن العلیؑ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجۂ فکر صوفی صافی طینت صاحب ذوق سلیم مولانا سلیم اللہ صاحب سلیم مقیم ریاست بھرت پور :-

نبیرہ مولوی سید افضل حسین
ز مکنون خاطر بکاغذ فگند
بہیں نامۂ دل کشا دل پذیر
عبارت بہ تسخیرِ معنی ۔ کمند
سلامت روی بندہ اش خانہ خیز
معاذیست اندیشہ را شہر بند
بہ تحقیق چوں داد تحقیق داد
معانی پژوہ و حقیقت پسند
عبارات خویش ہمہ دل نشیں
گزیں رشحۂ خامۂ ارجمند
بر و خرمن خوش بیانی نثار
متانت رضا جوئے سنے بلند
بہ بیند لخت از جبینہ نیر جواب
بہ ہر موز ہر بو سے تحسیں کنند
ہمہ راستی داستانِ دبیرؒ
خیالات پاکش سراپا چمند
معانی بہ الفاظ کرسی نشیں
از و مایۂ شاعری بہرہ مند
نکات پسندیدہ دلفریب را
مخالف ازاں گشت زند و نژند
بتاریخ ترتیب گفتم سلیم
حیات دبیر فصاحت پسند

قطعہ تاریخ تالیف کتاب حیات دبیرؒ نتیجہ افکار جناب شیخ قربان علی صاحب قربانؔ۔ ساکن ڈبائی ضلع بلند شہر مقیم و مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ۔ شاگرد رشید مؤلف کتاب:۔

عجب دلکش و دلچسپ ہے حیات دبیر
مؤلف اس کے ہیں استاد میرے ذی رفعت
جناب سید افضل حسین ثابت نام
ہے تراجم اہل کمال اور شاعروں کا حال
جو سال عیسوی کی فکر۔ میں نے کی قربان
دبیر کون؟ کہ مدّاح چار دہ معصومؑ
کہ جن کے فضل کی ہے آج اہل علم میں دھوم
جنہیں سمجھتے ہیں۔ ارباب علم و فن مخدوم
اسی کتاب کے پڑھنے سے ہو گیا معلوم
کہا یہ دل نے کہ لکھ۔ ذکر خیر اہل علوم

۱۹ ۱۲ ع

قطعہ تاریخ تالیف نتیجہ افکار سالک مسالک طریقت صوفی صافی طینت جناب شاہ محمد عبد الحلیم صاحب حلیمؔ۔ صاحب دیوان مطبوعہ:۔

شاعروں کی بزم کے صدر انجمن
صاحب فن سخن۔ روشن ضمیر
نکتہ سنجاں جہاں کے پیشوا
مرثیہ گو۔ مرثیہ خواں بے نظیر
یہ ضرورت تھی کہ اردو نثر میں
کیوں نہ ممنوں ہر بشر تا ہو بہم
زینت ایوان نظم دل پذیر
آسمان برتری کے ماہتاب
ملک معنی و بلاغت کے امیر
ہر طرح کی نکتہ چینی سے بری
آپ کے حالات ہوں زینت پذیر
اُن کی لائف جب مرتب ہو چکی
مطلع پُر نور خورشید کلام
اوج معنی کے لئے مہر منیر
منقبت گوئے امیر المومنینؑ
کون؟ یعنی حضرت مرزا دبیرؒ
حضرت ثابت نے یہ احساں کیا
بے مثال و بے عدیل و بے نظیر

۱۳ ھ

غیب سے آئی ندا مجھ کو حلیم
مہبط تحقیق حالات دبیرؒ

قطعہ تاریخ ترتیب و تالیف حیات دبیر مصنفہ سالک تسلیم و رضا و فا صاحب مرید حضرت نلاق بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (مقیم کوٹہ):۔

مجسم روح دانش۔ جان بینش
چراغ محفل بزم اسلام
نہ پوچھو کچھ عبارت کی لطافت
سراپا قابل تعظیم و اکرام
جناب ثابت عالی گہر نے
کہ ہیں مداح اس کے خاص و عام
گل گلزار علم و حلم و تہذیب
لکھا حال دبیر نیک انجام
بتا دیں سلک مروارید خوش آب

کہ چشمۂ معانی کا کہوں جام ۔۔۔ جواب اچھے دئے ہیں معترضوں کو ۔۔۔ نہیں منت پذیر جم کے شکستہ جام

وفا کو تھی تلاشِ سالِ ترتیب ۔۔۔ کہا دل نے ۔ چراغِ بزمِ الہام

قطعۂ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید محمود حسن صاحب ثاقب دہلوی شاگرد رشید مؤلف (و برادر زادہ و تعلیم یافتہ و شاگرد رشید جناب سید محمد زکریا خاں صاحب زکی ارشد تلامذہ حضرت غالب علیہ الرحمۃ مرحوم) وکیل درجہ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :-

جناب مولوی افضل حسین ثابت نے ۔۔۔ لکھے ہیں خوب ہی دلچسپ واقعات دبیر

مؤلف اس کے ہیں استاد محترم میرے ۔۔۔ جو فن شعر میں گویا ہیں آپ اپنی نظیر

یہ نشرِ طرہ تاج کمال ثابت ہے ۔۔۔ قلم کی تیغ سے ملک سخن کیا تسخیر

فصاحت اور بلاغت سے خوب لکھنے نکات ۔۔۔ سند میں آیۂ قرآں بھی کر دئے تحریر

دئے ہیں معترضوں کو جواب بھی معقول ۔۔۔ مثال آب رواں پاک صاف ہے تقریر

لکھوں وہ مصرع تاریخ عیسوی موزوں ۔۔۔ کہ جس کو پڑھ کے ہوں محظوظ سب صغیر و کبیر

صلائے ہاتف غیب آرہی ہے لکھو ثاقب ۔۔۔ ایسے اہل سخن عنصر حیات دبیر

قطعۂ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید ریاض الحسن صاحب ریاض ۔ ساکن قصبہ اول ضلع متھرا وکیل درجہ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :-

ملک پر حضرت ثابت نے یہ احسان کیا ۔۔۔ لکھے تحقیق سے حالات دبیر مرحوم

ہجری و عیسوی سنہ کی ہے مجھے فکر ریاض ۔۔۔ دل یہ کہتا ہے ۔ کہ تاریخیں ہوں دو دو مرقوم

شغل کا لفظ لکھو ۔ تو ہو عیاں ہجری سال ۔۔۔ شغل بے مثل لکھو ۔ عیسوی سنہ ہو معلوم

قطعۂ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ کرم و مخلص بے ریا عالی جناب بابو عبد القادر صاحب ندا اکبر آبادی ۔ اسسٹنٹ انجنیر ریاست کوٹہ ۔ راجپوتانہ :-

حضرت ثابت !! بڑا احسان کیا ۔۔۔ لکھ کے سچے سچے حالات دبیرؔ ۔۔۔ دی عطارد کو ترقی ماہ و مہر

کر دئے روشن کمالات دبیرؔ ۔۔۔ ناخنِ تحقیق سے حل کر دئے ۔۔۔ عقدۂ نظمِ خیالاتِ دبیرؔ

تحقیق تعریف ہے ساری کتاب	خاص کر جیبیدہ مقالات دبیرؔ	کردیا ثابت کہ اردو نظم پر
عالم میں جو موجود حالات دبیرؔ	اے ندا تم سال تدوین کتاب	۱۳۰۳ لکھ دو۔ نو تحقیق حالات دبیرؔ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ جناب منشی فاضل مولوی عبد الستار صاحب مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ :-

عیسوی ۱۹۱۲ع (ب) بسکہ تالیفات نظم شاعر عالی دبیر	ہجری ۱۹۶۹ بکرمی (ط) کردہ بافیض عروض اہل جہاں را کامگار
۱۳۲۳ف (ع) یاد باد این شغل ثابت شد پسند اندر جہاں	۱۳۳۱ ہجری (ی) یاد کن تذکیر و قل تاریخ بہر نامدار
۱۳۱۹ بنگلہ (ظ) ظلم من بہ زین نباشد شان گلزار سخن	۱۸۳۴ سالی (ش) شاد عاشق زین عروس نو عذارش مشکبار
۱۳۲۰ فصلی ۱۳۲۲ فصلی (غ) غنچہ نادر با وج است ہم ریاض نو بہار	۱۹۱۲ع ۱۳۳۰ (غ) غیرت افکار شد اعجاز مرغوب آشکار
۱۳۳۱ ہجری حرف ہر مصرعہ بشند تاریخ سال اہل نیز	۱۹۱۲ع ۱۹۱۲ع نظم موضوع و ریاض گلرخاں آمد بکار
۱۳۲۳ف ۱۹۱۲ع عیسی تاریخ ہمایوں غیرت گلزار جام	۱۳۳۱ ہجری ۱۳۱۹ بنگلہ بانشد تاریخ فن پس ہم باغ نو بہار

قطعہ تاریخ طبع مصنفہ شاعر کامل و طبیب حاذق عالم علوم معقول و منقول عالی جناب حکیم مولوی محمد مظہر اللہ صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ۔

آں نثر نواز ساز تصنیف	کو شاعر و ناثر دل آراست	آرائش مسند محبت
زیبائش منزل تمناست	ہم طوطی خوش نوائے گفتار	ہم بلبل بوستان انشاست
ہم پردہ کشائے جلوۂ غیب	ہم جلوہ نمائے حسن معنیٰ ست	نامش افضل حسین ثابت
نہ حیاست کہ اسم بامسمیٰ ست	بنوشت حیات، آں سخنور	مشہور جہاں دبیر یکتاست
وادست دبیرؔ را حیاتے	ہم طرح بمعجز مسیحاست	ترتیب بطرز نو نمودہ
جفتے بزبان خوش گویاست	اقوال لطیف تر از ارواح	احوال صحیح تر ہمہ راست
ہم نثر و عبارتش دل آویز	چوں آب حیات ہم مصفاست	بینش ز فروغ او منوّر
کحل البصر جواہر آماست	ز الفاظ مہذب و مرصع	تہذیب مصنفش ہویداست
از گوشش ترنم سمعنا	آواز زباں دل اطعناست	معنی ست بہ یوسفی ہم آغوش

چشمش بہ ہلاک دل زلیخاست
لطفش ز وفور ناشکیبی
انداز ادا قبول دلہاست
تکرار تجلّی الٰہی
ہم تازی و پارسی مہیاست
تا نور سخن جہاں فروزست
تا گوش بحسن صوت شیداست

حسنش ز کمال دل فریبی
برہم زن رونق تماشاست
توضیح معانی و بیان ست
انوار تقدس و تعالےٰ ست
تا اہل سخن کنند فیصل
تا گفت و شنود را ہیولاست
تشریف قبول خلعتش باد

چشمک زن حسن روئے لیلاست
اسلوب بیاں لطیف و دلکش
ایں وصف ز بہر چو ملتہا ہویداست
در بزم سخن ز ہند و انگلینڈ
بر صدر کدام جلوہ فرماست
تا حسن قبول فرع حسن ست
ایں ست دعا ہمیں تمناست

این ست سہیل سال طبعش　　۱۳۱۰　　تقویم دبیر بے کم و کاست　۱۳

قطعۂ تاریخ طبع نتیجۂ افکار گہر بار شاعر ذی وقار جناب سید نظیر الحسن صاحب فوقؔ۔ بدر شید تلامذۂ حضرت اوجؔ دامت برکاتہٗ۔ مدرس مدرسۂ صاحب ضلع متھرا و مصنف المیزان (جواب موازنۂ مولوی شبلی صاحب)۔

لکھا ہے ثابتؔ نے حال اُس کا
کلام ہے ہر طرف کو مشہور

جو شاعروں میں ہے فرد و یکتا
یہ ہاتف غیب نے سنایا

ہر ایک جانب ہے جس کا شہرہ
اگر سن طبع کی ہے خواہش

تو جلد اے طبع فوقؔ لکھ دے　　۱۳۱۰　　حیات مرزا دبیر مبرور　۱۳

قطعۂ تاریخ طبع از نتائج افکار گہر بار شاعر قوم کامل فن جناب مولوی سید علی نقی صاحب المعروف بہ مرزا صفیؔ لکھنوی دام نوالہ سررشتہ دار صاحب ایڈیشنل جج لکھنؤ۔

جناب سید افضل حسین ثابتؔ ما　　بحسن بسکہ چو کرد ایں جریدہ را تحریر
صفیؔ رقم زدہ تاریخ طبع آں نسخہ　　انیس فکرت اہل ہمم حیات دبیر　۱۳　۶　۱۹

قطعۂ تاریخ طبع حیات دبیر نتیجۂ فکر شاعر غرا ہجتی جناب سید یونس حسین صاحب یونسؔ معروف زیدی شاگرد رشید حضرت اوجؔ مد ظلہ:۔

کرد تالیف کرد ایں کتاب مشکلے　　۱۱۱ تا بہ سال ست آں کز اہل تمیز است

سالِ طبعش رقم کرد یونس | | حیاتِ دبیرم زجانم عزیز است

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر نتیجہ افکار مداح آل محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی ارشد تلامذۂ جناب عارف دامت برکاتہم۔

مشفق من ثابت شیوا بیاں
ہے ضیائے صور خامے کی صریر
ہیں یہ جس کے واقعاتِ زندگی
منقبت خوانِ امیر ابن امیر
کشتِ زارِ نظمِ دلکش کے لئے
والہ و شیدا ہر اک برنا و پیر
نام زندہ کر دیا مداح کا

خوب لکھی یہ کتاب دل پذیر
واقعہ ہر ایک لکھا ہے عدیل
تھا وہ مداح شہ گردوں سریر
مرثیہ گوئے حسینؑ تشنہ کام
طبع جس کی صورت ابر مطیر
جو ہے وہ شانِ بلاغت پر نثار
دے صلہ ثابت کو اے ربّ قدیر

ہو گیا جس سے کما حقہ کمال
معنی و مفہوم جس کے بے نظیر
اکمل دوران دبیرؔ نکتہ سنج
دعبل و حسان کا گویا ہم صفیر
وہ سخن دلکش کہ پڑھتے ہی جسے
جو ہے وہ طرزِ فصاحت کا اسیر
لکھ دو محشرؔ مصرعِ تاریخ طبع

عزتِ مجلس ہیں حالات دبیرؔ

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر نتیجہ فکر عالی جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس قصبہ جہانگیر پور ضلع بارہ بنکی۔ ارشد تلامذہ حضرت اوج مدظلہ۔

بفضل خدا شد افضل حسین | چہ خوش کرد ثابت صفات دبیرؔ | دل افروز و جاں پرور اہل دل
زہے دفتر وصف ذات دبیرؔ | پے سال طبعش فراست نوشت | بگو نعمت حق حیات دبیرؔ

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر مصنفہ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل منصرم آبپاشی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ:۔

لکھی ہے جس کی حضرت ثابت نے ہسٹری | | تلمیذ خاص تھا وہ جناب ضمیرؔ کا
بسمل کو سال طبع کی ہاتف نے دی خبر | | ہے شور مرثیوں میں حیات دبیر کا

یہ ماتیں [illegible] جس کو ترتیم میں بھی لکھ چکا۔ اب پھر لکھتا ہوں مگر عزیز ست کو بعض بغیر الف اسمت کے لکھتے ہیں بعض [illegible] کے قلیلم [illegible] متعلق ہے تا [illegible] یا ایک ہی صحیح ہے [illegible] تاریخ بالبعث تاریخ طبع دو [illegible] ہیں یہ بھی ان کے کمال کی دلیل ہے [illegible] حقیر ثابت

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ فکر عالی شاعر غرا جناب مولوی عبد الطیف صاحب المتخلص یکتا دام مجدہ۔ رئیس تھانہ بھون و ناظم نظامت کشن گنج ریاست کوٹہ سوار شد تلامذہ جناب امراؤ مرزا صاحب انور مرحوم و جناب فصیح الملک داغ دہلوی:۔

زندہ ہوا ہے نام حیات دبیر سے	مداح خاندان جناب امیرؑ کا
یکتا نے سال طبع بھی لکھا ہے بے بہا	ہے قدسیوں میں ذکر حیات دبیرؔ کا

(بعد تخرجہ ۸) ۱۹۱۳ء عیسوی

ایضاً ولہ

ثابت کریں گے خوب کمال دبیرؔ کو	امید نغمی یہ ثابت عالی جناب سے
لائف میں واقعات عجیبہ کئے رقم	تصحیح کر کے بعض فضیلت مآب سے
دل چسپ اس قدر ہیں مضامین نو بنو	مشکل ہوا ہے آنکھ اٹھانا کتاب سے
جانکاہ سے جناب مصنف کو دیکھ کر	نکلا ہے مرحبا۔ دہن شیخ و شاب سے
چھپ کر اس آفتاب سے نکلی یہ ہسٹری	گویا کہ ماہ نو نکل آیا سحاب سے
یکتا نے جب سوال کیا سال طبع کا	تاریخ ملا ہاتف حاضر جواب سے
	۱۳ ۶ ۹
کہدے کہ انطباع کی تاریخ ہے یہی	ظاہر ہوا ہے اوج دبیر اس کتاب سے

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مؤلفہ جناب سید علمدار حسین صاحب واسطی سررشتہ دار اسپیشل مجسٹریٹی (پٹیالہ) متوطن قصبہ ہنوڑ ریاست پٹیالہ۔ ملک پنجاب:

میر افضل حسین ثابت نے	کی حیات دبیر جب تحریر	کھل گیا۔ گلشن معانی تو	
بن گیا صفحہ صفحہ خلد نظیر	موشگافی سے کر دیا روشن	مطلب شعر۔ مثل مہر منیر	
کیا بلاغت کی شرح فرمائی	اور معانی کی خوب کی تفسیر	ہے سراپا ثبوت ذوق سلیم	
مرثیات کی بااثر تحریر	سال تاریخ پوچھا ہاتف سے	فکر تاریخ تھی جو دامن گیر	
		۳۰ ۱۳	
آواز آئی واسطی لکھ دو	خوب لکھی زہے حیات دبیر		

تقریظ جناب مسٹر ہیرالال سود۔ بی۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس متخلص بہ شیدا۔ رئیس آگرہ (مائی تھان) و سب جج کورٹ ملک راجپوتانہ۔ عالم علوم فارسی و انگریزی و سنسکرت و شاعر ہر سہ زبان اردو

انگلینڈ کے وسیع نظر فلاسفر اور پاکیزہ خیال عالم مسٹر تامس کارلائل کا قول ہے۔ کہ "دنیا کے تمام سچے پیغمبر اور شاعر اور حکمراں ایک ہی مادے کے بنے ہوتے ہیں۔ ان سب کا انکاس علم و راستی کے ایک ہی لایزال منبع سے ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ہی سوتے سے نکلنے والے چشموں کے پانی مختلف سرزمینوں پر بہنے کی وجہ سے جدا جدا تاثیریں حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اہل عالم کے سچے رہبر او رہنماصان خدا مختلف حالتوں میں پرورش پانے کی وجہ سے مختلف ضروریات دنیا کو پورا کرنے کی غرض سے علیحدہ علیحدہ صورتیں اختیار کر لیتے ہیں+

دنیا کے تمام جاندار چھوٹے اور بڑے تکلیف سے بچنے اور آرام حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ نیکی خوشی کا موجب اور بدی تکلیف کا سبب ہے۔ راستی اور ناراستی کی نہایت خوفناک جنگ ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک رہیگی۔ راستی وکیل خدا ہے۔ اور اُس کی امداد کے لئے سچے اور قابل تکریم ہیرو وقتاً فوقتاً نمودار ہوا کرتے ہیں۔ یہ زبردست لیڈر (راہ نما) حسب ضرورت مختلف قسم کی وردیوں اور بھیسوں میں ظاہر ہوتے ہیں+

جسمانی دماغی۔ روحانی ترقی جماعت انسانی کی بہبودی کا سبب ہوتی ہے۔ اور انہیں تینوں حالتوں کا تنزل موجب زوال قرار دیا جاتا ہے۔ ان تینوں ضروری پہلوؤں میں سے ایک کا بھی گر جانا رہتی کی فوج کو کمزور کر دیتا ہے۔ پس جس قوم کی کمزوری صورت پذیر ہوتی ہے۔ اُسی کی درستی کے قابل لیڈر بارگاہ الٰہی سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اور وہ میدان کارزار میں آکر ناراستی کو مغلوب کرتا ہوا خدا کے

پاک کام کی تکمیل کرتا ہے۔ جب دُنیا میں ظلم و تشدد کا بے انتہا زور ہو جاتا ہے۔ اور ایک بھائی دُوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو کر اُس کی جان و مال کو پامال کرنے لگتا ہے۔ اور ہر طاقت ور آدمی کلاہِ کج سر پر رکھ کر اپنے سے کمزور آدمیوں پر بیجا حکومت کرتا ہے۔ اور ہر کام اپنی نفس پرستی کا ذریعہ بنا تا ہے۔ تو ایک سچا ظلِّ اللہ درگاہِ باری سے مامور کیا ہوا بادشاہ عالم کی اسٹیج پر آتا ہے۔ اور تمام جھوٹے اور مصنوعی حکمرانوں کو نیست و نابود کر کے انسانی جماعت کے جسمانی پہلو کو مادی تکالیف سے نجات دیتا ہے ✦

انسان ایک عجیب و غریب جانور ہے۔ جب اُس کی جان و مال کی حفاظت کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور وہ کچھ دنوں شکم کی نیند سو لیتا ہے۔ تو اُس کا سر پھرا تا ہے۔ اور اُسے قسم قسم کے عیش و عشرت کی سوجھنے لگتی ہے۔ اس عیش کے متوالے کی دُنیاوی لذتوں سے تعلق رکھنے والی خواہشیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں۔ کہ اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اپنی ناجائز ضروریات کی فراہمی میں معبودِ حقیقی کی جانب سے امداد نہ پاتا ہوا بہت سے جھوٹے اور فرضی معبود گھڑ لیتا ہے۔ جو اُسے کبھی تو اُن برے والی خواہشوں کے سرسبز ہونے کے انتظار میں تھکا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح سچے بادشاہوں کے نعم البدل کی بدولت جسمانی موت سے بچا ہوا آدمی رُوحانی موت کا شکار بن جاتا ہے۔ اس برے حملے پر جو نجات دلانے والا لیڈر منجانب اللہ بھیجا جاتا ہے۔ اُسے پیغمبری کی وردی عطا ہوتی ہے۔ وہ جہالت کے تاریک غار میں پڑے ہوئے انسان کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتا ہے۔ اور بے حقیقت معبودوں کی حقیقت سے ماہر کرتا ہوا اُن کو اسرارِ حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اس طریق پر راستی کے سیدھے راستے پر لگ کر برسوں کے بچھڑے ہوئے مُسافر رُوحانیت کی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں ✦ جس وقت انسان کی جسمانی اور رُوحانی حالت ترقی کر جاتی ہے۔ اُس کے اندر حصولِ علم اور تحقیقات کا مادہ زور کرتا ہے۔ اُس کا دل اُمنگ پر آکر باریک سے باریک جذبات کا لطف اُٹھاتا ہے۔ اُس کی حس کی قوت انتہائی زور دار ہو کر اُس کو ہر چیز کی اصلیت کے جاننے کی کوشش میں سرگرم کرتی ہے اور انسان کی تنہا کوشش مشکل سے کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور اس نے اُس کے واسطے اس موقع پر

پہنچنا ہے اداؤ پہنچتی ہے۔ اس مرحلے پر رہبری کا معتبر کام شاعر کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اور جیسے کسی ساحل سے سمندر میں جذبات کی گہرائیوں تک پہنچ کر باریک سے باریک چیز کی اصلیت نکال لاتی ہے اور اس کو واقعی صورت اہل دنیا کے روبرو پیش کر دیتی ہے۔ ہم سب جو عوام کے زمرے میں داخل ہیں۔ نیچر کا صرف سطحی نظارہ کرتے ہیں۔ اور شاعر کی نظر اس کی اندرونی حالتوں کا بھی مشاہدہ کر لیتی ہے۔ شاعر کی دردی پہن کر عرصہ عالم میں نمودار ہونے والے ہیرو کی مدد سے ہم دنیا کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ماہیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس کا نفع اور نقصان اور نیک و بد ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔ ہم ہر شے کے واجبی استعمال کرنے کے لائق بن جاتے ہیں۔ پس ہر سچا شاعر ہماری دماغی ترقی اور اخلاقی نجات کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی لئے علمائے عالم کی نظر میں شاعر پیغمبروں سے کم رتبہ نہیں رکھتا۔ اور سچ پوچھو۔ تو شاعر کا کام پیغمبروں کے کام کے مقابلہ میں کچھ کم بھی نہیں ہے۔ روحانیت کا تعلق خدا سے اور اخلاق کا اس کے بندوں سے ہے۔ ہم ابو ابن ادھم کے قائل ہیں۔ جو بجائے خدا کے اس کے بندوں سے محبت کرتا تھا۔ بندوں سے محبت کرنیوالا خدا سے محبت کرتا ہے۔ اور جس کے دل میں بندوں کے ساتھ پیار نہیں ہے۔ وہ خدا کو پیار نہیں کر سکتا۔ الغرض مخلوق عالم کے ساتھ انسیت ذات خدا کے ساتھ محبت کرنے کے لئے لازمی ہے۔ اور اس لازمی چیز کی تکمیل شاعر کے سپرد کی گئی ہے۔ صورت مذکورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اہل دل نہیں کہہ سکتا۔ کہ ہم نے شاعر کا رتبہ قائم کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔

جب سچ اور جھوٹ کا ازل سے ساتھ ہے۔ مصنوعیت اصلیت کے ہمرکاب چلتی ہے۔ آفتاب عالم تاب کی روشنی اصلی اور کٹس لیمپ کی نقلی ہے۔ اصلی بادشاہوں (جن کو خدا نے بادشاہی کیلئے پیدا کیا ہے) کے تزک و احتشام کو دیکھ کر بہت سے نقلی اور مصنوعی بادشاہ بھی بن جاتے ہیں۔ گو ان کا تاج ان کے سر پر سوار ہو کر خنجر غنیم کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بہت سے فدائی بھر کے جھوٹے پیغمبری کا دعوے کرتے ہیں۔ گو اصلیت کھلنے پر بجائے مدحت کے لعنت ان کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سے حریص اور سچے شاعروں کی تعظیم و تکریم کو دیکھ کر للچا جانے والے

آدمی بھی شاعر بن جاتے ہیں۔ اور وہ جلد ٹوٹے پھوٹے شعر گھڑ گھڑا کر دنیا کے مشاعروں میں مستغنی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ہم کو بھیڑیئے کی کھال اوڑھ لینے والے گدھوں اور بلیوں [illegible] پاکر شیر بن جانے والے چوہوں سے غرض نہیں۔ اُن کی ناپاک ہستی کو خیال میں لانا ہے۔ اصلی شاعروں کی سراسر توہین ہے۔ جو بلند و برتر رتبہ ہم نے شاعروں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ وہ انھیں اہل کمال کو زیب دیتا ہے۔ جن کے دماغ علم کے بے بہا خزانے سے معمور اور دل محبت کی دولت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جو اپنے خدا کی بخشی ہوئی دولت سے ایک عالم کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جن کی پاک تعلیم کی بدولت دُنیا میں محبت کا راج قائم ہوتا ہے۔ اور جن کے مبارک قدموں کے صدقے سے جماعت انسانی اخلاق کے ہمالہ کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ جن کا فرشتوں کے دماغ کو تر و تازہ کر دینے والا نفس انسان کی مُردہ روح میں ایک زندگی پھونک دیتا ہے۔ اور جو اپنے ہم جنسوں کو اپنے الہام کے طفیل میں حیوانیت کی ذلت سے نکال کر فرشتگی کی عظمت کا حق دار بناتے ہیں۔ ایک سچے خدا کی طرف سے شاعری کے لئے پیدا ہونے والے شاعر کا کام ہے۔ کہ (اوّل) وہ نظام عالم کے ہر پہلو سے آگاہ ہو کر بڑی اور چھوٹی تمام چیزوں کی اصلیت اور اُن کے مناسب استعمال سے ماہیت حاصل کرے۔ (دوم) اپنے ہم جنسوں کو بھی اپنی جانی بوجھی باتیں بتلا دے۔ اور دیکھے کہ وہ نیچر کے عطیوں کو جائز طریق پر کام میں لاتے ہیں یا نہیں۔ (سوم) [illegible] کو جن کا حصول معمولی طبقے کے لوگوں [illegible] ممکن ہے۔ ایسے پیرائے [illegible] اور رنگین اور انتہا کا تناسب رکھنے والے الفاظ میں ظاہر کرے۔ کہ وہ [illegible] اور [illegible] ہو جائیں۔ اور اُن کا اثر اُن کے فائدے کا موجب ہو۔ (چہارم) بدی کی بُرائی اور نیکی کی بھلائی کے وہ دلکش ترانے سُنائے کہ سامعین کو اوّل الذکر سے نفرت اور آخر الذکر سے رغبت پیدا ہو۔ (پنجم) اپنے ہم جنسوں میں باریک بینی کی عادت پیدا کرے۔ اور محبت کو جو نیچر کا اصلی سروپ ہے۔ اہل تماشا کے روبرو اس انداز سے پیش کرے۔ کہ وہ نفاق کی مکروہ صورت سے بیزار اور محبت کے عاشق زار بن جائیں۔ اُن کا ہر موئے تن زبان ہو کر محبت کے گیت گانے لگے۔ اور وہ محبت ہی کو اپنی زیست کا آغاز اور انجام سمجھ کر

اُس کے شاہی خزانے یہاں وقف کر دیں۔

کوئی شاعر اپنے بیٹے کی دولت و حشمت دیکھ کر نہیں جلتا۔ ایک محبت ہی عداوت۔ نفرت۔ کدورت۔ نخوت۔ ظلم اور سیکڑوں بدعتوں کا علاج ہے۔ محبت۔ حرص و ہوا کے بندھن کو کاٹ کر اپنے بندوں کو آزاد کر دیتی ہے۔ صبر۔ استقلال۔ استغنا اُس کے غلاموں کو نصیب ہوتے ہیں۔ اور وہ ہفت اقلیم کی بادشاہی کو بھی پیار کی ایک نگاہ کے بدلے خرید نا سخت گراں سمجھتے ہیں۔ دُنیا کی اخلاقی اور جذبات سے تعلق رکھنے والی ہستی کے قیام کے لئے سچے اور اصلی شاعروں کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو آسانی سے ظاہر کر دینے کے لئے بھی ایک شاعر یا فلاسفر درکار ہے۔ ہم نظیر اکبر آبادی کا ایک قطعہ اہل دل کی خدمت میں مثالاً پیش کرتے ہیں۔ اس قطعہ کے سُننے سے طبیعت پر جو کیفیت طاری ہوگی اُس سے شاعروں کی ضرورت کا اندازہ کیا جانا ممکن ہے:۔

قطعہ

تن مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا ۔۔۔ گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا ۔۔۔ مُشیّن بدن تھا۔ معطّر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا ۔۔۔ نہ تار کفن تھا۔ نہ عضو بدن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی ۔۔۔ جو دیکھا۔ تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

ہم امید کرتے ہیں۔ کہ اس قطعہ کو بغور پڑھنے والے اصحاب شاعروں کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور دست بدعا ہیں۔ کہ اے ناظم کون و مکان دس بیس اس قسم کے شاعر ہماری رہبری کے لئے اور بھیج دے!!

ہم نے اکثر احباب کو مختلف زبانوں۔ مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب کے شاعروں کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔ کوئی انگریزی کے شاعروں کو اردو شاعروں سے اچھا بتلاتا ہے۔ اور کوئی اُس کے برعکس اردو شاعروں کو انگریزی سخنوروں پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک شخص ہندی والوں کی تعریف کرتا ہے۔ دُوسرا فارسی والوں کی۔ ہم اس معاملے میں اپنا خیال ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ ہم اس قسم

کی تمام بحثوں کو کج بحثی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ تمام مناظرے بے معنی ہیں۔ خیال کو ادا کرنے کا زبان صرف ایک آلہ ہے۔ اور ہر زبان میں ایک عمدہ اور پاکیزہ خیال ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ایک اونچے درجے کا دل کو ابھارنے اور طبیعت میں جوش پیدا کرنے والا خیال ہر زبان میں اپنی یکرنگی قائم رکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ زبان جاپانی ہو یا یونانی۔ عبرانی ہو یا ایرانی۔ انگریزی ہو یا ہندوستانی۔ مذہب کا اختلاف بھی کچھ فرق نہیں کر سکتا۔ مذاہب کے درمیان کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ محبت۔ ہمدردی اور اخلاق کی تعلیم ہر ایک میں موجود ہے۔ اور ہم کافی تفصیل کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ ہر سچے اور نیچرل شاعر کا مشن دنیا میں اخلاق اور محبت کو ترقی دینا ہے۔ بہت سے کج فہم اور چھوٹے دل والے لوگ شعرا کے خلاف لامذہبی کا فتوے صادر کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے فتوے دینے والے سخت غلطی پر ہیں۔ وہ شاعری کے فلسفے سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ایک شاعر بحیثیت انسان کسی ملک یا مذہب کا ہو لیکن بحیثیت شاعر اُس کا مذہب جدا ہوتا ہے۔ اُس کا کام عام پنڈتوں۔ مولویوں۔ پادریوں کی طرح مختلف فرقوں میں نفاق کی آگ بھڑکانا نہیں ہے۔ اُس کو خداوند کریم نے بجائے بیگانگت کے یگانگت اور عداوت کو دور کر کے محبت پیدا کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ۔ نے برائے فصل کردن آمدی

تعصب اخلاق کا دشمن ہے۔ اور اس لئے تعصب شاعر کے مذہب میں روا نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی شاعر نے اپنی خداداد طاقت کو تعصب کی ترقی اور مذہبی اختلاف کو مستحکم کرنے میں صرف کیا ہے۔ تو یہ اُس کے سچے شاعر نہ ہونے کی پہچان ہے۔ وہ شاعر نہیں تُک بند ہے۔ نقال ہے۔ ننگ شعرا ہے۔ اور شاعروں (محبت کے مشنریوں) کی پنچایت سے باہر کر دئے جانے کے قابل ہے۔

شکسپیر۔ ورڈس ورتھ عیسائی تھے۔ لیکن شکسپیر کے ڈرامے عیسائیوں۔ ہندوؤں۔ مسلمانوں کو ہیومن نیچر (فطرت انسانی) کے مطالعہ میں ایک سی مدد دیتے ہیں۔ ورڈس ورتھ کی دلکش نظمیں بنی نوع انسان کے لئے ہیومن افیکشنس (جذبات انسانی) کے راز کا انکشاف کرنے والی ہیں۔

ہومر۔ ورجل۔ ڈینٹی کا باوجود اختلاف مذہب کے دُنیا کے ساتھ ایک سا سلوک ہے۔ میرو غالب ہندوؤں کے ویسے ہی محسن تھے جیسے مسلمانوں کے۔ اور گوسائیں تلسی داس کے۔ اولاد کی سعادت مندی۔ بیویوں کی پارسائی اور بھائیوں کی محبت کے متعلق سبق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے بیحد فائدہ پہنچانے والے ہیں۔ شاعروں کے دُنیا میں بھیجے جانے کی ضرورت۔ اُن کا کلام اور اُن کی ذمہ داری کی بابت سطور بالا میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خداوند کریم شاعروں کو محبت کی ترقی اور اخلاق کی وسعت کے لئے پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر کے سچے یا جھوٹے اصلی یا نقلی ہونے کی آسان پہچان یہ ہے۔ کہ اُس نے محبت کے بیت المال کو جو ہل اللہ کا ورثہ ہے۔ کتنی ترقی دی۔ اور ممالک اتفاق و محبت کی حدود میں کس قدر اضافہ کیا۔ آؤ۔ ہم اس کسوٹی پر مرزا دبیر مرحوم کے کلام کو پرکھیں۔ اور دیکھیں۔ کہ مرحوم سچے اور اصلی شاعروں کی فہرست میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اردو شاعری سے تعلق رکھنے والوں میں ایک فرقہ ایسا ہے۔ جو مرثیہ گویوں کو اچھی نگاہ سے دیکھنے کے لئے طیار نہیں ہے۔ اُس کا خیال ہے۔ کہ "بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو ہوا کرتا ہے"۔ ہم اس جماعت کا ممبر بننا نہیں چاہتے۔ بلکہ خواستگار معافی ہوتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔ کہ ہم اس تنگ خیال زمرہ کی ممبری کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھتے ہیں۔ ہم اس گروہ کے مخالفین کے دوست ہیں۔ اور ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ "اردو شاعری میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ سب سے اعلےٰ ہے"۔ ہم غزلیں کہتے ہیں۔ اور سُنتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں۔ کہ غزل کے کسی کسی شعر میں بھی سچی شاعری کی بو آجاتی ہے۔ لیکن غزلوں کی بنا پر اصلی اور نقلی شاعر کی تمیز کر لینا ناممکن ہے۔ غزل میں محبت کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ معشوقوں کے ساتھ عاشقانہ گفتگو۔ رندانہ نیاز کی باتیں۔ وفا و جفا کے شکوے اُس باطنی محبت کی تصویر پیش نہیں کر سکتے جس کو فلاسفروں نے نیچر کے ہارمنی* (نیچر کے اتحاد) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ غزل گو کی محبت

* نیچر بذات خود ایک نظم اِلعزہ ہے۔ جس کا ہر اصول (عمل) قوافی اور سُروں کی طرح ایک دُوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ اور اردو زبان میں انگریزی کے بہت سے فلسفیانہ خیالات پُورے طور سے ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے مجبوراً جو لفظ بادہ موزون و مناسب معلوم ہُوا۔ خطوط ہلالی میں لکھ دیا گیا ہے + ۱۲ جاکر یارشید ا۔

خود غرضانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے معشوق پر اس لئے مرتا ہے۔ کہ اُس کے وصل سے بہرہ یاب ہو۔ وہ اپنے دلدار کی اس لئے شکایت کرتا ہے۔ کہ اُس جفا کیش کو دُوسرے لوگوں کے ساتھ بھی جنہیں غزل گو اپنا عدو یا رقیب سمجھتا ہے۔ محبت ہے۔ الغرض غزل گو کو اُس محبت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جو محض محبت کی غرض سے کی جاتی ہے۔ جس کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوتی ہے۔ کہ وہ انسان کا خمیر ہے۔ اور اُس کی زندگی کے لئے نمک کا کام دیتی ہے۔ غزل کے اخلاقی پہلو کی نسبت تو صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ [illegible] سینکڑوں دیوانوں میں مشکل سے ایک غزل ایسی نکالی جا سکتی ہے۔ جو کوئی شریف باپ اپنی بالغ بیٹی کو پڑھ کر سُنا سکے۔ یا وضعدار شوہر اپنی بیوی کو کسی دُوسرے مرد کو سُنانے کی اجازت دے۔ وجوہ مذکورہ کی بنا پر ہی کہا گیا ہے۔ کہ غزلیات کے ذریعے سچی شاعری کا منشا مشکل سے پُورا ہو سکتا ہے۔ قصیدے غزلوں سے بہتر ہیں۔ مثنوی اور مرثئے قریب قریب ایک ہی قسم کی نظمیں ہیں۔ اور میرے خیال میں ہر مرثیہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مثنوی کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ مرثیہ ایک اعلیٰ درجہ کی نظم ہے۔ اور اُس کا کہنا بہت مشکل ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ سو شاعروں میں سے کم سے کم پچانوے غزل گو اور زیادہ سے زیادہ پانچ مرثیہ گو ہوتے ہیں۔ اور ان پانچ میں سے بھی ایک کو مشکل سے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے بہت بڑی علمیت اور وسعت معلومات کی ضرورت ہے۔ مرثیہ گو کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ہیومن نیچر کا نہایت باریک مطالعہ کر چکا ہو۔ ایک واقعہ کو نظم کہتے وقت ہزارہا قسم کے آدمی متعلقین واقعہ اُس کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ ان ہزاروں آدمیوں میں سے ایک کی طبیعت کو بھی پہچاننے میں قاصر رہتا ہے۔ تو وہ اُس کی تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں۔ کہ ایک تصویر کا باریک سا بگڑا ہُوا پہلو بھی ساری تصویر کو بالکل خراب کر دیتا ہے۔ اور مصوّر کی سخت محنت پر ایک خفیف سے غلط نقطے کی وجہ سے پانی پھر جاتا ہے۔

مرثیہ گو کی محبت اُس کے ہیرو کے ساتھ وصل۔ بوسہ یا کم از کم ایک نگاہ لطف کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ اُس کے ساتھ اس لئے محبت کرتا ہے۔ کہ اُس کو صدق دل سے قابل محبت سمجھتا ہے۔

اور سچی اور بے غرضانہ محبت کی اس سے اچھی دوسری مثال نہیں ہوسکتی۔ مرثیہ گو کو اپنے پیارے ممدوح کے ساتھ روحانی لگاؤ ہوتا ہے۔ اور اس لئے اُس کے کلام میں جسمانی یا مادی خط کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔ اور جب لذائذ دُنیویہ سے واسطہ ہی نہیں رکھا جاتا۔ تو اُس کے پاک اشعار میں بد اخلاقی کو داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ملتی۔ مرثیہ گو کا ممدوح وہ شخص ہوتا ہے۔ جو اُس کے ایمان کے مطابق پکا راست باز اور ناراستی کا دشمن ہو۔ اور ایسے راست باز اور پاکیزہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ کا شاعرانہ بیان ناظرین کے دلوں پر قدرتاً ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاق بڑھانے والا اثر پیدا کرتا ہے۔ جب آپ کسی سچے شاعر کا مرثیہ پڑھیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اُس کے مرثیہ کا صرف ایک بند کئی وعظوں کے گھنٹوں کی اسپیچوں سے زیادہ عالی جذبات کو اُبھارنے والا اور پُر تاثیر ہوتا ہے۔ اردو زبان میں مرثیہ گو زیادہ تر مسلمان اور شیعہ مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض ہندو ان کے مرثیوں کو اس لئے رغبت سے نہیں پڑھتے۔ کہ اُن میں مسلمان بزرگوں کی تعریف ہوتی ہے۔ اور بعض سُنّیوں کو اُن کے ساتھ اس لئے دلچسپی کم ہوتی ہے۔ کہ اُن کو ان مرثیوں میں شیعہ اسپرٹ کی جھلک معلوم ہوتی ہے۔ میں ایک ہندو بلکہ آریہ ہوں۔ لیکن میں ہر دو اصحاب مذکور کے طرز خیال کے ساتھ ہمدردی نہیں کرسکتا۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ مرثیہ کہنے والا شاعر اپنے دماغ میں راستی اور ناراستی کی جنگ شروع کرتا ہے۔ جس میں اُس کی فکر رسا راستی کی طرفدار ہوتی ہے۔ اور ایک اچھے شاعر کا مرثیہ شروع سے اخیر تک پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے دل میں راستی سے محبت اور ناراستی سے نفرت ضرور پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم قسم مذکور کے اہل ہنود اور اہل سنت وجماعت سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک شیعہ شاعر کا مرثیہ پڑھتے وقت کسی اپنے مذہب کے ایسے بزرگ کا تصور باندھ لیا کریں۔ جو چند ناپاک دل لوگوں کے ظلم سے سخت تکالیف میں مبتلا ہوا ہو۔ تو اُس وقت اُن کو اس مرثیہ کی اصلی خوبی محسوس ہوسکیگی۔ اور وہ فوراً معلوم کرلینگے۔ کہ شاعر نے ایک خاص شخص یا خاص واقعہ کی آڑ میں تمام دُنیا پر حاوی ہونیوالی سچائیوں کا اعلان کیا ہے۔ ماں اور بہنوں کے سامنے اُن کے بچّوں اور بھائیوں کو قتل کرنا اور

پیاسوں کو بوند بوند پانی کے لئے ترسا کر مارنا ایسے ناپاک فعل ہیں۔ کہ اُن سے انسان کو نفرت دلانے والا شاعر بجائے ظلم و جفا کے نیکی اور محبت کی سلطنت قائم کرنے والا ہیرو کہلانے کا مستحق ہے۔

اس کل داستان کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اردو زبان میں مرثیہ ہی وہ اعلےٰ قسم کی نظم ہے۔ کہ جس کے ذریعے سے ہم اصلی اور نقلی شاعر کا امتحان کر سکتے ہیں۔ یہ مرثئے ہی ہیں۔ جن کی بدولت شاعری کی منشا پوری ہوتی ہے۔ اور جن کے طفیل میں اردو زبان بھی سنسکرت۔ بھاشا اور انگریزی کی طرح مصلح اخلاق اور پیغمبر محبت ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ ہر فاعل کی فعل سے اور فعل کی اُس کے نتیجے سے عزت ہوتی ہے۔ مرثیوں سے شاعری کی اصلی غرض کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس لئے اُس کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا مناسب ہے۔ مرثیہ کی عزت مرثیہ گو کی عزت ہے۔ اور ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم مرثیہ کہنے والے شعرا کو سچا شاعر سمجھیں۔ اور دُنیا کی نظر میں اُن کا وقار بڑھانے کے لئے جہاں تک ہو سکے کوشش کریں۔ اُن کا اردو اور اردو والوں پر بہت بڑا احسان ہے۔ اور ہم کو چاہئے۔ کہ احسان فراموش نہ ہوں کہ اُن کی تعظیم کریں۔ اور اُن کا نام روشن کرنے کے لئے دل و جان سے ساعی ہوں۔ یوں تو ہر مرثیہ کہنے والا شاعر قابل عزت ہے۔ لیکن جس قدر اچھے مرثئے کوئی شاعر کہتا ہو۔ اُسی قدر زیادہ تعظیم و تکریم کا وہ مستحق ہے۔ اردو میں مرثیہ کہنے والے پہلے بھی بہت ہوئے ہیں۔ اور اب بھی بہت سے عمدہ مرثئے کہتے ہیں۔ لیکن میرزا دبیر کو اس فن کا بادشاہ کہنا نامناسب نہیں ہے۔ اُن کو یکتائے دوران کہنا بھی نازیبا نہیں ہے۔ اگر کسی لڑائی جھگڑے کے خوف سے ایک دُوسرے بزرگ کو بھی ان کا ہمسر مان لیا جائے۔ تو اس میں تو کلام ہی نہیں۔ کہ تیسرا شخص اُن کے پایہ کا پیدا نہیں ہوا۔ اور آئندہ کیلئے پیشینگوئی کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم زمانے کی بدلتی ہوئی ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ شاید آئندہ بھی اس قسم کے شاعر کا مُنہ دیکھنا اردو زبان کے نصیب میں نہیں ہے۔

مرزا دبیر اور میر انیس کا مقابلہ ایک پُرانا جھگڑا ہے۔ اس سوال کو طے کرنے کے لئے

دبیریوں اور انیسیوں کی بڑی بڑی جنگ ہو چکی ہیں۔ کئی کتابیں لکھی گئیں۔ کئی مناظرے ہوئی
مولانا شبلی صاحب سے جید عالموں نے اس موازنہ کے مشکل کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور بہتوں کی
نگاہ میں پورا تولنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اعتدال پسندوں کی رائے یہ ہے۔ کہ
دونوں کا مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں فرد تھا۔ ہم بھی ان اعتدال پسندوں
کی رائے کو بہت مناسب سمجھتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس پتھریلے میدان میں قدم نہ
بڑھائیں۔ مگر جی نہیں مانتا۔ دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے۔ طبیعت چاہتی ہے۔ کہ کسی کے
کہنے سننے کی پروا نہ کرتے ہوئے کچھ کر ڈالیں۔ ہم نے بھی فارسی اردو پڑھی ہے۔ اور خاندان
کے رواج کے مطابق ایسی بری بھی نہیں پڑھی بقول شخصے "کو دو دن دیگر نہیں پڑھا"۔ اور نہ مولویوں کو
صرف اچار یا جمعراتی دے کر ٹرکاتے رہے ہیں۔ دونوں کاملوں کے کلام کا بہت کچھ حصہ
دیکھا ہے۔ ان کی بابت ہماری رائے بھی آپ سے آپ قائم ہو گئی ہے۔ خدا جانتا ہے۔
کہ ہم دبیرئے ہیں نہ انیسئے۔ اردو کے پانچویں سواروں میں ہمارا شمار بھی نہیں ہے۔ ہماری
رائے ایک نوجوان ناتجربہ کار شخص کی رائے ہے۔ اس لئے اگر کسی کو ہم سے اختلاف ہو۔ تو معافی
چاہتے ہیں۔ ہم کو نہ لڑنے کی آرزو ہے نہ جھگڑنے کی فرصت ۔

ہماری رائے میں مرزا دبیر مرحوم کو فارسی و عربی کی لیاقت میر انیس مغفور سے زیادہ تھی۔
مرزا صاحب ان زبانوں کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس خوبی سے استعمال کرتے
ہیں۔ کہ خلاف فصاحت نہیں ہوتا۔ ہر لفظ کو نہایت موزون جگہ دی جاتی ہے۔ اور اہل مطالعہ کو نہایت
غور کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لفظ اپنی جگہ پر بالکل ضروری تھا۔ اور اس سے بہتر لفظ کی تلاش
ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کے یہاں فارسی و عربی کی کمی نہیں ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کا کافی
ذخیرہ موجود ہے۔ میر صاحب کے یہاں ان کی کمی کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ میر صاحب اکثر مقامات
پر نہایت معمولی الفاظ سے ہی کام نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بہتر لفظ مل جانا ماہر زبان کیلئے
مشکل نہیں کہا جا سکتا۔ معمولی الفاظ سے ہماری مراد سبک درجے کے الفاظ سے نہیں ہے۔

سیدھے اور چھوٹے الفاظ کا استعمال کرنا ہمارے نزدیک داخل فصاحت ہے۔ معمولی الفاظ سے ہماری مراد اُن الفاظ سے ہے۔ جو متکلّم کے مطلب کو پورے طور سے ادا نہیں کر سکتے۔ اور جن کے مقابلے میں زبان میں اَور ایسے الفاظ موجود ہیں۔ جو مطلب مذکورہ کے ادا کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں +

مرزا صاحب کی معلومات اور علوم مختلفہ سے واقفیت میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مرزا صاحب کے کلام سے بہت سے تاریخی واقعات اور علوم کے اصول فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ جن کا میر صاحب کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے +

میر صاحب کا کلام صرف فصیح ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں فصاحت اور بلاغت دونوں کی کمی نہیں ہے۔" بہت لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب ضرورت سے زیادہ بلیغ اور اس لئے ثقیل تھے۔ میر صاحب کے کلام کی سی روانی ان کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی"۔ ان اصحاب کی گفتگو سراسر غلط ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں سے بیسیوں مرثئے اور ہزار ہا بند ایسے اخذ کی جا سکتے ہیں۔ کہ جن کا ثانی بلحاظ فصاحت بھی میر صاحب کے یہاں نکلنا مشکل ہے۔ افسوس کہ طوالت سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ہر دعوے کی تائید میں اس موقع پر (ثبوت کے) ڈھیر لگا دئے جاتے۔ حیات دبیر میں ایسے بند ناظرین انصاف پسند خود مطالعہ فرما کر ہمارے کلام کی تصدیق کرلیں +

مرزا صاحب کے مزاج میں استقلال اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ اس لئے اُن کا کلام میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور گہرا ہے۔ اس سنجیدگی اور گہرائی میں اگر نقص ہے تو یہ ہے کہ عوام کو مرزا صاحب کا بعض کلام بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مرزا صاحب کا قصور نہیں۔ اس کا الزام جہالت کی گردن پر ہے +

نارنگی اور انار دونوں ہی خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک بچّے کے سامنے ایک انار اور ایک نارنگی رکھکر اُس کو مجبور کریں۔ کہ وہ دونوں میں سے صرف ایک کو لے لے۔ تو بچّہ دونوں کو

سمجھتا تھا۔ دونوں کو ہی پینے کی آمادگی ظاہر کریگا۔ لیکن انتہائی مجبوری پر وہ دونوں میں سے اُس ایک کو لے لیگا۔ جسے وہ اپنے خیال میں زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ہم میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام کو مزہ دار سمجھتے ہیں۔ لیکن بچّہ مذکور کی طرح ایک کو ہی قبول کرنے کے لئے مجبور ہونے پر ہم **مرزا صاحب کے کلام کو ہی گھول کر پی جائیں گے۔**

مرزا صاحب کا کلام ہماری مقرر کی ہوئی کسوٹی پر پرکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب حقیقی سچے شاعر تھے۔ وہ شاعری کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چونکہ ہر اصلی شاعر کا مشن یہی ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں اخلاق کو ترقی دے۔ اس لئے وہ دُوسرے واقعات کے پیرایہ میں اپنے وقت کی بھلائیوں اور بُرائیوں کے نغمے سُنایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانے میں بھی آج کل کی طرح سچی دینداری کی جگہ ریاکاری کا بہت زور تھا۔ اور وہ اُس سے متنفّر تھے۔ اور اُس کی مذمّت اس طرح فرماتے ہیں۔ ؎

(۱) بہتر و نیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں ۔۔۔ تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

مرزا صاحب چاہتے ہیں۔ کہ انسان اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر خدا سے معافی کا خواستگار ہو۔ (فرماتے ہیں):-

(۲) رباعی

بخشش کا تری اُمیدوار آیا ہُوں ۔۔۔ مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں

چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل ۔۔۔ تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

(۳) مرزا صاحب ایک مصلحِ اخلاق کی حیثیت میں اپنے ہم جنسوں میں صبر و قناعت اور وضعداری اور بیکسوں اور مفلسوں سے ہمدردی کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جناب ممدوح حضرت امام حسینؑ کی زبان سے اُن کی چار برس کی بیٹی سکینہؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ ؎

سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا ۔۔۔ آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا*

گو قہر ہے اِس سن میں جُدا باپ سے ہونا ۔۔۔ لاشا مرا تڑپیگا۔ بہت مجھ کو نہ رونا

گر چاہتو مری رُوح ہو ناشاد سکینہ ۔۔۔ تو غم میں مرے۔ کیجیو فریاد۔ سکینہ

* (نوٹ: اس بند میں) جناب امیرؑ نے۔ [illegible]

(۴) اسی طرح جب شمر بن ذی الجوشن حضرت امام حسینؑ کے بھائیوں کو اپنی فوج کے علمدار بنانے کا لالچ دے کر اُن کو حضرت ممدوح کے خلاف باغی بنانا چاہتا ہے۔ تو وہ چھوٹے چھوٹے بچے کیا جواب دیتے ہیں۔ جس سے انتہائی قناعت اور دلیری و وضعداری ٹپکتی ہے۔ سدس موقع کے متعلق مرزا صاحب کے یہ بند ہیں:۔

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک بس بس زیادہ منہ سے نہ اب واہیات بک
چپ نابکار چپ۔ سگ او بے ادب سگ یہ شور و شر نہ بھلا کانپ اُٹھے فلک
بہکا انہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں یہ اُن سے کر۔ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں

ہمدوش حمزہؓ۔ حیدرؑ کرار تھے؟ نہ تھے روز احد نبیؐ کے علمدار تھے؟ نہ تھے
عباسؑ اس علم کے سزاوار تھے؟ نہ تھے شاہ نجفؑ کے یہ ڈرِ شہوار تھے؟ نہ تھے
توبہ۔ جدا۔ ہم اپنے امامِ ہدیٰ سے ہوں بیٹے کے ہوتے۔ نانا کے وارث نواسے ہوں

انبار۔ سیم و زر کے جو اہلِ درم لگائیں ٹھوکر سے ہم نہ ہات۔ خدا کی قسم لگائیں
آنکھوں میں شہ کا سرمۂ خاک قدم لگائیں پارس کے بھی پہاڑ کو ٹھوکر نہ ہم لگائیں
سب نے زباں سے آب و غذا کا مزا۔ لیا ہم نے فقط زباں سے۔ نامِ خدا۔ لیا

(۵) مرزا صاحب محبت کے دلدادہ تھے۔ وہ اہلِ محبت کی نہایت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عباسؑ علمدار کی اُلفت کی بابت فرماتے ہیں۔ ؎

جس دن نہ آباد یہ ویرانہ رہیگا عباسؑ کی اُلفت کا بھی افسانہ رہیگا

مرزا صاحب کا کلام ایسے ایسے اخلاق کی درستی کرنے والے اور محبت کی ترقی کے موجب خیالات کا کبھی خالی نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ اگر حق کو کلام بغور پڑھا جائے۔ تو یقینی طور پر معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے اہلِ عالم کے جذبات کو پاک بنانے کے لئے اپنی پیش قیمت زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ انسانی جماعت کو نیک اور پاکیزہ خیال بنانے کے لئے اس دُنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اور اس لئے سچے اور اعلیٰ شاعر تھے مرزا صاحب کے نیچرل شاعر ہونے کا بڑا بھاری ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ اُن کے اور اُن کے ساتھی

میر انیس مرحوم کے بعد دُوسرے شاعروں کو مرثیہ کہنے کی کافی جرأت نہیں ہوتی۔ گویا مرثیہ گوئی بھی ان عالی دماغ فرزندوں کے ساتھ ہی عدم کو چلی گئی۔ ہمارا یہ خیال ایمان کے درجے تک پہنچا ہُوا ہے۔ کہ جب تک خدا کو منظور ہوگا۔ کہ انسان کی بھلائی کے لئے اردو زبان کو بھی وسیلہ بنایا جائے۔ دبیر یا انیس ثانی پیدا نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہم کتنے بُرے آدمی ہیں۔ اردو بولنے والی قوم کس قدر محسن کُش ہے۔ کہ اُس کی زبان پر بلکہ اُس کی جان پر اس قدر احسانات کرنے والے اخلاق و محبت کے پیغمبر کی سوانح عُمری لکھنے کی کسی کو فکر نہ ہُوئی۔ ہمارا ارادہ تھا۔ کہ دبیر سے کامل بزرگ کا نام تک دُنیا سے مٹ جائے۔ خدا عادل ہے۔ اُس کو ہمارے ناپاک ارادے کی تائید منظور نہ تھی۔ اور اُس نے ہمارے دوست صادق مولانا سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی کے دل میں جو ایک اعلےٰ درجہ کے عالم۔ شاعر اور مرثیہ گو ہونے کے علاوہ عالی جناب مرزا اوج صاحب خلف الصدق مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اس ضروری کام کی طرف شوق پیدا کیا۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے حیات دبیر تکمیل کو پہنچی۔ حیات دبیر اسد و زبان میں لکھی ہُوئی اردو شعرا کی سوانح عمریوں میں یکتا سمجھی جائیگی۔ کیونکہ اوّل تو یہ ایک لاثانی شاعر اور کامل پاک باطن کی زندگی کے حالات سے معمور ہے۔ دوئم اس کی تکمیل کے لئے بڑے تجسس میں واسطے الا معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ یہ بات (لاالف) مرزا صاحب مرحوم کی ایک سچی تصویر ہے۔ اور اس میں اُن تمام بے بنا اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو مرزا صاحب اور اُن کی شاعری پر کم فہمی یا کسی اور سبب سے اُٹھائے گئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ یہ سوانح عُمری مصنع اخلاق حامی محبت دبیر کے نام سے دُنیا میں اخلاق اور محبت کی ترقی دینے کی موجب ثابت ہوگی۔ اور اُس کے نیک دل مصنف کو دارین کا ثواب حاصل ہوگا ✦

ہمارا بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ کہ اردو شاعری کے متعلق ایک فلسفیانہ رسالہ مرتب کریں جس میں اردو شاعری کے باطنی پہلو کو دکھاتے ہُوئے اُن تمام الزامات کا جواب دیں۔ جو شاعری کے فلسفہ سے ناواقف لوگوں نے اس کے ماتھے لگا رکھے ہیں۔ جن اصول پر کتاب مذکور لکھی جائیگی۔ اُس کی کچھ جھلک اس تقریظ میں دکھا دی گئی ہے۔ اگر حیات دبیر کی بدولت ہمارے خیالات ...

خدمت میں حاضر ہو کر دلچسپی حاصل کرینگے۔ تو ہم کو کتاب مذکور کے لکھنے کے لئے شکریہ کا بہت کچھ حوصلہ حاصل ہوگا۔ جناب مولوی افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے یہ عظیم کی کتاب لکھکر اپنا کام کر دیا ہے۔ ہمارا کام باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مولانا ممدوح کے کلام کی قدر کریں۔ دیکھیں۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں یا نہیں۔ خداوندا! یہ اچھی کتاب مقبول عام وخاص ہو۔

ہیرالال۔ سوز شیدا۔ اکبرآبادی
۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء۔ مقام کوٹہ۔ راجپوتانہ

تقریظ عالم علوم فارسی و انگریزی جناب مستطاب منشی ہیرالال صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ جوڈیشل سکرٹری محکمہ عالیہ خاص حضور دربار بہادر دام اقبالہ (ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ)

حکیموں کا قول ہے۔ کہ کائنات کا مشاہدہ ہر قسم کا کمال حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ قدرت نے اسکو خاص تکملہ احساس دل و دماغ عطا کیا ہو۔ کہ جس سے وہ مشاہدات کے دیکھنے اور ان کے سبب دریافت کرنے۔ سمجھنے میں غلطی نہ کھا وے۔ اس مقولہ کو مد نظر رکھتے ہوئے کارلائل نے جو انگلستان کا ایک مشہور فاضل ادیب (فلسفی) ہے۔ اپنی کتاب ہیرو و ہیرو ورشپ (Heroes and Hero worship) میں ریفارمر، جنگجو، نبی، شاعر اور حکماء کو مشاہد (Seer) کا لقب دیا ہے۔ اور شرح طور پر سمجھایا ہے۔ کہ ان لوگوں میں اور عام لوگوں میں فرق یہ ہے۔ کہ یہ لوگ نیچر کی ماہیت کو سمجھنے اور جاننے والے ہوتے ہیں۔ اور عام لوگ اس فیض سے بے بہرہ۔ پس اس میں شک نہیں ہے۔ کہ کائنات ایک ایسی کتاب ہے۔ کہ جس کا ہر شخص خواہ وہ کسی مذاق اور طبیعت کا ہو۔ اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق شے مطلوب کو پاتا

جاتا ہے۔ اور جس قدر اس کتاب کے دیکھنے میں جانفشانی کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس پر اسرار نہانی ہویدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی ترقیاں سب اس کی شاہد ہیں۔ ہوائی جہاز۔ مختلف قسم کے آلات حرب۔ نئے ستارے اور سیاروں کی معلومات۔ ایکس رے (X. Ray۔ ایک قسم کی چمکدار شعاع جس کے استعمال سے جذام تک اچھا ہو جاتا ہے۔ اور دیگر مختلف قسم کے امراض کا یقینی دفعیہ ہوتا ہے) وغیرہ وغیرہ سب اسی کتاب کے چھپے ہوئے نسخے ہیں۔ کہ جن کو مشاہدان نے سرورق کتاب سے پڑھ کر عوام پر ظاہر کیا ہے۔ مگر جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر کس و ناکس اس کتاب نیچر کے پڑھنے اور سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور جو لوگ اس کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن کو قدرت خاص طور پر اور ایسی خاص خاص قوتوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔ کہ جو عام لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اور اس میں خلاق عالم کی عین مصلحت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گو ہر شب شب قدر نیست شب قدر نیز بے قدر نہ بود ے۔ چنانچہ ہیروز (heroes) کی تعظیم و تکریم اور اُن کی وقعت کرنا ہر قوم و ملت و ملک نے فرض عین قرار دیا ہے ◆

یوں تو ہر قسم کے مشاہد اور موجد کی تعظیم کرنا فرض انسانی ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں مختلف قسم کی روشنیاں اور ترقیاں اُن کے نفس نفیس اور ذات پاک کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہیں اور وہ بنی نوع انسان کے اعلےٰ درجہ کے محسن ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان بزرگان علم و فن میں سے وہ کونسے ہیں۔ کہ جن کا تعلق عظیم ذات انسان سے ہے۔ اور جو انسانی طرز معاشرت۔ تعلقات باہمی۔ علم و ادب۔ رسم و رواج۔ خیالات دینی و دنیوی کے بانی اور موجد و مصلح ہیں۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ انسان مثل حیوانات کے اُن طریقوں۔ جذبات اور حرکات کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ کہ جو قدرت نے وقت پیدائش اُس کو عطا کئے ہیں۔ بلکہ خلاف اُس کے اُس کی حرکات وغیرہ یکگونہ خود حاصل کردہ ہیں یا اُن اثرات سے متاثر ہو کر پیدا ہوئے ہیں۔ جو اُس پر سوسائٹی۔ تمدن۔ ملکی و قومی تہذیب وغیرہ

چکے ہیں +

پس ان سب امور پر نظر کرتے ہوئے ماننا پڑیگا - کہ وہ ہیرو جس کا بڑا تعلق انسان سے ہے - ریفارمر یا نبی ہے - اور اس کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے - کیونکہ دنیا کے مختلف طبقوں کے انسان (باستثناء اُن کے جو غیر مذہب ہیں - اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں) کسی نہ کسی ریفارمر کے اصول کے پابند ہیں - حالانکہ اُس ریفارمر کو مرے ہوئے صدہا بلکہ ہزارہا برس ہو چکے ہیں - مگر اُس کے قول اور فعل - وعظ اور الہام نے انسانوں کے دل پر ایسا سکہ بٹھایا ہے - کہ جس کو وہ پشت ہا پشت تک نہیں بھول سکتے - اور اپنے جملہ تعلقات زندگی میں اپنے مقبولہ ریفارمر کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں - لیکن ریفارمر کی فضیلت - اُس کے احسانات - رہنمائی وغیرہ کا ذکر کرنا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے - کیونکہ یہ ایک وسیع مضمون ہے - کہ جس کے لئے فرصت اور قابلیت کی ضرورت ہے - جو بدقسمتی سے راقم کے پاس دونوں نہیں ہیں +

ریفارمر کے بعد قابل قدر اور واجب التعظیم ہیرو شاعر قرار پاتا ہے - کیونکہ شاعر کا کلام علاوہ ان کی آئندہ تہذیب و لٹریچر و طریق معاشرت پر اثر ڈالنے والا زمانہ سابقہ کی لٹریچر - عادات - افعال - طبیعت اور مذاق کا بمنزلہ آئینہ ہوتا ہے - سادہ لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے - کہ ہر خطہ زمین و ہر زبان کے شاعر کے کلام کا اُس خطہ کے باشندگان اور زبان دانوں پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے - کہ اُن کی نقل و حرکات اور لٹریچر اور مذاق طبیعت اُس کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے - اسی طرح اگر زمانہ سابقہ کی کسی قوم کے حالات اُن کی تہذیب طریق عمل اور آپس کے برتاؤ کا پتہ لگانا ہو - تو اُس قوم کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ ان سب امور پر ضرور روشنی ڈالیگا - اور مطالعہ کرنے والے کو اس ذریعہ سے وہ تحقیقات حاصل ہونگی - کہ جن کے اظہار کے لئے تواریخ بالکل قاصر ہیں - یہ بات کہ شاعر کے کلام کا انسان پر کیوں اس قدر اثر پڑتا ہے محتاج بیان نہیں ہے - کیونکہ ظاہر ہے - کہ شاعر مثل

مصوّروں کے ہر قسم کے سین (scene) پیشکش (انسان) کرتا ہے۔ اور وہ بھی اس طریق سے کہ انسان کی آنکھ اُس کے دیکھنے سے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اور آنکھ کے ساتھ دل و دماغ انسان بھی دلکش نظارہ سے مزہ اُٹھاتے ہیں۔ شاعر کا کام مصوّر سے کہیں بڑھا چڑھا ہوتا ہے۔ اور گو اچھے مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر بھی دیکھنے والے کو محو نظّارہ کر لیتی ہے۔ مگر جوں ہی کہ دیکھنے والا تصویر کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ تصویر کے نقش اُس کے دل و دماغ میں پھیکے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتّےٰ کہ کچھ عرصہ بعد دل و دماغ پر کچھ اثر نہیں رہتا۔ اس کے سوا مصور کی کھینچی ہوئی تصویر صرف ظاہری مادی حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اندرونی حالات اُس سے سراسر پوشیدہ رہتے ہیں۔ برعکس اس کے شاعر کے کھینچے ہوئے فوٹو کا اثر گو آنکھ پر نہ ہو۔ مگر دل و دماغ انسان پر اُس کا ایسا عکس پڑتا ہے اور جاگزیں ہو جاتا ہے کہ انسان کی کوشش سے بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ پھر مصوّر کی تصویر کی طرح کامل شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر ناقص نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُس میں ظاہری اور اندرونی حالات دونوں فصاحت کے ساتھ دکھلائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مصوّر اگر کسی انسان کی تصویر کھینچے۔ تو وہ اُس انسان کی جسمانی کیفیت اور پارچہ پوشیدگی کی رنگت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر شاعر اُس انسان کے حرکات۔ عادات۔ اخلاق۔ مذاق اور جذبات کا پورا چربہ اُتار لیتا ہے۔ شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر کے باثر ہونے کی ایک وجہ موجّہ یہ بھی ہے کہ شاعر تصویر کے کھینچنے میں الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور چونکہ انسان حیوان سے استعمال لفظ کی وجہ سے ممتاز ہے۔ کہ تمام حیوانوں میں فقط انسان ہی ناطق ہے۔ اس لئے کلام شاعر کا اثر خصوصیت کے ساتھ قلب انسان پر پڑتا ہے۔ اور پشت ہا پشت بلکہ صدیوں اور ہزار ہا برس تک قائم رہتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ ایران کو ایک نظم سُنا کر سفر سے واپس لے آنا۔ بخیل اور وعدہ شکن سلطان کو ایک ہجو کہہ کر موعودہ انعام ادا کرنے پر آمادہ کر دینا۔ حکمرانان ہند کو چند اشعار سنا کر جنگ اور صلح پر مستعد کر لینا۔ سامعین کے دلوں میں ایک مجلس اور ایک وقت میں مرثیہ۔ سلام۔ قصیدہ۔ رباعیات وغیرہ پڑھ کر مختلف قسم کے اثر رنج اور خوشی کے

مثلاً ایشیائی شاعروں کے ایسے کرشمے ہیں۔ جن کی صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ امر اس بات کا ثبوت کو پہنچا ہوا ہے۔ کہ شاعر ہر ملک اور ہر قوم کے لٹریچر کی روح رواں ہوتے ہیں۔ اور ہر قوم کے لٹریچر کی نشو و نما اس قوم کے شاعروں پر منحصر ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ اور تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ کہ ہر ترقی کرنے والی زبان میں اعلےٰ درجہ اور پایہ کے شاعر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جس وقت کسی زبان کی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ یا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت شاعروں کی کمی قدرتاً ہو جاتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے۔ کہ شاعر کون کہے جانے کے قابل ہے۔ اور شاعر میں کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔ میرے خیال میں سب سے اوّل شاعر کو پورے طور پر زبان داں ہونا چاہئے۔ دوئم جس ملک اور قوم میں وہ پیدا ہوا ہے۔ اور جس ملک اور قوم کے وہ حالات درج کرتا ہے اُن کے مختلف رسم و رواج اور طرز معاشرت سے واقف ہونا چاہئے۔ سوئم انسان کے جذبات خیالات۔ توہمات کا پورا ماہر ہونا چاہئے۔ چہارم موزون طبع ہونا چاہئے۔ پنجم صاحب علم ہونا چاہئے۔ ششم قدرتاً شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والا ہونا چاہئے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ "شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جا سکتے" (Poets are born; not made).

پس ان چھ صفات مذکورہ بالا کی رو سے جو شاعر کے لئے ست ضروریہ ہیں تو آگے امر پر بحث کی جائیگی۔ کہ فاضل اجل عالم متبحر جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم و مغفور کس درجہ اور پایہ کے شاعر تھے۔ کیونکہ مخدومی جناب مولانا سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے برسوں جانکاہ محنت کر کے حیات دبیر مرتب کی ہے۔ اور مجھ سے صاحب موصوف کی فرمائش ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم و مغفور کے متعلق ایک مضمون لکھا جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں (باوجودیکہ مجھ بے بضاعت کا ایسے معاملات میں لکھنے کو قلم اٹھانا ایک ہنسی کی بات ہے) یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

(۱) مرزا صاحب کا زباندان ہونا مقبول عوام وخواص ہے۔ اور مرزا صاحب کی زباندانی کا پورا پتہ اُن کے کلام سے ملتا ہے۔ مرزا صاحب نے مرد۔ عورت۔ بادشاہ۔ فقیر۔ شہری۔ دہقانی۔ بوڑھے۔ بچے۔ فاضل۔ جاہل۔ خادم۔ بازاری وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کے حالات نظم فرمائے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ اُن لوگوں کی زبان کو سرِمو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر کسی بچے کی گفتگو کا موقع ہے۔ تو بچے کی زبان کا پاس رکھا ہے۔ پیارے پیارے اور دلکش لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ بہادر جوان کی گفتگو نقل کرتے وقت زبان پُرجوش استعمال کی ہے۔ نوکروں۔ غلاموں۔ دہقانوں اور جاہل سپاہیوں کی زبان ہوبہو اُسی قدر شرفا کی زبان سے گری ہوئی کام میں لائی گئی ہے۔ جیسی کہ فی الواقع ہوتی ہے۔ غرضیکہ جس پایہ اور فن کے آدمی کا فوٹو اُتارا ہے۔ اُس کی زبان ویسی ہی باندھی ہے۔ مرزا صاحب کی نظم میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا۔ جس کو اردو سے گرا ہوا کہا جا سکے۔ بلکہ کہنا پڑیگا۔ کہ مرزا صاحب کی زبان ٹکسالی ہے۔ اور ہر طالب علم کو مرزا صاحب کی نظموں سے اردو زبان سیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی زبان عام فہم نہیں ہوتی۔ غلط ہے۔ مرزا صاحب نے ضرور کہیں کہیں فارسی اور عربی کے سخت لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ مگر وہ استعمال ضرورت کے موافق اور ضروری ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مرزا صاحب کو اردو کے لفظ نہ ملے۔ تو عربی فارسی کے لفظ استعمال کر ڈالے۔ کیونکہ بہت سا کلام مرزا صاحب کا (مندرجہ حیاتِ دبیر و موجودہ دفتر ماتم) اس قدر سلیس ہے۔ کہ جو خود اپنی نظیر ہے۔ اور جس کی نقل کرنا اگر غیر ممکن نہیں۔ تو سخت مشکل ضرور ہے۔

یہ مرزا صاحب ہی کا حوصلہ اور کام ہے۔ کہ ہر سہ کلام سلیس سے سلیس اور دقیق سے دقیق اُنھوں نے بڑی خوبی سے کہا ہے۔ ورنہ ہر شاعر ایک نہ ایک ایسا پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ کہ جس سے وہ مشکل سے ہٹ سکتا ہے۔ یعنی سہل گو شاعروں سے ادق الفاظ کا استعمال اگر وہ چاہیں۔ تو بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ادق اور مشکل گو شاعروں سے سہل گوئی قریب ناممکن ہوتی ہے۔ مگر مرزا صاحب کے پاس ہر قسم کے الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے۔ کہ ہر مذاق اور طبیعت کے آدمی کو اُس کی خواہش کے موافق بڑی بہتات کے ساتھ اُن کا کلام آسانی سے مل سکتا ہے۔ پس جو شاعر صرف ایک ہی رنگ

کی کلام گوئی میں مشتاق ہیں۔ اُن کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ زبان پر تمام و کمال حاوی نہیں ہیں مگر مرزا صاحب کے لئے ایسا کہنا محض اتّہام لگانا ہے + نتیجہ یہ نکلا کہ زبان اردو پر جس قدر مرزا صاحب کو قدرت ہے۔ دوسرے شاعر کو نہیں معلوم ہوتی +

(۲) مرزا صاحب کی ہندوستان اور عربستان کے طرز و طریق اور رسم و رواج سے واقفیت بھی مسلّم امر ہے۔ اور یہ واقفیت اُن کی نکاح ۔ بیاہ ۔ آتش ۔ موت ۔ دھاوا ۔ جنگ ۔ دعوت ۔ تعظیم بزرگان اور پردہ نشین خاتونوں کی سواری ۔ سفر و حضر کے حالات سے جو اُنہوں نے درج فرمائی ہیں ۔ سراسر ظاہر ہوتی ہے ۔ مرزا صاحب نے عرب کے سیدوں کی بارات نکاح ۔ جنازہ کی خاموشی و صبر کے ساتھ طیاری ۔ مبارزان جنگ کی رجز خوانی ۔ خاتونوں کی سواری کے وقت پردہ داری کے اہتمام کو اُن کے طریق اور رسم و رواج کے موافق قلمبند فرمایا ہے ۔ جو بعد وفات بانی اسلام عربستان یا ہندوستان میں جاری تھے ۔ اور ایسا کرنے سے مرزا صاحب کے کلام کا اثر اور اُس کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے ۔ اور سامعین یا مطالعہ کنندہ کی نگاہ کے سامنے اِن واقعات کے سننے یا پڑھنے سے زمانہ سلف کے عربستان اور اُس کے باشندگان کا آنکھوں میں سچا فوٹو کھنچ جاتا ہے ۔ اور کچھ وقت کے لئے وہ اپنے آپکو ناظرین معرکہ کربلا و دیگر واقعات کا سمجھنے لگتے ہیں +

مرزا صاحب کے شاعر بے مثل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے ۔ کہ اُنہوں نے کسی سانحہ یا حال کو اصلیت اور سچائی سے گرا کر نہیں باندھا ۔ اور یہی وجہ ہے ۔ کہ اُن کا کلام اس قدر مقبول اور دلکش ہے ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شاعر کسی عرب کی شادی کا سماں باندھے ۔ اور خلاف دستور عرب عیسائیوں کی شادی کا ڈھنگ اُس شادی میں نمایاں کرے ۔ تو اُس کی نظم گو بندش الفاظ اور دیگر شاعرانہ خوبیوں سے پُر ہو ۔ مگر سچائی سے گرے ہوئے ہونے کی وجہ سے سامعین کے دل پر کچھ اثر نہ کر سکیگی +

(۳) مرزا صاحب کا جذبات ۔ خیالات ۔ توہّمات انسانی کا ماہر ہونا ۔ مرزا صاحب کے نیچر انسانی پر قادر ہونے کی مثالیں اُن کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہیں ۔ مرزا صاحب نے سفر عراق کے وقت دختر مریضہ کو گھر چھوڑ جانے پر اُس کے تنہا رہنے کے خیالات ۔ باپ ماں اور بھائی بہن کے

اُمیر سے جُدا ہونے پر دلی صدمات۔ بہار کہن کے اپنے ننھے سفر میں جانے والے بھائی کے لئے اظہار محبت و رنج۔ والدہ سے نوجوان بیٹے کے جنگ میں جانے کے لئے اجازت چاہنے پر مادری اندیشوں و دلی وسوسوں۔ زندان کی مصیبتوں میں کم سن بچوں کی گھبراہٹ اور خواہشیں۔ اور بزرگوں کے تفکرات وغیرہ وغیرہ انسانی نیچر کو اس متانت سے آراستگی اور سچائی کے ساتھ دکھلایا ہے گویا انسانی دل کو ناظرین کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور یہ مرزا صاحب کی اعلےٰ درجہ کی فضیلت ہے جو دوسرے ہندوستانی شاعروں کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے +

شعراء یورپ کو شعراء ایشیاء پر ترجیح اس وجہ سے دی جاتی ہے۔ کہ شعراء ایشیا عام طور پر مثل شعراء یورپ کے انسانی نیچر کو بیان نہیں کر سکتے۔ شعراء ایشیاء صرف بندش الفاظ۔ سلاست زبان۔ حسن بیان اور دیگر مضامین وعظ و خدا پرستی پر اکثر اکتفا کرتے ہیں۔ اور گو وہ باغ۔ پہاڑ۔ میدان۔ جنگل۔ خلوت۔ جلوت۔ رزمگاہ وغیرہ کے سین بھی کامیابی کے ساتھ کھینچ لیں۔ مگر انسانی نیچر کا فوٹو اُتارنا اُن کی طاقت سے بالکل باہر ہوتا ہے۔ مگر یہ اعتراض مرزا صاحب پر عائد نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے انصاف تو یوں ہے کہ اپنے کمال میں شعراء یورپ کو سراسر مات کر دیا ہے۔ مرزا صاحب نے ایشیائی طرز شاعری یعنی بندش الفاظ۔ خوبصورتی زبان و پابندی قواعد۔ عروض کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیچر انسان کو اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ شعراء یورپ سے جس کا جواب ہونا مشکل ہے گویا مرزا صاحب کے کلام میں دو نا لطف موجود ہے۔ ایک لطافت زبان اور دوسرے نزاکت مضامین۔ پھر مرزا صاحب کے کلام میں ہر قسم کے انسان کے نیچر کو پورے طور پر دکھلایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی نیچر کے اظہار پر مرزا صاحب پورے قادر ہیں۔ اور مثل اکثر شعراء یورپ کے مرزا صاحب کو عورت یا بچے وغیرہ کے دل و دماغ کے خاکہ اُتارنے میں کوئی مجبوری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں جس کی زبان سے وہ کوئی خیال ظاہر کرتے ہیں وہ اُسی کے مناسب حال ہوتا ہے +

(۴) موزونیت طبع مرزا صاحب پر ختم ہے۔ مرزا صاحب نے معمولی آدمیوں کی فرمائش پر گھنٹوں میں وہ ہزاروں اشعار رنگین لکھ کر اُن کے حوالہ کر دئے ہیں۔ مرزا صاحب کا مطبوعہ کلام دیگر ہم بار د

ہمعصر شاعران ایشیا کے مقابلہ میں دوچند سہ چند بلکہ چہار چند ہے۔ اور بہت سا کلام ایسا ہے۔ جو لوگوں کے گھروں میں پڑا ہوا ہے۔ اور جس کی اشاعت کی ابتک نوبت بھی نہیں پہنچی۔ چنانچہ کچھ ایسا کلام بھی حیات دبیر میں فاضل مؤلف نے درج کیا ہے۔ اور باقی ایسے کلام کا پتہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ مگر باوجود ایسے پرگو شاعر ہونے کے مرزا صاحب کا کلام کہیں ایسا دستیاب نہیں ہوتا جو نمونۂ ذہنیت سے گرا ہوا ہو +

(۵) مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے میں شاید ہی کسی کو کلام ہو۔ مرزا صاحب نے جا بجا اپنے کلام میں اکثر معتبر حدیثوں اور روایتوں اور آیات قرآن شریف کے مضامین عالیہ کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے چست بندش۔ بلند پروازیٔ خیال سے تلمیحات۔ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال۔ مختلف بحروں میں نظمیں۔ ردیف کی چسپیدگی اور قافیہ کا مناسب حال ہونا جملہ ایسے امور ہیں جو اُن کے اعلیٰ درجہ کے صاحب علم اور باکمال ہونے پر دال ہیں۔ شاعر کے لئے صاحب علم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بلا صاحب علم ہوئے شاعر سے اُس کے ملک کے لٹریچر اور باشندگان ملک کی زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور نہ اُس کی نصیحت اور پند سے عوام پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ شاعر کی نازک خیالیاں اُسی وقت قابل قدر ہوتی ہیں۔ جبکہ علم و ہنر کے زیوروں سے مرصع ہو کر پبلک میں جلوہ افروز ہوں۔ ورنہ اچھے سے اچھے اور اعلیٰ خیال کا بھدے یا بدنما طریقہ سے اظہار کرنے میں ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور وہ شرفاء اور مہذب لوگوں کی بازیابی سے محروم رہتا ہے +

مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے کی وجہ سے اُن کی نازک خیالیوں نے اردو زبان پر بہت بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور اردو لٹریچر میں مرزا صاحب کے نفس نفیس سے وہ وہ ترقیاں نمودار ہوئی ہیں۔ کہ جن کے نشانات کا قیامت تک منہدم ہونا دشوار ہے +

(۶) مرزا صاحب کے قدرتی شاعر ہونے کے بہت سے ثبوت خود اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ سب سے اول یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کا رنگ اس قدر سلونا ہے۔ کہ اُس کی نقل

دوسروں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ مرزا صاحب کی طرح سے پیدائشی شاعر ہیں۔ اُن کو تو قدرت نے الگ ہی ڈھنگ اور طرز کلام عطا کیا ہے۔ جو مرزا صاحب سے کیوں ملنے لگا۔ اور جو لوگ پیدائشی شاعر نہیں ہیں۔ اُن کے بوتے سے یہ بات بالکل باہر ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کی رنگت حاصل کرنے کے لئے شاعری کے میدان میں ایک قدم بھی چل سکیں۔ کیونکہ مرزا صاحب کی جودت طبع۔ عالی مضامین کی آمد۔ زبان کی شستگی و بیساختگی قدرت نے اُن کو خاص طور پر عطا کی ہے۔ کہ جو اکتساب علم و ہنر اور حصول فضل و کمال کے احاطے سے باہر ہے۔ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مرزا صاحب کے کلام میں مضامین کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے۔ کہ تلاش کرنے والا مضامین کو دیکھتے دیکھتے ششدر رہ جاتا ہے۔ مگر جس قدر زیادہ تجسس کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس کی محنت کا صلہ اُسے ملتا جاتا ہے۔ بعض اوقات مرزا صاحب کے چند پُرزور بندوں کو سُن کر سامعین کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اب سب مضامین (متعلق اس حال کے) ختم ہو چکے ہیں۔ اور آئندہ مرزا صاحب کسی دیگر سلسلہ خیال کو شروع کرینگے۔ مگر یہ یقین سامعین کا فوراً ہی حیرت اور تعجب سے بدل جاتا ہے۔ جب وہ آگے کے بندوں میں نئی نئی اور نرالی نازک خیالیاں مرزا صاحب کی سُنتے ہیں۔ اور بالآخر مجبور ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کو قدرت نے خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ اور مرزا صاحب کے پیدا کردہ مضامین اسی طرح پر خاص ہیں +

تحریر معروضہ بالا سے ناظرین پر ہویدا ہوگا۔ کہ مرزا صاحب کس پایہ کے شاعر تھے۔ اور اس امر کے تصفیہ کو کہ مرزا صاحب سے بڑھا ہوا کوئی اور شاعر اردو لٹریچر میں ہوا ہے۔ یا یہ کہ مرزا صاحب ہی ملک الشعراء اور خاتم الشعراء ہیں۔ میں علم دوست اور قدر شناس پبلک کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ میرا مسلک صلح کل ہے۔ اور میں نہیں چاہتا۔ کہ مرزا صاحب کو اُن کے ہم عصر کسی شاعر پر فضیلت دے کر اُس شاعر کے حامیوں اور طرفداروں کے دل کو رنجیدہ کروں۔ اور ضد کی وجہ سے وہ فیض علم مرزا صاحب سے مستفید نہ ہوں۔ اور اُن کے کلام کا مطالعہ نہ کریں۔ ہاں اس قدر میں کہے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ مرزا صاحب کے احسانات کا جو اردو بولنے والی پبلک اور لکھنؤ اور مقبول شاعر "ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے" جلد مرجانے والی اردو لٹریچر پر اُنھوں نے کئے ہیں۔ معترف ہو کر احسانمند نہ ہونا محسن کشی سے کم نہیں ہے +

آخر میں میں اہل علم کی طرف سے فاضل مؤلف "حیاتِ دبیر" کا جنھوں نے برسوں محنت شاقہ کر کے ایک بزرگ اور محسن ہند کے حالات علم اور فضل کی دُنیا کی پبلک کو پیشکش کئے ہیں۔ اور نوجوانان ہند کو بزرگوں کی عظمت کرنے اور اُن کے احسانات کے ممنون ہونے کا سبق سکھلایا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اپنے مضمون کو فاضل مؤلف کے لئے اِس دُعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ اُن کو دُنیا اور عاقبت میں اس کا اجر نیک عطا کرے۔ آمین ثم آمین +

خادم القوم بیرالال ادھولیہ (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ جوڈیشل سکرٹری محکمہ محتشمہ خاص دربار کوٹہ دام اقبالہ)

تقریظ عالی جناب عالم علوم معقول و منقول مولوی حکیم محمد مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ

علوم قدیمہ کے محققین نے پرانے کتبوں۔ عمارتوں کے کھنڈروں۔ زمین دوز شہروں اور سکّوں پتھروں کی امداد سے علوم و فنون کے بیش بہا جواہر اکٹھے کئے ہیں۔ تحقیقات کا سلسلہ روز بروز معلومات کے ذخیرہ میں ایسا معتدبہ اضافہ کر رہا ہے۔ کہ خدا جانے آگے چل کر کیسی کیسی کارآمد چیزیں ہاتھ آنے والی ہیں۔ مگر انسانی تفتیش نے ریاضی کے مسلمہ مسائل کے سوا اب تک کہیں حق الیقین کا درجہ نہیں پایا۔ کیسے ہی نتائج و براہین کے بہتوں سے مستحکم دعوے پیش کئے جائیں۔ مگر تردیدی احتمالات اور نقض و منع کے حملے انہیں شکست دینے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اب اگر

دلائل مثبتہ کی قوت مدافعت کی پوری طاقت رکھتی ہے۔ ردّ و انکار کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ اور جدوجہد کے قلعہ پر کامیابی کا جھنڈا نصب ہو جاتا ہے۔ بادِ مُراد ناخدا بن کر جہاز کو ساحلِ مقصود پر جا لگاتی ہے۔ تحسین و آفرین کے نعروں سے عالمِ تحقیق گونج اُٹھتا ہے۔ واہ وا اور سبحان اللہ کی صدائیں زبانوں سے نکل کر دماغ میں پہنچتی ہیں۔ اور قوائے ذہنیہ میں تحریک۔ خیالات میں جوش اور ارادوں میں ایسی برانگیختگی پیدا کرتی ہیں۔ کہ وہ قدم تحقیق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ متجسّس نگاہیں اپنی خواہشات اُن کے استقبال کے لئے بھیجتی ہیں۔ اور متلاشی دل آغوشِ شوق جدید معلومات کے لئے کشادہ اور ادراک و فہم پردانہ کے بازو کھول کر نئے علمی سرمایہ کی تحصیل شروع کرتے ہیں۔ فکر و خیال رسائی کے ذریعہ ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کامیابی در حیاتِ عام کے ہم نہیں دیکھتے۔ کہ دُنیا میں کوئی مسئلہ بے چون و چرا تسلیم کر لیا گیا۔ اور تمام عالم نے سرِ قبول جھکا لیا؟ ایسی حالت میں اگر اہلِ جرمن علوم و فنون کا موجد یونانیوں کو بتائیں۔ یا بعض انگلستانی محقق یہ سہرا ہندوستان کے سر باندھیں۔ یا علامہ زلفن۔ شارلو۔ اور مورخ گبن وغیرہ کے نتیجۂ تحقیقات سے ایشیائے کوچک کے باشندے ثابت ہوں۔ ہم کسی کے سر پر تاجِ ایجاد و ابداع نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ سب اپنے اپنے دلائل و پیرایۂ استدلال میں اُنہیں پُرانے اعمال ناموں کی شہادت پر وثوق رکھتے ہیں +

ممکن ہے۔ کہ عربی مورخین اور اہلِ سیر سے پہلے کی تصنیفات علمِ تاریخ و سیر میں موجود ہوں مگر بائبل کے سوا کوئی ایسا قدیم مجموعہ عالم میں موجود نہیں ہے۔ جس کے واقعات کی ترتیب و تدوین خود اُس کی صداقت کی معیار ہو۔ پُرانی رامائن اور گُنہ مہابھارت وغیرہ جن کو مذہبی تقدیس کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ اُن کے شاعرانہ مبالغے واقعات کو امکانِ عادی بلکہ امکانِ عقلی سے بھی اتنی دُور پھینک رہے ہیں۔ جن کے واسطے غلو سے بھی زیادہ بلیغ لفظ وضع ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ عقیدتمند دل اپنے چشم دید حالات کی نسبت غلطی العبارت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ مگر اُن معاملات کے وقوع میں اُمنّا و صدّقنا سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے +

بہرحال کل خراب بمصداق یمہ فرحون کے موافق ہر شخص کا اعتقادی قبلہ اُس کا خفتی میلان ہوا کرتا ہے۔ لیکن مسٹر اسپرنگر مسٹر کالسن ہل جیسے معزز محققوں کی شہادت اور بیشمار تصانیف کے انبار لعینہ اُن تصنیفات میں بے انتہا ایسی کتابیں اور مصنفوں کی فہرستوں کیننہ ہے کہ اب ڈگوایک کتب خانوں میں اُن کا وجود بھی نہیں ہے) اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ کہ مسلمان مورخوں اور سوانح عمریوں کے مصنفوں نے ان فنون لطیفہ کو کس تاریکی اور ظلمت سے نکال کر کس روشنی اور نورانیت تک پہنچایا۔ حضیض دروغ و ناراستی سے اوج صداقت پر چڑھایا۔ قعر ذلت و گمنامی سے تخت بلند نامی پر لا بٹھایا۔ گویا ایک مردہ لاش میں روح پھونک کر اعجاز مسیحائی دکھلایا۔ دربار تحقیق میں راست بیانی کے برقی لیمپ روشن کر دئے۔ تمام حسن و قبح عیب و صواب۔ خوبیاں اور برائیاں دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہی ہیں۔ صداقت کی اکسیر شعاعیں اندرونی حقیقت کو باہر ہی سے دکھلا رہی ہیں۔ اگر ایک مورخ کسی کی طرفداری میں سرشار ہو کر یا غلطی و ناواقفیت سے مسلسل واقعات لکھتے لکھتے غلط نتیجہ کی ٹیڑھی پگڈنڈی پر چل دیا ہے۔ تو ناظرین خود تسلسل حالات سے شاہ راہ حقیقت پر ہو لیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی دشمنی اور کسی قسم کی عداوت۔ کوئی مطلب اور کوئی نفرت اُنہیں کسی واقعہ کے نقل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ علم الرجال اور ترتیب اسناد کا کارآمد ایجاد صرف اُنہیں کو مدد نہیں دیتا تھا۔ بلکہ وہ آج بھی بارہ تیرہ صدی کے بعد اُسی طرح ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ اور ہم جب چاہیں۔ اور جس خبر کو چاہیں۔ مختلف بیانات میں سے چھانٹ کر صحیح و سقیم۔ درست و نادرست بتلا سکتے ہیں۔ آج کون شخص ہمارے مقابلہ میں یہ بتلا سکتا ہے۔ کہ فلاں واقعہ کا ماخذ کہاں ہے۔ اور اُس کے اخباری وسائط کی کیا شان ہے۔ سلسلۂ اسناد میں سچا جھوٹا متقی الحفظ اور ضعیف الحافظ۔ معتبر و نامعتبر شخص ہے یا نہیں +

ابتدا میں فلسفہ، تاریخ و سیر کی زبانی تعلیم ضمناً ہوا کرتی تھی۔ اور ذہنوں میں اُس کا ذخیرہ مجتمع رہا کرتا تھا۔ حسب ضرورت کام میں لاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی علمی بنیاد پڑ گئی۔ ابو مسعود و سلیمان الاعمش وغیرہ نے مختصر یادداشتیں لکھ کر تلامذہ کو دینی شروع کیں۔ جس قدر عہد زمان بڑھتا جاتا تھا۔

اس فن کی ضرورت بڑھتی جاتی تھی +

اس فلسفہ کی بنیاد قائم کر کے مسلّمہ مثبت اصول کے وضع اور پیش کرنے اس طرح مدوّن کیا۔ کہ جو ان قاعدوں کو میزان عدل کر کسی واقعہ کو تولتے ہیں۔ کمی بیشی کا تفاوت جزو رتی تجربہ کی مقدار تک معلوم ہو جاتا ہے۔ آج لندن اور برلن کے کتب خانے جو تاریخوں کی بدولت درج جواہر و گنجینہ الماس پر ترجیح رکھتے ہیں۔ وہ عربی دماغوں کے پریس کے چھپے ہوئے ہیں۔ فلسفہ و ہسٹری کے ذخیرے جن پر یورپ کو ناز ہے وہ سب انہیں بادیہ گرد عربوں کا صدقہ ہے۔ بغداد و اندلس کے دار العلوم اور ان کے متعلقہ کتب خانوں کے چشموں سے یورپ کے جن ہونہار طلبہ نے جدا جدا کیفیت اور الگ الگ مزہ کے گھونٹ پئے تھے۔ وہ ان کے پیٹوں میں جا کر عجب کارساز تخم بن گئے۔ اور جب ان کو اپنے ملک کے دل و دماغ کی زمینیں درست کر کے اعلےٰ پیمانہ پر کاشت کیا۔ تو وہ عجیب و غریب نظر فریب پھل لانے لگے۔ اب وہی عربی تخم یورپین زمینوں میں ایسا پھلا پھولا۔ کہ اس کی دلربا سرسبزی نے موجدوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ بیچارے ابن خلدون سے کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ تو نے کس محنت و دلسوزی سے ان اصول کی تدوین کی تھی۔ اور کب کی تھی؟ جس زمانہ میں نہ کوئی شاہی کمیشن مقرر کئے جاتے تھے۔ نہ قوموں کے دست سخا و کرم جانگذاری و عرق ریزی کی کفالت کرتے تھے۔ نہ خود تدوین کرنے والے کو جانچ پڑتال کے ذریعے میسر تھے۔ نہ جہازوں اور ریلوں کے سیلوں اور فرسٹ کلاس گاڑیاں۔ اور نہ اسٹیشنوں کے ریفرشمنٹ روم سفر کو حضر سے بڑھ کر راحت کدہ بنانے والے تھے۔ نہ ترتیب واقعات و تحقیق حالات کے لئے ڈاک خانے اور تارگھر صحیح اور جلد تر خبروں کے بہم پہنچانے کا وسیلہ تھے۔ سفر اہل ہمت کے نزدیک کتنا ہی وسیلہ ظفر سمجھا جاتا تھا۔ مگر مسافروں کے لئے نمونہ سقر ضرور تھا۔ بڑے بڑے محقق بھوک پیاس کے صدموں سے کوہ و دشت میں مر کر رہ جاتے تھے۔ اور ہزاروں گوہر تحقیق کے ڈھونڈنے والے انسانی اور وحشی درندوں کا لقمہ ہو جاتے تھے۔ مگر تنہا شخص وہ حوصلے اور ہمت کر بیٹھا تھا۔ جو آج منفرد اور متحدہ پارٹیوں سے اس آسانی و قدرت کے زمانہ میں نہیں ہو سکتے۔ ادنےٰ ادنےٰ واقعہ کی تحقیق میں اور ایک ایک حدیث کی تلاش میں دنیا

کے اِس سرے سے اُس سرے تک۔ بغداد سے چل کر اندلس اور مشرق سے مغرب تک کی خاک چھان ڈالتے تھے۔ تب کہیں تصنیف و تالیف پر قلم اُٹھاتے تھے۔

زہری جیسے مشہور محدث کو مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات کی نسبت معلوم ہوا۔ کہ حرث بن فہر سے چند ایسے الفاظ آخر حدیث میں روایت کیے گئے ہیں۔ جو اُن کی سند و تحقیق میں کسی میں نہ تھے۔ حرث بن فہر زندہ تھے۔ مگر بے پتہ تھے۔ انہیں خلجان پیدا ہوا اور آسائش و آرام پر خاک ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جوئندہ یابندہ۔ تین سال کی سرگردانی کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آیا۔

ابن عیینہ کو ایک حدیث کی سند میں سہو کا گمان ہو گیا۔ درس و تدریس بند کر کے ایک مدت تک کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف رہے۔ عہد کر لیا۔ جب تک سند کی تصحیح اور اپنے حفظ کی تصدیق نہ ہو جائیگی۔ ہرگز حدیث بیان نہ کرونگا۔ انہیں خوف یہ تھا۔ کہ اگر سہو کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ بیان کرتے وقت کوئی لفظ غلط نکل جائے۔ پانچ سال تک پریشان پھرتے رہے۔ دو بار حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے۔ جس قریہ اور قصبہ میں گذر ہوتا تھا۔ جب درس میں شریک ہوتے تھے۔ کہ سرِ مدعا ڈھونڈتے تھے۔ لوگ ان کی آمد پر بڑے شوق و رغبت سے حدیث سننے کے لئے آتے تھے۔ مگر اپنی دردناک حالت پر خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے۔ پانچویں سال سبب بن عتیک ان کے گھر مہمان ہوئے۔ اثنائے طعام میں انہوں نے ایک حدیث آداب طعام میں اُسی سند سے بیان کی۔ جس میں ابن عیینہ مشتبہ تھے۔ انہیں جو سند یاد تھی۔ اُسی کی تائید مہمان کی زبان سے ہوئی۔ یہ سنتے ہی اُچھل پڑے۔ اور گھنٹوں روتے رہے۔ جب گریہ و زاری سے افاقہ ہوا۔ تو مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر وسیع پیمانہ پر تمام علما و محدثین شہر کی دعوت میں سب اثاث البیت بیچ کر لگا دیا۔ اُسی دن سے پھر دریائے افادہ و استفادہ زور شور سے بہنے لگا۔

علامہ ابو اسحٰق نیشاپوری مصنف سیرۃ الغزالی نے چونتیس سال کی جانکاہی کے بعد

اپنی بیش بہا تصنیف پبلک میں پیش کی۔ تو دیباچۂ کتاب سُنتے ہی اُن کی عالی ہمتی اور تحقیق و تفتیش کی جانکاہیوں کا دلوں پر سکّہ بیٹھ گیا۔ یہ اولوالعزم سوانح نگار تمام اُن شہروں۔ قریوں۔ وادیوں اور صحراؤں میں خود سفر کر کے پہنچتا تھا۔ جہاں جہاں امام غزالی کے پہنچنے کی خبر سُنتا تھا۔ اگرچہ امام غزالی کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ مگر وہ جہاں اپنے علوم کی روشنی پھیلا آئے تھے۔ ابھی اُن تجلیوں میں کمی نہ آئی تھی۔ اس لئے مصنف ممدوح کو نہایت عجیب و غریب اور سچے حالات مسلسل واقعات ملتے چلے گئے۔ اس لئے یہ کتاب امام غزالی کے حالات کا ایک روزنامچہ بن گئی۔

یہ دو تین قصے بطور نمونہ اس اندازہ کے لئے لکھ دئے ہیں۔ کہ ذرا ذرا سی بات کی تحقیق میں کیسی سخت جسمانی محنتیں برداشت کی جاتی تھیں۔ اب اس تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھئے۔ کہ جب روایت ان استحکامات سے مکمّل پائی جاتی تھی۔ تب ہر واقعہ اور بیان کو درایت و فہم کی کسوٹی پر کستے تھے۔ منطقی میزان میں تولتے تھے۔ فلسفہ کے پیمانوں اور ذہن و ادراک کے قدموں سے ناپتے تھے۔ اسبابِ علل کی جستجو کرتے تھے۔ حالات گردوپیش سے تطبیق دیتے تھے۔ رسوم و اوضاع و قواعد تمدن زمانی و مقتضیات احوال سے توفیق کرتے تھے۔ آپ کی تصنیف اس قدر تراش خراش اور ایسی دیکھ بھال اور صحت و سقم کی پڑتال کے بعد جو مجموعہ شائع کیا جاتا تھا۔ اگرچہ حقائق و واقعات کا لب لباب۔ رائے صائب اور اصابت خیال کا نتیجہ ہوتا تھا۔ لیکن اس پر بھی۔ پرکھنے والوں کو مذہبی طرفداری یا رسوخ عقیدت کی یا انسانی تنفر کا شبہ ہو جاتا۔ تو مقررہ قواعد کو پیش نظر رکھ کر خود اصلاح کر سکتے تھے۔ مگر سبحان اللہ یہ کیسے دماغ کیسی منصف طبیعتیں پائی تھیں۔ کس قدر عدل صاف تھے۔ کتنے بلند خیال تھے۔ کہ تعصب کے الزام سے بری رہنے کے لئے کسی واقعہ اور کسی کیفیت کو چھپاتے نہ تھے۔ خواہ اُس کی تردید میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیتے۔ مگر واقعہ کا ادائے فرض میں سنگ راہ تصور کرتے تھے۔

اس انصاف پسندی کو دیکھیے۔ کہ میں نے آج تک عربی زبان میں چھوٹی بڑی سب ملا کر بارہ سوانح عمریاں جناب امام ابوحنیفہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اور دس بارہ کتابوں کے

نام ان موجودہ کتابوں میں اوہ نظر آئے۔ ان دہ لکھی ہوئی کتابوں میں سے آٹھ شافعیوں کی اور چار حنفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ شافعی مصنّفوں نے امام ابوحنیفہ کے زہد و تقدس۔ علم و فضل اور اُن کی اصلی صفت قوت اجتہاد و استنباط مسائل کی تشریح میں جس تقدم و کمال کو ثابت کیا ہے۔ حنفی مصنّفوں کی کتابوں میں وہ بات نہیں ✦

صاف ظاہر ہے۔ کہ تکمیل کا مرتبہ بغیر محنت و جانفشانی اور بلا امتداد زمانی کے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ وہی پھل جو درخت پر آفتاب کی شعاعوں سے تدریجی حرارت حاصل کر کے اور ہوا کے صدموں۔ پانی اور برف کے طمانچوں کو برداشت کر کے دو ہفتہ میں پختہ ہوتے ہیں۔ وہی توڑ کر جب پال میں دبا دئے جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ نہیں گذرنے پاتا۔ کہ نرم اور پیلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا لطافت و نفاست میں۔ کیا مزہ اور خوشبو میں۔ کیا صورت اور رنگت میں کیا تازگی اور نظر فریبی میں دونوں برابر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ سال۔ ساگوان۔ آبنوس وغیرہ جن کی لکڑیاں صدیوں کام دیتی ہیں۔ برسوں میں جا کر اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ اُن کی لکڑی کام میں لائی جائے۔ اس لئے قدرت کا عام اصول یہی نظر آتا ہے۔ "دیر آید درست آید و ہرچہ زود آید دیر نپاید" ✦

ایک بڑے قابل مصنّف پر لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ برسوں انتظار میں مبتلا رکھ کر تم ایک کتاب مرتب کرتے ہو۔ اور بیسیوں بار اُس پر نظرِ ثانی کرتے رہتے ہو۔ تب کہیں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ میں ایسی تصویر بناتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہے ✦

جلدی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ لفظوں کی رنگینی اور عبارت کی ظاہری خوبیوں کے سبب کچھ دنوں تصنیف کی قدر و منزلت ہو جاتی ہے۔ مگر جب گہری نظریں تنقیدی نگاہیں عمارت کی اندرونی خرابیوں تک پہنچتی ہیں۔ تو پلاسٹر کے نیچے کی تمام بدنمایاں عیب و صواب کھل جاتے ہیں۔ وہ بہار وہ رنگ روپ وہ چمک دمک سب کافور ہو جاتی ہے۔ وہ طلسمی لیمپ چشم زدن میں گل ہو جاتے ہیں۔ وہ دھوکے کے پھول نکتہ چینی کے پہلے ہی تھپیڑے سے ہمیشہ کے لئے کمھلا کر رہ جاتے ہیں۔ پھر التفات کی نظریں تمنا بھری نگاہیں اُنہیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔ کھوٹے مال کو دیکھ کر مشتاق دل

اور خریدار طبیعتیں بھر جاتی ہیں۔ اور تصنیف کے خوشنما پوسٹ کو کس مپرسی کا پالا مار جاتا ہے +

بالکل یہی حال ہمارے مخدوم و حبیب الاحترام شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مدظلہ کی عجیب و غریب تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" کا ہے۔ اخبارات میں اشتہار دیکھ کر شوق پیدا اور ولولہ خریداری پیدا ہوا۔ اوّل تو مثل مشہور "بڑے گھر کی بڑی بات"۔ آپ کی عربی و فارسی کی ادبی قابلیت۔ اسلوب بیان کی دلکشی۔ اردو کی نامور تصنیفات جنھوں نے اردو دلائف سے پوری لائبریری کو مستغنی کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی تھیں۔ کہ عجیب جامع اور لاجواب کتاب ہوگی۔ دوسری مسرت یہ تھی۔ کہ موازنہ میں جناب انیس و حضرت دبیر دونوں کے حالات صحیح ایک محقق کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہونگے۔ حضرت انیس کی بعض ادھوری سوانح عمریاں دیکھنے کا تو اتفاق بھی ہوا ہے۔ لیکن اردو کی کس قدر بدنصیبی ہے۔ کہ آج تک اپنے اس محسن و مربی کی سوانح عمری سے اُس کا دامن خالی ہے۔ گو مرزائے مرحوم کا فضل مکمل کسی روشناسی کا محتاج نہیں ہے۔ ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را

مگر کیا اُس جم غفیر کے لئے باعث ننگ و عار نہیں جو آپ کی اصلاح سے مستفید ہو کر مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کیا اُن شعرائے نامور کو شرم نہیں آتی۔ جو شاعری کے ساتھ نا تربے عمل ہیں کہ نظیر اکبرآبادی کی بے نظیر سوانح عمری حضرت شہباز کے ہاتھ سے شائع ہو جائے۔ ذوق و غالب و داغ وغیرہ اساتذہ کے کارنامے تازہ رکھنے کے لئے حضرت حالی و آزاد و احسن اپنے فرائض خلاقی سے سبکدوشی حاصل کر چکیں۔ مگر مرزا دبیر جیسے کثیر التلامذہ اور عام فیض کے حالات مرتب ہونے کے لئے ایک ایک کا منہ تکیں۔ اس لئے جب معلوم ہوا۔ کہ علامہ شبلی نے لکھنؤ کے قیام کا شکریہ اس صورت میں ادا فرمایا ہے۔ خواہ مخواہ دل میں اُن کی شکر گذاری کا احساس ہوا۔ مگر آہ اُس ملال و افسوس کا اظہار کسی طرح ممکن نہیں۔ جو سرسری طور پر موازنہ کو پڑھ کر ہوا۔ اور جس قدر زیادہ غور کیا جاتا تھا رنج و ملال کا تھرمامیٹر ڈگریوں چڑھتا چلا جاتا تھا۔ اُمید یہ تھی۔ کہ علامہ شبلی کی تصنیف منصفانہ طور پر اُس جھگڑے کا قطعی فیصلہ کر دیگی۔ جو حضرت انیس و دبیر کے معتقدین میں عرصہ تک جاری رہا ہے۔

اُن کی جادو بیانی۔ اُن کی وسعت معلومات سے تاریکی۔ ادبی۔معنوی۔بیانی فوائد پہنچیں گے۔ مگر بجائے
اُس کے معلوم ہُوا۔ کہ ہم جس قدر آگے بڑھ رہے ہیں۔ تاریکی وظلمت بڑھتی جاتی ہے۔ جو کچھ اب
تک پڑھا لکھا تھا۔ سب غارت ہو کر لاعلمی اور حیرت کے پردہ معلومات پر پڑتے چلے جاتے ہیں۔
مختصر یہ ہے۔ کہ آپ نے جس بیدردی سے دبیر مرحوم کی خوبیوں پر خاک ڈالنے کی عجیب وغریب سعی
فرمائی ہے۔ ہم آپ کے ساتھ حسن عقیدت رکھتے ہُوئے یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ عجلت اور
جلدی میں آپ حضرت دبیر کے کمالات کا اندازہ نہیں فرما سکے۔ حُسن کو عیب اور خوبیوں کو بُرائیاں
سمجھ گئے۔ آپ اپنی تصنیف کو پبلک سے انٹروڈوس کرانے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے۔ تو غالباً
خود آپ کی مشہور قابلیت اور بلند نظری ضرور تمام کتاب پر خط نسخ کھینچ دینے پر مجبور کر دیتی۔ کیونکہ
جس کتاب کی بنا ہی غلطی پر ہے۔ اُس کے مسائل بناء الفاسد علی الفاسد کے مصداق ہیں۔ باوجود
اس تمام قلق وافسوس کے ایک بڑی خوشی یہ ہے۔ کہ موازنہ کی تصنیف سے عام تصنیف وتالیف
میں ایک شورش برپا ہو گئی۔ طبیعتوں میں خلش اور خارش کے ساتھ تحریک بڑھنے لگی۔ سچ ہے۔
بعض المفاسد یورث المقاصد۔ مُلک میں ایک ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کہ حضرت
دبیر کے صحیح حالات اور ہر قسم کے کلام کا نمونہ پبلک میں پیش کر کے بتلایا جائے۔ کہ جامع کمالات
ہونے کے لحاظ سے یہ بے نظیر شاعر کیا پایہ رکھتا ہے۔

مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین شائع ہُوئے۔ موازنہ کے اونٹ سے
جواب بھی دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ مگر میں نے جس قدر دیکھے وہ متانت وتہذیب سے بہے گرے
ہُوئے ہیں۔ کہ اُن کے وجود سے عدم اچھا تھا۔

مگر ہمنا شاعر بے نظیر خوش بیان وخوش گو جناب مولوی سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی
ایک مدت مدید سے نہایت ثبات واستقلال کے ساتھ حالات شعرائے مرثیہ گو کی ترتیب میں
مصروف تھے۔ حیات دبیر کا ذخیرہ بہت کچھ فراہم تھا۔ جس قدر اُس کی اشاعت میں دیر
ہوتی تھی۔ شائقین کی تمناؤں کا خون ہوتا تھا۔ مگر آپ کے مستقل ارادے کامل جانچ پڑتال کے

بغیر اُسے روشناس ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ کا یہ خیال تھا۔ اور بالکل درست تھا کہ انسان کوئی کام کیسی ہی نیک نیتی اور کتنی ہی کوشش کے ساتھ انجام دے۔ اُس میں اول تو نقص رہتا ہی ہے۔ مگر نہ ہونے پر بھی ملامت کرنے والے اُسے خلعت قبول نہیں پہناتے۔ لیکن انسان کو اپنی ممکن طاقت۔ واقعات کی تصدیق۔ حالات کی صحت۔ انتخاب کی وسعت اور ہر بحث کے متعلق رائے کی اصابت واستی کام کی تقویت میں ضرور مبذول کرنی چاہئے۔ اور یہ باتیں مدت تک سلسلہ تفتیش کو جاری رکھنے کے بغیر نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے خدا جانے کب اور کیونکر حیات دبیر کی رونمائی ہوتی۔ یہ صرف موازنہ کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔ کہ حضرت ثابت نے فراہم شدہ سرمایہ شاہانہ، دوڑی کوششوں اور بیحد جانفشانیوں سے اپنے خیال میں جلد سے جلد مرتب فرماکر مطبع کو بھیج دیا۔ دلی جوش نے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں مکمل کرادیا +

حضرتِ ثابت بلند خیال۔ وسیع المعلومات۔ عربی وفارسی کے بااستعداد صاحب علم ہیں۔ مذہبی پختگی کے باوجود صلح پسند اور عجب مرنجان مرنج بزرگ ہیں۔ اخلاق وانسانیت کا مجسمہ کہے جاسکتے ہیں۔ زبان پاکیزہ ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معارفانہ بحثوں سے احتراز کرتے رہنے اور دونوں شہروں کے کاملوں کی سلاست برتنے والے ہیں۔ شعر گوئی میں ان کا درجہ موجودہ زمانہ کے نامور اُستادوں میں ہونا چاہئے۔ تمام عمر غزل کہتے رہے۔ اب کچھ احتراز سا ہے۔ کلام عیوب سے پاک۔ اُصول شاعرانہ کی بندشوں میں جکڑا ہوا بہت مضمون خیز ہوتا ہے۔ طبیعت میں ایجاد دلچسپ واختراع دلکش بھی ہے۔ افسوس ملازمت کی پابندی کے سبب عمر کا بہترین حصہ ایسی جگہ گذارنا پڑا۔ جہاں کمال واہل کمال کے قدر کرنے والے نہیں۔ لکھنؤ یا دہلی میں مگر فارغ البالی میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملتا۔ تو آج اُستادی کا ہندوستان میں ڈنکہ بجا دیتے +

کچھ تو آپ کے مذکورہ اوصاف سے اور کچھ آپ کی جانکاہیوں سے آپ کی تصنیف کا تمام خوبیوں کو جامع ہونا لازم قرار پایا ہے۔ اس لئے حیات دبیر کو لعوز نکھنے کے بعد

میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اُسے مجمل طور پر بیان کرتا ہوں +

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ دبیر کے سچے شیدا کے قلم سے نکلی ہے۔ جو مرحوم کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر ادب و تہذیب یا سخن فہمی و تحقیق نے مرزا صاحب کے مقابل میر انیس کی حق تلفی نہیں کرنے دی۔ اور جس عقیدت یا انصاف کے ساتھ مرزا صاحب کے معترضین کو تحقیقی جواب دئے ہیں۔ حضرت انیس کو بھی اعتراضات سے بچانے کی ویسی ہی کوشش کی ہے +

زُبَان

کسی کی تعریف میں صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں۔ کہ وہ اہل زبان ہے۔ کیونکہ تمام اہل زبان مضمون کے ادا کرنے پر یکساں قادر نہیں ہوتے۔ بلکہ اُنہیں میں سے بعض کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح مافی الضمیر کو سامع کے ذہن نشین کر ہی نہیں سکتے۔ بعض ایسے ثقیل اور فصاحت سے گرے ہوئے لفظوں کی بھرمار کرتے ہیں۔ کہ معمولی پڑھے لکھے آدمی اُن کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب میں جس زبان سے کام لیا گیا ہے۔ وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نہایت صاف روزمرہ ہے۔ الفاظ اپنے معانی مطلوبہ کو نہایت وضاحت سے ادا کرتے ہیں۔ ثقیل الفاظ۔ متنافر کلمات۔ متروکہ محاورات۔ وحشی و اجنبی کلمات۔ بازاری روزمرہ سے پاک ہے۔ جن معانی کے ادا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ لفظوں نے دوش بدوش مساعدت کی ہے۔ سلاست عنان بعنان دوڑتی ہے۔ صفائی قدم بقدم چلتی ہے۔ چستی شانہ سے شانہ ملائے ہوئے ہے۔ عبارتوں کا ارتباط سلک مروارید بنا رہا ہے۔ بیکار اور بھرتی کی تفسیری عبارتیں نہیں۔ تطویل لاطائل و اختصار مخل سے گریز ہے۔ فقرہ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بڑے بڑے جملے نہیں ہیں۔ کہ کوسوں پر جاکر خبر نکلے۔ اور ذہن پراگندہ ہوکر دیدے محوروں کو کھو بیٹھے۔ برموقع برموقع لطائف ظرائف دلچسپی کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں +

اسلوب بیان

بیان کا طرز بہت دلکش ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں۔ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ جہاں کسی بات پر زور دینا مدنظر ہے۔ اُس کے لئے ویسے ہی زوردار الفاظ اس ترتیب سے جاتے ہیں۔ کہ محض

اسلوب بیان ہزاروں شہادتوں کی قائم مقامی کر رہا ہے۔ جس مسئلہ کے اثبات کی ضرورت تھی۔ اُسے دلائل محکم سے ثابت کرنے میں کمی نہیں کی۔ اور اس سلسلہ اور ترتیب سے لائے ہیں۔ کہ قیاسات برہانی کا بدیہی نتیجہ اثبات مدعا ہو جاتا ہے +

جس واقعہ سے متاثر کرنا منظور ہے۔ اُس کے لئے سوز و گداز سے بھرے ہوئے الفاظ دل کو نرم کرنے کا پورا کام دے رہے ہیں۔ جس بات کی تردید کرنی چاہی ہے۔ اُس کے اکھاڑنے میں جس قدر پہلو نکل سکتے تھے۔ سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ اداے مضمون کا سلیقہ موقع اور محل کی شناخت کا ملکہ مصنف کو ایسا آتا ہے۔ کہ جہاں بالضرور رکاوٹ ہونی چاہئے۔ کتاب کا دیکھنے والا سحر کلام سے مسحور ہو کر بے روک ٹوک سرپٹ گذر جائیگا +

ترتیب مضامین

چھاپہ خانوں کی کثرت اور اُن میں بیکاری کا مشغلہ یہ رہتا ہے۔ کہ کسی معمولی استعداد کے آدمی کو دس پانچ روپیہ دے کر کوئی ناول یا سوانح عمری لکھوالی۔ اور چھاپ کر ٹکے سیر سے کئے۔ وہ طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ کہ جیسے پہلے خلفا و سلاطین اور اولیا و صلحا کی سوانح عمریاں بکتی پھرتی ہیں۔ اُنہیں دیکھنے کے بعد دماغ میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ انہیں کے مقابلہ میں حیات جاوید۔ حیات سعدی۔ سیرۃ النعمان۔ البرامکہ۔ حیات غالب وغیرہ بے شمار ایسی باوقعت تصنیفیں موجود ہیں۔ جو اپنی انشا پردازی۔ ترتیب مضامین و تحقیق واقعات میں اس فن کے اعلےٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں +

مگر مصنف حیات دبیر نے اپنی تصنیف کو سلسلہ مضامین میں کسی کا تابع نہیں رکھا۔ اور جہاں جس مضمون کا ارتباط و ضرورت دیکھی۔ ایک کے بعد دوسرا مضمون شروع کر دیا۔ مثلاً مرزا صاحب کے اخلاق حمیدہ و عادات پسندیدہ کا بیان۔ ولادت۔ حلیہ۔ استعداد وغیرہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سے ہیڈنگ لکھ کر بظاہر طول دیا ہے۔ بہت سی باتیں جداگانہ عنوانوں کی محتاج نہ تھیں۔ شاید نئی روشنی کے شیدا اسے پسند نہ کریں۔ لیکن بغور دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقامی تسلسل اسی کا مقتضی اور مقتضائے حال یہی تھا۔ واقعات کی کثرت اور ہر واقعہ کی نوعی خصوصیت نزاکت پسندی میں جہاں کا نہ شرخی چاہتی تھی۔ اور یہ بہت ایک خوشنما اختراع ہے ؛

بعض مطالب اور حالات مکرر بیان میں آئے ہیں۔ دیباچہ میں اس کا سبب خود یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ ناظرین دُور پہنچ کر گذشتہ بیانات کو شاید بھول گئے ہوں۔ یہ سبب کچھ دلچسپ نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بعض حالات و مقاصد کی کیا خصوصیت ہے۔ اور عموماً ایسا کیا جائے۔ تو کتاب حشو و زوائد کا مخزن ہو جائے ؛

مرزا صاحب کے ابتدائی عمر کے حالات کی پرداز اس شان سے اُٹھائی ہے۔ کہ دیکھنے والے کو اُن کے ہونہار ہونے کا خود بخود یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پہلے ہی سے اُن کی آئندہ ترقیوں پر پیشین گوئی کرنے کا سامان ہو جاتا ہے ؛

یہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ کہ حالات کو مرتب ظاہر کرنے کے لئے قیاسات اور سطحی رائیوں سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہی لکھا۔ جو معتبر ذریعے سے معلوم ہُوا۔ جو بات ٹھیک طور پر معلوم نہ تھی۔ اُس پر قلم نہیں اُٹھایا۔ مرزا صاحب کے کلام کی تدریجی ترقی اور زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کی مثالیں۔ اُس زمانہ کی سوسائٹی کا پُورا نقشہ خوب کھینچا ہے ؛

مرزا صاحب کے شاگردوں کا اگر مجمل ذکر ہوتا۔ تو معمولی بات تھی۔ اور عربی و اردو کی بہت سی سوانح عمریوں میں ایسا کیا گیا ہے۔ حقیقت میں ایک فاضل کے کمال کا یہ بھی بیّن ثبوت ہے۔ کہ اُس کے تلامذہ میں بڑے بلند پایہ اور نامور لوگ دکھلائے جائیں۔ مگر مصنف حیات دبیر نے اسے ایک مستقل مضمون قرار دے کر شاگردوں کے حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ یہ حصّہ مرزا صاحب کی لائف سے غیر متعلق سا اور مصنّف کے ایک خاص خیال کی تکمیل ہے۔ کہ وہ شعرائے مرثیہ گو کا مستقل تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ مُلک کو احسان ماننا چاہئے۔ کہ مرزا صاحب کی بدولت ان با وقعت شعرا کے حالات مفت میں معلوم ہو گئے ؛

حیات دبیر کا موضوع اگرچہ ایک محترم زندگی کے حالات ہیں۔ مگر جہاں اپنے ہیرو کے کلام کے محاسن و فضائل کا ذکر کیا ہے۔ وہاں علم معانی و بیان کے مسائل کی تشریح اور فصاحت و بلاغت کے نکات کا حل اس خوبی سے کیا ہے۔ کہ ان فنون ادبیہ پر کوئی ایسی جامع اور معمولی استعداد والوں کو تمام سے فائدہ پہنچانے والی کتاب اُردو زبان میں موجود نہیں۔ غوامض علوم کو ایسے سہل پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ کہ اُسے پڑھ کر ایک بے استعداد آدمی اچھی لیاقت پیدا کر سکتا ہے +

صنعتوں کے بیان میں بڑا کمال ظاہر کیا ہے۔ لفظی اور معنوی صنائع کو دو جداگانہ فصلوں کے تحت میں ہر صنعت کا جداگانہ عنوان قرار دیا ہے۔ اُن کی تعریفیں بہت جامع و مانع اور سہل ترین الفاظ میں لکھی ہیں۔ اور بہتر سے بہتر مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے چھانٹ کر درج کی ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے۔ اوّل اُسی صنعت میں قرآنی آیت پیش کر کے دکھلایا ہے۔ کہ آج جو کم فہم مسلمان صنائع اور بدائع کو فصاحت اور حسن کلام میں مخل بتاتے ہیں۔ وہ فصاحت کے معنی نہیں جانتے۔ وہ انگریزی کی تقلید میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں۔ کہ اُنہیں انگریزی بے رنگ تصویر نازک اور خوشنما نقش و نگار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی کیاری سے جس میں کہیں کہیں گلاب۔ موتیا وغیرہ کے پھول بھی زیبائش بڑھا رہے ہیں۔ وہ میدان اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں برساتی پانی کے اثر سے مختلف وضع اور رنگ الگ قد و قامت کے پودے پھوٹ نکلے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ بالذات کلام کے حسن و قبح سے اُنہیں بحث نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ جانتے ہیں۔ کہ جو ترکیب شکسپیر۔ گولڈ اسمتھ۔ بائرن۔ ہومر۔ ڈینٹی نے نہیں برتی۔ وہ نامقبول اور ٹکسال باہر ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا۔ کہ اتفاقاً لف و نشر۔ تجنیس اور ایہام وغیرہ کسی انگریزی کے شاعر کے کلام میں مل گئے۔ تو یہ خانہ خراب بے تمیز تعریفوں کے طومار باندھ دیتے ہیں +

مصنف حیات دبیر نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بھی بتلایا ہے۔ کہ یہ صنعتیں کس جگہ کلام میں تاثیر۔ دلکشی۔ قوت۔ خوبی اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ اور کہاں اور کس طرح سخن کو اُس کے پایہ سے گرا کر بے اثر

اندر بند کر دیتی ہیں - اس موقع پر یہ افسوس کرنا پڑتا ہے - کہ جن صنعتوں کو معرض بیان سے نکال دیا گیا ہے - اُن کی مثالیں بھی مرزا صاحب کے کلام میں بافراط موجود ہیں - اگر تھوڑی سی تکلیف اور کی جاتی - تو اِسکا حصہ ایک مستقل تصنیف علم بدیع کی ہو جاتا +

حیات دبیر ایک انسانی کارگذاری ہے - اس لئے بعض ایسی باتیں بھی اُس میں ضرور ہیں جن پر تنقیدی نگاہ اپنا عمل جاری کر سکتی ہے - مثلاً الفاظ کی تین قسمیں دل چسپ - دلگداز اور دلکش بیان فرما کر مسائل کی عمارت ان پر قائم کی ہے - حالانکہ ان اقسام میں باہمی نسبت تضاد نہیں ہے - اور جب تک من وجہ بھی تضاد نہ ہو - آپس میں تقسیم نہیں ہو سکتیں - وہی لفظ جو اپنی بیرونی خوشنمائی یا اندرونی اثر سے دل کو کھینچتا ہے - ممکن ہے ایسا پُر لطف اور شیریں ہو - کہ بار بار اُسے دُہرانے سے قند مکرر کا مزہ آئے - اور اس حیثیت سے دلکشی کے ساتھ اُس میں دلچسپی بھی پیدا ہو جائے - اور اُسی لفظ کے بار بار خیال میں لانے اور تصور کے لب زبان سے ادا ہونے کا نتیجہ سوز و گداز ہو جائے - جیسا کہ ہم صوفیہ کرام کے یہاں سماع کی مجلسوں میں دیکھتے ہیں - کہ بعض اشعار دلچسپ معلوم ہوتے ہیں - اور اُن کے بار بار پڑھنے سے کیفیت و وجد جو دلچسپی و دلکشی و دلگذاری کے انتہائی نتیجے ہیں - ہویدا ہوتے ہیں - اس صورت میں وہی لفظ تینوں اوصاف سے متصف ہو سکتا ہے - یہ یا اس قسم کی جزوی فروگذاشتیں ایسی ہیں - کہ جن سے کوئی کتاب بشکل خالی ہو سکتی ہے علاوہ اُس کے حسن معنوی میں خلل انداز نہیں ہیں +

تصحیح حالات

مصنف ممدوح لکھنؤ کے رہنے والے اور حضرت اوج مظلہ کے رشید شاگرد ہیں اور چونکہ آپ کے نانا جناب سید محمد رضا ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے نامور شاگرد اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ خوان اور دربار دبیری کے دوامی حاضر باش تھے - اس لئے مصنف ممدوح نے مرثیہ خوانی کی گود میں پرورش پائی - اور منقبت کی آب و ہوا سے نشو و نما ہوئی - ہوش بھی نہ سنبھالنے پائے تھے - کہ اس فن کی مشق میں لگا دیئے گئے - گھر میں اسعد ان ہی چرچے رہا کرتے تھے - اور یہی مشغلے

ہُوا کرتے تھے۔ رات دن میر صاحب اور مرزا صاحب کے حالات گذشتہ و موجودہ کے سُننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مجلسوں میں ان بزرگوں کو پڑھتے سُنتے اور دیکھتے تھے۔ جس جلسہ میں گذر ہوتا تھا۔ یہی ذکر یہی فکر۔ چونکہ یہی مذاق فطرتی تھا۔ اور اسی کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ اسی میں لطف آتا تھا۔ اور اسی میں وقت گذارنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح بھولے ہُوئے حالات تازہ ہوتے رہتے تھے۔ عنفوان شباب تو پورا لکھنؤ کی دلچسپیوں میں بسر ہُوا۔ لیکن اس کے بعد لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ تاہم سال دو سال میں ایک دو مہینے کو لکھنؤ کا پھیرا ہوتا رہا۔ وہاں پہنچ کر آئینہ حفظ کے زنگ پر جلا ہوتی رہتی تھی۔ مرزا صاحب کو ابھی کچھ ایسا زمانہ نہیں گذرا۔ کہ اُن کے صحیح حالات کا پتہ چلانا دشوار ہو۔ ہاں مخالفوں کی بیہودہ سرائیوں اور محبین کی خوش اعتقادیوں نے اصلی حالات میں تحریف و تخلیط بہت کچھ کر رکھی تھی۔ تحقیق و تفتیش اور تنقید و انتخاب کی ضرورت تھی۔ تحقیق کرنے والے کے لئے یہ کام بہت آسان تھا۔ اوّل تو حالات کا بڑا ذخیرہ دماغ میں جمع تھا۔ دُوسرے برسوں سے ان حالات کو متفرق صفحات پر غیر مرتب جمع کر کے اُن کی تحقیق و تفتیش میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں جس مجمع میں کچھ سراغ ملتا تھا۔ اور جہاں ہم خیال ملتا تھا۔ یہ بندۂ خدا کچھ نہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے لاتا تھا۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ جن لوگوں سے حالات لئے گئے۔ اُن میں اکثر صلحا۔ علما۔ مجتہدین بڑے باوقعت و حرمت لوگ ہیں۔ اور جن تحریرات سے امداد لی گئی ہے۔ وہ اکثر معتبر کتابیں ہیں۔ جن میں شاہی فرمانوں کی نقلیں اور عمائد سلطنت کے خطوط بڑی مستند شہادتیں مہیا یہ ذرائع ہیں۔ جن سے نہایت صحیح حالات دستیاب ہُوئے۔ اور جانچ پرتال سے اُن میں جو کوئی جزوی اختلاف تھا۔ اُسے تطبیق دی گئی۔ سچے حالات کے ملنے سے صحیح رایوں کے قائم کرنے میں کامیابی ہُوئی۔ غالباً ایک مورخ اور سوانح نگار کی اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اُس کے مخزن میں صداقت و راست بیانی کا ذخیرہ بھرا ہُوا ہو۔ میں دوبارہ حضرت ثابت کا شکریہ ادا کرتا ہُوا اُن کی جانفشانی کی کامیابی پر داد دیتا ہُوں۔ کہ اُن کی عنایت سے ناخدائے نظم اردو کے صحیح حالات کا مجموعہ ہماری آنکھوں کو ضیا و نور اور دل کو لطف و سرور بخش رہا ہے +

حضرت معترض کے کلام نثر و نظم میں تمام وہ باتیں موجود ہیں۔ جن کو آپ کی عیب جو نظر حضرت مرزا صاحب کے لئے عیب و نقص قرار دیتی ہے)۔ مگر مصنف حیات نے محققانہ پہلو نہ یا مطلب نہ کیا۔ جوابوں کی معقولیت اور وقعت صرف اس بات سے معلوم ہو سکتی ہے کہ حضرت مرزا کے جس کلام پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ اکثر جگہ اُس کی تائید میں نظم سے جس آیۂ قرآنی لکھ کر یہ بتلایا ہے۔ کہ اگر اس اعتراض کے مورد حضرت مرزا ہو سکتے ہیں۔ تو معاذ اللہ کلام الٰہی پر بھی یہ اعتراض وارد ہوگا۔ نہج البلاغہ کے بلیغ خطبوں اور ادب و معانی و بیان کی مسلم عبارتوں کو نقل کر کے غلط اعتراضوں کے استیصال میں بلیغ کوشش فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ تحریر کی متانت بیان کی سنجیدگی۔ الفاظ کی تہذیب اور اسلوب بیان کی شائستگی۔ مجیب کی عالی ظرفی۔ بلند خیالی کی شہادت دے رہی ہے۔ اور اس پیشینگوئی پر جرأت دلاتی ہے۔ کہ کتاب کی مقبولیت عام ہوگی۔ اور معقولیت کا اعتراف کیا جائیگا۔ بلکہ عجب تو مخدومنا علامہ شبلی کی صاف گوئی سے امید بندھتی ہے۔ کہ اس کا دلی خیر مقدم اور فرما کر اپنے اعتراضات واپس لے لینگے۔

یہ بھی بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مصنف نے مرزا صاحب کی کثیر الکلامی کو پیش کر کے اقرار کیا ہے۔ کہ جو شخص اس قدر نظم لکھنے والا ہو۔ اُس کے کلام میں کہیں تعقید وغیرہ خرابیوں کا آ جانا کچھ بعید نہیں۔ لیکن اس پر بھی خواہ مخواہ اُن اشعار کو جن میں در حقیقت کچھ غرابت یا ثقل ذوق سلیم کو محسوس ہوتا ہے۔ معترض جناب نے بھی بے عیب بتلایا ہے۔ اور اُن کی ثقالت و غرابت سے انکار کیا ہے۔ یا میر صاحب اور مرزا صاحب کے وہ اشعار جن کی فصاحت کا مقابلہ علامہ شبلی نے کر کے میر صاحب کے اشعار کی فصاحت ظاہر کی ہے۔ آپ نے کبھی تو نہیں بلا تامل نقل کر کے صرف یہ کہہ دیا ہے۔ کہ دونوں فصیح ہیں۔ یا دونوں ہم پلہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں
آیہ نہ آیا مثل علیؑ مدح جود میں	قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں

دونوں بزرگوں نے ایک ہی واقعہ کو انتہائے جود و سخاوت کی نظر میں پیش کیا ہے۔ گو مرزا صاحب کو بندش ریا مدنظر ہے۔ لیکن فصاحت کلام کا بیّن فرق ہے۔ یہ کہنا کہ دونوں یکساں ہیں۔ یا تو خوش عقیدگی ہے یا اخفائے حق۔ بلکہ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے ایسے بیشمار ہم مضمون شعر موجود ہیں۔ جو فصاحت میں میر صاحب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ علی ہذا میر صاحب کے بہت سے اشعار بھی مرزا صاحب سے بہتر فصاحت ہے۔ اور اس کے ذیل میں چند مثالیں لکھ دینا کافی جواب تھا +

یا مثلاً مرزا صاحب کے حسب ذیل مصرعے ع

لے کر رطب دلو دوم کہنے لگے شاہ

ع مستغرق رُ درج اُس نے کیا تب غسل وشیر

ع اس سر پہ دھرے ہاتھ یہ قسمیہ اجل ہے

ان میں ثقیل الفاظ نہ بھی مانے جائیں۔ مگر ہیئت ترکیبی نے قطعی ثقالت پیدا کر دی ہے۔ اور اس سے انکار کرنا محض طوفان محبّت ہے۔ ہاں ان کی ثقالت سے انکار کرنیکی بجائے اگر تسلیم کر کے یہ کہہ دیا جاتا۔ کہ ایسی ثقالتوں سے کوئی مبرا نہیں۔ اور مثلاً میر صاحب کے چند مصرعے لکھ دئے جاتے۔ تو زیادہ محققانہ اصول کی پابندی ہوتی +

انتخاب کلام حضرت دبیر

زمانۂ حال کے سوانح عمری لکھنے والے اس بات کا قطعی فیصلہ صادر کر چکے ہیں۔ کہ جس کا حال لکھا جائے۔ اُس کی خوبیوں کے ساتھ اصلی بُرائیاں ضرور دکھلائی جائیں جس کتاب کو اس تکمیل سے خالی پاتے ہیں۔ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ثابت کو

زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری تھا۔ لیکن کم سے کم ہوایڈیشن یا جلد اوّل اس کی کھتلائی نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ جلدمیں اور خدا کرے اسی جلد کے دوبارہ شائع ہونے کا موقع آئے تو اسی جلدمیں یہ کمی پوری کردی جائے +

یہ تو ہوسکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی پرہیزگاری اور وسعت اخلاق کے سبب اُن سے شرعی اور اخلاقی معصیت و جرم ایسے نہ سرزد ہوئے ہوں۔ کہ وہ روزروشن میں لائے جائیں۔ اور حضرت ثابت انھیں درج کتاب فرمائیں۔ لیکن عالم شاعری میں اُن سے ضرور لغزشیں تو ہوئی ہونگی جو نظر آرہی ہیں۔ ان کو قلم کے دائرہ سے بالکل خارج کردینا یہ کھٹکنے کے قابل بات ہوتی۔ لیکن بعض اعتراضوں کی گرد سے دامن بچاکر گذرجانا اور کہیں کہیں دبی زبان سے بعض لغزشوں کو بشریت کے حوالہ کردینا اور مصالحانہ طریقہ پر خم ٹھونک کر لڑنے کو مستعد نہ ہونا یہ ایسی باتیں ہیں۔ کہ اس کی اشک شوئی کرکے شدید طرفداری کے الزام کو دفع کرتی ہیں۔ اور کتاب کو ہر طرح کی تکمیل کا پایہ بخشنے میں ساعی ہیں +

شاید بعض ناظرین انتخاب کی وسعت کو طوالت سمجھیں۔ مگر یہ بات نہیں۔ مرزا صاحب کے کلام کو بہتر اور برتر ثابت کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی نمبر لکھنے ضروری تھے۔ کیونکہ معترضین کی تردید کا یہ اچھا اور آسان طریقہ اور شائقین کے لئے منتخب مضمون کی افراط کا ذریعہ ہے۔ وہ کلام جواب تک شائع ہونے سے محفوظ ہے۔ اس میں سے بھی کلام منتخب بڑی کوشش سے حاصل کیا گیا ہے۔ خوبی یہ ہے۔ کہ کلام منتخب کے انتخاب کا حق ادا کیا ہے۔ اچھا سے اچھے ہوئے مضمون اپنی مرثیوں سے مربوط ہیں۔ کوئی قسم نظم انتخاب سے محروم نہیں رہی +

یوں تو عام طور پر حضرت انیس کے مرتبہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن بڑی ایمانداری یہ بھی ہے۔ کہ بالمقابل ہم مضمون جو کلام دونوں کا نقل کیا ہے۔ یکساں یا بہتر کلام چھانٹا ہے۔ یہ لغزش قدم کا موقع تھا۔ اور ایک طرف کا پلہ جھکنے سے ہیرو کی منقصت اور دوسری طرف کا

پھٹکارے سے انصاف کا خون اور ملک کے سادگی پسندوں سے لڑائی مول لینی تھی +

مقابلہ شعرائے عرب و عجم و انگلستان و ہند

اس مقابلہ سے یہ دکھلانا مقصود ہے۔ کہ جن شعرا سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے بلند پروازی و نازک خیالی و مضمون آفرینی کے میدان میں اُن سے کتنی قدر آگے بڑھکر جھنڈا گاڑا ہے۔ اور متفقہ مضامین میں کیا کیا جدتیں پیدا کی ہیں۔ بالخصوص شوب بیان بدل کر کیسی کیسی دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں۔ مقابلہ اور شاعر سے اس نتیجہ کے امیدوار ہونے پر میں اپنی رائے آئندہ ظاہر کرونگا۔ یہ مسلم ہے۔ کہ یہ شدید محنت اور عظیم الشان تلاش اس حد تک نہایت قابل قدر ہے۔ کہ ہم گویا ایک وقت گھر بیٹھے مختلف ولایتوں کے پھل پھول دیکھ سکتے ہیں۔ کھا سکتے ہیں۔ سونگھ سکتے ہیں۔ ایران و ہندوستان کے انار طائف عرب کے رمان اور انگلستان کے پومگرانیٹ ایک ہی ڈش میں رکھکر سامنے رکھے ہیں۔ کسی کے دانے سُرخ کسی کے گلابی۔ کسی کے سفید ہیں۔ کوئی میٹھا ہے کوئی کھٹا۔ کوئی کھٹا میٹھا۔ کوئی کسیلا۔ یہی حال مختلف مقامات کے شعرا کے مقابلہ کا ہے۔ اگر جی دیکھنا چاہے۔ کہ کسی مضمون خاص کو ایران والے کیونکر ادا کرتے ہیں۔ اور عرب کے بدوی اور متمدن کے نازک خیال شعرا کے ادائے مضمون کا کیا ڈھنگ ہے۔ ہندوستانی کیا ملاحت پیدا کر رہے ہیں۔ انگلستانی کیسا بیرنگ سادہ نقشہ دکھلا رہے ہیں۔ تو مختلف دیوانوں کے اکٹھا کرنے اور اُن میں اُس مضمون خاص کی تلاش کی مصیبت اُٹھانی پڑیگی۔ یہاں سب کے یکجائی نمونے موجود ہیں۔ ایک ایسا باغ لگایا ہے۔ جس میں مختلف ملکوں کے گلاب گلاب ایک جگہ۔ سیوتی سیوتی ایک جگہ۔ غرض جدا جدا قسم کے الگ الگ ممالک کے ایک ایک پھول کی خاص کیاری موجود ہے۔ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق جو پھول چاہے پسند کر لے۔ اور پھول بھی کیسے۔ جوہی کے پھیل۔ طرہ تاج قبول۔ کسی کی سادگی ستم ڈھا رہی ہے۔ کسی کا بناؤ سنگار مارے ڈالتا ہے۔ کسی کی پھبن پر دل لوٹ پوٹ ہے۔ ان اعتبارات سے یہ مقابلہ ایک خوشگوار سامان تفریح ہے۔ اور مصنف کی محنت رائگاں نہیں جا سکتی +

اب رہا متصود مقابلہ۔ اُس کی نسبت مجملاً میں عرض کئے دیتا ہوں +

اردو میں متقدمین کے ساتھ متاخرین کے کلام کے مقابلہ کی بنیاد حضرت حالی مدظلہ العالی نے ڈالی۔ لیکن جناب ممدوح کا فیصلہ اس بارہ میں کلی طور پر ناطق نہیں ہے۔ بلکہ صرف فارسی کی محدود شاعری میں ایک زبان دان اور ایک اہل زبان کے برابر ہو سکنے اور اہل زبان سے گوے سبقت لے جا سکنے تک محدود ہے۔ اس لئے ہماری بحث سے خارج ہے +

سُنئے! ہر ملک کی مضمون نگاری اور سخن پردازی وہاں کے رسم و رواج اور اُس ملک کے رہنے والوں کی عادتوں اور طبعی کیفیتوں کا فوٹو ہوتی ہے۔ ملک کے نشیب و فراز۔ خشکی و تری۔ آب و ہوا کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ کہیں کے باشندے ذہین ذکی صحیح الحواس اور کہیں کے رہنے والے غبی۔ کند ذہن اور مخبوط الحواس ہوتے ہیں۔ مقامی تمدن و معاشرت بھی شاعری پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ کہیں کے مُردہ کے جنازہ کے ساتھ باجے بجائے جاتے ہیں۔ گریہ و زاری تمسخر سمجھا جاتا ہے۔ کہیں سر پر خاک اُڑاتے اور بھُس اُڑاتے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ شاعر کے سامنے اور گرد و پیش ہوتا ہے۔ وہی اُس کی تشبیہوں کا ذخیرہ۔ استعاروں کا خزانہ۔ کنایوں کا سرمایہ۔ وسایط مجاز کے قرب و بعد کا باعث ہوتا ہے۔ اور انہیں چیزوں پر شاعری کا دار و مدار ہے۔ دیکھئے۔ یہاں کی بہار کا اور زمانہ ہے۔ اور ہی کیفیتیں ہیں۔ اور ہی طرح گذرتے ہیں۔ فارس کی بہار کا اور وقت اور اُس کی تفریحات و مشاغل کچھ اور ہی ہیں۔ کہیں بہار و خزاں دونوں ندارد۔ الا ان مکاکان کا عالم۔ ہندوستان میں ریا و نمود کا یہ زور شور۔ کہ خیرات بھی نمود کا ذریعہ ہے۔ عرب میں فیاضی کی یہ صفت کہ اِس ہاتھ کی اُس ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ ہندوستان کی عبادتوں میں کبھی ناچ رنگ جزو مذہب۔ عرب سے جن عبادتوں کی اشاعت ہوئی۔ اُن میں سے نماز کی کیفیت کہ آیہ قرآنی موسیقی کی راگنی میں ادا ہو جائے۔ تو نماز ہی ساقط نہیں بلکہ گنہگاری نفع میں۔ قدیم ہندوستان میں پردہ نہیں۔ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں عورت بناؤ سنگار کو کے آئے۔ اور جس ملک کے پیڑ سے جوان کو چاہے چھانٹ لے۔ اور یہ سب سے بہتر شادی قرار دی جائے۔ تو یہاں کا غریب شاعر

حیا و شرم صفات انسانی میں کیوں لائیگا۔ اُس کی بجائے بیباکی۔ عیاری اور چالاکی کی امید کرنا چاہئیے۔ جہاں برستا ہی نہیں۔ وہاں چشم ترکو اُس کا مشبہ کون بنائیگا۔ صحرائے افریقہ کے رہنے والوں کے دماغ میں گنگا۔ جمنا۔ دجلہ اور فرات کی روانی کہاں سے آئیگی۔ یونان کا شاعر ہو مر سر ٹپک کر مرجائے۔ مگر ان لفظوں میں گرمی کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔

وُہ دھوپ کہ مُرغان ہوا کرتے ہیں نالہ
بس ہاتھ رکھا قبضہ پہ اور پڑگیا چھالا

بریاں ہُوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا
اِس دھوپ میں اِس میں کھڑے ہیں شہ والا

پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسم شہ دیں پر

اور کچھ شعر ہی پر منحصر نہیں ہے۔ نثر میں بھی وہی تشبیہیں وہی مجازات کام میں لائے جاتے ہیں مگر نثر کے شرح فقرے وہ نزاکت نہیں پیدا ہونے دیتے۔ شعر میں یہ خوبی ہے۔ کہ جس مضمون کو نثر میں طوالت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اُسی کا دلچسپ اختصار لفظوں کو مقدم مؤخر کرکے موزون پیرایہ میں لے آتے ہیں۔ اس تبدیلی سے وُہی بے اثر منتر کارگر ہو جاتا ہے۔ دلکشی و دلگذاری کی بجلی پیدا ہو کر سُننے والوں کو بیتاب کر دیتی ہے۔ وہی الفاظ جواب تک تاثیر سے مُعرّا تھے اب ہیئت ترکیبی کی بدولت مقناطیسی کشش بھی رکھتے ہیں۔ اور جذب کہربائی بھی موجود ہے۔ مگر نثر ہو یا نظم۔ انشا پرداز ہوں یا شعرا سب اپنے ملکی خصوصیات۔ طبعی جذبات۔ مزمنہ عادات کے احاطہ میں گشت لگانے پر مجبور ہیں۔ تخئیل کا یہ کام ہے۔ کہ اُنہیں معانی میں جو خزانہ خیال میں مجتمع ہیں کتر بیونت کرکے نئی نئی صورت میں جلوہ گر کرے۔ اور تخیلہ جو کچھ ایجاد و اختراع کرکے الفاظ کے جسم میں معانی کی رُوح پھونکتی ہے۔ وہ سب قوائے مخفیہ حسیہ و عقلیہ کی فیاضی ہے۔ اور سب مذکورہ خصوصیتوں کے دائرہ میں رہ کر رنگ روپ۔ قد و قامت۔ وضع اور ڈھنگ میں متمیز ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایرانی شعرا کا منظور نظر انسانی فطرت کے خلاف سہی۔ مگر ملکی عادت کے سبب امرد ہے۔ اور عربی شاعروں کی محبوب جاں نواز عورت اور ہندی شعرا کے زنانے عشق کا مطلوب داڑھی مونچھ والا مچھندر ہے۔ علیٰ ہذا کسی ملک میں موئے بیگون اور چشم ازرق زیبائش حُسن ہیں۔ اور کہیں کالے کالے

بال اور سرگیں آنکھیں۔ اسی طرح ایک ہی ملک میں زمانوں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ جس قدر خیالات و جذبات و رسوم و عادات میں اختلاف ہوتا چلا جائیگا۔ شاعر اُسی کا اتباع کرتا رہیگا۔ کیونکہ وہ سوسائٹی کی حالتوں کا آرگن ہے۔ جب ایک ہی ملک کے مختلف الاوقات شعرا میں باہم قدرتی طور پر امتیاز عظیم ہونا چاہئے۔ تو غیر ملک والے اور وہ بھی جن میں صدیوں کا بُعد بلکہ ہو۔ ایک مرکز پر کیونکر گھوم سکتے ہیں۔ بلکہ تمام خصوصیات مذکورہ کے لحاظ سے اُس وقت میں اُسی زمانہ کے معمولی سے معمولی شاعر کا کلام اور اُس کے خیالات اِس زمانہ کے برتر سے برتر شاعر کے نازک خیالات سے زیادہ مقبول ہونے کے لائق تھے۔ اور اُس وقت کی سوسائٹی میں اس فیشن ایبل مال کا کوئی خریدار نہ ہوتا۔

پس صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ متنبیؔ جیسا اُس وقت کا نازک خیال اگر تیرھویں صدی ہجری میں یہاں پیدا ہوتا۔ اسی زمانہ کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا۔ تو قطعی دُوسرا دبیر ہوتا۔ اور حضرت دبیر اگر متنبیؔ کے زمانہ میں پیدا ہوتے۔ اور اسی سوسائٹی میں پرورش ہوتی۔ تو دوسرے متنبیؔ ہوتے۔ نظر بر معروضہ بالا میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے شعرا کے کلام کا مقابلہ ایک ایسا کام ہے۔ جس کے عدم و وجود میں اگر مساوات کی نسبت بھی ہو۔ تو بڑی کامیابی ہے۔

اب مَیں سمع خراشی کو ختم کرتا ہُوا دُعا کرتا ہُوں۔ کہ خدائے تعالے حیات دبیر کو قبول عام کا خلعت مرحمت فرمائے۔ اور مصنّف علّام کی سعی مشکور کرے۔ فقط

محمد مظہر الہادی سُہیل عفی عنہ طبیب امروہوی۔ کوٹہ۔ ۳ فروری ۱۹۱۳ء

تقریظ* عالم علوم مشرقی و مغربی جناب حکیم سید احمد حسین صاحب مدیر الشفا مقیم ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین والصلوٰۃ والسلام علیٰ

* تقریظ طویل ہو گئی تھی۔ بوجوہ مختصر کی گئی۔ اس میں نطق کے خلیفہ نمبو بیعت انشاء اللہ جلد ثانی میں شائع ہوگی۔

سید المرسلین خاتم النبیین محمد و آلہ و اصحابہ صلوٰۃ و اثمۃ لا یعد بحد و لا یحد بعدد +

دُنیا میں سچی عزت کے مستحق اہل قلم ہیں۔ جن سے بہتر بنی نوع انسان کا اور کوئی خدمتگذار نہیں ہو سکتا۔ مصنفین کا قلم جس عظمت و شان سے عالم پر حکومت کر رہا ہے۔ بڑے بڑے حکمرانوں کو نصیب نہیں۔ بلکہ وہ بھی اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ قلم کی یہ ادنےٰ قدرت ہے۔ کہ جس کو چاہے۔ بقائے دوام عطا کرے۔ اور جس کو چاہے۔ نیک نام اور بدنام کر دے +

جس شخص کا دل تعصب و طرفداری سے پاک اخلاقی فضائل خصوصاً صداقت و عدالت سے مزین اور عشق الٰہی اور ہمدردی و محبت مخلوق کے رنگ سے رنگین نہ ہو۔ وہ شخص قلم ہاتھ میں لینے کا کسی طرح مستحق نہیں +

دُنیا میں[1] صرف مسلمانوں کو ہی یہ فخر حاصل ہے۔ کہ جس قدر انہوں نے بارہ سو سال کے عرصہ میں لاکھوں علماء فصحاء کاملین و فلاسفروں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ اتنی کسی قوم نے نہیں لکھیں۔ اس

---

[1] ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو علم اسماء الرجال کی بدولت وہ عزت حاصل ہوئی جو کسی قوم کو حاصل نہیں۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی گذری ہے نہ اب موجود ہے۔ کہ جس نے مسلمانوں کی مانند بارہ سو سال کے عرصہ میں ہر ایک اہل علم کے حالات زندگی قلمبند کئے ہوں۔ اگر مسلمانوں کی کتب رجال جمع کی جاتیں۔ تو غالباً ہم کو پانچ لاکھ مکمل علماء و مشاہیر کا تذکرہ مل جاتا۔ ان کی تاریخ میں کوئی قرن یا کوئی جگہ ایسی نہیں جس کا کوئی مشہور آدمی سوانح زندگی لکھنے سے بچا ہو +

[2] فن تاریخ میں بہت سے مؤرخ خصوصاً محمد الکلبی اور واقدی اور محمد بن جریر طبری۔ مسعودی۔ مقریزی۔ حمزہ وغیرہ بکثرت ہیں جنہوں نے تاریخ عالم اور کرۂ ارض کے ہر زمانہ کی تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ ابو الفداء۔ نویری اور ابو القاسم قرطبی کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا جنہوں نے اقوام کی ترقی تہذیب۔ مذہبی و ملکی حالات قوانین سیاست و تمدن اور قومی انقلابات پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن سعد کی کتاب طبقات اور محمد بن اسمٰعیل بخاری۔ ابن ابی خیثمہ۔ ابن ابی حاتم۔ ابن شاہین۔ ابن حبان۔ ابن عدی۔ ابن حجر اور ابو الفضل ابن طاہر کی تصنیفات نہایت مشہور ہیں۔ ان میں بہت سی یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان بزرگوں نے راویوں کے اخلاق و عادات کی تحقیقات اور محنت کی۔ راویان کی چھان بین کر کے نیک اور معتبر اور غیر معتبر قرار دیا۔ اور مجروح و ضعیف راویوں کو علیحدہ کیا +

زمانہ میں اگر ہندوستانیوں نے سوانح عمریاں لکھنے کے لئے قلم بھی اٹھایا ہے۔ تو یا تو دلی عقیدت کا اظہار کرکے سوائے تعریفوں کے ان کی کوئی بات بھی قابل تنقید نہ سمجھے۔ یا کسی کی توہین کرکے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ خطا و نسیان ہر آدمی کے خمیر میں داخل ہے۔ کسی شخص کی محض تعریفیں لکھ دینا گویا اسکو انسانیت سے خارج کر دینا ہے۔ ہمیشہ وہی سوانح عمریاں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی جن میں انصاف سے رائے زنی کی گئی ہوگی۔ آج کل بعض سوانح عمریاں ملک کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے نہیں لکھی جاتیں۔ بلکہ کسی خاص شخص کو مشہور کرنے کی نیت سے لکھی جاتی ہیں۔ ایسے اہل قلم ملک کے خدمت گذار نہیں۔ بلکہ اس خاص شخص کے ہیں۔ جس کی تعریفوں کے وہ پل باندھتے ہیں۔ الغرض یورپ نے فن بیوگرافی کو حیرت انگیز کمالیت تک پہنچا دیا ہے۔ جس سے سبق لینا ضروری ہے منصفانہ تنقید کے پہلو بہ پہلو عیوب و نقائص بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کے اخلاق بھی درست ہو جائیں۔ میرا جناب ثابت کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ میں ان کی جانکاہ محنت کا معترف ہوں اور ان کی یہ کتاب کئی وجوہ سے ملک کے لئے مفید جانتا ہوں۔ انہوں نے برسوں کی محنت اور تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے۔ مرزا دبیر مغفور فرشتہ خصلت بزرگ اور اپنی قوم میں مجتہد وعالم دیندار مانے جاتے تھے پس جب کہ قابل تعریف حالات کے ملنے میں بھی دشواری پیش آئی ہے۔ اور زندگی میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹۵ نمبر ۱)

فرقہ امامیہ میں حسن بن علی بن فضال۔ عبد اللہ بن جبلہ نے [illegible] ہجری میں اسماء الرجال کی کتابیں لکھیں۔ اور حبیب بن زیاد نینوی نے [illegible] ہجری میں بعض کی وفات سے تصنیفات کی۔ [illegible] ان کی بن و تعدیل میں کتاب لکھی۔ محمد بن حسن بن [illegible] شیخ محمد بن یعقوب کلینی شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمی۔ نجاشی۔ کشی۔ شیخ ابو جعفر طوسی۔ علامہ حلی۔ تقی الدین بن داؤد۔ شیخ شہید ثانی۔ اسماعیل [illegible] میرزا محمد استرآبادی [illegible] شرف الدین نہایت مشہور و معروف شیعہ ہیں۔ جنہوں نے علم اسماء الرجال میں نہایت مفید کتابیں لکھی ہیں۔

اہل سنت و الجماعت کے یہاں استیعاب۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ کاشف۔ کتاب الضعفاء والمتروکین۔ تہذیب التہذیب۔ تقریب التہذیب۔ تہذیب الاسماء۔ لسان المیزان۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ۔ تدریب الراوی۔ شرح تقریب النووی۔ وغیرہ وغیرہ کتب نہایت مشہور و معروف ہیں۔ — عاجز راقم

ایسے شخص کے عیوب سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ خصوصاً ایک سخی بزرگ کے عیوب پر تو کسی کی نظر ہی نہیں پڑتی۔ بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ تائید ایزدی شامل حال رہتی ہے۔ اس لئے مجتبیٰ ثابت نے ایسے بزرگ کی اخلاقی عیب چینی سے اپنی قلم کو آلودہ نہ کیا۔ ایسے منتقد رصاحب کمال کی اخلاقی عیب چینی کا ثواب نہ تھی۔ حضرت ثابت میرے دوست ہیں۔ اور مہینوں ان کی گفتگو اور کلام سننے اور ان کے خیالات سے واقف ہونے کا مجھے موقع ملتا رہا ہے۔ اور آج کل بھی شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو۔ جو میں ان کی ملاقات سے محروم رہتا ہوں۔ ان کے خیالات اور مضامین پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوا۔ کہ جناب ثابت مرزا صاحب کا مرتبہ دنیا بھر کے شعرائے متقدمین و متاخرین سے افضل جانتے ہیں۔ اور اسی لئے انہوں نے نہایت ثابت قدمی سے عربی و فارسی وغیرہ کے شعرائے باکمال سے مقابلہ کیا ہے۔ تاکہ مرزا صاحب کی فضیلت سب سے اعلیٰ ثابت ہو جائے۔ گویا جناب ثابت نے جناب دبیر مرحوم کے اردو اشعار سے عربی وغیرہ اشعار کا جو مقابلہ کیا ہے۔ وہ شاعروں کی سوانح عمریاں لکھنے والوں کے لئے ایک جدید راہ نکالی ہے +

مجھ سے حیات دبیر جیسی محققانہ کتاب کا ریویو چاہا گیا ہے۔ جب تقاضا حد سے گذر گیا۔ تو میں نے ریویو کے لئے قلم اٹھایا۔ تو یہ کام نہایت ہی مشکل معلوم ہوا۔ کیونکہ دبیر و انیس مرحومین کے کلام بلاغت نظام پر مدت سے تنقید اور رائے زنی ہو رہی ہے۔ اور ایک بڑا ذخیرہ ہر قسم کے لٹریچر کا اخباری مضامین رسائل و کتب کی صورت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سبب سے حیات دبیر پر رائے زنی اور تنقید سہل کام نہیں رہا۔ میرے ہاں یہ سامان موجود نہیں۔ اس کے علاوہ جن حضرات نے بڑے بڑے شاعروں کے ناموں کے ساتھ یعنی شعرائے متقدمین و متاخرین کے فضل و کمال کے تذکرہ میں صرف جناب انیس مرحوم کے اسم گرامی لکھنے پر اکتفا کی ہے خواہ انہوں نے جناب دبیر کی نسبت کچھ بھی نہیں لکھا۔ مگر وہ بھی لائق ملامت ٹھیرائے گئے ہیں +

میری رائے میں اگر محض انیسیئے ہونے کی وجہ سے کوئی شخص جناب دبیر کی واقعی خوبیوں

اور کمالات کا معترف نہ ہو۔ تو بلاشک اس کی یہ تنگ ظرفی لائق ملامت و اعتراض ہے۔ اور
اسی طرح عاشقانِ کلام انیس بھی کر سکتے ہیں۔ مگر بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ کہ جناب دبیر کے
لائق اور مشہور شاگردوں نے کلام انیس سے اپنا تعشق ظاہر کرنے میں لومۃ لائم کی پروا نہیں کی۔
دنیا میں ہر آدمی۔ اور راس کے کام لاثانی ہیں۔ بہت سے اسالیب مرزا صاحب کے کلام میں
ایسے ہیں۔ کہ میر انیس کے ہاں ان کا پتہ اور نشان نہیں۔ ان کی قادر الکلامی اور پرگوئی اظہر من الشمس
و ابین من الامس ہے۔ بعض معمولی الفاظ کو ایسے ایسے اسالیب سے بیان کیا ہے۔ کہ ان کی
وقعت بڑھ گئی ہے۔ جب وہ فلسفیانہ علمی مصطلحات اور مشکل الفاظ کا استعمال دکھلاتے ہیں۔
یا باریک حکیمانہ مسائل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ تو سوائے افاضل ان کی داد اور کوئی نہیں
دے سکتا۔ معمولی سے معمولی خیال اور واقعہ کی ایسی عظمت معلوم ہونے لگتی ہے۔ کہ کامل الفن
محو حیرت ہو کر چلا اٹھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ عالم قدس سے بیشمار معانی و الفاظ یا اسرار و حقائق
کا نزول ہو رہا ہے۔ انہوں نے صدہا عربی و فارسی الفاظ اور اصطلاحات علمیہ کے ہزارہا طرق
استعمال سے زبان اردو کو مالا مال کر دیا ہے۔ ان کی آمد میں بے ساختہ پن اس بلا کا ہے۔ کہ عقل
دنگ رہ جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے سامنے اردو زبان کی ہی نہیں۔ بلکہ عربی و
فارسی کی دیگر زبانیں بھی دست بستہ حاضر ہیں۔ صدہا استعارات و تشبیہات غلامی کر رہے ہیں۔
اور بیسیوں نئے غلام بنائے جا رہے ہیں۔ صدہا کی درخواست قبول نہیں ہوتی۔ جس طرح چاہتے
ہیں۔ ان سے خدمت لیتے ہیں +

صنائع و بدائع کی آسمان سے بارش ہو رہی ہے۔ جن پر جناب کو اس درجہ قدرت و اختیار
حاصل ہے۔ کہ جس وقت چاہتے ہیں۔ استعمال کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ اور مشکل سے
مشکل صنعتوں اور مرصع و مسجع عبارات و الفاظ کو نئی نئی ترکیبوں اور معنی آفرینی کے رنگا رنگ
پھولوں سے گلستان سخن کی ہر روش کو جس طرح چاہتے ہیں۔ نہال کر دیتے ہیں۔ اگر مسائل
حکمیہ و مصطلحات علمیہ کا بیان شروع ہوا ہے۔ تو اُن سے ہی معانی کے اظہار کا کام لیا ہے۔

کہ عالم متبحر بھی حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔ سادہ کلام کے ٹکڑے بھی اپنی سادگی اور عام فہم ہونے میں مشہور اور دل میں گذر جانے والے ہیں۔ جناب دبیر خود عالم و فاضل تھے۔ ان کے شاگردوں میں عالم و فصیح بھی ہیں۔ مجتہد و محدث بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ میرزا نوشہ غالب مرحوم سے اہل زبان اور مجتہد العصر عالی جناب مفتی میر محمد عباس صاحب سے عالم اجل اور فاضل بے بدل ان کی فصاحت کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر جناب میر انیس مرحوم و مغفور کی وہ ادا جس پر ایک عالم مفتون و شیدا ہے بیان کرنا ضروری ہے۔ جناب انیس مرحوم کیفیات نفسانی اور جذبات باطنی یعنی رنج و الم۔ حسرت و یاس۔ تعجب و شرم۔ غصہ و جوش۔ شجاعت۔ خوف و حزن۔ اضطراب۔ مایوسی۔ بیچینی اور محبت وغیرہ کو بیان ہی نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں کے دل میں جس حد تک چاہتے ہیں۔ پیدا کر دیتے ہیں۔ قلوب خلائق کی باگ ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ واقعات کی ایسی سچی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کہ وہ ہو بہو ذہن کے سامنے متمثل ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو اس سلسلہ و ترتیب سے کھینچتے ہیں۔ کہ جب تک پوری شبیہ کسی حادثہ یا واقعہ کی نہیں اتر لیتی۔ یا واقعی نظارہ کسی موقع کا آئینہ ذہن میں منطبع نہیں ہو لیتا۔ اس وقت تک آدمی تمام واقعات بلکہ اپنے آپ کو بھی بھولا رہتا ہے۔ اور ابتدا میں جس خوبی اور جن رنگوں اور دلکش طرز سے وہ تصویر یا نقشہ عالم خیال میں کھنچنا شروع ہوتا ہے۔ اسی خوبی اور انہیں رنگوں اور اسی طرز کو لئے ہوئے اختتام پا جاتا ہے۔ اور انسان اس کے خاتمہ تک اور تمام باتوں بلکہ اپنے آپ سے بھی غافل رہتا ہے۔ بیچ میں نہ کسی دوسرے واقعہ کا خیال آتا ہے۔ نہ مشکل یا مغلق و اجنبی الفاظ کے آجانے سے طبیعت الجھتی ہے۔ اور نہ لفظی ہیر پھیر میں پڑ کر اصل واقعہ سے دل کو دوسری جانب ہٹانا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے۔

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیس + جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

یہ نہایت مختصر بیان ان دونوں بزرگوں کے کمالات کا ہے۔ اگر ان کے کلام کا مقابلہ دنیا کے مشہور شعراء سے کیا جائے۔ تو بیجا ہے۔ مگر میں اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا معترف اور کم فرصتی

وکثیر الاشغالی کا مقر ہوں۔ مطب کی اہم ذمہ داریوں اور طبی تحقیقات کے سبب سے ہر وقت دماغ تھکا ہوا رہتا ہے۔ مگر جب اپنے سچے مخلص کی تعمیل ارشاد اور بار بار کے سخت تقاضے کے سبب کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہوں۔ تو دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اور اپنی کمزوری پر نظر کر کے کہنے لگتا ہوں کہ میں کیا اور میری رائے زنی کیا ؎

گنجایش عداوت اغیار یک طرف ٭ یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ان مجبوریوں کے علاوہ میرے سچے اور مخلص احباب میں عاشقان کلام جناب انیس مرحوم بھی ہیں۔ اور قدردانان جناب دبیر مرحوم بھی۔ بعض نازک دماغ سچے دوستوں کا یہ حال ہے کہ دونوں بزرگوں سے کسی ایک کے لئے کچھ لکھنے پر بھی اعتراض ہو جاتا ہے۔ پس میں اس کتاب کا ریویو جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں لکھ سکتا ۔

جناب [illegible] شرف میرے سچے بے ریا احباب اور نہایت مخلص رفیقوں سے ہیں۔ ساری کتاب کو طبع ہونے سے پہلے میں نے پڑھا ہے۔ اور مولوی شبلی کے غلط اعتراضات کے جوابات لکھنے اور موازنہ دبیر و انیس پڑھنے کی ترغیب بھی اس کتاب کے دیکھنے سے ہوئی تھی۔ اس کتاب میں زبان اردو اور شاعری کے ایسے نکات بھی قلمبند ہوئے ہیں۔ جو شاید اردو میں بہت نہیں لکھے گئے۔ اور معانی بیان اور صنائع و بدائع کا اردو میں استعمال دکھلانے سے زبان کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ اور گو ان باتوں کو سوانح عمری سے کچھ تعلق نہیں۔ مگر ادب اردو کی اس خدمت نے اس سوانح عمری کو نہایت باوقعت اور مفید بنا دیا ہے۔ ایک اور مفید ایجاد جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ یہ ہے کہ جناب دبیر مرحوم کے فاضل اور لائق شاگردوں کے حالات بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ بلکہ شاگردوں کے شاگرد بھی شامل کرلئے ہیں۔ ان کے حالات کا قلمبند ہونا مشکل تھا۔ جناب دبیر مرحوم کے حالات زندگی کے سبب سے ان کے شاگردوں کو

---

[1] روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۱۲ء و ۲۶ اگست ۱۹۱۳ء میں میرے دو مضامین جواب اعتراضات مولوی شبلی شائع ہو چکے ہیں۔ راقم ماجد اللہ حسین ٭

بقائے دوام حاصل ہوگیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ باکمال کی عظمت و فضیلت
خدمات کو فروغ و شہرت لائق اور فاضل شاگردوں کی حسن خدمات و سعی سے ہوا کرتا ہے۔
ی کہ ایسے شاگردوں کا ملنا جو عقیدت مندی — اور اپنے اُستاد کی محبت و عشق میں
ار ہوں۔ بلکہ اپنی عزیز سے عزیز شے کو بھی نثار کر دینا فخر جانتے ہوں۔ بڑی خوش قسمتی
• جناب دبیر کے کلام بلاغت نظام میں یعنی انکی شاعری میں ہر رنگ موجود ہے۔ کیونکہ مرثیہ
میں ڈراما۔ ایپک۔ پاسٹورل اور لائرک (عشقیہ) اور ہر قسم کی شاعری جمع ہو سکتی ہے۔ سلسلہ
نے شناس ہے۔ کہ جناب دبیر کا کلام سوز میں بیشتر پڑھا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات
والوں کی فرمایش پر بیٹھے بیٹھے مرزا صاحب نے بین کے بند لکھ دئے ہیں۔ جس
باغ میں کچھ بھی عقل ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کے فہم کے مطابق اصلاح خیالات اور اصلاح
کرنا اپنا فرض خیال کریگا۔ اور مرزا صاحب مرحوم و میر انیس مرحوم سے کسی ایک کو دوسرے
یح دینے سے احتراز کریگا۔ کیونکہ ملک کی عمدہ باعزت [illegible] میں محض ایک کو دوسرے پر
دینے کے دلائل و براہین کی ایجاد و اختراع سوائے دل آزاری اور قلم گھسائی۔ اور
د کاغذ کے نقصان اور آپس کی منافرت بڑھنے کے ہرگز دیگر کوئی نتیجہ پیدا نہ کریگی۔ دونوں
بے اپنے رنگ میں کامل اور منفرد ہیں۔ خدا سب پاک و صدیق کو درست رکھتا ہے۔

میر انیس بھی اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی اور مرثیہ گوئی میں کچھ کم عزت کے مستحق نہیں ہیں۔
مشہور ذی علم تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "بلاشبہ جناب انیس کی شاعری ایسی ہی قدرت رکھتی ہے کہ
اس کا موازنہ ہومر۔ ورجل۔ فردوسی۔ ملٹن۔ والمیک اور ورڈس ورتھ سے نہ کیا جائے۔ اُن
کھانا بیرون امکان ہے۔ جن لوگوں نے مختلف اقوام کی شاعری پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ
کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے"۔ خود جناب دبیر کے دل میں میر صاحب مرحوم کی بڑی عزت
س جگہ میں نے صرف جناب کا اسم گرامی لکھا ہے۔ کیونکہ اللہ بیطہ حیات دبیر ہے۔"

عاجز سید احمد حسین (الراجی الی رحمۃ رب المشرقین)

اس لئے دُنیا میں ہر چیز اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اور ہر شخص کا رنگ جُدا ہے ۔ ا ۔۔۔
دستخط بھی تو بعینہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی شخص بھی تو دو چیز دو کو ایک
جیسی بنانے پر قادر نہیں +

مَیں خدائے کریم سے دُعا کرتا ہُوں۔ کہ یہ سوانح عمری ملک کو فائدہ پہنچائے۔
اور مصنّف ممدوح کو اپنی محنت و عقیدت کا صلہ دونوں جہاں میں مل جائے +

خاکسار سیّد احمد حسین مدیر الشفاء
مقیم کوٹہ (راجپوتانہ)
یکم فروری سنہ ۱۹۱۳ء

کتبہ احقر الافقر محمد اسمٰعیل کاتب و نقاش لاہوری عفی عنہ بقلم خود

ر فہرست کتب امامیہ جنرل بک ایجنسی
مانک پھلہ۔ لوہاری منڈی۔ لاہور

ۃ الایمان } مؤلفہ المولانا مولوی سید محمد مہدی صاحب۔ زبان اردو میں جو مشتمل
ہے بیان وجود ذیجود جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
لیہم السلام کے خصوصا ظہور جناب صاحب الامر علیہ السلام بہت بسط کے ساتھ
لواریخ عیسائیہ و براہمہ و اسلامیہ سے ثابت کیا ہے۔ اور انجیل و توریت و زبور و
ے تمام پیشینگوئیوں کی اصل عبارات بحوالہ صفحہ وسطر خوب لکھی ہیں۔ اور تمام
دو میں معنی لکھ دئے ہیں۔ الحق یہ کتاب جس کے نام نامی سے خوبی مضامین کا
تا ہے۔ ایسی زبردست دیڑزد تصنیف و تالیف ہے۔ کہ جس کا مثل اس
تک دوسرا نہیں دیکھا گیا۔ تمام اعتراضات کے تسلی بخش و دنداں شکن
ئے ہیں۔ خوب یقین جان لیں۔ کہ اس کتاب میں اُن معلومات کا کافی ذخیرہ
کیا ہے۔ جو آج تک کسی اردو کتاب میں نہیں ملیگا۔ وجہ یہ کہ اُن معلومات
معدن کتب عربی و فارسی و کتب نصاریٰ و براہمہ میں مرقوم ہیں۔ مگر اس
بسبب فقدان علم و کمی شوق کے اُن سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ناظرین کی
کے واسطے اس کتاب کی مختصر فہرست مضامین ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

و حال سبب تالیف کتاب۔ مقدمہ۔ باب اوّل در بیان توحید۔ باب دوم
عدل۔ باب سوم در بیان نبوت و ثبوت اس کا کتب آسمانی و دیگر مذاہب سے
ؤں کے بید سے مع شرح و بسط کے۔ باب چہارم در بیان امامت فصل

اوّل - بیان امامت کا مع ثبوت احوال ائمہ معصومین علیہم السلام دیگر مذاہب کے۔ خصوصًا ہنود کی کتب بید سے اور مہاوید کی پیشینگوئی۔ فصل دوم بیان ولادت مسعود السعادت امام عصر حجۃ اللہ عجل اللہ فرجہ و قصہ حضرت نرجس خاتون ع کے۔ فصل سوم - اسماء القاب امام ہدایت مآب و وجہ تسمیہ و خطاب و ... تذکار نام خاص جناب و دفعیہ دخل معاندین۔ فصل چہارم - بیان ... وغیرہ بعض اخبار و ادلہ اثبات حقیقت قائم ... معاندین طول عمر میں جناب کے۔ فصل پنجم - بیان معجزات و خوارق عادات ... کے جو اس برگزیدۂ خالق ارض و سماوات سے ظاہر ہوئے۔ فصل ششم بیان احوال سفراء کے جو زمان غیبت صغرےٰ میں درمیان شیعہ اور حضرت قائم ع کے واسطہ ہیں۔ فصل ہفتم اُن لوگوں کا بیان جنہوں نے شرف فیض صحبت سے شرافت ابد حاصل کی۔ فصل ہشتم - علامات ظہور و خروج سفیانی و دجال کے بیان میں۔ فصل نہم - بیان اثبات رجعت - باب پنجم - معاد کے بیان میں +

غرض کہ اس کتاب کی جس قدر تعریف لکھی جائے کم ہے۔ اس وقت تک اردو میں ایسی جامع کتاب دُوسری نہیں ملتی۔ اگر ہزار بار پڑھیں۔ رُوح کو تازگی ہوگی۔ عجیب دلچسپ اور مفید مضامین ہیں۔ دُعائیں و قصائد و ساقی نامہ وغیرہ - اس کتاب کا لطف دیکھنے سے آتا ہے - جیسی یہ عمدہ کتاب ہے - ویسی ہی خوشخط جلی قلم چھپوائی گئی ہے - اسکی تقطیع ۲۰×۲۶ - حجم ۴۸۴ صفحہ - بسبب خوبی کتاب کے یہ دعوے سے کہتا ہوں کہ جس صاحب کو بعد مطالعہ کتاب ناپسند ہو۔ شوق سے واپس کریں۔ مگر کتاب میلی و چرک و پارہ نہ ہونے پائے - خرچہ ڈاک ہر حالت میں منگانے والے کے ذمہ ہوگا - یہ کتاب اس وقت تک عہ قیمت پر فروخت ہوتی ہے - لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ کوئی صاحب علم اس کتاب کے فیض سے بے بہرہ نہ رہے - اسی لیے اس کی قیمت اب صرف عہ کردی ہے - جو مفت کے برابر ہے +

نوٹ :- باقی فہرست ٹائٹل کے صفحہ ۳ و ۴ پر دیکھو +

تحقیق المبین اردو ترجمہ حق الیقین یہ کتاب سرکار شریعت مدار ملا محمد باقر مجلسی اعلی اللہ مقامہ کی تصانیف سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے ۔ اس کتاب میں مجلسی علیہ الرحمہ نے اصول دین اور ضروری مسائل شرعیہ کو قرآن و احادیث سے ایسے سہل طور پر ثابت کیا ہے ۔ کہ کم فہم آدمی بھی خوب سمجھکر حق الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے ۔ اوّل اس کتاب کو مصنف علام علیہ الرحمہ نے عربی میں لکھا ۔ چونکہ یہ مقبول خاص و عام ہوئی ۔ اس سبب سے پھر سلیس فارسی میں اس کا ترجمہ کیا ۔ اب چونکہ عام رواج اردو زبان کا ہے ۔ اس وجہ سے جناب قبلہ مولوی سید [illegible] صاحب مرحوم جائسی مترجم حیات القلوب و نور الابصار وغیرہ نے اس کتاب مستطاب لاجواب کا عام فہم اردو میں ترجمہ کیا ۔ اور پھر (سونے پر سہاگہ) فخر الحکماء ظہیر العلماء مولانا سید علی اظہر صاحب قبلہ نے ملاحظہ فرما کر اس طلائے خالص کو زر کامل العیار بلکہ زر جعفری ... کو عنایت فرمائے ۔ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت کتاب نہایت خوشخط کاغذ مصری ولایتی سفید تقطیع ۲۰ × ۲۶ پر چھپ کر تیار ہے ۔ ضخامت ... صفحہ ۔ قیمت صرف دو روپے (عنہ) جو ... برابر ہے ۔ اس وقت تک اس قدر ... شیعہ مذہب کی کوئی کتاب آپ نے نہ دیکھی ہوگی ۔

چشمۂ نجات اردو ترجمہ **عین حیات** ۔ کتاب عین حیات کے نام نامی سے تمام شیعی دنیا واقف ہے ۔ درحقیقت یہ کتاب طالبان معرفت و عقبیٰ کے لئے روح افزا ... ہے ۔ اس کتاب میں ہر ایک حال کے ساتھ ... و قصص و حکایات عجیب و دلچسپ لکھی ہیں ۔ ہزار بار اس کتاب کو پڑھیں ۔ دل سیر نہ ہوگا ۔ قیمت صرف ... روپیہ چار آنہ عہ ۔

تذکرۂ علامۂ ملا محمد باقر مجلسی اعلی اللہ مقامہ بہت کوشش اور محنت سے کتب معتبرہ سے جمع کر کے تمام حالات مثلاً حالات بزرگان مجلسیؒ ۔ زمانہ طفولیت سے

تا وفات تمام حالات مجلسیؒ۔ شاہان وامراء نسبت مجلسیؒ۔ کرامات مجلسیؒ۔ حالات اقارب وشاگردان مجلسیؒ۔ اسمائے کتب تمام وکمال مصنفہ مجلسیؒ۔ وصایا ونصائح مجلسیؒ۔ مجلسی علیہ الرحمہ نے جو جو استفادے جناب صاحب الامر علیہ السلام سے حاصل کئے تھے مفصل لکھے گئے ہیں۔ غرضکہ عجیب وغریب تذکرہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ اعلیٰ درجہ کے ایسے ہوتے ہیں۔ اور علماء مذہب حقہ ایسے [illegible] تذکرہ عمدہ اور بے مثل ہے۔ ایسے ہی نہایت خوشنما اور عمدہ کاغذ پر چھپوایا گیا ہے۔ اگر مؤلف کی محنت کا خیال کیا جائے۔ تو اس کی قیمت دس روپے بھی بہت کم ہے مگر اس خیال سے کہ کوئی صاحب اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸/) مقرر کی ہے۔ حضرات شائقین بہت جلد طلب فرمائیں۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا۔

تطبیق [illegible] کی کتاب ہے۔ اردو زبان میں اصول دین وفروع دین کو [illegible] کے ثابت کیا ہے۔ کہ تمام مسائل اسلامی کتب آسمانی انبیاء سلف کے مطابق ہیں۔ [illegible] کے حوالے [illegible] گئے ہیں۔ خوشخط وکاغذ ولایتی۔ [illegible] صفحہ۔ قیمت [illegible] آنے [illegible] [illegible] کا لطف دیکھنے سے آتا ہے۔

سوانح عمری جناب علامہ سرکار علام [illegible] سید [illegible] حسین صاحب [illegible] دام ظلہ۔ جس میں سرکار علامہ دام ظلہ کے مجرب نسخے طبی وکیمیاوی وحالات [illegible] وحالات سفر وغیرہ وغیرہ۔ خالص چاندی بنانے کا مجرب نسخہ جو تیار کیا گیا۔ غرض نہایت [illegible] ہے۔ ولایتی رنگین کاغذ۔ اعلیٰ درجہ خوشخط وقلم جلی۔ اصلی قیمت [illegible]۔ اصلی لاگت [illegible] اب وقت سرکار علامہ دام ظلہ نے اپنی فیاضی سے صرف [illegible] آنے (۱۲/) قیمت کر دی ہے [illegible] مستفید ہو۔ ضخامت [illegible] صفحہ۔

[illegible] سے طلب کرو۔